تاریخِ ہزارہ

تألیف

ڈاکٹر شیر بہادر خان پنّی

دارُالشِّفاء
ایبٹ آباد ○ پاکستان

تاریخِ ہزارہ

تالیف

ڈاکٹر شیر بہادر خان پنّی

دارُالشِّفاء

ایبٹ آباد ○ پاکستان

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No 011254
★ MAILSI ★

(جملہ حقوق محفوظ)

کتاب : تاریخِ ہزارہ
تالیف : ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی
صفحات : ۶۵۶
اشاعتِ اوّل : ۱۹۶۹ء
اشاعتِ ثانی بترمیم و اضافہ ۱۹۸۰ء
مطبع : شرکت پریس لاہور
تعداد : تین سو
قیمت : -/۱۰۰ روپے

— ملنے کے پتے —
○ دار الشفار ایبٹ آباد
○ کواپرابک شاپ، شاہراہ قائدِ اعظم لاہور

۹۵۴۔۹۲۲
ش ۸۶ ت

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY



مؤلف

فہرست

فہرست تصاویر

اظہارِ تشکّر

تاریخِ ہزارہ کی (طباعتِ ثانی) کا مسوّدہ تین سال سے میز پر پڑا رہا کہ کوئی وسیلہ اس کی طباعت کا میسّر نہ آسکا۔ خود ضعیف (عمر ۸۲ سال) صحت کمزور اور حالت گوشہ نشین۔

لیکن ایک فرشتہ بہ صُورت قاضی افضل حق قرشی (میرے محترم دوست بواسطہ مولانا غلام رسول (مرحوم) نے اس کام کا بیڑا اُٹھا کر مجھے زیرِ احسان فرمایا۔ جزاہ اللہ خیر الجزا۔

اس سے پہلے بھی انھوں نے میری امداد فرمائی، جب کہ میرا مسوّدہ "افاداتِ مہر" مولانا مہر کی میز پر ان کی اصلاحی نظر کے لیے دھرا تھا، کہ انھوں نے دفعتہً داعئ اجل کو لبّیک کہا۔ اُن کے بیٹوں کو پے بہ پے خطوط لکھے لیکن بے نتیجہ، آخر کار اُن سے درخواست کی اور انھوں نے مولانا کے کاغذات کے انبار سے میرا مسوّدہ نکال کر مجھے ارسال فرمایا۔ پھر حال ہی میں میری ایک تالیف "مُشاہدات و تاثّراتِ حج" کی طباعت کا خاطر خواہ انتظام کر کے زیرِ احسان کیا۔

قاضی صاحب کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:

قاضی فضل حق قرشی

۱۵ر نومبر ۱۹۴۵ء کو بمقام کاکول ضلع ایبٹ آباد میں پیدا ہُوئے، اُن کا تعلق کاکول کے مشہور علمی خاندان سے ہے۔ پرائمری تعلیم کی تحصیل کے بعد لاہور چلے گئے، جہاں پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا، شعبۂ صحافت، پنجاب یونیورسٹی میں لائبریرین کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں، مُلک کے نامور علمی و ادبی رسائل میں ان کے تحقیقی مقالات شائع ہوتے رہتے ہیں، ان کی تالیفات یہ ہیں:

(۱) اقبال کے ممدُوح عُلماء (۲) اقبال کا فکر و فن

(۳) IQBAL THE UNIVERSAL POET

تاریخ ہزارہ کے ماخذ

میں نے طویل مدت تاریخ ہزارہ کے واقعات مختلف سرچشموں سے جمع کرنے میں صرف کی اور اب جب کہ تقریباً یہ تالیف مکمل کر چکا ہوں، ہر وقت مزید حالات کی تلاش و جستجو رہتی ہے۔ ؎

دانہ مے چیدیم، روزے کہ خرمن داشتیم

میں نے مختلف اور بعض نامعلوم گوشوں سے بھی حالات تلاش کر کے جمع کر دئے ہیں لیکن خاص ماخذ، جن سے میں نے استفادہ کیا وہ یہ ہیں۔

۱- اول اور بنیادی ماخذ جن سے میں نے بڑی محنت و مشقت سے سب اقوام ہزارہ کے خاندانی حالات، شجرہ نسب اور دیگر تاریخی واقعات نقل کئے وہ ۱۸۷۲ء کے کاغذات بندوبست ہزارہ ہیں۔ مشہور دیہات ہزارہ کی صورت دیہی اس ضمن میں مفید معلومات کی حامل تھیں۔ ان سے مجھے بہت سی اقوام کی تاریخ آمد و جائے رہائش و حالاتِ زندگی معلوم ہوئے۔ دو تین اقوام کے سلسلہ میں میری یہ تلاش ابھی تشنۂ تکمیل ہے۔ اگرچہ میں نے تلاش میں کمی نہیں کی لیکن افسوس ہے کہ اہلِ ہزارہ کے ارباب علم و فضیلت یا سربراہ اقوام و خوانین ہزارہ سے مجھے اس سلسلے میں توقع کے مطابق تعاون اور راہنمائی کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ حالانکہ میں نے ذاتی ملاقاتوں اور خطوط کے ذریعہ استدعا کی اور اخبارات کے ذریعہ کئی دفعہ توجہ دلائی۔ باوجود اس کے بھی اگر کوئی فروگذاشت اس تاریخی داستان میں یا حالات میں کمی بیشی نظر آئے تو میری معذوری کو مدنظر رکھتے ہوئے قارئین کرام معاف فرمائیں۔

اس ضمن میں مندرجہ ذیل اصحاب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنے قیمتی مشوروں اور تاریخی حالات بہم پہنچانے میں میری مدد فرمائی۔

۱- مولانا غلام رسول مہر مرحوم مسلم ٹاؤن لاہور۔ ۲- مولانا غلام ربانی لودھی۔ سرائے صالح

۳۔میاں عبدالقیوم صاحب مرحوم بفہ۔۴۔خان شاد محمد خان ٹبل۔۵۔خان علی اصغر زمان صواتی ساکن سفیدہ حال ایڈوکیٹ مردان۔۶۔میرے مہربان استاد الحاج مرزا غلام یوسف۔ساکن موڑہ غربی۔ضلع جہلم

۲۔"تاریخ ہزارہ" مرتبہ ویلس (WACE) مہتمم بندوبست ہزارہ ۱۸۷۲ء اور ہزارہ گزیٹر ۱۹۰۷ء سے بھی کافی مستند حالات معلوم ہوئے۔

۳۔"حیات افغانی" مصنفہ محمد حیات خان صاحب ساکن واہ۔یہ واہ کے مشہور خاندان کے مورث ہیں۔

۴۔"تواریخ خورشید جہاں" ۱۳۱۱ھ (۱۸۹۴ء) مصنفہ شیر محمد خان صاحب گنڈاپور۔ڈیرہ اسمٰعیل خان۔

۵۔"پٹھان"۔از سر آلف کیرو۔یہ آغاز عہدِ پاکستان میں سرحد کے گورنر تھے۔

ان ہر سہ متذکرہ بالا کتابوں سے پٹھانوں کے شجرہ نسب اور قدیم تاریخ کے متعلق کافی معلومات حاصل ہوئیں۔

۶۔"رؤسائے با اختیار و نامی خاندانِ پنجاب" مرتبہ کرنل چارلس فرانسس میسی مطبوعہ ۱۸۹۱ء اس میں عہدِ انگریزی کے مشہور خاندان و خوانین کے حالات ہیں۔

۷۔"خوشحال خاں خٹک"۔مصنفہ رائے زادہ دونی چند پر مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی کی تنقید۔مطبوعہ "معارف" اعظم گڑھ، صوبجات متحدہ ہندوستان۔اس میں گکھڑ قوم کے تاریخی حالات معلوم کرنے میں بہت مدد ملی۔

۹۔"تاریخ فرشتہ"۔

۱۰۔"بابر نامہ" (سفر نامہ بابر بادشاہ)
۱۱۔"تاریخ رہتاس" (بندوبست رہتاس)

} ان دونوں کتابوں میں گکھڑ قوم کے چند واقعات تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

۱۲۔"الفنسٹن"۔تاریخ سلطنت کابل و ملحقات۔شائع شدہ لنڈن ۱۸۴۲ء

۱۳۔"تاریخ ضلع جہلم"۔اس میں گکھڑ قوم کے حالات ہیں۔

۱۴۔"منتخب التواریخ"۔مصنفہ مُلّا عبدالقادر بدایونی۔

۱۵۔"تذکرۃ الواقعات، جوہر آفتابچی" (اردو ترجمہ از سید معین الحق جنرل سیکرٹری و ڈائریکٹر آف ریسرچ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی)

یہ ہمایوں بادشاہ کا آفتابچی تھا اور ہندوستان سے فرار کے بعد وہ ایران میں بادشاہ کے ساتھ رہا اور پھر واپس ہندوستان آیا۔ اس نے اس عرصہ کے حالات کو تفصیل سے قلمبند کیا ہے۔

۱۶۔ میجر راورٹی (RAVERTY) کی کتاب "افغانستان کی اقوام"۔

۱۷۔ ابٹسن کی فرہنگِ اقوام و قبائل پنجاب و سرحد۔

۱۸۔ میرے مسودہ تاریخ کے مکمل ہونے پر مجھے میرے دوست مولانا غلام ربانی لودھی ساکن سرائے صالح کی نشان دہی پر ایک قلمی فارسی تاریخ ہزارہ" قاضی عبدالمالک صاحب کلرک گورنمنٹ کالج ہری پور سے بذریعہ عزیز عبدالرحمٰن لیکچرار جغرافیہ ہری پور کالج ملی۔ انہوں نے کمال مہربانی سے یہ کتاب میرے استفادہ کے لئے مجھے عنایت کی۔ جو تقریباً دو ماہ میرے پاس رہی۔ اس کتاب کا نام "تاریخ ہزارہ عہد سرکار دولتمدار (سرکار انگریزی) و جنگ خورد برد سنگھاں و دُرّانیاں ہے"۔ اس کے لکھنے والا مہتاب سنگھ ہے۔ اس نے یہ کتاب میجر چیمبرلین اور ملھوخان اسسٹنٹ کمشنر کے ایماء پر لکھی۔ (میجر چیمبرلین ہزارہ کے بندوبست کا پہلا مہتمم تھا۔ لیکن ملھوخاں کی شخصیت اور اس کے اس ضلع سے تعلق کا حال مجھے معلوم نہ ہو سکا۔) وہ لکھتا ہے کہ ہزارہ کا پہلے پہل جب بندوبست شروع (غالباً ۱۸۴۹ء ۱۸۵۰ء) کرنے کے لئے افسران بالا تشریف لائے تو کچھ مدت کے بعد مصنف کو ہزارہ کی تاریخ مرتب کرنے کا حکم دیا۔ کیونکہ وہ عرصہ دراز سے اس ضلع میں موجود تھا اور کوئی کتاب اس سے پہلے اس ضلع کے حالات پر موجود نہ تھی۔ وہ لکھتا ہے:

"میرا نام مہتاب سنگھ قوم کانستھ ساکن مرلی پور پرگنہ ہوگنی پور موسائی نگر متعلقہ ضلع کانپور۔ کاہوں تلاشِ روزگار میں لاہور آیا تو پہلے پہل مہاراج صاحب کنور کھڑک سنگھ کی سرکار میں نوکر ہو گیا اور پانچ سال پرگنہ ساہیوال کلوخاں (جو مدت تک ضلع منٹگمری کے نام سے مشہور رہا اور اب پھر پرانا نام ساہیوال ہو گیا ہے) میں بہ عملداری دیوان ٹوڈرمل رہا۔ اس کے بعد میرا آب و دانہ یہاں سے اٹھ گیا تو دس ماہ تک سردار فتح سنگھ جو ملک منکیرہ پر حاکم تھا۔ (منکیرہ ریاست ۱۸۲۰ء کے آخر میں رنجیت سنگھ نے فتح کر لی تھی۔ ش ب) کے ساتھ رہا۔ اس کے بعد سردار ہری سنگھ کا ملازم ہو گیا اور ۱۸۸۱ بکرمی (۱۸۲۴ء) میں ملک ہزارہ کے دفتر میں مقرر کیا گیا"۔

پھر آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ:

"اب تیس سال کا عرصہ ہو گیا ہے کہ اس ملک میں اپنا وقت گزار رہا ہوں"

اس کی مہارت فارسی زبان میں کافی ہے اور عربی سے بھی کافی واقفیت رکھتا ہے۔ کیونکہ جابجا فارسی کے مستند اشعار اور عربی کے مقولے بھی بڑی خوبی کے ساتھ فارسی عبارت میں جابجا تحریر کرتا ہے۔ یہ ہزارہ کی بڑی مفصل تاریخ ہے۔ سکھوں کے عہد کے حالات کو اس نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ تاریخ ہزارہ کے بہت سے پوشیدہ واقعات پر ایسی روشنی ڈالی ہے کہ بایدو شاید۔ سردار ہری سنگھ کے عہد کے واقعات اور اس کی تمام جنگوں اور خوانین ہزارہ سے کش مکش کو شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ خانانِ تناول۔ ہندوال و پلال کی آویزش و دیگر حالات پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ ان سے بڑھ کر اس نے سید احمد شہیدؒ کے آخری معرکہ، شہادت بالاکوٹ پر جس تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس نے مولانا غلام رسول صاحب مہر، خاص مؤرخ سیرت شہیدؒ سے بھی دادِ تحسین حاصل کی اور سید شہید کی شہادت و دفن وغیرہ کے حالات پر بھی پوری روشنی ڈالی ہے۔

١٨۔ "نگارستانِ کشمیر" ۔ از قاضی ظہور الحسن صاحب۔ سیوہارہ ضلع بجنور۔ اس کتاب کا ترجمہ من وعن شامل کتاب کر دیا گیا ہے۔

١٩۔ "مخطوطاتِ قدیمہ" عجائب گھر پشاور کے سب پرانے فائل محکمہ امور خارجہ ہندوستان جو مجاہدین اور دیگر امور ضلع ہزارہ سے متعلق تھے، ان سے بھی کافی استفادہ کیا گیا۔

٢٠۔ بہت سے رسائل انگریزی و اردو اخبارات سے بھی ہزارہ کی تاریخ کے متعلق مواد حاصل کیا گیا۔

٢١۔ میجر ایبٹ۔ ضلع ہزارہ کے پہلے ڈپٹی کمشنر کی ڈائری۔ (میں نے میجر ایبٹ کی چند ڈائریوں (١٨٤٩ء، ١٨٥٠ء) کی نقول ١٩٥٥ء میں محکمہ مخطوطات پشاور سے حاصل کر لیں تھیں اور ان میں درج شدہ مفید معلومات کو اپنے مسودہ میں شامل کر لیا تھا)

لیکن اوائل ١٩٦٨ء میں جبکہ میں اپنا مسودہ مکمل کر چکا تھا، پتہ چلا کہ میجر ایبٹ کی ڈائری مارچ ١٨٤٨ء تا جون ١٨٤٩ء مقبرہ انار کلی کے عجائب گھر واقع لاہور میں زیر تحویل ہوم ڈیپارٹمنٹ حکومت مغربی پاکستان موجود ہے۔ کوشش کر کے ان کی نقول مجھے اوائل دسمبر ١٩٦٨ء میں ملیں۔ میجر ایبٹ (اس وقت یہ کپتان تھا) روزانہ ڈائری کے ذریعے مقامی بلکہ ملحقہ پنجاب کے

حالات اور سیاسی واقعات کشمیر و ملحقہ علاقہ جات، ریذیڈنٹ لاہور کو بھیجتا رہتا تھا۔ مقامی سکھ افسران (فوج و سول)، مہاراجہ کشمیر گلاب سنگھ کی ریشہ دوانیوں اور ان کے انسداد کی تدابیر سے ریذیڈنٹ کو مطلع کرتا رہتا تھا اور اس ضلع کے سیاسی حالات کا جو اثر پنجاب پر ہوتا تھا، اس سے لاہور کو باخبر رکھتا تھا۔ اس کے مشورے صائب، دلیرانہ اور پختہ سیاسی ذہن کے مظہر تھے۔ اہل ہزارہ کی سیاست کا ماہر اور نبض شناس تھا۔ اس کے مشوروں سے اور اس کے اپنے مؤثر طریق حکومت سے اہل ہزارہ کے دل اس نے اپنے قبضے میں کر رکھے تھے۔ وہ خوانین ہزارہ پر مشکل سے مشکل وقت میں بھی اعتماد کر سکتا تھا۔ اگرچہ وہ سکھ حکومت کا ملازم اور سکھ ناظم ہزارہ کا مشیر تھا لیکن عملاً وہ ریذیڈنٹ کا نمائندہ برائے سلطنت انگریزی تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایسے ماحول میں ہزارہ کا ناظم (گورنر) سکھ، افواج حکومت ہزارہ، سکھ، اس کی اپنی باڈی گارڈ سکھ سپاہی، حتیٰ کہ اس کا منشی سکھ تھا۔ مگر وہ ان سب پر بطور حاکم حکومت کرتا تھا۔ اس کی اصلی طاقت اقوام ہزارہ کی حمایت اور وفاداری تھی اور اس نے یہ دعویٰ کیا (یعنی ریذیڈنٹ کو لکھا) اگر سب افواج سکھاں اس کے خلاف ہو جائیں تو وہ ان سب کو اقوام ہزارہ کی امداد سے شکست دے دے گا۔

اس ڈائری سے اس عہد کے حالات اور پس منظر پر صحیح روشنی پڑتی ہے۔ میں نے اس ڈائری سے کافی استفادہ کیا۔

۲۲۔ "اسلام کے معاشی نظریئے"۔ مصنفہ محمد یوسف الدین صاحب۔ شائع کردہ مطبع ابراہیمیہ حیدر آباد۔ دکن ۱۹۵۰ء۔

۲۳۔ "تاریخ خان جہانی" (فارسی) از خواجہ نعمت اللہ ہروی۔ مصنفہ ۱۰۲۱ھ، ۱۶۱۲ء۔ ایڈٹ کردہ ایس۔ ایم۔ عماد الدین۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف پاکستان۔ ڈھاکہ۔

۲۴۔ "کابل" مصنفہ سر الیگزنڈر۔ برن۔ ۱۸۴۱ء

۲۵۔ "پنجاب کی سرحد پر ایک سال"۔ مصنفہ ہربرٹ۔ بی۔ ایڈورڈ۔ (دو جلد) بار دوم۔ شائع کردہ گورنمنٹ مغربی پاکستان۔ ۱۹۶۴ء

۲۶۔ "تواریخ حافظ رحمت خانی"۔ یوسفزئیوں کی تاریخ۔ کابل کی ہجرت کے آغاز سے پشاور مردان۔ سورت۔ باجوڑ سے آمد و حکومت کے متعلق مفصل حالات ہیں۔ جس کو پشتو اکاڈمی،

پشاور یونیورسٹی نے ۱۹۷۱ء میں شائع کیا۔ ایک مستند تاریخ ہے۔ اس میں برصغیر پاک و ہند کے افغان حکمرانوں کے حالات از ابتدائے عہد بہلول لودھی - ۸۵۵ھ، ۱۴۵۱ء تا وفات - آخری افغان حکمران خواجہ عثمان ۱۰۲۱ھ، ۱۶۱۲ء افغانوں کے نسب نامے بھی اس میں درج ہیں۔

پیش لفظ

(طبع اوّل)

مجھے بچپن میں کہانیوں اور قصوں کے سننے کا بہت شوق تھا اور خاص کر خاندانی کارناموں کا جو میرے خاندان کے لئے فخر و مباہات کا کام دیتے تھے۔ ماحول بھی اور زمانہ بھی قومی و خاندانی تعصب کا تھا۔ اور لوگ ایسی کہانیوں اور قصوں کو بڑی رغبت اور خواہش سے دہراتے تھے اور سنتے تھے اور یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ تاریخ کی ابتدا ہمیشہ قصے، کہانیوں اور روایات ہی سے شروع ہوتی ہے۔ یہ کلیہ خاص کر ان لوگوں کی تاریخ پر زیادہ صادق آتا ہے جو زمانہ بعید میں گزرے ہوں اور مؤرخ کے وطن سے دور ہوں۔ عام لوگ ایسی روایتیں سننے کے شائق ہوتے ہیں جن سے ان کی خاندانی برتری و عزّو جاہ کی تشہیر ہو۔ اس لئے میں عمر رسیدہ لوگوں، بڑی بوڑھیوں (خاص کر والدہ مرحومہ) کے پاس گھنٹوں بیٹھ کر ان سے پرانی کہانیاں، خاندانی قصے اور شجرہ نسب کے سلسلے بڑے غور اور دلچسپی کے ساتھ سنتا تھا اور کچھ کچھ پنسلی یادداشتیں بھی رکھ لیتا تھا۔ اس شوق میں زیادہ ترقی اس وقت ہوئی جب میں ۱۹۱۲ء میں مڈل سکول میں داخل ہوا۔ میرے ہم جماعت مختلف اقوام کے فرد تھے، لہٰذا خاندانی و قومی حالات کی کہانیوں اور قصوں کی طرف اور زیادہ توجہ ہوئی۔ آہستہ آہستہ اپنی قوم کے افراد کے حالات، ان کی کارکردگیاں، ان کے عروج و زوال، آغاز و انجام کی تحریر کی طرف توجہ مبذول ہوئی۔ اس کام کو بہت تفصیل سے کرنا شروع کیا۔ کام دیر طلب، طویل اور صبر آزما تھا۔ اپنے گاؤں اور خاندان کے حالات بہت مفصل دریافت کئے اور زبانی شجرہ نسب جتنا معلوم ہو سکا، تحریر کیا گیا۔ اس کام میں اور توسیع ہوئی اور دیگر دیہات قوم ہتّی کے متعلق بھی ان خطوط پر تحقیقات شروع کی۔ اس کام میں آہستہ آہستہ دلچسپی بڑھتی ہی گئی اور قوم ہتّی کے کل افراد کا مکمل شجرہ نسب تحریر کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ مگر اس کام کی تکمیل کے لئے بزرگوں کی زبانی اور تحریری یادداشتیں نامکمل نظر آئیں۔ لہٰذا اس کام کی تکمیل کے لئے مناسب وقت کا انتظار کرنا پڑا۔

۱۹۳۱ء میں میرا تقرر ہری پور سول ہسپتال میں بطور اسسٹنٹ سرجن ہوا اور دس ماہ ہری پور رہا۔ اور تحصیل کے دفاتر چھانے، اور جو بھی مفید مطلب کاغذات نظر آتے ان کو نقل کرلیا گیا۔ قوم تنی کے تمام شجرہ نسب کو مکمل نقل کرلیا گیا۔ ان سب مسودات کے ترتیب دینے کا کام ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۸ء تک جب میں بنوں میں سول سرجن تھا، مکمل کیا گیا۔ تمام دیہات قوم تنی کے افراد کا شجرہ نسب مکمل کرلیا گیا۔

اپریل ۱۹۵۲ء میں میری تقرری بہ عہدہ سول سرجن ضلع ہزارہ ہوئی اور اپریل ۱۹۵۴ء تک یہاں رہا۔ اس اثنا میں مزید قومی حالات ضلع ہزارہ کے ریکارڈ دفتر سے حاصل کرکے اپنے مسودات کی کمی کو پورا کردیا گیا۔ خیال یہ تھا کہ قوم تنی کی تاریخ معہ مکمل شجرہ نسب تحریر کرکے شائع کردی جائے اور یہ سب کام مکمل بھی ہوگیا۔ لیکن بعد میں جب زاویہ نگاہ، خاندان، قبیلہ اور قوم کے تنگ دائرہ سے بلند ہوا تو اس کام میں دلچسپی کم ہوگئی اور شجرہ نسب خاندانی (جو کہ وقتی فخر و مباہات کا سامان ہے) کی تحریر کا کام چھوڑ دیا۔ کیونکہ سب انسان اولاد آدم ہیں اور آدم مٹی سے بنا تھا۔ اس لئے ایک ہی مٹی سے بنے ہوئے انسان میں خاندان و قبیلہ کی تقسیم عزت و آبرو کے لئے کوئی مقصودی شئے نہیں۔ جس کسی نے ہمت کی، کوشش کی سو وہ اپنی مراد کو پہنچا۔ جو کاہل رہا، نامراد رہا، اور یہی بنیاد ہے حاکم و محکوم، معزز و نامراد ہونے کی اور اب یہ محسوس ہوا کہ یہ ایک ایسی نعمت نہیں جو تمام تر التفات کی مستحق ہو۔ اگر اس کی بجائے "ہزارہ کی کہانی، تاریخ کی زبانی" مرتب ہوسکے تو ایک مفید علمی کام ہوگا۔ لہٰذا اس کام کے لئے مناسب مواد جمع کرنے کی جستجو ہوئی۔

قارئین کرام کو میرے ان الفاظ سے یہ اثر نہیں لینا چاہیے کہ خاندان و قبیلہ کی تقسیم بغرض تنظیم کا میں مخالف ہوں۔ صرف یہ چاہتا ہوں کہ انفرادی صحت، ورزش اور ذاتی تمول کی معتدل کوشش سے زیادہ اہمیت خاندان اور قبیلہ کی اصلاح کو دینی چاہیے۔ اسی طرح بڑھتے بڑھتے اس اصول کی طرف آنا چاہیے ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

بہرحال یہ کام ایک صاحب علم اور قابل مؤرخ کا تھا۔ اور میں نے تو اپنی زندگی ڈاکٹری کی

تعلیم حاصل کرنے اور پھر اس کام میں مشغول رہنے کے لئے وقف کر دی تھی - اس پر مزید یہ کہ ڈاکٹری کی زندگی کا دائرہ خاص قسم کے علم و عمل ہی کو محیط ہوتا ہے - لہٰذا یہ خواہش اس پس منظر کے ساتھ مطابقت تو نہیں رکھتی تھی -

میرا پیشہ ڈاکٹری اور اس پر مشغلہ تاریخ نویسی - اول الذکر کی عدیم الفرصتی، ہمہ وقت مصروفیت اور اپنے وقت کے استعمال پر کامل بے اختیاری اور مؤخر الذکر کے لئے جمعیت خاطر اور وقت پر مکمل کنٹرول و سازگاری، بہ مرضی خود ضروری و لابدی - ان متضاد حالات میں بھی فطری ذوق و شوق نے اور سالہا سال کی محنت و عرق ریزی نے مواد جمع کرنے پر مجبور کیا کہ جس طرح بھی ہو اور جب بھی ہو اس کام کو ضرور پورا کیا جائے -

بہر حال کام کا آغاز کر دیا گیا - دوران ملازمت صوبہ سرحد کے تمام اضلاع اور خصوصاً ضلع ہزارہ کے گزیٹر وغیرہ کا مطالعہ شروع کر دیا گیا - آہستہ آہستہ یہ ذوق و شوق بڑھتا ہی گیا اور بہت سی کتابوں سے مفید مطلب معلومات کو نقل کرنا شروع کر دیا گیا - تمام میسر مطبوعہ کتابوں اور غیر مطبوعہ مسودات کا بغور مطالعہ کیا گیا - برطانوی عہد کی پرانی دستاویزات اور فائل، جو کہ پشاور کے عجائب گھر میں زیر تحویل "ناظم مخطوطات قدیمہ (DIRECTOR OF ARCHAIC) ہیں" ان سب کا مطالعہ کیا گیا اور ان سے اقتباسات لئے گئے -

آغاز کار سے تا اختتام ملازمت (یکم نومبر ۱۹۵۶ء) ان اوراقِ پریشان اور مسودات تاریخی کا ایک انبار جمع ہو گیا - خیال تھا کہ پنشن پر آنے کے بعد اور فراغت کے وقت ان کو ترتیب دینے اور تاریخ ہزارہ لکھنے کا کام شروع کیا جائے گا - لیکن + ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ان سطور (پیشِ لفظ) کے لکھنے کے وقت تک پورے گیارہ سال گزر چکے ہیں - لیکن تکمیلِ کار کے آثار اب بھی نظر نہیں آتے - اب بھی نہ فراغتِ قلب میسر اور نہ ہی ہمت - اب صورتِ حال یہ ہے کہ جب کبھی (عموماً چند ماہ کے بعد) اس کام کا خیال آیا تو اس طومار کو الٹ پلٹ کر دیکھا قلم اٹھایا لیکن کام کی اہمیت و گراں باری سے ہار کر پھر کاغذات لپیٹ کر طاقِ نسیاں کے حوالے کر دئے - یہ سلسلہ آج ۱۹۶۸ء تک یوں ہی چلتا رہا - تھوڑا تھوڑا یہ کام بھی ہوتا رہا اور کاروباری زندگی یعنی

ڈاکٹری کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ اور ڈاکٹر کی زندگی معلوم ہے کہ فارغ الوقت اور بے فکر نہیں ہو سکتی ڈاکٹر کو اپنے وقت کی آقائی کبھی میسر نہیں ہو سکتی۔ اِن حالات میں اس سنجیدہ اور غور و فکر کے کام کو کرنا بڑی ہی مشکل بات تھی۔ لیکن یہ کام چلتا ہی رہا اور بقول مولانا حسرت موہانی ؎

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی

اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

تاریخ تیار کرنے اور معالج کے فرائض ادا کرنے کے، دونوں میدانوں میں لڑتا رہا۔ اب جبکہ میں اس تمام ذخیرہ پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ تاریخ ہزارہ میں ایک عجب خصوصیت نظر آتی ہے۔ اگر مزید تلاش و محنت کی جائے تو وسطی ایشیا کے اقوام کی تاریخ کا عکس ہزارہ کی تاریخ کے آئینہ میں دیکھا جا سکتا ہے اور تاریخ ہزارہ میں زمانہ قدیم کے ادوار کی تاریخ کی جھلک دکھائی جا سکتی ہے۔

ہندوستان پر بحری حملوں کے آغاز سے پہلے جتنے حملے بھی اس ملک پر ہوئے وہ وسطِ ایشیا سے صوبہ سرحد کے شمال و مغربی دروں کے راستہ سے ہوئے۔ ان طوفانوں کا رخ گو پاک و ہند کے مرکز کی طرف ہی رہا۔ لیکن ان کی لہریں ضلع ہزارہ کی ناقابلِ تسخیر چٹانوں سے ٹکراتی رہیں۔ اور لبِ ساحل (یعنی دامنِ کوہ) پر اپنے اثرات اور بقیہ افرادِ قوم کو چھوڑتی رہیں۔ ان قوموں کے افراد کے موجودہ جائے وقوع سے اقوامِ گزشتہ کے سیلاب کی عصری تاریخ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے حملہ آوروں کے ہر سیلاب نے اول تو اصلی باشندوں اور پھر ان کی دوسری جانشین اقوام کو آگے دھکیلا اور خود درجہ بدرجہ اپنے پیش روؤں کے مقامات پر قبضہ جاتے رہے۔ اس سلسلہ کی مختلف کڑیاں ضلع کی شمال مشرقی سرحد کے پہاڑوں سے شروع ہو کر جنوب مغرب میں چھچھ کے میدان تک پھیلی ہوئی ہیں۔

ان تاریخی واقعات پر مزید غور سے یہ بات بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ انسانی تاریخ کے مختلف درجاتِ تہذیب کا عکس بھی ہزارہ کی ان دو انتہائی سرحدوں کے درمیان دیکھا جا سکتا ہے۔ جو پانی و گلہ بانی سے زراعت و تجارت کے درجات کا سلسلہ شمال مشرق کی بلندیوں سے جنوب مغرب کے میدانوں تک بتدریج اترتا اور پھیلتا ہوا نظر آ سکتا ہے۔ جو قومیں پرانی تہذیب

کی حامل تھیں اور ان کا آبائی پیشہ گلہ بانی اور چوپانی تھا۔ وہ شمال مشرق کی طرف انتہائی سرحد کی جانب دھکیلی جاتی رہیں اور بعد میں آنے والی اقوام جو نسبتاً ترقی یافتہ تھیں سلسلہ وار جنوب مغرب کے میدانوں میں ڈیرے ڈالتی رہیں۔ اس تاریخی حقیقت (یعنی بے شمار قوموں کی آمد و اقامت) نے لوگوں میں یہ غلط خیال پیدا کر دیا کہ اس ضلع میں چونکہ ہزارہا اقوام آباد ہیں اور اسی وجہ سے ضلع کی وجہ تسمیہ بھی یہی سمجھی گئی۔

اس پس منظر میں اور اس نظریہ کی تائید میں مزید محنت و تلاش کی ضرورت معلوم ہوئی تو میں نے از سر نو زیادہ تحقیق شروع کی۔ اس مقصد کے لئے ضلع کے دفاتر میں بہت پرانے تاریخی مواد کی تلاش شروع کی۔ یہ تلاش اب بھی جاری ہے اور ترتیب و اشاعت میں زیادہ التوا ہو رہا ہے اور دیکھئے کب یہ کتاب زیور طباعت سے آراستہ ہوتی ہے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

پیش لفظ

(طبع دوم)

پہلی طباعت، میرے عمر بھر کے جمع کردہ مواد پر مبنی تھی - یہ مواد مفصل اور بیشتر سرکاری دستاویزات عہدِ انگریزی سے لیا گیا تھا - اس لحاظ سے اس کی اہمیت قلمی مواد کی سی تھی - اس وقت یہ خیال تھا کہ سب جمع شدہ مواد شائع کر دیا جائے تاکہ مستقبل کے مؤرخ کے لئے باعث مطالعہ و فکر و نظر ہو سکے -

اس کی ترتیب بھی حسبِ خواہش نہ ہو سکی اور نہ ہی اس میں کاٹ چھانٹ کرنے کو مناسب سمجھا گیا - اس کی وجوہات میں سے ایک غالب وجہ فرصت کی کمی اور محنت کے لئے ہمت کا فقدان تھا - پھر اس پر مستزاد ۱۹۶۹ء میں مجھے ایک ذہنی حادثہ بھی پیش آگیا، جس نے حواس ہی مختل کر دئے - اپنی اس متاعِ عزیز کو جو مدت سے بڑی محنت و کاوش سے جمع کی گئی تھی، کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا - اس وجہ سے اسے اسی حالت میں طبع کرانے کا بندوبست کر دیا گیا -

بنیادی طور پر میں ڈاکٹر پیشہ ہوں اور یہ شغل تاریخ کا مطالعہ میرا ایک مشغلہ تھا یعنی "HOBBY" علمی لحاظ سے میں اس کوچہ سے نابلد تھا - لہٰذا ان حالات میں مزید التوا مناسب معلوم نہ ہوا -

اس مسودہ کے اتنی مدت پڑے رہنے کی وجہ ایک اور بھی تھی - میں طباعت کے مسائل سے قطعاً ناواقف تھا - اسی شش و پنج میں سال گزرتے گئے - آخر کار میرے رب نے میری شناسائی ایک متدین، تجربہ کار اور مخلص انسان سے کرا دی، جو ایک اچھا خوشنویس اور تجربہ کار کاتب ہے آپ کا اسمِ گرامی مولوی عبدالواحد اختر ہے - آپ ضلع راولپنڈی کے رہنے والے ہیں - انہوں نے کام کا بیڑا اٹھا لیا - خود ہی کتابت کی، کتاب چھپوائی اور جلدیں بندھوا کر مجھے سب کتابیں یہاں پہنچا دیں - جس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں - جزاهم الله خیر الجزاء -

زمانہ کی بے ذوقی کی وجہ سے کتاب کی صرف ۱۵۰ جلدیں ہی چھ سال کے عرصہ میں نکل سکیں۔ تاہم طبع ثانی کیلئے مناسب ترتیب، ترمیم وایزادی میں مصروف ہو گیا تا کہ جب بھی طباعتِ ثانی کی نوبت آئے تو نیا مسودہ تیار موجود ہو۔ اور بغیر کسی مزید التوار حوالہ پریس کر دیا جائے۔

پہلی چیز جو اس طبع میں حذف کر رہا ہوں وہ شجرہ ہائے انساب ہے۔ یہ چیز موجودہ زمانے کے مطابق نہیں رہی۔ اگرچہ میں بذاتِ خود اس کو ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ ایک خاص نظامِ حکمت سے وابستہ ہے، عادات ، مزاج، افتادِ طبعت اور عقیدہ جات کی تفسیر ہوتی ہے۔ اور یہ بات تاریخی مسلمات سے ہے اور اس سے اقوام کے ماضی کے حالات کی تشریح ہوتی ہے اور قوم کے مستقبل کے لئے ایک راہ نمودار کرتی ہے۔

اہلِ عرب کا قاعدہ تھا کہ جب وہ کسی اجنبی شخص سے تعارف حاصل کرنا چاہتے تو کہتے تھے کہ اس کا نسب ہمیں بتاؤ۔ کیونکہ ان کے ہاں تعارف میں سب سے پہلی چیز جو دریافت طلب ہوتی تھی وہ یہ تھی کہ اس کا نسب کیا ہے اور کس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ صرف اس بات سے وہ اجنبی کے طول وعرض کو ناپ لیتے تھے کیونکہ ہر قبیلے کے عادات واخلاق، طرز بود و ماند جدا جدا تھے اور ہر قبیلے کے افراد اپنے قبیلے کے اوصاف سے متصف تھے اور اس قبیلے کے افراد کی قدر وقیمت ان کے معلوم اوصاف پر مبنی ہوتی تھی۔

نسل وقوم کی نجابت ایک خاص وصف ہے جو صدیوں کے توارثِ عمل سے قوم کے افراد میں من حیث القوم پیدا ہوتا ہے۔ انگریزی کی ایک ضرب المثل ہے کہ جنٹلمین بننے کے لئے شرافت ونجابت خاندان کی تین پشتیں درکار ہیں۔ قومی نجابت انسانیت کے شرف وترقی کے لئے اشد ضروری ہے۔ خدا بھی نبی اس شخص کو بناتا ہے جو نجیب الطرفین ہو۔ کیونکہ ایسا ظرف جو نبوت کا متحمل ہو سکے صرف اشراف اقوام میں ہی پیدا ہو سکتا ہے۔

تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ دنیاوی حکومت کے لئے بھی ایک وسیع ظرف کی ضرورت ہوتی ہے اس حقیقت کو مولانا ابوالکلام آزاد نے کمال بلاغت سے یوں ادا فرمایا۔ وہ "الہلال" میں لکھتے ہیں کہ:

"یہ ممکن ہے کہ ایک انسان اپنی سعی وہمت سے بادشاہی کا تخت حاصل کرلے
لیکن یہ قطعی ناممکن ہے کہ وہ محلوں میں پلا ہوا دماغ بھی لا سکے"۔

لیکن اب لوگ شجرۂ نسب کی اہمیت کا احساس نہیں رکھتے اور نہ ہی اس کی تحقیق پر غور و فکر کے لئے تیار ہیں۔ حالانکہ خاندانی روایات و صفات کا تعلق خاندان سے وابستہ ہوتا ہے اور وراثت میں چلتا ہے۔ خاندانی روایات و صفات پشت بہ پشت منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ اجداد کی صفات کا پرتو ان کی اولاد میں دیکھا جا سکتا ہے۔ نامور و صاحبِ شرف افراد کی اولاد اجداد کی صفات سے متصف ہوتی ہیں۔

قوم و خاندان کے رنگ و روپ، دماغی و جسمانی قوے کی ساخت، عادات و اطوار اسلاف ہی کے اوصاف کا مظہر ہوتے ہیں۔ اب علم الانساب قابل توجہ نہیں رہا کیونکہ اختلاط نسل اب عام ہو چکا ہے۔ اجداد کے خصوصی عادات و اوصاف سے اب ان کی اولاد عاری ہو چکی لہٰذا اب اس علم کی مانگ بھی زمانہ کے بازار میں نہیں رہی۔ اہلِ زمانہ اب ہر سطح پر مساوات کے دلدادہ ہیں۔ خصوصی اعمال و اوصاف کی قدر و توقیر نہیں رہی۔ لہٰذا خالص اقوام و افراد کے اوصاف کی تلاش اب بے سود ہے۔ لہٰذا شجرہ انساب کو حذف کر دینا پڑا۔

۲۔ قومی حالات کو اب اختصار سے پیش کیا گیا۔ کیونکہ فی زمانہ زندگی بہت مصروف اور تلخ کام ہو گئی۔ طمانیت قلب مفقود ہے۔ مخلوقِ خدا دنیا کی حرص و آز میں اتنی محو ہو گئی ہے کہ ماضی کے تاریخی حالات کی طرف متوجہ ہونے کے لئے فارغ ہی نہیں لہٰذا اختصار ضروری ہوا تاہم واقعات کے تاریخی و عبرت آموزی کے پہلو کو نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا گیا۔ اگر اس کا لحاظ نہ رکھا جاتا تو یہ تاریخ کی کتاب نہ رہتی بلکہ بے مقصد قصہ گوئی کا پلندہ بن جاتی۔ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی "تدبر قرآن" جلد ۲ میں تحریر فرماتے ہیں۔

> "تاریخ کا فن ایک بالکل بیکار فن بن کر رہ گیا ہے کہ اس سے وہ حکمت و نصیحت واضح نہیں ہوتی جو واضح ہونی چاہیئے"

حالات ٹھیک ٹھیک اور حکمت و موعظت کے پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے سنانا چاہیے اگر واقعات محض داستان سرائی کے لئے بیان کئے جائیں تو یہ ایک کارِ عبث ہے۔ ان کے بیان کا نفع صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب وہ اس حکمت و موعظت کے ساتھ بیان کئے جائیں جو ان کے اندر مضمر ہے اور ٹھیک ٹھیک بیان کئے جائیں۔

جناب صفدر محمود صاحب نے اپنی کتاب "مسلم لیگ کا دورِ حکومت" میں تحریر فرمایا ہے کہ:

"میرے نزدیک تاریخ کسی قوم کا قیمتی سرمایہ ہوتی ہے اور جو قوم اپنی تاریخ فراموش کر دیتی ہے، اس کا جغرافیہ اسے فراموش کر دیتا ہے۔ تاریخ کا مقصد محض داستان گوئی نہیں ہوتا، بلکہ تاریخ، ماضی کا بے باک اور غیر جذباتی تجزیہ پیش کرتی ہے۔ جس کی روشنی میں آئندہ نسلیں اپنی راہ متعین کرتی ہیں۔ اس لحاظ سے مؤرخ کا کردار اس معالج کا ہوتا ہے جو مرض کی تشخیص بھی کرتا ہے اور علاج بھی تجویز کرتا ہے۔"

پہلی طباعت کے بعد تاریخی تفتیش و تلاش جاری رہی اور بہت سے مزید تاریخی کوائف حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی۔ خاص کر سکھوں کے تاریخی حالات اور ان کا پس منظر۔ ان سب کو اس طباعت میں شامل کر رہا ہوں اور سکھوں کے عہدِ حکومت کے حالات ایک قلمی (فارسی) کتاب سے من وعن ترجمہ کر کے شامل کر رہا ہوں جو سکھوں کے ایک وزیر سلطنت کی قلم سے ہیں۔ ان کے عہد کی چشم دید کہانی بھی اور تاریخی لحاظ سے معتبر بھی۔ لہٰذا اول والا متعلقہ باب حذف کر کے اس کتاب کا ترجمہ من وعن شامل کر رہا ہوں۔ اس طرح سے مفصل حالات بھی نظر کے سامنے آجائیں گے اور ایک قلمی تاریخی کتاب کا مواد بھی محفوظ ہو جائے گا۔ جو علمی لحاظ سے ضروری بھی ہے۔

باب اوّل

تمہید

عمرانی علوم میں تاریخ کی اہمیت محتاجِ وضاحت نہیں۔ یہ کسی قوم کے سفرِ زندگی کی ایک روداد ہوتی ہے۔ قوم کے مزاج، افتادِ طبع، نفسیاتی کیفیات، قوم کے رہنماؤں کی خوبیوں، خامیوں کا عکس پیش کرتی ہے۔ افراد اور اقوام، حال اور مستقبل تک ماضی کے اسی زینے کے وسیلے سے پہنچتے ہیں۔ جو قومیں اپنے ماضی یا تاریخ سے آگاہ نہیں ہوتیں وہ اپنے موجودہ اور آئندہ مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت سے بھی عاری ہوتی ہیں۔ باشعور افراد اور اقوام اپنے ماضی کی تاریخ سے سبق حاصل کر کے اپنے حال اور مستقبل کو سنوارتی ہیں۔ چنانچہ ازبس ضروری ہے کہ قوم اپنے ماضی کو پیشِ نظر رکھے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس کے پاس اپنے ماضی کی قابلِ اعتبار روداد، تاریخ کی شکل میں موجود ہو۔ کسی صاحبِ علم کا انگریزی مقولہ ہے:۔

"WHERE THERE IS NO KNOWLEDGE OF THE PAST
THERE CAN BE NO VISION OF THE FUTURE"

" جہاں ماضی کے واقعات کا علم نہیں وہاں مستقبل کی بلند نظری بھی پیدا نہیں ہو سکتی"۔

انسانی زندگی کے گزرے ہوئے واقعات بیان کرنے کو، اصطلاح میں تاریخ کہتے ہیں۔ علمِ تاریخ دنیا کی تمام قوموں میں رائج ہے اور سب طبقہ کے لوگ اس سے رغبت رکھتے ہیں اور اپنے خاندان کی سرگزشت کو کہانیوں، قصوں اور حکایتوں کے رنگ میں بیان کرتے ہیں۔ قومی اور نسلی فخر کے قصے بڑے مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں اور ان کو سینہ بہ سینہ بطور مقدس امانت کے اولاد کے حوالے کرتے ہیں اور اپنے نسب و حسب کے مکمل شجرے بڑے انتظام سے یاد رکھتے ہیں۔ ان ہی حکایتوں اور قصوں سے زمانہ قدیم کی تاریخ سے واقفیت حاصل ہوتی ہے اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی حالت وقتاً فوقتاً کیوں کر بدلتی رہی۔

مختلف اقوامِ عالم کا آغاز و انجام کس طرح ہوا اور کن واقعات نے قوموں کے عروج و زوال پر اثر ڈالا۔ یعنی تاریخ، مختلف قوموں کے ظہور، آثارِ ترقی، حالات، آداب و رسوم و عقائد اور مشہور لوگوں کے کارنامے بیان کرتی ہے اور جو اہم واقعات ظہور پذیر ہوئے ان کے اسباب و نتائج بتاتی ہے۔ فرد سے قبیلہ، قبیلہ سے قوم اور اقوام کے مجموعہ سے عالمِ انسان بنتا ہے۔ اس لئے جس شخص کے سینے میں نوعِ انسان کی خدمت کی تڑپ ہے وہ قوم کی اخلاقی، مادی اور جسمانی و روحانی بہبود کے لئے ہاتھ پاؤں مارے گا اسی طرح اگر کوئی انسان خدمت نوعِ انسان کے لئے اپنی ذات کی اصلاح و ترقی اور جسمانی و ذہنی ترقی کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنی نیت کی برکت سے محب انسانیت شمار ہوگا اور جو شخص ذاتی اقتدار کے لئے اور حیوانی خواہش کے لئے کوشش کرے گا وہ اپنی پست ذہنیت و ارادہ کے لحاظ سے پست ہوگا۔ ورنہ فرد کی اصلاح و ترقی بجائے خود مکروہ نہیں بلکہ پسندیدہ امر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے بعض افراد کو جو عبادت اور نماز کے لئے راتوں کو بہت جاگتے تھے، ان سے فرمایا: خدا نہیں تھکے گا تم تھک جاؤ گے۔ بِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقٌّ (تیری جان کا تم پر حق ہے) یعنی یہ کہ صوم و صلوٰۃ اور ذکر و فکر و عبادت میں ایسا اعتدال اختیار کرو کہ بدنی صحت پر زوال نہ آئے۔ الا ماشاءاللہ۔ ذات کی اصلاح تعلیم، صحت، قوت کے لئے کوشش کرنے والا قبیلہ کا دوست ہے۔ کیونکہ مفید اور شریف افراد کے مجموعے سے بہادر اور شریف قبیلہ بنتا ہے۔ اسی طرح بہادر، شریف اور نیک نام اور خوش اعمال قبیلوں کے مجموعہ سے باوقار قوم بنتی ہے اور اچھی اقوام کے مجموعہ سے وہ عالمِ انسانی بنتا ہے جنہیں خالق کائنات نے اشرف المخلوقات کا درجہ دیا اور قیامت اس وقت برپا ہوگی جب نیک آدمیوں سے زمین خالی ہو جائے گی اور اللہ کا نام پکارنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ اس حقیقت کو پہچاننے کے لئے ماضی کے واقعات کا علم چاہیے کیونکہ ماضی کے حالات کے علم سے انسان مستقبل کے حالات سے آگاہ اور حوادث کا سامنا کرنے کے لئے آمادہ ہو سکتا ہے۔

اس حقیقت کو نظام الملک طوسی نے اپنے بیٹے کو خطاب کرتے وقت ان الفاظ میں بیان کیا۔

"تاریخ کو تدابیر ملکی میں بہت کچھ دخل ہے۔ کیونکہ عالمِ اسباب میں کبھی کسی نئے واقعہ کا ظہور نہیں ہوتا، بلکہ وہی ہوتا ہے جو بارہا ہو چکا ہے اور جس کے نظائر موجود ہیں اور چونکہ پچھلے واقعات پڑھے ہوئے، سمجھے ہوئے، سنے ہوئے ہوتے ہیں کہ

فلاں کام کا خاتمہ یوں ہوا تھا۔ لہٰذا جب کوئی ایسا ہی معاملہ سامنے آجاتا ہے تو یقین رکھو کہ اس کا انجام بھی ویسا ہی ہوگا۔"

تاریخ تجربات زندگی کا وہ بلند مینار ہے جہاں سے ماضی کی اقوام وملل کے آغاز وانجام کے اسباب وعلل کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

تاریخ اذکار سے پیدا ہوتی ہے، کردار سے پرورش پائی، زندگی کی شاہراہوں پر اپنے نقش پا چھوڑ کر مستقبل کے لئے رہنمائی کا مقام حاصل کرلیتی ہے۔

عبرت کے لئے تاریخ آموزی ضروری ہے۔ یہ قوم کو آگاہ کرتی ہے کہ کن حالات میں عروج وزوال لازم آتا ہے۔ قرآنِ کریم نے تاریخ اقوامِ عالم سے نصیحت پذیری کی طرف توجہ دلائی۔ اس حقیقت کو مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے قلم اعجاز رقم سے اس انداز سے تحریر فرمایا:

"اصل یہ ہے کہ انسان ماضی کو کسی مقدس دیوتا کی طرح پوجتا تو ضرور ہے۔ مگر اس کے افسانوں کو یاد رکھنے کی بہت کم پرواہ کرتا ہے۔ اس کی اصلی مشغولیت زمانۂ حال میں ہوتی ہے۔ وہ صرف موجود اور حاصل ہی کا متلاشی رہتا ہے۔ البتہ مستقبل بھی اس کے لئے دل کش ہے کیونکہ انسان کی دلفریب امیدیں اور سرمست آرزوئیں مستقبل کے ہاتھ میں ہیں اور اس مخلوقِ غفلت وفراموشی کے لئے امیدوں کا وجود اس قدر دلچسپ ہوتا ہے کہ بسا اوقات زمانۂ حال کی موجود وحاصل مشغولیتوں کو بھی بھلا کر صرف مستقبل ہی کی حسرتوں میں اپنی پوری عمریں بسر کر دیتا ہے۔"

لیکن انسان کی سب سے بڑی غلطی یہی ہے۔ مستقبل پر اسے اختیار نہیں اور حال ہی ماضی کا جانشین اور اس کے ترکے کا وارث ہے۔ پس اس کے لئے جو کچھ سرمایہ فلاح ومراد ہے وہ صرف ماضی ہی کی یاد اور اس کے نتائج وعبرت کے درس وبصیرت میں رکھا گیا ہے اسی لئے نوعِ انسانی کی سب سے بڑی کتابِ ہدایت نے بار بار واقعاتِ گزشتہ تاریخ حوادث اور سوانح ماضیہ کے یاد رکھنے، سوچنے اور سمجھنے کی وصیت کی۔

(۱) قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ (۲) اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ" (الہلال جلد چہارم)

صحیح تاریخ سے عبرت ہوتی ہے۔ عام تواریخ چونکہ غلط قصوں سے لبریز اور صحت سے

سے خالی ہوتی ہیں وہ تاریخ کا صحیح مقصد پورا کرنے میں ناکام ہوتی ہیں۔

تاریخ کی تعریف یہ ہے:۔

ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک ساری دنیا میں جو کچھ ہو چکا ہے، یا جو محسوس کیا گیا یا جو کچھ ہو رہا ہے، یا محسوس کیا جا رہا ہے، تاریخ ہے۔

تاہم یہ حقیقت ہے کہ سب اقوام کی تاریخ قصوں اور روایات سے شروع ہوتی ہے خاص کر ان اقوام کی تاریخ میں یہ عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے جو لکھنے والوں سے زمانہ کے لحاظ سے یا جغرافیائی لحاظ سے بہت دور رہوں۔

فن تاریخ مسلمانوں کا ایجاد کردہ ہے۔ لہٰذا عہدِ اسلام سے پہلے کسی ملک (ضمناً ہزارہ) کی تاریخ کے متعلق کوئی تحریری ثبوت نہیں ملتا۔

ہندو تہذیب کے پاس سوائے دیو مالا کہانیوں کے اور کچھ نہ تھا، جس کو تاریخ سے کوئی نسبت نہیں۔

اس لئے میں نے کوشش کی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، ہزارہ کی تاریخ کے حصوں اور روایات کی پوری چھان بین ہو تاکہ تاریخی واقعات نکھر کر سامنے آجائیں۔ جس سے تاریخ کا صحیح مقصد پورا ہو۔ پڑھنے والوں کے لئے مفید ہو۔ عبرت آموز اور سبق آموز ہو۔ کیونکہ خدا نے قوموں قوموں کے عروج و زوال کو ان کے اخلاقی عروج و زوال کے تابع کیا ہے۔ کسی قوم کی صحیح تاریخ اس نظریہ کو ثابت کرتی ہے۔

ہزارہ کی وجہ تسمیہ اس کا سب سے پرانا نام جو کتب تواریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ اس خطۂ زمین کو ابی ساریز (ABISARES) کے ملک سے معنون کرتا ہے۔

ابی ساریز پونچھ (کشمیر) کا راجہ تھا اور یہ ملک سکندر اعظم نے اس کو دیا تھا۔

ڈاکٹر ائن سٹائن کے خیال میں ہزارہ۔ اراسہ (URASA) ہے اور رش اس سے مشتق ہے۔ میدان رش ابین ایبٹ آباد، کاکول اور میرپور واقع ہے۔

تاریخ ہزارہ، مصنفہ ولیس (WACE) جو ۱۸۷۲ء کے بندوبست ہزارہ کا مہتمم تھا۔ اس کی وجہ تسمیہ میں لکھتا ہے "چونکہ اس علاقہ — میدان ہری پور میں قوم ترک معروف بہ

قارلق کا قبضہ ہے۔ لہٰذا یہ میدان قارلق ہزارہ مشہور ہے۔ حقیقت میں یہ علاقہ ان ترکوں کے نام پر مشہور ہے جن کو امیر تیمور نے خود یہاں چھوڑا۔ یہ ایک ہزار کا لشکر قبیلہ قارلق از قوم ترک تھا۔ لہٰذا اس ضلع کا نام قارلق ہزارہ ہو گیا۔

اس امر کی تصدیق آئین اکبری سے بھی ہوتی ہے، جہاں اس کا حدود اربعہ، موسم کے حالات، زبان اور پھلوں کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ بارھویں صدی عیسوی میں ترکوں کی آبادی وسط ایشیا میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ لوگ بے حد سادہ اور بہادر تھے۔ اس زمانہ میں فوجی افسروں کے عہدے سپاہیوں کی تعداد سے ہوتے تھے۔ مثلاً پنج ہزاری، ہفت ہزاری وغیرہ۔ ایک ہزار سپاہیوں کا دستہ (ہزارہ) جس علاقہ یا قوم سے لیا جاتا تھا اسی نسبت سے اس کو پکارا جاتا تھا۔ جس قوم کے دستہ "ہزار سپاہیوں" کو اس علاقہ میں متوطن کیا گیا وہ قوم قارلق (قارلغ) تھا جس کے نام پر اس علاقہ کا نام "قارلق ہزارہ ہوا۔ زمانہ سے صرف ہزارہ رہ گیا۔ اور معلوم ہے کہ امیر تیمور کی آمد آخر ۱۳۹۸ء میں یہاں ہوئی۔ لہٰذا اس علاقہ کا نام اس وقت سے ہزارہ قارلق (قارلغ) ہوا۔ توزکِ بابری میں بھی یہی نام درج ہے۔ بابر لکھتا ہے:

"نیلاب اور ہزارہ قارلق ہمایوں کی جاگیر میں دیئے۔"

اور جب وہ ہاتھی گکھڑ پر (۹۱۵ھ، ۱۵۱۰ء) میں فتح پا کر کابل کو جا رہا تھا اس موقعہ پر لکھتا ہے کہ:

"ہمایوں کے ملازم قارلوق کے ملک مرزا ملوئے قارلوق بیس چالیس آدمیوں سمیت حاضر ہوا اور دلہ زاک افغانوں کا لشکر بھی آیا۔"

سرجن میجر بیلیو (BELLEW) کتاب "افغانستان کی اقوام" میں لکھتا ہے۔

"یہ کہا جاتا ہے کہ چنگیز خان نے افغانستان میں اپنی فوج کے دس ہزار کے دستہ سے نو دستے ہزارہ (کابل) میں چھوڑے اور ایک ہزار کا دستہ دریائے سندھ سے مشرق کے علاقہ پکھلی میں چھوڑا جب کہ وہ خود موسم سرما سوات میں گزار رہا تھا یعنی یہ ایک دستہ اس طرف کی حفاظت کے لئے تھا جبکہ وہ منگاج[1] کو جانے سے پہلے ہندوستان کے راجہ سے اس کے علاقہ سے گزرنے کی اجازت کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔"

---

[1]: دمنگاج، سوات نزد مینگورہ بر لبِ دریائے سوات۔

تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ منگولوں کا پہلا حملہ ۱۲۲۱ء میں التمش کے عہد میں ہوا۔ ہزارہ (پکھلی) میں ترکوں کی موجودگی اسی وقت سے تھی۔

دوسرا حملہ ۱۲۴۱ء میں بہرام شاہ کے عہد میں ہوا جس میں لاہور فتح ہو گیا۔

عہدِ بلبن میں تیسرا حملہ ۱۲۷۹ء اور چوتھا ۱۲۸۵ء میں ہوا۔ ان حملوں سے منگول، دریائے سندھ اور دریائے جہلم کے درمیانی علاقہ پر قابض ہو گئے۔ ۹۸-۱۲۹۶ء میں منگول جالندھر تک بڑھ آئے لیکن پسپا ہوئے۔ ۱۲۹۹ء میں انہوں نے سیدھا دہلی کا رخ کیا۔ کچھ عرصہ شہر کا محاصرہ رکھا، شہر کو فتح نہ کر سکے۔ لیکن اردگرد کے علاقہ میں لوٹ مار کی۔

۱۳۰۸ء میں ملتان کے قریب دریائے سندھ کو پار کر کے پنجاب پر حملہ آور ہوئے۔ لیکن پسپا ہوئے۔ منگولوں کے کل بارہ حملے ہوئے۔ سندھ، پنجاب اور بلوچستان ان حملوں کی زد میں آئے۔

ان کے بعد تیموری حملے شروع ہوئے۔ تیمور نے میدان ہری پور میں (داخلیا) ہزارہ قارلق کی ایک منگ (ایک ہزار سپاہی) اپنے سلاطین پکھلی کی امداد کے لئے جو پہلے سے یہاں موجود تھے کی حفاظت کے لئے چھوڑی تاکہ ان کا دست و بازو بنے۔

بارھویں صدی عیسوی میں چنگیزی مغلوں (ترکوں) کے حملوں نے اس ضلع میں ہندوؤں کی حکومت کو ختم کر کے رکھ دیا تھا اور تیرھویں صدی میں ہزارہ میں ترکوں کی حکومت (سلاطین پکھلی) قائم ہو گئی۔ اسی حکومت کی امداد کے لئے تیمور نے ۱۳۹۸ء میں قارلق قبیلہ ترک کی ایک رجمنٹ کو یہاں آباد کیا، جس سے اس علاقہ کا نام ہزارہ قارلق (جو بعد میں صرف ہزارہ رہ گیا) پڑا۔

ان ترک سلاطین پکھلی کی حکومت سرحد کشمیر سے اٹک تک تھی۔ ان سلاطین کے عہدِ حکومت کا عروج ۱۴۷۲ء سے شروع ہوا اور ۱۷۰۳ء میں آخری سلطان، سلطان محمود کی وفات کے بعد خاتمہ ہو گیا۔ دیگر اقوام ہزارہ، سواتی اور مختلف قبائل افغان، ہزارہ میں بطور یلغار سلاطین پکھلی کے زوال پر آ کر آباد ہوتے گئے۔

حدود پکھلی

توزک جہانگیری میں پکھلی کا حدود اربعہ یہ ہے۔
"عرض ۲۵ کروہ (کوس)، طول ۳۵ کروہ۔ حد مشرقی کوہستان کشمیر، حد شمالی لکھنور۔ حد جنوبی گکھڑ، اس علاقہ کا رئیس سلطان حسین ہے۔ موضع دھمتوڑ کا رئیس اکبر بادشاہ

---

[1] سلاطین پکھلی کی ذیلی ریاست تھی۔

کے وقت شاہ رخ تھا اور اس کا بیٹا بہادر تھا۔

اکبر بادشاہ کا بیان ہے "بہادر اور سلطان حسین باہم خویشی رکھتے ہیں۔ ان کی زبانی پایا جاتا ہے کہ جب امیر تیمور گورگان ہندوستان کو فتح کر کے واپس آئے تو ان کے بزرگ ان کے پارکاب تھے۔ ان کو اس مقام پر چھوڑ کر یہ مقام عنایت فرمایا اور ذات اپنی تاریخ بیان کرتے ہیں۔ مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کا بزرگ کون تھا اور کیا نام رکھتا تھا۔۔۔ سلطان حسین ستر برس کی عمر کا ہے۔"

مندرجہ بالا تاریخی حوالوں سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے کہ اس ضلع کا نام ہزارہ ترک قوم کے قبیلہ ہزارہ قارلغ سے ہوا۔ چونکہ قارلغ ترک میدان ہزارہ (ہری پور) ہی میں پہلے آباد ہوئے تھے لہٰذا میدان ہری پور ہی اصلاً ہزارہ ہے۔ عہد مغلیہ، دُرّانی اور سکھوں کے عہد میں اسی میدان کو ہی ملک ہزارہ لکھا جاتا رہا۔ باقی اطراف ضلع کو ملک پکھلی، ملک تنول وغیرہ لکھا جاتا رہا۔ اگرچہ عموماً یہ سب علاقے ہزارہ کے نام کے تابع ہی سمجھے جاتے رہے اور اب تو اس کے حدود ہری پور ایبٹ آباد، مانسہرہ، بٹگرام اور الائی کے علاقوں پر حاوی ہے اور ہزارہ کمشنری بن گئی۔ اگرچہ اب بھی تحصیل مانسہرہ اور ایبٹ آباد کے لوگ، میدان ہری پور کو ہی ہزارہ بولتے ہیں۔

ہزارہ

جغرافیائی حدود میں تغیر و تبدل از زمانہ ماضی تا حال بنیادی طور پر موجودہ ضلع کے حدود ہمیشہ برقرار رہیں۔ وقتاً فوقتاً ان کے ساتھ اور علاقے بھی مختلف ادوار تاریخ میں ملحق ہوتے رہے یا الگ کر دئیے جاتے رہے۔ مثلاً چھچھ بنیادی طور پر اس خطہ ارضی کا ایک حصہ ہے اور زمانہ ماضی میں ہزارہ کے تین مشہور حصے رہے۔

۱۔ تخت ہزارہ (موجودہ تحصیل مانسہرہ اور ایبٹ آباد)

۲۔ میدان ہزارہ (تحصیل ہری پور)

۳۔ چھچھ ہزارہ۔ حسن ابدال۔ حضرو کا علاقہ تا اٹک۔

تاریخ ہزارہ بندوبست ۱۸۷۲ء کے مطابق وادئی کاغان کی بلندی ۱۷ ہزار فٹ ہے اور میدان ہزارہ ۱۷ سو فٹ۔ ضلع کی لمبائی ۱۲۰ میل اور چوڑائی ۵۰ میل ہے۔

ہزارہ (ہری پور، ایبٹ آباد، مانسہرہ) ایک تحریر کے مطابق ضلع کا رقبہ تقریباً ۴۵ لاکھ ایکڑ اور آبادی ۲۷ لاکھ کے قریب ہے۔

سکھوں کے زمانہ میں ہزارہ (ہزارہ قارلق) کی حدود مطابق تاریخ ہزارہ (قلمی از دست مہتاب سنگھ مندرجہ ذیل تھیں۔ یہ تاریخ میجر جیمبر لین جو ہزارہ کا پہلا مہتمم بندوبست ۱۸۴۹ء میں مقرر ہوا، کے حکم پر لکھی گئی۔ لکھنے والے نے اپنا تعارف آغاز تحریر میں ان الفاظ سے کرایا۔

"میرا نام مہتاب سنگھ ہے۔ میں موضع مرلی پور پرگنہ ہوگنی پور موہنی نگر متعلقہ ضلع کان پور اور قوم کائستھ سے ہوں۔ پہلے پہل میں کنور کھڑک سنگھ کے پاس نوکر ہوا۔

پانچ سال پرگنہ بلوخاں ساہیوال، دیوان ٹوڈرمل کے ماتحت رہا۔ اس کے بعد دس ماہ سردار فتح سنگھ کے ساتھ منکیرہ میں گزارے۔ اس کے بعد میں سردار ہری سنگھ کا ملازم ہوگیا۔ ۱۸۸۱ بکرمی (۱۸۲۴ء) ہزارہ کے ملک میں مقرر کیا گیا اور اب تک (یعنی ۱۸۵۴ء تک) تیس سال اس ملک میں گزار چکا ہوں اور اس ملک کے جملہ کوائف سے واقف ہو چکا ہوں اور سب حالات کا عینی شاہد ہوں۔"

سرحدات ہزارہ

ہزارہ جس کو قارلق ہزارہ کہتے ہیں، اس کی سرحدات یہ ہیں۔

سرحد غربی: علاقہ سری کوٹ جو دریائے سندھ تک ہے۔ اس پہاڑ کے مغربی دامن میں چار گاؤں، گنڈھی، انبار خانہ (دامر خانہ)، ڈل موہٹ اور چوتھا موضع سری کوٹ جو کہ پہاڑ میں ہے۔

سرحد شرقی: مواضعات چنبہ، نوشہرہ اور بگڑہ جن میں جدون پٹھان بستے ہیں اور ان کا بندر رجوعیہ سے ملحق ہے۔

سرحد جنوبی: گکھڑوں کے ملک سے ملتی ہے۔ ہزارہ کی جنوبی سرحد کے گاؤں بریلہ، کھنڈو، پنجو، اور کالی تراڑ ہیں اور خان پور کی سرحد پر ہزارہ کے گاؤں باندھی نیکو، رانڑی واہ اور حطار ہیں۔

سرحد شمالی: تا ڈنہ تنول، موضع آتولی، تیتر اور بنڈ ہاشم خان حد ہزارہ میں ہیں۔

سرحد شرقی: حد ملک کرڈال ہے جس میں ناڑہ وستوڑہ کے مواضعات ہیں۔

نوٹ: یہ حدود میدان ہزارہ کے موسوم ہزارہ قارلق کی ہیں۔ اصلاً اسی علاقہ کا یہ نام تھا۔ اب بھی مانسہرہ اور ایبٹ آباد کے لوگ ہری پور کے علاقہ کو ہزارہ بولتے ہیں۔

لیکن ضلع ہزارہ جن حدود پر اب مشتمل ہے اس خطہ جنت نظیر کی جغرافیائی حدود مختلف اوقات زمانہ میں پھیلتی اور سکڑتی رہی ہیں۔ لیکن عام طور پر یہ حدود کاغان کی برف پوش بلندیوں سے شروع ہو کر بتدریج ڈھلوان میں اترتی ہوئی میدان ہزارہ (تحصیل ہری پور) سے ہوتی ہوئی چھچھ کے نشیب و زرخیز علاقہ تک پہنچتی ہے۔

بہ حیثیت مجموعی زمانہ قدیم سے اس جغرافیائی وحدت کی حدود کم و بیش یہی رہی ہیں۔ ان کی قدرتی تقسیم یوں ہے اور یہی زبان زد عام ہے۔

۱۔ تخت ہزارہ: (موجودہ مانسہرہ اور ضلع ایبٹ آباد کی تحصیل ایبٹ آباد۔)

۲۔ میدان ہزارہ: (موجودہ تحصیل ہری پور۔)

۳۔ چھچھ ہزارہ: (موجودہ تحصیل کیمبل پور۔ شاہراہِ راولپنڈی پشاور سے شمال کی طرف کا علاقہ تا کنارۂ دریائے سندھ)

جغرافیائی لحاظ سے یہ خطۂ زمین پنجاب کا ایک حصہ اور تنظیمی لحاظ سے بھی قدیم سے بھی اسی صوبہ کے ساتھ ملحق رہا۔ مگر اپنی انفرادی اور جغرافیائی حدود سے متمیّز رہا ہے۔ لیکن انتظامی سہولت کے اغراض سے اس کے مختلف حصوں کو قریب کے انتظامی حلقوں سے وابستہ کیا جاتا رہا۔ کبھی چھچھ اور میدان ہزارہ (بمعہ خان پور، ناڑہ، بکوٹ، بوئی) فتح پور باری (موجودہ راولپنڈی) سے متعلق رہا اور کبھی حاکم اٹک (مقیم ضلع اٹک) کے ماتحت رہا۔

تخت ہزارہ (موسوم بہ کشمیر پائیں ہو کر) سرکار کشمیر سے متعلق رہا۔ اور کبھی سرکار پکھلی کے نام سے جداگانہ حیثیت سے ابھرا۔

قدیمی تاریخ

دوسری صدی عیسوی تا ساتویں صدی عیسوی تک یہ خطہ ہندوؤں کے زیر حکومت رہا اور مانگل مرحوم اس کا پایۂ تخت رہا اور اس کی حدود دریائے سندھ تک رہیں۔

مغلیہ دورِ حکومت اور درانیوں کے عہد میں بھی کم و بیش یہی حدود رہیں۔ سکھوں کے عہد میں یہ حدود سمٹ گئیں اور متذکرہ بالا حدود (بیان کردہ مہتاب سنگھ) ہی ہزارہ کے نام سے موسوم رہا۔ جب انگریزوں نے اس خطہ پر ۱۸۴۹ء میں اقتدار حاصل کر لیا تو اس کی حدود اٹک اور راولپنڈی تک ہو گئیں۔ لیکن ۱۹۰۱ء میں انگریزی حکومت نے اپنے سیاسی اغراض و مقاصد کے تحت اس خطۂ جنت نظیر کو پنجاب سے الگ کر کے اٹک پار کے پشتون علاقوں (صوبہ سرحد) سے وابستہ کر دیا۔

موجودہ حد بندی

حکومتِ پاکستان نے ۱۹۷۶ء ۱۹۷۷ء میں ضلع کوہستان (سابق علاقہ غیر) کو ایک ضلع بنا کر ہزارہ کے ساتھ شامل کر دیا اور ضلع ہزارہ کو ڈویژن کا درجہ دے دیا۔ سابق ضلع ہزارہ کی تین تحصیلوں میں سے ضلع مانسہرہ اور ضلع ایبٹ آباد

(مشتمل بر تحصیل ایبٹ آباد و تحصیل ہری پور) کو ایک دوسرا ضلع بنادیا ہے۔ گویا اب ہزارہ سب ڈویژن میں تین ضلعے ہیں۔ ضلع کوہستان، ضلع مانسہرہ، ضلع ایبٹ آباد۔

ضلع ہزارہ میں آباد اقوام کی جائے سکونت

پرانے زمانہ میں دوآبہ دریائے سندھ و جہلم بمعہ پنجاب راجگانِ ہند کے ماتحت تھا اور اس علاقہ (ہزارہ) میں موجودہ جگہوں کے سنسکرت نام اس امر کی شہادت دیتے ہیں۔ مثلاً گندگر (علاقہ تار خیلی میں)، مہابن (جدون علاقہ میں) مانسہرہ، مانک رائے، راجکوٹ (گندگر پہاڑ جس کو تار خیلی کافر کوٹ کہتے ہیں)، راجدھان رانی داہ (علاقہ خانپور) اوراوگی اوگرہ (تحصیل مانسہرہ) علاقہ خانپور سے جب خاتمہ ہندو راجگان کا ۷۵۶ء میں ہوا تو اس کے بعد سے دخل قوم گکھڑ کا پایا جاتا ہے۔ جلال الدین اکبر بادشاہ اور جہانگیر بادشاہ کے وقت علاقہ ڈھونڈ و کرڑال بھی گکھڑوں کے علاقہ میں شامل تھا۔ اور رجوعیہ کا علاقہ داخل کرڑال ہو کر گکھڑوں کے متعلق سمجھا جاتا تھا اور علاقہ خانپور، دناہ، ناڑہ، بکوٹ بوئی متعلق فتح پور بابری (موجودہ راولپنڈی) گکھڑوں کے زیر حکومت تھا اور صوبہ لاہور سے متعلق تھا اور ہزارہ جس میں ظاہراً علاقہ جات ترین، ترک، دلازاک وشنگرھی، اتمان زئی وغیرہ شامل تھے۔ اٹک بنارس سے متعلق کر رکھا تھا۔ گویا ہزارہ کے تین ٹکڑے تھے۔

پہلا ٹکڑہ: ضمیمہ صوبہ کشمیر، سرکار پکھلی بمعہ علاقہ دھمتوڑ (جدون)، وتناول۔

دوسرا ٹکڑہ: متعلق صوبہ لاہور، پرگنہ فتح پور بابری یعنی راولپنڈی (علاقہ گکھڑ، خان پور دناہ، ناڑہ، بکوٹ بوئی۔

تیسرا ٹکڑہ: متعلق دوآبہ سندھ ساگر علاقہ اٹک پرگنہ ہزارہ، علاقہ جات ترین، ترک دلازاک، شنگرھی، اتمان زئی وغیرہ۔

۷۵۵ء سے ۱۷۳۲ء تک ایام سلطنت چغتائی میں تو یہ صورت رہی اور خراج ہائے مقررہ وقت پر سلطنت میں ادا کرتے رہے۔ پھر جب ۱۷۴۳ء میں نادر شاہ کا غلبہ ہوا تو یہ ملک اس کی حکومت کے متعلق ہو گیا تو اس وقت بھی ایسا ہی حال رہا۔ حکومت نادر شاہ سے احمد شاہ درانی کو نصیب ہوئی اور چونکہ وہ پٹھان تھا، لہٰذا اس ملک میں قوم افغان کو زیادہ غلبہ ہو گیا۔ پکھلی میں

صواہتی اور رجوعیہ، دھمتوڑ وغیرہ میں جدون اور علاقہ جات تناول متعلقہ پکھلی میں تنولی آ گئے اور گکھڑ بھی کچھ کمزور ہوئے، ڈھونڈ اور کرڑال نے بھی ایک قسم کی آزادی ان کی حکومت سے حاصل کر لی۔ رفتہ رفتہ ملک کی صورت کی تفصیل قوم وار حسب ذیل ہو گئی۔

۱۔ تارخیلی۔ کھڑی وگندکر۔

۲۔ مشوانی۔ سری کوٹ۔

۳۔ اتمان زئی۔ تربیلہ وخالصہ (علاقہ کھلابٹ۔ درگڑی وغیرہ)

۴۔ تنولی۔ کولائی۔ بدہنک، کچھی، بیرہان، شیروان، گھڑیال۔ شنگڑی۔

۵۔ اقوام متفرق میدانِ ہزارہ۔

i۔ ترین۔ جاگل، کوٹ نجیب اللہ، کنڈی کاہل، ہری پور۔

ii۔ دلازاک، سرائے صالح۔

iii۔ ترک، مانکرائے۔

iv۔ قوم پنی پنیاں، بھیرہ وملحقات۔

۶۔ گکھڑ، خان پور۔

۷۔ جدون، بگڑہ، رجوعیہ، دھمتوڑ، مانگل۔

۸۔ قوم صواہتی، ضلع مانسہرہ اور ضلع کوہستان میں آباد ہیں۔

مختلف اقوام کی ہزارہ میں آمد کا زمانہ، تاریخ کی روشنی میں

مسلمان اقوام کی آمد سے پہلے یہاں ہندوؤں کی آبادی تھی۔ جن کا بقایا عہد انگریزی تک شہروں اور قصبوں میں کافی تعداد میں موجود تھا، مگر دیہات میں کم تھا۔ سکھوں کے عہد اور انگریزی عہد میں سکھ بھی کافی تعداد میں اس ضلع میں آکر آباد ہوئے۔ تجارت پر ہندوؤں اور سکھوں کا مکمل قبضہ تھا اور بعض مقامات شہروں اور دیہاتوں میں سربراہ بھی یہی تھے۔ یہاں تک کہ موضع لکھنیال (نزد سیرہاں، بگڑہ)، گاؤں کا ایک نمبردار ہندو تھا۔

علم اور دولت کی وجہ سے ان کا حکومت انگریزی کے وقت کافی عمل دخل تھا۔ ان کی گرفت

مالی اعتبار سے مضبوط اور سیاسی اعتبار سے بہت مؤثر تھی۔
پاکستان بن جانے کے بعد مجموعی طور پر ہندو اور سکھ ہندوستان چلے گئے اور سوائے دربند علاقہ ریاست امب کے ان کا نام ونشان نہ رہا۔

مُسلم اقوام ہزارہ

ا۔ گوجر، کرڑال اور ڈھونڈ اس ضلع کی قدیم ترین اقوام ہیں۔ گوجر تو اس ضلع کے قدیمی باشندے ہیں اور یہ کہنا چاہیے کہ ہندوؤں کے زمانہ سے اصلی باشندے یہی ہیں۔
قوم کرڑال و ڈھونڈ بھی قدیمی باشندے ہیں۔ لیکن ان دونوں اقوام کی آمد کا سن و سال تاریخی طور پر حل نہ ہو سکا کہ اگر یہ باہر سے آئے ہیں تو کب آئے۔ جن اقوام کی آمد تاریخ سے معلوم ہو سکی وہ یہ ہیں۔

گکھڑ
یہ ایرانی الاصل ہیں۔ ان کی آمد کے متعلق دو اقوال ہیں۔
ا۔ وہ گیارھویں صدی عیسوی میں سلطان محمود غزنوی کے ساتھ آئے۔
۲۔ زیادہ قرین قیاس قول یہ ہے کہ یہ قبیلہ دارا یوش اول شہنشاہ ایران کے عہد میں، ایران سے ترکِ سکونت کر کے، پوٹھوہار (ضلع راولپنڈی) میں آکر آباد ہوئے۔
۵۱۸ ق م میں تمام وادئ سندھ تا سرہند، ایرانی سلطنت کا بیسواں صوبہ تھا۔ لہٰذا تاریخ فرشتہ کے مطابق، ان کا انند پال کے لشکر میں شامل ہو کر محمود غزنوی کے خلاف لڑنا باعث حیرانی نہیں ہو سکتا۔ انند پال اور اس کے جانشینوں کی شکست کے بعد یہ قبیلہ یقیناً مسلمان ہو گیا ہوگا۔ بہرحال اس نظریہ کے لئے حتمی شہادت موجود نہیں۔ لیکن یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ شہاب الدین محمد غوری (۱۱۷۳ تا ۱۲۰۶ء) کے عہد میں گکھڑ قبیلہ پوری آب و تاب سے صفحہ تاریخ پر چمکنا شروع ہو گیا تھا۔

آوان
"تاریخ جہلم" (مطبوعہ ۱۸۷۰ء) کے مطابق یہ قوم غالباً ۱۶۲۸ء میں ہرات سے آکر ضلع جہلم کے مغربی حصہ میں آباد ہو گئی۔
مولوی محمد عثمان صاحب فاضل دیوبند، گورنمنٹ کنٹریکٹر، کی تحقیق کے مطابق آوان

تیرھویں صدی عیسوی کے وسط میں اپنے وطن (غور) سے آکر پنجاب اور ہزارہ میں آباد ہوئے اور وہ ان کو غوری قوم کا ایک حصہ کہتے ہیں۔ سلطان محمد غوری نے جب ہندوستان فتح کر لیا اور کھوکھروں سے علاقے خالی کرالئے تو آدانوں کو اس علاقہ میں بھکر تا اٹک اور اٹک تا ملتان آباد کر دیا۔ چنگیزی مغلوں کے حملوں کے وقت، اس علاقہ کے آوان محفوظ علاقوں مثلاً ہزارہ میں آکر آباد ہو گئے۔

جب تیموری ترک فوجیں ۸۰۰ھ، ۱۳۹۸ء میں ہزارہ میں آئیں تو آوان ہزارہ میں موجود تھے۔ بابا سجاول رح اغلباً بادشاہ اورنگ زیب کے عہد میں یہاں آئے۔

بانڈھی ڈھونڈاں کے آوان چار سو سال سے یہاں آباد ہیں۔ مرحوم مانگل کے دو خاندان ایسے بھی ہیں جو مغلیہ دور سے پہلے یہاں آباد تھے۔

تُرک یہ قوم پہلے پہل چنگیزی عہد (تیرھویں صدی) میں اس ضلع میں آئی۔ قارلق ترک جن کے نام پر اس ضلع کا نام "قارلق ہزارہ" ہوا اس ضلع میں چودھویں صدی میں امیر تیمور کے ساتھ آئے۔ اس قوم نے بہت عروج پایا۔ اس کی سلطنت موسوم بہ سلطنت پکھلی، جس کی حدود کشمیر سے اٹک تک تھیں، تین سو سال تک حکومت کی، جو آخری سلطان، سلطان محمود کی شہادت سے ختم ہو گئی۔

دلازاک یہ قوم شاندار ماضی کی حامل ہے۔ اکبر بادشاہ کے چچا مرزا الغ بیگ حاکم کابل جو (۱۴۶۸ء سے ۱۵۰۲ء قائم رہا)، کے ہاتھوں جب یہ قوم قتل عام سے دوچار ہوئی تو وہاں سے نکل کر ننگرہار (علاقہ جلال آباد) میں آئی۔ بعد میں یہ دوآبہ (علاقہ چارسدہ ضلع پشاور) میں آکر آباد ہو گئے۔

بابر بادشاہ کی آمد (۱۵۲۵ء) سے بہت پہلے اس قوم کو یوسف زئی اور مندڑ کے ہاتھوں شکست ہوئی اور ضلع مردان ان سے خالی ہو گیا۔ لیکن پشاور کے جنوبی حصہ میں بابر بادشاہ کی آمد پر موجود تھے۔

اس کے بعد وہ چھچھ ہزارہ میں آ گئے۔ لیکن ۰۸-۱۶۰۷ء میں ان کو جہانگیر بادشاہ نے جلاوطن کر کے لاہور کی طرف بھیج دیا۔ ۱۶۷۲ء میں بادشاہ نے ان کو ہزارہ جانے کی اجازت

دے دی اور وہ یہاں آکر آباد ہو گئے۔ ان کے خان صالح محمد خان نے سرائے صالح کا گاؤں آباد کیا۔

تنولی ایک مشہور روایت کے مطابق یہ قوم سلطان سبکتگین کے عہد میں درۂ تانال (غزنی) سے سوات میں آئی اور بعد میں پندرھویں، سولھویں صدی عیسوی کے شروع میں علاقہ تناول میں آکر آباد ہو گئی۔

صواتی سولھویں صدی کے آخر اور سترھویں صدی (عیسوی) کے شروع میں جب یہاں ترکوں کی حکومت تھی تو یہ قوم جلال بابا کی زیر سرکردگی میں اس ملک میں آئی اور اپنے موجودہ مستقر میں آباد ہو گئی۔

سادات ہزارہ میں ان کی دو شاخیں ہیں۔

۱۔ سادات ترمذی (اولاد سید جلال بابا) جن کے جدِ اعلیٰ پیر بابا، سید علی بنیری رح (۱۵۰۲-۱۵۸۳ء) ہیں۔ یہ صواتی قوم کے سربراہ ہو کر فاتحانہ رنگ میں یہاں آئے۔

۲۔ سادات گیلانی۔ یہ مختلف اوقات میں عموماً پٹھان قبیلوں کے ساتھ بطور ہادی و مرشد آئے۔ ان کا زمانہ آمد سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی (پٹھانوں کی آمد کا زمانہ) پر محیط ہے۔

پنّی پٹھان یہ قوم، افغانوں کی یلغار کے زمانہ سے بہت پہلے بطور تجار اپنے وطن سے نکلی اور ہندوستان میں داخل ہو کر انتہائی جنوب تک پہنچے۔ وہاں اقتدار حاصل کر لیا۔ وہاں ان کی ایک بہت بڑی ریاست (ریاست کرنول، صوبہ دکن) تھی جو انگریزوں کے عہد تک موجود رہی۔ ہندوستان سے اس قوم کا ایک قافلہ، سترھویں صدی عیسوی کے نصف میں غور غشتی (علاقہ چھچھ) میں آیا اور وہاں سے اٹھ کر موجودہ جائے اقامت (علاقہ پنیاں۔ تحصیل ہری پور) میں آکر قابض ہو گیا۔

جدون یہ قوم پنّی کے ہم جدی ہیں اور پنّی قوم کے ہمراہ یہ بھی علاقہ غور غشتی میں آئے۔ وہاں سے اٹھ کر علاقہ مہابن (تحصیل صوابی، ضلع مردان) چلے گئے اور وہاں آباد ہو گئے۔ ان کا ایک قبیلہ وہاں سے آکر تنولیوں کو بے دخل کر کے موجودہ مستقر (تحصیل ایبٹ آباد) پر قابض ہو گیا۔

اتمان زئی اس قوم کے دو قبیلے یہاں آباد ہیں۔ ۱۔ طاہر خیلی۔ ۲۔ سید خانی۔ ان کی یہاں آمد، دیگر افغانوں کی طرح بطور یلغار نہیں ہوئی۔ بلکہ ان کے چھوٹے

چھوٹے گروہ یا چند افراد وقتاً فوقتاً یہاں آکر آباد ہوتے رہے۔

سید خانی - غالباً سکھوں کی حکومت کے آغاز سے کچھ عرصہ پہلے اٹھارھویں صدی کے آخر، انیسویں صدی کے شروع میں علاقہ کھلابٹ میں آ گئے۔

طاہر خیلی - دُرّانیوں کے عہد (اٹھارویں صدی کے تیسرے یا چوتھے عشرے) میں موضع ٹوپی اور کوٹھہ (تحصیل صوابی، ضلع مردان) سے آکر علاقہ تربیلہ اور کھڑی (کوہ گندگر کا مغربی دامن) میں آباد ہوئے۔

بنبہ | سولھویں صدی عیسوی میں علاقہ بدخشاں سے شمالی راستہ سے آکر علاقہ مظفر آباد اور بوئی (دریائے کنہار کے دونوں طرف) میں آباد ہو گئے۔

مشوانی | ایک روایت کے مطابق یہ دسویں صدی عیسوی یا اس سے قدرے بعد بہ عہد سلطان محمود غزنوی اس ملک میں آئے۔ لیکن صحیح تر یہ بات ہے کہ یہ سید محمد گیسو دراز کی اولاد ہیں اور وہ چودھویں صدی کے آخر یا پندرھویں صدی کے شروع میں وارد علاقہ کابل ہوئے اور ہندوستان تشریف لے گئے۔ ان کے ورود دکن کی تاریخ ۸۱۵ھ، ۱۴۱۳ء ہے اور یہی زمانہ یا کچھ عرصہ بعد مشوانی قوم کا اس جگہ آنے کا ہو سکتا ہے۔

ترین | ہزارہ گزیٹر، ۱۹۰۷ء کے مطابق یہ قوم گوجر (جو اس علاقہ پر قابض تھی) کی دعوت پر اس ملک میں آئے۔ سنہ آمد کا ذکر نہیں۔

ایک روایت کے مطابق اس قوم کا پہلا شخص جو اس ملک میں آیا وہ شیر خاں تھا، جو ۱۶۳۱ء میں آیا۔

بلغادری | یہ قوم اب بھی پار دریائے سندھ کے علاقہ میں موجود ہے۔ لیکن ضلع ہزارہ میں اس قوم کے چند گھر ہی ۱۸۷۲ء میں یہاں علاقہ طاہر خیلی (مواضعات جموں اور بھائی) میں آباد تھے۔ اب یہ قوم یہاں گمنام ہو گئی ہے۔

شلمانی | (سلیمانی - ایک مؤرخ کے مطابق یہ عربی النسل ہیں۔) بندوبست ہزارہ ۱۸۷۲ء میں تحریر ہے کہ تربیلہ میں پرانی آبادی شلمانیوں کی ہے۔ اتمان زئی ان کے بعد اس علاقہ میں آئے۔ گویا یہ قوم سترھویں صدی عیسوی سے پیشتر یہاں

آباد تھی۔ اب اس کی خاص آبادی موضع بھیلہ (جو اب زیرِ ڈیم تربیلہ ہے) میں تھی۔

تواریخ حافظ رحمت خانی کے حواشی از خان روشن خان ساکن نواں کلی مردان تحریر کرتے ہیں کہ یہ افغان ہیں اور ان کی نسبت شمالی شام کے ایک علاقے کی طرف ہے۔ شلمان، لبنان کے قریب ایک پہاڑ ہے۔

اقوامِ ہزارہ

(ان کے موجودہ مساکن اور اس کا تاریخی پس منظر)

پاک و ہند پر بحری حملوں سے پہلے جتنے حملے بھی اس ملک پر ہوئے وہ وسطِ ایشیا کے ان دروں سے ہوئے جو موجودہ صوبہ سرحد کے مغربی پہاڑوں میں ہیں۔ ان میں زیادہ تر حملے درہ خیبر سے ہوتے رہے۔ ان طوفانی سیلابوں کا رخ گو پاک و ہند کے مرکز کی طرف رہا۔ لیکن ان کی لہریں ضلع ہزارہ کی ناقابلِ تسخیر چٹانوں سے بھی ٹکراتی رہیں۔ لہٰذا لبِ ساحل (یعنی دامنِ کوہ اور اس کی وادی) پر اپنے اثرات بہ صورت افراد حملہ آور قوم چھوڑ جاتی رہیں۔ ان اقوام کی موجودہ جائے سکونت سے ان کی گزشتہ یلغاروں اور ان کی عصری تاریخ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ان حملہ آور اقوام کے سیلاب کے ریلے نے مقامی باشندوں کو آگے دھکیلا اور ان کی جگہ پر خود اقامت گزیں ہو گئے۔ اسی طرح پر نئے حملہ آور نے اپنے پیش رووں کو آگے دھکیلنے کا کام جاری رکھا اور خود ان کی جگہ پر قیام کرتے رہے۔ قوموں کی اس نشست و برخاست کی مختلف کڑیوں کا سلسلہ ہزارہ کے شمال مشرقی سرحد کے پہاڑوں سے لے کر جنوب مغرب کے میدانوں یا چھچھ ہزارہ تک پھیلا ہوا دیکھا جا سکتا ہے۔ زمانہ قدیم کی اقوام اب ضلع کے انتہائی شمال مشرقی مقامات پر ہیں اور ان سے بعد کی اقوام میدان ہزارہ میں درجہ بدرجہ پھیلی ہوئی ہیں۔

ان تاریخی واقعات اور مختلف اقوام کے موجودہ جائے رہائش پر مزید غور کرنے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ انسانی تاریخ کے مختلف ادوار اور ان کی تہذیب و ترقی کا عکس ضلع ہزارہ کی انتہائی سرحدوں (شمال مشرق اور جنوب مغرب) کے درمیان دیکھا جا سکتا ہے۔

چوپانی اور گلہ بانی سے زراعت و تجارت کے درجات کا سلسلہ شمال مشرق کی بلندیوں سے

بتدریج جنوب مغرب کے میدانوں تک اترتا اور پھیلتا ہوا نظر آسکتا ہے۔

جو قدیم قومیں پرانی تہذیب کی حامل تھیں ان کا پیشہ گلہ بانی اور چوپانی تھا۔ وہ شمال مشرق کی انتہائی سرحد تک دھکیلی جاتی رہیں اور بعد میں آنے والی اقوام جو نسبتاً ترقی یافتہ تھیں وہ سلسلہ وار جنوب مغرب کے میدانوں میں ڈیرے ڈالتی رہیں۔

اس تاریخی حقیقت (بے شمار قوموں کی آمد و اقامت) نے لوگوں میں یہ غلط خیال پیدا کر دیا ہے کہ اس ضلع میں چونکہ ہزارہا اقوام آباد ہیں لہٰذا اس ضلع کی وجہ تسمیہ یہی سمجھ لی گئی، یعنی "ہزاروں اقوام کا وطن"۔

نوٹ۔ مندرجہ بالا کوائف سابق ضلع ہزارہ سے متعلق ہیں۔ اب جبکہ کوہستان کو ملاکر ہزارہ ڈویژن بنادیا گیا ہے تو ان کوائف میں ضلع کوہستان کے قبائل کے متعلق کوئی تاریخی مواد میرے سامنے نہیں آیا۔ عام طور پر ضلع کوہستان میں سواتھی اور کوہستانی قوم آباد ہے۔ سواتھی قوم تو سابق ضلع ہزارہ کی سواتھی قوم ہے اور کوہستانی قوم کی خاص تاریخ معلوم نہیں ہوسکی۔ ان کے مختصر سے حالات کسی دوسری جگہ تحریر کئے گئے ہیں۔

راجہ رسالو

(ہزارہ کی ایک افسانوی شخصیت)

اس ضلع میں راجہ رسالو کے متعلق بہت مشہور روایات ہیں۔ اس کے متعلق عوامی گیتوں کا بھی کافی حصہ اب تک موجود ہے، جن سے اس کے مختلف تاریخی کارناموں پر روشنی پڑتی ہے۔

راجہ رسالو راجہ سالباہن کا بیٹا تھا۔ راجہ سالباہن نے اب سے قریباً دو ہزار سال پہلے شمالی ہند کے ساکا حملہ آوروں کو شکست دے کر سیالکوٹ میں اپنی سلطنت قائم کی۔ اس کے باپ کی حکومت راولپنڈی کے علاقہ تک قائم تھی۔ اس کا بیٹا رسالو قسمت آزمائی کے لئے شمالی سرحد کی طرف نکلا۔ راجہ سرکپ (ٹیکسلا) سے بھی نبرد آزما ہوا۔ وہاں پر کھنڈرات میں وہ مقام بھی دریافت ہوا جس جگہ راجہ رسالو نے راجہ سرکپ کے ساتھ چوپڑ کا کھیل کھیلا تھا اور ستر حسین و جمیل دوشیزاؤں کو اپنی بہادری سے مرعوب کیا تھا۔

راولپنڈی اور ٹیکسلا کے درمیان ایک مقام سنگ جانی آتا ہے۔ اس کا بھی ذکر عوامی گیتوں میں ہوا ہے اور راجہ ہودی کا بھی، جس کا دارالحکومت ہودی نگر اٹک کے جنوب میں دریائے سندھ پر واقع تھا۔ اس سے راجہ ہودی کے باپ راجہ اٹکی مل کا سراغ ملتا ہے جس کی سلطنت اٹک سے جلال آباد (افغانستان) تک پھیلی ہوئی تھی۔

ضلع ہزارہ میں راجہ رسالو کے متعلق بہت مشہور روایات ہیں اور اس کا زمانہ دوسری صدی عیسوی کا بیان ہوتا ہے۔ علاقہ کنڈی کاہل میں جو چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں۔ روایت کے مطابق یہ پتھر اس کی فوج نے جمع کئے تھے۔ سربن پہاڑ (ایبٹ آباد) میں اس کا غار جہاں وہ شکار کے دوران آرام کیا کرتا تھا اب تک موجود ہے۔ گندگر پہاڑ میں اس نے راکشسوں (دیوؤں) سے مقابلہ کیا تھا۔ یہ کہانی اس طرح ہے کہ ایک دن جب وہ میدان رجوعیہ میں سو رہا تھا تو اس کی غیر حاضری میں اس کی بیوی جو گندگر کے پہاڑ میں تھی۔ ایک دیو سے محبت کے انداز میں راز و نیاز کر رہی تھی۔ رانی نے ایک مینا اور ایک طوطا پال رکھے تھے۔ اس رانی اور دیو کی یہ حرکات ان کو پسند نہ آئیں۔ مینا نے

رانی کو ملامت کی۔ اس پر رانی نے مینا کی گردن مروڑ دی۔ وہ وہاں مرگئی۔ طوطا یہ حال دیکھ کر اڑ گیا اور رجوعیہ میں آکر اپنے پَر دریائے دوڑ کے پانی میں ڈبو کر سوتے ہوئے راجہ رسالو کے چہرہ پر پانی چھڑکا جس سے راجہ جاگ پڑا۔ طوطے نے اس کی بیوی کی بے وفائی کا قصہ اس کو سنایا۔ یہ سنتے ہی راجہ رسالو اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر سیدھا گندگر پہنچا۔ اس کے گھوڑے کے سموں کے نشان اب بھی نارڑا سید خانی (نزد موضع داڑی کھلابٹ) کے نالہ میں موجود ہیں۔ اس نے بیوی اور دیو کو محبت کرتے دیکھ لیا۔ بیوی کو وہیں قتل کر دیا۔ لیکن دیو بھاگ کر ایک غار میں چلا گیا۔ راجہ دوڑ کر غار کے منہ پر پہنچا لیکن دیو اندر جا چکا تھا۔ راجہ نے غار کا منہ ایک پتھر سے بند کر دیا اور اندر کی طرف اپنے تیر سے پتھر پر اپنی تصویر جس میں اس نے کمان پر تیر چڑھایا ہوا نقش کیا تھا بنا دی۔ جب کبھی وہ دیو باہر آنے کی کوشش کرتا تو راجہ رسالو کی تصویر دیکھ کر شور کرتے ہوئے واپس غار کے اندر دوڑ جاتا تھا۔ لوگ عام روایت کرتے ہیں کہ بہت مدت تک گندگر پہاڑ سے ایک خوفناک آواز وقفہ سے سنائی دیتی رہتی تھی۔ میجر ایبٹ کے بیان کے مطابق یہ انیسویں صدی کے پہلے تیس سالوں تک یہ آواز سننے کا قصہ لوگوں نے اس سے بیان کیا۔

اس واقعہ کی تصدیق تزک جہانگیری[۱] سے بھی ہوتی ہے۔ جہانگیر کے دورہ ہزارہ و کشمیر کے متعلق درج ہے۔ جہانگیر پگلی (پکھلی) اور دھنتوڑہ (دھمتوڑ) کے راستہ کشمیر کی طرف روانہ ہوا۔ حسن ابدال میں دو دن قیام کیا۔ اس منزل گاہ میں ایک بہتا ہوا چشمہ، ایک آبشار اور ایک نہایت نفیس حوض موجود ہے۔ (یہ واہ نزد حسن ابدال میں ہے۔ جہاں جہانگیر نے خوبصورت آرام گاہ بنائی، جو آج بھی موجود ہے۔ مؤلف)

سلطان پور میں پڑاؤ ڈالا جو حسن ابدال سے پانچ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس علاقہ کے لوگوں سے سننے میں آیا کہ برسات کے دنوں کے بعد جب آسمان پر بادلوں کا نام و نشان اور بجلیوں کے کوئی آثار نہیں ہوتے کبھی کبھی نزدیک کے پہاڑ (گندگر) سے بادلوں کی گرج جیسی آواز نکلتی رہتی ہے جس کی وجہ سے اس پہاڑ کا نام گرج گڑھ رکھا گیا ہے۔ یہ آواز پہاڑ سے سال دو سال کے وقفہ کے بعد نکلتی ہے۔ میں نے یہ بات حضرت[۲] کی زندگی میں ان کی محفلوں میں بھی متعدد مرتبہ سنی تھی۔

---

[۱] ۔ تزک جہانگیری اردو ص ۵۹۵ [۲] اکبر بادشاہ۔

چونکہ عجائبات سے خالی نہیں۔ اس لئے تحریر کر دی۔ صحیح علم اللہ تعالیٰ کو ہے۔
نوٹ: جہانگیر تخت نشینی کے چودھویں سال اول اول کشمیر آیا۔

ہزارہ مختلف ادوارِ حکومت میں

(ساتویں سے بارھویں صدی عیسوی تک)

چینی سیاح ہیون سانگ جو اس ملک میں ساتویں صدی عیسوی میں آیا۔ اس نے ہزارہ کے نام کا ذکر بہ حیثیت ملکِ وِد۔ لا۔ شی کے کیا ہے اور اس کو کشمیر کے ماتحت اور اس کے شمال مغرب میں بیان کیا ہے۔ اس علاقہ کا دار السلطنت مانگل تھا جو مانگل ندی پر واقع تھا۔ اس وقت اور بعد میں بھی مانگل ایک بڑا شہر تھا۔ اگرچہ وہ شہر اب نابود ہو گیا ہے پھر بھی اس کی دیواروں کے نشانات اب بھی موجود ہیں۔ ہیون سانگ سے صدیوں بعد اراشہ کی سلطنت (یعنی ہزارہ موسوم برش) کا تعلق کشمیر سے رہا۔ اس کی تصدیق کلہانا کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ بادشاہ شنکر اورمان جب ۹۰۲ء میں اس ملک سے گزر رہا تھا تو باشندگان ہزارہ نے اس پر حملہ کر دیا اور ایک تیر جو پہاڑ کی چوٹی سے اس پر پھینکا گیا وہ اس کی گردن میں لگا۔ یہ ضرب مہلک ثابت ہوئی۔ اور جبکہ وہ اپنی فوج کے ساتھ واپس کشمیر جا رہا تھا تو راستہ ہی میں مر گیا۔ لیکن اس کی موت کو فوج سے اس وقت تک پوشیدہ رکھا گیا جب تک وہ وادی جہلم میں نہ پہنچی۔ اس کے بعد کلہانا لکھتا ہے کہ ۱۰۶۳ تا ۱۰۸۹ء میں کلاشا بادشاہ کشمیر نے اس ملک پر قبضہ کر لیا اور بعد میں ہزارہ کا راجہ ابھیایا بمعہ دیگر ماتحت راجاؤں کے مہاراجہ کلاشا کے دربار میں حاضر ہوئے۔ راجہ ابھیایا کی بیٹی مہاراجہ ہرسا کے بیٹے بھوج سے بیاہی گئی۔

اس کے بعد ۱۱۱۲ — ۱۱۲۰ء مہاراجہ شسالا نے اورشہ پر حملہ کیا اور خراج مقرر کیا۔ ۱۱۲۸ء ۱۱۴۹ء مہاراجہ دیوتیا نے والیٔ اورشہ کو شکست دی۔ اس کے ساتھ کلہانا لکھتا ہے۔ اتیوگرہ پور (بقول بطلیموس اورشہ اور بہ تحقیق ڈاکٹر سٹائن موجودہ اگرور) جو ایک مضبوط قلعہ تھا مہاراجہ دیوتیا نے فتح کر لیا۔ اس علاقہ میں پرانے قلعوں کے جا بجا آثار، جن کے متعلق روایات ہیں کہ جنوں نے

طاقتور رانیوں کے حکم سے بنائے مثلاً دریا سرن کے کنارے موضع سوہا دبیٹر کے نزدیک) اور دریائے کنہار اور جہلم کے اتصال پر موضع پٹن والے قلعے - ان روایات سے مزید واضح ہوتا ہے کہ اس علاقہ پر ہندوؤں کا راج رہا -

پندرہویں کے وسط سے اٹھارہویں صدی تک ترکوں کے حملے

ہزارہ کا ذکر تیمور کے حملوں کے دوران تاریخ کے صفحات پر نمایاں ہوتا ہے جب وہ ہندوستان فتح کر کے ۱۳۹۹ء میں واپس ہوا تو اس ملک تاریخ (قارلق) کو ترکوں کے حوالہ کر دیا - جہاں پر ترک پہلے سے آباد تھے - ان کو یہاں آباد کرنے کی ایک وجہ اپنے ہم قوم قبائل کی امداد کرنا بھی تھی -

اس وقت ہندوؤں کی قوت ختم ہو چکی تھی اور مسلمانوں کا مکمل غلبہ اس ملک پر ہو گیا تھا -

ہزارہ عہدِ مغل میں

آئینِ اکبری میں ابوالفضل اور توزکِ جہانگیری میں جہانگیر نے اس علاقہ کو پکھلی سرکار لکھا ہے اور اس کا حدود اربعہ اور حالات تحریر کئے ہیں - اس وقت اس میں موجودہ تناول اور علاقہ پکھلی اور رش کا میدان داخل تھے - علاقہ ناڑہ بنیالاں و خان پور گکھڑوں کے زیر حکومت تھا -

مغل بادشاہوں کے وقت پکھلی سرکار پر ترکوں کی حکومت تھی، جہاں اب بھی چند مواضعات میں ان کی اولاد موجود ہے اور شمال میں حکومت کشمیر کا قبضہ تھا - تاریخ فرشتہ میں اس علاقہ کا ذکر موجود ہے - مغلوں کے وقت ہزارہ کا میدان اور پکھلی سرکار حاکم اٹک سے متعلق تھے -

توزک بابری میں بابر جہاں ہندوستان کے حالات لکھتا ہے، وہاں پر پہاڑوں کے حالات کے تحت لکھتا ہے :

"شمال کی طرف دریائے سندھ پار ہوتے ہی سارے پہاڑ میں آبادی ہے اور وہ علاقہ ملک کشمیر کے علاقہ میں گنا جاتا ہے جیسے پگلی (پکھلی)، سمنک وغیرہ کے علاقے - ان علاقوں میں سے اس زمانہ میں بہت سے علاقے کشمیر کے تعلق

سے نکل گئے ہیں لیکن پہلے داخلِ کشمیر ہی تھے۔ کشمیر سے بنگال تک اس پہاڑ میں بڑا وسیع ملک ہے۔"

مغلیہ سلطنت کا زوال اور ہزارہ

اس زمانہ میں مغلوں کا زوال اور مقامی خاندانوں کی کمزوری سے باہر کی اقوام کے حملے شروع ہو گئے اور افغانوں اور ان سے متعلقہ اقوام نے داخل ہونے کی کوششیں شروع کر دیں۔ سب سے زیادہ قابلِ ذکر واقعہ سترھویں صدی میں سواتیوں کے پے در پے حملوں کے بعد میدانِ پکھلی پر قبضہ کرنے کا ہے۔ وہ اپنے وطن علاقہ سوات سے پٹھانوں کے دباؤ سے نکلنے پر مجبور ہوئے۔ سوات سے نکلنے کے وقت وہاں کے سلطان کا نام سلطان پکھل تھا اور جو جہانگیری سلاطین کے خاندان سے تھا۔ اس کے نام پر پکھلی کا نام رکھا گیا۔ سب سے آخری حملہ اٹھارھویں صدی میں زیرِ قیادت سید جلال بابا ہوا جس کا مقبرہ واری بھوگڑمنگ میں ہے۔ ترک بے دخل کر دئے گئے اور سواتیوں نے ضلع کے شمالی حصہ اور مغربی پہاڑی علاقہ پر قبضہ کر لیا۔

اسی طرح تناولی قوم کو دریائے سندھ سے پار مہابن کے علاقہ سے یوسف زیوں نے نکال دیا اور یہ موجودہ علاقہ تناول میں آکر آباد ہو گئے۔

جدون بھی دریائے سندھ پار سے آکر علاقہ دھمتوڑ پر قابض ہو گئے اور ترکوں کو نکال دیا۔

قوم ڈھونڈ اور کڑال نے گکھڑوں سے آزاد ہونے کی جدوجہد شروع کر دی۔

ترین قوم نے میدانِ ہزارہ میں گوجروں سے بہت سے حقوق مختلف مواضعات میں حاصل کر لئے اور تربیلہ کے گوجروں نے اتمان زیوں کو پار علاقہ سے اپنی امداد کے لئے بلا لیا اور اتمان زیوں نے بیع و رہن سے ان گوجروں سے زمینیں لے لیں۔ یہ سب واقعات سترھویں صدی کے آخر اور شروع اٹھارھویں صدی میں ہوئے۔ مستند تاریخی حالات کی عدم موجودگی میں ان اقوام کے متعلق صحیح تاریخی حالات معلوم نہیں ہو سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرکزی حکومت کی کمزوری سے طاقتور اقوام کمزور اقوام کو اپنے گھروں اور جائداد سے بے دخل کرتے رہے اور جس کی لاٹھی اسی کی بھینس کے قانون پر عمل ہوتا رہا۔

ہزارہ عہدِ دُرّانی میں

(اٹھارھویں صدی کا آخر نصف اور انیسویں صدی کی ابتداء)

احمد شاہ ابدالی ۱۷۴۸ء میں بادشاہ ہوا اور ۱۷۵۲ء میں کشمیر اور پنجاب اس کے قبضہ میں آگیا ہزارہ پر درانیوں نے اقوامِ ہزارہ کے خوانین کے ذریعہ سے حکومت کی اور مستحکم نظام بنانے کی خواہش نہ کی۔ ان خوانین کو بڑی بڑی جاگیریں دے کر اور وقتاً فوقتاً اپنی فوج کے لئے سپاہی بھرتی کرنے اور کشمیر کا راستہ پرامن رکھنے ہی میں مصلحت سمجھی۔ انہوں نے ضلع کے شمالی حصہ پر خوانین سواتھی کے ذریعہ تناول، اکڑال اور علاقہ گکھڑ میں ان کے خوانین کے ذریعہ حکومت کی اور میدانِ گکھڑ میں بھی ان کے خوانین کے ذریعہ حکومت کی اور میدان ہری پور پر اٹک کے حاکم یا ترینوں کے ذریعہ سے۔ انیسویں صدی کے شروع میں درانی سلطنت کمزور ہوگئی اور ہزارہ کے لوگوں پر حکومت کرنی بھی مشکل ہوگئی۔ درانی حاکم کشمیر اور کابل جاتے ہوئے راستہ میں اہلِ ہزارہ سے جو کچھ وصول ہوتا رہا اسی کو غنیمت سمجھتے رہے۔ یہ دور ایک قسم کی بدامنی کا تھا۔

عہدِ دُرّانی کے مشہور خوانین

اس عہد میں جب طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ اس وقت کے جن خوانین نے اپنی اپنی قوم کی سرداری کی اور ان کو نظم میں رکھا، وہ یہ ہیں:

۱۔ سعادت خان: یہ سواتھیوں کا خان تھا۔ اس کا مسکن گڑھی سعادت خان (موجودہ گڑھی حبیب اللہ جو اس کے لڑکے کے نام سے موسوم ہے) دریائے کنہار کے کنارے پر تھا۔ اس وقت اس کا بہت اثر ورسوخ تھا۔ خوانین جدون اور تناول بھی اپنے معاملات برائے تصفیہ اس کے پاس لے جاتے تھے۔

۲۔ راجہ جعفر خان۔ گکھڑ۔ خان پور ۱۷۸۹ء سے ۱۸۰۱ء

۳۔ گل شیر خان تناولی۔ اس سے انگریز سیاح فارسٹر (FORESTER) نے ۱۷۸۳ء میں ملاقات کی تھی۔

۴۔ نجیب اللہ خان ترین۔ جس نے میدانِ ہزارہ پر خوب دبدبہ سے حکومت کی۔ اس کی وفات ۱۷۹۹ء میں ہوئی۔ اس کے بعد اس کی بیوی بنی بیگم نے اپنے عامل مقدم مشرف کے ذریعہ سکھوں کے عہد کے آغاز تک حکومت کی۔

ان خوانین کے علاوہ باقی عام طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ قبائل ایک دوسرے پر لوٹ مار، قتل و غارت کرتے رہتے تھے۔ بدامنی اتنی تھی کہ لوگ حکومت کے کارندوں پر بھی دست درازی کرتے تھے۔ ان ایام کا نقشہ ایک واقعہ سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔ ۱۸۰۳ء میں حاکم اٹک نے ایک قاضی جو علاقہ چھچھ کا رہنے والا تھا۔ میدان ہری پور کا مالیہ وصول کرنے کے لئے بھیجا وہ سکندر پور (نزد ہری پور) میں آکر ٹھہرا۔ اس وقت تک سکندر پور ہی حکام کی جائے رہائش تھی اور ہری پور آباد نہ ہوا تھا۔ لیکن ترینیوں اور مقدم مشرف نے ظاہراً اس سے ادائیگی مالیہ کی بات چیت کی۔ لیکن رات کے وقت حملہ کر کے اسے قتل کر دیا اور اس کے جو ہمراہی بچ سکے وہ بھاگ کر اٹک چلے گئے۔

احمد شاہ ابدالی کی وفات (۱۷۷۱ء) یا (۱۷۷۳ء میں بموجب کننگھم) کے بعد اس کا بیٹا تیمور شاہ تخت نشین ہوا۔ وہ ۱۷۹۵ء (۱۷۹۳ء کننگھم) میں فوت ہوا۔ تیمور شاہ کی وفات سے پہلے بارک زئی خاندان کا اثر و رسوخ افغانستان میں ہو گیا تھا۔

تیمور شاہ کی وفات کے بعد اس کا تیسرا بیٹا شاہ زمان بہ مشورہ امراء و امداد پائندہ خان بارک زئی تخت پر بیٹھا۔ اس وقت بارک زئی قوم کا ہاتھ اقبال نے پکڑا اور رسدوزئی (قبیلہ احمد شاہ) نے بھی پر و بال نکالے۔ اکثر درانی بہ تہمت سازش شاہ محمود پسر دوم تیمور شاہ قتل کئے گئے۔

ہزارہ اس عرصہ میں درانیوں کے زیر نگین رہا اور ان کی آئے دن کی خانہ جنگیوں اور سازشوں سے یہ ضلع بھی متاثر ہوتا رہا۔

۱۸۰۸ء میں شاہ شجاع افغانستان سے پنجاب میں آگیا اور سدوزئی خاندان کے تباہ ہونے پر بارک زئی کا قبضہ کافی حصہ افغانستان پر بہ سرکردگی دوست محمد خان ہو گیا۔ ہزارہ درانیوں کے کشمیر جانے کے لئے آسان راستہ تھا اور اس علاقہ سے کافی رنگروٹ بھی بھرتی کئے

جا سکتے تھے۔ لہٰذا درانیوں نے اس علاقہ پر ان دو وجوہات کے لئے اپنی گرفت محفوظ رکھنے تک ہی رکھی اور اندرونی امن وامان سے غرض نہ رکھی اور مالیہ کی وصولی کی بھی اتنی پرواہ نہ رکھی۔ انیسویں صدی میں درانی حکومت کمزور ہوگئی۔

درانی حکومت میں ضعف آنے کی وجہ سے ضلع ہزارہ کے لوگوں نے مالیہ دینا بند کر دیا۔ ان ایام میں ہزارہ، ناظم اٹک کے متعلق تھا۔ نمو شاہ (علی مردان ثانی) فرزند احمد شاہ ناظم اٹک ہو کر آیا۔ ملک میں سرکشی عام ہوئی۔ مانکرائے کے ترک جو قوم غور غشتی سے مغلوب ہو کر اپنے علاقہ سے نکل گئے تھے۔ پھر باعانت حکومت دخیل ہو گئے۔

چوہدری عیسیٰ و موسیٰ گوجر دولتا والے (حال کوٹ نجیب اللہ) جو پٹہ گوجری کے وارث تھے۔ سمت خان ترین کے ہاتھ قتل ہوئے (اس قتل کی مفصل تاریخ بعد کے صفحات میں دی جائے گی)، ملک میں بدامنی تھا اور انتظام پوری طرح سے نہ ہو سکا۔ آپس میں لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے، تو ان ایام میں کابل سے سمندر خان درانی معہ کافی فوج آیا۔ اہالیانِ ہزارہ کے ساتھ جنگ بمقام سری (نزد کالو پنڈ بھیرہ) ہوئی۔ اس کی بہت سی فوج ماری گئی۔ مگر سری اس نے لے لی۔ (موضع سری کوہ گندگر کے دامن میں ہے اور بدامنی کے زمانہ میں سب اہالیان میدان ہری پور کے لئے قلعہ کا کام دیتی تھی۔ اس مقام پر اور پھر اس سے بلند پہاڑی کی چوٹی سری کوٹ پر اہلِ ہزارہ دشمن کی مقاومت کے لئے جمع ہو جایا کرتے تھے) سمندر خاں نے موضع سری فتح کرنے کے بعد اس کو اور اکثر دیہات ہزارہ کو جلا دیا اور سخت بربادی بپا کی مگر پھر بھی انتظام نہ ہو سکا۔

۱۸۰۲ء میں حاجی وہاب قانون گو از علاقہ چھچھ حاکم ہزارہ ہو کر بمعہ فوج آیا اور موضع سکندر پور میں (نزد ہری پور) جو اس وقت اس علاقہ کے حاکم کا مرکز تھا، ٹھہرا۔ تمام خوانین ہزارہ کو بلا کر فہمائش اور نصیحت کی۔ ان ایام میں محمد خان ترین پسر نجیب اللہ خان ترین بامداد مقدم مشرف جو نہایت قوی دل شخص تھا، ہزارہ پر غالب ہو چکا تھا۔ حاجی وہاب بطور حاکم وقت ہو کر آیا تھا۔ دونوں کی رائے گفتگو میں مطابقت نہ ہوتی۔ محمد خان ترین بوجہ اختلافِ گفتگو ناراض ہو کر اٹھ گیا اور اپنے اہل وعیال کو درویش سے نکال کر گلڈھیری علاقہ کنڈی کاہل لے گیا۔ حاجی وہاب نے درویش کو جلا دیا۔ محمد خان نے تمام خوانین ہزارہ کو طلب کر کے مشورہ کیا اور دوسرے روز

رات کے وقت حملہ کر کے حاجی وہاب کو قتل کر دیا اور اس کے دو سو سوار بھی قتل کر دئیے۔ باقی مفرور ہو گئے۔

تاریخ ہزارہ فارسی قلمی از مہتاب سنگھ جو سردار ہری سنگھ کے وقت سے اس ضلع کا کاردار عرصہ تیس سال تک رہا نے اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ۱۸۰۰ء میں جب محمود شاہ تخت کابل پر بیٹھا تو اس نے سمندر خان درانی کو بھیجا جس نے ملک ہزارہ میں بہت بربادی کی اور اس کی بہت سی فوج بھی کام آئی۔ موضع سری کو جلا دیا گیا اور باقی دیہات ہزارہ کو بھی سخت تکلیف پہنچائی گئی۔ شاہ محمود شاہ نے مہمات مملکت کو امراء کے حوالے کر دیا اور ایک قلعہ دار قلعہ اٹک کی حفاظت کے لئے مقرر کر دیا اور اقلیم چھچھ ہزارہ وغیرہ کا انتظام قلعہ دار اٹک کے حوالہ کر دیا۔ قلعہ دار نے قلعہ میں پہنچنے پر سب پرگنوں میں اہل کار مقرر کر دئیے۔ چنانچہ ملک ہزارہ کی تحصیل مالیہ کے انتظام کے لئے حاجی وہاب خان جو ملک چھچھ کے قانون گویاں میں سے تھا، ہزارہ بھیج دیا۔ حاجی وہاب خان تین سو سوار اور چند پیادوں کے ساتھ ہزارہ میں داخل ہوا اور موضع قاضی پور حال سکندر پور کے ساتھ موضع ملکیار کے میدان میں پندرہ دن تک اپنا ڈیرہ رکھا۔ ہزارہ کے رئیس، ملک اور مال گزار فرداً فرداً آ کر سلام و مجرا کرتے رہے۔ اس کے بعد حاجی وہاب خان نے سب رئیسوں اور خوانین کو طلبی کے پروانہ جات لکھے کہ وہ سب یک جا ہو کر ملاقات کریں۔ ملاقات پر بعد از حال پرسی و سلام کلام اس نے خریف کا معاملہ طلب کیا۔ اس سوال و جواب میں تلخی پیدا ہو گئی۔ محمد خان ترین نے سخت جوابات دئیے۔ حاجی وہاب خان کو حکومت کا پندار تھا۔ ہر دو کے درمیان موافقت نہ ہو سکی اور تعلقات خراب ہو گئے۔ محمد خان مجلس سے اٹھ کر سید ھا درویش گیا اور اپنے اہل و عیال کو ساتھ لے کر موضع گلڈھیری (نزد نوردی) لے گیا۔ حاجی وہاب خان اس واقعہ سے خفا ہو کر درویش میں آیا۔ محمد خاں کے گھروں کو برباد کیا۔ بعض کو آگ لگا دی اور بعض کو مسمار کر دیا۔ ان مکانات کی سب لکڑی جلانے میں استعمال کر دی۔ محمد خان کو اس بات سے سخت غصہ پیدا ہوا۔ ظاہراً زمانہ سازی سے تمام رئیسان ہزارہ کا جرگہ برائے ادائیگی مالیہ بلایا۔ تاکہ حاجی وہاب خان کے پاس جا کر مالیہ ادا کر دیا جائے لیکن اندرون خانہ حملہ کی تیاری کی۔ مضبوط اور چست کمر بند آدمی ہر سہ پٹی ترک، اولاک و ترین سے اور کچھ تنولی و افغان اور مشوانی سے ساتھ لئے۔ اور حاجی وہاب خان کے ڈیرہ کے چاروں طرف صبح سویرے آ کر فوراً بندوقیں چلانی شروع کر دیں۔ حاجی وہاب خاں ابھی خیمہ گاہ سے بیدار نہ

ہوا تھا۔ لیکن جرأت اور ہمت سے اٹھا۔ کپڑے پہنے اور گھوڑے پر سوار ہو کر باہر آیا۔ لیکن نیند سے بیدار ہونے والے اور بیدار کے حالات میں تفاوت ظاہر ہے۔ آخر کار اس جنگ میں حاجی وہاب خان بمعہ اپنے ایک دو آدمیوں کے مارا گیا۔ اس کی باقی سوار فوج نے اٹک کی راہ لی۔ جو کوئی بھی ڈیرہ میں موجود تھا گھوڑے پر سوار ہو کر سواروں کی معیت میں روانہ ہو گیا۔ انہوں نے اپنے بہت سے گھوڑے، اسلحہ جات اور سامان چھوڑ کر اپنی جان سلامت لے جانے ہی کو غنیمت جانا۔ جو بھی ذرا پیچھے رہا اس کو گرفتار کر کے گھوڑا، سامان اور اسلحہ لے لیا جاتا تھا۔

محمد خان ترین بمعہ مشرف ساکن کوٹ نجیب اللہ ان سواروں کا ہزارہ کی سرحد تک تعاقب کر کے بھگانے کے بعد واپس آئے اور حاجی وہاب خان کا سب اسباب، خیمہ، تمبات، گھوڑے اسلحہ جات اور نقد و جنس لوٹ لیا گیا۔

ہزارہ میں سکھوں کی حکومت کا آغاز

درانی حکومت کی کمزوری سے ہزارہ نسبتاً حاکم سے باغی ہونے لگا اور سکھوں کی حکومت بھی چند ابتدائی شکستوں کے بغیر مستحکم نہ ہو سکی۔ رنجیت سنگھ نے اس ضلع کو ۱۸۱۸ء میں باضابطہ طور پر اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ لیکن ۱۸۲۰ء میں اس کے سپہ سالاروں کو شکست ہوئی اور ۱۸۲۱ء میں سردار امر سنگھ مجیٹھیہ سمندر کٹھہ (علاقہ کرڑال) میں قتل کر دیا گیا۔ اس پر سردار ہری سنگھ حاکم کشمیر کو ہزارہ بھیجا گیا۔ اس کو تین سال سے زیادہ عرصہ قبائل ہزارہ کو مطیع کرنے میں لگ گیا۔ خان پور کے گکھڑوں کو ۱۸۳۶ء تک ہی مطیع کیا جا سکا۔ بہر حال ہزارہ پر حکومت کرنا اتنا آسان کام نہ تھا۔

۱۸۴۵ء میں پنجاب میں سکھ حکومت کے کمزور ہونے پر ہزارہ میں پھر بغاوت شروع ہو گئی۔ ۱۸۴۶ء میں دیوان مول راج حاکم ہزارہ کو حسن ابدال میں پناہ لینی پڑی۔ لوگ ہری پور میں جمع ہوئے اور اپنی حکومت کا انتظام کرنے لگے۔ اس اثنا میں سکھوں کی پہلی لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ مارچ ۱۸۴۵ء میں سکھ دربار اور حکومت برطانیہ کے معاہدہ کی رو سے ہزارہ راجہ گلاب سنگھ راجہ جموں کے ماتحت آ گیا۔ لیکن ہزارہ کو ناقابلِ تسخیر سمجھ کر اوائل ۱۸۴۸ء میں گلاب سنگھ نے ہزارہ

کو دوبارہ سکھ دربار کے حوالے کر کے اس کے عوض میں جموں کے نزدیک کا علاقہ لے لیا اور ۱۸۴۹ء میں سکھوں کی دوسری لڑائی کے نتیجہ کے طور پر ہزارہ برطانوی قبضہ میں آکر پنجاب سے ملحق کر لیا گیا۔

۱۸۴۷ء میں کپتان ایبٹ صاحب سکھ دربار کے حکم سے ضلع ہزارہ اور علاقہ مہاراجہ گلاب سنگھ کی حد بندی کرنے کے لئے آیا اور ہزارہ کا سرسری بندوبست کیا۔ اس نے منصفانہ تشخیص مالیۂ خوانین کے ساتھ روادارانہ سلوک اور وقت ضرورت مضبوطی و جرأت سے کام لے کر ایک سال کے اندر اندر اہلِ ہزارہ کو مطمئن اور گرویدہ کر لیا۔

سکھوں کی دوسری لڑائی میں میجر ایبٹ نے اپنی ذاتی ہمت سے اپنی پوزیشن ہزارہ کے پہاڑوں میں جبکہ سکھ فوجوں نے اس کے چاروں طرف گھیرا ڈال رکھا تھا، قائم رکھی۔ حالانکہ کوئی بیرونی امداد اس کو نہ مل سکتی تھی۔

جنگ آزادی کے زمانہ میں میجر بیچر (BECHER) کے زیر حکومت رہا اور کوئی فساد نہیں ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کالا ڈھاکہ کی مہمیں جاری رہیں اور ۱۸۶۸ء ۱۸۸۸ء ۱۸۹۱ء اور ۱۸۹۲ء کی چڑھائیوں نے ملک کو پر امن بنا دیا۔

یہ عہد درانی سے بعد کے وہ سرسری حالات ہیں، جو سکھوں کے متعلق بیان کئے گئے ہیں۔ سکھوں کے عہد کے مفصل حالات اگلے باب میں شرح و بسط کے ساتھ انشاء اللہ بیان کئے جائیں گے۔

سکھوں کا عہدِ حکومت[1]

ہزارہ میں سکھ حکومت کے عہد کے حالات بیان کرنے سے پہلے سکھوں کے ظہور، عروج اور زوال کی مختصر تاریخ بیان کی جاتی ہے تاکہ ہزارہ کے واقعات کے لئے پس منظر کا کام دے۔

تاریخی لحاظ سے سکھوں نے مقامی طور پر ۱۷۴۸ء سے ۱۷۶۷ء تک غلبہ حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں جب کہ احمد شاہ ابدالی ہند پر حملہ آور ہوتا رہا۔ احمد شاہ کے آخری آمد ہندوستان ۱۷۶۷ء سے بعد تیس سال تک یعنی ۱۷۹۷ء تک سکھ حکومت لاہور پر قابض رہی۔ ۱۷۹۷ء میں شاہ زمان لاہور پر چڑھ آیا لیکن تاوانِ جنگ لے کر واپس چلا گیا۔ دوسرے سال پھر وہ

---

[1] : اقتباس پاکستان ٹائمز ۱۹۶۴ء۔ ایم۔ زیڈ۔ اے خان۔

لاہور آیا اور واپس جاتے وقت لاہور کی حکومت رنجیت سنگھ کے حوالے کر گیا۔ رنجیت سنگھ نے لاہور کی حکومت کو مضبوط اور مشہور کر دیا۔ انگریزی حکومت (برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی) نے رنجیت سنگھ کی موت، ۲۷ جون ۱۸۳۹ء بہ عمر ۵۹ سال سے بعد اپنے مقام حکومت (آگرہ، اودھ) سے للچائی ہوئی نظریں لاہور پر ڈالیں، جس کی وجہ سے ان کی سکھوں سے جنگیں شروع ہو گئیں۔

جواہر سنگھ رانی جنداں (رنجیت سنگھ کی مہارانی) کا بھائی اور لال سنگھ رانی جنداں کا منظور نظر حکومت پر عملاً قابض تھے۔ جواہر سنگھ وزیر بنایا گیا لیکن خالصہ فوج کی مخالفت کی وجہ سے وہ ۲۱ ستمبر ۱۸۴۵ء میں قتل کر دیا گیا۔ حکومت پر فوج کا قبضہ ہو گیا۔ دل سنگھ وزیر اور تیجا سنگھ کمانڈر انچیف مقرر کیا گیا۔ ۱۷ نومبر ۱۸۴۵ء کو انگریزوں سے جنگ کا اعلان کر دیا گیا اور سکھ فوج نے ۱۱ دسمبر ۱۸۴۵ء کو دریائے ستلج پار کر لیا۔

جنگ مُدکی ۱۸ دسمبر، فیروز پور۔ ۲۱، ۲۲ دسمبر اور بدوال ۲۱ جنوری ۱۸۴۶ء علی وال ۲۸ جنوری اور سبراؤں ۱۰ فروری ۱۸۴۶ء میں ہوئی۔ سکھوں کو شکست ہوئی اور لاہور پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور ۱۸۴۶ء میں لاہور میں برٹش کونسل آف ایجنسی مقرر ہو گئی اور سب اختیار حکومت برٹش ریذیڈنٹ نے سنبھال لئے۔ اس کے بعد سکھ فوج اور آبادی نے بغاوت کر دی اور پیش قدمی کرتے ہوئے ساٹھ میل تک پہنچ گئے۔ لارڈ گوو (GOUGH) نے فوج کی کمان سنبھالی اور مقام چلیانوالہ بتاریخ ۱۳ جنوری ۱۸۴۸ء سخت جنگ لڑی گئی۔ سکھوں نے اپنی انتہائی کوشش دوبارہ حکومت لینے کے لئے کی لیکن وہ ناکام رہے۔

چلیانوالہ کی لڑائی کے بعد انگریزوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد گجرات کی لڑائی ۲۱ فروری ۱۸۴۸ء میں ہوئی اور لارڈ گوو (GOUGH) نے سکھوں کی تمام پریشان شدہ فوج کو تباہ کر دیا۔ دلیپ سنگھ کو باقاعدہ طور پر ۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء کو گدی سے اتار دیا گیا اور پنجاب کو انگریزی حکومت میں شامل کر دیا۔ اس طرح سکھوں کی سلطنت گلاب سنگھ اور مہارانی جنداں کی سازش سے تباہ ہو گئی۔

سکھوں کا زوال اور مہارانی جنداں کا کردار

مہارانی جنداں رنجیت سنگھ کی سب سے چھوٹی رانی تھی۔ اس کا اصلی نام جے دیوی تھا۔ رنجیت سنگھ ۱۸۱۹ء سے ۱۸۳۹ء تک برسرِاقتدار رہا۔ سکھوں کی آخری شکست کے بعد انگریزوں نے سکھوں سے ایک کروڑ روپیہ کا تاوانِ جنگ مانگا۔ سکھوں کے پاس اتنا روپیہ نہ تھا۔ اس واسطے صوبہ کشمیر و صوبہ ہزارہ بمعہ تمام کوہستانی علاقوں کے کمپنی بہادر کو دے دیئے۔ انگریزوں کو اپنی سیاسی، قومی اور کاروباری ضرورت کے لئے روپوں کی اشد ضرورت تھی۔ اس لئے انہوں نے یہ علاقے مارچ ۱۸۴۶ء میں پچھتر لاکھ روپے نانک شاہی کے عوض گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کر دیئے۔

گلاب سنگھ نے سکھوں سے غداری کی اور جنگ میں ہی انگریزوں سے ساز باز کر لی تھی۔ اس کا علم جب رانی جنداں کو ہوا تو اس نے گلاب سنگھ کو موقوف کر کے اس کی جگہ لال سنگھ کو تمام اختیارات دیئے گئے۔

رانی جنداں کو کشمیر و ہزارہ کی فروخت کا سخت رنج تھا۔ لہٰذا اس نے راجہ لال سنگھ کے مصاحب خاص کے ذریعہ صوبیدار کشمیر شیخ امام دین کو پیغام بھیجا کہ خبردار راجہ گلاب سنگھ کو کشمیر کا قبضہ نہ دینا اور جنگ شروع ہو گئی۔

انگریزوں نے اپنی فوج کی مدد سے گلاب سنگھ کو قبضہ دلا دیا۔

رانی جنداں اخلاقی لحاظ سے عیش پرست تھی لیکن اس میں خودداری بھی تھی اور جذبۂ انتقام بھی۔ وہ آخر وقت تک انگریزوں کے مخالف رہی۔

انگریزوں نے اس کی مخالف حرکات کی وجہ سے اسے قلعہ شیخوپورہ میں نظر بند کر دیا پھر بنارس بھیج دیا۔ وہاں سے وہ اپنی دو لونڈیوں کے ہمراہ بھاگ جانے کی کوشش کر رہی تھی کہ گرفتار کر کے چنار گڑھ بھیج دی گئی۔ لیکن وہ اسی رات بیراگن کا بھیس بدل کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی اور ۲۱ اپریل ۱۸۴۹ء نیپال جا پہنچی۔ وہاں وہ انگریزوں کے تسلط کو ختم کرنے کے منصوبے بنانے میں مصروف رہی۔ نیپال سے اس نے نو افراد کو ہندوستان روانہ کیا، جن کے ذمے بغاوت پھیلانا

اور ہندوستان کے گورنر جنرل کو قتل کر کے مہاراجہ دلیپ سنگھ کو نیپال پہنچانا تھا۔ جب ۱۰ر نومبر ۱۸۴۹ء کو لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل ہندوستان لاہور میں داخل ہو رہا تھا رانی جنداں کے آدمی پکڑے گئے جنہیں سازش کے جرم میں پھانسی دے دیا گیا۔

مہاراجہ دلیپ سنگھ اپنی کم عمری اور ناتجربہ کاری کے باعث کاروبارِ حکومت کی الجھنوں سے گھبرا گیا اور اس کی ذہنی پریشانیوں کا یہ ردعمل ہوا کہ وہ ۲۱ر دسمبر ۱۸۴۹ء کو اپنی سلطنت انگریزوں کے حوالے کر کے لاہور چلا گیا۔ ۱۶ر فروری کو دلیپ سنگھ فتح گڑھ متصل فرخ آباد پہنچا۔ وہاں پر تھوڑا عرصہ قیام کے بعد ۱۸۵۴ء میں لندن روانہ ہو گیا، جہاں اس نے عیسائیت قبول کر لی۔

ان باتوں کا علم جب رانی جنداں کو ہوا تو وہ نیپال سے لندن پہنچ گئی تاکہ اپنے بیٹے کو واپس لائے۔ لیکن دلیپ سنگھ نے انگریزی شہریت اختیار کر لی تھی، وہ نہ آیا۔ اس سے رانی جنداں کو سخت صدمہ ہوا اور ہندوستان کی آزادی اور پنجاب میں سکھ حکومت کی بحالی کی خواہش لے کر ۱۸۶۴ء میں اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔

راجہ دلیپ سنگھ ۱۸۹۳ء تک زندہ رہا۔ اس کی اولاد بھی وہاں ہی رہ گئی۔ اس کا بیٹا وکٹر دلیپ سنگھ ۱۹۴۶ء میں برما کا دورہ کرنے کے لئے آیا تھا اور رنگون میں مقیم تھا کہ مہاراجہ ہری سنگھ نے اس کو خط لکھا۔ (ان دنوں جموں اور کشمیر میں مہاراجہ ہری سنگھ کے خلاف "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک شیخ عبداللہ نے جاری کر رکھی تھی)

کہ "شیخ محمد عبداللہ کمیونسٹ ہے اور پنڈت جواہر لال نہرو اس کا معاون اور رفیق ہے۔"

(چٹان - ۸ر ستمبر ۱۹۷۵ء)

سکھوں کی حکومت

(آغاز اور انجام کی عبرت ناک داستان)

سکھوں کی جوانا مرگ سلطنت کے سربراہانِ افراد کی زندگی اور ان کے خانگی حالات اور اخلاقی اطوار کا ذکر اور ڈوگرہ خاندان (راجگان جموں) کے حالات کو میجر جی مارٹیکل سمتھ نے اپنی کتاب "لاہور کا سکھ حکمران خاندان اور راجگانِ جموں" کو بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ سکھ حکومت کے عروج وزوال

کی داستانِ عبرت کو سمجھنے کے لئے چند ضروری اقتباسات دیئے جاتے ہیں۔

رنجیت کے اجداد میں بھائی بار آ ہوا، جس کی وفات ۱۶۷۹ء میں ہوئی - رنجیت سنگھ اس کی پانچویں پشت میں ہوا ہے۔

احمد شاہ ابدالی کے حملہ ۱۷۶۲ء کے وقت چڑت سنگھ (رنجیت سنگھ کا دادا) نے اپنا مال و متاع جموں بھیج دیا اور افغان فوجیوں پر حملہ اور لوٹ مار کرتا رہا۔ احمد شاہ نے اس کا قلعہ گوجرانوالہ مسمار کر کے ہموار کر دیا۔

ان ایام میں چڑت سنگھ اور اس کے خاندان کی واقفیت جموں کے ڈوگرہ خاندان سے ہوئی - اس کے ایماء پر بجری دیو، پسر راجہ جموں نے اپنے باپ رنجیت دیو کے خلاف بغاوت کر دی۔

۱۷۷۴ء میں چڑت سنگھ اور دوسرے سکھوں نے بجری دیو کی حمایت کی - انہی ایام جنگ میں جموں سے قریباً دو کوس پر، اس کے سپاہیوں کے ہاتھوں ایک بندوق پھٹ جانے سے اس کی (چڑت سنگھ) کی موت واقع ہو گئی۔

اس کی موت کے بعد اس کا بیٹا مہاں سنگھ عمر ۱۲ سال جانشین ہوا۔

گلاب سنگھ - سکھ حکومت کا معروف کردار، راجہ جموں - سروپ دیو (وفات ۱۷۴۲ء) کی پانچویں پشت میں ہوا - یہ تین بھائی تھے - گلاب سنگھ (پیدائش ۱۷۸۸ء) دھیان سنگھ (پیدائش ۱۷۹۷ء) اور سچیت سنگھ (پیدائش ۱۸۰۱ء)

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ان تینوں بھائیوں کو ۱۸۱۸ء میں راجہ بنا دیا تھا۔

مسٹر سمتھ کتاب کی تمہید صفحہ xviii پر لکھتا ہے۔

دو دلیپ سنگھ کے متعلق شک ہے کہ وہ رنجیت سنگھ کا بیٹا نہ تھا - کیونکہ اس کی ماں، مائی جنداں، اس کی شادی شدہ بیوی نہ تھی - رنجیت سنگھ نے صرف دو عورتوں سے ہی معروف رسومات کے مطابق شادی کی۔

۱- مائی نکئی - والدہ کھڑک سنگھ۔

۲- مہتاب کور - دختر سدا کور۔

اور چادر ڈالنے کی رسم اس نے تین عورتوں سے کی۔

۲،۱ : دو بیوگاں صاحب سنگھ۔ ساکن گجرات

۳۔ گل بیگم : لاہور کی کنچنی "

ضمیمہ ۲۹ نونہال سنگھ کی موت اور دھیان سنگھ کا اس واقعہ میں ملوث ہونے کا شبہ"

"نونہال سنگھ کی موت کی اطلاع دھیان سنگھ وزیر کو دی گئی اور اس نے لوگوں کو اس واقعہ سے مطلع کیا۔ لیکن کسی رشتہ دار، سکھ سردار یہاں تک کہ اس کی ماں کو مرتے ہوئے مہاراجہ کو دیکھنے کے لئے نہ چھوڑا گیا۔ سردار لہنا سنگھ مجیٹھیہ اور دوسرے سرداروں کو جو اس کو دیکھنے کے لئے آئے، دھکیل کر الگ کر دیا "

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خاندان کے اخلاقی حالات

مہاں سنگھ، والد رنجیت سنگھ اپنے باپ چڑت سنگھ کا بعمر ۱۲ سال جانشین ہوا۔

چڑت سنگھ کی موت (۱۷۷۴ء) اس کے سپاہیوں کے ہاتھ سے ایک بندوق کے پھٹ جانے سے ہوئی۔ چونکہ مہاں سنگھ صغر سن تھا، لہٰذا مسل کی حکومت اس کی ماں نے کی اور اپنے آشنا جے رام مصر (برہمن) سے اپنا مسمار شدہ قلعہ تعمیر کرایا۔

۱۷۷۵ء میں مہاں سنگھ کی ماں نے جے سنگھ سربراہ کنہیا مسل کے ہاتھ سے جودھ سنگھ بھنگی کو قتل کرا دیا۔

اسی سال کے آخر میں مہاں سنگھ کی شادی گجپوت سنگھ ساکن جیند کی لڑکی سے ہو گئی۔ ۱۷۷۶ء میں رنجیت سنگھ پیدا ہوا۔ موسم سرما ۱۷۷۸ء میں مہاں سنگھ نے اپنی ماں کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دیا۔ کیونکہ وہ حقیقت سنگھ، کنہیا مسل والے کے ساتھ یارانہ رکھتی تھی۔

مہاں سنگھ کو اپنی بیوی کے چال چلن پر شبہ تھا اور وہ رنجیت سنگھ کو اپنا فرزند خیال نہ کرتا تھا۔ مہاں سنگھ اس دوہرے غم کو غلط کرنے کے لئے سخت شرابی ہو گیا اور ۱۷۹۰ء میں کثرت مے نوشی سے مر گیا۔ رنجیت سنگھ اس وقت بچہ تھا۔ اس کے نام پر اس کی ماں اور

ساس سدا کور حکومت کرتی رہیں۔

۱۷۹۳ء میں جب رنجیت سنگھ کی عمر سترہ سال کی تھی تو اس نے اپنی ماں کو قتل کر دیا اس کے بعد اس نے اپنے باپ کے کاروار دیوان لیکھ راج کو قتل کرا دیا۔

اپنی ساس سدا کور کو دھنی کا قلعہ جو ستلج کے بائیں کنارے پر تھا، نہ دینے پر قید کر دیا اور وہ ۱۸۲۷ء میں اسی قید میں مر گئی۔

لاہور دربار کی اندرونی تاریخ

رنجیت سنگھ کے آخری ایام زندگی یا یہ کہنا چاہیے کہ ہیرا سنگھ کی پیدائش کے وقت سے دھیان سنگھ نے مختلف طریقوں سے مہاراجہ پر کلی اختیار حاصل کر لیا تھا۔ کوئی سکھ سردار یا مہاراجہ کے اپنے بیٹے[1] بھی دھیان سنگھ کی اجازت کے بغیر محل کے اندر نہ جا سکتے تھے۔ کھڑک سنگھ اور شیر سنگھ کو اجازت کے لئے گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا تھا اور دربانوں کو رشوت دے کر سلام کے لئے اندر جانے دیا جاتا۔

انہی دنوں میں دھیان سنگھ نے مہاراجہ پر یہ نقش بٹھانے میں کامیابی حاصل کر لی کہ کھڑک سنگھ بوجہ دماغی نقص، حکومت کرنے کے قابل نہیں۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ کھڑک سنگھ، ایک ہونہار اور قابل حکمران بننے کی تمام صلاحتیں رکھتا تھا۔ اگر کوئی نقص تھا تو وہ یہ تھا کہ وہ مذہبی خیالات کا آدمی تھا اور دھیان سنگھ کی طرح چالاک نہ تھا۔ وہ ایک بہادر، قابل اور صاحب عزم انسان تھا۔ والد کی بے توجہی اور حالات کی ناسازگاری نے اس کی طبیعت پر برا اثر ڈالا۔ وہ بددل ہو کر دل برداشتہ اور خاموش ہو گیا۔

شیر سنگھ کو مہاراجہ اپنا بیٹا خیال ہی نہ کرتا تھا صرف ظاہر داری کے طور پر اس کو جاگیر وغیرہ دے رکھی تھی۔

ان دونوں کو معمولی معمولی کاموں کے لئے سرحدات پر مامور رکھا جاتا اور اس طرح سے ان کو دربار سے دور رکھا جاتا رہا۔

دھیان سنگھ نے چالاکی اور حزم کے ساتھ باز کر کے اپنے بڑے بیٹے ہیرا سنگھ کو مہاراجہ کا متبنیٰ مشہور کرنے کا انتظام کر لیا اور رنجیت سنگھ پر ایسا جادو کر دیا کہ وہ ہیرا سنگھ کو ہر وقت

---

[1] رنجیت سنگھ کے بیٹے۔

اپنے ساتھ رکھتا۔ یہاں تک کہ اگر ہیرا سنگھ اس کے ساتھ نہ ہوتا تو مہاراجہ کو نیند نہ آتی تھی۔ اس کی غیر حاضری میں رنجیت سنگھ بے آرام اور چڑچڑا رہتا اور اس کی واپسی تک پریشان رہتا۔

ہر رات مہاراجہ خود اپنے ہاتھ سے پانچ سو روپے ہیرا سنگھ کے سرہانے کے نیچے رکھ دیتا تھا تاکہ صبح کے وقت ہیرا سنگھ اس روپے کو خیرات کر دیا کرے۔

ان ایام میں مہاراجہ کے حکم اور دھیان سنگھ کی خواہش پر پنڈت جھلا کو ہیرا سنگھ کا اتالیق اور محافظ مقرر کر دیا گیا کیونکہ اس کی والدہ ۱۸۳۲ء میں مر گئی تھی۔

ہیرا سنگھ کی رہائش و موجودگی، زنان خانہ میں رہتی اس طرح دھیان سنگھ کو سب اندرونی حالات معلوم ہوتے رہتے۔

عبرت ناک انجام

صفحہ ۶۲ پر وہ لکھتا ہے:-

" چاند کور اور شیر سنگھ کی جنگ میں سکھوں کا قتل عام ہوا۔ سکھوں نے سکھوں کو زندہ جلا دیا۔ جب زخمی سکھ رحم کی درخواست کرتے تو دوسرے سکھ ان سے کہتے بھائی، چڑھ جاؤ۔ چڑھ جاؤ۔ (مُردوں کے ساتھ، چتا پر جلنے کے لئے)۔ کی نوف ہوندا اے۔"

ص ۱۶۸ پر لکھتا ہے:

" ہیرا سنگھ کی وزارت کے وقت لال سنگھ[1] ترقی کر کے حکومت کا چیف خزانچی (افسر خزانہ) ہو گیا۔ ہیرا سنگھ نے اس کو دو میلی اور رہتاس کی جاگیر دے کر، راجہ لال سنگھ بنا دیا۔

اس احسان نوازی کے بدلے میں لال سنگھ نے ہیرا سنگھ اور اس کے وزیر پنڈت جھلا کو قتل کرا دیا۔ ظاہراً وہ ان دونوں کے ساتھ محبت و رفاقت رکھتا رہا لیکن اندرونی طور پر مہارانی جنداں (والدہ دلیپ سنگھ) کے ساتھ راز رکھتا تھا اور رانی جنداں، ہیرا سنگھ اور پنڈت جھلا[2] کے خلاف تھی۔ رانی اور لال سنگھ کے درمیان (ناشائستہ) تعلق تھا۔ اپریل ۱۸۴۵ء میں لال سنگھ اور رانی جنداں کے درمیان روابط زیادہ ہو گئے۔ رانی کے بھائیوں کی کوشش بھی ان روابط کو ختم نہ کر سکی۔ یہاں تک

---

[1]: دھیان سنگھ کے وقت پہلے خزانچی جسا مصر۔ [2]: والد لال سنگھ کے مرنے پر دھیان سنگھ نے اس کے لڑکے لال سنگھ کو اپنے باپ کی جگہ مقرر کر دیا

کرلال سنگھ نے جواہر سنگھ برادر رانی جنداں کو قتل کرادیا۔ اس کے بعد وہ رانی کے مشورہ و حمایت سے عملاً ریاست کا سربراہ تھا۔

انگریزوں کے حملہ کی تجویز کے وقت، لال سنگھ وزیر تھا اور بعد میں وہ سکھ فوج کے حملہ ستلج کے وقت ان کی کمان کر رہا تھا۔

راجہ گلاب سنگھ کے مہاراجہ کشمیر بن جانے کے بعد لال سنگھ، اس کی سفارش سے وزیر بن گیا آخر کار گورنر کشمیر[1] کو درپردہ گلاب سنگھ کو کشمیر کا قبضہ نہ دینے پر اکسانے کے جرم میں لال سنگھ کو دسمبر ۱۸۴۶ء میں بطور قیدی آگرہ بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد اس کا ذکر پھر نہ سنا گیا۔

ضمیمہ جات کتاب کرنل میلکالم

ضمیمہ ۶

چاند کور والدہ نونہال سنگھ یہ آوارہ چلن کی عورت تھی۔ رنجیت سنگھ نے اس کے کئی عاشقوں کو جیل میں ڈالا۔ خاص کر ایک فرّاش بہ نام منوں (بڑی آنکھوں کی وجہ سے یہ نام مشہور ہوا تھا) کو وہ اپنے عاشقوں کو خط لکھ کر اپنی خوابگاہ میں بلایا کرتی تھی۔ اگر نونہال سنگھ، چندے اور زندہ رہتا تو اس کو خود ہی قتل کر دیتا۔

ضمیمہ ۹ رنجیت سنگھ نے اپنی ماں کو بدچلنی کی شہرت کی وجہ سے خود قتل کرایا۔ اس قتل کی تصاویر پرنسپ (PRINCEP) نے خود دیکھی تھیں۔

۱۸۰۷ء میں رنجیت سنگھ لاہور آیا، تو اس کی رانی مہتاب کور نے دو جڑواں پیدا ہونے والے بچے شیر سنگھ و تارا سنگھ رنجیت سنگھ کو دکھائے۔

نوٹ: رنجیت سنگھ نے ان کو اپنے بچوں کے طور پر کبھی پوری طرح تسلیم نہ کیا۔

شیر سنگھ تو علی بخش دھوبی (سدا کور والدۂ مہتاب کور کا نوکر تھا) کا بیٹا تھا اور تارا سنگھ ایک ترکھان "درل سنگھ" کا بیٹا تھا۔ مہتاب کور کے چال چلن پر شبہ کی وجہ سے وہ ہمیشہ اپنی ماں سدا کور کے پاس ہی رہی۔

[1] شیخ محی الدین۔

ضمیمہ ۱۳ میں نے کھڑک سنگھ کو کبھی ضعیف العقل نہ پایا۔ جب تک کہ اس کو زہر کھلانے سے ایسا نہ کر دیا گیا۔

تارا سنگھ آوارہ نہ تھا، بلکہ بیوقوف تھا۔ شیر سنگھ اور تارا سنگھ دربار میں کم آتے۔ حقیقتاً وہ رنجیت سنگھ کے بیٹے نہ تھے۔ شاید مہاراجہ نے اس راز کو کھڑک سنگھ کی حفاظت کے خیال سے ظاہر نہ کیا کہ یہ دونوں اس کو کچھ نقصان نہ پہنچادیں۔

ضمیمہ ۲۱ جب نونہال سنگھ زخمی حالت میں راجہ دھیان سنگھ کے سامنے لایا گیا، تو اس کی کھوپڑی بری طرح ٹوٹی ہوئی تھی۔ اس کے ماتھے پر خون کا دھبہ تک میں نے دیکھا تو وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے گفتگو کی یا نہیں۔

دھیان سنگھ نے سوائے اپنی پارٹی کے لوگوں کے اور کسی کو نونہال سنگھ کو دیکھنے نہ دیا۔ شیر سنگھ کو اسی وقت اطلاع دے کر بلایا گیا۔

رنجیت سنگھ کی موت کے بعد افراتفری اور قتل مقاتلہ کی تفصیل

دھیان سنگھ وزیر مہاراجہ نے مندرجہ ذیل اشخاص کو قتل کر دیا۔

۱۔ جیت سنگھ ۲۔ مہاراجہ کھڑک سنگھ (بذریعہ زہر خوردنی) ۳۔ مہاراجہ نونہال سنگھ (طریقہ قتل پراسرار تھا) ۴۔ مہتاب سنگھ کٹھوا ۵۔ جوالا سنگھ

باقی افراد کا انجام

۱۔ مہاراجہ شیر سنگھ کو اجیت سنگھ سندھیانوالہ نے بندوق سے قتل کیا۔

۲۔ سردار بدھ سنگھ کو اجیت سنگھ کے آدمیوں نے قتل کیا۔

۳۔ پرتاب سنگھ (پسر اکبر شیر سنگھ) کو لہنا سنگھ سندھیانوالہ نے قتل کیا۔

۴۔ دھیان سنگھ کو اجیت سنگھ کے سواروں نے قتل کیا۔

۵۔ لہنا سنگھ سندھیانوالہ ہیرا سنگھ سے مقابلہ میں مارا گیا۔

۶۔ اجیت سنگھ بھی ہیرا سنگھ سے مقابلہ میں مارا گیا

۷۔ بلدام سنگھ بہ حکم ہیرا سنگھ قتل کیا گیا۔

۸۔ بیلی رام مصر بہ حکم ہیرا سنگھ قتل کیا گیا۔

۹- مصر رام کشن (برادر بیلی رام)، بحکم ہیرا سنگھ قتل ہوا۔

۱۰- بھائی گورمکھ سنگھ بحکم ہیرا سنگھ قتل ہوا۔

۱۱- راجہ سچیت سنگھ " " " " -

۱۲- کیسرا سنگھ " " " " -

۱۳- دیوان بھیم سنگھ " " " " -

۱۴- امیر سنگھ اہلووالیہ مہاراجہ شیر سنگھ کے حکم سے پانی میں ڈبو کر مارا گیا۔

۱۵- چاند کور، زوجہ کھڑک سنگھ اور والدۂ نونہال سنگھ، شیر سنگھ کے حکم سے سنگسار کی گئی۔

۱۶- بابا بیر سنگھ، ہیرا سنگھ کے مقابلے میں مارا گیا۔

۱۷- کشمیرا سنگھ، " " " " " " -

۱۸- عطر سنگھ سندھیانوالہ " " " " " " -

۱۹- جنرل گلاب سنگھ کو عطر سنگھ سندھیانوالہ نے گولی سے مار دیا۔

۲۰- راجہ ہیرا سنگھ کو خالصہ فوج نے قتل کر دیا۔

۲۱- پنڈت جلا " " " "

۲۲- میاں لابھ سنگھ " " " "

۲۳- میاں سوہن سنگھ " " " "

۲۴- نکا دیوان چند " " " "

۲۵- فتح سنگھ مان کو گلاب سنگھ کے آدمیوں نے قتل کیا۔

۲۶- رتنو چودھری " " " " " " " -

۲۷- دیوان گپت " " " " " " " -

۲۸- کنور پشاورا سنگھ " " " " " -

۲۹- جواہر سنگھ " " " " " -

۳۰- بابا رتن سنگھ " " " " " " -

۳۱- بھائی جیٹھا سنگھ " " " " " " -

جو افسر اور سردار، انگریزی فوج کے ہاتھوں آخری جنگ میں مارے گئے۔

۱۔ چتر سنگھ کالووالیہ	فیروز پور شہر میں۔
۲۔ گنڈا سنگھ کنجاہ	″ ″ ″
۳۔ گلاب سنگھ کپتیا	″ ″ ″
۴۔ شام سنگھ اٹاری والا	سوبراؤں میں
۵۔ کشن سنگھ پسر خوشحال سنگھ	″ ″
۶۔ میوہ سنگھ مجیٹھیہ	″ ″
۷۔ جنرل مکا خاں	″ ″
۸۔ کرنل امام شاہ	″ ″
۹۔ منگلو (برادر منگلا)	″ ″
۱۰۔ ہیرا سنگھ ٹوپی	″ ″
۱۱۔ حکم سنگھ ملاویہ	″ ″
۱۲۔ دیوان رام دتہ	″ ″

سکھوں کی قومی خصائص

میجر سمتھ اپنی کتاب "لاہور کے حکمران خاندان" میں لکھتا ہے۔

صفحہ ۱۶۸۔ سکھوں کے لئے خوبصورت قدرتی مناظر، باغوں اور درختوں میں کوئی کشش نہیں۔ سکھ فوجیوں نے جلانے کے لئے لکڑی حاصل کرنے کے لئے بنوں شہر میں سب باغ تباہ کر دیئے۔ (یہی حال انہوں نے شاہی باغ پشاور کا کیا تھا۔ مؤلف)

چنار اور سرو کے سب درخت کاٹ دیئے۔

ص۱۷۱۔ "بنوں میں ہم ریشم کی صنعت کو فروغ دینے کی کوشش کرتے۔ لیکن توت کے سب درخت سکھوں نے ختم کر دیئے۔ سکھ جہاں بھی گئے، انہوں نے درختوں کا صفایا کر دیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہدِ حکومت کے چند قابلِ ذکر واقعات

ماخوذ از تاریخ "حقیقی رنجیت سنگھ" (REAL RANJIT SINGH) مصنفہ فقیر سید وحید الدین درج کئے جاتے ہیں۔ تاریخ کی جانچ بے لاگ اور ناقدانہ ہونی چاہیے۔ مؤرخانہ دیانت کا تقاضہ ہے کہ اس کی زندگی کا یہ رخ بھی پیش کر دیا جائے ؎

عیبش ہمہ گفتی - ہنرش نیز بگو

۱- رنجیت سنگھ کی حکومت کے سکہ کا نام (روپیہ) نانک شاہی تھا۔ اپنے نام کا کوئی سکہ نہ ڈھالا۔ ص ۳۰

۲- رعیت کے بنیادی حقوق کا مفصل فرمان ۳۱ - ۳۳ صفحات تک درج ہے اور فارسی میں ہے۔ اس کی دفتری زبان فارسی تھی۔

۳- مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں موت کی سزا نہ دی جاتی تھی۔ اگرچہ مہاراجہ پر ہی قاتلانہ حملہ کیوں نہ ہو (ص ۳۵)۔ میدان جنگ میں مخالفوں کو ان کی شکست کے بعد وہ معاف کر دیتا تھا اور برائے گذارہ جاگیر عطا کر دیا کرتا تھا۔ رنجیت سنگھ کے تحمل کے ثبوت میں اپنی ملکی روایت کا ذکر کرتا ہوں۔ کوٹ نجیب اللہ (تحصیل ہری پور) ایک بڑا قصبہ ہے، جس میں جلاہوں کی آبادی کی کثرت ہے۔ سکھوں کے عہد میں جلاہوں پر پانچ روپیہ فی کھڈی اور ایک روپیہ تانا ٹیکس لگایا گیا۔ ان ایام میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کا گزر اس قصبہ پر ہوا۔ قصبہ کی مستورات سب اکٹھی ہو کر باہر نکل آئیں اور مندرجہ ذیل گانا شروع کر دیا ؎

آیا نی رنجیت کا نڑا۔ پانچ روپے کھڈی لیندا چھوواں لیندا تانا۔

آیا نی رنجیت کا نڑا (یعنی کانا رنجیت سنگھ آیا ہے جو کھڈی پر پانچ روپے اور تانا پر ایک روپیہ ٹیکس لیتا ہے)، یہ سن کر اس نے یہ ٹیکس معاف کر دیا، جو اس کی عالی حوصلگی کا مظاہرہ تھا۔

۴- رنجیت سنگھ کے اعلیٰ افسرانِ حکومت ہر قوم سے تھے۔

(۱- راجہ دھیان سنگھ وزیر اعلیٰ ڈوگرہ - ۲- راجہ گلاب سنگھ اس کا بھائی اعلیٰ مرتبہ کا افسر - ۳- راجہ سچیت سنگھ (دوسرا بھائی)، اعلیٰ فوجی افسر - ۴- جمعدار خوشحال سنگھ (اصلاً برہمن جو سکھ ہو گیا تھا) میرٹھ کا رہنے والا تھا۔ مہاراجہ کا ڈیوڑھی وار دمیر صاحب (LORD CHAMBERLAIN) تھا۔

۵- بھائی رام سنگھ برادر خوشحال سنگھ دیوان ولی عہد کنور کھڑک سنگھ تھا اور اس کا بھتیجا راجہ تیج سنگھ اعلیٰ فوجی افسر تھا۔ ۶- راجہ دینا ناتھ، راجہ صاحب دیال، راجہ رلیا رام، دیوان اجودھیا پرشاد اور پنڈت تنکر ناتھ سب برہمن تھے اور بڑے مناصب پر مقرر تھے۔ ۷- دیوان ساون مل گورنر ملتان کھتری تھا۔ ۸- مسلمانوں میں فقیر عزیز الدین، نور الدین، امام الدین (تینوں بھائی تھے) قاضی نظام الدین، مفتی محمد شاہ اور بہت سے افسر اعلیٰ مراتب رکھتے تھے۔ ۹- سکھ مصاحبوں اور درباریوں میں سے سردار فتح سنگھ اہلووالیہ، سردار چتر سنگھ، شیر سنگھ، شام سنگھ اٹاری والا اور سردار دیوا سنگھ اور لہنا سنگھ مجیٹھیہ)

۱۰- مہاراجہ کی فوج کے جرنیل مختلف اقوام سے تھے۔ دیوان محکم چند، اس کا پڑپوتا پریم دیال اور پوتا رام دیال اور مصر دیوان چند ہندو تھے۔ ہری سنگھ نلوہ، فتح سنگھ کالیانوالہ، فتح سنگھ ڈلی والیہ، اور نہال سنگھ اٹاری والا سکھ تھے۔ الارڈ (فرانسیسی) وینٹورا (اٹالین) اور ابوطبیلہ (یورپین) تھے الٰہی بخش اور میاں غوثہ مسلمان اور بلبھدار گورکھا تھے۔ ص۳۶

۱۱- وفا بیگم شاہِ شجاع کی بڑی بیگم نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو کوہِ نور دینے کا وعدہ اس پر کیا کہ اگر وہ شاہ شجاع کو کشمیر سے چھڑا لائے۔ ص۴۸

۱۲- مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وقت چار صوبے تھے۔ لاہور، ملتان، کشمیر، پشاور۔ ہر صوبہ میں پرگنے اور تعلقے ہوتے تھے اور ہر تعلقہ میں ۵۰ - ۱۰۰ تک مواضعات ہوتے تھے۔ ہر صوبہ ایک ناظم کے ماتحت ہوتا تھا۔ اس کے نیچے کاردار (ضلع افسر) جو ڈپٹی کمشنر کے اختیارات کے حامل ہوتے تھے۔

باب دوم

تاریخ ہزارہ عہدِ سرکار انگریزی دولتمدار

و

جنگ خورد و بُردِ سنگھاں و دُرانیاں

تالیف فارسی

مہتاب سنگھ

اردو ترجمہ

ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنی

تعارف

میں عرصہ دراز سے تاریخ ہزارہ کے متعلق مواد حاصل کرتا رہا۔ جب نومبر ۱۹۵۶ء میں پنشن پر آیا اور ایبٹ آباد میں مسکن پذیر ہوگیا تو بھی تاریخ ہزارہ کے لئے مواد جمع کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ اس ضمن میں مَیں نے محترم غلام ربانی مرحوم لودھی (متوفی) ساکن سرائے صالح سے رجوع کیا تو انہوں نے ایک نایاب قلمی نسخہ تاریخ ہزارہ کے متعلق نشاندہی فرمائی۔ انہوں نے اپنے گرامی نامہ مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۶۷ء میں تحریر فرمایا "تاریخ ہزارہ کے متعلق ایک فارسی کتاب قلمی نسخہ جناب قاضی عبدالمالک ساکن مراد آباد کے خاندان[1] میں ہے۔ اہمیت کے لحاظ سے اچھی خاصی کتاب تھی جو سردار موہن سنگھ ہیڈ ماسٹر خالصہ ہائی سکول (۲۰-۱۹۱۰ء) ہری پور کئی مرتبہ اس کتاب کو مستعار لے جاتے رہے۔ اگر انہوں نے دے دی ہے تو قاضی عبدالمالک کی تحویل میں ہوگی"۔

جب قاضی عبدالمالک صاحب کلرک ڈگری کالج ہری پور سے رابطہ قائم کیا گیا تو انہوں نے یہ کتاب چند روز کے لئے مجھے عطا فرمادی۔

کتاب کا مطالعہ کیا گیا تو یہ بہت قیمتی مواد سے پر تھی اور ہزارہ میں عہد سکھاں کی معتبر اور چشم دید تاریخ تھی۔ اس سے میں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اس کا مواد اپنی تاریخ ہزارہ[2] میں مناسب جگہوں پر درج کیا۔

جب میں نے اپنا مسودہ تاریخ کا ایک حصہ "حضرت سید احمد شہیدؒ کی شہادت کے باب کا ترجمہ مولانا مہرؒ (وفات ۱۶ر نومبر ۱۹۷۱ء) کو بھیجا تو انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ اس کتاب کی نقل ان کو بھیج دوں۔ ان کے حکم کی تعمیل میں دو نقول تیار کی گئیں۔ ایک اپنے پاس رکھی اور دوسری

---

[1] کتاب کے آخر میں کاتب نے اپنا جو تعارف کرایا، اس کا ترجمہ بھی شامل کتاب کیا گیا ہے۔ افسوس ہے میں اس خاندان کا پورا حال باوجود کوشش حاصل نہ کر سکا۔ [2] شائع شدہ ۱۹۶۹ء۔

ان کو بھیج دی۔ انہوں نے اس کتاب کا وہ حصہ جو شہادت حضرت سید احمد شہیدؒ کے متعلق تھا اپنی کتاب "سیرت سید احمد شہیدؒ" کی اشاعت سوم ۱۹۶۸ء کے آخر میں اس پر تین باب کا اضافہ کیا اور تمہید میں لکھا:

"میں سید صاحبؒ کی شہادت کے متعلق وہ تمام ماخذ دیکھ چکا تھا جن کا علم ہو سکا اور وہ میری دسترس میں آسکے۔ خیال نہ تھا کہ کوئی ضروری کتاب یا بیان باقی رہ گیا ہو گیا ہو گا۔ میرے عزیز اور ہم مشرب دوست ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنی (دارالشفاء ایبٹ آباد) نے ایک نیا ماخذ ڈھونڈھ نکالا۔ جس کا نام ہے "تواریخ ہزارہ بہ عہد سرکار دولتمدار"۔ یہ سکھوں کے دورِ حکومت کے متعلق ضلع ہزارہ کی تاریخ ہے جو غالباً ۱۸۴۹ء میں لکھی گئی۔ ڈاکٹر شیر بہادر خان نے اس میں سے بالاکوٹ کی سرگزشت کا خلاصہ مرتب کر کے بھیج دیا تھا پھر اصل مخطوطہ ارسال فرما دیا۔ یہ اصل کی نقل ہے جو ۱۹۲۹ء میں لکھی گئی اور سواسو صفحات پر مشتمل ہے ...... جنگ بالاکوٹ کی سرگزشت اس قلمی نسخے میں ص۷۹ سے ص۸۹ تک ہے۔ میں ڈاکٹر شیر بہادر خاں کی اجازت سے اور ان کے دلی شکریے کے ساتھ اسے یہاں بیان کرتا ہوں"۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"مصنف اور وجہ تصنیف۔ کتاب کے مصنف کا نام مہتاب سنگھ ہے۔ ذات کائستھ ساکن مرلی پورہ پرگنہ موسیٰ نگر ضلع کان پور (یو۔پی)، یہ شخص تلاش معاش میں وطن سے لاہور پہنچا۔ پانچ برس کنور کھڑک سنگھ (ولیعہد رنجیت سنگھ) کی سرکار میں ملازم رہا۔ یہ مدت اس نے پرگنہ ساہیوال میں گزاری جو دیوان ٹوڈر مل کی عملداری میں تھا۔ پھر دس مہینے فتح سنگھ کے ساتھ منکیرہ[1] میں رہا۔

---

[1] ۔ منکیرہ ملتان کے شمال اور جھنگ کے مغرب میں ہے۔ سکھوں کے زمانہ میں دوآبہ سندھ ساگر (مابین سندھ و جہلم) میں ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ منکیرہ میں ایک زبردست قلعہ تھا اس علاقہ کے گورنر

میجر ایبٹ (پہلا ڈپٹی کمشنر ہزارہ) نے اپنی ڈائری مورخہ ۳ مئی ۱۸۴۸ء از ہری پور ہزارہ بجانب ریذیڈنٹ لاہور میں لکھا کہ جب اپریل ۱۸۴۸ء میں دیوان مولراج حاکم ملتان نے بغاوت کر دی تھی اور میجر ایبٹ ہزارہ سے امداد کے لئے فوج بھیجتا تھا۔ اس میں لکھتا ہے کہ راستہ میں منکیرہ کا زبردست قلعہ ہے۔ اس کو فتح کر کے ملتان پر بڑھنا ہوگا۔ وہ لکھتا ہے کہ منکیرہ کا قلعہ صحرائے کے درمیان ہے۔ یہ کچی اینٹوں کا حصار ہے اور چاروں طرف خشک خندق ہے۔ اس کو پہنچنے کے لئے سندھ سے دو لمبی منزلیں طے کرنی ہوں گی اور اس فاصلہ کے درمیانی کیمپ میں کنواں کھودنے کی ضرورت ہوگی۔

منکیرہ کی تاریخ: ایڈورڈ اپنی کتاب "پنجاب کی سرحد پر ایک سال" جلد دوم ص۹۵ پر لکھتا ہے۔ منکیرہ قلعہ کی اہمیت صرف تاریخی لحاظ سے ہے نہ کہ استحکام کے لحاظ سے۔ یہ قلعہ حافظ احمد خاں۔ نواب منکیرہ نے کچی اینٹوں اور مٹی سے بنوایا تھا۔ یہ صحرائے کے مرکز میں واقع ہے۔ اس کے چاروں طرف بیس بیس میل پر چار چوکیاں بنوائیں اور منکیرہ کے ارد گرد دس بارہ میل تک سب کنوئیں بند کرا دیئے تھے۔

باوجود اس احتیاط برائے حفاظت قلعہ رنجیت سنگھ نے ۱۸۔ نومبر ۱۸۲۱ء میں جب اس کے سامنے کیمپ لگایا تو نواب نے ۱۲ دسمبر ۱۸۲۱ء کو قلعہ رنجیت سنگھ کے حوالے کر دیا۔

اس قلعہ کی اہمیت کے پیش نظر رنجیت سنگھ نے اس قلعہ کا چارج نہ ہی ساون مل (حاکم ملتان) اور نہ ہی اس کے لڑکے مولراج کو دیا۔ بلکہ اس میں ہمیشہ سکھ فوج رکھی۔

ص۲۸۹ پر ایڈورڈ لکھتا ہے کہ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے منکیرا کا قلعہ ۱۸۲۱ء میں نواب سے لیا تو اس کو ایک معاہدہ لکھ کر دیا۔ جس پر بطور تصدیق اپنا پنجہ (ہاتھ) زعفران میں ڈبو کر نشان لگایا کہ ڈیرہ اسمٰعیل خاں ہمیشہ نواب کی جاگیر رہے گا۔ لیکن ۱۸۳۶ء میں وعدہ خلافی کر کے ڈیرہ اسمٰعیل خاں پر فوج سے حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ شرمندگی کی وجہ سے وہ خود فوج کے ساتھ نہ گیا بلکہ اپنے پوتے نونہال سنگھ کو بھیجا اور نواب کی جگہ دیوان لکھی مل کو حاکم مقرر کر دیا۔

(بقیہ حاشیہ) کے والد احمد خاں نے جو برائے نام کابل کی حکومت کے ماتحت تھا۔ بہت عرصہ تک سکھوں کا مقابلہ کیا لیکن اواخر ۱۸۲۱ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ خود مقابلہ کے لئے گیا۔ رنجیت سنگھ کی عزت مندانہ شرائط پر قلعہ اس کے حوالے کر دیا گیا اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں کا علاقہ اس کے عوض میں بطور جاگیر حافظ احمد خان کو دیا گیا
(کننگھم کی تاریخ سکھاں ص۱۵۹)

ترجمہ کی ضرورت مدت سے اس کتاب کی نقل (فارسی) میرے پاس پڑی ہوئی ہے۔ چونکہ یہ ایک قیمتی کتاب ہے لہٰذا خیال ہوا کہ اس کا ترجمہ (اصل کتاب فارسی میں ہے) شائع کر کے مستقبل کے شائقین کے لئے اس کتاب کو محفوظ کر دیا جائے۔ کتاب کی زبان پرانی اور ادق ہے۔ بعض جگہ عبارت بھی نقل در نقل کی وجہ سے مسلسل نہیں رہی۔ تاہم اپنی بھرپور کوشش کر کے شائع کرنے کا اہتمام کر رہا ہوں۔

کتاب کی وجہ تالیف

(از قلم مؤلف مہتاب سنگھ)

"جیمبر لین صاحب[1] ہر وقت غربا پروری و رعیت نوازی میں مصروف ہیں۔ پرانی کتابوں کے آئین کے مطابق رعیت کے فائدے، خلق کی خوشنودی میں کوشاں ہیں۔ روٗساں، سفید پوشان، زمینداران، سب چھوٹے بڑوں کے ساتھ یکساں عنایت و شفقت کا سلوک کرتے ہیں۔ اس لئے سب لوگ ان کی انصاف پسندی میں رطب اللسان ہیں۔

کچھ مدت کے بعد صاحب موصوف برائے نظم و نسق ہزارہ تشریف لائے۔ ایک روز

بقیہ حاشیہ: ۱۸۰۱ بکرمی (۱۸۲۴ء) میں ہری سنگھ نلوہ کے پاس ہزارہ پہنچا اور دفتر میں مامور ہوا۔ پھر پچیس سال اس نے ہزارہ میں گزار دیئے۔ جب پنجاب پر انگریز قابض ہوئے اور میجر جیمبر لین ہزارہ پہنچا تو اس نے مہتاب سنگھ سے کہا کہ تم تیس برس اس ملک میں گزار چکے ہو۔ اگر اس ملک کے چشم دید حالات کتاب کی شکل میں مرتب کر دو تو وہ کتاب تمہاری یادگار رہے گی اور یہ امر ہماری خوشنودی کا باعث ہوگا۔"

یہ کتاب اس زمانہ کے چشم دید حالات و تفصیل پر مبنی ہے۔ اس کی عبارت مسجع و مقفیٰ فقرات سے بھری ہوئی ہے۔ کہیں کہیں عربی ضرب الامثال اور عموماً فارسی امثال و ابیات ہیں اور اس زمانے کی عادت کے مطابق عبارت طول طویل ہے۔ مگر میں نے اس کتاب کے مطالب کو ہی مختصر الفاظ میں ترجمہ کر دیا ہے۔"

---

[1] پہلا مہتمم بندوبست ہزارہ۔

برسرِ اجلاس استفسار فرمایا کہ کیا کسی نے ملک ہزارہ کی تاریخ لکھی ہے، جس میں کیفیت ماضی ہو۔ چونکہ ایسی کوئی کتاب کسی سے دستیاب نہ ہو سکی تو اس بندہ کو خطاب کیا کہ تم اس ملک میں کس طرح آئے ہو؟

عرضِ حالِ مؤلف

اس کے جواب میں عرض کیا:

"کہ میرا وطن مرلی پور ہے۔ جس کا پرگنہ ہوگنی پھر موسٹی نگر متعلقہ ضلع کان پور ہے۔ میرا نام مہتاب سنگھ اور قوم کائستھ ہے۔ تلاشِ روزگار میں لاہور آیا اور سرکار مہاراج صاحب کنور کھڑک سنگھ نوکر ہو گیا۔ اور پانچ سال، دیوان ٹوڈرمل کی عملداری میں دفترِ پرگنہ ساہیوال بھوخان میں رہا۔ اس کے بعد دس مہینے سردار فتح سنگھ حاکم منکیرہ کی خدمت میں گزارے اس کے بعد سردار ہری سنگھ کا ملازم ہو کر ۱۸۸۱ بکرمی (مطابق ۱۸۲۴ء) ملک ہزارہ میں پہنچا۔ آج تک تیس برس اس ملک میں گزارے۔

اس پر میجر چیمبرلین نے فرمایا کہ تیس سال کا عرصہ بڑا عرصہ ہے۔ لہٰذا اس عرصہ کے چشم دید حالات بطور تاریخ قلمبند کرو، تاکہ ہماری خوشنودی کا باعث ہو اور تاریخ میں تمہارا نام بھی رہ جائے۔ لہٰذا ان کے فرمان کی تعمیل میں کمر ہمت باندھی اور کتاب لکھنی شروع کر دی۔

بیان سرحد غربی ہزارہ از طرف سری کوٹ

ہزارہ کو قارلق ہزارہ کہتے ہیں جس کا حدود اربعہ یہ ہے۔

علاقہ سری کوٹ کی حد دریائے سندساگر سے ملحق ہے۔ اس میں چار دیہات موضع کنڈی انبار خانہ (مشہور امر خانہ۔ مترجم) ڈل، موسہٹ، دریا کے کنارے پر ہیں اور سری کوٹ پہاڑ کے درمیان آباد ہے۔ ان میں مشوانی قوم آباد ہے، جو اپنے آپ کو سید کہتے ہیں۔ نیک اور دیانتدار مسلمان ہیں۔ کوئی بدکاری یا بدروی ان میں ہرگز نہیں۔ ان کا ملک پہاڑی ہے اور کاشتکاری بہت کم۔ تھوڑی تھوڑی زمین پر اوقات بسری کرتے ہیں۔ فصلِ ربیع میں گندم، جو، مسور اور سرسوں اچھے پیدا ہوتے ہیں۔ موسم خریف میں اگر بارش کم ہو، تو کچھ بھی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر بارش برابر ہوتی رہے تو مکی، باجرہ اور موٹھ پیدا ہوتے ہیں۔ ربیع کی فصل زیادہ اور خریف کم ہوتی ہے۔ جنگلی میوہ انجیر، کنار اور سنبلو وغیرہ ہوتے ہیں۔

پرانی آبادیاں پرانی آبادیوں کی نشانات اب تک موجود ہیں۔
۱۔ چونترو۔ زمانہ قدیم کی آبادی ہے۔ شہر کے کوٹھ ہائے اور دیواروں کے نشانات اب تک موجود ہیں۔
۲۔ پہاڑ کی چوٹی پر ایک قلعہ کے آثار باقی ہیں۔ اس کو مسلمان کافر کوٹ اور ہندو راجکوٹ کے نام سے پکارتے ہیں۔ قلعہ کی دیواریں، دروازہ، سنگی محرابیں باقی ہیں۔ دیگر مکانات کے کھنڈرات بھی نظر آتے ہیں۔
۳۔ کوکر گلی۔ زمانہ قدیم بڑا شہر رہا ہے۔ اس کی دیواریں اور بعض جگہ بنیادیں موجود ہیں۔ کافر کوٹ (راجکوٹ) کے نزدیک ایک بہت بڑا غار[ل] ہے۔ جس کے دروازے پر ایک بڑا پتھر چسپاں ہے۔ بیان کرتے ہیں کہ راجہ رسالو جو اس ملک کا حکمران تھا، نے ایک دیو کو اندر بند کر دیا تھا۔ اور کبھی کبھی اس غار سے ایک مہیب آواز جس سے دس بارہ کوس تک زمین ہل جاتی ہے، آتی رہتی ہے۔ لیکن ۱۸۹۸ بکرمی (مطابق ۱۸۴۱ء) میں جب سندھ میں سخت طغیانی آئی، اس کے بعد سے یہ آواز سنائی نہیں دی۔

[ل] - بیان سید عثمان مشوانی۔ یہ میرے دوست سری کوٹ کے رہنے والے ہیں۔ اور ۱۹۷۷ء میں ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس ہزارہ ڈویژن کے دفتر میں کام کرتے ہیں۔ ان سے میں نے غار کے متعلق استفسار کیا تو کہنے لگے کہ دیو والا قصہ تو فرضی معلوم ہوتا ہے۔ غار کی تحقیق کے متعلق انہوں نے بیان کیا کہ مولانا عصمت اللہ صاحب ساگن سری کوٹ بمعہ چند افراد کے مسلح بہ اسلحہ و لالٹین اور ٹارچ غار کے اندر ۱۹۳۰ء میں گئے تھے۔ ان کا بیان تھا کہ غار کے اندر باقاعدہ سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تنگ دروازے ہیں، جن کے اندر لیٹ کر یا رینگ کر ہی جایا جا سکتا ہے۔ سید عثمان خود بھی فروری ۱۹۷۷ء میں غار کے اندر گئے۔ لیکن زیادہ اندر نہ جا سکے وہ کہتے ہیں کہ یہ غار قلعہ کافر کوٹ سے مشرقی جانب پر ڈھلوان میں ہے۔ تھوڑا سا بیرونی حصہ کا فرش ڈھلوان ہے اور تیس چالیس قدم آگے جا کر فرش ہموار ہو جاتا ہے۔ وہ اس غار کی دیوار سے چند پتھر کے ٹکڑے توڑ کر لائے ہیں جو اعلیٰ سنگِ مرمر کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ نوٹ: غار کی ساخت اور قلعہ و آبادی سے قربت اس کو پرانے زمانہ کے سنیاسیوں کے عبادت گاہ، مندر معلوم ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حد شرقی ہزارہ

یہ حد مواضعات چنبہ و نوشہرہ و بگڑہ (جدون افغانوں کے دیہات) اور موضع رجوعیہ سے ملحق ہے۔

حد جنوبی

گگھڑوں کے ملک خان پور سے ملحق ہے۔ چنانچہ موضع بریلہ، کھدو، بنجو، اور کالی ترار ہزارہ کی حد میں ہیں اور باڈھی نیکو، رانٹری واہ اور حطار خان پور کی حد میں ہیں۔

حد شمالی

ڈنہ تنول، موضع الوٹی، موضع تیر اور پنڈ ہاشم خان ہزارہ کی حد میں ہیں۔ ملک تنول اور ہزارہ کی حد فاصل نالہ دوڑ ہے۔ جو بیرن گلی علاقہ کرڑال سے نکل کر جدونوں کے ملک کے دیہات نواں شہر، دھمتوڑ، رجوعیہ، چنبہ اور نوشہرہ سے گزرتا ہے۔

اس نالہ دوڑ سے ایک بڑا چشمہ شاہ مقصود کے باغ سے جو علاقہ سرائے صالح ملک دلزاک میں ہے، نکلتا ہے۔ اس نالہ دوڑ اور اس کے چشموں سے ہزارہ کے بہت سے دیہات کی زمینیں سیراب ہوتی ہیں۔ پونا کماد (چوسنے والا گنا) بہت پیدا ہوتا ہے اور زرد چوبہ اور پوست پیدا ہوتا ہے۔ محنت کرنے والے زمیندار بہت پیداوار حاصل کر لیتے ہیں۔ فصل ربیع و خریف خوب پیدا ہوتے ہیں۔ گنے سے گڑ بناتے ہیں۔

نہریں

دریائے دوڑ سے سرائے صالح سے نیچے نہریں نکالی گئی ہیں۔ جن کا بانی مبانی ایک رنگیلا نامی کھتری ساکن موضع درویش (نزد ہری پور شہر) اور ان نہروں کا نام آج تک رنگیلا مشہور ہے۔

(آج تک اس نظام آبپاشی میں نہ کوئی ایزادی کی جا سکی اور نہ ہی اس سے بہتر انتظام ہو سکا۔ مترجم)

اس رنگیلا کے کٹھہ سے یہ علاقہ اپنے پانی کی سب ضروریات پوری کرتا ہے (ہری پور کی سرسبزی اور آبادی اس کی رہینِ منت ہے۔ مترجم)

اس رنگیلا کے کٹھے کے بالمقابل ایک کٹھ سرائے صالح کے نزدیک پٹی تورکی کے دیہات مانکرائے، پھرالہ و مکھن وغیرہ کو سیراب کرتا ہے اور علاقہ خالصہ کھلابٹ کو بھی پانی دیتا ہے۔

نالہ دوڑ تور کی پٹی کے دیہات کے ساتھ بہتا ہوا بھارو کوٹ نزد موضع متصلہ دریائے سرن میں مل جاتا ہے۔ (اب یہ سب دیہات تربیلا ڈیم کی وجہ سے زیر آب آگئے ہیں۔ مترجم)

ملک گگھڑ خان پور کا علاقہ نالہ ہرو سے سیراب ہوتا ہے، جس کی ایک شاخ ملک کرڑال موضع ستوڑہ و ماڑہی اور ایک شاخ ملک ڈھونڈ، موضع نگری و بیر سے نکلتی ہے۔ ان دو شاخوں اور اردگرد کی وادیوں سے پانی مل کر دریائے ہرو بن جاتا ہے اور خان پور کے ساتھ بہتا اور دیہات علاقہ خان پور کو سیراب کرتے ہوئے ملک کھاٹڑ سے گزرتا ہوا اور چھوٹے ندی نالوں کو ساتھ لیتا ہوا، نیلاب کے گھاٹ، دریائے سندھ میں جا گرتا ہے۔ اس کی وجہ سے علاقہ خان پور کا علاقہ باغات اور درختوں مثلاً آم، شاہ توت اور قسم قسم کے انگوروں سے پر ہے۔ گنا خوب پیدا ہوتا ہے اور اس پر بہت سے جندر خان پور میں آٹا پیسنے کے لئے چلتے ہیں۔ گنے کے رس سے گڑ بنایا جاتا ہے فصل خریف اور ربیع میدان خان پور میں خوب ہوتے ہیں مگر پہاڑی علاقہ میں فصل خریف زیادہ ہوتا ہے اور ربیع کم۔ معاملہ سرکار بحساب پنجدوئی، یعنی سہ حصہ خریف میں اور دو حصہ ربیع میں ادا کرتے ہیں۔ سوختنی لکڑی اور گھاس افراط سے پیدا ہوتا ہے۔

ایک ندی موسوم بہ نیلاں چلہ شاہ حبیب فقیر سے نکل کر چیس کے پہاڑ کے نیچے سے ڈنہ مستا اور راجدھان و کنتھیلا کے پہاڑ سے گزر کر دریائے ہرو میں شامل ہو جاتی ہے۔ اس ندی کا پانی بہت صاف اور پاک ہے۔ اس کے کنارے پر میٹھے پانی کے چشمے ہیں، جو گرمیوں میں سرد اور سردیوں میں گرم ہوتے ہیں۔ جنگل میں انار دانہ کے درخت بہت ہیں۔

خان پور کی سرحدات اس کی مغربی حد ملک کھاٹڑ کے ساتھ ملحق ہے۔ پنڈ شیرو خانپور کی حد میں ہے اور خرم و عثمان کھاٹڑ کی حد میں۔

جنوبی سرحد پر ملک گورڑہ (گوراٹھ۔ مترجم) ہے۔ ان کی درمیانی سرحد، درمیان کے پہاڑ کی چوٹی ہے۔

مشرقی سرحد پر ڈھونڈ اور کرڑال کا علاقہ ہے۔ چنانچہ موضع بدھار شامل خان پور ہے اور ہر دو مساۃ شامل پٹی کرڑال ہیں اور موضع پھلا، ڈھونڈ کی حد میں ہے۔ کوہمل، ہلی اور

دیرکوٹ خان پور کی حدمیں ہیں اور نور پور، ڈھونڈ کی حدمیں۔

خان پور کی شمالی سرحد ہزارہ سے ملحق ہے۔ چنانچہ موضع چھجیاں اور باندھی نکو، خان پور کی حدمیں اور ربریلہ اور نوروہی، ہزارہ کی حدمیں واقع ہیں۔

ہزارہ کی مشرقی سرحد مشرقی سرحد پر قوم کرڑال کا ملک ناڑہ وستوڑا ہے، جس کو دفتر میں ناڑہ نیلاں لکھتے ہیں۔ یہ پہاڑی ملک ہے اور ایک گھوڑے کے دوڑنے کے لئے میدان نہیں ہے۔ لہٰذا اس علاقہ کی آبادی کوہستان کی طرح چھوٹے چھوٹے گاؤں پر مشتمل ہے۔ جہاں بھی تھوڑی سی زمین ہے، وہاں پر زمینداروں نے چند مکان بنا کر گاؤں بنالئے ہیں۔ اسی زمین پر مویشی کے کوٹھے بنالئے ہیں اور وہاں ہی کھاد وغیرہ زمین میں ڈال دیتے ہیں۔ فصل خریف زیادہ ہوتا ہے اور ربیع کم۔ گندم بہت کم۔ البتہ جَو قدرے ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا سرکار معاملہ خریف میں دو حصہ اور ربیع میں ایک حصہ ادا کرتے ہیں۔ آبی زمین کم ہے۔ زیادہ تر بارانی ہے۔ بعض جگہوں، مثلاً ستوڑہ اور ایک دو دیہات میں آبپاشی ہوتی ہے جس میں چاول پیدا ہوتا ہے، جو اچھی قسم کا نہیں ہوتا۔

ملک کرڑال کا حدود اربعہ حد غربی اور شرقی علاقہ خان پور سے ملحق ہے۔ موضع دارتی، ڈیال خان پور کی حدمیں ہے اور موضع نگری ڈھونڈ کی حدمیں ہے۔

موضع لنگرٹیال، وڈبراں۔ حد ناڑہ نیلاں میں ہے اور تجوال اور باگن حد کرڑال میں ہیں۔

جنوب میں موضع جبڑی بدھار، خان پور کی حدمیں ہے اور موضع چنجاہ، ومساح حد کرڑال میں ہے۔

حد شمالی میں بیرن گلی، کرڑال کی حدمیں

حد غربی: مالسہ، چوکنیال، سراڑہ، جدون پتہ سالار سے ملحق ہے۔ سالار (جدون) کی سرحد پر ایک موضع کیاآہ جو علاقہ کرڑال میں ہے، میں ایک چشمہ ہے جس کا پانی بہت میٹھا اور خوشگوار ہے۔ سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں ٹھنڈا ہوتا ہے۔ یہ چشمہ حد خان پور، کرڑال کے درمیان والے پہاڑ سے نکلتا ہے۔ اس پہاڑ پر سردیوں میں برف برستی ہے اور ناڑہ میں تو اتنی برستی ہے کہ زمین سے دو دو گز اوپر تک بڑھ جاتی ہے۔ بیساکھ اور جیٹھ تک زمین پر پڑی رہتی ہے۔

سرحد ملک جدون جانب مشرق

ملک جدون میں تین تپہ آباد ہیں۔
۱۔ سالار۔ یہ رجوعیہ میں آباد ہیں اور ان کے تقریباً ۲۵ گاؤں اس علاقہ میں آباد ہیں۔ یہ اپنے علاقہ کی زمین خود کاشت کرتے ہیں اور معاملہ سرکار میں ادا کرتے ہیں۔ سالار کے علاقہ کی حد کوہ تاڑہ نیلاں تا بہ سرحد چنبہ و نوشہرہ، جو ہزارہ کے ملک سے ملحق ہیں تک ہے۔ یہ ملک مشرق سے مغرب تک سات کوس ہوگا۔ دریائے دوڑ، ملک سالار میں بہتا ہے۔ اور جنوب و شمال ایک کوس کے برابر بلکہ بعض جگہ اس سے بھی کم ہے۔ حد شرقی جو ہزارہ سے ملحق ہے اس میں موضع چنبہ اور نوشہرہ اور رو اندھی، اخون باندھی، و موہڑی و بھیڑی، و کھولیاں حد سالار میں ہیں اور مقصود، حد ہزارہ میں۔ جدون کے ملک کے حد شرقی ملک کرڑال سے ملحق ہے۔ کیالہ، چپڑ، حد کرڑال میں اور موضع ہر تاڑہ و پھوگراں حد سالار میں ہیں۔ جنوبی حد بگڑہ و نیلاں سے پیوست ہے۔ موضع حاجیا چنگہ حد نیلاں میں اور موضع پھلا نوالی اور رو اندھی پنڈو حد سالار میں ہیں۔ حد شمالی ملک سالار، علاقہ دھمتوڑ علاقہ حسنہ زئی (حسن زئی۔ مترجم) کے ساتھ ساتھ ہے۔ موضع بازدارہ سالار کی حد میں ہے اور موضع باندہ صاحب خان اور کھوکھر، حسن زئی علاقہ دھمتوڑ کی حد میں ہیں۔

پیداوار

سالار کے علاقہ میں فصل خریف زیادہ اور ربیع کم ہوتی ہے۔ چنانچہ معاملہ سرکار بر حساب پنجدوئی، تین حصہ خریف میں اور دو حصہ ربیع میں دیتے ہیں۔ خریف میں مکی، ماش، مونگ وغیرہ اور ربیع میں گندم، جو، سرسوں اور مسور پیدا ہوتے ہیں۔

دوسرا حصہ ہسہ زئی (حسن زئی۔ مترجم)، تعلقہ دھمتوڑ ہے۔ دھمتوڑ، شنخن باندھی اور دھمتوڑ کی باندھیوں میں زمیندار رہتے ہیں۔ باقی تمام دیہات پہاڑ میں ہیں۔

تیسرا پتہ منصور ہے اور نواں شہر کا تعلقہ ان کا ہے۔ نواں شہر اور میر پور میدان میں ہیں۔ باقی دیہات پہاڑ میں ہیں۔ دھمتوڑ اور نواں شہر کی زمین جو میدان میں ہے اس کو زمین اورش (درشس۔ مترجم) کہتے ہیں۔ یہ ہر وقت گیلی رہتی ہے۔ برسات کے دنوں میں تو ان زمینوں کے چاروں طرف نالے کھود دیئے جاتے ہیں، تاکہ زمینوں کا پانی اس خندق میں آجائے اور کھیت میں فصل ہو سکے۔ اگر اس طرح سے کھیت سے پانی نہ نکالا جائے تو فصل نہیں ہوتی فصل خریف

اچھا ہوتا ہے، لیکن ربیع کم۔ لہٰذا معاملہ سرکار بہ حساب پنجدو۔ سہ حصہ فصلِ خریف میں اور دو حصہ فصلِ ربیع میں ادا کرتے ہیں زمین میں پانی کی افراط سے درخت بھی نشو و نما نہیں کرتے۔ سردیوں میں برف پڑتی ہے۔ بہت سرد علاقہ ہے۔ گرمیوں میں بھی پسینہ نہیں آتا۔ اس علاقہ کے پہاڑ بہت سرد ہیں۔ چنانچہ ٹھنڈا پانی کے پہاڑ میں ساون کے مہینے میں بھی لحاف کے بغیر آدمی نہیں سو سکتا۔ موضع مانگل کے دیہات بھی ملحق ہیں۔ جن میں افغان (جدون۔ مترجم) رہتے ہیں۔ مانگل نام کا نالہ جن کو ملکی زبان میں گرس کہتے ہیں، یہاں سے گزرتا ہے۔ اس کا منبع کا پہاڑ علاقہ ہیہ زئی (حسن زئی۔ مترجم) و منصور و بیرن گلی (ملک بنیر) میں واقع ہے۔ مانگل سے گزر کر موضع مور کلاں سے ہوتا ہوا ملک تنول میں نالہ سرن سے مل جاتا ہے۔ مانگل نالہ سے ایک بہت ہی شیریں چشمہ موسوم بہ ہوکی ستر (مانگل کے گاؤں سے نیچے) نکلتا ہے۔ اس کے گرد بڑے بڑے درخت از قسم املوک و کنگر وغیرہ اگے ہوئے ہیں۔ اس کا پانی سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں ٹھنڈا ہوتا ہے۔ یہ ملک دھمتوڑ تا سرحد پکھلی چھ کوس ہوگا۔ اور سرحد جدون و پکھلی پر ایک پختہ عمارت (موسوم بہ برج۔ مترجم) بنی ہوئی ہے اور مغرب سے مشرق تک حسن زئی و منصور دو کوس کے قریب ہوگا۔

دھمتوڑ سے نیچے اور مشرق کی طرف نالہ دوڑ نکلتا ہے اور مغرب کی طرف سے ایک چشمہ اتکیہ سے نکلتا ہے اور چونہ کاری کے چشمہ کا پانی جو میدانِ نواں شہر میں ہے اور چشمہ تنول باشی[1] جو چونہ کاری کے ساتھ ہے، دونوں کا پانی مل کر دھمتوڑ کی طرف آتا ہے۔ دھمتوڑ اور نواں شہر کے درمیان فاصلہ ایک کوس ہے۔ ایک چھوٹا سا نالہ ہے، جس میں تنول باشی، چونہ کاری اور شیخن باڈھی کے چشموں کا سب پانی مل کر نواں شہر اور دھمتوڑ کے نیچے آ کر گرتا ہے۔ اس پر بہت سے جندر ہیں۔ پھر یہ سب پانی اتکیہ کے چشمے کے پانی سے مل کر دھمتوڑ کے مغرب و شمال کے گوشہ کے نیچے سے گزرتا ہے، جس کو دڑگن کہتے ہیں۔ پھر یہ سب پانی مقام نہتور، دریائے دوڑ میں مل کر سالار کے علاقہ میں آ جاتا ہے۔

---

[1] موجودہ نالہ موسوم بہ لیاسی۔

کیفیت ملکِ پکھلی

پکھلی، صواتی قوم کی ملکیت ہے۔ یہ افغان ہیں۔ صوات سے آکر اس ملک پر قابض ہوئے اور صواتھی کہلائے۔ پکھلی بہت سیر حاصل و سرد ملک ہے۔ آب و ہوا اچھی لیکن بھادوں واسوج (ستمبر، اکتوبر) جب چاول کے خوشے نکلتے ہیں ہر شخص ملکی و غیر ملکی، جو بھی یہاں ہو، بخار میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

جائے صدر
موضع شنکیاری، پکھلی کا جائے صدر ہے۔ یہاں بازار ہے اور خرید و فروخت ہوتی ہے۔ روغن زرد کوہستان سے لاکر بیوپاری یہاں بیچتے ہیں۔ یہاں سے یہ ہزارہ و پشاور کے بیوپاری خرید کر لے جاتے ہیں۔

علاقے
پکھلی کے تین علاقے مقرر ہیں۔
۱۔ مانسہرہ ۔ ۲۔ علاقہ بھیڑ گنڈ ۔ ۳۔ تین کوہستانی درے۔ یعنی درہ کاگان[^۱]، درہ بھوگڑ منگ[^۲] و درہ اگرور[^۳]۔

کُنہار نامی دریا جو ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ شمال کی طرف کاگان پائین سے نکل کر بالاکوٹ سے ہوتا ہوا گڑھی سعادت خاں (حال گڑھی حبیب اللہ، مترجم)، کے نزدیک دریائے جہلم میں جا گرتا ہے۔

بڑا پہاڑ جو نالہ کنہار، مشرق میں ہے اور اس کا پانی کنہار کی طرف آتا ہے، صواتھی کی حد ہے اور جو پانی اس پہاڑ سے دوسری طرف یعنی مشرق میں گرتا ہے وہ مظفرآباد کی حد میں ہے۔ درہ دریائے کنہار کا طول گڑھی سعادت خاں تا دیہات کاگان، سنگھڑ، وانگراہی وغیرہ جنوب سے شمال تک پندرہ کوس ہوگا۔

مشرق و مغرب جس سے دونوں طرف کے پہاڑوں کا پانی گرتا ہے۔ بعض جگہ ایک کوس اور بعض جگہ آدھا کوس ہوگا۔

---

[^۱]: یہ علاقہ ہزارہ کے انتہائی شمال میں مشرق میں کشمیر اور مغرب میں قبائلی علاقہ کے درمیان ایک پچر کی مانند واقع ہے اس کی لمبائی براہ راست سیدھی، جنوب مغرب سے شمال مشرق تک ۔ میل اور بذریعہ سڑک بابوسر سے بالاکوٹ سے ۱۲ میل ہے۔ اس کی اوسط چوڑائی ۱۵ میل ہے۔

درہ بھوگر منگ اس کے شمال میں دریائے سرن جاری ہے۔ جو اچھڑیاں اور موضع وھڑیال تک دس کوس ہوگا۔ سرن کے دونوں طرف اونچے پہاڑ ہیں۔ پہاڑوں کے دامن میں جہاں بھی کچھ زمین ہے اس جگہ چند گھر آباد ہیں۔ زمین آبی ہے، لہٰذا چاول اور مکئی پیدا ہوتے ہیں۔ فصلِ ربیع درہ کنہار، بھوگرمنگ اور اگرور میں کم ہوتی ہے۔

معاملہ سرکار سال میں ایک دفعہ فصلِ خریف میں ادا کرتے ہیں۔

سردیوں میں سب زمیندار و گوجر معہ مال و مویشی پہاڑ سے نیچے آجاتے ہیں اور گرمیوں میں پہاڑ پر چلے جاتے ہیں۔ اس علاقہ میں آبادی کم ہے۔ تانبے یا مٹی کے برتن کم ہوتے ہیں مکھن اور روغن زرد بہت پیدا ہوتا ہے۔ صنوبر، چیڑھ و دیار کے درختوں کو کاٹ کر اس کو اندر سے خالی کر کے برتن بنا لیتے ہیں۔ صنوبر کے درخت کو آدمی کے قد کے برابر کاٹ کر اس کے اندر کو کرید کر کے خالی کر دیتے ہیں۔ اس میں مکھن ڈال کر رکھتے ہیں۔ اسی واسطے یہ روغن زرد تلخ اور بدمزہ ہوتا ہے اور اس کے کھانے کو جی نہیں چاہتا۔

نالہ سرن نالہ سرن شنکیاری سے گزر کر پہاڑ کے نیچے سے ہوتے ہوئے میدانِ ڈھوڈیال میں آجاتا ہے۔ پھر موضع خاکی کے نیچے سے بہتے ہوئے ملک تنول، ازدکوٹ، ہندوال موضع کھرکہ، موضع پرنیاں سے ہوتا ہوا، بطرف پھوہار اور بیڑ چلا جاتا ہے۔ راستہ میں شنکیاری اور ڈھوڈیال کی زمینوں کو پانی دیتا ہوا نوکوٹ و خاکی وغیرہ اور ملک پکھلی میں علاقہ شنکیاری اور بھیرکنڈ کو سیراب کرتا ہے۔ اس سیرابی سے ہزاروں من چاول پیدا ہوتے ہیں۔

سرحد مانسہرہ میں موضع ترنوائی سے ایک نالہ موسوم براچھڑ آتا ہے، جس پر صنوبر کے ہزاروں درخت سر بفلک کھڑے ہیں۔ اس نالہ پر بہت سے جندر چلتے ہیں۔ موضع داتا و گاندھیاں سے گزر کر موضع بھیرکُنڈ کے نزدیک دریائے سرن میں گرتا ہے۔ دریائے سرن کے مشرق اور مغرب میں علاقہ شنکیاری کے دیہات آباد ہیں۔ دریائے سرن، درہ بھوگڑمنگ سے نکل کر شمال سے جنوب کی طرف بہتا ہے۔ جب شنکیاری سے گزر کر موضع ڈھوڈیال کے پاس آتا ہے تو اس کا رخ مغرب کی طرف ہو جاتا ہے۔ دو تین کوس مغرب کی طرف جا کر خاکی کے گاؤں کے پاس اس کا رخ پھر شمال سے جنوب کی طرف ہو جاتا ہے اور کرپلیاں کے پاس پھر مغرب کی طرف رخ کر لیتا ہے تا موضع لساں

اور موڑ لقہ کے نیچے شمال سے جنوب کی طرف رواں ہو کر بھاروکوٹ کے بعد پھر مغرب کی طرف رخ کرلیتا ہے اور تربیلہ کے پاس دریائے سندھ میں مل جاتا ہے۔

درۂ اگرور اس کے چاروں طرف پہاڑ ہیں اور ان پہاڑوں کے دامن میں چند گاؤں آباد ہیں۔ جن سے بہت کم معاملہ حاصل ہوتا ہے

تنول، جس کا جاگیردار جہانداد خان پسر پائندہ خان ہے کی سرحد پر شیر گڑھ کا قلعہ ہے۔ جس میں جہانداد خاں کا تھانہ ہے۔ شیر گڑھ کے ساتھ سے پانی کا ایک نالہ موضع گندف، سیرہ، وشو نگلی و چمیڑی سے گزرتے ہوئے راستے میں دوسرے نالوں کو ساتھ لیتے ہوتے اور موضع نکہ پانی سے گزرتے ہوئے ملک جہانداد خاں سے باہر آکر دریائے سندھ میں گرتا ہے۔ جس دریا کا دوسرا نام اٹک بھی ہے۔ اس دریا کے منبع کا پورا حال معلوم نہیں۔ لیکن یہ موضع تھاکوٹ جو سرحد پکھلی پر ہے سے گزرتا ہوا ملک نندھیاڑ و ٹکری و ہوترو دلیشی اور افغانوں کے علاقہ حسن زئی و امازئی، مداخیل سے ہوتا ہوا، پکھلی کی طرف سے گزرتا ہوا، ودھارا، وسوماروبتیاں سے ہوتا ہوا اور کھبل وکیا پار کی جانب اور تربیلا اس جانب کے درمیان سے گزرتا ہے اور ملک چھچھ کہ اس کے مشرق اور علاقہ یوسف زئی اس کے مغرب میں رہتا ہے۔ گزرتے ہوئے قلعہ اٹک کے نیچے پھر جانب مغرب رخ کرلیتا ہے۔

موضع تھاکوٹ سے تا بحد اٹک اس کے کنارے پر کہیں بھی آب پاشی نہیں ہوئی۔ نہ ہی کوئی جندر چل سکتا ہے۔ اگر کوئی جندر چلائے تو وہ صرف تین چار ماہ سردی میں چل سکتا ہے اور طغیانی کے وقت یہ جندر مسمار ہو جاتے ہیں۔ اس کا صرف ایک ہی فائدہ کاریگر لوگ اٹھا سکتے ہیں اور وہ اس کی ریت کو چھان کر سونا حاصل کرنا ہے۔ ہر آٹھ نفر پر مشتمل ایک گروہ ریت کی بڑی چھلنی استعمال کر کے سونا نکالتے ہیں۔ یہ لوگ جمعہ کے دن چھٹی کرتے ہیں۔ ایک ہفتہ کی مزدوری میں ہر ایک شخص کو ایک ماشہ سونا حاصل ہو جاتا ہے۔ سال ۱۸۴۱ء میں جب بڑی طغیانی ہوئی تھی، اس سال سونا بہت مقدار میں دستیاب ہوا تھا۔ بعد میں پھر حسب سابق ہی یافت ہوتا رہا۔

ملک تنول تنول کا ملک پہاڑی ہے۔ اور زمین بہت کم ہے۔ اس علاقہ میں کھنڈر، پہاڑ اور غار بہت ہیں۔

سرحدات مغرب کی طرف موضع گمٹی، ویڑوڑ، دریائے سندھ و دیہات تربیلہ کے ساتھ ہے اور حد مشرقی علاقہ جدون ہے۔ چنانچہ رسم کونٹ، مورکلاں سرحد پر جدون کی طرف ہیں موضع پھوڑ، پہاڑ بھورج تنول میں ہیں۔ شمالی حد پکھلی اور اگرور کے ساتھ شیر گڑھ، شونگلی، بھوجدرہ، کوٹ ہندوال، ٹھٹھہ، جلو، شہلیہ وکنڈ وغیرہ تنول کی حدیں ہیں اور سوسل، نیلور، تمر کھولہ، کھرکالہ، مانسہرہ اور پکھوال، پکھلی کی حدیں ہیں۔

تقسیم ملک تنول یہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ نصف حصہ ملک پلال ہے اور نصف حصہ ملک ہندوال۔

حصہ ہندوال کے مالک پائندہ خان کے بزرگان کا ہے (مقررو دوائم) حصہ پلال میں پلالوں کے سب قبیلے قابض ہیں۔

ملک پہاڑی ہے۔ پیداوار خریف اور ربیع ہر دو برابر ہوتی ہیں۔ حصہ پلال میں نصف نصف حاکمان کو ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ ہشت و نہ ۹/۸ خریف میں اور ہشت و نہ ۹/۸ ربیع میں ادا کرتے ہیں۔ حصہ ہندوال میں رعیت مالک نہیں بلکہ پائندہ خان کے بزرگوں کے ماتحت رہتے ہیں اور یہ عمل اب تک جاری ہے۔

نالہ مانگل ملک جدون سے آکر علاقہ تنول سے گزر کر نالہ سرن میں جا ملتا ہے۔ اس نالہ کے دونوں طرف پہاڑ کے دامن میں تنولیوں کے گاؤں آباد ہیں۔

نالہ سرن پکھلی سے نکل کر تنول سے گزرتا ہے۔ اس نالہ پر بھی پہاڑوں کے دامن ہیں۔ دونوں طرف گاؤں آباد ہیں۔ یہ دونوں (نالہ مانگل اور سرن) قصبہ بھوہار کے نزدیک مل جاتے ہیں۔ تنولیوں کے وقت میں بھوہار جائے صدر نشین حاکم تھی۔ بعد میں حصہ مظبر آباد ہوا۔ سکھوں کے وقت شیروال جائے حاکم صدر نشین تھی۔ وہاں حاکم کی رہائش کے لئے قلعہ بھی بنایا گیا۔

کیفیت ملک تربیلہ

تربیلہ دریائے اباسندھ کے کنارے پر ہے۔ دریا کے مشرقی کنارہ پر آٹھ گاؤں آباد ہیں۔ پار دریائے سندھ کے کنارے پر موضع کھبل، موضع کیا اور موضع تھانہ بر لب دریا آباد ہیں۔ یہ پٹھان آزاد ہیں

اور کسی حاکم کو نہ ایک دام یا ایک دانہ بطور مالیہ ادا کرتے ہیں۔ لیکن تربیلہ کے پٹھان جوان کے ہم قوم ہیں۔ معاملہ حاکمان کو بموجب کنکوت بحساب پنجدہ۔ یعنی پانچ من غلہ کی پیداوار سے دو من حصہ حاکمان اور تین من حصہ رعایا کو ادا کرتے ہیں۔ علاقہ بہت ٹھنڈا اور زمین پوری زرخیز ہے۔

دریا کی ریت سے سونا نکالا جاتا ہے۔ نالہ ہائے مانگل، سرن و دوڑ کے ملنے کے بعد کے حصہ پر جندرات لگائے ہوئے ہیں۔ ہر جندر نزد دریائے سندھ مالیہ سرکار بحساب ساڑھے سات سو روپیہ سالانہ ہے۔ ریت چھان کر سونا نکالنے والوں سے چھ روپے سالانہ مالیہ وصول کیا جاتا ہے لیکن ۱۸۴۱ء طغیانی کے سال میں تمام سال کے لئے چھتیس روپیہ دیا تھا۔ اس سال بروایت دلالاں بازار ہری پور تین لاکھ روپے کا سونا، ہری پور کے بازار میں فروخت ہوا تھا۔

کیفیت ملک گندگر

یہ ملک نصف حصہ مشوانیوں سری کوٹ کے تحت ہے اور نصف حصہ طاہر خیلی پٹھانوں کے تحت، مدتوں سے ہے۔ پہاڑ کے دامن بطرف سندھ میں جو دیہات آباد ہیں، ان کو علاقہ کھڑی کہتے ہیں اور جو دیہات پہاڑ کے درمیان واقع ہے ان کو علاقہ گندگر کہتے ہیں۔ پہاڑ کے درمیان کے علاقہ میں جو دیہات آباد ہیں، ان کی زمین بارانی ہے۔ ان کی امیدیں اور زندگی باران رحمت پر ہی ہیں۔ قحط سالی کے دنوں میں وہ جنگلی میوہ جات از قسم پھگواڑہ، گوراچہ، وغیرہ پر گزارہ کرتے ہیں طاہر خیلی معاملہ سرکار کم وبیش ہی دیتے ہیں۔ پیداوار کا نصف حصہ قوم طاہر خیلی کی جاگیر ہے اور نصف سرکار کو دیتے ہیں۔

(نوٹ: ہزارہ میں یہی ایک قوم ہے جس کی جاگیر سب افراد قوم میں تقسیم ہوتی ہے۔ دوسری اقوام ہزارہ میں جاگیر صرف خان قوم کی ملکیت ہوتی ہے۔ مترجم)

چونکہ طاہر خیلی قوم زیادہ ہوگئی ہے اور ان کا گزارہ تنگ ہوگیا ہے اور چونکہ ان کی سکونت پہاڑ میں ہے، ان کا دماغ غرور سے بھر گیا ہے۔ لہٰذا وہ ہر بیوپاری اور سوداگر یا دیگر آنے جانے والے لوگوں سے، جو اٹک سے راولپنڈی کی جانب یا قصبہ حضرو سے ہزارہ کو آتے جاتے ہیں لوٹ لیتے ہیں۔ قصبہ جات حضرو، حسن ابدال اور عثمان کھاٹڑ میں چوری اور نقب زنی کی وارداتیں کرتے رہتے

ہیں۔ اس لئے ہر بیوپاری اور سوداگر کی آمد و رفت مشکل ہوگئی ہے بلکہ بدرقہ کے بغیر کوئی بھی ان کے راستے سے نہیں گزر سکتا۔

کیفیت سلطنت دُرانیاں و سنگھاں

روایت کرتے ہیں کہ زمانہ قدیم میں سلطنت چغتائی شاہ جہان آباد (دہلی۔ مترجم) میں تھی" اور ہندوستان کی حکومت بادشاہ کے دانشور، مدار المہام راجہ بیر بر کے تحت تھی، جو بادشاہ کا وزیر تھا۔ وہ کشمیر میں اور کوہستان میں برائے انتظام معاملہ کشمیر آیا۔ کشمیر کو دانایان زمانہ کے حوالہ کر دیا۔

راجہ موصوف نے اپنی دانائی کی بناء پر کشمیر کے معاملہ کا نظام کر کے معاملہ اقساط کے حساب سے شاہی خزانہ میں داخل کرنے کا انتظام کیا اور پہاڑی ملک اور فلواتس قوم بنبہ و کھکھہ کے راجگان و رئیسان وغیرہ کو مطابق جاگیر تقسیم کر کے دے دیا۔ اس پر کسی چغل خور نے بادشاہ کو چغلی کر دی کہ راجہ بیر بر نے تمام پہاڑی ملک راجگاں و رئیساں کو جاگیر میں دے دیا ہے۔ بادشاہ نے اس پر راجہ بیر بر سے باز پرس کی تو راجہ بیر بر نے جواب دیا کہ: "غریب پرور! جو گوشت تھا وہ حضور کے باورچی خانہ کے لئے لے آیا ہوں، جو ہڈیاں تھیں وہ کتوں کے آگے ڈال دیں" بادشاہ اس جواب پر بہت خوش ہوا اور راجہ بیر بر کو خلعت و انعام سے ممتاز کیا۔

چنانچہ دور سلطنت چغتائی تمام ملک ہند میں غالب اور مستحکم رہا اور مقرر کردہ آئین راجہ بیر بر پر عمل درآمد ہوتا رہا اور معاملہ بدستور خزانہ بادشاہی میں داخل ہوتا رہا اور ملک، جاگیر، جاگیرداروں کے قبضہ میں رہی۔

سلطنت چغتائی کا زوال جب گردش زمانہ سے سلطنت چغتائی کے وقار اور دبدبہ میں زوال شروع ہوا تو راجگان و رئیسان نے مجوزہ قانون سے روگردانی شروع کی۔ زور آور نے کمزور کو دبانا شروع کیا اور ملک ہند میں طوائف الملوکی شروع ہوئی تو اب صوبجات میں فتنے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سلطنت چغتائی در شاہجہان آباد، فتنہ بیدار و سیاست خفتہ، والا معاملہ شروع ہوا تو کشمیر اور گرد و نواح کے کوہستان میں سب جگہوں سے زیادہ خلل و فساد پیدا ہو گیا۔ اس ملک ہزارہ میں مختلف رؤسا خود مختار اٹھ کھڑے ہوئے۔

درانی حکومت

آخر کار خاندان درانی نے کابل میں سلطنت مستحکم کرلی اور کابل سے کشمیر تک درانی حکومت کا سلسلہ جاری ہو گیا اور ۱۲۱۰ھ (۱۷۹۵ء) میں جب تیمور شاہ تخت کابل پر بیٹھا تو انہوں نے علی مردان خان کو ملک ، چھچھ ہزارہ کا حاکم مقرر کیا ۔ جب حاکم مذکور نے قلعہ اٹک میں اقامت اختیار کرلی تو ملوک خاں و محمد خان نامی ترک وارث پٹی تورکی علاقہ مانکرائے جو اپنے حریفوں کے ہاتھوں جلاوطن تھے ۔ اٹک میں حاکم مذکور سے ملاقات کی اور دادرسی چاہی اور بارہ ہزار روپیہ مالیہ سرکار اپنا اور تورکی پٹی کا ادا کیا اور اپنے علاقہ کا قبضہ دلانے کی درخواست کی ۔

ترکوں کی شکایت پر ملک ہزارہ کی تقسیم

حاکم مذکور کے دیوان لعل چند کو دیہات پٹہ تورکی کی حد بندی و تقسیم کرانے کے لئے ساتھ لایا ۔ اس وقت پٹھان قوم غورغشتی ، مانکرائے پر قابض تھی ۔ حاکم علی مردان خاں نے ان کو مانکرائے سے نکال دیا اور اپنے قدیم مسکن غورغشتی کو واپس بھیج دیا اور ملوک خان و محمد خان ترکان کو اپنے حصہ وراثت پر قائم کر کے مالیہ سرکاری کی تحصیل کا کام شروع کر دیا اور ملک ہزارہ جس میں ۸۴ گاؤں ہیں ، جس کی وجہ سے اس ملک کو چوراسی ہزارہ کہتے ہیں کو چار حصوں[1] میں تقسیم کر دیا ۔ ۲۱ ۔ گاؤں ترکی پٹی ، ۲۱ گاؤں دلزاکی پٹی متعلق سرائے صالح جائے صدر ، سردار صالح محمد خان صدر قوم دلزاک ، ۲۱ گاؤں پٹی ترینی گوجری اور ۲۱ ۔ گاؤں ہمراہ خالصہ متعلق کھلابٹ اور ۲۱ ۔ مواضعات پٹی ترینی ۔ ترینوں نے درانی حکومت کے آنے سے پہلے ، جب کوئی حکومت نہ تھی تو اس ملک پر قبضہ کر لیا تھا اور گوجروں کو جو اس ملک کے قدیمی وارث تھے کے ساتھ حصہ دار بن گئے ۔ بعض گاؤں ان سے بیع خرید لیے اور بعض پر بزور قبضہ کر لیا ۔ چنانچہ جب دیوان لعل چند اس ملک میں آیا اور ملک تقسیم کیا تو سمت خان ترین یہاں موجود تھا اور ملک ہزارہ میں صاحب اثر تھا ۔

ترین قوم کا غلبہ

دیوان موصوف نے تمام ملک ہزارہ سے تمام پٹیوں سے ساٹھ ہزار روپیہ وصول کیا ۔ اس زمانہ میں چودھری موسیٰ و عیسیٰ گوجری پٹی کے سربراہ تھے اور صاحب

---

[1] ۔ یہ تقسیم بظاہر غلط معلوم ہوتی ہے ۔ شاید نقل در نقل سے ایسا ہوا ۔ اصلاً ہزارہ چار پٹی میں تقسیم ہوا تھا ۔ گوجری[1] ، دلزاکی[1] ، تورکی[1] ، اور ترینی ۔

عزت واثر تھے۔ دیوان لعل چند نے ان کو اپنے ساتھ رکھ کر انتظام ملکی میں شامل کر لیا۔

چودھری موسیٰ و عیسیٰ سربراہانِ قوم گوجر کا قتل

اس پر ہمت خان ترین کو آتش حسد زیادہ ہو گئی۔ اس نے ان دونوں کو جرگہ کے بہانے بلا کر ان سے بات چیت شروع کی۔ ساتھ ہی اس نے مسلح آدمی ٹوڈو (نزد کوٹ نجیب اللہ۔ مترجم) کی وادی (نالہ۔ مترجم) میں بٹھا دیئے۔ جب جرگہ کی باتیں ختم ہو گئیں اور دونوں سرداروں کو رخصت کیا، کہ وہ اپنے گاؤں دوتی (نزد کوٹ نجیب اللہ۔ مترجم) جو اس زمانہ میں آباد تھا، کو واپس جانے لگے اور گھات میں بیٹھے ہوئے مسلح لوگوں سے غافل و بے خبر تھے۔ ان مسلح آدمیوں نے ان کو نالۂ ٹوڈو میں قتل کر دیا۔ ان کے قتل ہو جانے کے بعد گوجروں میں کوئی آدمی قابل سربراہی گوجراں نہ رہا۔ ہمت خان ترین سب گوجروی پٹی پر قابض ہو گیا۔ جو معاملہ وصول کرتا اس کو اپنے قبضہ و تصرف میں رکھتا۔ جب کبھی درانیوں کا کوئی حاکم کشمیر کو جاتا یا کشمیر سے واپس کابل کو جاتا تو قدرے ہمت خان سے وصول کر لیتا۔ اگر وہ کچھ نہ دیتا تو درانی لشکر خواہ مخواہ غارت و لوٹ کے لئے دست درازی کرتا اگر کبھی لشکر زیادہ تعداد میں آتا تو ہمت خان چند دنوں کے لئے کوہ گندگر، تنول یا چھجیاں کے پہاڑ کی طرف چلا جاتا۔ جب لشکر واپس چلا جاتا تو پھر وہ اپنی جگہ پر آ کر آباد ہو جاتا۔

نجیب اللہ خان

جب ہمت خان ترین فوت ہو گیا، تو اس کا بیٹا نجیب اللہ خان جانشین ہوا۔ تو سرائے گدائی اور دوتا۔ ہر دو کو ویران کر دیا اور کوٹ نجیب اللہ آباد کیا۔

نجیب[1] اللہ خان شکار کا بہت شوقین تھا اور اکثر اوقات شکار میں مشغول رہتا۔ اس نے مقدم مشرف گوجر کو اپنا کاردار مقرر کیا۔ مقدم مشرف بہت زیرک، دانش مند اور بہادر شخص تھا۔ ان ایام میں یوسف زئی پٹھان (طاہر خیلی۔ مترجم) جمع ہو کر ہزارہ میں آتے۔ سب مال مویشی لے جاتے اور

---

[1] ۔ عہد درانی میں نجیب اللہ خاں ۱۷۶۲ء سے ۱۷۹۹ء تک حاکم ہزارہ رہا۔ اس کی وفات کے بعد اس کی بیوہ، بیوی بنی بیگم نے ۱۸۱۱ء تک بڑی قابلیت سے حکومت کی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا محمد خان جوان ہو گیا۔ تو وہ حکمران ہوا۔ اس کی اور اس کے بیٹے غلام جان کی سکھوں سے چپقلش رہی۔ سکھوں کے بعد غلام خان انگریزوں سے نبرد آزما رہا۔ آخر کار گرفتار ہو کر (۱۸۴۸ء) ۱۸۵۱ء سے ۱۸۵۷ء میں الہ آباد کی جیل میں پھانسی دے دیا گیا۔

جس گاؤں میں رات رہتے وہاں روٹی کھاتے اور سونے کے لئے لحاف تولائی لیتے۔ صبح اٹھ کر جاتے وقت لحاف تولائی گھوڑوں پر ڈال کر ساتھ لے جاتے۔ اس لئے مقدم مشرف کے تقرر پر لوگ بہت خوش ہوئے اور اپنے گھروں میں امن وامان سے آباد ہو گئے۔

موضع سرائے گدائی جو اس زمانہ میں بہت آباد گاؤں تھا اور اس میں بہت سے ساہوکار آباد تھے، جس کو گنڈ گھریوں (تار خیلوں۔ مترجم) کی تعدی نے ویران کر دیا تھا۔ ان سب لوگوں کو... نجیب اللہ خاں نے کوٹ نجیب اللہ میں آباد کر دیا مقدم مشرف کی پشت پناہی کی وجہ سے کوٹ نجیب اللہ خوب آباد ہو گیا۔ لوگ بے خوف وخطر وہاں رہنے لگے۔

کیفیت ریاست تنول[1]

صوبہ خان تنولی

صوبہ خان نیک بخت خاں، اور بیدار نصیب شخص، تنول کے نصف حصہ ملکیت قوم پلال کا حاکم تھا۔ وہ بڑا انجنا اور شخص تھا۔ ملک ہزارہ، پکھلی دجدون و قرب وجوار کے سب رئیس اس کے تابع فرمان تھے۔ تنول میں مشہور قصبہ بیڑ گُنڈ اسی کا آباد کردہ ہے قرب وجوار سے ساہوکاروں اور کھتریوں کو لاکر تعمیر مکانات کے لئے خرچ دے کر نیا گاؤں بیڑ آباد کیا۔

خان موصوف کی اپنی رہائش موضع پھوہار سر سبز آبادی دریائے سیرن کے کنارے میں تھی۔ لیکن ہر صبح وہ گھوڑے پر سوار ہو کر بیڑ میں آتا۔ ہر چھوٹے بڑے کی دلجوئی کرتا۔ سارا دن اس موضع کی آبادی کے کام کی نگرانی کرتا اور شام کو اپنے دولت خانہ واقع پھوہار واپس چلا جاتا۔ اس کے کرم کے فیض اور حسن اخلاق سے دور ونزدیک سے ساہوکار اور کھتری مثلاً سرائے گدائی خان وملو ھینڈہ وغیرہ سے آکر قصبہ بیڑ میں آباد ہو گئے۔ خان موصوف کی رعایا پروری، غریبوں اور کمزوروں کی دلجوئی کا شہرہ آفاق میں بلند ہو گیا۔

نقل کرتے ہیں کہ ایک دفعہ خان موصوف کا ایک بیٹا پیدا ہوا تو سب رعیت اور باشندگان بیڑ مبارک بادی کے لئے پھوہار گئے۔ سب ہندوؤں اور مسلمانوں نے مبارک باد کا نعرہ بلند کیا، تو

---

[1] ۔ قوم تناولی اخوان درویزہ کے مطابق یہ قوم درہ تانال سے آئی۔ بہادر اور شمشیر زن قوم ہے۔

خاں موصوف نے پوچھا کہ کس بات کی مبارک۔ سب نے کہا۔ دولت عالی کے باغِ اقبال میں ایک نیا پھول لگا ہے اور رعایا مبارک بادی کے لئے آئی ہے۔ خان موصوف نے کہا کہ میں سمجھا اگر کوئی نیا شخص موضع بیٹر میں آکر آباد ہوا ہے اگر مجھے اپنے بیٹے کی پیدائش سے رعیت میں نیا آنے والا مجھے بہت عزیز ہے۔ سب رعیت نے خان کے اقبال و بخت کے لئے دعا کی یہی وجہ ہے کہ قصبہ بیٹر اچھی طرح آباد ہوا۔

صوبہ خان کی وفات کے بعد خانہ جنگی

کچھ عرصہ بعد صوبہ خانؒ نے وفات پائی۔ ان کی اولاد میں سے دو بیٹے، ایک بیوی سے مسمیان محمد خان واحمد خان سگے بھائی تھے اور وہ موضع دہترہ، علاقہ کلائی میں رہتے تھے۔ پانچ اور بیٹے مسمیان گلشیر خان، محمود خان، فتح شیر خان، سرفراز خان واشرف خان، دوسری بیوی سے سگے بھائی تھے۔ اور یہ موضع پھوہار میں رہتے تھے۔

محمد خان واحمد خان نے دریائے سندھ کے اس پار پٹھانوں سے مصلحت کر کے ایک ہزار مسلح افغانوں کے ساتھ موضع پھوہار پر حملہ کر دیا اور اپنے نا سگے بھائیوں گلشیر خان وغیرہ کو پھوہار سے بدر کر دیا۔

یہ سب بھائی جلاوطن ہو کر تربیلہ کے پٹھانوں[۲] کے پاس آگئے اور محمد خان واحمد خان ملک تنول کے حصہ پلال پر حاکم ہو گئے۔

پلال میں پانچ قبیلے ہیں۔ اول[۳]: ادلال، خانخیل، لاہیال۔ دوم: ذخیرال سوم، اکریال چہارم موتیال۔ پنجم مینہ کرکلہ سماک وغیرہ۔ ان سب قبیلوں نے محمد خان کی حکومت کی اطاعت قبول کر لی۔

چندے محمد خان کی حکومت چلتی رہی۔ لیکن وہ ظالم تھا۔ لوگوں پر سختی کرتا۔ ان کا مال غصب کرتا اور دل آزار تھا۔ چنانچہ یہی پانچ قبیلے جمع ہوئے اور اتفاق کیا کہ محمد خان کو ہٹایا جائے۔ چنانچہ

---

[۱]۔ ۱۷۰۲ء میں فوت ہوا۔ تاریخ تنولیاں از سید مراد علی۔ [۲]۔ تربیلہ کے پار کھبل (تاریخ تنولیاں از سید مراد علی) [۳]۔ سید مراد علی نے چار خیل لکھے ہیں۔ ۱۔ علی سال ۲۔ دفراں ۳۔ بنکریال ۴۔ متیال۔

کھانا کھلانے کے بہانہ سے اس کو ڈیوڑھی میں بٹھایا اور تلواروں سے یک دم حملہ کرکے اس کا کام تمام کردیا اور گل شیر خان برادران کو جو تربیلہ میں تھے بلایا اور خانی کی دستار فتح شیر خان کے سر پر باندھی۔

فتح شیر خان نیک نام رہا۔ قوم و رعایا کے ساتھ اچھا سلوک کرتا تھا۔ اس کی وفات (۱۸۰۵ء) کے بعد ریاست کی دستار پلال کے پنج پتہ کے اتفاق سے گل شیر کے سر پر باندھی گئی۔ گل شیر خان بھی نیک نام رہا بلکہ ہندوؤں کی خاص رعایت کرتا تھا۔ ہندوؤں کو قصبہ بیڑ میں دھرم سال بنانے کے لئے مبلغ دو ہزار روپے نقد دیئے اور گل کار و معمار کشمیر سے منگوا کر دھرم سال عمدہ طرز تعمیر کرایا گرمی کے موسم دہرہ برلب دریائے سندھ اعلاقہ کولائی میں رہتا تھا۔ چند مدت حکومت کرنے کے بعد فوت ہوا۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا احمد علی خان جانشین ہوا۔

تنولیوں کی شاخ ہندوال

تنول کا نصف حصہ جو بھینگڑہ کے پہاڑ سے متعلق قوم ہندوال کا ہے۔ ان کے پانچ تپہ۔ جمال، شبریال، لابی آل، بنکریال۔

سید مراد علی نے ہندوال کے چار پتے لکھے ہیں۔ جمال، سہاڑیال، بوتہال، جلوال۔ لیکن تنولی قوم کی حکومت و خانی پلال میں ہے اور قدیم سے رہی ہے۔ ہندوال میں کوئی نامور اور سرکردہ نہیں ہوا۔ ہندوال کے سب پتے زمیندار و کاشتکار رہے ہیں۔ مگر ہیبت خان ہندوال، پائندہ خان کا جد امجد اپنے آپ کو دوسروں سے ممتاز خیال کرتا تھا اور موضع گلی میں جہاں زیادہ آبادی چند سبزی فروشوں اور دیگر دکانداروں کی تھی، رہتا تھا۔ ایک وقت اس نے گلشیر خان سے ہمسری کا دعویٰ کیا۔ گلشیر خان نے اس پر اس کو گلی کے گاؤں سے بدر کر دیا اور گاؤں کو تاراج کرکے جلا دیا چونکہ ہیبت خان کوئی طاقت نہ رکھتا تھا، لہٰذا شرمندہ ہو کر گل شیر خان سے معافی مانگ کر اس کا مطیع ہو گیا اور اس کی اجازت سے اپنے گاؤں کو از سر نو آباد کر کے اس میں بود و باش رکھنے لگا۔

اولادِ ہیبت خان اور تنولی ہندوال و پلال خاندان میں صلح صفائی

اس کے دو فرزند تھے۔ ۱۔ ہاشم علیخان ۲۔ نواب خاں

چونکہ ہیبت خان اور گل شیر خان کے درمیان موافقت ہو گئی۔ لہٰذا احمد علی خان پسر گل شیر خان کی نسبت دختر ہیبت خان سے ہو گئی اور گل شیر خان کی بیٹی کی منگنی ہاشم خان پسر ہیبت خان سے ہو گئی۔ دونوں شادیاں حسب دستور طے پا گئیں۔ ان دونوں خاندانوں میں آمد و رفت کا سلسلہ

شروع ہوگیا۔

ان شادیوں کے بعد ہیبت خان[1] اور گل شیر خان (وفات ۱۸۰۵ء) دونوں اپنی اپنی باری سے فوت ہوگئے۔ ہیبت خان کی اولاد کو ترقی حاصل ہونی شروع ہوگئی اور ان کے خانگی ملازموں کی تعداد تین سو ہوگئی۔ ان کی افزائش قوت سے احمد علی خان پسر گل شیر خان کو فکر ہوئی اور ان سے حسد کرنے لگا۔ کیونکہ تین پشت ہندوال پر بھی سربراہ پلال کو برتری اور حکمرانی حاصل رہی تھی۔ تمام ہندوال قوم نے متفق ہوکر ہاشم علی خان کو اپنا سربراہ بنالیا، تاکہ پلال قوم کے خوف سے امن حاصل کرسکیں۔

پلال اور ہندوال میں جنگ آزمائی کے منصوبے

گھیری اور دربند کے دیہات جو سخت گزار موقع پر ہیں اور قوم ہندوال کی دفتر قدیم سے ہیں ان پر گل شیر خان نے قبضہ کر رکھا تھا۔ اب جبکہ خوش نصیبی سے ہاشم علی خان اور نواب خان طاقتور ہوگئے تھے۔ انہوں نے اپنا ایک معتبر قاصد احمد علی خان کی طرف بھیجا کہ وہ دربند اور گھیری جو ان کے موروثی دیہات ہیں کو واگذار کردے۔ احمد علی خان کو تشویش ہوئی کہ اگر ہاشم علی خان کی طاقت اسی طرح بڑھتی رہی تو جلد ہی وہ سب ملک تنول پر قبضہ کرلے گا۔ اور اس کو پلال کی ریاست سے بدر کردے گا۔ لہٰذا اپنے متعلقین سے مشورہ کیا کہ اگر ہاشم علی خان کو ابھی سے زیر کرنے کی تدبیر نہ کی گئی، تو وہ ان کے لئے مصیبت کا باعث بن جائے گا۔ سب نے ہاشم خان کو قتل کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن مصلحت یہ ٹھہری کہ اس کو سربازار قتل کرنا باعث فساد ہوگا۔ اس کے لئے یہ تجویز ہوئی کہ احمد علی خان سیر و شکار کے لئے چند روز یہاں آنے کے لئے ہاشم علی خان کو دعوت دے اور کہلا بھیجے کہ جب چند روز کے بعد ہاشم علی خان واپس ہو تو احمد علی خان یہ دونوں دیہات اپنی بہن (زوجہ ہاشم علی خان) کو بطور چادر دے دیگا۔ اس اثنائے قیام میں موقع پاکر ہاشم علی خان کو قتل کردیا جائے۔ اس کو قتل کرنے کے لئے پلال میں سے چار آدمی جو احمد علی خان کے خاص آدمی تھے، مقرر ہوئے۔ ان کے نام ۱۔ رحمت خان لابیال جد بزرگوار فیروز خاں۔ ۲۔ رشید خان۔ خانخیل پدر ہاشم علی خان سیری والہ۔ ۳، ۴۔ فضل خان، ناصر خان، ان کی اولاد سے اب کوئی نہیں رہا۔

---

[1] وفات ۱۸۰۳ء۔ سید مراد علی۔

ہاشم علی خان ہندوال کے قتل کرنے کا منصوبہ

اس مصلحت کے بعد احمد علی خان نے ہاشم علیخان کو دعوت نامہ بھیجا کہ آپ چند روز کے لئے یہاں آئیں، تاکہ ایک جگہ نشست وبرخاست سے دل خوش کریں ۔اہلِ خانہ کو بھی ساتھ لائیں ۔ واپسی پر آپ کی خواہش کے مطابق دربند ،وگھیرتی بہرو مواضعات بطور چادرِ ہمشیرہ خود آپ کو واپس کر دیئے جائیں گے ۔ چونکہ ہاشم علی خان کا پیالہ عمر لبریز ہو چکا تھا ،وہ بلا خوف وخطر باعیال خود بمعہ چند نفر خدمت گار سوار ہو کر موضع ڈہرہ ،مسکن احمد علی خان آگیا ۔ یہاں احمد علی خان نے اس کا خوب استقبال کیا اور پر خلوص محبت کا اظہار کیا ۔ کافی دن سیروشکار میں صرف ہوئے ۔ آخرکار ہاشم علیخان نے واپسی کی اجازت چاہی ۔ اس موقعہ پر احمد علی خان اپنے متعلقہ چار اشخاص کو قتل کی تیاری کا اشارہ کیا ۔جس صبح کو ہاشم علی خان نے واپس جانا تھا ،ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا ،تو ہاشم علی خان کے خدمتگار نماز پڑھنے کے لئے دریائے سندھ جو نصف کوس کے فاصلہ پر تھا ، کی طرف چلے گئے ۔ابھی یہ لوگ دریا پر پہنچے ہی ہوں گے کہ احمد علی خان کے آدمیوں نے اس فرصت کو غنیمت جان کر اپنا کام تمام کرنا چاہا ۔ احمد علی خان اس وقت باہر مسجد میں بیٹھا ہوا تھا اور ہاشم علی خاں گھر کے اندر مستورات کے پاس بیٹھا ہوا تھا ۔

ہاشم علی خان کا قتل

کہ یہ چار اشخاص نماز کے بہانے سے اٹھے اور ہاشم علی خان کو تلواروں سے قتل کر دیا ۔ اس پر شوروشغب برپا ہونے پر جو لوگ سندھ پر نماز کے لئے گئے تھے ، کچھ تو پا پیادہ وہاں سے فرار ہو گئے اور ڈہرہ کو واپس آئے ، ان کو اہالیان ڈہرہ والوں نے قتل کر دیا ۔ یہ واقعہ ۱۸۱۲ء کا ہے ۔ اس کے بعد ہاشم علی خان اور دیگر مردہ گان کو دفن کر دیا گیا ۔ جب نواب خان نے اپنے بھائی کے قتل کی خبر سنی ۔ علماء وسادات کا ایک جرگہ ہاشم علی خان کی لاش اور اس کی بیوی کی واپسی کا مطالبہ کے لئے بھیجا ۔ احمد علی خان نے جرگہ کو صاف جواب دے دیا اور نہ ہاشم علی خان کی لاش اور نہ ہی گھر کی مستورات کو واپس کیا ۔ بیس روز تک نواب خان چپ رہا ۔

ہاشم علی خان کے قتل کے بعد آویزش

اس کے بعد نواب خان نے میاں لطیف اللہ جو سرخیل کے وسرکردہ بزرگان علاقہ کے تھے ، کو اس غرض کے لئے بھیجا ۔ چونکہ اس بزرگ عالی مرتبت سے انکار ناممکن تھا ۔ احمد علی نے لاش اور اہلیہ ہاشم علیخاں

کو واپس کر دیا۔ عدت کے گزرنے کے بعد نواب خان نے بیوہ ہاشم علی خان سے نکاح کر لیا اور اپنے قوت بازو سے دربند و گڑھی پر قبضہ کر لیا اور احمد علی خان مقابلہ میں کامیاب نہ ہو سکا۔ نواب خان کو دن بدن ترقی اور قوت حاصل ہوتی گئی۔

احمد علی خان اور اکبر علی خان کی کش مکش اور دُرّانیوں کی آمد

اس اثنا میں اکبر علی خان جو احمد علی خان کا چچا زاد بھائی اپنے حصہ پدری کے لئے حاکم کشمیر عطا محمد خان[1] کی خدمت میں بغرض امداد حاضر ہوا۔ اس نے ایک فوج بہ سرکردگی کشمیری خان، ہزارہ کی طرف بھیجی۔ یہ خبر سن کر احمد علی خان اپنی بیٹی کی نسبت سید اعظم ساکن ستھانہ سے کر دی گھر کا سب سامان، زیورات، برتن اور کپڑے، فرش فروش، اسلحہ جات بندوقیں اور تلواریں جن کے دستے سنہری اور مرصع تھے، جو ایک لاکھ روپے کی مالیت کی تھی، اپنے معتبران کی معیت میں سید اعظم شاہ، سید ستھانہ اور برادر سید اکبر شاہ ستھانہ والہ کے ہاں اس امید پہ بھیج دی کہ اگر مخالف کا قبضہ ملک تنول پر ہو جائے تو وہ ستھانہ بیٹھ کر گزر اوقات کر سکے۔

جب لشکر مخالف تنول میں داخل ہوا اور احمد علی خان پر ملک تنگ ہوا تو وہ بارہ ہزار نقد روپے کے ساتھ تنول سے بھاگ کر گندگر پہاڑ کی چوٹی پر چلا گیا۔ موضع بھرواسہ میں بیٹھ گیا۔ اگر اس وقت وہ ستھانہ جاتا تو سید اس کو وہیں قتل کر دیتے۔ چونکہ زندگانی باقی تھی، وہ ستھانہ کو نہ گیا اور موضع بھرواسہ میں وقت گزارتا رہا۔

کشمیر کی فوج دُرّانی کی آمد اور علی اکبر خان کا قبضہ

جب کشمیر کی فوج آئی اور احمد علی خان کا ملک بدر ہونے کا سنا تو اس کو فتح بغیر جنگ فرض کیا۔ اکبر علی خان کو پھوہار اور بیڑ میں بٹھایا اور موضع ڈھیرہ مسکن احمد علی خان کو جلا دیا۔ فوج واپس کشمیر چلی گئی۔

---

[1] ۔ تاریخ تنولیاں مصنفہ سید مبارک علی نے لکھا ہے کہ ایسا ہی دفعہ نواب خان بخدمت عظیم خان درانی حاکم کشمیر کو ۱۸۱۲ء میں برائے امداد بھیجا تھا، جس کے جواب میں عظیم خان نے اپنے بھائی احمد خان کو بھیجا تھا لیکن یہ قرین قیاس نہیں۔

احمد علی خان کا دوبارہ قبضہ

کشمیر کی فوج مظفر آباد سے آگے نہ گئی ہوگی کہ احمد علی خان گند گھر سے آکر اپنے ملک کولائی کے لوگوں سے مشورہ کیا اور اپنی سکونت موضع لالوگلی میں رکھی اور اکثر قوم اکرال نے جو پلال کے پانچ قبیلوں میں سے ایک ہے ۔ احمد علی خان کی حکومت کو مان لیا ۔

سید اعظم شاہ ساکن ستھانہ کا احمد علی خان کو قتل کرانے کا منصوبہ

کچھ عرصہ کے بعد سید اعظم شاہ ساکن ستھانہ کو فکر ہوئی کہ کسی تدبیر سے احمد علی خان کو قتل کیا جائے تاکہ اس کی جانب سے امانت میں رکھا ہوا مال و دولت ، زیور برتن اور اسلحہ کو ہضم کیا جا سکے ۔ جو اس نے سید مذکور کے گھر میں رکھا ہوا ہے ۔

اپنے بھائیوں سے مشورہ کر کے ایک بہانہ سے احمد علی خان کو برائے جرگہ بلایا ، تاکہ اس کو قتل کر دیا جائے ۔ ظاہراً ملک تنول کے انتظام میں اس کو مدد کی امید دلائی ۔

صاحب غرض دیوانہ ہوتا ہے اور احمد علی خان کو بھروسہ بھی بہت تھا کہ خاندان ستھانہ صاحب عزت سادات ہیں ۔ دوسرے اپنی دختر کی منگنی بھی سید اعظم سے کی ہوئی تھی ۔ بلا خوف و خطر گھر سے روانہ ہوا ۔ دریا پار کر کے ستھانہ پہنچ گیا ۔ سب سادات اس کو دیکھ کر عزت و اکرام کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کو جرگہ میں بٹھایا ۔ چکنی چپڑی باتیں شروع کیں ۔ مگر احمد علی نے محسوس کیا کہ سادات اس کو قتل کرنے پر آمادہ ہیں تو فوراً پیشاب کرنے کے بہانہ سے وہ ازار بند ہاتھ میں پکڑے ہوئے ، جرگہ سے اٹھ کر چند قدم باہر آگیا تاکہ دوڑ کر اپنی کشتی میں بیٹھ کر وہاں سے نکل جائے ۔

جب سیدوں نے دیکھا کہ وہ جرگہ سے اٹھ کر جا رہا ہے ۔ تو تلواریں نکال کر اس کے پیچھے دوڑے ۔ احمد علی خان ، پایاب دریا سے تیزی سے گزرنے لگا کہ سادات نے تلواروں کی گیارہ ضربات ، اس کے سر ، بازوؤں اور پشت پر لگائیں ۔ لیکن اس کی زندگی کے دن باقی تھے ، اس نے دریا میں ڈبکی لگائی اور بچ گیا اور پھر تیر کر کشتی میں سوار ہوگیا اور ملاح اس کو کھینچ کر واپس کولائی[۱] لے آئے ۔

اس کا تمام سامان جو سادات کے گھر امانت تھا ، اب بھی وہاں ہی ہے ، جو انہوں نے نہیں دیا ۔

احمد علی خان چند دن بعد ان زخموں سے صحت یاب ہوگیا اور اپنی رہائش موضع ڈھیرہ میں مقرر کرلی ۔

---

۱ ۔ کولائی سیرن نالہ کے پار کا علاقہ

نواب خاں ہندوال کا حملہ علاقہ پلال پر نواب خاں پدر پائندہ خاں ان دنوں میں طاقتور ہو گیا تھا۔ اور اپنے مقتول بھائی ہاشم علی خان کے انتقام کے لئے پھوہار میں آگیا۔ ایک قلعہ دریائے سرن کے کنارے پر مرمت کر دیا اور خود اپنی جمعیت کے ساتھ بھاروکوٹ میں آگیا۔ یہ خبر سنتے ہی سر بلند خاں پسر سرفراز خان ابن صوبہ خان جس کی جائے رہائش موضع شنگڑھی میں تھی۔ بھاگ کر جدون افغانوں کے پاس دھمتوڑ چلا گیا۔ محمد خان ترین پسر نجیب اللہ خان بھی نواب خان کی ملاقات کے لئے بھاروکوٹ گیا اور اپنے مسلح آدمی زیر قیادت مقدم مشرف، تیار کر کے موضع سکندرپور جو اب قاضی پور کے نام سے مشہور ہے، میں بٹھائے اور خود نواب خان سے ملاقات میں مشغول ہو گیا۔

محمد خاں ترین اور نواب خان تنولی کی ملاقات بھاروکوٹ میں محمد خان نے دیکھا کہ تمام لوگ، سادات، علماء، شرفاء فرش پر بیٹھے ہیں اور نواب خان خود ایک چارپائی پر بیٹھا ہوا ہے۔ اگرچہ محمد خان فرش پر بیٹھ گیا، لیکن عزت و رشک نے اس کا دل غصہ سے بھر دیا کہ نواب خان اتنا شوخ ہے کہ اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھتا۔ محمد خان نے بیٹھتے ہی اونچی آواز میں اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ اگر خانصاحب کی مرضی ہو تو چند روز براہ مہربانی اپنا ڈیرہ سکندرپور[۱] میں رکھیں، تاکہ ہم دونوں مل کر جنگلی جانوروں کا شکار، باز، جرہ اور تازی کتوں کے ساتھ کریں۔ یہ بات سنتے ہی نواب خان اپنی جگہ پر خاموش مانند نقش دیوار بن گیا۔ فکر و غم نے اس کو پریشان کر دیا اور کوئی جواب نہ دے سکتا تھا۔ بے اندازہ وسوسوں اور اندیشوں نے اس پر غلبہ کر لیا۔

نواب خان کی ہزارہ سے واپسی محمد خان کو رخصت کر کے خود اپنی فوج ایک سو سوار اور سات سو پیادہ کے ساتھ جلدی سے واپس چلا گیا۔ واپسی پر راستہ میں اس کے دو گھوڑے گر کر مر گئے۔ اس کے بعد اس نے کبھی بھی ہزارہ کی طرف رخ نہ کیا۔

اس اثناء میں احمد علی خان نے اپنے عم زاد سربلند خان سے صلح کر لی اور قول و قرار پر بھائی چارہ کی بنا قائم کر لی۔ ظاہراً تو صلح کر لی۔ لیکن اندرونی طور پر دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہے۔

احمد علی خان اور سربلند خان کی اندرونی مخالفت اور نتیجہ اس کے بعد دونوں نے مل کر شیروان جانے کا ارادہ کیا کہ رحمت خاں لابیال

---

[۱] ۔ ہری پور کے ساتھ جو علاقہ ترین میں ہے۔

کو وہاں سے ملک بدر کردیں، اس کے گھر کو تباہ کریں اور تمام ساہوکاروں اور ہندوؤں کو جو وہاں جمع ہیں اور بہت دولت مند ہیں لوٹ لیں۔

لیکن چاہ کن را چاہ درپیش کی مثل مشہور ہے۔ جب یہ کٹھیالہ پہنچے اور صبح کا کھانا کھایا اور قیلولہ کرنے کے بعد جب اٹھے تو نماز ظہر کا وقت تھا۔ دونوں باتفاق اٹھے کر استنجا وغیرہ کر کے نماز ادا کریں سربلند خان نے مسجد میں اور احمد علی خان نے ایک کوٹھہ پر کھڑے ہو کر نماز پڑھنی شروع کی۔ سربلند خان نے اپنے نوکروں کے ساتھ یہ تجویز پہلے سے کی ہوئی تھی کہ جب احمد علی خان رکوع میں جائے تو پیچھے سے گولیوں کی باڑ سے اس کو ہلاک کر دیا جائے۔ جونہی گولی اس کی پشت پر لگی۔ احمد علی خاں اسی جگہ گر کر فوت ہو گیا۔ اس کے بعد گاموں خان پدر امان اللہ خان نے بندوق پکڑ کر مقتول کے سر پر آ کر فائر کیا، جس سے مقتول کے کپڑے آگ سے جل گئے۔

احمد علی خان کے قتل کے بعد سربلند خان کی حکومت

احمد علی خان کے مرنے کے بعد ملک تنول حصہ پلالان پر سربلند خان کی حکومت مستقل ہو گئی اور اس نے اپنی رہائش موضع شنگڑھی میں رکھی

نواب خان تنولی اور عظیم خان درانی کی کشمکش کا آغاز

واقعہ یہ ہے سرداران بارک زئی یعنی عظیم خان و عطا محمد خان کشمیر کے ناظم تھے۔ ان کی والدہ کشمیر سے کابل جا رہی تھی۔ وہ پکھلی سے گزر کر موضع گلی مسکن نواب خان میں وارد ہوئی۔ اگرچہ ظاہراً نواب خان استقبال کے لئے پکھلی گیا اور عزت و اکرام کے ساتھ اس کو لا کر اپنے گاؤں میں ٹھہرایا۔ اقامت و خوراک لشکر و حیوانات میں ہر چیز مہیا کی۔ لیکن صبح کے وقت جب کوچ ہونے لگا تو ایک روایت کے مطابق نواب خان نے از روئے جہالت، خفیہ طور پر والدہ عظیم خان سے پوچھا کہ میں نے سنا ہے کہ ملکہ مقدسہ کے پاجامہ مبارک میں ایک قیمتی اور بہت خوبصورت آزار بند ہے۔ میں امید رکھتا ہوں کہ از راہ نوازش وہ آزار بند مجھے عطا فرماویں گے۔

اگرچہ موصوفہ نے بہت حیلے بہانے کئے۔ لیکن نواب خان اپنے مطالبہ میں بہت مستعد اور مستبد ہو گیا۔ لہٰذا موصوفہ نے خیال کیا راستہ دشوار اور گذرگاہ تنگ، ملک پہاڑی اور قافلہ اور اس کے حیوانات کا گزرنا مشکل ہے۔ مجبور ہو کر نواب خان کو آزار بند دے دیا اور اس طرح سے جان خلاص کرا کر کابل

کی راہ لی۔ جب وہ کابل پہنچ گئی تو اپنے بیٹوں کو جو ناظم کشمیر تھے، خط لکھا کہ نواب خان تنولی نے شوخی اور بے ادبی کر کے ہماری عزت میں خلل ڈالا، لہٰذا اس بے ادبی کی پاداش میں نواب خان کو ایسی سزا دیں کہ اس کا ذکر صفحہ روزگار پر ثبت ہو جائے۔

عظیم خان دُرّانی کا نواب خان کو سزا دینے کے لئے روانہ ہونا

اگرچہ کشمیر سے ان کا ہاتھ نواب خان پر نہ پہنچ سکتا تھا۔ مگر وہ جب کشمیر سے کابل جانے لگا تو اپنی ماں کے خط کے مطابق پکھلی اور گلی کے راستہ دربند کے گذر سے جانے کا انتظام کیا۔ کیونکہ اگر پہلے سے نواب خان کو اس کی ناراضگی کا پتہ چل جاتا تو نواب خان فرار ہو کر اپنے پہاڑی ملک میں کسی پہاڑ کی چوٹی پر چلا جاتا اور عظیم خان کے ڈیرہ کے گزر جانے کے بعد واپس اپنی جگہ پر آ جاتا۔ لہٰذا اس نے منصوبہ بندی و دور اندیشی سے سید وحید شاہ موضع نوکوٹ تعلقہ پکھلی کو پکھلی پہنچنے سے پہلے ہی طلب کر کے خلعت فاخرہ و انعامات دے کر اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ نواب خان تنولی کو ہر طریقہ سے سردار موصوف کی خدمت میں حاضر کرے۔ چونکہ نواب خان کا تعلق وحید شاہ سے یک دلی و صداقت کا تعلق از حد درجہ زیادہ تھا لہٰذا وحید شاہ نے افسون و افسانہ اور صفات مردانہ نواب خان کو ایسا مسحور کر لیا کہ وہ بمعہ اپنے پسر کلاں پائندہ خان، پوری دلجمعی کے ساتھ سردار عظیم خان کے پاس حاضر ہو گیا۔ نواب خان کے پہنچنے پر دوسری دفعہ حیدر شاہ کو خلعت و انعام سے نوازا۔

عظیم خان کی تنول میں آمد

نواب خان نے مہمانداری کے سب لوازمات اخوراک مجلس سرود و غنا و تماشائے اہل نشاط، خیمہ و فرش جتنا کہ اس کے مقدور میں تھا، انتظام کیا۔ سردار موصوف کی بہت عزت و تکریم کی اور موضع گلی و موضع شلو نگلی اور موضع نکہ پانی کی راہ سے دریائے سندھ کے گزر سے پار کیا۔ سردار موصوف بھی نواب خان کی عزت کرتا رہا اور اپنے ساتھ مسند پر برابر بٹھاتا اور اپنے ساتھ ہم نوالہ و ہم پیالہ بناتا رہا۔ تمام رات رنگ و آہنگ، سرور اور رقص اہل نشاط نواب خان کے ڈیرہ پر ہوتا رہا۔

نواب خان اور پائندہ خان کو زیر حراست کرنا

دریائے سندھ سے پار ہونے کے بعد سردار کا ڈیرہ صبح سویرے انب سے براہ کیا دکھبل کوچ کر کے جانب ملک یوسف زئی روانہ ہوا۔ چابک دست نوکر اور معتبر محافظ نواب خان اور پائندہ خان کی

نگہداشت کے لئے مقرر ہو گئے اور سردار موصوف کا ڈیرہ متصل پیہود ملک یوسف زئی میں ٹھہرا۔

نواب خان کو فکر ہوا کہ وہ اپنے بیٹے پائندہ خان سمیت اپنے ملک، مال، قبائل وعیال سے نکل آیا ہے۔ پائندہ خان سے مشورہ کیا کہ تم کو ایک بہانہ سے اس جگہ سے نکالتا ہوں۔

اپنے بیٹے کو رہا کرانے کے لئے نواب خان کی حکمت عملی

پائندہ خان سے مشورہ کیا کہ تم کو ایک بہانہ سے اس جگہ سے نکالتا ہوں

اور میری زندگی سے ہاتھ دھو ڈالو اور واپس جا کر پہاڑ کی چوٹی پر پناہ گزین ہو جاؤ۔ جب سردار کا ڈیرہ دور چلا جائے تو پھر اپنی جگہ پر آکر مقیم ہو جاؤ۔ اس کے سوائے اور کوئی علاج نہیں ہے۔ اس مشورہ کے بعد نواب خان سردار کی خدمت میں درخواست لے کر حاضر ہوا کہ اس نیاز مند کی یہی خواہش ہے کہ میں اپنے قبائل اور اہل وعیال سمیت آپ کے ہم رکاب کابل کو جاؤں۔ امید کرتا ہوں کہ دو تین ڈولے زنانہ سواری کے لئے، چند نوکروں اور اونٹ وخچروں کے ساتھ برائے لانے عیال واشیار خانگی میرے بیٹے پائندہ خان کو عنایت فرمائے جائیں گے کہ وہ جا کر قبائل وعیال کو ہمراہ لے کر آجائے۔ جب سردار عظیم خان نے نواب خان کے قبیلے واہل وعیال کے لانے کا سنا تو اس نے ایک عظیم نعمت سمجھا کہ نواب خان کو اس کے قبیلے کے ساتھ اپنی والدہ کی خدمت میں حاضر کردے گا۔ والدہ کی جو مرضی ہوگی ان کو بے ادبی کی سزا دی جائے گی۔ سردار نے اسی وقت پائندہ خان کو ڈولہ ہا معہ حاملان وشتر وخچر عطا کر دیئے اور اس کو اپنے قبیلے وخاندان لانے کے لئے رخصت کر دیا۔ جب پائندہ خان معہ ڈولہ ہائے وشتران وخچر ہائے انب میں پہنچا تو اس کے خاندان کے لوگ پہلے ہی سے پہاڑ پر چلے گئے تھے پائندہ خان حاملان ڈولہ وشتران وخچر ہا کو نیچے چھوڑ کر خود پہاڑ کی چوٹی پر چلا گیا اور وہاں سے ان کو جواب بھیجا کر وہ چلے جائیں۔ کیونکہ اس کے خاندان کے لوگ ہرگز نہیں آتے۔ یہ سب خالی ہاتھ واپس ہوئے اور سردار عظیم خان کو اطلاع دی کہ ہمارے ساتھ یہ واقعہ ہوا۔

نواب خان کا دریائے کابل میں غرق ہونا

سردار موصوف یہ سن کر رنجیدہ اور غضب ناک ہوا۔ اس وقت سردار کا ڈیرہ دریائے لنڈا (دریائے کابل۔ مترجم) کے کنارہ پر تھا۔ نواب خان کو صبح کے وقت چمڑے میں سی کر دریائے لنڈا (دریائے کابل۔ مترجم) میں پھینک دیا۔

نواب خاںؒ دریا میں پھینکے جانے کے بعد فی الفور ڈوب گیا اور سردار عظیم خان کابل کو روانہ ہو گیا پائندہ خان سردار کے ڈیرے کے کوچ کرنے کی خبر سن کر انب میں واپس آگیا۔ اس کو خوب آباد کیا۔ سکھوں کے مقابلہ میں بڑے بڑے کار مردانہ و ہمت دلیرانہ اس سے ظاہر ہوئے، جن کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔

کیفیت ریاست پکھلی

ملک پکھلی سواتی قوم کی وراثت ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب افغان سوات سے آئے اور پکھلی پر قبضہ جما لیا تو سب نے محکم قول و قرار کیا کہ جو شخص ہماری قوم سے ہے، اس پر واجب ہے کہ ملک کو فتح کرنے کے لئے ہمارے ساتھ کمر بندی کرے۔ اس عہد کے مطابق ہر ایک پر ملک برابر تقسیم ہوا۔ چنانچہ ہر پتہ کا نیم گی (حصہ) مقرر کیا گیا۔ اس نیمگی کے حصہ کی تقسیم قوم وار ہوئی، جس کی تفصیل آخر میں دی جائے گی۔ کسی ایک شخص نے اپنی گرہ سے خرچ کر کے ملک فتح نہیں کیا کہ وہ مالک اور حاکم ہو جائے۔ ہر ایک نے خرچ اپنی اپنی گرہ سے کر کے ملک فتح کیا۔ اس لحاظ سے ہر ایک کا حصہ مقرر کیا گیا۔

سعادت خان کی سربراہی پر سواتی قوم کا متفق ہونا

کچھ عرصہ کے بعد اس قوم سے ایک شخص سعادت خان تائیدایزدی سے صاحب حشمت ہو گیا۔ قوم نے خان موصوف کو دربار میں سوال و جواب اور امراء و وزراء سے ملاقات کے لئے مختار و ممتاز بنایا اور اس کا ساختہ و پرداختہ، سب قوم نے منظور کرنے کا اقرار کر لیا۔ اس خان کا اپنا مسکن بنا کردہ خود گڑھی سعادت خان ہے۔ نیمگی سے خان کی پگڑی کے لئے پڑی سے حصہ زیادہ دیا گیا۔

جب کبھی درانی حکومت کی طرف سے مقرر شدہ حاکم کشمیر کا گزر اس علاقہ سے کشمیر کی طرف ہوتا تو خان موصوف اس کی ہم رکابی کے لئے ایک دو منزل استقبال کے لئے جاتا اور کشمیر تک پہنچاتا۔ اگر حاکم، کشمیر سے کابل کو جاتا تو اس کا استقبال مظفر آباد میں کرتا اور اپنی حد سے بسلامت اس کو گزارتا۔ اس خدمت کے عوض اس کو کچھ جاگیر کشمیر سے ملتی اور حاکم کی آمد و رفت کے وقت پکھلی کا مقررہ شدہ معاملہ، لوگوں سے وصول کر کے اس کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کرتا۔

لہ۔ یہ واقعہ ۱۸۱۶ء کا ہے۔ مطابق تاریخ تنولیاں از سید مراد علی۔

اگر رئیس تنول، جدون افغانوں کے ساتھ کچھ جھگڑا یا عداوت کرتا تو تمام صوبہ تھی بطور جرگہ جمع ہو کر ان کے درمیان تصفیہ کرا دیتے۔ کچھ عرصہ کے بعد جب سعادت خان فوت ہو گیا تو اس کے دونوں بیٹے نجیب اللہ خان اور حبیب اللہ خاں اس کے قائم مقام ہو گئے۔ حبیب اللہ خان چھوٹا تھا۔ ریاست وحکمرانی کی دستار نجیب اللہ خاں کے سر پر باندھی گئی۔ نجیب اللہ خان اپنے باپ کے دستور کے مطابق اپنے بھائیوں سے اتفاق ومراعات رکھتا رہا۔

کیفیت ملک آورشں (ہرشں)

افغان جدون کے تین پتے ہیں۔ سالار،[۱] حسن زئی،[۲] اور منصور۔[۳] یہ دریائے سندھ پار کے علاقہ سے آئے اور رجوعیہ، دھمتوڑ، نواں شہر اور رانگل پر قابض ہو گئے۔ ان میں کوئی خان یا افسر نہ تھا۔ سب بحیثیت مساوی رہتے۔ خرچ پر آئے اور ملک پر قابض ہو گئے۔ جب کبھی پکھلی کی جانب سے صورتی پر حملہ کرتے تو یہ تینوں پتے متفقہ دفاع کرتے۔ اسی طرح تنولیوں کے خلاف بھی متفقہ اقدام دفاع کرتے۔ قوم کرڑال بوجہ اپنی کمزوری کے، جدونوں کے حلیف رہے اور کچھ نذرانہ میں امداد بھی دیتے۔ جب حاکم کشمیر ان کے ملک سے گزرتا تو نذرانہ کے طور پر گھوڑا، جرہ باز اور کچھ نقدی دے کر اپنی حد سے ان کو گزار دیتے۔ ملک کا انتظام وکاروبار سب پتے مل کر اتفاق سے سرانجام دیتے۔ اگر کسی کو کوئی مشکل پیش آجاتی تو تینوں پتوں سے دو دو یا چار چار سفید ریش اور تجربہ کار لوگ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے جمع ہو جاتے۔ جب کبھی دربار حاکم میں سوال وجواب کی ضرورت ہوتی تو ایک شخص پتہ حسن زئی دھمتوڑ سے بطور خان ہر سہ پتہ کے اتفاق سے مقرر کر لیتے۔ اس خان کی وفات کے بعد اس کی نسل سے کسی کو متفقہ طور پر خان مقرر کر لیتے۔ چنانچہ سکھوں کے وقت برخوردار خان دھمتوڑ والا تینوں پتوں کا خان تھا۔ اس کی وفات کے بعد عنایت اللہ خان اس کا قائم مقام ہوا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹے کو خان سب کے صلاح ومشورے سے مقرر کرتے۔

کیفیت ملک گگھڑاں

خان پور ملک گگھڑ میں تین بھائی تھے۔ سلطان مہند علی خان، راجہ شیر محمد خان[۱] اور سید محمد خاں

---

[۱] ۱۸۴۷ء سے ۱۸۷۲ء تک حکمران رہا۔

سید محمد خان کا ملک میں کوئی حصہ نہ تھا۔ صرف گزارہ کے لئے ایک گاؤں الگ دیا ہوا تھا۔ ملک کا نصف حصہ راجہ مہند علی خان[۱] جو مسند نشین تھا کے زیر قبضہ تھا اور نصف راجہ شیر محمد خان کے قبضہ میں تھا۔ دونوں اتفاق سے گزارہ کرتے تھے۔ حاکمان کے نذر و نذرانہ اور ریاست کے خرچ مہمانداری کو دونوں نصف نصف برداشت کرتے تھے۔ سلطان مہند علی خان کی اولاد سے بڑا بیٹا نجف خان، دوسرا مدد خان اور تیسرا نادر خان ہیں۔ کچھ کنیز زادے بھی ہیں۔ ان میں سے حسین بخش خان کچھ عرصہ مامور رہا اور فرمان علی خان بھی۔ راجہ شیر محمد کی اولاد بڑا بیٹا راجہ گوہر علی خان، دوسرا علی بہادر خان ہے۔ راجہ علی گوہر خان[۲] زندہ موجود ہے۔ مگر علی بہادر خان عہد مولراج میں پیران پلاسی و حسن علی خان کرڑال کے ساتھ جنگ میں قتل ہوگیا۔ راجہ نجب خان پسر کلاں سلطان مہند علی خان مرحوم زندہ اور موجود ہے لیکن اس کی زبان ۳/۴ حصہ لکنت ہے۔ اور اتنا گونگا ہے کہ بات نہیں کرسکتا۔ راجہ نجب خان کے دو بیٹے جو ایک ہی ماں سے ہیں۔ نام راجہ حسن خان اور راجہ حیدر بخش خان۔ راجہ نجب خان کے دو تین بیٹے دوسرے قبیلہ سے ہیں، جو کم عمر ہیں اور ان کے نام اب تک مشہور نہیں ہوئے۔

مدد خان برادر نجب خان دانا، نیک، باثر اور قوی شخص تھا۔ اس کے دو بیٹے ہیں۔ راجہ عطا علی خان اور راجہ غلام محمد خان۔

راجہ سید محمد خان برادر خورد سلطان مہند علی خان کے دو بیٹے ہیں۔ ایک راجہ نیاز علی خان اور دوسرا راجہ غلام محمد خان۔ لیکن انہوں نے خان پور سے حصہ کا دعویٰ نہ کیا اور دونوں نوکری کر کے وقت گزار رہے ہیں۔

سب ملک خان پور، نصفا نصف سلطان مہند علی خان اور راجہ شیر محمد خان کے درمیان تقسیم ہے۔ گاؤں اور آسامیاں سب تقسیم ہیں۔ دونوں راجگاں کی جاگیروں کے درمیان سادات کے گھرانے آباد کئے ہیں اور ہر ایک کو بقدر توفیق خرچ نقدی یا غلہ کی صورت میں دیتے ہیں۔

راجگان کے پاس توپ یا بندوق کی قسم کا کوئی ہتھیار نہیں ہے۔

---

[۱] - ۱۸۰۲ء سے ۱۸۲۴ء تک حکمران رہا۔

[۲] - ۱۸۲۵ء ۰ ۱۸۶۲ء ۰ ۰ ″

[۳] - ۱۸۲۵ء ۰ ۱۸۶۳ء ۰ ۰ ″

احوالِ ملک ترین

محمود شاہ درانی کے عہدِ سال ۱۸۰۰ء میں کابل سے سمندر خان درانی ہزارہ میں آیا اور سب ملک کو آزار پہنچایا۔ موضع سری[1] (نزد بھیرہ کالونیڈ۔ مترجم) میں ایک بڑی جنگ ہوئی۔ جس میں سمندر خان کو شکست ہوئی اور اس کی سب فوج ماری گئی۔ لیکن سری کا گاؤں اس نے جلادیا اور ہزارہ کے اور بہت سے گاؤں اس نے جلا دیئے۔

درّانیوں کی حکومت سے حاجی وہاب کا مالیہ وصول کرنے کے لئے ہزارہ میں آنا

ملک کے نظم و نسق کا انتظام محمود شاہ کی مملکت کے امراء سے متعلق ہوگیا۔ شاہ موصوف نے قلعہ اٹک میں اپنا قلعدار مقرر کیا۔ چھچھ ہزارہ اس کے ماتحت کردیا اور مالیہ وصول کرنے اور انتظام ملک کرنے کے لئے چھچھ کے قانون گوؤں میں ایک قانون گو حاجی وہاب کو حاکم اٹک مقرر کر کے ہزارہ میں بھیج دیا۔ حاجی وہاب اپنے لشکر مشتمل بر تین سو سوار اور چند پیادہ کے ساتھ ہزارہ میں داخل ہوا اور موضع قاضی پور کہ اس زمانہ میں سکندر پور[2] کے نام سے معروف تھا، میں اپنا ڈیرہ لگایا اور پندرہ دن تک سکندر پور سے نیچے میدان ملکیار میں رہا کہ ملک کے رئیس اور ملک و مال گذاران و دیہات باری باری سے آکر حاضری دیتے اور سلام کرتے رہے۔ اس نے ملک کے تمام مقدمان و رئیسان اور مال گذاریاں کو حکم بھیجا کہ وہ سب ایک دن اس کے پاس حاضر ہو جائیں۔ چنانچہ اس حکم کی بناء پر سب بمعہ محمد خان ترین اس کے پاس حاضر ہوگئے اور ملاقات شروع ہوگئی۔

محمد خان ترین اور حاجی وہاب میں تلخ گفتگو

سلام دعا، احوال پرسی وغیرہ کے بعد معاملہ کی ادائیگی پر بات چیت شروع ہوئی کہ معاملہ خریف ادا کیا جائے۔ سوال و جواب میں محمد خان ترین کا رویہ سخت تھا اور حاجی وہاب حکومت کے نمائندہ ہونے

---

[2]: اب بھی سکندر پور کے نام سے مشہور ہے۔

[1]: نزد سری کوٹ۔ ترجمہ

کا دعوے دار تھا۔ دونوں میں اختلاف رونما ہوا اور موافقت نہ ہو سکی۔

محمد خاں وہاں سے اٹھ کر موضع درویش میں آیا اور اپنے اہل و عیال کو وہاں سے نکال کر موضع گلڈھیری (نزور ہانہ ۔ مترجم) لے گیا۔

حاجی وہاب کا درویش پر حملہ

حاجی وہاب بھی اس واقعہ سے برافروختہ ہو گیا اور موضع درویش میں آیا محمد خان کے گھر کو آگ لگا دی اور چند کو گرا دیا اور ان مکانات کی لکڑی اپنے جلانے کے لئے لے گیا۔

محمد خان کی جوابی کارروائی

اس سے محمد خان کی آتش غضب بھڑک اٹھی بظاہر تو اس نے رئیسول کا جرگہ طلب کیا کہ معاملہ ادا کر دیا جاتے لیکن اندرونی طور پر بغاوت کے لئے مضبوط کمر بند آدمی کافی تعداد میں ہر سہ پٹی ہزارہ، اترین، دلزاک و ترک اور بعض تناول، افغاناں اور مشوانی سے بھی جمع کر کے صبح سویرے حاجی وہاب کے ڈیرے کو گھیر لیا اور بیک وقت بندوق زنی شروع کر دی۔

حاجی وہاب کا قتل اور اس کی فوج کی پسپائی

حاجی وہاب خان جو اپنے خیمہ میں اس وقت محو خواب تھا۔ آواز سنی، تو جلدی میں اٹھا، کپڑے پہنے اور گھوڑے پر سوار ہو کر جرأت سے مقابلہ کے لئے تیار ہو گیا۔ وہ بمعہ ایک دو ہمراہیوں کے مقابلہ میں مارا گیا لیکن باقی فوج گھبرا کر اٹک کی طرف بھاگ گئی۔ پیادہ بھی بھاگ گئے۔ جو باقی رہ گئے ان سے حملہ آوروں نے مال و متاع اور سامان لوٹ لیا۔ محمد خان نے مقدم مشرف کی معیت میں سواروں کا تعاقب تا حد ہزارہ کیا اور ان کو ملک کی حد سے نکال کر محمد خان واپس آیا۔ حاجی وہاب کا سب سامان، خیمے، گھوڑے، اسلحہ، نقد و جنس لوٹ لیا گیا۔

احوال ملک ترکان

ترک پٹی مانکرائے

وراثتاً مانکرائے کے ترک محمد خان اور ملوک خان کی اولاد سے تھے میسمیان ہاشم خان و کمال خان دونوں اتفاق اور مشورہ سے ترک پٹی کا انتظام کرتے تھے لیکن ہاشم خان اپنے قوت بازو کی وجہ سے بھائیوں پر زور آور تھا۔ ایک دن آدھی رات کے وقت راجہ کمال خان کو معہ اہل و عیال قتل کر دیا۔ اس کا ایک خوردسال بیٹا مسمی فتح خان زندہ بچ گیا۔ راجہ ہاشم خان نے سب پٹی تورکی پر بزور غلبہ حاصل کر لیا۔

احوال دورِ سکھاں

جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ۱۸۷۶ بکرمی (مطابق ۱۸۱۹ء) میں کشمیر کو فتح کر لیا، تو قلعہ اٹک بھی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے قبضہ میں آگیا۔ تو قلعہ اٹک کی حراست اور انتظام ملک چھچھ ہزارہ کے لئے بھائی حکم سنگھ چمنی کو حاکم مقرر کر دیا۔ اور بھائی حکم سنگھ چمنی نے ہزارہ کے معاملہ کی تحصیل کے لئے مکھن سنگھ کو جو ایک بہادر شخص تھا، مقرر کر دیا۔ مکھن سنگھ چند سواروں کے دستہ کے ساتھ آیا اور سرائے صالح میں آکر مقیم ہو گیا۔ وہاں پہلے سے ایک خام گڑھی تھی جس میں چند سپاہی رہتے تھے، جو حکومت حکم سنگھ چمنی سے پہلے دو سکھ سرداروں مکھا سنگھ و جوان سنگھ ساکن راولپنڈی نے بنائی تھی اور جو ہزارہ سے مقررہ نذرانہ وصول کیا کرتے تھے۔ جن کی طرف سے بخشی لیکھراج نے ایک دو فصل نذرانہ جمع بھی کیا تھا اور سرائے صالح میں گڑھی بھی بنائی تھی۔ جب مکھن سنگھ بحکم بھائی حکم سنگھ آیا تو یہ سپاہی اس کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کے مطیع ہو گئے۔

ان ایام میں ملک ہزارہ کا کل معاملہ بارہ ہزار روپیہ مقرر تھا اور بموجب تقسیم ہر پٹی برابر ادا کرتے تھے۔ مکھن سنگھ کے آنے کے وقت میں فصلِ ربیع ۱۸۷۷ بکرمی ۲۰-۱۸۱۹ء ابھی کچا تھا، لہٰذا کچھ مدت اس نے انتظار کیا۔ جب فصل پختہ ہو گیا اور معاملہ کی وصولی کا وقت نزدیک آ گیا تو مکھن سنگھ نے ایک رقعہ محمد خان ترین کو جو گلڈھیری میں مقیم تھا، لکھا۔

سکھوں کے معاملہ ربیع کی وصولی اور محمد خان ترین کی مخالفت

جب یہ خط محمد خان کو ملا تو اس نے فوراً اپنے منشی سے جواب سخت الفاظ میں لکھ کر بھیجا، جس سے طرفین میں دشمنی پیدا ہو گئی۔ محمد خان نے ہزارہ کے رئیسوں سے اتفاق کر کے اور سری کوٹ کے مشوانیوں، تنولیوں اور ہزارہ کے لوگوں کے ساتھ سکندر پور جو بعد میں قاضی پور کے نام سے مشہور ہوا، میں جمع ہو گئے۔ یہ سن کر مکھن سنگھ بمعہ چالیس سواروں کے سرائے صالح سے نکل کر میدان میں آ گیا۔ شاہ محمد کے گاؤں کے ساتھ، کنارہ دریائے دوڑ پر طرفین میں جنگ واقع ہو گئی۔ ملکی لوگوں کے لشکر نے آگے بڑھ کر مکھن سنگھ کے سواروں کے ساتھ جنگ شروع کر دی۔

لہ۔ یہاں پر مکھن سنگھ نے ایک گڑھی بھی تیار کی تھی۔

مکھن سنگھ کا قتل مکھن سنگھ ایک بہادر شخص تھا۔ ہر دفعہ حملہ کو پسپا کرتا رہا۔ یہ جنگ صبح سے دوپہر تک ہوتی رہی۔ لیکن ملکی لوگ زیادہ تھے، یہ تھوڑے۔ آخرکار مکھن سنگھ کو گولی لگی اور وہ گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ اس کے باقی ماندہ سپاہی بھاگ کر سرائے صالح کے قلعہ میں محصور ہو گئے۔ بعد قسم و سوگند اور جرگہ، سید و علمائے قلعہ سے باہر آئے۔ بعض پیادہ سپاہی جو ملکی تھے، اپنے گھروں کو چلے گئے۔ باقی سوار نکلتے ہی اٹک پہنچ گئے اور حکم سنگھ کو حالاتِ جنگ اور مکھن سنگھ کے قتل ہونے کی خبر دی۔ بھائی حکم سنگھ یہ خبر سنتے ہی سوار ہو کر ہزارہ کی طرف بڑھا۔

حکم سنگھ کی آمد اور جنگ موڑہ جب حکم سنگھ موضع موڑہ سرحد ہزارہ پر پہنچا تو ادھر سے محمد خان ترین بمعہ تمام ملکی لوگوں کے سدراہ ہوا۔ آخرکار موضع موڑہ اور سلطان پور کے درمیان طرفین میں بندوقوں سے جنگ[1] شروع ہو گئی۔ دونوں طرف بہت سے لوگ مارے گئے۔ جب بھائی حکم سنگھ نے ہزارہ میں داخل ہونے کی قوت نہ دیکھی تو واپس اٹک کی طرف چلا گیا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کو سب حالات، مکھن سنگھ کے مارے جانے، اس کے موڑہ پر آنے اور رقابو نہ پانے سے آگاہ کیا۔

دیوان رام دیال کی آمد مہاراجہ نے دیوان رام دیال کو فوج و توپخانہ کے ساتھ مفسدان کی تنبیہ و تادیب کے لئے بھیجا، تا کہ ہزارہ کا انتظام کرے۔

جب دیوان رام دیال ہزارہ پہنچا، تو بعض لوگ اس کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور بعض روپوش ہو کر سری کوٹ، کوہ گندگھر میں چلے گئے اور معاملہ مقررہ و نذرانہ ادا کرنے سے پہلو تہی کی۔ جو لوگ حاضر ہوئے انہوں نے کہا کہ سب مالیہ تو وہ لوگ، جو اب پہاڑ پر چلے گئے ہیں، ان سے وصول کر چکے ہیں اب ہم ادا شدہ معاملہ کس طرح پھر ادا کریں۔

جنگ ناڑہ لہٰذا دیوان رام دیال نے ناڑہ[2]۔ سید خانیاں پران سے جنگ کا انتظام کیا۔ صبح سویرے دیوان موصوف فوج اور سامان کے ساتھ ناڑہ پر پہنچ گیا۔

---

[1] ۱۸۲۱ء

[2] سری کوٹ کے نیچے بالمقابل موضع داڑہی و کھلابٹ۔

اس طرف سے سری کوٹ کے مشوانی، سید خانی دکھلابٹ والے۔ مترجم، اور تربیلہ کے پٹھان اور یوسف زئی بھی جمع ہو گئے۔ سارا دن جنگ ہوتی رہی

دیوان رام دیال کا قتل

جب رات ہو گئی تو کوہستانی جنگ کے نمونہ پر سب ملکی چاروں طرف سے غوغا و شور کر کے یک دم حملہ آور ہو گئے۔ دیوان رام دیال مارا گیا اور اس کی فوج بھاگ کر اپنے ڈیرہ پر آگئی۔ دیوان رام دیال کی سمادھی موضع کھلابٹ کے ساتھ اب بھی موجود ہے۔ فوج سکھاں خالی ہاتھ اور سراسیمہ ہو کر واپس لاہور چلی گئی اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کو سب حالات سے باخبر کیا۔

سردار امر سنگھ (زمانہ کا بہادر) کی آمد

اس کے بعد سردار امر سنگھ کو جو ایک منتخب سردار اور تیر انداز تھا کو ہزارہ کے انتظام کے لئے بھیجا گیا۔ ۷۹-۱۸۷۸ بکرمی (مطابق ۱۸۲۱ء) ہزارہ میں داخل ہوا اور اس نے اپنا ڈیرہ کوٹ نجیب اللہ، جو مقدم مشرف کا مسکن تھا، میں لگایا۔ رعیت کی خاطر داری کے لئے ان سے ہر رعایت روا رکھی اور حسنِ سلوک سے پیش آیا۔ غریب کسانوں کو امداد تخم اور بیل عطا کر کے خوشنود کیا اور نیک نامی حاصل کی۔ بہت سے لوگ جو محمد خان ترین کی زیادتی سے اپنے گھر بار سے دل برداشتہ ہو چکے تھے۔ سردار امر سنگھ مجیٹھیہ کی خوش خلقی کے باعث اس پر اعتبار کر کے اس کے گرد جمع ہو گئے۔ علاقہ کے رئیس اور سردار موصوف سے متفق ہو گئے۔ اگرچہ سردار موصوف ظاہراً محمد خان کے ساتھ بھی حسن خلق اور زمانہ سازی ظاہر کرتا تھا اور کبھی بھی اپنی تحریراً سوال و جواب میں ترشی نہ کرتا تھا۔ لیکن دل میں محمد خان کے گذشتہ واقعات جنگ کی وجہ سے کدورت رکھتا تھا اور اس کی باتوں پر اعتبار نہ کرتا تھا۔

چونکہ کاروبارِ دنیا سب خدا کی مرضی کے تحت ہوتے ہیں اور ایک پتہ بھی اس کے حکم کے بغیر ہل نہیں سکتا۔ تقدیر الٰہی کے مطابق اوباش لوگوں نے جو عقل و خرد سے خالی تھے، سردار موصوف کو مشورہ دیا کہ جب تک وہ موضع نگری، مکول متعلق پرگنہ ناڑہ مسکن محمود خان کرڑال کو تاخت و تاراج نہ کرے گا۔ ملک ہزارہ میں اس کا رعب و داب قائم نہ ہو گا۔ بلکہ ہزارہ کی فتح کا کام آسان ہو جائیگا۔

امر سنگھ مجیٹھیہ کا حملہ کرڑالوں پر

اس نے اوباشوں کے مشورہ کے مطابق عمل کیا اور اپنے دانا و خیر اندیش اصحاب سے مشورہ نہ کیا۔ وہ قلیل جماعت

ؔ موضع کانڈل۔ برلب سڑک، اب تربیلہ ڈیم کے زیر آب ہے۔

ایک سو پچاس سوار اور کچھ ملکی لوگوں کے ساتھ (راجہ خان پور اور ہزارہ کے لوگوں کے ساتھ) حملے کے لئے روانہ ہو گیا۔

یہ ملک پہاڑی ہے اور بغیر کافی جمعیت کے فتح مشکل ہے۔ اگرچہ سردار موصوف کے سواروں نے ان مواضعات پر فتح پائی اور چند لوگ جو گاؤں میں تھے، ان کو قتل بھی کر دیا۔ لیکن بہت لوگ بھاگ گئے۔ ان دونوں مواضعات نگرہی، مکول سے مویشی و دیگر سامان لوٹ لیا گیا۔ چند مکانات کو جلا دیا اور کچھ کو گرا دیا۔ سردار موصوف اس کے بعد واپس ہوا۔ اس کے چند ملازمین اور ملکی لوگ لوٹا ہوا سامان لے کر واپس ہو گئے اور سردار خود چند آدمیوں کے ساتھ وہاں رہ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی واپس ہوا۔ اس کے لشکر کے سپاہی اور ملکی لوگ جب دور چلے گئے

امر سنگھ کا قتل

تو سردار موصوف اپنے چند سواروں کے ساتھ وادی سمندر کٹھ جو موضع سجی کوٹ نگرہی و مکول کے نیچے واقع ہے، طہارت کے لئے نیچے اترا۔ یومیہ مقدار افیون کھانے اور پاخانہ وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد گھوڑے پر سوار ہوا تو قرب وجوار کے ملکی لوگ سمندر آل، ڈھونڈ و چوکیال تینوں قوموں کے افراد شور و غوغا کرتے ہوئے ڈھول تری کے ساتھ مقابلہ پر آن کھڑے ہوئے اور سردار مذکور کو وادی سمندر کٹھ میں گھیر لیا۔ اس وقت وہ کٹھ میں جاری پانی سے ہاتھ منہ دھو رہا تھا۔ چنانچہ سردار موصوف نے اپنی ملازم فوج اور حشری کو واپس آنے کے لئے آواز دی۔ لیکن کوئی بھی واپس نہ آیا کہ مدد کرے۔

سردار نے اپنی کمان سنبھالی کہ دشمنوں پر تیر اندازی کرے۔ لیکن تینوں بار زہ کمان سے اتر گئی۔ لاچار سردار نے کمال بہادری اور سرخروئی سے بمعہ اپنے چھوٹے بھائی ہری سنگھ نے از دست دشمنان جان دے دی۔ ان دونوں بھائیوں کی لاشیں سمندر کٹھ کے پانی کے کنارے ایک ماہ سے زائد پڑی رہیں۔ آخر کار ہندوؤں اور برہمنوں کی درخواست پر یہ لاشیں سرائے صالح لے جا کر جلائی گئیں اور سمادھی بنا دی گئی۔ اب تک وہ ڈیری موجود ہے

(یہ جگہ بر لب سڑک جرنیلی ہے، جس میں اب ایک باغ ہے۔ مترجم)

مائی سدا کور کی آمد اور تربیلہ میں قیام

جب سردار امر سنگھ کے قتل کی خبر مہاراجہ رنجیت سنگھ والئی لاہور کو ملی تو اس نے ایک بہت بڑی فوج

بہ سرکردگی مائی سداکور اور کنور شیر سنگھ مقرر کر کے بھیجی اور کرنل الہٰی بخش خان معہ بڑے توپخانہ کے اس کے ساتھ تھا۔

انہوں نے تربیلہ میں ایک کچی گڑھی قائم کی اور اس کو تھانہ بنا کر، سپاہی مقرر کیئے۔

مائی سداکور نے محمد خاں ترین کو اپنا بیٹا کہہ کر بلایا اور چند دن ہزارہ میں رہی۔ گھوڑے باز اور معاملہ مقرر شدہ وصول کر کے واپس چلی گئی۔

بھوانی داس پشاوریہ

ان دنوں میں دیوان بھوانی داس پشاوریہ ایک فوج کے ساتھ کشمیر سے آیا۔ ایک قلعہ موضع گلی مسکن نواب خان اور ایک گڑھی موضع دربند میں مرمت کر کے دونوں جگہ تھانے بنائے اور فوج مقرر کی۔ ان کی تنخواہ ہر دو ماہ بعد کشمیر سے آتی اور تقسیم کی جاتی۔

صوبیدار کشمیر دیوان موتی رام اور پھر سردار ہری سنگھ کا تقرر

جب ملک کشمیر رنجیت سنگھ والئی لاہور کے تحت میں آیا تو پہلا صوبیدار کشمیر دیوان موتی رام مقرر ہوا۔ اس کے بعد سردار ہری سنگھ حاکم کشمیر مقرر ہوا۔

سردار ہری سنگھ دو سال حاکم رہا۔ اس کے بعد ۱۸۸۰ بکرمی میں دیوان موتی رام پھر حاکم کشمیر ہوا

ہری سنگھ کی واپسی براہ ہزارہ اور مانگل کی جنگ

سردار ہری سنگھ کو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے واپس بلا لیا کہ رنجیت سنگھ والئی لاہور ملک منکیرہ کی فتح کے لئے روانہ ہو رہے تھے اور ضروری تھا کہ سردار ہری سنگھ بمعہ اپنی فوج سوار اور پیادہ جتنی جلدی ہو سکے مہاراجہ کی ہمرکابی کے لئے پہنچ جاتے۔ دیر کرنے کی صورت میں مہاراجہ سخت ناراض ہوگا۔

اس حکم پر سردار ہری سنگھ اپنی فوج سمیت کشمیر سے منکیرہ کے لئے براہ مظفر آباد اور پکھلی روانہ ہوا۔

جب سردار ہری سنگھ پکھلی میں وارد ہوا تو ہزارہ کے ملکی لوگوں، افغانان جدون اور تنولیوں نے محمد خان ترین سے مل کر، موضع مانگل میں جہاں راستہ بہت تنگ اور دشوار گزار ہے، سردار ہری سنگھ

کا راستہ روکا۔

ہری سنگھ کی راہ مانگل کو کھلوانے کی کوشش

سردار ہری سنگھ کو جلدی سے منکیرہ کی مہم کے لئے رنجیت سنگھ کے ساتھ شامل ہونا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر یہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں اور اس کا راستہ چھوڑ دیں تو بہتر ہوگا۔ اس عقدہ کو حل کرنے کے لئے اس نے نجیب اللہ خان صواتی جو محمد امین کا چچا تھا اور لالہ راج کنور سرگروہ سپاہ متعینہ شنکیاری کو وکیل بنا کر بھیجا۔ کہ وہ ان لوگوں کو کہیں کہ سردار ہری سنگھ کو تمہارے ملک کے ساتھ کچھ غرض نہیں۔ وہ صرف مختصر اور سیدھے راستہ سے منکیرہ کو جانا چاہتا ہے اور اس کو مہاراجہ کے پاس جلد ہی پہنچنے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی ہے جو مہاراجہ کے دل میں مصر دیوان چند، مہاراجہ کے درباری اور مشیر نے ڈالی ہے۔

مصر دیوان چند، مہاراجہ کے مشیر اور سردار ہری سنگھ کے درمیان عداوت

مصر دیوان چند کو سردار ہری سنگھ سے عداوت تھی اور وہ ہر وقت اس کی بدخواہی میں لگا رہتا تھا۔ جس وقت کہ پروانہ طلبی ہری سنگھ کو لکھا جا رہا تھا تو مصر دیوان چند نے مہاراجہ کے حضور عرض کی تھی کہ سردار ہری سنگھ آپ کے حکم کی تعمیل نہ کرے گا اور آپ کے ساتھ ہمرکاب ہو کر منکیرہ جانے میں توقف کرے گا۔ اس بات کو زیادہ مؤثر کرنے کے لئے مصر کے بھائی نے مہاراجہ سے چغلی کھائی کہ آپ تو تسخیر ملک منکیرہ کے لئے روانہ ہوئے ہیں لیکن سردار ہری سنگھ سات سو مسلح سپاہی لے کر کشمیر سے نہیں آئے گا۔ وہ وہاں بیٹھا ہوا کیا کام کر رہا ہے۔ ان چغلیوں کو سن کر سردار ہری سنگھ کی یہ خواہش تھی کہ وہ پروں کے ساتھ اڑ کر مہاراجہ کے پاس پہنچے۔

افغانوں اور ہری سنگھ کے درمیان نامہ و پیام کی ناکامی اور جنگ مانگل

مگر سب کام قدرت الٰہی کے قبضہ میں ہیں۔ نجیب اللہ خان اور راج کنور کی راستی پر مبنی صلح کی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا اور افغان زیادتی سے باز نہ آئے اور نجیب اللہ خان اور راج کنور کی زبانی جواب بھیجا کہ سردار بہت دولت اور پشمینہ کشمیر سے لایا ہے۔ ہم پشمینہ کا محصول اور حقِ بدرقہ ضرور لیں گے۔ اگر سردار محصول اور

بدرقہ سے انکار کرے گا تو ہم بھی اس کا راستہ نہیں چھوڑیں گے۔

یہ جواب سن کر پکھلی سے چل کر سردار مانسہرہ میں آگیا۔ رات وہاں گزاری۔ صبح پھر نجیب اللہ خان اور راج کنور کو پٹھانوں کی طرف بھیجا کہ مجھے جلدی جانا ہے اور تین روز کا سفر ایک دن میں طے کرنا چاہتا ہوں تاکہ مہاراجہ صاحب والیٔ لاہور کے ساتھ مل جاؤں۔ تمہارے لئے مناسب ہے کہ میرے ساتھ کچھ غرض نہ رکھو اور راستہ چھوڑ دو۔

نجیب اللہ خان اور راج کنور پھر مانگل میں آئے اور پھر فہمائش کی لیکن کوئی نیک خواہی و دوستی کی بات قبول نہ کی گئی، بلکہ مخالفت میں زیادتی ہی ہوتی گئی۔ اسی اثناء میں سردار کا لشکر مانسہرہ سے چل کر مانگل کی سرحد نزد بٹ[1]، جو جدون افغانوں اور پکھلی کی سرحد پر ہے، پر آکر اتر گیا۔ ظہر کا وقت تھا کہ نجیب اللہ خان اور لالہ راج کنور ناکام و ناامید ہو کر واپس سردار کے ڈیرہ پر آگئے اور افغانوں کی خود پسندی و تند مزاجی کی باتیں سنائیں کہ وہ کسی حال میں بھی راستہ چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

صبح کے وقت سردار کا ڈیرہ بٹ سے اٹھ کر مانگل کے تکیہ پر جو مانگل سے بہ طرف شمال بندوق کی زد کے فاصلہ پر ہے، آگیا اور پھر ان دونوں وکیلوں کو یہ پیغام دے کر بھیجا کہ:

"اگر آج رات کو راستہ خالی کر کے اپنے گھروں کو چلے جاؤ تو بہتر، نہیں تو کل صبح میرا لشکر اسی راستے سے گزرے گا۔"

وکیلوں نے تیسری بار جا کر ان سے بات کی، مگر افغانوں کے اولوس نے جو اس وقت تک ۲۵ ہزار تک جمع ہو گئے تھے۔ اور موضع مانگل کی حفاظت کے لئے خار بندی اور مورچہ بندی اچھی طرح سے کر لی تھی، نے جواب دیا کہ بغیر محصول کے راستہ ہرگز نہ دیا جائیگا۔

جب وکیل اس دفعہ بھی محروم اور مایوس ہو کر آگئے اور افغانوں کی جمعیت، مورچہ بندی اور مانگل کی پختہ حفاظت کر لینے اور افغانوں کے غرور اور سرکشی کا ذکر سردار سے کیا تو سردار نے جواب دیا کہ اس زندگی سے موت بہتر ہے۔ سردار موصوف نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا کہ کل صبح دیکھا جائے گا کہ خدا کس کو فتح سے سرخ رو کرتا ہے اور کس کو شکست سے

---

[1] ایک پختہ پرانا مینار۔

رو سیاہ کرتا ہے۔

تمام رات سکھ گرنتھ پڑھتے رہے اور دعا میں مصروف رہے۔ رات کو پندرہ سولہ دفعہ جوش آیا لیکن رات کا اندھیرا ہونے کی وجہ سے حملہ نہ کر سکتا تھا۔ جب صبح ہوئی تو سردار نے اپنی فوج کا میمنہ اور میسرہ ترتیب دے کر مانگل کے پھاٹک کی طرف جو شمال کی جانب تھا حملہ کے لئے روانہ ہوا۔ چونکہ درمیان میں فاصلہ بہت تھوڑا تھا۔ سردار کے سوار ہوتے ہی افغانوں نے جو مانگل میں جمع تھے، بندوقیں چلانی شروع کر دیں۔ جب مانگل کی دیواروں کے پاس فوج سکھاں پہنچی تو اس کے چند آدمی بندوق کی گولیوں سے مارے گئے اور بعض زخمی ہوئے لیکن سردار نے مرنے والوں کی فکر نہ کرتے ہوئے تلوار نیام سے نکالی اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر مانگل کے پھاٹک پر پہنچ گیا۔ سکھوں نے ہر طرف سے حملہ کیا اور دیواروں کو پھاند کر مکانوں پر چڑھ گئے۔ ان کا رہبر اقبال سنگھ تھا اور اس کی ہلاشیری سے سیڑھیوں کے بغیر ہی سب سکھ مکانوں پر پہنچ گئے۔ جو کوئی سامنے آیا اس کو قتل کر دیا۔ بہت سے تلواروں سے ڈر کر مکانوں کے اندر چھپ گئے۔

افغانوں کی شکست اور معافی کی درخواست سکھوں نے ان مکانوں کو آگ لگا دی۔ جب آگ کے شعلے بلند ہوئے تو بہت سے پٹھانوں نے چھلانگیں لگا کر مانگل سے نیچے نالہ میں کود پڑے، جن کے بازو اور ٹانگیں گرتے ہی ٹوٹ گئے۔ روایت ہے کہ اس جنگ میں تقریباً دو ہزار آدمی مارے گئے اور بہت سے زخمی ہو گئے۔ جو بچ گئے وہ مطیع ہو کر سکھوں سے معافی کے طلب گار ہوئے۔ ہری سنگھ کو بہت بڑی فتح نصیب ہوئی اور جدون پٹھانوں نے دیکھا کہ ان کے حمایتی جو ہزارہ، تنول، ناڑہ نیلاں اور بیرنگلی وغیرہ سے آئے تھے، سب بھاگ کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور ملک جدون، سکھوں کے ہاتھوں جل کر راکھ ہو گیا اور جدون، نواں شہر اور دھمتوڑ کے ہندوؤں کو ساتھ لے کر سردار موصوف کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور معافی کے خواستگار ہوئے، کہ ہم زمیندار لوگ ہیں۔ ہمارا کوئی اختیار نہ تھا۔ جو لوگ ہزارہ، تنول، ناڑہ نیلاں اور بیرن گلی سے جمع ہو گئے تھے، انہوں نے ہم کو ملاقات نہ کرنے دی اور پشمینہ کا محصول لینے پر بضد رہے۔ اس پر

سردار نے ان کا گناہ معاف کر دیا۔ اور حکم دیا کہ سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر آباد ہو جائیں، ان سے تعرض نہ کیا جائے۔

علاقہ جدون پر تاوانِ جنگ

ملک جدون کے ہر گھر۔ تینوں پتیوں نواں شہر، مانگل، دھمتوڑ اور رجوعیہ سے بطور تاوان ہر گھر سے ساڑھے پانچ روپے مقرر کر دیا گیا۔ خانہ شماری کے ذریعے یہ سب وصول کر لیا گیا اور سردار کے حوالہ کر دیا گیا۔

ہری سنگھ کی روانگی لاہور

سردار موصوف نے چند روز نواں شہر میں قیام کیا اور خام گڑھی نواں شہر کو مرمت کر کے اس میں تھانہ مقرر کر دیا اور خود مع فوج از راہِ چنبہ و نوشہرہ، ہزارہ کی طرف چلا گیا۔ محمد خان ترین مع اہل و عیال خود سری کوٹ کے پہاڑ میں چلا گیا اور بوستان خان، برادر زادہ محمد خان، بہ صلاح محمد خان سردار کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ بوستان خان کو سردار موصوف نے اپنے ہمراہ لے جا کر مہاراجہ کی خدمت میں حاضر کر دیا۔

مہاراجہ کی فتح مانگل پر خوشنودگی

سردار ہری سنگھ نے مہاراجہ کی خدمت میں بہت سے تحفے، کشمیر کے گھوڑے مع زین، سنہری و روپہلی اور نقد روپے پیش کئے۔ مہاراجہ ان تحائف کو دیکھ کر بہت ہی خوش ہوا اور دربارِ عام میں اپنی زبان سے سردار ہری سنگھ کو مبارک باد دی اور ایک ردّی کاغذ اپنے ہاتھ میں لے کر اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اونچی آواز سے کہا کہ کشمیر کے حساب کا یہ کاغذ ہے۔ میں نے اس کو فتح مانگل کے عوض میں سردار ہری سنگھ کو بخش دیا۔ اس اعلان پر سردار کے دوست بہت خوش ہوئے اور حاسد جل اٹھے۔ چونکہ یہ ایام موسم برسات کے تھے، سردار، مہاراجہ سے رخصت ہو کر اپنے قصبہ گوجرانوالہ میں آ گیا۔

ہری سنگھ کی پشاور کو روانگی

برسات کے بعد، دوسہرہ کے موقع پر حسبِ دستور سب فوج اور افسر مہاراجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تیوہار منانے کے بعد مہاراجہ مع افسران و افواج پشاور کی طرف روانہ ہوا۔ راوی، چناب اور جہلم کو خیر و خوبی سے پار کر کے راولپنڈی کے نزدیک چھپلو جھنگی میں مقام کیا اور لشکر کو سردارانِ پشاور سے گھوڑے لانے کے لئے بھیج دیا۔

محمد خان ترین کی واپسی ہزارہ اسی مقام پر محمد خاں ترین کو مصر دیوان چند جو سردار ہری سنگھ کا سخت مخالف تھا، نے مہاراجہ کی خدمت میں پیش کیا۔ مہاراجہ صاحب، نے محمد خان کی عزت افزائی کی اور بیس ہزار روپیہ لطور خلعت عطا کیا۔ اور محمد خان کو ہری سنگھ کے ہمراہ ہزارہ بھیج دیا۔ سردار ہری سنگھ محمد خان کے ساتھ ہزارہ میں آیا۔ مہاراجہ نے ہری سنگھ کو ہدایت کی کہ محمد خان ترین کی عزت کا ہر وقت پاس کرے اور محمد خان کو بیس ہزار روپیہ ملک ہزارہ کے معاملہ سے ادا کرے۔

سردار نے ملک ہزارہ کے معاملہ سال ۱۸۷۹ بکرمی (مطابق ۱۸۲۲ء) کے تحصیل کے لئے اپنے ملازم مقرر کئے۔ سردار موصوف نے بیس ہزار کی جاگیر کے عوض مواضعات جاگل، ڈھینڈہ میکلم، درویش، موضع بھیرہ، کاتس، عالم، گلڈھیری، پنڈ خان خیل اور چند دیگر گاؤں دیئے۔ محمد خان اس پر راضی نہ ہوا اور مہاراجہ کی خدمت میں درخواست بھیجی کہ اس کو پوری جاگیر نہیں دی گئی۔ جو گاؤں دئے گئے ہیں وہ سترہ ہزار جاگیر بنتے ہیں۔

مہاراجہ نے از راہِ مہربانی محمد خان کو تین ہزار کی جاگیر علاقہ کھاٹڑ سے موضع پوڑ کا پروانہ عنایت کر دیا۔ خان نے اس موضع پر قبضہ کر لیا۔

سردار ہری سنگھ اور محمد خان کے مابین اختلاف اور جنگ اگرچہ مہاراجہ نے محمد خان کی عزت و تکریم اور جاگیر فراخ حوصلہ سے دی لیکن خان مذکور کے مزاج میں تندی و ترشی زیادہ تھی، لہٰذا سردار ہری سنگھ کے ساتھ اس کی موافقت نہ ہو سکی اور دن بدن مخالفت زیادہ ہوتی گئی۔ لوگوں میں حکومت کے خلاف بددلی پیدا کرتا اور باقیداروں کو سری کوٹ کی طرف بھیجتا رہتا۔ یہ سب لوگ موضع سری میں جمع ہو کر بیٹھ گئے۔ سردار ہری سنگھ نے ان کی تنبیہ کے لئے فوج۔ سوار و پیادہ اور توپوں کے ساتھ سری کی طرف کوچ کیا اور دوسرے دن صبح سویرے ان سے جنگ شروع کر دی۔ زمیندار بھی وہاں تیار بیٹھے تھے۔ توپ و بندوق سے طرفین میں جنگ شروع ہو گئی۔ زمیندار لوگ مورچہ میں تھے اور محفوظ تھے اور سردار کے لشکر میدان میں، لہٰذا ان کا نقصان زیادہ ہوتا رہا۔ دوپہر تک جنگ جاری رہی۔

ہری سنگھ کی شکست اور قلعہ ہری پور کی تعمیر

اس اثنا میں زمینداروں کی امداد کے لئے مشوانی، تربیلہ اور دریا سے پار کے یوسف زئی افغان آ گئے، جو سکھ ایک پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے تھے مشوانیوں نے حملہ کر کے ان سب کو قتل کر دیا۔ سردار کی کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔ بلکہ اس کی فوج تنگ اور لاچار ہو گئی اور واپس آ گئی، لہٰذا سردار نے بصلاح مقدم مشرف جو محمد خان کے خلاف اور سردار کا خیر خواہ تھا، واپسی کا ارادہ کر لیا اور اپنی جگہ پر واپس آ گیا۔ مقدم مشرف کے مشورہ سے قلعہ تعمیر کر لیا۔ اس واقعہ کے بعد قلعہ ہر کشن گڑھ کی بنیاد رکھی اور شہر ہری پور آباد کیا۔

قلعہ ہر کشن گڑھ ابھی غیر مکمل تھا کہ مہاراجہ نے سیر کی خاطر ڈیرہ اسمٰعیل خان و ڈیرہ غازیخاں کی طرف متوجہ ہوا اور سردار ہری سنگھ کو بمعہ فوج بلا بھیجا اور وہ ادھر روانہ ہوا۔ ملک ہزارہ سے نئے بھرتی شدہ ملازمین، دو سو سوار اور پانچ سو پیادہ سپاہی اپنے بڑے بیٹے گوردت سنگھ کی زیر کمان حفاظت ملک کے لئے چھوڑے اور سردار ہر سا سنگھ کالیہ کو، جو گوردت سنگھ کا خسر تھا، اس کی مدد کے لئے مقرر کیا اور خود سردار ہری سنگھ بمعہ لشکر عازم ڈیرہ اسمٰعیل خاں ہو گئے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ بہ مقام کوٹلہ خام جا کر مل گئے۔

محمد خان ترین نے قلعہ ہری پور کا محاصرہ کر لیا

سردار ہر سا سنگھ کالیہ نے قلعہ کی تعمیر کیلئے شیشم کا ایک درخت موضع درویش، جاگیر محمد خان سے کاٹ لیا۔ محمد خان نے جب یہ سنا تو غصہ سے بھر گیا۔ ڈھول بجا کر ارد گرد کے حشری لوگوں کو جمع کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ قلعہ ہر کشن گڑھ کے سپاہی قلعہ سے باہر نہ آ سکتے تھے۔ سردار ہر سا سنگھ اور گوردت سنگھ کو سانس لینا مشکل ہو گیا۔ مجبور ہو کر سردار ہری سنگھ کو صورتِ حال سے باخبر کرنے کے لئے سردار ہر سا سنگھ اور گوردت سنگھ نے خط لکھا جو بہ مقام جیب پور اس کی خدمت میں پہنچ گیا۔ سردار ہری سنگھ نے وہ خط فوراً مہاراجہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ مہاراجہ نے سردار ہری سنگھ کو اپنی فوج اور ڈیرہ سردار بدھ سنگھ سندھانوالہ کے ساتھ ہزارہ کی طرف بھیج دیا۔ فاصلہ بہت تھا اور ان کے ہزارہ میں پہنچنے سے پہلے صوانتھی لوگوں نے تندھیاڑ، کونش اور بھوگڑمنگ سے جمع ہو کر قلعہ شنکیاری کا محاصرہ کر لیا۔

قلعہ شنکیاری ملکی لوگوں نے فتح کر لیا

اور سپاہیوں کو اتنا تنگ کر دیا کہ کوئی سپاہی باہر نہ آسکتا تھا۔

موضع شنکیاری میں موجود ہندو اور کھتری ، مسلمانوں کے خوف سے قلعہ میں آگئے اور جو سامان اٹھا کر ساتھ لا سکتے تھے ، قلعہ میں آگئے اور جو سامان اٹھا کر ساتھ لا سکتے تھے ، قلعہ میں لے آتے اور جو کچھ ان کے گھروں میں رہ گیا وہ لوگوں نے لوٹ لیا۔

چند روز محاصرہ رہا۔ چونکہ کوئی مدد باہر سے نہ آسکی تو آخر کار محاصرین نے قلعہ پر ہلہ بول دیا اور اس کو فتح کر لیا اور سب سامان لوٹ لیا۔

قلعہ دربند بھی ملکی لوگوں نے لے لیا

دوسری طرف سے تنولی قوم اور پٹھانوں نے قلعہ دربند پر حملہ کر کے سب لوگوں کو قتل کر دیا۔ جو کھتری کہ قلعہ کے اندر تھے ان کو گرفتار کر کے ٹکر ہی اور نند ھیاڑ لے گئے۔ کھتریوں کو جرمانہ لے کر رہا کر دیا۔ اور جوان اور کنواریوں لڑکیوں کو اپنے نکاح میں لے آئے۔

نواں شہر کے قلعہ پر جدونوں کا حملہ

اسی طرح کا شور و فساد جدونوں کے ملک میں بھی نمودار ہو گیا۔ لوگوں نے قلعہ نواں شہر کا محاصرہ کر لیا۔ مگر دور سے ہی بندوقیں سے فائر کرتے رہے ، نزدیک نہ آتے کہ قلعہ کے اندر فوج کے پاس توپیں تھیں ، لہٰذا حملہ کر کے اسے فتح نہ کر سکے۔

اسی اثنا میں سردار ہری سنگھ فوج کے ساتھ جلدی سے ہزارہ میں داخل ہو گیا۔ یہاں پہنچتے ہی اس نے نواں شہر کے قلعہ کی امداد کے لئے سردار ہرسا سنگھ کالیہ کو آٹھ توپوں اور چند سوار اور پیادوں کے ہمراہ بھیجا۔ جب ہرسا سنگھ نواں شہر کے قلعہ میں داخل ہوا ، تو مقامی سپاہیوں کا حوصلہ بھی بڑھ گیا۔

اس قلعہ میں غلہ کم رہ گیا تھا ، لہٰذا قلعہ کے سپاہیوں نے سردار موصوف سے عرض کیا خوراک کے لئے غلہ کا بندوبست کیا جاتے۔ سردار موصوف نے مہان سنگھ کو معہ چند سوار و پیادہ نقدی دے کر غلہ کی خرید کے لئے بھیجا۔ چونکہ جن لوگوں کے پاس غلہ تھا ، وہ سب قلعہ کے محاصرہ میں مصروف تھا۔ لہٰذا جنس کی خرید کا بندوبست مشکل تھا۔ مہاں سنگھ کی اطلاع ، دشواری خرید غلہ

پاکر سردار ہری سنگھ نے تیسرے دن ان محاصرین پر حملہ کر دیا۔ نواں شہر کے باشندوں نے، جنہوں نے اپنے مکانوں کی چھتوں پر مورچہ بندی کر رکھی تھی اور وہاں سے بندوقیں چلا رہے تھے۔

جدونوں کی شکست

ان کی گولیوں سے دو تین سوار اور تین چار پیادہ سپاہی ہلاک ہو گئے۔ لیکن سکھوں کی فوج اپنے مردوں اور زخمیوں کے باوجود یکدم شہر کے اندر داخل ہو گئی۔ پہلے پہل ایک مسجد جس کے اندر دو سو مسلمان جمع تھے، کا محاصرہ کر لیا اور مسجد کو چاروں طرف سے آگ لگا دی۔ جو لوگ باہر آتے وہ تلوار اور بندوق سے قتل کر دئے گئے اور جو اندر رہ گئے وہ آگ میں جل کر مر گئے۔ اس کے بعد تمام مسلمانوں نے نواں شہر کو خالی کر دیا اور بھاگ گئے۔

سکھوں نے ان کے گھروں سے جتنا غلہ اپنے سروں پر اٹھا کر لا سکتے تھے، اٹھا لائے۔ اس جگہ مکمل فتح حاصل کی گئی، تاکہ پکھلی تک کوئی شخص مقابل نہ آ سکے۔

سردار ہری سنگھ کی آمد ہزارہ

سردار بدھ سنگھ سندھانوالہ کی فوج جو سردار ہری سنگھ کے ساتھ آ رہی تھی، ہزارہ میں داخل ہو گئی۔ مگر سردار بدھ سنگھ، مسلمانوں محمد خاں ترین و ترک وغیرہ کو، بدراہ کرنے لگا اور محمد خان سے ایک گھوڑا پیش کش لینے کے بعد سردار بدھ سنگھ نے محمد خان کی طرفداری شروع کر دی۔ سردار ہری سنگھ نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو ان حالات سے آگاہ کیا کہ سردار بدھ سنگھ کو واپس بلا لیا جائے اور اس کی جگہ کوئی دوسری فوج بھیج دی جائے۔

چونکہ قلعہ نواں شہر کا محاصرہ ختم ہو چکا تھا، لہذا سردار ہری سنگھ تمام فوج کے ساتھ پکھلی کی طرف روانہ ہو گیا اور ہزارہ کا انتظام اور معاملہ کی فراہمی کا کام مسمی شاہ کھتری ساکن حضرو کے سپرد کر دیا گیا۔

اس کے بعد سردار ہری سنگھ مانسہرہ پہنچا۔ وہاں پر مضبوط قلعہ تیار کرایا اور کچھ عرصہ وہاں رہا اور ملک کا حال معلوم کیا۔ اس کو بتایا گیا کہ قلعہ شنکیاری کی فتح کے وقت ہندوؤں کے ساتھ بہت زیادتی کی گئی اور کہ ہندوؤں کی عورتیں اب تک مسلمانوں کی قید میں ہیں۔ اس کے بندوبست کے لئے غور کیا اور یہ تجویز ٹھانی کہ راتوں رات اچانک کسی مسلمان آبادی پر حملہ کر کے ان کے بچوں

اور عورتوں کو گرفتار کرے۔

ہری سنگھ کا انتقامی حملہ، اگرور پر

اس کے لئے خیر خواہ ملکی لوگوں سے مشورہ لیتا رہا کہ کوئی ایسی جگہ بتلائیں۔ کیونکہ سب ملک پکھلی ویران پڑا ہوا تھا اور کہیں بھی یک جا کوئی آبادی نہ تھی۔ آخر کار خیر خواہوں نے بتلایا کہ ایک جگہ آباد ہے، جہاں ان مقامی لوگوں کے علاوہ پکھلی کے لوگ بھی جمع ہیں۔ لیکن اس جگہ کا فاصلہ سولہ کوس ہے۔ اس پر سردار ہری سنگھ نے دوری کا کوئی خیال نہ کیا اور اگرور (یہ مقام خیر خواہوں نے بتلایا تھا۔ مترجم) پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا اور فوج کو حکم دیا، دو تین روز کے خرچ کے لئے روٹیاں پکا کر ساتھ لے لیں کہ کسی جگہ کی طرف جانا ہے، لیکن جگہ کا نام کسی ہمراہی کو نہ بتلایا۔

اگرور میں قتل و غارت

نصف رات کے وقت سوار ہو کر درہ اگرور کے راستہ پر روانہ ہو گیا۔ چونکہ پہلی بار تھی، راستہ غلط ہو گیا اور رات پائین پکھلی ہی میں گزر گئی۔ جب صبح کی روشنی نمودار ہوئی تو اگرور کے صحیح راستہ پر چل پڑے اور صبح ڈیڑھ پہر کے قریب اگرور میں داخل ہو گئے۔ اگرور کے لوگ اگرچہ تعداد میں زیادہ تھے، لیکن مقابلہ کی طاقت نہ دیکھ کر ہر ایک شخص اپنے اہل و عیال کو لے کر فرار ہو گیا۔ تاہم سکھ فوج نے پہنچتے ہی قلعہ شنکیاری میں قتل شدہ فوج سے دو چند بلکہ زیادہ مسلمانوں کو قتل کر دیا اور ان کی عورتیں و بچے قید کر کے لشکر کے ساتھ لے لئے ایک رات اگرور کے ملک میں رہے، دوسرے دن کونش کی طرف کوچ کیا۔ چنانچہ کونش و ننداڑ کا سب علاقہ بے چراغ ہو گیا۔ درہ کونش کے سرے پر چھتر کے میدان میں سردار ہری سنگھ نے ایک دن ڈیرہ کیا۔

قلعہ شنکیاری کی از سر نو مرمت

دوسرے دن یہاں سے سردار موصوف شنکیاری میں آیا۔ مسلمانوں کے ہاتھوں سے مسمار شدہ گاؤں کو پھر سے مرمت کر کے آباد کیا۔ اس قلعہ شنکیاری کو بھی از سر نو آباد کیا۔

چند دنوں کے بعد کہ موسم برسات کا موسم شروع ہونے والا تھا۔ از راہ مانسہرہ و پاوہ، کہ حد تناول پر ایک شہر ہے۔ ہزارہ کی طرف واپس ہوا۔ واپس ہونے سے پہلے سردار نے قلعجات گلی، مانسہرہ، و شنکیاری میں ہر قسم کے اجناس کے ذخیرہ کا بندوبست کیا۔

ہندو اغوا شدہ عورتوں کی واپسی

ہندوؤں کی جو عورتیں، مسلمانوں کی قید میں تھیں، ان کو بوساطت حبیب اللہ خان پدر محمد امین خان گڑھی والا، چھڑانے کا بندوبست کیا اور ایک ہندو عورت کے بدلے میں دو، دو، تین تین مسلمان عورتیں دے کر سب ہندو عورتوں کو رہا کرالیا۔

سربلند خان تنولی اور ہری سنگھ کے درمیان جنگ

تنول میں سربلند خان نے ہری سنگھ کی آمد کے خوف سے اپنا سب مال و متاع اور اہل و عیال کو باہر بھیج دیا اور خود جنگ کے لئے تیار ہو گیا۔

جب سردار، گلی شاہ، نزد بھورج میں پہنچا تو تنولیوں نے اس پر بندوق سے فائر کرنے شروع کر دئے۔ اگرچہ گذرگاہ تنگ اور علاقہ دشوار گزار اور پہاڑی تھا، لیکن سردار نے بڑے حوصلہ اور بہادری سے یہ راستہ طے کرلیا اور درخیری اور شنگڑھی کو جلادیا۔ اور ہزارہ میں داخل ہو گیا۔

سربلند خان فساد و مقاومت کے لئے، ملکی لوگوں کو پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دنوں کے بعد سردار کو معلوم ہوا کہ سربلند خان اپنی جمعیت کے ساتھ پہاڑ کی چوٹی ڈنہ پر چلا گیا ہے جو موضع دروازہ کے نزدیک پہاڑ کی چوٹی پر ہے۔

سربلند خان جس نے اندورہ (پٹی)، آہنگراں میں ایک گڑھی تعمیر کی ہوئی تھی اور وہاں رہتا تھا۔ جب سردار کی فوج کے آنے کی خبر سنی تو اپنے بیٹے شیر محمد خان کو، جو بہت بہادر اور شجاع آدمی تھا، سردار کی فوج سے مقابلہ کرنے کے لئے کوہ ڈنہ کی چوٹی پر بھیجا۔ جب شیر محمد خان راتوں رات کوہ ڈنہ کی چوٹی پر پہنچ گیا تو سکھوں کی فوج پر بندوق سے فائر شروع کر دئے۔

شیر محمد خان پسر سربلند خان کا ہری سنگھ کی گولی لگنے سے فوت ہونا

سکھوں کی فوج نے قدرے پیچھے ہٹ کر پتھروں کے پیچھے پناہ لے لی۔ اس وقت سردار نے سنتری سے بندوق لے کر خود شیر محمد خان پر فائر کیا۔ گولی شیر محمد خان کو لگی اور وہ گولی لگتے ہی زمین پر گر پڑا۔ اس کے ساتھی مقابلہ کی تاب نہ دیکھ کر سب فرار ہو گئے۔

اس پر سکھوں نے حملہ کر کے ان کا تعاقب کیا۔ کافی لوگ قتل کر دیئے اور بہت سے بھاگ گئے۔ شیر محمد خان کا سر کاٹ کر لایا گیا اور اس کے سر اونچی لکڑی پر لٹکا کر قلعہ کے دروازہ پر نصب کر دیا۔ سربلند خان اپنے اس بیٹے کی، جو بڑا عادل، ہوشیار، بہادر اور دیندار تھا، موت سے سخت غمگین ہوا۔ گھر بار اس کے لئے ناگوار بن گیا اور وہ ملک تنول چھوڑ کر سری کوٹ میں پناہ گزیں ہو گیا۔

محمد خان ترین بھی سری کوٹ میں موجود تھا، یہ دونوں یک جا ہو گئے۔ لیکن مقابلہ کرنے کا کوئی راستہ ان کو نظر نہ آتا تھا، کہ کیا کریں۔

سری کوٹ جہاں محمد خان ترین بمعہ ملکی خوانین جمع تھے پر ہری سنگھ کا حملہ

اس اثنا میں خیر خواہان سرکار سکھاں نے سردار ہری سنگھ کو رائے دی کہ جب تک سری کوٹ فتح نہیں ہوتا، اس ملک سے فساد ختم نہ ہو گا یہ کام اور کاموں سے پہلے کرنا مناسب ہے۔

سردار موصوف اپنی بہادری کی بنا پر اس کام کو آسان سمجھتا تھا۔ اس وقت اس کے پاس سات ہزار بندوقچی سپاہی، سو چھوٹی توپیں (زنبورہ) اور دو بڑی توپیں تھیں۔ اسی فوج کے ساتھ اس نے مشوانیوں اور طاہر خیلیوں کو تنبیہ و تادیب کرنے کے لئے حملہ کا فیصلہ کر دیا سب مناسب سامان اور فوج کے ساتھ ماہ اسوج کے شروع میں ۱۸۸۱ بکرمی (۱۸۲۴ء) صبح سویرے حملہ کے لئے نکلا۔ پہلے دن قلعہ کرشن گڑھ سے نکل کر موضع ملکیار میں ڈیرہ کیا۔ دوسرے دن علی الصباح یہاں سے چل کر ناڑہ کے مقام کے سامنے جا کر حملہ شروع کر دیا اور موضع ناڑہ کے مکانوں پر مورچے بنا لئے۔ مسلمان ناڑہ کو خالی کر کے پہاڑ کی چوٹی پر جمع ہو گئے اور وہاں سے آہستہ آہستہ بندوقیں چلانی شروع کر دیں۔ پہلے دن طرفین میں دوپہر تک گولیاں چلتی رہیں۔ اس پر سردار نے اپنے افسروں کو تاکید کی کہ یہ وقت آگیا کہ چند مسلمان پہاڑ کی چوٹی سے بندوقیں چلا رہے ہیں اور تم میں سے کوئی ایسا نہیں کہ اوپر جا کر ان کو پہاڑ سے نیچے اتارے۔

اس پر سکھوں کے ایک دو سردار بڑھے، لیکن ملک پہاڑی تھا۔ زخمی ہو کر واپس آ گئے اور چوٹی سر نہ ہو سکی، بلکہ پہلے سے بھی زیادہ مسلمان وہاں جمع ہو گئے یہاں تک کہ دن کے ختم ہونے

میں چار گھڑی وقت باقی رہا تھا کہ سردار ہری سنگھ نے سکھوں کی فوج کے تمام افسروں کو، الٰہی بخش خان توپ خانہ اور دیوان رام دیال آنجہانی و اس کے افسران کو جو شکست ہوئی تھی اس کی یاد کرائی۔

ہری سنگھ کی جنگ کی صورتِ حال پر تشویش

اور کہا کہ آج پہاڑ کی چوٹی سر نہ کی گئی تو بہت مشکل پیش آتے گی اور دن کا وقت بھی آخر ہو گیا ہے۔ چونکہ واپسی کا راستہ بھی دشوار گزار ہے، لہٰذا مناسب ہے کہ کسی طرح سے اب واپسی کی جاوے اور اپنی فوج کو اپنے ڈیرہ پر پہنچا دیا جائے۔ پھر ایک دو دن کے بعد، حالات کی تبدیلی پر پھر یہاں آجائیں گے اور فتح حاصل کریں گے۔ چونکہ سردار کا مزاج بہت تند و تیز تھا اور اپنی بات پر مُصر تھا، کسی کی بات پر عمل نہ کرتا تھا بلکہ مجلس میں موجود افسروں کو طعنہ دیا، کہ تم کو زندگی پیاری ہے۔ تم کو بال بچے، جاگیریں، ملک اور نعمتیں یاد آرہی ہیں اور موت کی طرف منہ نہیں دے سکتے۔ مجھ کو نعرہ بازی سے زیادہ سکھوں کی عزت اور ملک بہت عزیز ہے۔ اگر اس جگہ سے نامراد واپس گئے تو مہاراجہ کو کس طرح منہ دکھائیں گے اور ہم کس طرح اس کے سامنے سرخرو ہو سکیں گے۔

اس کے بعد دو آدمی ان افسران کی طرف، جو زیارت شاہ شیر محمد غازی[۱] میں بیٹھے، اور کچھ دریائے دوڑ کے کنارے پر بیٹھے تھے، بھیجے کہ سردار ہرسا سنگھ کالیہ و مہاں سنگھ اور دوسرے افسروں کو کہیں کہ تم دربار میں ہر روز آیا کرتے تھے اور سب لوگ تمہارے ساتھ آکر یہاں بیٹھتے تھے۔ کھاتے، پیتے اور رنگ و تماشا میں ہر وقت شریک و ہم دوش ہوتے تھے، آج یہ کیا ہو گیا۔ جنگ میں موت کے خوف سے ایک کونہ میں بیٹھ جانا تمہارے شایانِ شان نہیں اور ادھر نہیں آتے ہو۔ یہ پیغام سنتے ہی جس کسی کو ہمارے ساتھ ہم نسبتی و یک جہتی کا دعویٰ ہو یہاں فوراً چلا آئے اور جس کسی کو جان و مال اور اہل عیال عزیز ہیں وہ جو چاہیں کریں

ہری سنگھ کی ناکامی اور اس کا زخمی ہونا

سردار ہری سنگھ کا یہ پیغام ہر ایک افسر نے سنا، لیکن کوئی بھی سردار ہری سنگھ کے پاس آنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ لیکن مہان سنگھ جوان دنوں سردار ہری سنگھ کے زیر عتاب تھا، توکل کر کے مع دو جوانوں

---

[۱] ۔ متصلہ کے گاؤں کے نزدیک یہ گاؤں اب تربیلہ ڈیم کی وجہ سے زیر آب ہے۔

سردار ہری سنگھ کے پاس پہنچ گیا۔

اس کے پہنچنے پر سردار نے ازراہِ طنز کہا کہ لوگ جنگ کو ٹھنڈا پڑتے دیکھتے ہیں تو پھر آجاتے ہیں۔ مہاں سنگھ نے جواب میں کہا کہ اگر کوئی اور نہیں آتا تو میں زندہ یا مردہ حاضر ہوں کہ میں سردار کا نمک پروردہ ہوں۔

مہاں سنگھ کی وفاداری

جب سورج طلوع ہو گیا تو مسلمانوں نے نعرۂ تکبیر کے ساتھ سردار کے کوٹھے کا چاروں طرف سے محاصرہ کر لیا، جس میں سردار کے ساتھ چند آدمی ہی تھے اور بڑی تیزی سے یکجا گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ چونکہ کوٹھے کی دیواریں مضبوط تھیں اور گولی اندر اثر نہیں کر سکتی تھی، تو انہوں نے دیواروں میں سوراخ کرنے شروع کر دئیے اور ان سوراخوں کی راہ سے اندر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ اسی طرح دوسرے مکانوں پر جن میں سکھ سپاہی تھے، لوگوں نے حملے کر دئیے اور میدانِ جنگ سکھوں پر تنگ ہو گیا۔ دوسرے افسر اپنے سپاہیوں سمیت کوٹھوں سے نکل کر اپنے ڈیرہ کو چلے گئے۔ سردار کو اس کے ساتھیوں نے اطلاع دی کہ سب سپاہی اور افسر چلے گئے ہیں اور سب مورچے خالی کر گئے ہیں۔ اب صرف یہی مکان باقی رہ گیا ہے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اس مکان سے باہر نکل جائیں اگر موقع ملے تو باقی سپاہ کے ساتھ جا کر مل جائیں۔ اگر مقابلہ ہو گیا، تو مرنا ٹھیک ہے لیکن یہاں پر بیٹھے رہنے میں تو مفت میں سراسر ہلاکت ہے۔ لہٰذا سردار نے اپنے ساتھیوں کے مشورہ کے مطابق اپنے چھوٹے بھائی کشن سنگھ کو سب سے پہلے کوٹھے سے باہر بھیجا جب مسلمانوں نے کشن سنگھ کو دیکھا تو اس پر حملہ کر کے اس کو قتل کر دیا۔

اس کے بعد سردار مہاں سنگھ اور سردار ہری سنگھ دونوں باتفاق کوٹھہ سے باہر آئے دونوں زرہ پوش تھے۔ مسلمانوں نے ان پر پتھروں اور تلواروں سے حملہ کیا۔ تلوار تو زرہ پر کارگر نہ ہو سکتی تھی، لیکن پتھروں نے ان کو سراسیمہ کر دیا۔ سردار کوٹھے کے نزدیک چٹان سے نیچے گر پڑا اور سردار مہاں سنگھ اپنی چستی و چالاکی سے چند قدم پہلے ہی نکل آیا۔ جب وہ فوج کے ساتھ مل گیا تو اس نے ہر ایک سے پوچھا کہ سردار ہری سنگھ یہاں آیا تھا، اب کہاں ہے۔ سب نے اس کو جواب دیا کہ تو پاگل ہو گیا۔ سرداری ہری سنگھ تو دن کے آخری وقت میں قتل

ہو کر مر گیا اور تو کہتا پھرتا ہے کہ سردار ابھی یہاں آیا تھا اور کہاں ہے۔

ہری سنگھ زخمی حالت میں قلعہ میں لایا گیا

لوگوں کی یہ تکرار سردار ہری سنگھ کے کان تک پہنچی خیال کیا کہ اگر وہ اونچی آواز سے بات کرے، تو مسلمان نزدیک ہیں، سن کر حملہ کر دیں گے اور مجھے قتل کر دیں گے۔ فوج نے چونکہ شکست کھائی ہے، وہ مقابلہ نہ کر سکے گی۔

جب اس اثناء میں ایک دوسرے ڈیرے کا سپاہی سردار ہری سنگھ کے پاس پہنچا۔ اس کے دامن کو پکڑ کر آہستہ سے کہا کہ میں سردار ہری سنگھ ہوں اور مجھے مہاں سنگھ اور اس کے سپاہی کے پاس پہنچا دے، جہاں یہ دونوں تکرار کر رہے ہیں اور میں تم کو بہت انعام دونگا۔

جب اس سپاہی نے سردار ہری سنگھ کو پہچان لیا تو سردار کو اپنی پشت پر اٹھا کر مہاں سنگھ کے پاس لے آیا۔ سردار مہاں سنگھ نے سردار ہری سنگھ کو دھونسہ والے گھوڑے (جس پر بڑا طبل دھونسہ۔ رکھا جاتا ہے۔ مترجم) جو پاس ہی کھڑا تھا، اس پر سوار ہو کر سردار ہری سنگھ کو اپنے پیچھے بٹھا کر چند سوار اور پیادوں کو ساتھ لے کر قلعہ ہر کشن گڑھ کی طرف روانہ ہو گیا۔

مہاں سنگھ کی موقع شناسی اور جرأت سے ہری سنگھ کی جان بچ گئی

جب وہ کھلابٹ میں پہنچے تو وہاں پر بوستان خان ترین برادر زادہ محمد خان ترین بمعہ چند پیادہ مسلح بر بندوق سپاہیوں کے ساتھ بندوق توڑہ دار ہاتھ میں لئے بیٹھا ہوا تھا۔ سردار مہاں سنگھ کو دیکھ کر آداب وسلام بجا لایا۔ اور کہا کہ آج رات یہاں ہی قیام کریں۔ لیکن مہاں سنگھ کو فکر ہوا، کہ اگر ٹھہرتا ہوں تو یہ لوگ سردار ہری سنگھ کو، جو زخمی اور اس کی پشت پر سوار ہے، پہچان لیں گے کہ ہم قلعہ کو جا رہے ہیں تو مسلمان جو سب متفق ہیں، حملہ کر کے سردار کو بمعہ سب ساتھیوں کے قتل کر دیں گے۔ اسی خوف سے اس نے اس گاؤں سے چارپائی بھی نہ لی۔

جب پڈھانہ کے قریب پہنچے تو وہاں کھیت میں کسی زمیندار کی چارپائی پڑی تھی، اس پر سردار ہری سنگھ کو ڈال کر قلعہ ہر کشن گڑھ میں لے آئے اور ایک پہر رات گزری تھی کہ وہ قلعہ میں پہنچ گئے۔ باقی لوگ دوسرے دن سہ پہر ڈیرہ پر پہنچ گئے اور مردوں کی لاشیں تازہ

ہی میں پڑی رہ گئیں۔

ان مردگان میں سردار جمعیت سنگھ بمعہ اپنے چھوٹے بھائی، موراج، ایک ہزار سوار اور بہت سے چھوٹے افسر شامل تھے۔ تقریباً چار سو سکھوں کے آدمی قتل ہوئے۔ مسلمانوں کی طرف دو چار آدمی زخمی ہوئے ہوں گے۔ بے شمار اسباب، اسلحہ، سونے کے دستوں والی تلواریں، روپہلی سنہری دستوں والی بندوقیں، چار انبہ اور پیٹی ہاتھے، سکھوں کی طرف سے ضائع ہو گیا۔ چونکہ سردار ہری سنگھ پتھروں کی ضربات سے سخت زخمی ہو گیا تھا، ملکی لوگوں نے مشہور کر دیا کہ وہ بھی مارا گیا ہے اور ایک سکھ بنام نلوہ جو سردار ہری سنگھ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور اس جنگ میں مارا گیا تھا، اس کا سر کاٹ کر سری کوٹ کے پہاڑ پر آویزاں کر دیا تھا کہ یہ سردار ہری سنگھ کا سر ہے۔ یہ خبر دور دراز تک مشہور ہو گئی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی آمد

جب اس جنگ کے حالات مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سنے تو یہ خبر سنتے ہی مہاراجہ رنجیت سنگھ بذاتِ خود افواجِ قاہرہ بمعہ سامان جنگ توپوں اور زنبورک (چھوٹی توپ) کو لے کر ہزارہ کی طرف روانہ ہو گئے تاکہ یہاں پہنچ کر وہ اس صورتِ حال کا ازالہ کرنے کی طرف متوجہ ہو سکیں۔

ایک ہفتہ کے علاج معالجہ و مالش سے سردار ہری سنگھ صحت یاب ہو گیا اور سکھ سپاہی بھی گزشتہ جنگ کی کوفت و تھکان سے آسودہ ہو گئے تو سردار ہری سنگھ نے دریافت کیا کہ سارے ملک میں میری موت کا آوازہ مشہور ہو گیا ہے، لہٰذا میں کس مقام پر اپنے آپ کو ظاہر کروں کہ یہ خیال لوگوں کے دل سے نکل جائے۔

ہری سنگھ کا بگڑہ کے مواضعات پر حملہ

اس لئے رات کے آخری حصہ میں سوار ہو کر پیادہ فوج کو ساتھ لے کر علاقہ بگڑہ کے مواضعات پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہوا، کیونکہ یہ علاقہ ہزارہ سے مفرور لوگوں سے بھرا ہوا تھا علی الصبح کہ زمیندار اب بیدار بھی نہ ہوئے تھے کہ یہ ان کے سروں پر پہنچ گئے۔ جدون افغانوں کے چند لوگ جو مسلح تھے، ان کو تو قتل کر دیا گیا اور باقی ماندہ لوگوں نے اطاعت اختیار کر لی اور قتل سے بچ گئے، ان کا سب مال و اسباب لوٹ لیا گیا۔ اس دن لوگوں کو یقین ہو گیا

کہ سردار ہری سنگھ زندہ ہے۔ یہ معلوم ہونے کے بعد ملکی لوگوں میں خوف و ہراس پیدا ہو گیا اور ہر ایک نے اپنی وسعت کے انداز سے وقت گزاری شروع کر دی۔

اس اثنا میں مہاراجہ صاحب والئی لاہور بمعہ افواج ہزارہ میں داخل ہو گئے اور کوہ گندگر کے دامن میں موضع جاگل اور بھیرہ میں کیمپ لگا دیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کا موضع جاگل اور بھیرہ میں کیمپ

اور تمام افسران فوج کو حکم دیا کہ کوہ گندگر پر چڑھ کر تمام مشوانیوں اور دیگر اقوام کے لوگوں کو، جو وہاں ہوں، پکڑ لائیں اور محمد خان ترین، صالح محمد مشوانی اور سر بلند خان تنولی کو جو سری کوٹ میں موجود تھے کو حکم بھیجا کہ حضور مہاراجہ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں۔

مہاراجہ کے حکم پر صرف محمد خان ترین، صالح محمد مشوانی اور سر بلند خان تنولی کا کیمپ میں حاضر ہونا

محمد خان ترین صالح محمد مشوانی اور سر بلند خان تنولی، تینوں مہاراجہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ لیکن دوسرے ملک اور رعایا کے لوگ اپنی عزت اور جان کے خوف سے فرار ہو کر پار دریائے سندھ کے قبائل میں چلے گئے۔ معذور، نادار اور ضعیف لوگ ہی علاقہ میں رہ گئے، جن کو خوف جان و مال نہ تھا۔ وہ وادیٔ کوہ میں ادھر ادھر بیٹھ گئے۔ جب فوج دو تین دن کے بعد واپس آ گئی تو یہ معذور لوگ پھر اپنے اپنے گھروں میں چلے گئے۔

تربیلہ میں مہاراجہ کا قیام

اس کے بعد مہاراجہ صاحب والئی لاہور نے براہ تربیلہ یوسف زیوں کے ملک کو جانے کا ارادہ کر لیا۔ ان کا مقام تربیلہ میں ایک رات کے لئے ہوا۔ دوسرے دن مہاراجہ صاحب ہاتھی پر سوار ہو کر دریائے سندھ کے نظارہ کے لئے کنارہ پر روانہ ہوئے۔ دوسرے کنارے سے کھبل کے پٹھانوں نے از راہ حماقت و بداندیشی، مہاراجہ پر بندوق کے فائر شروع کر دئے۔

کھبل پر حملہ بطور تادیب

ان کی اس گستاخی پر مہاراجہ غضب ناک ہوا اور حکم دیا کہ کل موضع کھبل کو میں جلا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ صبح سویرے ڈیرہ تربیلہ سے کوچ کر کے دریائے سندھ کو بغیر کشتی و ملاح، پیادہ پار کر کے بیہور، علاقہ یوسف زئی

میں اتر گیا اور بعض افسروں کو بمعہ فوج کھبل دکیا کو جلانے کے لئے بھیجا۔ ان گاؤں کے لوگ تو اہل و عیال سمیت بھاگ کر پہاڑ کی چوٹی پر چلے گئے لیکن دونوں گاؤں کو فوج جلا کر شام کے وقت اپنے ڈیرہ بہ مقام پہیور واپس آگئی۔

اسی مقام پر پائندہ خان تنولی نے اپنے وکیل مہاراجہ کی خدمت میں بھیج کر درخواست کی کہ مہاراجہ اپنے کسی افسر کو بھیجے تاکہ وہ اپنے بیٹے کو عزت و اکرام کے ساتھ مہاراجہ صاحب کی خدمت میں حاضر کرے۔ مہاراجہ صاحب نے سردار مہاں سنگھ کو پائندہ خان کے بیٹے کو لانے کے لئے بھیجا۔ مگر اس اثنا میں مہاراجہ صاحب کا ڈیرہ پہیور سے کوچ کر گیا اور پائندہ خان نے اپنے بیٹے کو بھیجنے سے پہلوتہی کر دی۔

محمد خان، اصالح محمد اور سربلند خان، مہاراجہ کے ہمراہ لاہور روانہ ہوئے

محمد خان ترین، اصالح محمد مشوانی اور سربلند خان تنولی مہاراجہ صاحب کے ہم رکاب تھے، ان کو خرچ مہاراجہ کی جانب سے ملتا تھا۔ یہ سب مہاراجہ صاحب کے ساتھ لاہور کے لئے روانہ ہوئے۔

محمد خان کی گرفتاری

جب مہاراجہ کا ڈیرہ بمقام سرائے کالا (حال ٹیکسلا۔ مترجم) پہنچا تو محمد خان ترین نے گھر جانے کی رخصت مانگی۔ صبح کے وقت محمد خان کو قیدیوں کی طرح ہاتھی پر سوار کر کے سردار جھنڈا سنگھ، جو مہاراجہ کا خاص ندیم تھا کے ہاتھ میں محمد خان کا بازو دے کر حکم دیا کہ اس کو سردار ہری سنگھ کے سپرد کر کے رسید لاؤ۔

قلعہ سری کوٹ کی مرمت اور اس میں تھانہ کا تقرر

سردار ہری سنگھ کو مہاراجہ نے لاہور براہ یوسف زئی جانے کے وقت، سری کوٹ میں قلعہ کی مرمت کے لئے بھیج دیا تھا اور سردار ہری سنگھ نے ان ایام میں ہی، جب کہ مہاراجہ ملک یوسف زئی میں تھا، قلعہ کو مرمت کر کے تھانہ مضبوط کر کے اس میں پانچ سو سپاہی مقرر کر دیئے۔

محمد خان کو ہری سنگھ کے حوالہ کرنا

جب سردار ہری سنگھ ہزارہ میں پہنچا تو اسی دن جھنڈا سنگھ نے محمد خان کو سردار کی خدمت میں پیش کر دیا اور مہاراجہ کی طرف سے پیغام دیا کہ محمد خان کے بازو کے عوض ایک لاکھ روپیہ مہاراجہ صاحب

مانگتے ہیں۔ سردار ہری سنگھ نے ایک لاکھ روپے کی ادائیگی سے معذوری ظاہر کی اور محمد خان کو واپس مہاراجہ صاحب کے پاس بھیج دیا اور عرض کیا کہ سب ملک اور مال حضور کا ہے۔ اگر مجھے حکم دیں تو میں حضور کے ہم رکاب جانے کے لئے تیار ہوں۔

محمد خان کی واپسی لاہور، زیر حراست

مگر اس ملک سے اتنا روپیہ وصول نہیں ہو سکتا، جس سے سپاہ ہی کو اچھی طرح سے رکھ سکوں۔ اور اتنا روپیہ زائد کہاں سے لاؤں۔ لہٰذا محمد خان کو مہاراجہ اپنے ساتھ لاہور لے گیا اور لاہور میں بطور قیدی زیر حراست رکھا۔ صرف روزمرہ کا خرچ اس کو دیا۔

تعمیر قلعہ ناڑہ، کرڑالاں

اس عرصہ میں سردار ہری سنگھ ہزارہ میں رہا اور گیارہ ماہ مگھر ۱۸۹۱ بکرمی ناڑہ کرڑالاں میں قلعہ کی تعمیر کے لئے گیا۔ قلعہ ہرکشن گڑھ سے کوچ کر کے سرائے صالح میں قیام کیا۔ رات کو بارش شروع ہو گئی جو لگاتار چار رات اور چار دن جاری رہی۔ پانچویں دن جب بارش تھمی، تو خیموں کے خشک ہونے کے بعد لشکر نے ناڑہ کی طرف کوچ کیا۔ سردار مہاں سنگھ کو پیادہ فوج کے ساتھ براہ بگڑہ و کمر کی روانہ کیا اور خود سوار فوج کے ساتھ براہ چھتر، سجی کوٹ میں داخل ہوئے۔ اس جگہ پر حسن علی خان کرڑال حاضر ہوا۔ ایک رات سجی کوٹ میں رہا۔ سردار ہری سنگھ نے حسن علی خان کو نگر ہی، مکول وغیرہ موروثی ملک، جاگیر میں عطا کی اور اس کے ایک لڑکے کو ہم رکاب رکھ کر، سردار قلعہ ناڑہ کی تعمیر کے لئے روانہ ہونے کا انتظام کیا۔ ابھی روانہ نہ ہونے پایا تھا کہ برف باری شروع ہو گئی اور اتنی برف برسی کہ خیموں پر دو تین ہاتھ برف چڑھ گئی اور لوگ سردی کی زیادتی اور راشن کے نہ پہنچنے سے تنگ ہو گئے اور سردار کو بھی ایک دو دن سردی کی زیادتی سے بخار آ گیا۔ لاچار سردار مہاں سنگھ تعمیر قلعہ ناڑہ کو چھوڑ کر بمعہ لشکر واپس باندھی مشعل خان میں آ کر مقیم ہو گیا اور وہاں سے راشن وغیرہ کا انتظام کیا۔ یہاں تک ایک ماہ کے عرصہ میں ناڑہ کا قلعہ تیار ہو گیا۔ وہاں ایک تھانہ جس میں سپاہیوں کو بہ سرکردگی حسن شاہ ساکن مانکرائے کو مقرر کیا اور سردار ہری سنگھ و سردار مہاں سنگھ دونوں واپس ہزارہ ہو گئے۔

سردار ہری سنگھ کا، حکومت ہزارہ سردار مہان سنگھ کے حوالہ کرنا

دو چار دن کے بعد سردار ہری سنگھ نے ملک ہزارہ

کی حکومت سردار مہاں سنگھ کے سپرد کی اور خلعتِ فاخرہ مع شمشیر، سپر واسپ مخلع عطا کی۔ اس وقت قلعہ جات گلی، دربند، شنکیاری، سری کوٹ، مانسہرہ، ناڑہ، اکڑالاں میں موجود فوج کے علاوہ سردار مہاں سنگھ کے پاس دو سو سوار اور ایک ہزار پیادہ مسلح فوج تھی اور سردار ہری سنگھ خود بمعہ فوج د سواری لاہور کی طرف روانہ ہو گئے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کا سلام کرنے کے بعد اپنی رہائش مقام گوجرانوالہ میں آ گئے اور برسات کا موسم اپنے گھر میں گزارا اور دسہرہ کے موقع پر مہاراجہ صاحب کی خدمت میں لاہور حاضر ہوئے۔

ہری سنگھ کا علاقہ راولپنڈی میں بمعہ محمد خان ترین آنا

وہاں مہاراجہ کے حکم کے مطابق ملک راولپنڈی دھنی، گھیب، کھاٹڑ و چھچھ کا معاملہ وصول کرنے کے لئے آئے۔ حسبِ خواہش مہاراجہ صاحب بروقتِ رخصت دوسری دفعہ محمد خان ترین کو بعوض پچاس ہزار روپیہ نانک شاہی اپنے ساتھ لاکر راولپنڈی آئے۔ ادھر سے سردار مہاں سنگھ بھی بمعہ فوج و سواری سلام کے لئے آئے۔ ابھی ایک دو دن ہی گزرے تھے کہ بوستان خان ترین برادر زادہ محمد خان ترین (محمد خان ترین جو قید میں تھا) کے ورغلانے سے تمام مشوانی فرار ہو کر کوہستان کو چلے گئے۔ حالانکہ جب مہاں سنگھ حاکم ہزارہ تھا تو بوستان خان اس کے پاس حاضر ہوا تھا۔ اور سردار مہاں سنگھ نے اس کو گذرِ معاش کے لئے ایک ہزار روپیہ کی جاگیر مقرر کی تھی اور اس کو سردار ہری سنگھ کی خدمت میں بھیجا تھا اور اس نے بوستان کو مہاراجہ صاحب کی خدمت میں پیش کر کے اس کی جاگیر کی توثیق کرا کر واپس کر دیا تھا۔ وہاں سے بخیر و بخوبی آ کر موضع شیر گڑھ میں جو اس کی رہائش کے لئے مقرر کیا گیا تھا، آباد ہو گیا تھا، لیکن دل میں کدورت رکھتا تھا۔

محمد خان ترین کی آمد پر مشوانیوں کی بغاوت

جب محمد خان ترین راولپنڈی پہنچا تو مشوانیوں کو بغاوت پر آمادہ کر کے قلعہ سری کوٹ کا محاصرہ کرا دیا۔ افسرانِ قلعہ نے سردار کو صورتِ حال سے مطلع کیا۔

جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ تین چار روز سے قلعہ کا محاصرہ شروع ہے اور کوئی سپاہی قلعہ سے باہر نہیں جا سکتا۔ بہت مشوانی جمع ہو گئے ہیں اور قلعہ کے اندر پانی کا ذخیرہ ختم ہونے کو ہے۔

سردار ہری سنگھ نے اسی وقت سردار مہاں سنگھ کو ہزارہ کی فوج کے ساتھ اور کچھ فوج اپنے پاس سے دے کر رخصت کر دیا کہ ہزارہ میں پہنچ کر رسد وغیرہ کا بندوبست کرے اور کہا کہ میں بھی آ رہا ہوں۔

ہری سنگھ کا سری کوٹ پر حملہ کے لئے جاگل میں کمپ لگانا

دوسرے روز سردار نے مع فوج سوار و پیادہ کوچ کر کے جاگل کے پاس اپنا ڈیرہ لگا دیا۔ اس دن شام کے وقت مشوانیوں نے کوہ گندگر کی چوٹی پر ہزاروں جگہ آگ روشن کر کے شور و غوغا برپا کر دیا تاکہ سکھوں کو معلوم ہو کہ مشوانیوں کا لشکر بہت زیادہ ہے۔

اگرچہ سردار ہری سنگھ بہت دلاور اور شجاع تھا لیکن ناڑہ میں شکست کھانے کے بعد فکر مند ہو گیا، کہ ایسا نہ ہو کہ پھر کام خراب ہو جائے۔

اس اثناء میں ونتورا صاحب (رنجیت سنگھ کا جرنیل ۔ مترجم) بمعہ تین پلٹن کے سرداران پشاور سے حسب الحکم مہاراجہ والئی لاہور، مقررہ گھوڑوں کا خراج لینے کے لئے پشاور کی طرف جا رہا تھا اور رواہ نزد حسن ابدال میں وارد ہوا۔ چونکہ ہری سنگھ جنرل ونتورا کے بمعہ تین پلٹن آنے سے مطلع تھا لہٰذا فوراً ایک خط بہ عبارت دوستانہ لکھ کر اپنے ایک معتبر کے ہاتھ اس کو بھیجا ۔ اگرچہ ونتورا صاحب نے اس معتبر سردار سے مہاراجہ صاحب والئی لاہور کا حکم طلب کیا، لیکن اس معتبر نے جواب دیا کہ جناب حضور مہاراجہ صاحب والئی لاہور کا اس وقت حکم لانا، عراق سے تریاق لانا ہے اور اس وقت تک قلعہ باقی نہیں رہے گا۔ اور یہ بھی آپ پر روشن ہے کہ اگر قلعہ سری کوٹ نہ رہا تو پھر بغیر مہاراجہ صاحب کے خود آنے کے سوا کون گندگر کے پہاڑ پر چڑھ سکے گا۔ آخر کار ونتورا صاحب اپنی تین پلٹنوں سمیت جاگل میں آگیا اور سردار صاحب کے نزدیک اپنا ڈیرہ لگا دیا۔

ونتورا اور ہری سنگھ کا متفقہ حملہ سری کوٹ کا منصوبہ

رات کی دو گھڑی گزرنے کے بعد سردار صاحب، ونتورا صاحب مہاں سنگھ اور مقدم مشرف چاروں ایک جگہ بیٹھ کر مشورہ کرنے لگے۔ مقدم مشرف نے عرض کی کہ جب تک یہ اشخاص؛

۱۔ جلال خان ولزاک، سرائے صالح والا۔

۲۔ راجہ ہاشم خاں ترک، مانکرائے والا۔

۳- بوستان خان ترین

۴- شیخا جدون - ملک میں موجود ہیں - امن نہیں ہوگا۔

ہزارہ کی چیدہ شخصیتوں کی گرفتاری

اسی وقت سردار نے حکم دیا کہ ان سب کو راتوں رات گرفتار کر کے قلعہ ہرکشن گڑھ میں پہنچا دیا جائے - ان کو گرفتار کرنے کے لئے ہر ایک کے لئے پچیس پچیس سوار بھیج دئے گئے - جوان کو گرفتار کر کے لائے اور قلعہ ہرکشن گڑھ میں بند کر دیا گیا۔

حملہ سری کوٹ

دو گھڑی رات باقی تھی کہ طرم، تنبور اور ڈھول کے ساتھ لشکر سری کوٹ پر حملہ کے لئے تیار ہو گیا - سری کوٹ کے قلعہ کے راستہ پر جو مشوانی بطور محافظ موجود تھے، ان کو قتل کر دیا گیا - جنگ کے شروع میں بندوق کا استعمال کیا گیا - لیکن ونتورا صاحب نے بڑی احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ یہ بندوبست کیا کہ ہر تین پلٹن سے مضبوط جوانوں پر تین تین کمپنیاں بنائیں - پہلی تین کمپنیاں یک جا مارچ کریں، جب وہ سو قدم آگے چلی جائیں تو پھر دوسری تین کمپنیاں مارچ کریں - اسی طرح تین تین کمپنیاں غول بنا کر چلتی جائیں اور کوئی سپاہی اپنے غول سے ادھر ادھر نہ ہو - نہ کوئی آگے نکلے اور نہ ہی پیچھے رہے - جو ایسا کرے گا سخت سزا کا مستوجب ہوگا - پہلے غول پر مشوانیوں نے بندوقوں سے حملہ کیا - لیکن سکھ سپاہیوں نے پرواہ نہ کی اور مشوانیوں سے چند آدمی بندوقوں اور سنگینوں سے قتل کرا کے آگے بڑھ گئے۔

فتح سری کوٹ

ان کے بعد دوسرا غول آگیا جبکہ پہلا غول آگے نکل گیا - اس طرح نوبت بہ نوبت مدد پہنچتی رہی - مشوانی تو پہلے غول سے ہی مقابلہ کی تاب نہ لا کر بھاگ گئے اور سردار ہری سنگھ کا لشکر جو دوسری طرف سے چڑھ رہا تھا وہ گندگر پہاڑ پر چڑھ گیا - سب مشوانی شکست کھا کر بھاگ گئے اور چار کوہ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے اور صبح کے وقت ونتورہ صاحب اور سردار صاحب کی فوج اور قلعہ کی فوج نے سب دشمنوں کا صفایا کر دیا - رات کو سب فوج نے سری کوٹ قلعہ میں ڈیرہ کیا۔

دوسرے روز ملک کی خبرگیری اور معاملہ کی وصولی شروع کی - سردار مہاں سنگھ اور ونتورہ صاحب نے دوسرے دن کوچ کیا۔

ہزارہ کے نامور گرفتار شدہ لوگوں کا توپ سے اڑایا جانا

سردار نے حکم دیا کہ ان سات آٹھ آدمیوں کو جو بغاوت سے باز نہیں آتے، توپ سے اڑا دیا جائے۔ اس لئے ان اشخاص یہ

۱۔ بوستان خان برادر زادہ محمد خان ترین درویش والا۔

۲۔ شیر محمد خان برادر صالح محمد خان۔ سرائے صالح والا۔

۳۔ صالح محمد مشوانی۔

۴۔ سلیم شاہ مشوانی۔ ۵۔ جلال خان دلزاگ ساکن سرائے صالح۔

۶۔ شیخ جدون ساکن رجوعیہ۔

۷۔ محمد ترین۔ ساکن درویش والا

کو توپ سے اڑا دیا گیا۔

اس کے بعد سردار راول پنڈی پہنچ گیا۔

محمد خان ترین سے زر ضمانت کا مطالبہ

اس فتح سے قبل جب مشوانیوں کی بغاوت کی خبر راولپنڈی پہنچی تھی تو سردار ہری سنگھ نے اپنے معتبر کے ذریعہ سے محمد خان ترین کو خبر بھیجی کہ میں پچاس ہزار روپے مہاراجہ کو دے کر تم کو لایا تھا تاکہ یہ رقم وصول کر کے تم کو رہا کر دوں، لہٰذا کچھ روپیہ تمہاری گرہ سے اور کچھ تمہاری جائیداد سے وصول کیا جائے گا تاکہ تم رہا ہو کر سرکار کی خدمت کرو۔ لیکن یہ فساد تم نے کیسا شروع کرا دیا۔ یہ پیغام سنتے ہی محمد خان نے بے محابا گالیاں دینی شروع کر دیں کہ اب جبکہ مجھے قید کر دیا گیا ہے پھر بھی تہمت میرے سر پہ ڈالی جا رہی ہے۔ اب میرا کیا اختیار ہے۔

محمد خان کی وفات

یہ سن کر سردار نے محمد خان کو قلعہ ڈھیری، ملک کلر کہار میں بھیج دیا اور نیم پاؤ آٹا اور ایک پاؤ نمک کی روٹی پکا کر روزانہ اس کو دینی شروع کر دی کہ یہی تمہاری خوراک ہے۔ کچھ مدت کے بعد خان اسی جگہ مر گیا۔

اس کے مرنے کے بعد سردار ہری سنگھ نے ہزارہ، مہاں سنگھ اور ملکان و مقدمان کے نام پروانہ بھیجا، جس میں لکھا اس وقت تم کہتے تھے کہ جو تاوان بھی ہمارے پر آئے ہم ادا کریں گے

مگر محمد خان کو ملک سے بدر کرو۔ اب جبکہ میں نے پچاس ہزار روپیہ اس کے سر پر دیا ہے اور اس کو ملک سے خارج کر دیا ہے۔ اب تم سب پر لازم ہے کہ تم یہ رقم ادا کرو۔

سب ہزارہ سے پچاس ہزار روپیہ کی وصولی

سردار مہاں سنگھ نے سب ملکان و مقدمان کو لکھا کہ یہ جرمانہ بہ حساب ڈھائی روپیہ فی گھر تمام ملک پکھلی، جدون، تنول، تربیلہ اور ہزارہ سے کارداران کے ذریعہ سے جمع کیا جائے۔ اس طرح سے ساٹھ ہزار روپیہ گنڈا، تمام ملک سے جمع ہو گیا۔ تمام سیدان، پیران و علماء، فقیران اور بیوہ عورتیں اس کی ادائیگی سے معاف رکھی گئیں۔

مشوانیوں کا ملک سے اخراج

باقی سب سے یہ وصول ہو گیا لیکن مشوانیوں کے متعلق سردار نے حکم دیا کہ وہ سری کوٹ میں ہرگز آباد نہ ہوں۔ اگر کوئی شخص کوٹھہ یا چھپر بنائے تو قلعہ کی فوج اس کو جلا دے۔ چنانچہ سال تک یہی حکم رہا اور کسی مشوانی یا دیگر شخص ساکن سری کوٹ، یا دیہات والے کو تعمیر کی اجازت نہ تھی۔ اگر کسی نے کوئی چھپر بھی مال مویشی رکھنے کے بہانہ سے بنایا تو قلعہ کی سپاہ اس کو جلا دیتی تھی۔

ایک دفعہ پار دریائے سندھ سے بہت سے مشوانی آئے۔ بیل گرہان کے ساتھ چھپر بنائے تو سری کوٹ کے تھانہ دار نے سردار مہاں سنگھ کو اطلاع دی۔ سردار مہاں سنگھ نے چند فوج کے سپاہی اور ملکی لوگ جمع کر کے بھیجے۔ گرہان کے پاس مقابلہ ہوا۔ فوج اور ملکی لوگوں کا سربراہ مصر انگھ افسر فوج تھا، وہ اس مقابلہ میں مارا گیا۔ مشوانی پھر دریائے سندھ چلے گئے اور پانچ سال تک ملک میں نہ آ سکے۔

مشوانیوں کو معافی

مشوانی بود و باش و رہائش سے بہت تنگ ہوئے، یہاں تک کہ قبر کے لئے بھی جگہ نہ پاتے، لہٰذا مجبور ہو کر مشوانی سردار ہری سنگھ کی خدمت میں مطیعانہ حاضر ہوئے، جب کہ وہ لاہور سے علاقہ یوسف زئی میں آیا ہوا تھا اور عرض کی کہ ہم غریب لوگ ہیں۔ اب اپنے عمل کی کافی سزا بھگت چکے ہیں۔ اپنے ملک سے دربدر ہو گئے ہیں، پھر کبھی فساد نہ کریں گے۔ اب ہمارے حال پر رحم کریں کہ ہم بہت تنگ ہو گئے ہیں۔

چنانچہ سردار ہری سنگھ نے بعد تحریر اقرار نامہ و ضمانت، سردار مہاں سنگھ کو حکم دیا

کر مشوانی اپنے دیہات کو آباد کریں۔ اس کے بعد نہ سردار ہری سنگھ کے عہد میں اور نہ ہی بعد میں مشوانیوں نے کبھی بھی فساد کیا۔ بلکہ اگر کوئی اور فتنہ برپا ہوتا تو یہ متحد ہو کر حکومت کی مدد کرتے۔

ہزارہ کے تھانہ داروں کا تغیر و تبدل

جس زمانہ میں ہزارہ کا ملک سردار مہاں سنگھ کے سپرد ہوا تھا، اس وقت تمام تھانہ جات کا بندوبست سردار ہری سنگھ کے افسران، جو اس کے ملازم تھے، کے سپرد تھا، جو حسب ذیل تھے۔

۱۔ ملک پکھلی، گلاب سنگھ دھون تھانہ دار شنکیاری کے ماتحت تھا۔

۲۔ ملک پکھلی، دل سنگھ تھانہ دار گلی کے ماتحت تھا۔

۳۔ ملک مانسہرہ، حکم سنگھ تھانہ دار مانسہرہ کے ماتحت تھا۔

۴۔ ملک تنول، بھوانی داس متصدی کے ماتحت تھا۔

۵۔ ملک ناڑہ نیلاں، سید حسن شاہ تھانہ دار ناڑہ کے ماتحت تھا۔

۶۔ ملک تربیلہ، فتح سنگھ تھانیدار قلعہ تربیلہ کے ماتحت تھا۔

۷۔ سرائے صالح کا علاقہ مول سنگھ مہریالہ جو سردار ہری سنگھ کا عمدہ خدمتگار تھا کے سپرد تھا۔

یہ سب سردار ہری سنگھ کے چیدہ ملازمین میں سے تھے۔ ان سب کو حکم تھا کہ ہر فصل کا مکمل حساب سردار مہاں سنگھ کی خدمت میں پیش کریں۔

جب مہاں سنگھ نے اقتدار سنبھالا تو سب سے پہلے سرائے صالح کے حساب کی پڑتال کی اور مول سنگھ کو تبدیل کر کے دربند بھیج دیا اور سرائے صالح میں اپنے بڑے بھائی عطر سنگھ کو مقرر کر دیا۔

اس کے بعد ملک کنہار، مجو گڑھ منگ، درہ اگرور، تکری و نندھیاڑ کو مبلغ تیس ہزار روپے کے اجارہ پر خان حبیب اللہ خان ساکن گڑھی کو دے دیا۔ خان موصوف نے انیس ہزار روپے ادا کر دئے اور گیارہ ہزار باقی رہ گئے۔

اس کے عوض سردار مہاں سنگھ نے حبیب اللہ خان کے بھائی صوبہ خان اور بھتیجے زمان خان کو گرفتار کر لیا اور بطور یرغمال قلعہ ہرکشن گڑھ (ہری پور۔ مترجم)، میں محبوس کر دیا اور کہہ دیا کہ جب تک بقایا ادا نہ کیا جائے گا، ان کو رہائی نہ ملے گی۔

زمان خان پسر پائندہ خان (برادر حبیب اللہ خان - مترجم) نے نصف بقایا ادا کر دیا، اور زمان خان رہا ہو گیا - نصف بقایا میں صوبہ خان قید میں رہا - ایک سال پورا ہو گیا لیکن حبیب اللہ خان سے بقایا ادا نہ ہو سکا - اس پر امین خان پسر حبیب اللہ خان یرغمالوں کے عوض میں آ گیا اور درہ کنہار کی تحصیل سید محمد علی شاہ کے سپرد ہوئی اور بھوگر منگ کی وصولی کارروار تحصیل کی گئی - درہ اگرور پر پائندہ خان تنولی قابض ہو گیا - سندھیاڑ و ٹکری یاغستان بن گئے -

اگرچہ درہ کنہار کہ متعلق کائیگان (کاغان - مترجم) سے ہے اور قدیم سے ادائیگی میں نیک کردار رہا - لیکن حالات زمانہ کی تبدیلی سے محمد علی شاہ پورا معاملہ وصول نہ کر سکا اور کچھ باقی رہ گیا پس محمد علی شاہ کو موقوف کر دیا گیا اور درہ کنہار کا معاملہ خام کر دیا گیا اور دو تین سال خام معاملہ وصول ہو کر داخل خزانہ سرکار ہوتا رہا - تیرہ ہزار روپے معاملہ جو برائے جاگیر حبیب اللہ خان مقرر تھا، زمیندار ہر سال ادا کرتے رہے اور کچھ بھی بقایا نہ رہا -

اس کے بعد سردار مہاں سنگھ نے تھانہ دار مانسہرہ سے حساب مانگا - اس کے پاس دو سال کا معاملہ جمع ہو گیا تھا اور بہت سا اس میں سے ادا نہ ہوا تھا - تھانہ دار مانسہرہ کو وہاں سے نکال کر ہری کوٹ کے تھانہ میں مقرر کر دیا اور مانسہرہ میں اپنے ایک بھائی نکل سین کو مقرر کر دیا -

اسی طرح دل سنگھ تھانہ دار گلی، جس کے ساتھ علاقہ بھیڑ کنڈ بھی تھا، اس کو الگ کر کے آسانند منشی کے حوالے کر دیا - اگرچہ نام (دل سنگھ) بدستور کاغذات میں قائم رہا -

علاقہ نواں شہر میں مہاں سنگھ کا ایک رشتہ دار مسمی کاہن سنگھ مقرر ہو گیا اور ملک تنول بخشی سیورام جو مہاں سنگھ کا خاص رشتہ دار و رابطہ دار تھا کے حوالے کیا گیا -

ہزارہ میں ہر قلعہ میں اپنے رشتہ دار (مہاں سنگھ کے - مترجم) مقرر کئے جو ملک سے بحساب کنکوت معاملہ وصول کرتے تھے -

محصول ملک کا ٹھیکہ بعوض تیس ہزار روپیہ سالانہ پر ٹھیکیدار ہرکشن مل ساکن مظفر آباد کر دیا گیا -

ملک تربیلہ پر ہری سنگھ کا مقرر کردہ تھانہ دار فتح سنگھ ہی بحال رہا -

مہاں سنگھ اور پائندہ خان کی کشمکش

دو سال مہاں سنگھ نے حکمرانی کی۔ اس تمام عرصہ میں پائندہ خان تنولی سے کشمکش رہی۔ اس کشمکش کی بنیاد کی وجہ یہ تھی کہ سردار ہری سنگھ نے راجہ شیر محمد تنولی کو موضع کڑ پلیاں ولاّ دگلی، جس کو علاقہ کو لائی کہتے ہیں، جاگیر میں دے دیئے اور اس کو دریائے سندھ کے کنارہ قلعہ قادر آباد میں بٹھا دیا تھا۔ راجہ شیر محمد کو مہاں سنگھ نے بہانہ سے بمعہ سواروں اور چند زمینداروں قلعہ ہرکشن گڑھ دہری پور (قدیم) کے اندر بلا کر قید کر لیا۔ گھوڑوں اور سامان سواران کو لوٹ کر سواروں کو واپس کر دیا۔ راجہ شیر محمد اور ایک معتبر مسمی گلا کو قید کر لیا۔ چند دنوں کے بعد چار ہزار روپیہ جرمانہ ادا کر کے انہوں نے رہائی حاصل کر لی۔ رہائی کے دو تین ماہ بعد شیر محمد خان بمعہ اہل و عیال بھاگ کر پار دریائے سندھ جا کر موضع اشراہ نزد انب میں رہائش اختیار کر لی۔

پائندہ خان کو اس وجہ سے دل میں غیرت پیدا ہوئی۔ لیکن اس نے ظاہر نہ کی۔ ایک دن مسمی نہال سنگھ سپاہی جو قلعہ گلی میں متعین تھا، کسی کام کی غرض سے پائندہ خان کے علاقہ کی حد کے نزدیک گیا۔ پائندہ خان کے آدمیوں نے اس کو قتل کر دیا اور اس کے ہتھیار و سامان لے گئے۔ پائندہ خان نے مہاں سنگھ کو وہ سامان واپس کر دیا اور لکھا کہ یہ کام پٹھانوں نے کیا ہے اور اس کے آدمیوں نے ان سے چھین لیا، جو واپس کر رہا ہوں۔

پائندہ خان اور مہاں سنگھ میں سطحی دوستی

ان باتوں کے اظہار پر جانبین میں دوستی ہو گئی اور علی اکبر خان برادر پائندہ خان ایک نقرہ گھوڑا، ایک باز بطور پیش کش لے کر سردار مہاں سنگھ کے پاس آیا۔

مہاں سنگھ نے ایک جوڑا خلعت طلائی برائے پائندہ خان بھیجی اور علی اکبر خان کو ایک خلعت دے کر رخصت کیا۔

کنجران ہری پور کا واقعہ

چند دنوں کے بعد پائندہ خان کے خاندان میں کسی کی شادی ہونے والی تھی۔ اس نے ہری پور کے گانے بجانے والے کنجروں کو رقعہ بھیجا کہ وہ اس شادی کے موقعہ پر یہاں آئیں۔ اس پر کنجر مہاں سنگھ کے پاس گئے اور کہا کہ ان کو پار دریائے سندھ جانے سے خوف آتا ہے اور جانا منظور نہیں۔ سردار مہاں سنگھ نے کنجروں کو تسلی

دی کہ فکر نہ کرو۔ ہمارے درمیان دوستی ہے، تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

مہاں سنگھ کی تسلی دینے پر کنجر وہاں چلے گئے۔ دس پندرہ دن وہاں رہے۔ نشاط و سرور کی محفلیں منعقد کیں، شادی کا کام ختم ہو گیا تو انہوں نے رخصت کی اجازت مانگی۔

اس اثنا میں ایک حسین و نوجوان کنجری کو مدد خان نے اپنے نکاح میں لے لیا۔ دوسری کو اکبر علی خان نے اور تیسری کو مدد خان کے ملازم مسمی جھتانے نے لیا۔ اس پر کنجروں نے واویلا مچایا اور فریاد کی۔ اس میں دو چار دن گزر گئے لیکن شنوائی نہ ہوئی۔

کنجروں کی شکایت مہاں سنگھ سے

آخر کار کنجر مایوس و محروم ہو کر اپنے گھروں کو آ گئے اور سردار مہاں سنگھ کے پاس حاضر ہو کر شکایت کی کہ وہ اس کی تسلی دلانے پر وہاں گئے۔ انعام تو کچھ نہ ملا۔ لیکن ان کی تین لڑکیاں انہوں نے پکڑ لیں۔

سردار مہاں سنگھ کو بہت غصہ آیا۔ لیکن وہ غصہ کو پی گیا اور ظاہراً پائندہ خاں سے خط و کتابت حسب معمول کرتا رہا۔ لیکن دل میں یہ ارادہ کر لیا کہ اس کے تدارک کا بندوبست کرنا چاہیے۔

پائندہ خان کے نوکروں کی ہری پور میں گرفتاری

چنانچہ کچھ دنوں بعد پائندہ خان کے چار معتبر نوکر ہری پور میں گھوڑے اور ان کا ساز و سامان خریدنے کے لئے آئے اور بھی بہت سی چیزیں خریدیں اور انب بھیجیں۔ دوسرے دن وہ معتبر مہاں سنگھ سے رخصت لے کر صوابی میرا میں رات گزارنے کے لئے ٹھہرے مہاں سنگھ نے کچھ سوار بھیج کر رات ہی ان کو گرفتار کرا کر بطور یرغمال راتوں رات قلعہ ہرکشن گڑھ میں منگا کر ان کو قید کر لیا۔ اس واقعہ پر سیدان صوابی بھی رنجیدہ ہوئے کہ ان کے ہاں سے ان کو گرفتار کیا گیا۔ یہ نامناسب تھا۔

پائندہ خان کا انتقاماً قلعہ قادر آباد پر قبضہ وغیرہ

جب دوسرے دن ان کی گرفتاری کی خبر پائندہ خان کو ملی تو اس نے اپنی فوج کے ساتھ قادر آباد قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت قلعہ قادر آباد کا تھانہ دار منیر خان ولد حبیب خان بربان والا تھا۔ دو دن تو اس نے حیلے بہانے سے گزار دئے لیکن تیسرے دن قلعہ پائندہ خان

کے حوالے کر کے چلا آیا۔ ایک دو گھڑی کے بعد کرپلیاں کا قلعہ بھی پائندہ خان نے فتح کر لیا۔ اس کے بعد کلنجر کی طرف روانہ ہوا۔ کلنجر کے زمیندار مہاں سنگھ کے پاس مدد لینے کے لئے آئے۔ مہاں سنگھ نے چالیس سپاہی زیر کمان حوالہ دار خیر بخش بھیج دیئے۔

دوسرے دن پائندہ خان گندف میں آ گیا اور وہاں کے سپاہیوں کے ساتھ سارا دن جنگ رہی۔ تربیلہ کے تھانیدار فتح سنگھ نے مہاں سنگھ کو پیغام بھیجا کہ وہ بمعہ فوج آجائیں۔ میری فوج بھی بمعہ ملکی لوگوں کے آجائے گی تاکہ کلنجر کے پاس پائندہ خان سے جنگ کی جائے۔ ہمیں ضرور فتح ہو گی۔

مہاں سنگھ کا جوابی اقدام اور ناکامی

یہ پیغام سن کر مہاں سنگھ قلعہ ہرکشن گڑھ سے بمعہ سوار و پیادہ فوج روانہ ہو کر آدھی رات کے قریب بھاروکوٹ کے قلعہ میں آ گیا۔ وہ وہاں ٹھہر گیا اور فوج۔ سوار و پیادہ، موہر سنگھ، اپنے بھتیجے کی کمان میں آگے روانہ کر دی۔ جب یہ فوج بھاروکوٹ سے تنگ درہ ندآبی، جو بھاروکوٹ سے نیچے تھا، سے گزر کر صوابی میرا پہنچی تو معلوم ہوا کہ تھانیدار فتح سنگھ، تربیلہ سے نہیں آیا اور صوابی اور کلنجر کے زمینداروں نے اپنے دیہات کی خاربندی کر لی ہے اور مقابلہ کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔

موہر سنگھ رات کو میرا میں پہنچ گیا اور صبح تک تربیلہ کے تھانیدار کی آمد کا منتظر رہا۔ چونکہ فتح سنگھ نہ آیا، اس کا یہ فعل غدر گنا گیا۔ لہٰذا سکھوں کی فوج میرا سے صوابی کی طرف روانہ ہوئی۔ سامنے سے سیدوں نے گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ اسی طرح دوسرے دیہات بھی مخالف ہو گئے۔

اس پر سب نے مشورہ کیا کہ اس جگہ اگر پائندہ خان سے جنگ کرتے ہیں جبکہ سارا ملک خلاف ہے تو نقصان کا اندیشہ ہے۔ بہتر یہی ہے کہ بھاروکوٹ کو واپس چلے جائیں۔ ملکی لوگوں نے بھی یہی مشورہ دیا کہ تم واپس چلے جاؤ۔ تمہارے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کرے گا۔ اب پائندہ خان ہم پر زور آور ہے۔ بہتر ہے کہ تم درمیان سے نکل جاؤ۔ لیکن ملکی لوگوں کا پہلے سے یہ مشورہ تھا کہ جب مہاں سنگھ اس طرف آئے تو اسے راستہ ہی میں قتل کر دیا جائے۔ اس کام کے لئے لوگوں نے کوہ ندآبی کے درے پر اپنے آدمی بٹھا دئے تھے۔ لیکن خوش قسمتی سے

مہاں سنگھ فوج کے ساتھ اس طرف نہ آیا اور بچ گیا۔

خیر سکھوں کی یہ فوج واپس ہوتی اور حفاظت کے لئے پورے اہتمام کے ساتھ۔ کیونکہ ملکی لوگوں کے تعاقب کا خوف تھا۔ سب سے پہلے پیادہ فوج کا پہرہ کوہ ندابی پر لگا دیا گیا، تاکہ کمزور پیادہ اور کچھ سوار پہلے آرام سے گزر جائیں اور بعد میں یہ پیادہ اور سوار یک جا گزر جائیں۔ تاہم ان کے تعاقب میں صوابی کے زمینداروں اور سیدوں نے گولیاں چلائیں۔ لیکن یہ کارگر نہ ہوئیں خیر تمام فوج کوہِ ندابی سے بخیریت بھاروکوٹ میں پہنچ گئی۔

سکھوں کے سپاہی جو کلنجر گئے تھے وہ پائندہ خان کے حوالے کر دیے گئے

جو چالیس سپاہی کلنجر کے زمیندار اپنی مدد کے لئے ساتھ لائے تھے، ان سب کو انہوں نے پائندہ خاں کے حوالے کر دیا اور کالنجر کے سب لوگ پائندہ خان سے مل گئے اور اس کی مطابعت اختیار کرلی اور سکھوں کو معاملہ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔

صوابی میں قیدی سکھ سپاہیوں کا پائندہ خان کو قتل کرنے کا منصوبہ

جب پائندہ خان صوابی میں آگیا تو صوابی کے سید بھی اس سے متفق ہو گئے۔ جو چالیس سپاہی کلنجہ والوں نے پائندہ خان کو گرفتار کروائے تھے، وہ صوابی میں اپنے ساتھ لایا۔ رات کو ان میں سے ایک سپاہی بیدار ہوا اور اپنے ساتھیوں کو جگایا اور کہا کہ اے بے خبرو جاگو! پہرہ داروں سے اسلحہ لے کر پائندہ خان جہاں سویا ہوا ہے، حملہ کر کے اس کو قتل کر دو۔ چنانچہ اس کام کے لئے انہوں نے حملہ کر کے پہرہ والے سپاہی سے تلوار اور ڈھال چھین کر اس کو قتل کر دیا اور پھر پائندہ خان کی خواب گاہ کی طرف دوڑے اور اس کے خدمت گار پر دو تین وار تلوار کے کئے کہ اتنے میں شور و شغب شروع ہو گیا۔ دوسرے سکھ سپاہیوں نے اس کی مدد نہ کی، نہیں تو یہ سپاہی پائندہ خان کا کام تمام کر دیتا اس شور و شغب پر خان بیدار ہو گیا اور اس فکر سے کہ اپنا ڈیرہ نہیں، بلکہ دوسروں کے گھر میں ہے یہاں سے بھاگنے کی تجویز کی۔

جب لوگ بیدار ہو گئے تو سپاہی مذکور کو دوسرے سپاہیوں سمیت ہتھکڑیاں اور بیڑیاں

لگاکر اٹک کی طرف بھیج دیا۔ پائندہ خان ایک دو دن کے بعد نالہ نداپی و سرن سے پار ہو کر واپس چلا گیا۔ سکھوں کے سپاہی سرن سے پار دوسری طرف نہ گئے۔

چونکہ دربند اور گڑھی کے قلعے بہت مضبوط تھے پائندہ خان نے ان کا محاصرہ کئے رکھا۔ لیکن فتح نہ کر سکا۔ یہ بے اتفاقی اور بدی جانبین کے درمیان ماہ اسوج سے لے کر ماہ بیساکھ (یعنی چھ ماہ۔ مترجم) تک رہی۔ لیکن دربند، اگلی اور گڑھی کے قلعوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا، اور فوج بدستور اپنی جگہوں میں رہی۔

خلیفہ سید احمد شاہ کی ہزارہ میں آمد

خلیفہ سید احمد شاہ نے ملکی اور یوسف زئیوں اور سرداران پشاور کے ساتھ ایک جمعیت بنا کر سکھوں کی فوج کا محاصرہ کر لیا (یعنی قلعہ جات دربند، اگلی اور گڑھی۔ مترجم)

سکھوں کی فوج تھوڑی تھی بقدر دس بارہ ہزار اور ملکی لوگ بمعہ سید احمد شاہ کے لوگوں کے ایک لاکھ پچیس ہزار جمع ہو گئے تھے اور سکھوں نے دریائے سندھ کی جانب پتھروں کی دیوار سے مورچہ بنا رکھا تھا۔ آخرکار جنگ واقع ہو گئی۔ سکھ فتح یاب ہوئے۔ بہت سے ملکی لوگ قتل ہو گئے اور دوسرے بھاگ گئے۔ جونہی جنگ کا فیصلہ ہوا، اس وقت سردار ہری سنگھ کی ارسال کردہ مدد چند سوار اور پیادہ پہنچ گئے۔

سکھوں کی پائندہ خان سے صلح

ان دنوں میں سکھوں کی پائندہ خان کے ساتھ صلح ہو گئی اور پائندہ خان کے جو چاہ نوکر قلعہ ہرکشن گڑھ میں قید تھے رہا کر دئے گئے۔ قلعہ دربند اور گڑھی کا محاصرہ اٹھا لیا گیا۔ آمد و رفت جاری ہو گئی اور مردمان کولائی گندپ، کلنجر اور صوابی بدستور رعیت ہو گئے۔ لیکن سرکاری معاملہ میں اس فتنہ فساد رعیت سے بہت خسارہ ہو گیا۔ چھتیس ہزار روپے جو تمام ملک کا مشخصہ محصول تھا اور جس کا متاجر ہرکشن مل کھتری ساکن مظفرآباد تھا، اس کو تیرہ ہزار روپے کا خسارہ ہوا۔ کیونکہ زمانہ فساد میں آٹھ ماہ تک بیوپاریوں کی آمد و رفت اور خرید و فروخت بند رہی۔ جب متاجر مذکور کے ذمہ بقایا محصول کا حساب کیا گیا تو وہ چونکہ دولتمند نہ تھا، کہ ادا کر سکے، لاچار قیدی ہو گیا اور سردار ہری سنگھ کی حکومت کے دوران قیدی رہا۔ اور جب سردار ہری سنگھ مارا گیا (جمرود کی جنگ ۱۸۳۷ء میں۔ مترجم) اور سردار تیج سنگھ حاکم ہوا تو متاجر کو رہائی ملی۔

جنگ تنولیاں

چونکہ پائندہ خان کے ارادۂ فساد سے ہری سنگھ واقف تھا لہٰذا جب وہ ۱۸۸۴ء بکرمی (۱۸۲۷ء) میں علاقہ یوسف زئی سرداران پشاور سے مقررہ گھوڑے اور معاملہ وصول کرنے سے فارغ ہوگیا تو مہاراجہ کے حکم سے بمعہ فوج راجہ سچیت سنگھ بہ سرکردگی سردار کیسرا سنگھ، ہزارہ میں آیا اور پائندہ خان کو تنبیہ و تدارک کرنے کے لئے متوجہ ہوا اور تنول کے اس نصف حصہ میں مقام بھیاڑہ، جو پائندہ خان کی جاگیر میں تھا، ڈیرہ لگایا۔ ادھر سے پائندہ خان بھی بھینگڑہ کے پہاڑ سے جو اس کا قدیمی ملجا و ماوا تھا، سے اتر کر اپنی فوج کے ساتھ ہری سنگھ کے سامنے مقام کیا۔

سردار ہری سنگھ نے چند روز انتظار کیا کہ پائندہ خان سے صلح و آشتی کی بات کرے تاکہ واپس ہو جائے، لیکن خان موصوف اپنی جگہ پر متکبر تھا اور کچھ سوال و جواب نہ کرتا تھا۔ بلکہ اپنے آدمیوں کو حکم دے رکھا تھا کہ اگر راستے میں سکھوں کا کوئی سوار یا پیادہ دیکھیں تو اس کو لوٹ کر قتل کر دیں جو کوئی ایک سکھ سپاہی کا سر لائے گا، اس کو بیس روپے انعام دیا جائے گا۔ چنانچہ اس وجہ سے فوج کی آمد و رفت اور غلہ وغیرہ لانے کے راستے بند ہو گئے۔ لشکر سکھاں کے بہت سے سپاہی و غیر سپاہی قتل ہو گئے اور سکھوں کے ڈیرہ میں غلہ کی تنگی شروع ہو گئی۔ اس سے وزیر کیسرا سنگھ جو راجہ سوچیت سنگھ کی فوج کا افسر تھا، رنجیدہ ہو گیا۔ مجبوراً سردار ہری سنگھ نے کیسرا سنگھ کی مرضی کے مطابق پائندہ خان سے صلح کی بات چیت شروع کی اور ڈیرہ نے کوچ کر دیا اور کچھ فیصلہ نہ ہو سکا۔

اس سال کے گزرنے کے بعد ۱۸۸۵ بکرمی (۱۸۲۸ء) سردار ہری سنگھ دوسری دفعہ ہزارہ میں آیا۔

ان ہی ایام میں کشمیر کی طرف سے دیوان کرپا رام پسر دیوان موتی رام ناظم کشمیر، اپنے باپ کی طرف سے حکومت کشمیر میں ممتاز تھا اور سلطان زبردست خان مظفر آباد والا سے ناراض تھا۔ مظفر آباد کی طرف بمعہ مستعد اور کافی فوج آیا۔ راستہ میں تمام پرانے قلعوں کو مرمت کرتا ہوا مظفر آباد پہنچ گیا۔

ناظم کشمیر اور سردار ہری سنگھ کی متفقہ مہم کا مشورہ برخلاف سلطان زبردست خان

چونکہ انھی دنوں میں سردار ہری سنگھ ہزارہ میں تھا لہٰذا اس کو خط لکھا کہ:

"مخلص دیوان کرپا رام کشمیر سے برائے تنبیہ و تدارک سلطان زبردست خان آیا ہوں۔ اگر آپ کی مرضی ہو تو ہم دونوں مل کر دونوں کوہستانوں (ہزارہ، مظفرآباد کشمیر مترجم) کی سرحد پر جو یاغستان بنا ہوا ہے اور وہاں سرکش جمع ہیں، ان سے اس جگہ کو پاک کر دیا جائے۔ لہٰذا اس خط کے ملتے ہی سوار ہو کر مظفرآباد کی طرف آئیں"۔

چنانچہ سردار نے بمعہ لشکر تیزی سے نالہ کنہار کے کنارے متصل گڑھی سعادت خان (حال گڑھی حبیب اللہ خان۔ مترجم) پر پہنچ کر مقام کیا۔

حبیب اللہ خان معہ اپنے بھائیوں، بیٹوں اور بھتیجوں کے ساتھ سردار کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور نالہ کنہار پر پل باندھا اور لشکر سردار کو بخوبی پار کرا کر آگے روانہ ہو گیا اور مظفرآباد میں دریائے کشن گنگا جو مظفرآباد کے نیچے جا رہی ہے، کے کنارے پہنچا دیا۔

سردار نے پہنچتے ہی دیوان کرپا رام کو خط لکھا کہ یہ مخلص آں مہربان کے خط کے بموجب یہاں پہنچ گیا ہے۔ اگر آپ جلد ہی سے یہاں پہنچ جائیں تو تمام کاروبار متفقہ طور پر سرانجام ہو جائے گا کیونکہ میں زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔

دیوان نے خط پڑھتے ہی صاف جواب دیا کہ میں اپنے زور بازو سے کشمیر سے یہاں تک آیا ہوں اور قلعہ چکار و قلعہ دوپٹہ زیر مرمت ہیں۔ جب بھی ان کی مرمت سے فرصت ملی، تو میں آ جاؤں گا۔ اگر آں مہربان کو زیادہ ٹھہرنے کی فرصت نہیں، تو آپ کی مرضی۔

سردار ہری سنگھ کی واپسی از مظفرآباد اور گڑھی میں تھانہ بنانا

یہ جواب ملنے پر سردار ہری سنگھ نے سلطان زبردست خان سے چار ہزار روپیہ بطور نذرانہ معرفت جواہر شاہ برادر سپاہی ہریا سنگھ شاہوکار قلعہ سرکشن گڑھ لے کر واپس روانہ ہو گیا۔

واپسی کے وقت حبیب اللہ خان نے اپنے آدمیوں سے نالہ کنہار کا پل تڑوا دیا اور جنگ و فساد

کے لئے تیار ہوگیا۔ جب سردار کوہ دب پر آیا تو گھوڑی کے سلطان بخت خان کے ملازمین اور حبیب اللہ خان نے جنگ شروع کر دی۔ چونکہ سردار ہری سنگھ ایسے کوہستانی علاقوں کی جنگ کا تجربہ رکھتا تھا، کچھ فکر نہ کیا اور بڑے استقلال اور عزم کے ساتھ کوہ دب سے اتر کر گڑھی کے نزدیک ڈیرہ لگایا۔ حبیب اللہ خان کا گھر لوٹ کر اس کو جلا دیا۔ ایک دو روز وہاں رہا اور حبیب اللہ خان کی ایک پختہ حویلی کو تھانہ بنایا اور اس میں تین سو سپاہی مسلح بہ بندوق زیر کمان نتھا سنگھ مقرر کر کے اور کنہار کے پل کو باندھ کر پار کیا اور مانسہرہ کے نزدیک پہاڑ کے دامن میں کیمپ لگایا۔

جنگ پھلڑہ مابین مجاہدین و ہری سنگھ

یہاں پر پھلڑہ، ملک پائندہ خان سے خبر ملی کہ خلیفہ سید احمد شاہ کا بھانجا احمد علی کچھ آدمیوں کے ساتھ پھلڑہ پہنچ گیا ہے اور اس طرف آرہا ہے۔

ادھر حبیب اللہ خان و سلطان نجب خان نے گڑھی سے نتھا سنگھ بمعہ سپاہیوں کو اپنی حویلی سے باہر نکال دیا اور حبیب اللہ خان پھر اپنی حویلی میں مقیم ہو گیا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی سردار سوار ہو کر نالہ کنہار پر پہنچ گیا۔ نتھا سنگھ دریا عبور کر کے سردار کی خدمت میں آگیا۔ سردار نے اس سے ناراض ہو کر اس کو بیڑیاں لگا کر گھر میں قید کر دیا جہاں وہ دو سال قید رہا۔ آخر کار دو ہزار روپے جرمانہ ادا کر کے رہا ہوا۔

سردار ہری سنگھ یہاں سے واپس ہو کر پھر مانسہرہ پہنچ گیا اور مہوت کٹھ (مانسہرہ کے ساتھ نالہ کا نام۔ مترجم) کے نالہ پر فروکش ہوا۔

خلیفہ سید احمد شاہ کا بھانجا احمد علی ساٹھ ہزار ہندوستانیوں اور دو تین ہزار ملکی لوگوں کے ساتھ پھلڑا میں ٹھہرا ہوا تھا۔ جب یہ خبر سردار کو ملی تو اس نے بقول مولوی سکندر "باشرقیاں حرب داشت۔ در خیمہ بہ گو پند غرب داشت"۔ مانسہرہ سے اٹھ کر نواں شہر کی طرف منہ کر کے ڈیرہ واپس کر لیا۔ لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ سردار کو کوئی بات یاد آئی ہے اور وہ ہزارہ کو جا رہا ہے۔

یہ سن کر احمد علی جو پھلڑہ میں تھا، دلیر ہو گیا اور چند آدمیوں کے ساتھ نالہ سرن کو پار کر کے اس طرف آگیا اور چند آدمیوں کے ساتھ دوسرے لوگ موضع پوزنیاں متصل پھلڑہ میں بیٹھے رہے۔

رات کا ایک پہر باقی تھا کہ سردار نے فوج میں اسلحہ اور بارود تقسیم کر کے شبخون مارنے کے لئے سوار ہو گیا اور پو پھٹتے ہی سرن نالہ سے گذر کر موضع کرکر و موضع بھاکلہ پر پہنچ گیا۔

احمد علی کے جو آدمی دریائے سرن کے اس طرف تھے سب بھاگ کر پار چلے گئے اور جو باقی پار کنارے والے جو بھاکلہ و پوزنیاں میں تھے، انہوں نے بندوق سے فائر کرنے شروع کر دیئے جس سے سردار کے لشکر کے چار سوار مارے گئے۔ لیکن سردار نے بطور یلغار دریا کو پار کر کے حملہ کر دیا۔ اس طرف احمد علی کے ساتھ ساٹھ آدمی تھے، مقابلہ کے لئے تیار ہو گئے۔ دونوں طرف سے تیر و بندوق کی جنگ شروع ہو گئی۔ ملکی لوگ احمد علی کا ساتھ چھوڑ کر پہاڑ پر چلے گئے۔ مگر اس کے ساٹھ ساتھی بڑی سرفرازی اور جوانمردی سے مقابلہ کرتے رہے اور سردار کے لشکر میں سے دو تین سواروں کو زخمی کر دیا اور سو کے قریب اور لوگ بھی زخمی ہو گئے۔ چونکہ احمد علی کے آدمی بہت تھوڑے تھے، سب قتل ہو گئے اور ایک آدمی بھی ان سے زندہ نہ بچ سکا۔

سردار نے فتح پائی اور اپنے ڈیرہ کی طرف آگیا اور بعد میں ہزارہ کو چلا گیا۔ اس کے بعد اس علاقہ کے سب تھانہ دار اور کارگزار اپنے اپنے کام میں سرگرم اور مصروف رہے۔

خلیفہ سید احمد شاہ اور پائندہ خان کی ملاقات کا انتظام

تا وقتیکہ خلیفہ سید احمد نے پائندہ خان کو خط لکھا کہ تم میرے ہاتھ پر بیعت کرو اور میرے وزیر بن جاؤ۔ خلافت میں تم کو دے دوں گا۔ انشاء اللہ خوب کام ہو گا اور کرسی نشینی کا اچھا انتظام ہو جائے گا۔

پائندہ خان بوکالت سید حسن شاہ اس بات پر راضی ہو گیا اور خلیفہ سید احمد شاہ اور پائندہ خان ملاقات کے لئے قریب ہوئے۔ خلیفہ پنج تار سے کھبل میں آگیا۔ یہاں دریائے سندھ کے دونوں طرف کے لوگ خلیفہ سے متفق ہو گئے اور قلعہ تربیلہ کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت ہزارہ میں فوج تھوڑی تھی اور مہاں سنگھ کے پاس کوئی آٹھ سو مسلح پیادہ اور ڈھائی سے سوار ہوں گے۔ باقی فوج اپنے قلعوں میں تھی۔

ان دنوں جنرل الارڈ مہاراجہ لاہور کی جانب سے تین رجمنٹ کے ساتھ موضع واہ متصل حسن ابدال میں وارد ہوا۔ سردار مہاں سنگھ نے اپنے معتبر کے ہاتھ ایک خط برائے امداد

لکھا۔ اگرچہ اول الارڈ صاحب نے عذر کیا کہ حضور مہاراجہ کا حکم دکھائیں لیکن آخر کار ایک رجمنٹ جو موسوم بہ دوم ڈراگون (DRAGOON) (بمعنی غصیلہ رسالہ) کو حکم دیا کہ تربیلہ جا کر مدد کریں تاکہ قلعہ کا محاصرہ اٹھ جائے۔

جنگ تربیلہ

چنانچہ رجمنٹ مذکور بہ افسری سردھا سنگھ سندھیانوالہ جلدی سے واہ سے کوچ کر کے مہاں سنگھ کے معتبر کے ساتھ آکر بھاروکوٹ میں فروکش ہوگئی۔ ایک رات بھاروکوٹ میں رہ کر دوسرے روز جب ہزارہ فوج نے پیش قدمی کی تو یہ رجمنٹ ان کے پیچھے روانہ ہوئی۔ جب یہ تربیلہ کے قریب پہنچے تو تربیلہ کے زمیندار جنہوں نے اپنے اہل وعیال باہر بھیج دئیے تھے، آمادہ جنگ ہوئے۔ جانبین میں گولیوں سے جنگ شروع ہوگئی۔ اس جنگ میں زمینداروں کے چند آدمی مارے گئے اور یہ لوگ فرار ہوگئے۔ قلعہ تربیلہ کا محاصرہ ٹوٹ گیا اور رجمنٹ تربیلہ میں ٹھہر گئی۔ اس رجمنٹ کے پانچ چھ سوار جو تنخواہ کی برآمدگی کے لئے پنڈ دادنخاں گئے ہوئے بمعہ اسلحہ خیروخوبی سے واپس آگئے۔

دل موہٹ میں سکھ سپاہیوں کا قتل

الارڈ صاحب واہ سے کوچ کر کے علاقہ چھچھ میں موضع غورغشتی میں آکر فروکش ہوئے اور جو سوار تنخواہ لے کر آئے، انہوں نے بھی اپنی رجمنٹ میں شامل ہونے کے لئے براہ کھڑی وغازی جانے کا ارادہ کر لیا۔ کسی نے ان کو منع نہ کیا کہ اس راہ سے نہ جائیں۔

یہ چھ سوار گھوڑوں ٹٹوؤں اور تھیلوں کے ساتھ براہِ کھڑی وغازی اپنی رجمنٹ کو ملنے کے لئے تربیلہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جب وہ موضع موہٹ میں پہنچے تو موہٹ کے زمینداروں نے منت سماجت اور چاپلوسی سے سواروں کو کہا کہ اس جگہ سے تربیلہ دور ہے۔ اب بے وقت ہوگیا ہے اور آپ وہاں نہ پہنچ سکیں گے۔ لہذا ضروری ہے کہ آپ یہاں ہی ٹھہر جائیں۔ وہ چارپائیاں لے آئے اور سواروں کو دے دیں اور رسد آٹا و دانہ ان کو دیا اور رات وہاں ٹھہر لیا۔ سواروں نے ڈیرہ کر لیا اور دانہ اور رسد لے لی۔ بعض تو روٹی پکانے میں لگ گئے، اور بعض دیگر کاموں میں مصروف ہوگئے۔

ناگاہ سب زمینداروں نے جمع ہو کر ان سے اسلحہ لے لیا اور سب کو قتل کر دیا۔ صرف

ایک سکھ زندہ بچا، جس نے آکر رجمنٹ میں اس واقعہ کی خبر دی۔

موہٹ کے سب زمینداران سواروں کا سامان گھوڑے، یابو اور سب نقدی جوان کے پاس تھی لے کر ایک جالہ (دو چار شہتیروں کو باندھ کر کشتی بنانا۔ مترجم) میں سوار ہو کر دریائے سندھ کے درمیان واقع ایک بیلہ (دریا کے درمیان جزیرہ۔ مترجم)، میں جا کر بیٹھ گئے۔

جب ان کی رجمنٹ تربیلہ کی مہم سے واپس ہو کر لارڈ صاحب سے آکر ملی تو ان سواروں کے حالات سے اس کو آگاہ کیا۔ الارڈ صاحب نے اس کا بدلہ لینے کا فکر کیا اور اس کے لئے ایک افغان مسمی پھلیل خان جو سرکار سکھاں کا خیرخواہ تھا سے رابطہ قائم کیا۔ اس شخص نے الارڈ صاحب کو اس کے تدارک کی تدبیر بتائی۔ اس کے لئے اس نے دریا کے پایاب حصہ کی رہنمائی کر کے پانچ سو سواروں کو ساتھ لے کر بیلہ میں پہنچا دیا۔ ڈل موہٹ والے لوگ بچوں اور عورتوں کے ساتھ بیلہ میں موجود تھے، ان میں سے بعضوں کو قتل کر دیا اور کچھ کو قید کر لیا۔ تمام مال و متاع بمعہ گھوڑوں اور جنس کے جو انہوں نے لوٹا تھا، لے لیا۔ سواروں کے ساتھ ظلم کی تلافی ایسی ہوئی کہ جس کسی نے سنا آفرین کہی۔

ملاقات خلیفہ احمد شاہ و پائندہ خان

خلیفہ سید احمد شاہ کی ملاقات پائندہ خان کے ساتھ گڑھی ستھانہ دگیا سے نیچے ہوئی۔ پائندہ خان کے مصاحبوں، نوکروں اور خویش و اقارب سب نے خلیفہ کے سامنے تعظیم و تکریم سے سر خم کیا۔ جیسے ان سب کو ساری عمر میں پائندہ خان سے کوئی واسطہ یا غرض نہ تھی۔ گویا ان سب کے قدیم مربی اور بزرگ خلیفہ سید احمد رہے تھے۔ جب پائندہ خان نے اپنے بھائیوں، خویش و اقارب اور ملازمان کی یہ حالت دیکھی تو اس کے دل میں وہم اور وسواس پیدا ہو گیا کہ کہیں یہ سب لوگ اور میرے نوکر جنہوں نے خلیفہ سید احمد کی اتنی تعظیم کی، اس کو گرفتار کر کے خلیفہ کے حوالے نہ کر دیں۔ اگرچہ خلیفہ سید احمد شاہ اور پائندہ خان کی ملاقات تو ہو گئی مگر پائندہ خان کو بہت فکر اور اندیشہ پیدا ہو گیا اور دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ گوشہ گزینی آسان ہے لیکن خلیفہ کے ساتھ سازگاری مشکل ہے۔

پائندہ خان دل میں یہ مشورہ کر کے الگ ہو گیا۔ چنانچہ سربلند خان تنولی جس کی پائندہ خان

کے ساتھ جانی دشمنی تھی، بمعہ اپنے بیٹے نواب خان نے خلیفہ کے پاس جاکر نوکری اختیار کرلی، اور پائندہ خان کا برادر حقیقی نواب خان بھی اس سے رنجیدہ ہو کر خلیفہ کے پاس وقت کا منتظر تھا کہ خلیفہ نے اپنی جمعیت کے ساتھ کوہستان کے راستہ سے پائندہ خان کے ملک کو فتح کرنے کا ارادہ کرلیا۔ مدد خان اور سربلند خان اس لشکر کے رہنما بنے۔ پائندہ خان بھی اپنے سوار و پیادہ سے تیار ہو کر انب کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ لیکن اس کو یہ فکر تھا کہیں اس کے نوکر بے ایمانی کر کے اس کو گرفتار نہ کرادیں اور جب دیکھا کہ بعض نوکر گولی ڈالے بغیر بندوقیں چلا رہے ہیں تو بے اعتبار ہو کر اپنے بارہ خیر خواہوں سمیت سوار ہو کر گڑھی انب سے نکل کر گڑھی چتر بائی جو دریا کے کنارے ایک بڑے پتھر پر بنی ہوئی ہے کی طرف بھاگ کر چلا گیا۔ وہ رات چتر بائی میں گزار کر بمعہ اہل و عیال دریا کو عبور کر کے کولائی کی طرف آکر بیٹھ گیا۔

جب خلیفہ سید احمد شاہ نے انب پر اپنی گرفت مضبوط کرلی، تو تمام ملکی لوگوں نے کہا کہ ان کا کوئی تعلق پائندہ خان کے ساتھ نہیں ہے اور نہ اس سے غرض رکھیں گے اور خلیفہ اور مدد خان کی نوکری کریں گے۔

جب چند لوگ دریا سے پار گئے تو پائندہ خان اپنی جان کے خوف سے کولائی سے فرار ہو کر براہ شیر گڑھ اگرور کی طرف چلا گیا اور اپنے بال بچوں اور لوگوں کے ساتھ وہاں بیٹھ گیا۔

دو تین دن جب گزر گئے تو عبدالغفور خان، خان اگرور نے اپنی منسوبہ ہمشیرہ پائندہ خاں جس کی منگنی نواب خان پدر پائندہ خان نے خود کی ہوئی تھی اور نواب خان کے مرنے کے بعد پائندہ خان نکاح کر کے نہ دیتا تھا، بہ جبر نکاح کر لینے کا ارادہ کیا ہوا تھا۔ یہ واقعہ سن کر پائندہ خان بہت رنجیدہ ہوا۔

پائندہ خان کی ہری سنگھ سے درخواست برائے امداد

اتفاقاً انہی دنوں میں سردار ہری سنگھ لشکر سمیت ہزارہ میں آیا ہوا تھا۔ پائندہ خان نے اپنے بیٹے جہانداد خان کو اپنے چند معتبرین کے ساتھ رات کے وقت ہری سنگھ کے پاس بھیجا اور کہلوایا کہ میری عزت کا سوال ہے، جس طرح بھی ہو میری مدد کریں۔

سردار ہری سنگھ نے فوراً ہزارہ کی فوج مہاں سنگھ کے ساتھ بھیج دی، جس نے گلی کی راہ سے گزر کر چنذیر میں ڈیرہ کیا۔ پائندہ خان نے اس فوج کے پہنچنے سے تقویت پاکر، اگروریوں کے قبضہ سے نکلنے کی کوشش کی۔ اگروریوں نے یہ تجویز کی ہوئی تھی کہ رات کے وقت پائندہ خان کے آدمیوں کو قتل کر کے پائندہ خان کی بہن کو عبدالغفور خان اپنے نکاح میں لے آئے۔

پائندہ خان نے اسی رات وہاں سے نکل کر موضع میرا میں آکر ڈیرہ کیا۔ اس کے لوگ اگرور میں رہ گئے۔

دوسرے دن قلعہ شونگلی جو مدد خان کے تحت تھا کو فتح کر لیا اور اس پر اپنی حکومت جاری کر دی۔ تیسرے دن سردار ہری سنگھ نے سوار ہو کر ڈیرہ میں مقام کیا اور پائندہ خان اپنا ڈیرہ ڈنڈا نولیاں میں لے گیا۔ تیسرے دن سردار ہری سنگھ کی فوج کے ساتھ، پائندہ خان کے لوگ مل گئے۔ اور دونوں فوجوں نے قلعہ چمیری، جس میں پائندہ خان کا چچا محمد خان ازجانب مدد خان، مختار کے طور پر مقرر تھا، کا محاصرہ کر لیا۔ دو دن تک جانبین میں بندوق، چھوٹی توپوں سے جنگ جاری رہی، لیکن کوئی مدد قلعہ والوں کو نہ مل سکی۔ تیسرے دن محمد خان قلعہ سے باہر آکر حاضر ہو گیا۔ پائندہ خان نے اس کا اچھی طرح سے استقبال کیا اور اپنے ساتھ ملا لیا۔

پائندہ خان کی بحالی بہ امداد ہری سنگھ

اس کے بعد یہ فوجیں نکہ پانی کے راستہ سے دربند میں داخل ہو گئیں۔ چنانچہ سردار ہری سنگھ کی مدد سے ملک پھر پائندہ خان کے تحت آگیا۔ رعیت نادم و شرمندہ ہو کر پائندہ خان کی خدمت میں حاضر ہو گئی۔ پائندہ خان بھی ان کے ساتھ ظاہر داری سے پیش آیا اور ہر شخص کی طاقت کے مطابق جرمانہ وصول کر کے معاف کر دیا۔

صرف ایک قلعہ انب جو پائندہ خان کا مسکن تھا اور ایک قلعہ چتر بائی جو دریا کے درمیان میں تھا، باقی رہ گیا۔ باقی سب ملک سردار ہری سنگھ کی امداد سے پائندہ خان کے ماتحت آگیا۔ سردار ہری سنگھ نے پائندہ خان کو کہا کہ اسی وقت باقی قلعے حاصل کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے لیکن دریا میں طغیانی ہے۔ جب بھی دریا اتر گیا قلعہ انب و چتر بائی بھی بھی خلاص کرا کر تمہارے حوالے کر دئیے جائیں گے۔ خاطر جمع رکھیں اور کوئی فکر نہ کریں۔

اس کے بعد میں آپ کو اپنا آدمی سمجھتا ہوں۔ اس بات چیت کے بعد سردار ہری سنگھ کی فوج ہزارہ کو چلی گئی اور پائندہ خان بطرف بانڈہ نگوائی چلا گیا۔

پائندہ خان کے نصیب نے یاوری کی، دریائے سندھ کی طغیانی کم ہو گئی۔ موسم برسات ختم ہو گیا اور موسم سرما آ گیا تو اس اثنا میں یوسف زئی کے افغان خلیفہ سید احمد شاہ سے ناراض ہو گئے۔

یوسف زئی افغانوں کی خلیفہ صاحب سے ناراضی کی وجہ

افغانوں کا رواج ہے کہ جب کوئی لڑکی جوان ہو جائے تو اس کا رشتہ اپنے کفو اور برابر والوں سے کرتے ہیں۔ جب تک وہ شخص ایک سو اسی روپیہ کما کر نہ لائے اور لڑکی والوں کو نہ دے دے شادی نہیں ہو سکتی۔

خلیفہ سید احمد شاہ نے اس رواج کو بدعت قرار دے کر تمام ملک یوسف زئی میں منادی کرا دی کہ جو شخص اپنی بیٹی کا شیر بہا (ادائیگی نقد روپیہ۔ مترجم) لے گا یہ حرام ہے۔ صرف نکاح پڑھنے والے ملا کو پانچ آنے دے کر نکاح کر کے لڑکی کو بیاہ لائے۔

چونکہ سینکڑوں لڑکیاں منگنی شدہ گھروں میں بیٹھی ہوئی تھیں اور شادی کا روپیہ پیدا نہ ہونے کی وجہ سے اپنے باپوں کے گھروں میں بیٹھی تھیں۔ ان کے نامزد شوہروں نے پانچ پانچ آنے نکاح نامہ کے دے کر شادیاں کریں اور ان کو اپنے گھروں کو لے گئے۔

اگرچہ یہ نیک کام تھا اور لوگوں کے فائدے کے لئے تھا لیکن افغانوں کو یہ بات پسند نہ آئی۔ لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ لڑکی کی قیمت اب چند آنہ ہو گئی ہے۔ یہ طعنہ پٹھانوں کو بہت سخت اور گراں معلوم ہوا۔

آپس میں مشورہ کیا کہ خلیفہ سید احمد شاہ نے بزور ہمارے ملک پر حاکم ہو کر افغان لڑکیوں کی قیمت پانچ آنے مقرر کر دی ہے ایسی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔

یوسف زیوں کی سازش

یوسف زیوں نے خلیفہ سید احمد شاہ کے خلاف ایک مشورہ کر کے اس کے پاس گئے اور یہ بات بنائی کہ اٹک کا ایک قلعہ خالی ہے اور اس پر مسلمان گولہ انداز مقرر ہیں اور انہوں نے ہمیں پیغام بھیجا ہے کہ اگر

ہم سب جمع ہو کر جائیں تو وہ گولا اور توپیں ہمارے حوالے کر دیں گے، تاکہ قلعہ اٹک کو فتح کریں لہٰذا مصلحت یہ ہے کہ ہم قلعہ کا محاصرہ کریں۔ لیکن اس کے لئے خرچ کی ضرورت ہے جس کو پورا کرنے کے لئے آپ اپنے سپاہیوں کو دیہات میں عشر کی وصولی کے لئے حسب دستور بھیجیں۔ جب یہ جمع ہو جائے تو پھر ہم سب اٹک کی طرف حملہ کے لئے جائیں گے۔

خلیفہ سید احمد شاہ، ان کے غدر اور فریب سے بے خبر تھا۔ اس نے تمام سوار و پیادہ کو جو اس کے پاس جمع تھے، یوسف زئی کے دیہات میں عشر جمع کرنے کے لئے بھیج دیا۔ اندر سے افغانوں نے یہ مشورہ کر کے ایک آدمی کو مختار بنایا کہ فلاں تاریخ بروز جمعرات رات کا پہلا پہر گزرنے کے بعد موضع شیوا (تحصیل صوابی ڈکرہ مار پہاڑ جو کالو خان کے گاؤں کے ساتھ ہے۔ مترجم) کے پہاڑ کی چوٹی پر آگ روشن کر دے۔ جب لوگ اس کے شعلے بلند ہوتے دیکھیں تو فوراً جہاں جہاں جتنے آدمی بھی خلیفہ صاحب کے ہوں، ان کو قتل کر کے، ان کے گھوڑوں اور ساز و سامان پر قبضہ کریں۔

القصہ جب مقررہ دن اور وقت پر یہ آگ جلائی گئی تو جتنے سپاہی خلیفہ صاحب کے مختلف دیہات میں تھے، وہ سب قتل کر دیئے گئے۔ یہ کل آٹھ سو آدمی تھے۔ ان کے گھوڑے اور اسلحہ جات سب لے گئے اور خلیفہ صاحب کے پاس پنجتار میں صرف ڈیڑھ سو سپاہی رہ گئے اور ان کے قتل یا گرفتار کرنے کے منصوبے بنانے شروع کر دئے۔

خلیفہ صاحب کی آمد ہزارہ میں

لیکن فتح خان، خان پنجتار نے خلیفہ صاحب کو پہاڑوں سے گزار کر دریائے سندھ سے پار کر کے ٹکری، نندھیاڑ (ضلع ہزارہ۔ مترجم) پہنچا دیا۔

حبیب اللہ خان گڑھی والا، جو ان دنوں سکھوں کے برخلاف تھا۔ اپنی فوج سمیت موضع راج دواری ملک نندھیاڑ میں آ گیا اور خلیفہ صاحب کی اطاعت اختیار کر لی۔

کچھ دنوں کے بعد خلیفہ سید احمد راج دواری سے بھوگڑ منگ میں آ گئے۔ چند روز یہاں رہ کر بالاکوٹ اور درہ کا ئیگان (کاغان) میں آ گئے اور کشمیر کی طرف جانے کا ارادہ رکھتے تھے اور کشمیر کو جاتے ہوئے جو رئیس مثلاً حبیب اللہ خان وغیرہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے

ان کو ملک کشمیر میں جاگیر دینے کا پروانہ دیتے ۔

سکھ افواج کا خلیفہ صاحب سے مقابلہ کے لئے ہزارہ میں آنا

خلیفہ سید احمد شاہ کے اس ارادہ کے تدارک کے لئے کنور شیر سنگھ اپنی آٹھ ہزار مسلح فوج لے کر بمعہ سردار عطر سنگھ کالیانوالہ، سردار شام سنگھ اٹاری والا، مہادھو سنگھ نہنگ، رتن سنگھ گونکوا، وزیر سنگھ انگریکلہ، گورمکھ سنگھ اور لکھمی سنگھ، جو سرداران پشاور سے گھوڑے اور ملک یوسف زئی سے معاملہ لینے پر مامور تھے۔ سب خلیفہ سید احمد شاہ کے کشمیر جانے سے روکنے کے لئے اور جہاں کہیں بھی وہ ہو، اس سے مقابلہ کے لئے روانہ ہونے کا حکم ہو گیا۔ جب کنور شیر سنگھ اپنے ان آدمیوں اور فوج کے ساتھ ملک ہزارہ سے ملک پکھلی میں موضع شنکیاری میں پہنچا۔ اس وقت خلیفہ درہ بھوگڑ منگ میں تھا جو شنکیاری سے آٹھ دس کوس ہو گا۔

سب سرداروں نے کنور شیر سنگھ کو مشورہ دیا کہ سرکار کے ملک میں جہاں کہیں خلیفہ خلل ڈالے تو اس کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ اب خلیفہ بھوگڑ منگ میں ہے، جو سردار ہری سنگھ کی جاگیر ہے۔ لہٰذا وہ خود اس کا تدارک کرے گا۔

لہٰذا ان سب کا یہ مشورہ ٹھہرا کہ سب سے پہلے ہم کو مظفر آباد جانا چاہیے اور اس جگہ کا بندوبست کرنا چاہیے۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔ کنور شیر سنگھ نے یہ مشورہ مان لیا۔ ہر چند سردار مہاں سنگھ کہتا رہا کہ جناب جب خلیفہ اپنی جمعیت کے ساتھ بھوگڑ منگ میں ہے تو اس سے مقابلہ چھوڑ کر مظفر آباد جانے میں کیا مصلحت ہے۔

کنور شیر سنگھ کا مظفر آباد میں آنا

لیکن سب سرداروں نے اس کی بات نہ مانی اور خواہ مخواہ لشکر کوچ کر کے مظفر آباد کی طرف روانہ ہو کر دریائے کشن گنگا پائین مظفر آباد بہ موضع گوجرہ مقام کیا، جن ملکی لوگوں نے مظفر آباد کا محاصرہ کیا ہوا تھا، سکھ فوج کو دیکھ کر منتشر ہو گئے۔ قلعہ مظفر آباد کا محاصرہ ٹوٹ گیا اور سلطان بخت خان گھوڑی والا کنور شیر سنگھ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ سلطان کی تواضع و عزت افزائی کے لئے توپ کی سلامی دی گئی اور کنور شیر سنگھ نے سلطان سے عہد و پیمان مکمل کر کے اس معاہدہ

پر اس نے بہ قلم کیسر یعنی زعفران دستخط کر دیئے کہ مظفر آباد کے ملک کی سلطانی، سلطان بخت خان کو عطا کی گئی اور دوسرے کسی شخص کو اس ملک نہ شراکت کا حق حاصل ہے اور نہ غرض۔

چند دن کنور شیر سنگھ کا ڈیرہ گو جری میں رہا، تا کہ مظفر آباد کے ملک کا تمام انتظام مکمل ہو جائے۔

خلیفہ صاحب کی بالاکوٹ میں آمد

اس اثنا میں خلیفہ سید احمد شاہ اپنی جمعیت کو بھوگڑ منگ میں چھوڑ کر خود موضع بالاکوٹ، جو درہ کنہار کے سرے پر ہے آکر مقام کیا۔ اس علاقہ کے لوگ، رعایا و زمینداران کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

اس پر سردار مہاں سنگھ نے کنور شیر سنگھ کی خدمت میں عرض کی کہ خلیفہ ملک سے معاملہ وصول کر رہا ہے، اب قلعوں میں مقرر شدہ فوج کی تنخواہ کہاں سے ادا کروں گا۔

اس پر کنور شیر سنگھ نے حکم دیا کہ سردار مہاں سنگھ اپنی فوج اور وزیر سنگھ زنگر لکیہ و سادھو سنگھ نہنگ و رتن سنگھ کو نگلو کوچ کر کے گڑھی میں مقام کریں اور جو بندوبست مہاں سنگھ کرنا چاہے، اس کی مدد کریں۔

اس جگہ سے ہزارہ کی فوج جو مہاں سنگھ کے ساتھ تھی، جو دو سو سپاہی ہوں گے اور اتنے ہی رتن سنگھ کو نگلو کے ساتھ اور ایک سو آدمی کے قریب سادھو سنگھ نہنگ کے ساتھ ہوں گے یہ سب اکٹھے ہو کر گڑھی پہنچ گئے اور دریا کے کنارے پر اپنا ڈیرہ لگایا۔

سردار مہاں سنگھ نے وہاں ایک گڑھی موسوم بہ فتح سنگھ گڑھی تعمیر کرنی شروع کر دی۔ دو تین دن کے بعد یہ قلعہ کسی جگہ ایک گز اور کسی جگہ ڈیڑھ گز کے قریب تیار ہوا ہو گا کہ خبر ملی، کہ آج چار گھڑی دن باقی ہو گا کہ خلیفہ بالاکوٹ سے چل کر دریا کے دوسرے کنارے پر بالمقابل آ گیا ہے اور آج رات سکھوں کے ڈیرہ پر شبخون مارے گا۔ یہ خبر سنتے ہی ڈیرہ کے افسر گھبرا گئے کہ ان کے ساتھ فوج تھوڑی ہے اور اس کا علاج کوئی نظر نہ آتا تھا۔ آخر کار جرأت کر کے انہوں نے اپنے ڈیرہ کے گرد خندق کھودی اور خاربندی کر لی۔ پتھر اور لکڑی جمع کر کے اپنے مورچے کے دونوں دروازوں کے پاس ڈھیر کر دی۔

چار گھڑی رات گزرنے کے بعد سب سوار اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر اور ہر پیادہ مسلح ہو کر کبھی مشرق اور کبھی شمال کی طرف جاتے۔ ڈھول و نقارہ صبح تک بجاتے رہے۔ یہ زلزلہ اور شور ساری رات جاری رہا۔ کوئی کہتا کہ اس طرف سے آ گئے، کوئی کہتا کہ اس راہ سے آ گئے۔ ساری رات خوف سے کوئی بھی سو نہ سکا۔

لہٰذا ان افسران نے مشورہ کر کے کنور شیر سنگھ کو عرضی بھیجی کہ خلیفہ دریا کے اس پار آ گیا ہے اور شبخون مارنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو ان کی قلیل جمعیت، آٹھ سو سپاہی مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ اور وہ ان سب کو قتل کر دے گا۔

یہ عرضی رات کو پہنچی۔ کنور شیر سنگھ نے اسی وقت سب فوج کو حکم دے دیا کہ فوراً سوار ہو جاؤ۔ لیکن رات ہونے کی وجہ سے تیاری میں دیر ہو گئی۔ رات دو تین گھڑی سے گزر چکی تھی کہ تیاری شروع کی گئی لیکن فوج دو گھڑی رات باقی تھی کہ سوار ہو کر گوجرہ سے روانہ ہوئی اور صبح سویرے گڑھی پہنچ گئی۔

اس فوج کے آ جانے سے سب لوگوں کے دل مضبوط ہو گئے اور گڑھی کی تعمیر شروع کر دی سولہ دن میں گڑھی تیار ہو گئی۔

شیر سنگھ کا گڑھی پہنچنا

ایک دو دفعہ کنور شیر سنگھ افسران سمیت سوار ہو کر اپنے ڈیرہ سے بطرف بالاکوٹ گئے، تاکہ موقعہ کا ملاحظہ کر سکیں۔

جب گڑھی تیار ہو گئی تو اپنے ڈیرہ سے روانہ ہو کر دریا کے کنارے اگر کوٹ بیلہ جو بالاکوٹ سے تین کوس ہو گا پر مقام کیا۔

خلیفہ سید احمد شاہ اس وقت بالاکوٹ میں تھا۔ کنور شیر سنگھ ایک دو دفعہ بالاکوٹ، دریا کے کنارے اور دوربین سے ملاحظہ کیا اور کہا۔ دریا کے اس طرف سے خلیفہ کے ڈیرہ پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ اس امر پر ہر روز مشورے ہوتے رہے۔

ایک دن خلیفہ نے پوشیدہ طور پر چار پانچ سو ملکی مسلح بہ بندوق کو دریا عبور کرا کر، سکھوں کے ڈیرہ سے کوس ڈیڑھ کوس کے فاصلہ پر سرُوٹ کے جنگل میں چھپا دیا اور اپنے ڈیرہ میں چاول پکا کر چھوڑ دیتے اور خود وہاں سے ہٹ گئے تاکہ بہت سے پرندے ان کو

کھانے کے لئے جمع ہو جائیں۔ جب کنور شیر سنگھ نے دو تین گھڑی دن چڑھے دوربین لگا کر دیکھا تو کہا کہ خلیفہ بالاکوٹ سے بھاگ گیا ہے۔ اس کا ڈیرہ خالی ہے اور پرندے اس کے ڈیرہ پر جمع ہو کر چگ چر رہے ہیں۔

کنور شیر سنگھ نے صورتِ حال معلوم کرنے کے لئے پانچ سوار اور پانچ پیادے فوری طور پر خبر لانے کے لئے روانہ کئے۔ جب یہ سوار اور پیادے سروٹ کے جنگل میں داخل ہوئے تو خلیفہ کے چھپے ہوئے لوگوں نے پانچ سواروں اور تین پیادوں کو قتل کر دیا۔ مگر دو پیادے جو تیراک تھے دریا میں کود پڑے اور تیر کر دریا پار کر کے اپنے ڈیرے میں پہنچ گئے اور اس واقعہ کی خبر پہنچائی کہ یہ سب لوگ خلیفہ کے فریب کا شکار ہو گئے اور قتل کر دئے گئے۔

خلیفہ صاحب پر حملے کے لئے مشورہ

اس کے بعد سب افسر یکجا مشورہ کے لئے اکٹھے ہوئے اور طے پایا کہ ان سب کو دریا پار کر کے خلیفہ کی فوج کے ساتھ جنگ کرنا چاہیے۔ لیکن اپنا ڈیرہ یہاں رکھنا چاہیے۔ ڈیرہ کی حفاظت کے لئے قلعہ گرناہ کشمیر سے جو فوج ایک ہزار کے قریب جمعدار ٹیک سنگھ کے ساتھ آئی تھی، کو ڈیرہ کی حفاظت کے لئے چھوڑ دیا جائے اور باقی فوج دریا پار کر کے خلیفہ سے جنگ کرے۔

چنانچہ اس تجویز پر عمل کیا گیا۔ ایک گوجر فوج کا رہنما بنا اور فوج براہ لبیاں و دلولہ پٹی کوٹ پہاڑ کے ڈنہ (چوٹی - مترجم) پر پہنچا دیا۔

ہزارہ کی جو فوج شنکیاری میں تھی، وہ بھی براہ تمری بالا، اسی پہاڑ پر آ گئی۔ راستہ میں خلیفہ کی فوج سے چونکہ پانی کے راستہ پر بطور نگہبان بیٹھی ہوئی تھی۔ جنگ ہوئی چونکہ وہ لوگ تھوڑے تھے تین چار آدمی ان سے مارے گئے اور باقی بھاگ گئے۔

اس اثنا میں خلیفہ کی فوج سے ایک ہزار آدمی بندوقوں سے مسلح ہو کر بالاکوٹ سے پیشقدمی کی کوشش کی، کہ اس پہاڑ پر چڑھ جائیں، لیکن سکھوں کی فوج ان سے پہلے پہنچ گئی، لہٰذا خلیفہ کی فوج راستہ ہی سے واپس ہو گئی۔

سکھوں کی فوج پٹی کوٹ کی چوٹی پر

جب سکھوں کی فوج معہ کنور شیر سنگھ اور افسران پہاڑ کے ڈنہ پر پہنچ گئے تو وہاں پانی کا ایک قطرہ

بھی نہ تھا۔ حیران ہوئے کہ ایک دو دن کھانا نہ ملنے سے وقت گزارا جا سکتا ہے لیکن پانی کے بغیر کس طرح گزارہ ہوگا۔

سب اس فکر میں پریشان تھے۔ قدرتِ الٰہی سے بادل کا ایک ٹکڑہ شمال کی جانب سے اٹھا اور اس نے ڈیرہ پر آ کر ژالہ باری شروع کر دی۔ مگر کسی آدمی یا جانور کو کوئی نقصان نہ پہنچا اور پینے اور روٹی پکانے کے استعمال کے لئے اتنا وافر پانی ہو گیا کہ لوگوں نے تمام برتن، جو ان کے پاس تھے اولوں سے بھر لئے۔ ایک ساعت میں وافر میٹھا، خوشگوار اور ستھرا پانی مہیا ہو گیا۔ اس آسمانی امداد سے سکھوں کی فوج، پانی اور روٹی سے آسودہ ہو گئی۔ رات سب نے آرام سے گزاری اور صبح کنور شیر سنگھ کے پاس سب افسر آئے اور مشورہ کیا اور یہ فیصلہ ہوا کہ اس پہاڑ کی چوٹی پر اپنا قبضہ بہت ضروری ہے۔ لہٰذا مصلحت اس میں ہے کہ سردار مہاں سنگھ ہزارہ کی فوج اور سردار جوالا سنگھ کے چچا لکھمی سنگھ بھڈانیہ پیش قدمی کر کے خلیفہ سے جنگ شروع کریں اور باقی مدد کے لئے ان کی پشت پر موجود رہے۔

سردار مہاں سنگھ اور لکھمی سنگھ یہ سنتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور بالاکوٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب وہ دو گولی کی مار کا فاصلہ طے کر چکے تو سردار شام سنگھ اٹاری والا نے کہا کہ یہ ٹھیک نہیں اگر دونوں نے فتح حاصل کر لی تو ہم اور دوسرے کس حساب میں لکھے جائیں گے اور اگر ان دونوں کو شکست ہو گئی تو ہم کس نوشتہ میں ہوں گے۔

یہ سنتے سب افسران کو فکر زیادہ ہو گیا اور یہ کہہ کر سب اٹھ کھڑے ہوئے کہ ہم سب اکٹھے ہو کر جنگ کریں گے۔ اس پہاڑ کی چوٹی کو سنبھالنے کی کوئی حاجت نہیں۔ اگر ہم کو شکست ہو گئی تو کوئی بھی لاہور نہ پہنچ سکے گا۔ راستہ میں مسلمانوں کا ملک ہے وہ کب ہم کو چھوڑیں گے۔ لہٰذا ہم سب کو اکٹھے ہو کر یکبارحملہ کرنا چاہیے۔

بالاکوٹ کے میدانِ جنگ کا نقشہ

اس بات پر سب فوج روانہ ہو گئی۔ جب فوج پٹی کوٹ سے اتر کر نیچے آئی تو پہاڑ کے دامن میں سب سے پہلے ہوتر کے کھیت تھے جو نشیب میں تھے۔

اس کے بعد بالاکوٹ کی پہاڑی ہے۔ جس میں خلیفہ تیر، تفنگ اور چھوٹی توپوں سے مسلح

تیار بیٹھا تھا۔ جب سکھوں کی فوج نیچے اتری تو دونوں جانب توپ اور بندوق کے فائر شروع ہو گئے۔ سکھوں نے ایک توپ جو وہ کشمیر سے ساتھ لائے تھے، کو مقابلہ کے لئے برابر کیا اور گولہ باری شروع کر دی۔ دن کے ایک پہر گزرنے سے دوپہر تک جانبین میں بندوق، توپ اور زنبورک سے گولہ باری ہوتی رہی۔ چونکہ بندوق کی ایک گولی ہزارہ فوج کے نشان بردار کو جو سب سے آگے تھا، کے سینہ پر لگی اور دوسری گولی جوالا سنگھ بھڈانیہ کی فوج کے نشان بردار کو لگی تو یہ دونوں اسی جگہ ڈھیر ہو گئے۔ جب یہ دونوں نشان بردار زمین پر گر گئے اور جھنڈے ان کے ہاتھ سے گر گئے تو اگرچہ دوسرے سکھوں نے یہ نشان اٹھا لئے۔

مجاہدین کا حملہ سکھوں پر

لیکن ان جھنڈوں کے گرتے ہی خلیفہ کے جتنے آدمی بالاکوٹ میں تھے، سب نے دفعتاً حملہ کر دیا، بلکہ خلیفہ سید احمد شاہ اور مولوی اسمٰعیل، جو فوج کے سب سے بڑے دو افسر تھے، نے حملہ شروع کر دیا اور اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتے ہوئے اور جوش و غضب میں اپنی ڈاڑھیاں، دانتوں کے نیچے دبا کر ہوتروں (دھان کے کھیتوں) میں آ گئے اور اونچی آواز سے حکم دیا کہ کافروں پر حملے کرو۔ وہ بھاگ رہے ہیں، جانے نہ پائیں۔

چونکہ قضا و قدر میں ان دونوں کی، اور ان کے ساتھیوں کی موت کا وقت قریب آ چکا تھا یہ سب حملہ کر کے ہوتر کی زمینوں سے گزر کر پہاڑ کے دامن میں پہنچ گئے، جہاں ایک طرف سردار شام سنگھ، سردار پرتاپ سنگھ اٹاری والوں کی فوج تھی اور دوسری طرف سردار عطر سنگھ کالیانوالہ، گورکھ سنگھ بھلہ وغیرہ کی فوج تھی اور ہزارہ کی فوج زیر کمان مہاں سنگھ اور کنور شیر سنگھ کی فوج بالمقابل تھی جس سے جنگ ہوئی۔ پہلے ہلے میں سکھوں کی فوج میدان سے پیچھے ہٹ گئی آخر کار کنور شیر سنگھ میان سے تلوار نکال کر سب سے آگے ہو گیا۔ مگر سردار مہاں سنگھ اور اس کے ہمراہیوں نے منع کیا کہ آپ کا اکیلے آگے جانا مناسب نہیں لیکن کنور شیر سنگھ نے اس وقت کسی کی بات نہ سنی اور شمشیر بدست دس بارہ قدم آگے نکل کر ان لوگوں پر پتھر مارے جو مقابلہ سے ہٹ کر واپس آ رہے تھے اور اسی جگہ کھڑا رہ کر اپنا ایک اردلی سردار شام سنگھ، پرتاپ سنگھ اٹاری والوں کی طرف خبردار کرنے کے لئے بھیجا، جو پہلے سے ہی ہوشیار تھے اور بندوقیں چلا

چلا رہے تھے اور ایک آدمی عطر سنگھ کالیانوالہ کی طرف اور آفریں دی کہ خوب فائر کر رہے ہو چنانچہ دونوں جانب سے بندوقیں چلنی شروع ہو گئیں۔ خلیفہ کے ساتھ کے لوگوں سے ایک سو ستاسی آدمی (ملکی۔ مترجم) انہی ہوتروں میں، جو خلیفہ پر فدا تھے، ایک دوسرے کے اوپر مر کر ڈھیر ہو گئے۔

خلیفہ صاحب کی شہادت

دوسری طرف ہوتروں میں اسی طرح چار سو ہندوستانی جو خلیفہ کے دل وجان سمیت ساتھ تھے مارے گئے اور اسی جگہ خلیفہ کی لاش، جس کے دائیں ہاتھ پر ایک گولی لگی تھی اور دوسری گولی سینہ پر بائیں پستان (عین دل پر۔ مترجم) پر لگنے سے وہاں ہی پڑی ہوئی تھی۔

مجاہدین کا خلیفہ کی لاش اٹھالے جانے کی کوشش

اس کے باقی ماندہ ہمراہیوں نے جو کم و بیش اسی کے قریب تھے، تین چار مرتبہ حملہ کیا کہ خلیفہ کی لاش کو اٹھا کر لے جائیں۔ لیکن سکھوں کی جانب سے گولیوں کی بوچھاڑ مثل بارش کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکے۔ لاچار خلیفہ کا سر کاٹ کر ساتھ لے گئے۔ لیکن جب تھوڑی دور گئے تھے تو جس شخص نے خلیفہ کا سر اٹھایا ہوا تھا، اس کو گولی لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ لیکن مرتے مرتے اس نے خلیفہ کا سر، سرسوں کے خرمن میں جہاں وہ گرا تھا، وہاں چھپا دیا۔ اس کے ساتھی فرار ہو گئے۔

سکھوں نے ان کا تعاقب کیا اور بالاکوٹ میں پہنچ گئے اور جا کر خلیفہ اور دوسرے لوگوں کے گھروں کو لوٹ لیا اور آگ لگا دی۔ خلیفہ کے سامان لشکر سے آٹھ چھوٹی توپیں، ایک ہاتھی بارہ گھوڑے اور کچھ خچریں سکھوں کے ہاتھ لگیں۔

خلیفہ صاحب کی لاش کی شناخت

فتح کے بعد سکھوں کے ڈیرے نے کوچ کر کے دریائے کنہار کے کنارے مقام کیا۔ کنور شیر سنگھ اور دوسرے سردار سوار ہو کر میدانِ جنگ میں آئے تاکہ خلیفہ کی لاش کو دیکھیں۔ جب میدان جنگ میں آئے اور خلیفہ سید احمد شاہ کی لاش (سر بریدہ۔ مترجم) دیکھی تو خیال کیا کہ یہ مسلمانوں کے لشکر کے کسی رئیس کی لاش ہے۔ اس کو میدان جنگ سے اٹھا کر ڈیرہ کے نزدیک لے آئے اور ایک سائبان کے نیچے رکھ دی۔ کنور شیر سنگھ نے حکم دیا کہ اگر کوئی شخص خلیفہ کی لاش کو

کو پہچانتا ہے تو وہ آئے اور شناخت کرے۔

چونکہ نواب خان تنولی، دو تین سال سے زائد خلیفہ کی نوکری میں رہا تھا، اس کو شناخت کے لئے بلایا گیا۔ کنور شیر سنگھ نے اس سے پوچھا کہ تم اتنے سال خلیفہ کی نوکری میں رہے ہو کیا تم شناخت کر سکتے ہو کہ یہ اسی کی لاش ہے یا کسی اور کی۔

نواب خان نے لاش دیکھ کر کہا کہ صاحب! اگر اس کے ساتھ سر ہوتا تو میں شناخت کر سکتا۔ اب سر کے بغیر لاش کو شناخت کرنا بہت مشکل ہے۔ ہاں خلیفہ سید احمد شاہ کا ایک نشانِ شناخت اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کے پاؤں کی سب انگلیوں کے ناخن ناقص اور خراب تھے۔ جب کپڑے اٹھا کر دیکھا گیا تو سب ناخن خراب اور نادرست تھے۔ اگرچہ سب نے کہا کہ یہ خلیفہ ہی کی لاش ہے لیکن پورا یقین نہ ہو سکا۔

اس فکر میں تھے کہ بوقت عصر ایک سپاہی ملازم کالا خان تنولی والد فیروز خان تنولی آیا اور بیان کیا کہ اگر اس کو کچھ انعام دیا جائے تو وہ خلیفہ کے سر کا پتہ بتا دے گا۔

کنور شیر سنگھ نے اس کو پچیس روپیہ انعام دیا اور ۲۵ سوار اور ۵۰ پیادے اس کے ساتھ بھیج کر کہا کہ جہاں خلیفہ کا سر ہے، وہاں جائیں اور سر کو لے آئیں۔ چنانچہ وہ سپاہی ان کے ساتھ میدانِ جنگ میں گیا اور سرسوں کے اس خرمن سے جہاں خلیفہ کے مرنے والے سپاہی نے اس کو چھپا دیا تھا، نکال کر ان کے حوالے کر دیا۔

جب سپاہی سر لے کر واپس آئے تو نماز کا وقت ہو گیا تھا اور رات کافی گزر چکی تھی۔ ان کی آمد کے شور سے ڈیرہ کے لوگوں میں ہراس پیدا ہو گیا کہ دشمنوں کے سوار و پیادہ حملہ کے لئے آ گئے۔ (یہ مجاہدین کی ہیبت کا اثر تھا۔ مترجم) سکھوں نے فوراً گھوڑے ساز و سامان سے تیار کرنے شروع کر دئیے اور اسلحہ بندی شروع کر دی لیکن بعد میں ان کو یہ معلوم ہو کر تسلی ہوئی کہ یہ تو اپنے آدمی ہیں جو خلیفہ کا سر لانے کے لئے گئے ہوئے تھے۔

جب سب کو تسلی ہو گئی تو آرام سے بیٹھ گئے اور خلیفہ کے سر کو لاش کے ساتھ جوڑ کر سیدھا کر دیا۔ اس کے بعد کنور شیر سنگھ نے نواب خان تنولی کو پھر بلایا کہ وہ دیکھ کر بخوبی شناخت کرے کہ کیا یہ سر خلیفہ کا ہی ہے، یا کسی دوسرے کا؟

چنانچہ نواب خان تنولی نے سر دیکھنے کے بعد یقین سے کہا کہ یہ سر واقعی خلیفہ سید احمد شاہ کا ہی ہے۔

خلیفہ صاحب کی لاش کی تجہیز و تکفین

اس کے بعد سکھوں کے مسلمان ملازموں نے ساری رات بیدار رہی کی اور لاش کے پاس مرثیہ خوانی کرتے رہے۔

دوسرے روز کنور شیر سنگھ کی اجازت سے خلیفہ کی لاش کو دریائے کنہار کے کنارے دفن کر دیا۔

تیسرے دن ان کاموں سے فراغت کے بعد کنور شیر سنگھ کی فوج نے گڑھی حبیب اللہ خان کی طرف کوچ کیا۔ سردار مہاں سنگھ اور سردار لکھمی سنگھ کو حکم ملا کہ وہ تیار رہیں اور فوج کے ڈیرہ کا سامان روانہ کرنے کے بعد انتظار کریں۔ جب تمام فوج پٹی کوٹ سے گزر کر اس طرف چلی جائے تو پھر تم ان کے پیچھے پیچھے آؤ۔

خلیفہ کی لاش کو دفن کے بعد نکال کر دریا برد کرنا

چنانچہ ان دونوں سرداروں نے حسب الحکم انتظار کیا اور اس دوران مشورہ کیا کہ خلیفہ کی زندگی میں یہ سب شور و فساد اس کی وجہ سے رہا۔ اب اگر اس کی قبر اس ملک میں رہ گئی تو بہت سے مسلمان اس قبر کی پرستش کریں گے اور اس کی کرامات کا تذکرہ کریں گے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ خلیفہ سید احمد شاہ کی لاش قبر سے نکال کر دریائے کنہار میں ڈال دیں۔

چونکہ ساتھ ہی آٹھ نہنگ سکھ کھڑے تھے۔ دونوں سرداروں نے ان کو پچیس پچیس روپے دے کر کہا کہ یہ ثواب کا کام ہے۔ خلیفہ کی لاش کو قبر سے نکال کر دریائے کنہار جو ساتھ ہی ہے میں ڈال دیں۔ چنانچہ ان نہنگوں نے لاش کو قبر سے نکالا اور تلوار سے اس کا انگ انگ جدا کر کے دریائے کنہار میں ڈال دیا۔

اس کے بعد جب فوج کا ڈیرہ گڑھی سے گزر گیا تو سردار مہاں سنگھ اور لکھمی سنگھ دونوں نے اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہو کر گڑھی میں مقام کیا۔ دسویں روز وہاں سے کوچ کر کے مانسہرہ میں آ گئے۔ منزل بہ منزل کوچ کرتے ہوئے کنور شیر سنگھ معہ فوج اور افسروں کے لاہور پہنچ گیا اور

ہزارہ کی فوج سردار مہاں سنگھ کے ساتھ ہزارہ کے انتظام میں مصروف ہو گئی۔

جنگ بالاکوٹ کی تاریخ

جنگ خلیفہ و سکھاں، ۷ بیساکھ ۱۸۸۸ بکرمی (مطابق مئی ۱۸۳۱ء) میں موضع بالاکوٹ تعلقہ درہ کنہار علاقہ کاغان (کاغان۔ مترجم) میں ہوئی اور خلیفہ سید احمد شاہ کی روح قفس عنصری سے بوجہ لگنے گولی اعالم بالاکوٹ کی طرف پرواز کر گئی۔

جہانداد خان کو لاہور بطور یرغمال لے جانا

جہانداد خان پسر پائندہ خان جو سردار ہری سنگھ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور سردار موصوف نے تنول میں ہندوال کا حصہ جس پر مددخان تنولی اور خلیفہ سید احمد شاہ نے قبضہ کیا ہوا تھا وہ سب تھانے قلعہ شونگلی و چتربائی وغیرہ ان سے خلاص کرا کے پائندہ خان کو قبضہ دلا دیا تھا۔

جب سردار موصوف ہزارہ سے لاہور کی طرف روانہ ہوئے تو جہانداد خان پسر پائندہ خان کو بھی ساتھ لے گئے۔ لاہور پہنچ کر جہانداد خان کو مہاراجہ کے سامنے پیش کر کے کہا کہ اس کو بطور یرغمال لے آیا ہوں۔

پائندہ خاں کا امب اور چتربائی پر قبضہ

اس اثنا میں یوسف زئی کے لوگ خلیفہ سید احمد شاہ کے خلاف ہو گئے اور اس کے آدمیوں کو قتل کر دیا۔ (جیسا کہ پہلے صفحات میں بیان ہو چکا ہے۔ مترجم) اور خلیفہ کمزور ہو کر ٹکڑی اور سندھیاڑ کی طرف چلا گیا اور پائندہ خاں پھر بدستور قلعہ چتربائی اور قلعہ امب کو بغیر جنگ فتح کر لیا اور قابض ہو گیا۔

پائندہ خان اور مہاں سنگھ کی آویزش

چند دنوں کے بعد اس نے سردار مہاں سنگھ کے ساتھ جھگڑا اختیار کر لیا اور قلعہ دربند اور گڑھی کو بند کر دیا اور تنول کے دیہات علاقہ پلال، جو سکھوں کے ماتحت تھا میں چوری اور شبخون مارنا شروع کر دیا۔

ہری سنگھ کی ہزارہ میں آمد اور پائندہ خان سے جنگ

جب سردار ہری سنگھ دوبارہ ہزارہ میں آیا تو دربند اور گڑھی

کے راستے کھولنے اور قلعہ قادر آباد اور کرپلیاں جن پر پائندہ خان نے قبضہ کر لیا تھا کو خلاص کرنے کے لئے سردار ہری سنگھ اس طرف متوجہ ہوا۔ چنانچہ سردار نے ہر طرف سے حملہ کر کے قلعے خلاص کرا لئے۔ لیکن قلعہ چتربائی ایک طرف دریا سے ملحق تھا۔ ہر بار کوشش کی کہ دریا پار کر لے تاکہ دوسری طرف سے قلعہ پر حملہ کرے۔ کئی بار اس کوشش میں جنگ ہوئی اور کارگر نہ ہو سکی۔ ایک دن پھر حملہ کیا لیکن کامیابی نہ ہو سکی اور اس میں بہت سے جوان مرد جنگ آزمودہ سپاہی از طرف ہری سنگھ مارے گئے۔ ایک دن سردار ہری سنگھ نے بہت تنگ ہو کر حکم دیا۔ مورچہ توپ جو بالمقابل پائندہ خان کے تھا، کے سامنے جہانداد کو کھڑا کر دیا جائے، تاکہ جو گولی یا گولہ پائندہ خان کی طرف سے آئے جہانداد خاں اس کی زد میں آ جائے۔ تاکہ وہ اپنے بیٹے کی جان کی خاطر گولہ اندازی نہ کر سکے لیکن پائندہ خان نے اپنے گولہ اندازوں اور بندوقچیوں کو حکم دیا کہ ہرگز صرفہ نہ کریں، کہ جہانداد خاں سامنے ہے۔ یہ نامردی ہوگی، اگر وہ گولہ باری سے مر گیا تو مجھے کوئی غم نہیں ہے۔ چنانچہ بدستور گولہ باری کی جاتی رہی۔

اب سردار ہری سنگھ نے خود بخود جہانداد خان کو کھولا اور اپنے ڈیرہ پر لے گیا۔ جنگ بارہ دن تک جاری رہی۔ آخر کار وکیلوں کی وساطت سے صلح کی بات چیت شروع ہوئی۔ قلعہ قادر آباد خلاص ہو گیا اور دربند کے راستے گڑھی کا راستہ بھی کھول دیا گیا اور غلہ ان قلعوں میں درآمد ہونا شروع ہو گیا۔

جہانداد خان کی قلعہ ہری پور سے رہائی کا پس منظر

جہانداد خاں بدستور قلعہ ہرکشن گڑھ میں قید رہا اور سردار پھر لاہور چلا گیا۔ جہانداد خان کی رہائی کی کوئی صورت نہ بن سکی۔ اس اثناء میں ایک سال امیر دوست محمد خان بذاتِ خود پشاور کی طرف متوجہ ہوا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ بمع اپنی فوج کے پشاور میں آ گیا اور جنجہ کے مقام کھاٹڑ کے ایک زمیندار مسمی سعد اللہ خان کو وکیل بنا کر پائندہ خان کے پاس بھیجا کہ پائندہ خان کو تسلی دینا اور کہنا کہ اگر وہ خود حاضر ہو جائے تو اس کے بیٹے کو رہا کر دیا جائے گا۔

جب سعد اللہ خان وہاں پہنچا تو پائندہ خان نے اس کو بیڑی (ڈنڈا) لگا کر قید کر دیا

اور ایسا تنگ کیا کہ وہ مرنے لگا۔ خیر اندیش اور نیک خواہوں نے ہر چند پائندہ خان کو کہا کہ وکیلوں کے ساتھ کوئی بھی ایسا سلوک نہیں کرتا لیکن پائندہ خان نے کوئی بات نہ سنی اور جواب دیا کہ ہم بھی جانتے ہیں کہ مہاراجہ صاحب والئی لاہور کے وکیل کو قید کرنے کے بعد ہم ملک تنول میں نہیں رہ سکتے۔ لیکن میں نے یقین کر لیا کہ اس کام کے بغیر جہانداد خان کی رہائی ناممکن ہے۔ اگر مہاراجہ نے میرے خلاف چڑھائی کی تو اپنا گھر، بار، ملک اور مال چھوڑ کر فرار ہو جاؤں گا۔ مگر سعد اللہ خان کو بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ اگر مہاراجہ کی فوج میرے تعاقب میں آئی اور میں نے محسوس کیا کہ اب گرفتار ہو جاؤں گا تو دریائے سندھ میں چھلانگ لگا کر اپنے آپ کو غرق کر دوں گا۔ لیکن جہانداد خان کی رہائی کے بغیر سعد اللہ خان کو نہیں چھوڑوں گا۔

جب یہ اطلاع مفصل طور پر مہاراجہ کے گوش گزار کر دی گئی تو مہاراجہ صاحب نے کہا کہ واقعی سعد اللہ خان کی رہائی جہانداد خان کی رہائی کے بغیر ناممکن ہے۔ اس لئے مہاراجہ نے فوری طور پر سردار ہری سنگھ کو حکم بھیجا کہ جہانداد خان کو ان کے سامنے حاضر کیا جائے۔ چنانچہ جہانداد خان سردار کے معتبران کے ساتھ مہاراجہ کی خدمت میں حاضر کر دیا گیا۔ وہاں سے اس کو بھائی موہن سنگھ کاردار علاقہ کنہار کے حوالہ کر دیا کہ وہ جہانداد خان کو پائندہ خان کے حوالے کر دے اور سعد اللہ خان کو وہاں سے لے آئے۔

بھائی مذکور نے جہانداد خان کو خان زمان خان گندگریہ (طاہر خیلی قوم کا خان۔ مترجم) کے حوالے کر دیا۔ تاکہ وہ جہانداد خان کو پائندہ خان کے پاس پہنچا دے اور سعد اللہ خان کو رہا کر کے خان زمان خان گندگریہ کے آدمیوں کے حوالے کر دے۔

اس کے بعد پائندہ خان نے کبھی بھی جہانداد خان کو کسی سردار یا حاکم کے پاس ملاقات کے لئے نہ بھیجا اور پائندہ خان نے خود بھی کبھی کسی سردار یا درانی یا سکھ سے ملاقات کی۔ اپنے گھر میں بیٹھ کر اپنا وقت گزارتا تھا۔

راجگان خان پور سے بقایا کی وصولی جب سردار مہاں سنگھ پکھلی کے بندوبست سے فارغ ہو گیا تو ہزارہ میں آگیا اور دریافت کیا کہ کچھ روپیہ جو راجگان نے قرض لیا تھا اور کچھ سالانہ نذران سے تا حال وصول نہیں ہوئی۔

اگرچہ سردار مہاں سنگھ کی جانب سے بھائی روپ سنگھ خان پور میں بطور تھانہ دار تھا لیکن راجگان نے کوئی عذر اس کے سامنے پیش نہ کیا۔

اس بقایا کے وصول نہ ہونے پر، باوجود اس بات کے کہ مہاں سنگھ نے راجہ نجب خان سے پگڑی بدلی تھی، ناراض ہو گیا اور اس پگڑی کا کوئی لحاظ نہ کیا اور سردار ہری سنگھ کو لکھا کہ راجگان خان پور خدمت واطاعت سے پہلو تہی کرتے ہیں، بلکہ بغاوت کا خیال دل میں رکھتے ہیں۔

سردار ہری سنگھ نے مہاں سنگھ کا خط مہاراجہ کی خدمت میں پیش کر کے ان سے منظوری لے لی کہ اگر راجگان خدمت واطاعت سے روگردانی کریں تو فوراً ان کا ملک خان پور ضبط کر لیا جائے۔

یہ حکم ملنے کے اور دسہرہ کے دس دن گزرنے کے بعد سردار ہری سنگھ، مہاراجہ سے رخصت ہو کر یوسف زیوں کے معاملہ کی وصولی اور سردارانِ پشاور سے نذرانہ کے گھوڑے لینے کے بعد جب راولپنڈی واپس پہنچے تو فوراً راجہ خان پور کو کہلا بھیجا کہ اگر خان پور کا ملک چاہتے ہو تو جلدی آجاؤ۔ اگر آنے میں دیر کی تو تمہاری جاگیر ضبط کر لی جائے گی اور ساتھ ہی اپنا ایک معتمد راجہ کے پاس بھیجا کہ راجہ کی تسلی اور دلجمعی کرے کہ وہ کوئی فکر نہ کرے۔ سردار کے معتمد نے راجہ کو تقریر و تمثیل سے جتنی بھی تسلی دی راجہ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور راجہ نجب خان اور راجہ علی گوہر خان نے حاضر ہونے سے انکار کر دیا۔ معتمد نے مجبور ہو کر ہر دو راجگان کے دو معتبر آدمی ساتھ لئے اور سردار کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور راجگان کی طرف سے ایک گھوڑا بطور نذرانہ لے گئے۔

سردار نے نذرانہ قبول کر لیا اور دونوں معتبروں کو خلعت دے کر واپس کر دیا۔ سردار مہاں سنگھ کو لکھا کہ وہ ہزارہ سے خان پور کی طرف آئے اور ساتھ اپنے بیٹے ارجن سنگھ کو اس فوج، سوار اور پیادہ کے ساتھ سردار ہری سنگھ کے ڈیرے موضع سرائے کالا میں جمع ہے، ساتھ لے کر خان پور پہنچ جائے اور سردار خود بھی علی الصبح راولپنڈی سے سوار ہو کر ہزارہ کی طرف براہ شاہ اللہ دتا، خان پور میں آ گئے۔ تینوں طرف کی فوج کا ملاحظہ کیا۔ راجگان خان پور سے نکل کر کوہستان ڈھونڈ میں جا کر پناہ گزین ہو گئے۔

تعمیر قلعہ خان پور سردار ہری سنگھ نے خان پور میں آکر مقام کیا اور ایک گڑھی ۱۸۸۸ بکرمی بمطابق ۱۸۳۱ء تعمیر کی جو اب تک موجود ہے (اس میں پولیس کا تھانہ ہے۔ مترجم) اور اسی سال سے ملک خان پور کا معاملہ ہزارہ کے ساتھ لگا دیا گیا۔ اس اثناء میں راجگان خانپور کو چھوڑ کر کوہستان ڈھونڈ، مقام سیر وغیرہ میں اقامت گزین رہے۔

گڑھی کی تعمیر کے بعد سردار ہری سنگھ راولپنڈی، گھیب، کھاٹڑ، دھنی و چھچھ ہزارہ سے معاملہ وصول کرنے کے بعد راولپنڈی پہنچ گیا۔

راجگان ایک دو دفعہ خان پور میں شبخون مارنے کے لئے آئے۔ ان حملوں میں طرفین سے چند آدمی مارے گئے اور چند زخمی بھی ہوئے لیکن راجگان کی مطلب براری نہ ہو سکی نہ کچھ مدد معاش اور نہ ہی جاگیر مل سکی۔ بلکہ سردار ہری سنگھ کی زندگی میں راجگان اپنے وطن میں آکر آباد نہ ہو سکے۔ یہاں تک کہ سردار ہری سنگھ جنگ جمرود میں مارا گیا۔

اس کی موت کے بعد ماہ بیساکھ ۱۸۹۴ بکرمی مطابق ۱۸۳۷ء میں سب ملک ہزارہ سردار تیجا سنگھ کے ماتحت ہو گیا۔ سردار تیجا سنگھ نے خان پور کا ملک، بھائی دل سنگھ کاردار راولپنڈی کے حوالے کر دیا۔ اس وقت راجہ علی گوہر خان نے بوساطت سردار دھیان سنگھ[۱] دو ہزار جاگیر کا پروانہ مہاراجہ رنجیت سنگھ والئی لاہور سے لکھوا لایا تو اس کو تین گاؤں موضع سرڈہ[۱]، ترنوٹہ[۲]، پکشاہی[۳] بعوض دو ہزار روپے از جانب دل سنگھ دیئے گئے کہ وہ وہاں آباد ہو جائیں اور مہاراجہ گلاب سنگھ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں۔

سردار ہری سنگھ کا راجہ مانڈلہ کو سزا دینا برسات گزارنے کے بعد سردار ہری سنگھ اپنے گاؤں گوجرانوالہ سے مہاراجہ صاحب والئی لاہور کی خدمت میں دسہرہ کا تیوہار منانے کے لئے حاضر ہوا۔

ایک دن مہاراجہ کے دربار میں بیان کیا گیا کہ شاہولی خان راجہ مانڈلہ راولپنڈی کے لوگوں پر بہت ظلم و زیادتی کرتا ہے۔ اگر شام کے بعد کوئی کھترانی (ہندو عورت) قضائے حاجت کے لئے باہر جائے تو شاہولی خان کے سوار اس کو پکڑ کر موضع مانڈلہ میں لے جاتے

---

[۱] وزیر اعظم مہاراجہ رنجیت سنگھ۔

ہیں اور دو چار رات قید رکھ کر جب اس کے وارث، کسی زمیندار کی وساطت سے جا کر رہائی کے لئے منت و سماجت کرتے ہیں تو اپنی مرضی کے مطابق جرمانہ لے کر اس کو چھوڑتے ہیں۔

جب یہ بات مہاراجہ نے سنی تو فرمایا کیا کوئی شخص اس ظلم و تعدی سے شاہ ولی خان کو منع نہیں کرتا۔ چنانچہ سردار ہری سنگھ اس وقت دربار میں حاضر تھا، اٹھ کر عرض کی اگر حضور کا حکم ہو تو یہ کیا کام ہے۔ مہاراجہ نے فرمایا کہ ایسے اعمال کی سزا ضرور اس کو دی جائے۔

دسہرہ کے گزرنے کے بعد مہاراجہ والئی لاہور نے سردارانِ پشاور سے گھوڑے اور یوسف زئی سے معاملہ جمع کرنے کے لئے سردار ہری سنگھ کو بہت سی فوج دے دی گئی۔

سردار ہری سنگھ کا تسخیرِ دناہ

سردار نے راولپنڈی پہنچتے ہی ملک ہزارہ اور دناہ (خان پور کا علاقہ۔ مترجم) کا انتظام کرنے کی دل میں ٹھانی۔ چنانچہ راستہ کے واقف کاران سے موضع دِناہ کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے بتلایا کہ ایسے تو کوہ دناہ پر پہنچنا بہت دشوار ہے۔ لیکن نیلاں بھوتو کے راستہ سے اگر لشکر جائے ہر دوازدہ چیس سے گزر کر کوہ دناہ پر آسانی سے پڑھ سکتا ہے۔

بکہ خان گولڑہ کی گرفتاری اور توپ سے اڑایا جانا

واقف کاروں کی تجویز کے مطابق ایک رہبر لے کر جب سردار راولپنڈی سے سوار ہو کر موضع گولڑہ سے گزرا تو قرب و جوار کے لوگوں نے عرض کیا کہ بکہ خان گولڑہ تو شاہ ولی خان سے بھی زیادہ ظالم ہے۔ اس کے ہاتھ سے اس کی قوم اور ارد گرد کے دیہات والے بھی نالاں ہیں۔

بکہ خان کے ایک دشمن نے سردار کے سامنے پیش ہو کر عرض کی کہ آپ دِناہ اور شاہ ولی خان ماندلہ والہ کی تنبیہ و تدارک کے لئے جا رہے ہیں۔ لیکن گولڑہ کا بکہ خان شاہ ولی خان سے بھی زیادہ ظالم ہے۔ اس کو کیوں سزا نہیں دیتے۔ یہ بات سن کر سردار نے تفتیش کی تو بہت سے لوگوں نے اس شکایت کی تائید کی تو بکہ خان کو گرفتار کر کے توپ سے اڑا دیا۔

دوسرے دن سردار کا ڈیرہ موضع نور پور پہنچا۔ شاہ ولی خان ماندلہ کو بال بچوں سمیت گرفتار کر کے ہری پور کے قلعہ ہرکشن گڑھ میں بھیج دیا جہاں وہ اپنے بیٹے سمیت قید کر دیا گیا۔

اس کے بعد موضع نور پور سے سوار ہو کر موضع دِناہ پہنچے تو دناہ کے ڈھونڈوں نے پہلے تو

کچھ بندوقیں چلائیں۔ لیکن جلدی اپنے مال و متاع اور اہل و عیال کو گھروں سے نکال لینے میں مصروف ہو گئے اور سردار کی فوج کوہ دناہ پر پہنچ گئی۔

دناہ میں قلعہ کی تعمیر

وہاں قیام کر کے ایک قلعہ کی تعمیر کا انتظام کیا۔ اس کی بنیاد رکھی۔ مزدور اور معمار قلعہ کی تعمیر کے لئے مقرر کئے۔

چونکہ دناہ کے لوگ فرار ہو گئے تھے، لہٰذا ان کے گھروں کو مسمار کر کے ان کے شہتیر اور لکڑیوں کو قلعہ کی تعمیر میں صرف کیا اور ایک ماہ کے عرصہ میں از لغایت ۱۵۔ مگھر ۱۸۸۹ بکرمی مطابق ۱۸۳۲ء آخر ماہ پوہ یہ قلعہ تیار ہو گیا۔ (یہ قلعہ ۲۹ اگست ۱۸۶۱ء میں مسمار کر دیا گیا۔ مترجم)۔ قلعہ کے تیار ہو جانے پر اس کو تھانہ بنا کر اس میں چار سو سپاہی مسلح بہ بندوق مقرر ہو گئے۔

جب قلعہ کی تعمیر کی جا رہی تھی تو ان دنوں میں طوفانی برفباری ہو رہی تھی۔ یہ برف باری دس دن تک جاری رہی۔ چنانچہ جو سپاہی پہرہ پر کھڑے ہوتے تو برف کی سردی اور سرد ہوا کی وجہ سے دو تین گھڑی کے بعد گر پڑتے اور کچھ دیر بعد وہیں مر جاتے۔ اگر کسی کو گرم دوائیں مثلاً جوربویہ، زعفران، افیون اور بادام میسر ہوتے تو وہ ان کے کھانے سے مرنے سے بچ جاتا۔ لیکن ہر کسی کو یہ چیزیں میسر نہ تھیں۔ لہٰذا دو چار گھڑی بعد وہ مر جاتا۔

جب قلعہ بالکل تیار ہو گیا تو تمام ڈھونڈوں نے پیرانِ پلاسی سے متفق ہو کر بیس ہزار مسلح آدمیوں سے جب رات دو گھڑی باقی تھی، اڈیرہ پر حملہ کر دیا۔

قلعہ کی تعمیر کے بعد ڈھونڈوں کا قلعہ پر حملہ

لشکر میں شور و غوغا پیدا ہو گیا۔ سردار ہری سنگھ کمال ہمت و بہادری سے ایک توپ ہمراہ لے کر ملکی لوگوں کے مقابلہ کے لئے سامنے آ گیا۔ اگرچہ فوج تھوڑی تھی اور ملکی لوگ بہت زیادہ تھے لیکن مقابلہ پر جم نہ سکے۔ سکھوں کی توپ نے پے در پے چند گولے برسائے، جس سے تقریباً ڈیڑھ سو ملکی مارے گئے۔ باقی ماندہ فرار کو غنیمت سمجھ کر اپنی جان سلامت لے کر گھروں کو چلے گئے۔

تعمیر قلعہ کے بعد پیران پلاسی والے سردار کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کو سردار نے پانچ سو روپیہ کی دوامی جاگیر میں موضع پلاسی اور مال تولہ دے دیئے اور دوسرے زمینداروں کو حسب مراتب انعام و خلعت دی اور ہر گھر سے پانچ روپیہ بطور نذرانہ وصول کر کے سردار راولپنڈی

کے راستہ سے ملک یوسف زئی اور پشاور کو چلے گئے۔

قلعہ دناہ کی تھانیداری اور فساد

قلعہ کے تھانے میں منصب خان کو تھانہ دار مقرر کیا اور سردار مہاں سنگھ ہزارہ میں آکر اپنے کاروبار میں مشغول ہو گیا۔

جب سردی کا موسم ختم ہو گیا تو دوسرے سال ۱۸۹۰ بکرمی مطابق ۱۸۳۲ء کے شروع میں تمام ملکی لوگ جمع ہو گئے اور قلعہ دناہ کا محاصرہ کر لیا۔ چونکہ سردار ہری سنگھ پشاور میں تھا لہٰذا اس نے ایک پلٹن سوار اور پیادہ اپنے بیٹے ارجن سنگھ کے ساتھ بھیجی۔ ساتھ ہی لہناں سنگھ سندھیانوالیہ کو، جو اس وقت چھچھ میں ٹھہرا ہوا تھا اور سردار ہری سنگھ کے ساتھ دوستی تازہ کی ہوئی تھی، اکو لکھا کہ مسلمانوں نے قلعہ دناہ کا محاصرہ کر لیا ہے۔ آپ اپنی فوج کے ساتھ برخوردار ارجن سنگھ کی مدد کریں۔

اس پر سردار لہناں سنگھ خود دناہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ خان پور سے گزرتے ہوئے اپنی تمام فوج کے ساتھ کوہ چھیس پر ڈیرہ کیا۔ چونکہ چھیس میں سردار ہری سنگھ نے ایک برج تیار کیا ہوا تھا، جس کو مسلمانوں نے مسمار کر دیا ہوا تھا، اول اس برج کی مرمت شروع کر دی۔

اس اثناء میں پیران پلاسی اور ملکی لوگ سردار لہناں سنگھ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ درخواست کی کہ اگر قلعہ کا تھانیدار منصب خان نہ ہو، بلکہ کوئی اور مقرر کر دیا جائے تو ہم خدمت کے لئے حاضر ہیں۔

اگرچہ سردار ہری سنگھ لوگوں کے اس مطالبہ سے مخالف تھا لیکن سردار لہناں سنگھ کی مرضی کے مطابق منصب خان کو معزول کر کے مرزا فقیر بیگ کو تھانیدار مقرر کر دیا۔ منصب خان قلعہ سے باہر آگیا اور اپنی رضامندی سے مرزا فقیر بیگ کو قلعہ میں لے جا کر، چارج اس کو دے دیا۔ لوگوں کی مخالفت اور شبخون ختم ہو گئے۔ سب رعایا آرام اور فراغت سے اپنے گھروں میں آباد ہو گئے اور مقرر شدہ معاملہ سال بہ سال داخل سرکار کرتے رہے۔

مرزا فقیر بیگ بہت فراخ حوصلہ، خوش مزاج، نیک سیرت، سفید پوش، دین دار اور صاحب حسن کردار تھا اور ہر شخص رئیس، ملک و عوامی کے ساتھ ملاقات کر کے دوستی پیدا

کر لی۔ ہر چھوٹے بڑے کو سردار سے مہربانی کی امید دلا کر اپنا گرویدہ کر لیا۔ چنانچہ معاملہ فصل مرزا صاحب کی دانش مندی سے وصول ہو کر داخلِ خزانہ سرکار ہوا۔

آخر الامر سال ۱۸۹۲ء بکرمی مطابق ۱۸۳۵ء مرزا فقیر بیگ تھانہ دار قلعہ دناہ کسی کام کے لئے ہزارہ میں آیا تو ملکی لوگوں نے پھر فتنہ برپا کر کے قلعہ دِناہ کا محاصرہ کر لیا۔ جب یہ خبر ہزارہ میں پہنچی تو وہ بغیر کسی تردد اور لوگوں سے کسی اندیشہ بغیر، فی الفور قلعہ دِناہ کو روانہ ہو گیا۔ اس کو یقین تھا کہ لوگ اس کے ساز گار اور اس سے خوش ہیں۔

جب وہ موضع ٹھیلہ میں پہنچا تو بعض لوگوں نے اس کو منع کیا کہ یہ وقت وہاں جانے کا نہیں ہے۔ لیکن لوگوں کے اس نیک مشورہ کو نہ مان کر وہ ضرور وہاں جانا چاہتا تھا کہ جا کر قلعہ دناہ میں داخل ہو جائے۔ ملکی لوگ ہر طرف سے جمع ہو گئے اور مرزا کو قتل کر دیا۔ جو لوگ مرزا کے ساتھ تھے ان میں سے جو بھاگ گئے وہ بچ گئے۔ اگرچہ لوگوں نے مرزا کو دغابازی سے قتل کر دیا۔ لیکن قلعہ دِناہ کے سپاہی بدستور محکم تھے اور لوگ قلعہ کو فتح نہ کر سکے۔ اس پر ملکی لوگوں نے پشیمان ہو کر قلعہ کا محاصرہ اٹھا لیا اور بدستور حاضر ہو کر اطاعت کا شیوہ اختیار کر لیا اور معاملہ سرکار کو بدستور ادا کرتے رہے اور پھر کوئی فتنہ و فساد برپا نہ کیا۔

چنانچہ ان دنوں میں منصب دار خان کو پھر تھانیدار مقرر کر دیا گیا۔ سردار ہری سنگھ کی عملداری بہ سرکردگی سردار مہاں سنگھ پھر کبھی دناہ میں فتنہ و فساد برپا نہ ہوا۔

قوم کرڑال کا فساد اور قلعہ ناڑہ پر حملہ

جب سردار مہاں سنگھ ہزارہ میں آیا تو احمد علی خان اور فتح علی خان موضع ستوڑہ میں رہتے تھے اور اس موضع کو جاگیر کے طور پر کھاتے تھے۔ لیکن دیہات ناڑہ نیلاں ان کو نہیں ملے تھے۔ کرڑالوں نے بھی شورش اور فساد برپا کر دیا اور قلعہ ناڑہ کا محاصرہ کر لیا۔ جس سے قلعہ کے اندر سب مویشی پانی نہ ملنے کی وجہ سے مر گئے۔ لہذا سردار مہاں سنگھ نے ہزارہ کی فوج کے ساتھ اس شورش کو دور کرنے کے لئے، مقابلہ کے لئے اس طرف آنے کا ارادہ کیا۔ ان دنوں میں حکم سنگھ ملازم سردار ہری سنگھ جو خٹک میں تھانہ دار تھا، معزول ہو کر یہاں آیا ہوا تھا۔ ان دونوں نے صلاح مشورہ کیا کہ حملہ کر کے قلعہ ناڑہ کا محاصرہ دور کریں۔ ملکی لوگ ان کے آنے پر فرار ہو گئے۔

چند دن سردار مہاں سنگھ نے اپنا ڈیرہ ناڑہ میں رکھا۔ ایک دن سیر و شکار کے لئے ستوڑہ کی طرف گئے۔ لیکن کوئی بھی کرڑال ان کے سدراہ نہ ہوا۔ سب فوج ناڑہ سے آکر ستوڑہ میں پہنچ گئی۔ احمد علی خان اور فتح علی خان کے گھروں کو جلا دیا گیا اور جو کچھ ان میں تھا، لوٹ لیا۔ شام کے وقت پھر وہ واپس اپنے ڈیرہ ناڑہ میں پہنچ گئے۔

ستوڑہ میں قلعہ کی تعمیر

چونکہ کام آسان نظر آیا، لہٰذا دوسرے دن ستوڑہ میں داخل ہو کر ایک کچا قلعہ بنایا۔

احمد علی خان و فتح علی خان اپنے بال بچوں کے ساتھ بھاگ کر موضع ماڑی ونگری میں پناہ گزین ہو گئے۔ ایک مہینہ میں جب ستوڑہ کی گڑھی تیار ہو گئی تو مہاں سنگھ نے یہاں تھانہ بنا کر ایک سو سپاہی بندوقوں سے مسلح یہاں بٹھا دئیے اور خود ہزارہ کی طرف واپس ہو گیا اور موضع ستوڑہ اور دوسرے دیہات جو جاگیر میں تھے کو ضبط کر لیا۔ محض ایک ہزار روپیہ کی جاگیر میں دو تین بہت چھوٹے دیہات جو قبضہ سے باہر تھے احمد علی خان و فتح علی خان کرڑال کو جاگیر میں دیئے۔ یہ ۱۸۹۲ بکرمی مطابق ۱۸۳۶ء کا سال تھا، جس میں ستوڑہ کا قلعہ تعمیر ہوا۔ اس سال کے آخر میں سردار ہری سنگھ بمعہ فوج ہزارہ ملک میں آیا۔ اس کے بعد سردار چتر سنگھ اٹاری والا اور تارا سنگھ اٹاری والا بھی سردار کی متابعت میں یہاں آئے۔

سردار ہری سنگھ کی ہزارہ میں آمد اور اگرور پر حملہ

ان سب کے ساتھ سردار ہری سنگھ نے ملک اگرور کی طرف جانے کا ارادہ کیا اور فوج ایک دم درہ اگرور میں کو لکہ کے مقام میں داخل ہوئے۔ سردار ہری سنگھ کے ساتھ ایک توپ تھی، جس سے گڑھی کو لکہ کے مورچہ پہ توپ زنی شروع کر دی۔ ڈھائی سو کے قریب گولے مارے گئے ہوں گے کہ قلعہ کے سپاہیوں نے امان مانگی اور باہر آگئے۔ سردار نے ان کی جان بخشی کر کے رخصت دے دی اور قلعہ کو اپنے قبضے میں کر کے اپنے ملازموں کے حوالے کر دیا۔

اس کے بعد اگرور کے زمیندار حاضر ہوئے اور اگرور کا بندوبست کرنے کے بعد سردار نے از راہِ گلی و تنوعہ، بھینگڑہ، تنول کے بہت بلند پہاڑ کی چوٹی پر جاکر چیکوبین

کے مقام پر ایک گڑھی جو صنوبر اور خشک پتھروں سے بنی ہوئی تھی کو مرمت کیا اور اس میں تین سو سپاہی مسلح بہ بندوق مقرر کر کے تھانہ بنایا۔ پھر اس جگہ سے چل کر موضع کمیاں، جس سے زمیندار بھاگ کر دوسری طرف چلے گئے تھے کی گڑھی کو مہاں سنگھ کے حوالے کر دیا کہ وہ اس کو مرمت کرے اور خود معہ فوج کے کریلیاں میں آ گئے۔

سردار ہری سنگھ نے کوٹ کمیاں کی گڑھی کی تیاری کے لئے ہزارہ سے اجناس وغیرہ کا ذخیرہ ہزارہ سے منگوا کر پہنچایا۔ جب پندرہ سولہ دن میں یہ گڑھی تیار ہو گئی تو مہاں سنگھ نے ساٹھ سپاہی مسلح کو یہاں مقرر کیا اور تمام مطلوبہ جنس کا ذخیرہ محکم کر کے سردار ہری سنگھ کی خدمت میں بہ مقام کریلیاں حاضر ہو گیا۔

ہری سنگھ کی اگرور سے واپسی اور پائندہ خان سے آویزش

سردار ہری سنگھ رسد وغیرہ پہنچانے کے بعد فارغ ہو گیا تو پائندہ خان نے صلح کا پیغام بھیجا۔ دو گھڑی دن باقی تھا کہ پائندہ خان کے وکیل حاضر ہوئے۔ اس وقت دریائے سندھ سے اس پار سامنے نظر آیا کہ چند بکریاں اور چاولوں کی کچھ گٹھڑیاں بندھی ہوئی پڑی ہیں، جیسے کہ یہ سب چیزیں بطور دعوت پیش کرنے کے لئے رکھی ہوتی ہیں۔ پائندہ خان کے وکیلوں نے عرض کیا کہ آپ قدم رنجہ فرما کر دریا کے اس پار جا کر ٹھنڈا پانی نوش فرمائیں اور مہمان ہوں۔ چنانچہ سردار ہری سنگھ تمام فوج کے ساتھ بلا عذر اور بلا کسی خوف کے دریا کے پار جانے اور ٹھنڈا پانی پینے کے لئے روانہ ہوا۔

جب یہ پھلاہ تبی کے پاس جہاں دریا اتنا تنگ ہے کہ اگر اس کنارے سے پتھر پھینکا جائے تو دوسرے کنارے پر جا لگے، سردار معہ فوج پہنچا۔ پھلاہ تبی کے محاذ پر جہاں پائندہ خان نے اپنی سب توپیں، زنبورک اور بڑی بندوقیں نصب کی ہوئی تھیں سے ان پر ایک بار آتش باری شروع کر دی۔ اس فوری فائر بندی اور شور و غوغا سے ایسی ہڑبونگ مچی کہ فراشوں (خدمت گاروں) کے ہاتھوں سے سرداروں کے سر پر جو سائبان (چھتریاں ـ مترجم) انہوں نے پکڑے ہوئے تھے، سب گر گئے۔ اور سردار گھوڑوں سے اتر کر دریا کے کنارے پتھروں کی آڑ میں لیٹ گئے۔ لیکن خدا کے حکم سے ایسا ہوا کہ کسی کو بھی گولی نہ لگی اور سب صحیح و سلامت

اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب سورج غروب ہوگیا تو سردار پا پیادہ وہاں سے اپنے ڈیرہ کو آیا۔

ہزارہ میں آخری آمد کے بعد ہری سنگھ کی واپسی لاہور

دوسرے دن صبح کے وقت سردار مہان سنگھ گڑھی کمیاں کی تعمیر سے فارغ ہو کر فوج ہزارہ سے آکر مل گیا۔ دو چار روز کے بعد دونوں ایک ساتھ ہزارہ آئے۔ سردار ہری سنگھ معہ اپنے لشکر دارالسلطنت لاہور کو چلا گیا اور اس کے بعد پھر ہزارہ میں نہیں آیا۔ یہ اس کا آخری دورہ تھا۔

سردار مہان سنگھ راولپنڈی تک سردار ہری سنگھ کے ساتھ گیا اور راولپنڈی سے رخصت لے کر واپس آیا۔ ہزارہ میں آکر بدستور کاروبار معاملہ میں مشغول ہوگیا۔

ہری سنگھ کی تقرری، پشاور کی صوبیداری پر

ایام برسات کے بعد دسہرہ کے موقع پر مہاراجہ صاحب والئی لاہور نے سردار ہری سنگھ کو پشاور کی صوبیداری پر مقرر کر کے رخصت کیا۔ اور کنور شیر سنگھ کو پشاور سے بلالیا گیا۔

ہری سنگھ اور کنور شیر سنگھ کا حملہ پنجتار پر

سردار ہری سنگھ سب سے پہلے ملک یوسف زئی میں آیا تا کہ پنجتار جو ملک یوسف زئی میں تکلیف دہ تھا، کا انتظام کیا جائے۔ کنور شیر سنگھ اور سردار ہری سنگھ نے متفقہ حملہ کیا اور پنجتار کو جلا دیا۔ جو مالدار لوگ تھے وہ تو فرار ہو گئے اور جو غریب اور نادار تھے وہ اسی جگہ ادھر ادھر چھپ چھپا کر گزارہ کرتے رہے۔ تین چار دن کے بعد یہ لوگ اپنے گھروں کو آگئے۔

فتح پنجتار کے بعد کنور شیر سنگھ لاہور کی طرف تشریف لے گئے اور سردار ہری سنگھ پشاور میں آگیا۔ اور ملک کے نظم و نسق میں مشغول ہو گیا۔ چنانچہ سب سے پہلے ملک خیبر کو دیکھا۔

قلعہ جمرود کی بنیاد رکھنا

وہاں جمرود کے مقام پر ایک خام گڑھی تھی، اس کی مرمت شروع کی۔ دو تین دن وہاں ٹھہرا۔ گڑھی (قلعہ) کی بنیاد خود رکھی اور پشاور میں آگیا۔ مہان سنگھ کو گڑھی کی تعمیر کے لئے جمرود میں چھوڑا۔ چنانچہ چھٹے ماہ کی ابتدا تھی کہ قلعہ جمرود کی بنیاد رکھی گئی۔ آخر ماہ ماگھ سال ۱۸۹۲ بکرمی مطابق ۱۸۳۵ء میں قلعہ کی تعمیر مکمل ہوگئی اور ذخیرہ اجناس، اسامان حرب و بارود و غلہ وغیرہ مہیا کر کے اس کو مضبوط کر دیا۔

دُرانیوں کا حملہ قلعہ جمرود پر

زمینداران علاقہ نے قلعہ کی تعمیر امیر دوست محمد خان والئی کابل کو پہنچائی کہ سکھوں نے جمرود، جو کابل کا دروازہ ہے، پر قبضہ کر لیا ہے۔ اگر کچھ مدد کریں تو یہی وقت ہے، نہیں تو کچھ عرصہ بعد کابل سے دست بردار ہونے کیلئے تیار ہو جائیں۔ امیر دوست محمد خان نے رعایا خیبر کا یہ استغاثہ سن کر اپنے بیٹوں محمد اکبر خان و محمد افضل خان کو حکم دیا کہ ان لوگوں کی مدد کریں۔

چنانچہ یہ دونوں دو ہزار پیادہ اور سات سو سواروں بمعہ اٹھارہ چھوٹی توپوں کے خیبر کے لوگوں کی مدد کے لئے آ گئے۔ پہلے علی مسجد کے مقام پر جو جمرود سے ڈھائی کوس کے فاصلے پر ہے، مقام کیا۔ ادھر سردار مہاں سنگھ کو خبر مل گئی کہ کابل سے درانیوں کی فوج آ گئی ہے اور علی مسجد میں مقیم ہے۔

مہاں سنگھ نے سردار ہری سنگھ کو اطلاع دی۔ سردار ہری سنگھ نے یہ خبر مہاراجہ صاحب کو لاہور پہنچائی اور لکھا کہ پشاور کی امداد کے لئے فوج جلدی روانہ کی جاتے۔ چونکہ ان دنوں میں کنور نونہال سنگھ کی شادی کا سامان ہو رہا تھا، لہٰذا پشاور جانے کا کسی کو حکم نہ دیا گیا۔

اس اثنا میں درانیوں کی فوج موضع جناکی میں پہنچ کر خیمہ زن ہو گئی۔ ایک دن درانیوں کے چار پانچ سوار آئے اور سکھوں کے بعض سپاہیوں جو قلعہ جمرود سے باہر تالاب پر کپڑے دھونے کے لئے آئے تھے یا لکڑیاں لانے کے لئے گئے ہوئے تھے، قتل کر دیا۔ اس وقت دستور یہ تھا کہ ہر آٹھ روز کے بعد قلعہ جمرود کے سپاہیوں کی ڈیوٹی تبدیل ہوتی تھی اور ان کی جگہ ایک کمپنی قلعہ میں داخل ہو کر ان کی جگہ لے لیتی تھی۔ جب درانیوں نے سکھوں کے سواروں کو قلعہ کے نزدیک ہوتے دیکھا تو پہاڑ کی چوٹی سے بندوق چلانے کے لئے تیار ہو گئے۔ ان میں سے جو سپاہی قلعہ کی طرف گیا اس کو راستہ ہی میں قتل کر دیا اور جو اس کمپنی سے پیچھے رہ گیا وہ بچ گیا۔ اس حملہ کے بعد درانی سپاہی واپس چلے گئے اور ان کے چار پانچ سپاہی مارے گئے اور دو تین گھوڑے بھی رہ گئے۔ جمرود جانے والوں سے سکھوں کے چودہ سپاہی مارے گئے۔

اس قسم کا تنازعہ ہر روز ہوتا رہا اور آخر کار درانیوں کی سب فوج نے خیبر اور علی مسجد سے جمع ہو کر بارہ بیساکھ شروع ۱۸۹۲ بکرمی (مئی ۱۸۳۵ء) کو قلعہ جمرود کا محاصرہ کر لیا۔ قلعہ کے بارہ سو

سپاہی مسلح بہ بندوق تھے - ان میں آٹھ سو بندوق بردار سپاہی جنگ میں مقابلہ کے لئے تیار تھے باقی چار سو سپاہی بقالوں کی دوکانوں، دکانداروں، خدمت گاروں اور گھوڑے ٹٹوؤں کی حفاظت کے لئے مقرر تھے۔

درانیوں نے خیبر کے لوگوں کے ساتھ مل کر ایک دن مورچہ بندی کر کے بیٹھ گئے، اپنی تین توپوں کو انہوں نے جنوب مغرب کے مورچہ میں نصب کیا اور چھ توپوں کو مغرب میں - ان سب سے قلعہ پر گولہ باری شروع کر دی - چھ روز تک مسلسل گولہ باری سے قلعہ کی فصیل کی مغربی دیوار اور جنوب مغرب کا برج، بنیاد سے سر تک مسمار کر دیا - جس سے سوار گھوڑے کی دلکی چال سے دوڑ کر قلعہ کے اندر آسکتا تھا - جب قلعہ کی دیوار اور برج اس طرح سے مسمار ہو گئے تو محمد اکبر خان نے خیبر کے لوگوں کو بلا کر کہا، کہ تم نے میرے باپ امیر دوست محمد خان کے سامنے اقرار کیا تھا کہ جب قلعہ کی دیوار توڑ دی جائے گی تو تم خود حملہ کر کے قلعہ پر قبضہ کر لو گے - اب قلعہ کا ایک برج اور دیوار ہم نے گرا دی ہے، تو تم کیوں حملہ نہیں کرتے - خیبر کے لوگوں نے اپنے وعدہ کا اقرار کیا اور کہا کہ صبح بروز جمعرات ہم حملہ کریں گے -

قلعہ کے لوگ بہت تنگ ہو گئے - اگر کوئی محصور اپنی انگلی سے اشارہ کرتا تو اس کی وہی انگلی محاصرین کی گولی سے اڑا دی جاتی - اس طرح قلعہ کے لوگوں میں چودہ آدمی باہر کی گولیوں سے ہلاک ہو گئے - تبدیلی پہرہ پر قلعہ کے سپاہیوں کے سایہ کے نشان پر ہی باہر سے گولی آکر سپاہی کو لگ جاتی - قلعہ کے سپاہی اس خبر سے کہ کل ان پر حملہ ہونے والا ہے، بہت خائف ہوئے چنانچہ رات ایک گھڑی گزرنے کے بعد یہ تمام افسران، سپاہ سب یک جا جمع ہوئے اور سردار ہری سنگھ کو عرضی بھیجی کہ کل صبح بروز جمعرات ان پر حملہ ہوگا - اگر اس حملہ سے پہلے مدد پہنچ گئی تو خیر! نہیں تو قلعہ کے سب لوگ قتل ہو جائیں گے اور ہم سب سرکار کا حقِ نمک ادا کر دیں گے -

قاصد (سپاہی) کو پچیس روپیہ انعام دے کر رخصت کیا - وہ سپاہی کتے کی طرح ہاتھ پاؤں سے قلعہ کی دیوار سے چھلانگ لے کر باہر چلا گیا اور درانیوں کے مورچہ سے گزر کر پشاور پہنچ گیا - اس کے ساتھ یہ کہا گیا تھا کہ جب وہ پشاور پہنچ جائے تو ہماری تسلی کے لئے کر

ہماری عرضی سردار کو جب پہنچ جائے تو ایک توپ وہاں چلائی جائے۔

وہ سپاہی رات، دو گھڑی باقی تھی کہ پشاور پہنچ گیا اور عرضی دیوان والوں کو پہنچا دی۔ شیخ احمد منشی جو سردار ہری سنگھ کا دربکار نویس تھا، عرضی لے کر سردار ہری سنگھ کی خدمت میں پہنچانے کے لئے جلدی سے روانہ ہو گیا۔ عرضی کا حال بیان کیا اور حسب گفتہ سپاہی توپ کا ایک گولہ چلا دیا۔

قلعہ جمرود کے افسروں اور سپاہیوں کو یقین ہو گیا کہ ان کے سپاہی نے عرضی سردار ہری سنگھ کی خدمت میں پیش کر دی۔ وہ سارا دن امداد کے امیدوار رہے کہ ابھی امداد آتی ہے۔ لیکن سردار کی طبیعت ناساز تھی اور اس نے جلاب لیا ہوا تھا وہ سوار ہو کر موضع تہکال کے ساتھ والے برج (جس کو اب برج ہری سنگھ کہتے ہیں) میں، جو جمرود سے نصف کوس دور ہے میں آ کر شام تک دوربین سے حالات کا مشاہدہ کرتا رہا۔ دن کی چار گھڑی باقی تھی۔ افسرانِ قلعہ کے نام پروانہ لکھ کر اسی سپاہی کو دیا، کہ تم یہ قلعہ میں پہنچا دو اور اس کے لئے پچاس روپیہ انعام دیا اور پانچ روپیہ کے لئے قلعہ والوں کو لکھا کہ اس کو دے دو۔

اس سپاہی کی جوانمردی تھی کہ لوگ قلعہ سے باہر جانے کے آرزومند تھے۔ لیکن یہ پرواز لے کر قلعہ جمرود کے لئے روانہ ہو گیا۔

دن سے دو گھڑی وقت باقی تھا کہ قلعہ پر بیس ہزار خیبریوں کے سواروں کو نیزے دے کر روانہ کیا گیا اور محمد اکبر خان، خود ان کے پیچھے آ کر نمودار ہوا۔

چاروں طرف سے حملہ شروع ہو گیا اور قلعہ کے اندر کے سپاہیوں نے بھی بے دریغ فائر کرنے شروع کر دئے لیکن قضا و قدر یہ تھی کہ جب باہر سے گولیاں بارش کی طرح برس رہی تھیں لیکن قلعہ کے اندر کسی کو بھی کوئی زخم نہ پہنچا۔ قلعہ کے اندر ایک توپ تھی۔ اس سے اور ایک زنبورک سے گولے چلاتے رہے۔

خیبر کے سواروں سے تین سو کے قریب نے پیادہ پا ہو کر قلعہ کے دونوں طرف سے حملہ کیا۔ لیکن اندر سے گولیوں کی بوچھاڑ سے ان کی لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ ان کے بعد بیس سواروں نے حملہ کیا لیکن وہ بھی توپ اور بندوق کی گولیوں سے وہیں ڈھیر ہو گئے اور حملہ

ناکام ہو گیا۔ درانی فوج اور خیبر کے لوگ اپنے ڈیروں کو واپس چلے گئے۔

اس اثنا میں وہ سپاہی سردار ہری سنگھ کا پروانہ لے کر قلعہ میں داخل ہو گیا۔ جس سے قلعہ کے افسر بہت خوش ہوئے اور دلیر ہو گئے۔ پروانہ پڑھا۔ اس میں لکھا تھا کہ صبح جمعہ ہے، جس طرح بھی ہو سکے مقابلہ میں مستحکم رہیں۔ ہفتہ کے دن درانی فوج جہاں بھی ہو گی، اس کے سر پر پہنچ جاؤں گا۔

جب صبح ہوئی تو جمعہ کا دن تھا۔ خیبری اور درانی اپنے مردوں کی تجہیز و تکفین میں مصروف رہے اور جنگ کا کوئی خیال ہی نہ کر سکے اور توپ و بندوق بالکل بند رہے۔

ہفتہ کے دن صبح کے وقت سردار ہری سنگھ پشاور سے روانہ ہو کر دس ہزار فوج کے ساتھ نالہ باڑہ کے کنارے آ کر فروکش ہو گیا۔

جونہی کہ خیبری اور درانیوں نے سردار ہری سنگھ کی آمد اور کٹھہ باڑہ پر مقام کرنے کا سنا، تو فکر مند ہوئے اور اپنے مورچے قلعہ جمرود کے مشرق اور گوشہ شمال مشرق سے خالی کر کے فصیل کے مغرب اور گوشہ جنوب مغرب میں جمع ہو گئے اور تمام دن اپنے مورچوں کے بندوبست میں مشغول رہے اور سکھوں سے مزاحمت نہ کی۔ دن کے وقت چار پانچ گولے مارے جبکہ رات ہو گئی۔ رات کے وقت اس طرف سے بندوق کی گولیاں چلتی رہیں۔

قلعہ کا محاصرہ جو ۲۰ بیساکھ سے ۱۲ جیٹھ رہا اور بیس روز ہو چکے تھے کہ سردار نے اپنا ڈیرہ اٹھا کر قلعہ کے ساتھ لگا دیا۔ سردار مہاں سنگھ بمعہ افسراں قلعہ سے باہر نکل کر تعظیم بجا لایا اور عرض کی کہ آپ کا ڈیرہ آج یہاں ہی رہے۔ امید ہے کہ آپ کے اقبال سے رات کے وقت درانیوں کی فوج فرار ہو جائے گی اور اگر بر تقدیر وہ نہ گئی تو صبح تک فوج آرام کر لے گی اور ان سے برابر جنگ کی جائے گی۔

لیکن سردار ہری سنگھ نے فرمایا یہ کیوں؟ افیون کھانے سے پہلے ان کو تنبیہ و سزا دی جائے گی۔ خاطر جمع رکھو۔ نصف فوج کمر بستہ ہو کر قلعہ کے برجوں میں بیٹھ جائے۔ نصف کمر بستہ تیار رہے۔ اس تجویز پر عمل کریں۔

اس اثنا میں درانیوں کی جانب سے ایک گولہ آیا اور سردار کے لشکر کے دھونسہ مارنے والے کو لگا اور وہ گھوڑے سے نیچے گر گیا۔ ایک دوسرا گولہ آیا کہ کمیدان صوبہ سنگھ کی پلٹن

کے ایک خدمت گار کی گردن پر لگا اور وہ مر گیا۔ اور درانیوں کے سواروں نے حملہ کر دیا تو جمعدار خوشحال سنگھ کا ڈیرہ ان کے مقابل تھا۔ یہ میدان سے پیچھے ہٹے۔ جب سردار ہری سنگھ نے یہ دیکھا تو حکم سنگھ سندھوالیہ اور جواہر سنگھ جمعدار کو حکم دیا کہ وہ اپنی فوج سے اس کی (جمعدار خوشحال سنگھ کی) مدد کریں۔ اس پر حکم سنگھ و جواہر سنگھ دونوں نے اپنی فوج کے ساتھ سردار ہری سنگھ کے ڈیرہ سے گھوڑے دوڑا کر جمعدار خوشحال سنگھ کے ڈیرے کی مدد کے لئے گئے۔

دُرانّیوں کی شکست ان کے پہنچتے ہی درانیوں کے چند سوار گھوڑوں سے گر پڑے اور بعض مارے گئے اور درانی فوج کو شکست ہوئی۔ وہ ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ کی طرف جاتے اور اترتے رہے اور سکھوں کی فوج ان کا تعاقب کرتی رہی۔ اس طرح سے پانچ پہاڑی موریچوں سے ان کو نکال دیا۔ ایک مورچہ پر درانیوں کی چھ توپیں تھیں اور ان پر ہند و گولہ انداز تھے۔ انہوں نے سکھوں کی منت سماجت کی کہ ان کو قتل نہ کریں کہ ہم ان توپوں کے رخ درانیوں کی طرف کر کے ان پر گولہ باری کرتے ہیں اور اب ہم تمہارے نوکر ہیں۔ لیکن ان کی باتوں کو سکھوں نے نہ سنا ان کو قتل کر دیا اور توپوں کے گھوڑے، راشن اور اسباب کو لوٹ لیا۔ ان چھ توپوں پر سردار ہری سنگھ نے خود پہنچ کر قبضہ کر لیا۔ ان توپوں اور ان کے گھوڑوں کو قلعہ میں پہنچا دیا گیا۔

ہارسن فرنگی کی بیوی کا قتل اس اثنا میں سکھ ہارسن صاحب فرنگی کے خیمہ تک پہنچ گئے جس میں ہارسن کی بیوی بیٹھی تھی۔ اس پر تلوار اٹھائی تو اس نے کہا کہ میں عورت ذات ہوں اور عورتوں کا قتل کسی مذہب میں جائز نہیں۔ گرفتار کر کے لے جا سکتے ہیں۔ لیکن کسی نے اس کی بات نہ سنی اور اس کو قتل کر دیا گیا اور اس کا ڈیرہ لوٹ لیا۔

شمس الدین خان دُرّانی کے سواروں کا حملہ ناگاہ دوست محمد خان کا بھانجا شمس الدین خان تازہ دم ڈیڑھ ہزار سوار فوج لے کر علی مسجد سے نعرہ "بزن" "بزن" (مارو، مارو) لگاتے آن پہنچا۔

آتے ہی اس کا مقابلہ سردار ہری سنگھ کی فوج کے ہراول حکم سنگھ سے ہوا۔ حکم سنگھ کو پیشانی پر گولی لگی اور وہ مر گیا۔ اسی طرح اور بھی چند سوار کام آئے۔ اس مقام سے سواروں

نے بھاگنا شروع کیا۔ گولیوں سے بہت سے سوار زخمی ہوئے اور بہت سے مارے گئے۔

سکھوں کی شکست

درانی فوج کے سواران کے تعاقب میں آئے جہاں سردار ہری سنگھ کی فوج کھڑی تھی۔ ان سواروں کے آنے سے بہت سے پیادے گھوڑوں کے پاؤں تلے روندے گئے اور بہت سے سوار نیچے گر پڑے۔ اس افراتفری میں سکھوں کی فوج کو شکست ہو گئی جو قلعہ جمرود سے متصل نالہ کے کنارے پر کھڑی تھی۔ نالہ کے اندر ایک ہزار فوج تھی اور سردار خود دو پلٹنوں کے ساتھ کنارہ پر تھا۔ جہاں سردار بیٹھا تھا اس جگہ پر توپ کے گولوں سے بہت سے سوار بمعہ گھوڑوں کے اور بہت سے پیادہ مارے گئے اور توپ کے گولے دمبدم گر رہے تھے۔ اس پر جملہ افسران سردار کاہن سنگھ مجھیٹھیہ و ہر لوک سنگھ و امیر خان قصابان پلٹن نے سردار ہری سنگھ کی خدمت میں عرض کی کہ اس وقت جو فوج نالہ میں کھڑی ہے اس کو بار بار بلانے پر بھی وہ نہیں آتی حالانکہ ہم آپ کے پاس ہیں۔ آٹھ سوار مر چکے ہیں۔ باقی سب بھی مر جائیں گے۔ کہ توپ کے گولہ سے کسی کو امان نہیں ہے تجویز یہ ہے کہ اس وقت ڈیرہ یہاں سے اٹھائیں کہ افیون کھانے کا وقت ہے۔ کل ان درانیوں سے سمجھا جائے گا۔

سردار اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ اس کی فوج سے مقابلہ ہے اور اس کی سب فوج شکست کھا چکی ہے اور نالہ کے اندر کھڑی ہے اور اوپر نہیں آتی۔ ناچار پریم سنگھ اور امیر خان کی دونوں پلٹنوں کو کہا کہ میں اٹھ کر پہلے نالہ میں جاتا ہوں۔ جب میں پہاڑی کے اس طرف جاؤں تو تم سب تیار ہو کر مقابلہ کرنا اور پھر پلٹن کی سب فوج کے لوگ نالہ میں اتر آئیں۔ مگر یہ کام جلدی سے کریں کہ درانی فوج سر پر کھڑی ہے اور وہ ایک آدمی کو بھی جانے نہ دیں گے۔ بلکہ سب کو قتل کر دیں گے۔

سردار ہری سنگھ کا قتل

جب سردار اٹھا کہ سوار ہو جائے۔ ابھی اس کا پاؤں رکاب میں ہی تھا کہ دونوں پلٹنیں کنارہ سے کود کر نالہ میں گر پڑیں۔ یہ دیکھتے ہی درانیوں کے سوار فوراً اس جگہ پر آ گئے اور بندوقیں چلانی شروع کر دیں۔ اس طرح بہت سے لوگ نالہ کے اندر مارے گئے۔

سردار ہری سنگھ پچیس قدم ہی اس طرف آیا ہوگا کہ اس نے دیکھا کہ تین توپیں ہیں۔ ان میں سے ایک ٹوٹی ہوئی ہے اور دو گھوڑے موجود ہیں۔ وہاں کھڑے ہو کر اس نے پوچھا کہ ان کے گھوڑے کہاں ہیں اور توپ خانہ کا کمیدان کہاں ہے۔ گولہ اندازوں نے کہا کہ کمیدان بھاگ گیا ہے اور توپ خانہ کے گھوڑوں کو قلعہ کی طرف لے گئے ہیں اور واپس نہیں آئے۔

سردار نے کھڑے ہو کر کہا کہ توپوں کو بے کار کر دو۔ ایسا نہ ہو کہ ان کو چھوڑ جاؤ۔ کہ اتنے میں توپوں کے گھوڑے آ گئے۔ ان کو توپوں کے آگے باندھ دیا۔ لیکن طرفین سے توپ و بندوق کی گولہ باری سے گھوڑے بدکتے رہے۔ کبھی شمال اور کبھی جنوب کی طرف ہو جاتے۔ ناگاہ درانی سواروں نے ایک بار بندوقیں چلانی شروع کر دیں کہ سردار کے پیٹ اور چھاتی کے بائیں طرف گولیاں لگ گئیں۔ پہلی گولی سے زرہ، جو سردار پہنے ہوئے تھا کی کنڈیاں جسم کے اندر داخل ہو گئیں اور سردار کا کام تمام کر دیا۔ لیکن سردار کے پس ماندگان کی زندگی لمبی تھی کہ سردار اس نالہ کے میدان میں سوار آ کر نالہ کے کنارے پر قلعہ کی جانب پہنچ گیا۔ اگرچہ اس کے سر کا خود اور پگڑی نیچے گر پڑی۔ لوگ دوڑ کر قلعہ کے دروازے سے چارپائی لے آئے اور سردار کو اس پر ڈال کر قلعہ کے اندر ایک کونے میں چھپا کر رکھ دیا اور آواز دی کہ سردار زخمی ہوا ہے، مگر زندہ ہے اس کو دوائی اور مالش بدستور کی جاتی رہی۔

درانیوں کی جانب سے توپ و بندوق کی جنگ شام تک جاری رہی۔ سکھوں کی فوج سے بہت سے لوگ مارے گئے۔ شام کے بعد سکھوں کی فوج نے اپنا ڈیرہ قلعہ کے ساتھ دیری (دیر: جائے عبادت ہندواں۔ مترجم)، جو پرانے قلعہ جمرود، جس کو اب قلعہ نو کہتے ہیں کے ساتھ لگایا۔

قلعہ جمرود میں پانی کی تنگی

قلعہ کے اندر فوجیوں کو پانی کی تکلیف تھی اور جب فوج نے ڈیرہ دیری کے ساتھ لگایا تو وہاں تو پانی کے نالہ پر درانیوں کا قبضہ تھا۔ جب وہ چاہتے تو کٹھ کو توڑ کر پانی دوسری طرف کر دیتے۔ اس پر افسران نے غور کیا۔ پہلے تو ان کا مشورہ یہ کہ پشاور جائیں اور وہاں مقام کریں۔ لیکن سردار مہاں سنگھ نے نہ مانا اور اس پر بضد رہا کہ یہاں ہی رہیں گے۔ لاچار سب لوگ بیٹھ گئے۔ قلعہ کے اندر ایک ہی تالاب تھا کہ اس کے کیچڑ اور جو پانی تھا، اپنے اردگرد مورچہ بنانے پر خرچ کر دیا۔ یہ کام

ساری رات ہوتا رہا۔ رات کی ایک گھڑی باقی تھی کہ قدرتِ الٰہی سے بارش شروع ہوگئی جو ایک دن اور دو رات برابر جاری رہی اور وہ تالاب جس سے سب پانی اور کیچڑ بھی تعمیر پر ختم ہوگیا تھا، پانی سے بھر گیا۔ جو فوج کے لئے دو تین ماہ تک کے لئے کافی تھا۔ اس پر لوگوں کو اطمینان ہوگیا۔ مگر آٹے دانہ کی تنگی ہوگئی۔ یہاں تک کہ ایک روپے کا تین پاؤ آٹا بھی میسر نہ آتا تھا اور قلعہ میں جتنی جنس غلہ گندم کی تھی وہ سردار مہاں سنگھ نے تمام لشکر پر تین سیر فی روپیہ فروخت کردی۔ جس سے لوگوں کو تقویت ملی۔ لیکن اس کی قیمت جمعدار خوشحال سنگھ کے آنے پر وصول نہ کی۔ کیونکہ جمعدار نے کہا کہ فوج سرکاری خدمت پر مقرر تھی، لہٰذا اس غلہ کی قیمت پشاور کے بھاؤ پر دی جائے گی۔ فوج دس دن تک مورچہ میں بیٹھی رہی۔ اس کے دو تین دن بعد پشاور سے ونتورہ صاحب بہادر بمعہ اپنی پلٹنوں اور جمعدار خوشحال سنگھ و کنور کھڑک سنگھ و کنور نونہال سنگھ اور راجہ دھیان سنگھ بہت سی فوج کے ساتھ آگئے۔

دُرانیوں کی مراجعت کابل

اسی دن درانیوں نے اپنا ڈیرہ اٹھا کر چنا کی لے گئے۔ سکھوں کی فوج کا ڈیرہ جمرود سے اٹھ کر کٹھ کے اوپر آگیا۔ سب لشکر کٹھ بارہ پر جمع ہوگیا۔ چند روز یہاں آرام کرنے کے بعد قلعہ جمرود کی مرمت کی۔

کرڑالوں کا قلعہ ناڑہ کا محاصرہ اور مہاں سنگھ کی پشاور سے آمد

چند دنوں بعد ہزارہ سے خبر آئی کہ کرڑالوں نے قلعہ ناڑہ کا محاصرہ کرنے کے بعد اس کو فتح کر لیا ہے۔ تھانہ دار اور کچھ سپاہیوں کو قتل کر دیا ہے اور بعض سپاہی مفرور ہوگئے ہیں۔ اس پر مہاراجہ دھیان سنگھ و کنور نونہال سنگھ نے سردار مہاں سنگھ کو بمعہ رجمن سوک صاحب اور ہزارہ کی طرف بھیجا اور ادھر سے مہاراجہ صاحب والئی لاہور کی جانب سے جواہر سنگھ و بابا عطر سنگھ چند سواروں کے ساتھ ہزارہ میں آگئے۔ مہاں سنگھ نے ہزارہ میں پہنچ کر کرڑالوں سے قلعہ ناڑہ خلاص کرالیا اور از سرِ نو اس میں تھانہ بٹھا دیا۔

اس کام سے فارغ ہوکر سردار مہاں سنگھ پکھلی کی طرف روانہ ہوگیا اور مانسہرہ میں قیام کیا۔ چند روز کے بعد رجمن سوک صاحب ناراض ہوکر لاہور کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس کے بعد ہری سنگھ کی جو پلٹن مہاں سنگھ کے ساتھ تھیں، وہ بھی بغیر اجازت لاہور روانہ ہوگئیں۔

ایام برسات گزرنے اور دسہرہ کے بعد مہاراجہ والئی لاہور میانی اور پنڈ دادنخان کی طرف تشریف لے گئے اور سردار مہاں سنگھ کو حکم پہنچا کہ وہ ایک لاکھ روپیہ نقد، پانچ گھوڑے بمعہ زین طلائی و چاندی، پانچ اونٹ، دو باز، پانچ شکاری کتے اور بیس خچریں لے کر مہاراجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو جائیں - ان کے لانے کے لئے مہاراجہ صاحب کا اردلی دیوا سنگھ پسر مہاں سنگھ داسووالہ کو بھیجا گیا تھا -

۱۱ کاتک ۱۸۹۴ بکرمی (۱۸۳۷ء) مہاں سنگھ ہزارہ میں اپنے چھوٹے بھائی صوبا سنگھ کو چھوڑ کر سب سامان بغیر نقدی کے لے کر مہاراجہ کے ڈیرہ میانی کی طرف روانہ ہو گیا -

تیجا سنگھ کا عہد ۱۸۳۷ء تا ۱۸۴۱ء

چونکہ وہ کچھ نقد روپیہ ساتھ نہ لے گیا تھا مہاراجہ صاحب کا اس پر عتاب ہوا اور اس کی جگہ سردار تیجا سنگھ پوربی کو معہ دو رجمنٹ اور ایک کمپنوہ آٹھ پلٹنوں کے ہزارہ جانے کا حکم ہوا. وہ ہزارہ میں آیا - صوبا سنگھ نے قلعہ کا چارج دے کر تیجا سنگھ سے رسید حاصل کر لی - یہ رسید سردار مہان سنگھ نے راجہ دھیان سنگھ کی معرفت پہنچا دی - تیس ہزار روپیہ سرکار کی جانب سے مہاں سنگھ کے لئے مقرر تھا، اس کو ادا کر دیا گیا -

۱۸۳۷ء سے تا ۱۸۴۱ء ہزارہ کا معاملہ سردار تیجا سنگھ کی معرفت سے وصول ہو کر داخل خزانہ سرکار ہوتا رہا -

پائندہ خان کی آمد ہزارہ اور جاگیر کا مطالبہ

پائندہ خان اپنے لشکر کے ساتھ تین چار ہزار افغانوں کو لے کر دریائے سندھ عبور کر کے بھاروکوٹ میں آ گیا اور اس سے متصل گاؤں جوڑا پنڈ میں ڈیرہ لگایا اور سکھوں کے اہلکاروں کو جواب بھیجا کہ آٹھ ہزار کی جاگیر جو سردار تیجا سنگھ نے اس کو دی تھی وہ لا کر حوالہ کریں، نہیں تو واپس نہیں جاؤں گا اور آٹھ ہزار روپیہ اس ملک کے لوگوں سے لے لوں گا -

چنانچہ سردار تیجا سنگھ نے اپنے اہل کاروں کو لکھا کہ اگر نقرہ گھوڑا دے تو جاگیر کا روپیہ دے دیں - اگر یہ نہ دے تو کچھ بھی ادا نہ کریں - یہی جواب پائندہ خان کو سردار تیجا سنگھ نے لکھا جو اس نے اپنے اہلکاروں کو لکھا تھا کہ تم حسب وعدہ اپنی جاگیر، سفید گھوڑا بطور نذر دے کر

لے سکتے ہو۔ ان حالات میں پائندہ خان بھاروکوٹ میں آیا۔ سکھوں کے پاس فوج کم تھی اور اندرونی طور پر ملکی لوگ غلام خان ترین، سیدان صوابی وتنولی و دلازاک اور ترک، پائندہ خان سے ملے ہوئے تھے۔ چنانچہ اہلکاران حکومت نے ایک ہزار سوار اور پیادہ ملکی جمع کرکے کھلابٹ میں مقرر کردیئے۔ لیکن باوجود ان کے وہاں ہونے کے پائندہ خان اپنے چار سو سواروں کے ساتھ واڑی کی زیارت پر آیا اور سلام کرکے واپس اپنے ڈیرہ موضع جوڑہ تنڈ میں چلا گیا۔ لیکن ان ملکی حشری ایک ہزار مسلح ملازموں نے اس پر ایک فائر بھی نہ کیا۔ اس وجہ سے اہلکاران فکرمند ہوئے کہ فوج کم ہے۔ اگر پائندہ خان کے مقابلے میں جائیں تو یہی ملکی لوگ سب اس سے مل جائیں گے تو ہمارے ان چار سو فوجی سواروں کو شکست ہو جائے گی۔ اس کے بعد قلعہ ہری پور کی حفاظت بھی مشکل ہو جائے گی۔ اس خیال سے جنگ نہ کی اور ایک فصل کی جاگیر کا چار ہزار روپیہ پائندہ خان کو دے کر واپس کردیا اور واپس جاکر ہری پور کے مہاجنوں، ملکوں اور رئیسوں کو لکھا کہ ایک روپیہ فی گھر ہزارہ سے پکھلی تک ادا کریں۔ اس طرح سے چار ہزار روپیہ کی جگہ سولہ ہزار روپے ملک سے وصول کرلئے۔

پیارا سنگھ کاردار کی آمد

ہزارہ ابتدائے ربیع ۱۸۹۰ بکرمی نہایت ۱۸۹۶ بکرمی سردار تیجا سنگھ کے تحت رہا اور ۱۸۹۷ بکرمی میں پیارا سنگھ برہان کو اس ملک کا کاردار بنا کر بھیجا گیا۔ اس وقت غلہ کا نرخ گراں تھا۔ لہٰذا اس نے آتے ہی سب ملک کا معاملہ سب ٹپیوں پر چار لاکھ مقرر کردیا۔ لیکن جب موسم خریف میں بارش خوب ہوگئی اور غلہ ارزاں ہو گیا تو وہی پرانا معاملہ ڈیڑھ لاکھ ہی کل ملک سے وصول ہو سکا۔ سب مستاجر ملک سے فرار ہوکر پشاور چلے گئے اور کچھ لوگ دوسرے علاقوں میں جاکر چھپ گئے۔ معاملہ وصول نہ ہو سکا۔ سال ۱۸۹۹ بکرمی مطابق ۱۸۴۲ء میں مہاراجہ شیر سنگھ والئی لاہور تھے تو انہوں نے ہزارہ کا ملک اپنے بیٹے کنور پرتاپ سنگھ کو جاگیر میں دے دیا۔

ہزارہ راجہ گلاب سنگھ کے حوالہ کردیا گیا

چنانچہ کنور پرتاپ سنگھ معہ راجہ گلاب سنگھ والئی جموں، دیوان مولراج اور سردار بوڑ سنگھ کشمیر میں فوج کی شورش کو ختم کرکے، کشمیر سے ہزارہ میں آئے اور ہزارہ کا ملک راجہ گلاب سنگھ

کے حوالے کر دیا گیا۔ راجہ گلاب سنگھ نے اپنے اہل کار میاں اربیل سنگھ کو یہاں مقرر کر دیا۔

کنور پرتاپ سنگھ اور راجہ گلاب سنگھ کی ہزارہ میں آنے کی وجہ

جب پیارا سنگھ کو سردار تیجا سنگھ نے ۱۸۹۰ بکرمی میں کاردار مقرر کیا تو اس نے آتے ہی معاملہ کے معاملے پر سختی شروع کر دی۔ زمینداروں کو گرفتار کر کے جرمانے شروع کر دیئے اور ایک شخص مسمی زبرو ساکن شیروان کو توپ سے اڑا دیا اور ایک زمیندار مسمی مراد کو اتنا زدوکوب کیا کہ وہ مر گیا۔

پائندہ خان سے جنگ

جب بعض امورات کے تصفیہ کے لئے دو پلٹن ایک میہاں سنگھ اور دوسری بدری ناتھ کے ساتھ پیارا سنگھ کولائی علاقہ کی طرف گیا تو پائندہ خان نے دریا کے اس طرف سے اس پار ڈیرہ اور کربلیاں کے گاؤں میں آ کر ان دو پلٹنوں کو توپ اور بندوق کے فائر سے اتنا تنگ کیا کہ وہ عاجز آ گئے۔

ان دنوں میں سردار شام سنگھ اٹاری والے کا ڈیرہ اور اربل سنگھ پشاور سے واپس آتے ہوئے ہزارہ میں آ گئے۔ ان کا حکم تھا کہ اگر ہزارہ میں کسی مدد کی ضرورت ہو تو وہ بہم پہنچائیں۔ لہٰذا یہ دونوں سردار، پیارا سنگھ کے پیغام کے مطابق سرکاری پلٹنوں سمیت ہزارہ میں آ گئے۔

دریائے سندھ میں ۱۸۴۱ء کا طوفان

انہوں نے آ کر دریائے اباسندھ کے کنارے پر اپنے ڈیرے لگائے کہ ناگاہ ۱۲، جیٹھ ۱۸۹۸ بکرمی مطابق ۱۲، جون ۱۸۴۱ء کو دریائے سندھ میں ایسی طوفانی طغیانی آئی کہ کنارے پر فوج کے ڈیرے کا بہت سا اسباب، توپیں، چھوٹا توپ خانہ، گھوڑے، اونٹ اور آدمی سب غارت ہو گئے۔ دن سے چھ گھڑی باقی تھے کہ طوفان آیا۔ اگر رات ہوتی تو ایک جانور بھی زندہ نہ بچتا۔ دن تھا اور فوج جنگ کے لئے پائندہ خان کے مقابلہ پر گئی ہوئی تھی اور چند کمزور اور بیمار سپاہی ڈیرہ میں تھے۔ ان سب کو خیموں، قناتوں، توپوں وغیرہ کو پانی بہا لے گیا۔ چنانچہ اس کے بعد رات کو امیر، غریب اور فقیر سب ننگی زمین پر سوئے۔ نہ کسی کا بسترہ رہا، نہ قالین۔ سب یکساں ہو گئے۔ دریا کا یہ جوش دن کے چھ گھڑی باقی سے آدھی رات تک قائم رہا۔ آدھی رات کے بعد کچھ کم ہوا۔ جب صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ قلعہ دربند، گڑھی، انب و تربیلہ سب کو دریا بہا لے گیا۔ ان سے چند سکھ باقی رہے اور

اور گلی میں سب ریگستان رہ گیا۔

چند دن فوج یہاں ہی رہی اور قلعہ درتید کو پھر سے درست کر کے تھانہ مقرر کر دیا۔ اس کے بعد وہاں سے روانہ ہو کر ہزارہ میں آ گئے۔ میاں اربیل سنگھ ہزارہ میں رہ گیا اور سردار شام سنگھ اٹاری والا لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔

کنور پرتاپ سنگھ اور راجہ گلاب سنگھ کی ہزارہ میں دوبارہ آمد

جب کنور پرتاپ سنگھ، اور راجہ گلاب سنگھ مظفر آباد میں آ گئے تو یہاں اربیل سنگھ ان کے استقبال کے لئے وہاں گیا۔ وہاں سے کنور موصوف اور راجہ گلاب سنگھ پکھلی میں آ گئے۔ چند روز شنکیاری میں ٹھہرے۔ اس کے بعد کوہستان کی طرف گئے اور وہاں پائندہ خان یا اس کے بیٹے کو آنے کے لئے پیغام بھیجا۔ لیکن پائندہ خان نے پہلوتہی کی۔ نہ خود آیا اور نہ ہی بیٹے کو بھیجا۔ اس پر ناچار پائندہ خان کے بھائی مدد خان کو جس سے پائندہ خان نے اس کا ملک چھین لیا ہوا تھا اور وہ ناراض بیٹھا ہوا تھا، کو بلایا۔ وہ چونکہ پائندہ خان سے دل برداشتہ تھا، حاضر ہو گیا۔

پائندہ خان کا ملک اس کے بھائی مدد خان کو دیا گیا

اس کی مدارات وغیرہ کر کے اس کو سرفراز کیا اور جو ملک پائندہ خان کے ماتحت تھا وہ سب مدد خان کے حوالے کر دیا اور ایک خط جس پر کنور پرتاپ سنگھ کی کی مہر لگی ہوئی تھی، جس پر کنور پرتاپ سنگھ کی مہر لگی ہوئی تھی، لکھ کر دے دیا کہ ملک تنول کی خانی اور ریاست مدد خان کو دی گئی ہے۔

اسی وقت مدد خان کو ملک پر قبضہ دے دیا اور اس پر پائندہ خان کا قبضہ نہ رہا اور اس کو ملک بدر کر دیا گیا۔ صرف انب کا خانگی قلعہ اور زمین اس کے قبضہ میں رہ گئی۔ جس کی کاشت سے وہ قوت لایموت حاصل کرتا رہا۔ تمام جاگیر و اختیار مدد خان کو حاصل ہو گیا۔

دیوان مول راج حاکم ہزارہ ہوا

سال ۱۸۹۸ بکرمی، ۱۸۹۹ بکرمی کے گزر جانے اور ابتدائے سال ۱۹۰۰ بکرمی مطابق ۱۸۴۳ء میاں اربیل سنگھ لاہور چلا گیا اور دیوان مول راج ملک ہزارہ کا ناظم مقرر ہو گیا اور ابتدائے لغایت ۱۹۰۰ بکرمی ملک

کا نظم ونسق و عدالت و وصولی معاملہ بہت اچھے طریقہ سے کیا۔ رعایا کو اپنی مہربانی کا مشکور بنایا مظلوموں کی حق رسی کی اور حق و انصاف سے عدالت کی۔ سب لوگ دیوان موصوف کی عدالت اور حکومت سے راضی و شاکر تھے اور اس کی بقا کے لئے دعائیں کرتے تھے۔

پائندہ خان کا حملہ

ان دنوں میں پائندہ خان نے جو اپنی جاگیر سے خارج کیا ہوا تھا۔ افغانوں کو جمع کر کے کچھ فساد برپا کرایا۔ دو پلٹنیں جو شنگڑھی اور بھوہار میں تھیں مقابلہ کے لئے روانہ ہوئیں۔ اور پائندہ خان کو شکست ہو گئی۔ اسی غم سے وہ فوت ہو گیا۔

مہاراجہ شیر سنگھ اور کنور پرتاب سنگھ کا قتل

مہاراجہ شیر سنگھ اور کنور پرتاب سنگھ، باپ بیٹا دونوں اول ماہ اسوج ۱۹۰۰ء بکرمی مطابق ۱۲ ماہ ستمبر ۱۸۴۳ء لاہور میں اجیت سنگھ و لہنا سنگھ سندھانوالیوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ ان کے قتل کی خبر سن کر اسی دن دیوان مولراج تپ محرقہ سے بیمار ہو گیا۔ ابتدائے ماہ اسوج تا مگھر، تین ماہ تک بیمار رہا۔ آخر کار طبیبوں کی دواؤں، حکیموں کے شربت اور معجون اور پیروں فقیروں کے منتروں سے اس کو کچھ افاقہ ہوا۔ چونکہ راجہ گلاب سنگھ کو دو دفعہ ملک ہزارہ دیا گیا لیکن اس سے کچھ اچھا انتظام نہ ہو سکا۔ اس وجہ سے اس کے دل میں غیرت تھی۔

بنوں کا حاکم ہزارہ ہونا

جب وہ اس شورش و باہمی کشمکش سکھاں کے وقت لاہور گیا تو اس وقت راجہ ہیرا سنگھ کہ سلطنت لاہور کے بست و کشاد کا مالک تھا، سے اپنے ایک منشی وزیر بنوں جو اس کا خانہ زاد تھا، ہزارہ کے حاکم مقرر کرنے کا حکم لکھوا لیا۔

ہری پور سے ۵ میل مغرب میں سڑک جرنیلی

جس دن وزیر بنوں ہزارہ میں داخل ہوا اسی روز مولراج ہزارہ سے رخصت ہو گیا اور موضع پنیآں میں ڈیرہ کیا اور صبح کو لاہور کے لئے روانہ ہو گیا۔ جب لاہور پہنچ گیا تو راجہ ہیرا سنگھ ناراض ہوا کہ بغیر طلب کس طرح لاہور آ گئے ہو لیکن اس زمانہ میں کسی کا آتنا رعب نہ تھا۔ لیت و لعل میں چند دن گزارے اور پھر حکومت ہزارہ پر سرفراز ہو کر ہزارہ میں آیا۔

مول راج پھر حاکم ہزارہ ہو کر آیا

مولراج کے آنے تک وزیر بنوں اور معز اللہ خان معتبران راجہ گلاب سنگھ قلعہ ہرکشن گڑھ میں رہتے تھے۔ معاملہ دیوان مولراج کے لاہور سے سرفراز ہونے کا سن کر مالیہ ربیع ۱۰۱ بکرمی کا جمع کر کے قلعہ بند ہو گئے۔

دیوان مولراج لاہور سے روانہ ہو کر موضع دیوآل اپنے مسکن میں آ کر دو ماہ تک وہاں رہا۔ پنڈت چیلارام نے جو راجہ ہیرا سنگھ کا وزیر تھا، مولراج کو بار بار لکھا کہ وہ جلدی جا کر قلعہ ہری پور خلاص کرائے۔ چنانچہ حکم کے مطابق مولراج، دیوال سے چل کر ہزارہ میں داخل ہوا۔ اس نے پہنچتے ہی معز اللہ خان اور وزیر بنوں جو راجہ گلاب سنگھ کے معتمد تھے، کو پیغام پر پیغام بھیجا کہ قلعہ خالی کر دیں۔ لیکن انہوں نے جواب دیا کہ موت سے پہلے ہم قلعہ خالی نہ کریں گے۔

آخر کار ہزارہ کے سب لوگ جمع ہوئے۔ قلعہ کے گرد مورچہ سنبھال کر محاصرہ کر گیا۔ آٹھ دن ان کے مابین توپ، بندوق اور چھوٹی توپوں سے گولہ باری ہوتی رہی۔ انجام کار سردار کاہن سنگھ مجھیٹیہ کے ذریعے بات چیت کرنے کے بعد قلعہ انہوں نے خالی کر دیا اور جموں کو چلے گئے۔ مولراج قلعہ میں داخل ہو گیا۔ معاملہ خریف ۱۰۱ بکرمی کی تحصیل کا حکم جاری کر دیا۔ اس کے چند روز بعد آٹھ پلٹنیں گلاب سنگھ ہو دووالہ اور بدھ سنگھ مان کے تحت ہزارہ میں آئیں تو مولراج ان پلٹنوں کو ہمراہ لے کر ہزارہ سے گڑھی حبیب اللہ کی طرف جا کر وہاں قیام کر گیا۔

راجہ ہیرا سنگھ کا قتل

وہاں اس کو خبر ملی کہ راجہ ہیرا سنگھ اپنے وزیر پنڈت چیلارام اور راجہ گلاب سنگھ کے دیوان میاں سوہن سنگھ کو فوج نے قتل کر دیا ہے اور لاہور کی ریاست کو راجہ دلیپ سنگھ کے ماموں جواہر سنگھ کے حوالے کر دیا ہے۔

یہ خبر سنتے ہی چاروں پلٹنیں جو بدھ سنگھ مان کے ماتحت تھیں، خود بخود لاہور کو روانہ ہو گئیں۔ کچھ دنوں کے بعد سردار کاہن سنگھ مجھیٹیہ بھی لاہور کی طرف روانہ ہو گیا اور مولراج ہزارہ کو واپس آ گیا۔

پیرانِ پلاسی کی شورش

کچھ مدت کے بعد گلاب سنگھ اور بدری ناتھ ہزارہ چھاؤنی میں آئے ان دنوں پیران پلاسی نے شورش کھڑی کر کے قلعہ ماڑی کو قبضہ میں کر لیا تھا۔ جس کو ان دونوں پلٹنوں نے آتے ہی قلعہ ماڑی کو حسب سابق قائم کر دیا۔

ان پلٹنوں کی آمد سے پہلے مولراج کے چار سو سپاہی مسلح بہ بندوق پیران پلاسی کی تنبیہ کے لئے براہ ناڑہ کرڑالاں بھیجے ہوئے تھے اور راجہ علی بہادر خان، خان پور والا کو ملکی لوگوں کو بطور حشری براہ دیرہ کوٹ پیران پلاسی کے قبضہ کردہ گاؤں کی طرف بھیجا۔

پیران پلاسی اور حسن علی خان کرڑال نے باہمی مشورہ سے علی بہادر خان برادر راجہ علی گوہر خان کو قتل کر دیا اور بعد میں جو فوج ناڑہ کی طرف گئی ہوئی تھی۔اس سے جنگ شروع کر دی اور اس فوج کے تقریباً ڈیڑھ سو سپاہی قتل کر دیئے۔ناڑہ کی اس فوج کے فرار ہونے کے بعد اس کا تعاقب بگڑہ کے گاؤں تک کیا۔اس جنگ میں سخت شکست ہوئی۔

ان دو پلٹنوں کے بروقت پہنچنے پر ماڑی کے قلعہ پر پھر قبضہ کر کے اس میں تھانہ مقرر کر دیا۔ اس کے بعد یہ دونوں پلٹنیں ہزارہ میں آگئیں اور دریائے دوڑ[1] کے کنارے پر چھاؤنی ڈال دی۔مولراج نے بہتیرا کہا، کہ پکھلی کی طرف جائیں کہ وہاں فساد پیدا ہو گیا ہے اور وہاں جانا ضروری ہے۔لیکن وہ اس طرف نہ گئے۔

فوجوں کا گڑھی حبیب اللہ جانے سے انکار

گڑھی حبیب اللہ کی طرف کاہگان دکاغان (مترجم) کے سید اور خلیفہ سید احمد شاہ کے پس ماندہ مجاہدین نے وہاں فساد برپا کر رکھا ہے۔لیکن یہ پلٹنیں مولراج کے کہنے پر اس طرف نہ گئیں۔ ناچار نواب خان کو بمعہ حشرات ملکی اور اپنے ملازموں اور سپاہیوں کے ساتھ گڑھی حبیب اللہ کی طرف بھیجا۔اگرچہ نواب خان ظاہری طور پر سپاہ کے ساتھ مدد کے لئے گیا۔لیکن اندرونی طور پر کاہگان سے گندگر تک کے رئیسوں کو خط لکھے، تاکہ باہمی مشورہ سے کام کریں۔

نواب خان کا تقرر

اور مولراج کی طرف بھی ایک دو دفعہ لکھا کہ یہ کام سخت ہے اور مزید فوج بھیجیں۔لیکن فوج نے مول راج کا حکم نہ مانا اور کوئی بھی نہ گیا۔

نواب خان کی مخالفت اور پکھلی میں فسادات

نواب خان قلعہ گڑھی حبیب اللہ کو چھوڑ کر اور سپاہیوں کو اپنے ساتھ لے کر تنول میں چلا گیا اور درہ کونش وٹگری، اندھیاڑ اور کاہگان کے دروں میں شورش کھڑی ہو گئی۔

---

[1] قلعہ بھارو کوٹ

محاصرین نے قلعہ شنکیاری کے سپاہیوں کو قسم و قرآن سے باہر نکال لیا۔ جب وہ باہر آ گئے تو تھانہ دار اور سب سپاہیوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا اور ان کا سب اسباب لوٹ لیا۔ اس کے بعد اگرور کی گڑھی اور تھانہ بھیڑ گنڈ کے سپاہیوں کو بھی قتل کر دیا۔

لیکن مانسہرہ کے قلعے کے تھانیدار نے، جو ایک ضعیف شخص تھا، جب دیکھا کہ سب تھانوں کے سپاہی قتل کئے جا رہے ہیں تو حکمت عملی سے چند مقامی زمینداروں کو کچھ دے دلا کر آدھی رات کے وقت قلعہ سے باہر آ کر بسلامت ہزارہ پہنچ گیا۔

نواب خان کا قلعہ شیروان پر حملہ

نواب خان نے شیروان میں آتے ہی ندھان سنگھ تھانہ دار قلعہ شیروان پر حملہ کر کے اس کو قید کر لیا۔ گھوڑے، نقدی و جنس، جو کچھ کہ قلعہ میں تھا کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔

اس پر مولراج نے حیات خان ترک ساکن مانکرائے، جو نواب خان کا بہنوئی تھا کو بمعہ نواب خان کی بہن گرفتار کر کے قلعہ ہری پور میں لے آیا۔ جب نواب خان تنول کے معاملات سے فارغ ہوا تو انہی ایام میں مشوانیوں نے بھی قلعہ سری کوٹ کو آزاد کرا لیا۔

مشوانیوں اور کرڑالوں کی شورش

کرڑالوں کے قلعے ماڑی و ناڑہ اور خان پور کا قلعہ بھی لوگوں نے آزاد کرا لئے۔

قلعہ ہرکشن گڑھ کا محاصرہ

یہ سب لوگ مل کر قلعہ ہرکشن گڑھ پر حملہ آور ہوئے، حالانکہ مولراج نے فوج کو کہا تھا کہ گڑھی کے فساد کا ازالہ کریں، جو انہوں نے نہ کیا اور یہ فساد بڑھ کر سب ملک میں پھیل گیا۔

مولراج کو کہا گیا کہ قصبہ ہری پور کے کھتریوں کو حکم دے دو کہ جو کوئی جدھر جانا چاہتا ہے سامان لے کر باہر چلا جائے۔ وہ کسی کو منع نہیں کرے گا۔ لیکن مولراج نے یہ مشورہ نہ مانا اور شہر کے دروازوں پر پہرہ بٹھا دیا کہ اگر کوئی شخص کوئی چیز باہر لے جائے تو اس کو گرفتار کر کے لاؤ۔ اس خوف سے کسی شخص سے ایک سوئی بھی باہر نہ بھیجی۔

نواب خان وغیرہ تنول، پھر ماڑی اور رواندھی وغیرہ دیہات میں جمع ہوئے۔ غلام خان ترین بمعہ مشوانیوں وغیرہ کے کھیل میں آ گئے۔ سب کرڑال اور جدون مواضعات موبری بھیڑی

علاقہ سرائے صالح میں جمع ہو گئے۔

اس پر دونوں پلٹنوں کے خوف سے چھاؤنی (بھاروکوٹ برلب دریائے دوڑ بالمقابل موضع تھپلہ۔ اب یہ مقامات تربیلہ ڈیم کی وجہ سے زیر آب ہیں۔ مترجم)، کو چھوڑ کر قلعہ ہری پور کی فصیل کے ساتھ مشرق کی طرف آکر ڈیرہ کیا اور اپنے چاروں طرف خاربندی کر کے بیٹھ گئے اور مطمئن ہو گئے۔

۲۰ ماہ پھاگن ۱۹۰۴ بکرمی مطابق ۱۸۴۵ء ملکی لوگوں نے چاروں طرف سے رات شروع ہوتے ہی ہری پور شہر پر حملہ کر دیا۔ اس شہر کے سب لوگ بمعہ زن و بچہ قلعہ میں داخل ہو گئے اور جو سامان فوری طور پر از قسم زیور و کپڑے اٹھا کر لا سکتے تھا، ساتھ لے آئے۔ باقی سب سامان اجناس بیوپا یا غلہ اور کپڑے لاکھوں روپے کا سامان غارت ہو گیا۔

غلام خان ترین کا قبضہ ہری پور

پلٹنوں سے دو آدمی جو شہر ہری پور میں مقرر تھے، نے مقابلہ کیا۔ لیکن بے شمار لوگ جب چاروں طرف سے حملہ آور ہو گئے تو وہ بھاگ کر اپنی پلٹنوں میں آ گئے اور شہر میں غلام خان ترین نے اپنا ڈیرہ بنا لیا۔

چنانچہ ہزارہ کے سب لوگ اور مشوانی غلام خان کے ساتھ تھے۔ تمام تنول نواب خان کے ساتھ اور تمام کرڑال اور جدون سرائے صالح میں جمع تھے۔ جو غلہ ہری پور کے لوگوں کے گھروں میں تھا کھاتے اور لے جاتے رہے۔ قلعہ کا محاصرہ دس بارہ روز تک رہا۔ قلعہ کے اندر پانی کی تنگی پیدا ہو گئی۔ کیونکہ پانی کا کھٹہ، جو قلعہ میں آتا تھا، باہر سے مسلمانوں نے بند کر دیا۔ قلعہ کی خندق کا پانی بھی خشک ہو گیا اور قلعہ کے اندر کے کنویں اور تالاب سے دو تین دن گزارے۔ لیکن کنواں بھی خشک ہو گیا اور تالاب بھی ختم ہو گیا۔ قلعہ کے لوگوں کے لئے پانی کی تنگی شدت اختیار کر گئی۔

پشاور سے امداد کی طلب کے لئے پیغام بھیجا گیا

چنانچہ قلعہ سے رات کے وقت شریف خان پوپلزئی کو پانچ سواروں کے ساتھ قلعہ سے باہر کر کے پشاور کی طرف بھیجا کہ وہاں سے امداد کے لئے فوج لے آئے۔ چنانچہ شریف خان دو روز میں پشاور پہنچ گیا۔

اس وقت شیر سنگھ پسر چتر سنگھ اٹاری والہ صوبہ پشاور کا ناظم تھا۔ چنانچہ ہزارہ کا حال معلوم ہونے کے بعد اس نے دو مزید پلٹنیں کاہن سنگھ کے ساتھ مدد کے لئے بھیجیں۔ لیکن یہ

معاملہ عراق سے تریاق لانے کے مترادف تھا۔ روٹی کے بغیر دو تین دن گزارے جا سکتے ہیں۔ لیکن پانی کے بغیر ایک ساعت بھی مشکل ہے۔

سکھوں کا باہر نکل کر ملکی لوگوں سے مقابلہ

جب پانی کی تکلیف حد سے زیادہ ہو گئی تو تمام فوج نے اپنا سب سامان اور اہل و عیال قلعہ کے اندر کر کے خود جنگ کے لئے تیار ہو کر باہر نکل آئے۔ چھ کمپنیاں بمعہ دو عدد توپ خاربندی سے باہر ہو کر جنگ میں مشغول ہو گئیں۔ چونکہ مقابلہ پر زمیندار لوگ تھے، توپ کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ پہلا گولہ موضع ڈھیری اور پھر ہالہ جس میں خان زمان گندگر یہ (طاہر خیلی۔ مترجم) کے سوار وغیرہ جمع تھے، میں جا کر ان پر گرا۔ گولہ لگتے ہی سب فرار ہو کر گندگر کو چلے گئے۔ اسی طرح کا ایک گولہ موضع مانکرائے کی مسجد، جس میں مسلمان اور مولوی ولایت علی کے ہندوستانی تھے، میں لگا۔ وہاں مسجد میں کچھ بارود وغیرہ بھی تھا۔ گولہ ایک شخص کے پیٹ پر لگا، جس سے اس کا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور گولہ کا ایک ٹکڑا مسجد میں بارود کی جگہ پر لگا۔ وہاں جو ستر آدمی بیٹھے ہوئے تھے، تنکوں کی طرح اڑ گئے۔ اس پر تمام لوگ جدون، افغان، تنولی اور باقیماندہ ہندوستانیوں نے بھاگ کر بگڑہ و نوشہرہ وغیرہ کی طرف جا کر دم لیا۔

جب غلام خان جو شہر میں تھا، یہ سنا کہ خانزمان خان اور نواب خان بھاگ گئے ہیں تو وہ بھی ننگے پاؤں گلڈھیری کی طرف بھاگ گیا۔

اس کے بعد فوج کے سوار سرائے صالح گئے اور پانی کے کٹھ کو درست طور سے باندھ کر پانی لے آئے اور دن سے چار گھڑی باقی تھے کہ کٹھ کا پانی قلعہ میں آگیا، جس سے لوگ بدستور سیراب ہوئے۔ سبزے اور درختوں کو طراوت حاصل ہوئی۔ لوگوں نے چند دن پانی کی تکلیف دیکھی تھی۔ عورت، مرد سب سر دھونے، غسل کرنے اور کپڑے دھونے میں لگ گئے اور خدا کا شکر ادا کیا۔

پشاور سے امداد کی آمد

تین چار دن کے بعد پشاور سے دونوں پلٹنیں جو شیر سنگھ اٹاری والے نے بہ سرکردگی کاہن سنگھ بھیجی تھیں۔ انہوں نے دیہات میں جا کر جو دور تھے میں جا کر لوگوں کو سزا دی۔ اور موضع نورتی (گلڈھیری کے ساتھ ـ مترجم) کو

جا کر لوٹ لیا۔

تمام ہزارہ ویران تھا۔ ہری پور کے اردگرد کے مسلمان، شہر کے گھروں سے لکڑیاں نکال کر لے گئے اور گھر ویران ہو گئے۔

مول راج کی طلبی لاہور لاہور سے مہاراجہ لال سنگھ کا ایک خط مولراج کے نام آیا کہ تم ملک ہزارہ سے آ کر اب یہاں حاضر ہو جاؤ۔ دانا لوگوں نے اس پر مولراج کو مشورہ دیا کہ اس وقت لاہور میں کوئی صاحب سلطنت نہیں، لہٰذا تم کو وہاں نہ جانا چاہیے۔ لال سنگھ نے یہ خط تم کو دشمنی کی بناء پر لکھا ہے۔ تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ جب تم ہزارہ کو خالی کر دو گے اور فوج یہاں سے چلی جائے گی تو یہ ملک مسلمانوں کے قبضہ میں چلا جائے گا تو پھر راولپنڈی سے پشاور کا راستہ کس طرح جاری رہ سکے گا اور پشاور سے کشمیر کو جانے کا کیا بندوبست ہو گا۔ حالانکہ اب تمام انتظام ٹھیک ٹھاک ہے۔ جس وقت ہزارہ خالی ہو جائے گا تو لوگ قلعہ ہرکشن گڑھ کو جلا دیں گے۔ اور پھر ہزاروں روپوں کے خرچ سے ہی مرمت کیا جا سکے گا اور اس میں تمہاری بدنامی ہو گی کہ فلاں نے قلعہ خالی کر دیا اور یہ حالت ہو گئی۔ لہٰذا مناسب یہی ہے کہ یہاں سے نہ جائیں چونکہ مول راج جاہل اور تندمزاج تھا۔ داناؤں کے مشورہ پر عمل نہ کیا اور قلعہ چھوڑ کر دو چار پلٹنیں ساتھ لے کر حسن ابدال میں جا قیام کیا اور دوڑھائی ماہ وہاں مقیم رہا، لیکن قلعہ کی حفاظت نہ کی۔

مولوی ولایت علی کی حکومت ہزارہ جس وقت مولراج قلعہ سے باہر ہو گیا تو غلام خان ترین وغیرہ رئیساں نے جمع ہو کر مولوی ولایت علی ہندوستانی کو قلعہ میں صدرنشین کر کے خود کاروبار حکومت چلانا شروع کر دیا۔

غلام خان ترین نے چند ملکی سوار موضع ملکیار اور دھمتوڑ اور دیگر دیہات سے جمع کر کے اپنے ملازم مقرر کر دیئے۔

اسی طرح نواب خان تنولی نے میر سیف اللہ اور غفار شاہ کو سواروں کا افسر بنا کر نوکر رکھ لئے۔ جدون افغانوں میں عطائی خان[1]، پیر خان و جلال خان وغیرہ نے جمع ہو کر اپنے ملک کی زمین

---

[1] ۔ باندہ عطائی خان اور باندہ پیر خان اور جلال خان، اسی تقسیم کی یادگار معلوم ہوتے ہیں۔

باہم تقسیم کرکے انتظام میں مشغول ہو گئے۔

جہاں داد کی سکھوں کے قلعوں کی سپاہیوں کی حفاظت

اس وقت میں جہاں داد خان پسر پائندہ خان اپنے جاگیر کے علاقہ سے سب تھانے دار اور سپاہی قلعوں سے بحفاظت نکال کر اپنی حراست میں انب لے گیا اور ان سب کو، جو چار سو بندوق ہوں گے، رسد و خرچ اپنی گرہ سے دیتا رہا اور ان سب کو تسلی دی کہ کوئی خوف و خطرہ مت کریں۔ اس وقت اگر تم سب کو دریا سے پار کر کے ہزارہ یا چھچھ کی طرف بھیجوں تو ملکی لوگ باغی ہو چکے ہیں، وہ تم سب کو قتل کر دیں گے۔ جس وقت بھی اس ملک کا کچھ انتظام لاہور کی حکومت نے کیا اور کوئی حاکم اس ملک میں آگیا، تو تم سب کو اس کے پاس بھیج دیا جائے گا۔ اس طرح سے یہ تمام قلعہ جات کے افسر اور سپاہی حسب وعدہ جہاندادخان کے پاس رہے۔

راجہ گلاب سنگھ بمعہ دیوان ہری چند ناظم ملک ہزارہ کی آمد

راجہ گلاب سنگھ کی فوج بمعہ دیوان ہری چند ناظم ملک ہزارہ ۱۱ جیٹھ ۱۹۰۲ بکرمی مطابق ۲۔ مئی ۱۸۴۶ء ہزارہ میں داخل ہوئے۔ اس سے پہلے غلام خان ترین نے اپنے ساتھیوں کے مشورہ سے قلعہ ہرکشن گڑھ کو جلا دیا تھا۔ لہٰذا یہ ہری پور شہر میں رہائش رکھ کر رعایا کی آبادی میں مصروف ہو گئے۔

قلعہ ہرکشن گڑھ جو مسمار اور برباد شدہ تھا، دیوان ہری چند نے آباد کرنا شروع کر دیا اور فوج کا ڈیرہ دریائے دوڑ کے کنارے پر جہاں بدری ناتھ اور گلاب سنگھ کی دو پلٹنوں نے ڈیرہ کیا تھا، ڈیرہ جمایا (بھارو کوٹ کے مقام پر۔ مترجم)

بعض زمیندار حاضر ہوئے اور ان سے معاملہ ربیع ۱۹۰۲ بکرمی کی وصولی کا کام شروع کیا۔ تربیلہ، سری کوٹ اور علاقہ خالصہ کھلابٹ وغیرہ کے لوگ حاضر نہ ہوئے۔

دیوان ہری چند جو خود خان پور میں تھا، اپنی فوج کی ایک پلٹن کو، بھگوان سنگھ کو اوتم سنگھ کی پلٹن، اور سواروں کے ساتھ قلعہ ہرکشن گڑھ کو بھیجا۔ بھگوان سنگھ ایک رات قلعہ میں گزار کر صبح کے وقت سوار ہو کر کھلابٹ گیا۔ اس وقت زمینداران کھلابٹ اور داڑھی سب موضع داڑھی میں موجود تھے، انھوں نے مقابلہ کیا۔ جس میں چند زمیندار مارے گئے اور بھگوان سنگھ کی فوج

کے پانچ چھ سوار اور پیادہ کام آئے۔ بعض زمیندار اطاعت پر رضامند ہو گئے۔

جب دیوان ہری چند راجہ گلاب سنگھ کی طرف سے مامور ہو کر اس ملک میں آیا تو اس کے ذمہ نواں شہر تک کے علاقہ سے معاملہ لینے کا انتظام تھا جو اس نے وصول کرنا شروع کیا۔ معاملہ پکھلی درہ کائیگان اور بھوگڑ منگ کی وصولی کے لئے دیوان نے پانچ سو سوار اور پیادہ مسلح بہ بندوق، مانسہرہ اور پکھلی کی طرف بھیجے، جنہوں نے مانسہرہ پہنچ کر اپنا ڈیرہ لگایا۔

اس فوج میں بہت سے افسر مقرر کئے۔ اس وجہ سے ان افسروں میں کسی معاملہ پر اتفاق نہ ہوتا تھا۔ اس فوج نے چنبہ، سلطان پور، حویلیاں اور رجوعیہ سے گزر کر اور دھمتوڑ سے آگے چل کر بیر پور میں ڈیرہ جمایا۔ جہاں پر دو راستے ہیں۔ ایک راستہ تنگن سے مانگل کی طرف جاتا ہے اور دوسرا اسلہڈ کی طرف آتا ہے۔ ایک راستہ بیر پور سے مانگل اور نواں شہر کو جاتا ہے۔

چونکہ جدون افغان، دیوان ہری چند کی خدمت میں بالکل حاضر نہ ہوئے تھے، لہٰذا فوج کے پہنچنے پر افسرانِ فوج نے افغانوں سے معاملہ نپٹانے کے لئے باہم مشورہ کیا۔ چونکہ افسر بہت تھے۔ لہٰذا یہ سب کسی فیصلہ پر متفق نہ ہو سکے۔ دو تین دن مشورہ اور حیص بیص میں گزر گئے افغانوں کے ساتھ نواب خان تنولی اور مدد خان تنولی بھی تھے۔ مانگل وغیرہ دیہات سے جدون افغان اور پکھلی کے لوگ بھی جمع ہو گئے۔ یہ سب مقابلہ پر آ کر فوج پر گولیاں چلانے لگے۔ چونکہ سب فوج بے دل اور بطور بیگاروں کی تھی۔ گولیاں چلنے پر بیگار کے سوار، سلہڈ کے راستے سے فرار ہو کر ہزارہ کی طرف بھاگ گئے۔ لیکن ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ وادی سلہڈ بہت تنگ اور دشوار گزار ہے۔ اگر ان کو یہ معلوم ہوتا تو اس راستے سے وہ ہرگز نہ جاتے۔ جب یہ وادیٔ سلہڈ پہنچے تو شیخ البانڈھی اور سلہڈ کے لوگوں نے ان کو پکڑ لیا۔ سب گھوڑے اور اسلحہ لے لیا۔ بہتوں کو قتل کر دیا اور چند واپس آ گئے۔ اس واقعہ کی خبر آدھی رات کے وقت دیوان ہری چند کو دی گئی۔

اس کے بعد دیوان ہری چند ملک میں کوئی محکم انتظام نہ کر سکا۔ اس سال قدرتِ الٰہی سے ملک میں بخار کا ہر طرف زور ہو گیا۔ لشکر کے بہت سے لوگ مر گئے۔ دیوان ہری چند بھی اس بخار میں مبتلا ہو گیا اور چاہتا تھا کہ کسی طریقہ سے اس ملک سے جان نکال لے جائے۔ ان ہی دنوں میں سردار گلاب سنگھ پسر چتر سنگھ اٹاری والہ اپنے سواروں اور کاہن سنگھ کی دو پلٹنوں کے ساتھ ہزارہ

میں آیا۔

قاضی نادر علی حاکم ہزارہ

اس کے آتے ہی دیوان ہری چند نے اپنی فوج کے ساتھ جموں کی طرف کوچ کر دیا اور قاضی نادر علی اور سردار گلاب سنگھ کے حوالے ملک ہزارہ کا انتظام کر دیا۔ چنانچہ معاملہ خریف ۱۹۰۲ بکرمی قاضی نادر علی نے جس سے بھی وصول ہو سکا۔ وصول کیا اور جس کسی نے نہ دیا تو اس سے تعرض نہ کیا

دیوان ہری چند کی آمد پر نواب خان تنولی سب سے پہلے حاضر ہوا اور قلعہ شیروان کو درست کر کے دیوان مذکور کو ساتھ لے گیا اور قلعہ حوالے کر دیا۔ اس پر دیوان مذکور نے ایک ہزار روپے کی جاگیر نواب خان کو لکھ کر دے دی۔ اس کے باوجود جب جدونوں کے ساتھ جنگ وجدل شروع ہوا تو نواب خان نے شیروان کے قلعہ سے سپاہیوں کو نکال دیا اور دیوان ہری چند کے پاس بھیج دیا ملک تنول میں فساد پیدا کر دیا۔ جب حالات اس کے خلاف خراب ہو گئے۔ ان دنوں نواب خان کا باپ سربلند خان فوت ہو چکا تھا۔ لہٰذا وہ اپنے قبائل اور اہل وعیال کو لے کر دریائے سندھ سے پار ہو کر کھبل اور ستھانہ میں بیٹھ گیا۔

میجر ایبٹ کی ہزارہ میں آمد

چند دن اس حال میں وہاں رہا۔ جب میجر ایبٹ صاحب بہادر یہاں آئے تو ان کی خدمت میں حاضر ہو گیا، تو اس کو ایک ہزار روپے سالانہ کی جاگیر عطا ہو گئی۔

دیوان ہری چند موسم سرما۔ کاتک کے مہینے میں ہزارہ سے چلا گیا اور چیت کے مہینے میں دیوان ہری چند کا بڑا بھائی دیوان جوالا سہائے ہمراہ اکنول صاحب ہزارہ میں آیا۔

جوالا سہائے حاکم ہزارہ اور راجہ گلاب سنگھ کو ہزارہ کی بجائے منادر اور رنجیت گڑھ لینے کا شوق

چند دن یہاں رہا۔ وہ آدمی ہوشیار تھا۔ سمجھ گیا کہ یہ ملک کانٹوں کا بستر ہے اور یہاں تنازع ہمیشہ ہوتا رہے گا تو وہ نادر علی کو اپنے ہمراہ لے گیا اور اس کی جگہ بخشی ہری سنگھ کو مقرر کر دیا۔

ان ہی دنوں میں غلام خان ترین بھی سردار گلاب سنگھ کی معرفت سے حاضر ہو گیا تھا اور پانچ ہزار کی جاگیر، علاقہ گلڈھیری کی، لے کر گلڈھیری میں مقیم ہو گیا تھا۔ قلعہ ہرکشن گڑھ جو سماہو

گیا تھا۔ اس سے لکڑی لے جا کر گلڈھیری میں اپنے مکانات تعمیر کرلئے تھے۔

جب میجر ایبٹ صاحب بہادر لاہور سے برائے حد برآری سرحد کھاٹڑ، گندگر، خان پور، ہزارہ جموں تشریف لا چکے تھے، تو اس وقت قاضی نادر علی حاکم ہزارہ تھا۔ دوسری دفعہ جب سرحد کی حد بندی ہو چکی تھی، تو آئے تو اس وقت بخشی ہری سنگھ یہاں حاکم تھا۔

جب دیوان جوالا سہائے لاہور پہنچا، تو عرض کی کہ ہزارہ کی بجائے اس کو مناور اور رنجیت گڑھ دیا جائے۔ کیونکہ ہزارہ کا انتظام اس سے نہیں ہو سکتا۔ اس کی عرض کے مطابق حالی شاہ، صدر دربار لاہور اس کی تبدیلی ہزارہ سے کر دی گئی۔

میجر ایبٹ صاحب بہادر دوسری دفعہ سرحد پر تشریف لے گئے اور ہزارہ کے عوض مناور اور رنجیت گڑھ کے سرحد بندی برائے اہلکاران راجہ گلاب سنگھ کرنے کے لئے اور لاہور اور جموں کی سرحد بندی کرنے کے لئے اس سرحد پر چلے گئے۔

چتر سنگھ کا حاکم ہزارہ مقرر ہونا

اس وقت سردار چتر سنگھ اٹاری والا حاکم ہزارہ ہو کر سردار جودھ سنگھ بوتالیہ اور چند پلٹنوں، ایک رجمنٹ سواروں اور چند توپوں کے ساتھ ہزارہ میں آئے۔

میجر ایبٹ کی آمد اور ملک کا دورہ

ان کے آنے پر میجر ایبٹ صاحب بہادر سردار جودھ سنگھ کی کچھ فوج کے ساتھ نکلم کھنڈ (قوم طاہر خیلی کا صدر مقام۔ گندگر میں جانب غرب۔ مترجم) کے قلعہ کو مرمت کرنے کے لئے گئے۔ اس کے بعد تول اور کموٹہ کے انتظام کے لئے تشریف لے گئے۔ ان دونوں قلعوں کی مرمت کے بعد جھاری (سرحد پنجاب اور ہزارہ پر۔ مترجم) کے راستہ سے ہزارہ میں آئے اور ہزارہ، خان پور اور دتاہ کے معاملہ کی کتابوں اور ملک کموٹہ اور راگرور کی کتابوں کو درست کیا اور سردار جودھ سنگھ کی فوج اور پلٹن کو جھاری سے رخصت کر دیا۔

اور خود چند سوار اور ایک کمپنی اپنی حفاظت کے لئے ساتھ لے کر سرحد کے ملاحظہ کے لئے تشریف لے گئے اور از سر نو سرحد کو مقرر کر کے واپس ملک ہزارہ میں آ گئے اور سال ۱۹۰۴ بکرمی سب ملک کے معاملہ کی کتابیں مقرر کر دیں۔

شروع ۱۹۰۵ بکرمی میں سرحد کا ملاحظہ کرنے کے بعد ۱۵۔۱۰ بیساکھ ۱۹۰۵ بکرمی مطابق ۱۰ اپریل ۱۸۴۸ء ہزارہ میں داخل ہوئے۔ سات آٹھ دن اپنے بنگلہ[1] (ہری پور۔ مترجم) میں رہے۔

اس کے بعد دورہ کرنے کی غرض سے باغ خاکی اور شیروان کی طرف تشریف لے گئے۔ بارہ روز خاکی میں بسر کر کے پہاڑ کی چوٹی پر قلعہ شیروان چلے گئے۔ شیروان میں جانے کی وجہ یہ تھی کہ ملتان میں مولراج کی بغاوت کا سن کر ہری پور کی فوج میں سخت بغاوت پھیل گئی

سکھ فوج کی بغاوت

اور دو افسروں کو قتل کر دیا۔ باوجود فہمائش کے وہ اپنی روش سے باز نہ آئے۔ چتر سنگھ نے بھی شورش بپا کر کے ان افسروں کے مقابلہ کے لئے تیار ہو گیا اور فساد پر آمادہ ہو گیا۔

چتر سنگھ باغیوں کے ساتھ تھا

جب میجر ایبٹ صاحب نے یہ خبر سنی کہ فوج باغی ہو گئی ہے اور چتر سنگھ بھی ان کے ساتھ ہم راز ہے، حالانکہ یہ بات اس کے لائق نہ تھی۔

ملکی خوانین ہزارہ میجر ایبٹ کے ساتھ تھے

میجر ایبٹ نے چند چھوٹی توپیں اور گولہ بارود ہزارہ سے منگوا کر ملکی خوانین اور زمینداروں کو بلا کر کہا کہ سنا ہے کہ سکھوں کے ارادے فساد کے ہیں۔ اگر کوئی فساد برپا ہو گیا تو تم کیا کرو گے۔ ان سب نے جواب دیا کہ ان سب نے ہمیشہ سکھوں کے ساتھ جنگیں کی ہیں اور اب آپ کی خدمت اور مدد بہ دل و جان کریں گے۔

ناگاہ چتر سنگھ اپنی فوج کو بارکوں (جو مابین خالصہ ہائی سکول[2] و رہائش اٹھٹ کمشنر ہری پور تھی۔ مترجم) سے نکال کر دوڑ کے کنارے پر لے آیا۔ (یعنی بھاروکوٹ میں جہاں سے میجر ایبٹ جو شیروان میں تھا کے خلاف حرکت کی جا سکتی تھی۔ مترجم)

کرنل کنارا کا قتل

فوج کے پاس دو توپیں تھیں جو کرنل کنارا کے زیر کمان تھیں، جس پر سکھ فوجی تعین تھے۔ کرنل کنارا کو چتر سنگھ نے پیغام بھیجا کہ تم بھی یہ توپیں میرے

---

[1] ۔ ہری پور شہر میں ان کا بنگلہ تھا۔
[2] ۔ حال ٹریننگ کالج برائے استادانِ سکول۔

ڈیرہ میں یہاں لے آؤ۔

کرنل کنارا نے جواب دیا کہ اگر کسی کے ساتھ جنگ ہے تو میں سوار ہو کر آجاتا ہوں اور توپیں لے آتا ہوں وگرنہ چھاؤنی ابھی ابھی تیار ہوئی ہے۔ سب گھوڑے نو آموز اور تند گام ہیں تو پھر کس لئے اس جگہ سے حرکت کریں۔ اس پر دونوں کمپنیوں کو چتر سنگھ نے حکم دیا کہ تم توپوں کو یہاں لے آؤ۔ یہ حکم ملتے ہی کمپنی نے کرنل کنارا اور ایک گولہ انداز کو گولیوں کی بوچھاڑ سے موت کے گھاٹ اتار دیا اور دونوں توپیں سردار چتر سنگھ کے ڈیرے پر لے گئے۔

میجر ایبٹ کا سکھوں سے مقابلہ کے لئے تیار ہونا

جب یہ خبر شیرواں میں میجر ایبٹ صاحب کو ملی تو اس وقت فوج کی ایک کمپنی ان کے اردل میں تھی، اس کو بلا کر پوچھا کہ اب تمہاری کیا مرضی ہے۔ جو شخص میرے پاس رہنا چاہتا ہے، وہ رہ سکتا ہے۔ اگر تم سب اپنی پلٹن کی طرف جانا چاہتے ہو تو اسی وقت پہرداروں کی معیت میں تم سب کو حفاظت کے ساتھ وہاں پہنچانے کا انتظام کرتا ہوں۔ سب کمپنی نے واپس جانے کی درخواست کی اور ان سب کو حفاظت کے ساتھ ہزارہ میں پہنچا دیا گیا۔

دوسرے دن میجر ایبٹ شیروان سے کوچ کر کے ناڑہ سید خانیاں (بالمقابل موضع کھلابٹ۔ مترجم) جو سری کوٹ سے نیچے پہاڑ کے دامن میں ہے، میں آ کر مقام کیا اور نئے سرے سے فوج کی بھرتی شروع کی۔ ہزارہ، اتنول اور یوسف زئی کے بہت سے لوگ آ کر نوکر ہوئے۔

جب چتر سنگھ نے اپنی سب فوج بمعہ افسران جو بھوپ سنگھ مان کے ساتھ پکھلی میں تھی کو ایک جگہ جمع کرنے کا انتظام کیا تو میجر ایبٹ نے ان کی راہ بند کرنے کے لئے اپنی فوج کو حکم دیا لیکن ملکی لوگوں نے اس سے اتفاق نہ کیا۔ کیونکہ ملکی لوگوں میں بعض لوگ سکھوں سے دوستی رکھتے تھے۔ انہوں نے اس طرف سے چتر سنگھ کو سوار کرا کر دھمتوڑ اور نواں شہر پہنچا دیا اور ادھر سے بھوپ سنگھ کی فوج کو سوار کرا کر لے آئے۔ اور ان دونوں فوجوں کا ملاپ میرپور اور مانگل میں ہو گیا اور یہ دونوں ہزارہ کی طرف روانہ ہو گئیں۔

لہ۔ اگست ۱۸۴۸ء کا واقعہ ہے۔ بموجب ڈائری میجر ایبٹ

اگرچہ میجر ایبٹ صاحب ناڑہ سے اور کپتان نکلسن حسن ابدال سے اپنی فوجوں کے ساتھ دھمتوڑ میں ان کے سامنے پہنچ گئے۔ ملکی لوگوں نے چونکہ سکھ فوجوں کا راستہ بند نہ کیا، لہٰذا سکھوں کی دونوں فوجیں پکھلی اور ہزارہ کی ایک جگہ جمع ہوگئیں۔

چتر سنگھ کے جنگی ارادے اور چالیں

چتر سنگھ اول دن سے ہی دل میں فساد کا خیال رکھتا تھا، جبکہ وہ ناظم ہزارہ ہو کر آیا تھا۔

جب چتر سنگھ پکھلی کی فوج کے ساتھ مل گیا اور یہ دونوں فوجیں سلطان پور اور جنبہ میں آکر مقیم ہوگئیں، تو چند دن پہلے سردار چتر سنگھ نے اپنے حجام مسمٰی آنام کے ہاتھ جو خط امیر دوست محمد خاں کو بھیجا تھا۔

امیر دوست محمد خاں والئی کابل سے خط و کتابت

تو وہ حجام امیر دوست محمد خان کا جواب لے کر اس وقت آیا جب چتر سنگھ پکھلی کی فوج کے ساتھ سلطان پور اور جنبہ میں آکر ٹھہرا ہوا تھا۔ حجام مذکور نے چتر سنگھ کے خط کا جواب مرسلہ امیر دوست محمد خان نے یہاں آکر اس کو دیا۔

خط میں جو کچھ کہ تھا، اس کے پڑھنے سے چتر سنگھ دوچند مغرور ہو گیا۔ اس کے بعد وہ ہزارہ میں آگیا۔ ڈیڑھ ہزار سپاہی مسلح بہ بندوق اور دو توپ کو قلعہ ہری کشن گڑھ میں رکھ کر باقی تمام فوج کے ساتھ چھچھ و اٹک کی طرف روانہ ہوگیا۔

چند دن چھچھ میں قیام کرنے کے بعد پشاور کے افسرانِ فوج کے ساتھ خط و کتابت کی، لیکن انہوں نے اس خط کا جواب نفی میں دیا۔

جس دن چتر سنگھ کے ڈیرہ نے ہری پور سے کوچ کیا اور موڑہ کے گاؤں کے پاس قیام کیا تو میجر ایبٹ صاحب اپنی فوج کو ساتھ لے کر موضع بھیڈیاں اور پوڑ میں آگئے۔[2] کپتان نکلسن بہادر حسن ابدال میں تھے۔ میجر ایبٹ ایک دن قیام کے بعد کوچ کر کے موضع سلطان پور میں چلے گئے۔ اگرچہ چتر سنگھ نے اپنے بیٹے مسمی تارا سنگھ (اوتار سنگھ مطابق میجر ایبٹ کی ڈائری) کو میجر ایبٹ صاحب

---

[1] - بحوالہ ڈائری میجر ایبٹ۔

[2] - یہ دونوں گاؤں موڑہ سے جانب غرب واقع ہیں۔

کی خدمت میں بھیج کر معافی مانگی اور جس کو میجر ایبٹ نے کپتان نکلسن کے پاس حسن ابدال بھیج دیا تھا۔

جنگ موڑہ

لیکن چتر سنگھ نے اپنی فوج کے ساتھ وہاں سے کوچ کر دیا۔ (یعنی موضع موڑہ سے ۔ مترجم) میجر ایبٹ صاحب نے کپتان نکلسن کو اپنے معتبر کے ذریعہ اطلاع دی اور خود مسلح ہو کر موضع موڑہ کے نالہ دکسی ہی میں آگئے[1]۔

دونوں طرف توپ اور بندوق سے فائر شروع ہو گئے اور شام سے نصف رات تک جاری رہے۔ رات ہی اس لئے میجر ایبٹ صاحب طرح دے کر حسن ابدال آگئے۔ وہاں پر چتر سنگھ کا بیٹا موجود تھا لیکن صلح صلاحیت کی بات نہ چل سکی، لہٰذا اس کو رخصت دے کر واپس کر دیا۔

چتر سنگھ نے کھوڑہ سے ایک پلٹن کو جو وہاں تھی، بلا کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس کے بعد میجر ایبٹ صاحب واپس ہزارہ میں آئے۔ تین رات اپنی جمعیت سمیت مانکرائے میں رہے۔ چوتھے دن ناڑہ سید خانیاں (گندگر علاقہ سری کوٹ ۔ مترجم) چلے گئے۔

چتر سنگھ علاقہ چھچھ میں

چتر سنگھ نے چھچھ سے پشاور فوج اور امیر دوست محمد خان کے ساتھ خط و کتابت کی اور چھچھ سے براہ کھڑی و غازی آکر قلعہ سلم کھنڈ پر قبضہ کرنے کے لئے اس طرف آگیا۔

جنگ سلم کھنڈ

ادھر سے میجر ایبٹ صاحب بھی اپنی فوج کے ساتھ براہ سری کوٹ وہاں پہنچ گئے۔ وہاں پر سخت جنگ ہوئی۔ سکھوں کی فوج کے بہت سے افسر اور سپاہی مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ لیکن قلعہ سلم کھنڈ سے فوج نکال کر وہ اپنے ساتھ لے گیا اور اس کے بعد اٹک کے قلعہ پر قبضہ کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ جہاں پر انگریزوں نے اپنی فوج کا تھانہ مقرر کر رکھا تھا۔ قلعہ میں کپتان نکلسن اور ایک دو اور انگریز تھے (ان میں ایک لفٹیننٹ ہربرٹ بھی تھا ۔ مترجم) لہٰذا چتر سنگھ اس قلعہ پر قابض نہ ہو سکا[2]۔ میجر ایبٹ صاحب نے تھوڑی سی مدد دریائے سندھ کے راستہ سے دتربیلہ کے مقام سے کشتی کے ذریعہ جس میں

---

[1] ۔ ۲۴ ۔ اگست ۱۸۴۸ء مطابق ڈائری میجر ایبٹ ۔ [2] ۔ میجر ایبٹ کی ڈائری کے مطابق لفٹیننٹ ہربرٹ ۲۲ ستمبر ۱۸۴۸ء سے قلعہ اٹک میں سکھوں کی فوج سے محصور رہا اور چھ جنوری ۱۸۴۹ء اپنے چھ سات آدمیوں کے ساتھ قلعہ سے نکل کر دریا پار چلا گیا۔

غزن خان بیٹی بھی تھا۔ یہ کشتی قلعہ اٹک کے پاس جلالیہ پتھر سے ٹکرا کر چور ہو گئی۔ غزن خان اور دوسرے لوگ ڈوب گئے۔ جو انگریز کشتی میں تھا وہ تیر کر کنارے پر لگ گیا۔) بھیجی۔ لیکن کشتی ٹوٹنے کی وجہ سے دریا میں ڈوب گئی۔

چتر سنگھ کا مشورہ سرداران پشاور کے ساتھ اس کے بعد چتر سنگھ دریا سے پار جا کر سرداران پشاور سلطان محمد خان و پیر محمد خان سے صلاح و مشورہ کیا۔ آخر الامر دوست محمد خان امیر کابل اور سلطان محمد خان و پیر محمد خان نے سکھوں کے ساتھ ظاہراً لیکن اندرونی طور پر انگریزوں کے ساتھ ساز باز رکھتے تھے۔

جب پشاور کی فوج میں بغاوت ہو گئی تو میجر جان لارنس جو پشاور کا حاکم تھا، پشاور سے فرار ہو کر کوہاٹ جو سلطان محمد خان[1] کی جاگیر تھی، میں چلا گیا تو سلطان محمد خان و پیر محمد خان جو اندرونی طور پر سکھوں اور چتر سنگھ کے ساتھ مصلحت رکھتے تھے، میجر جان لارنس کو بمعہ بیوی اور متعلقین گرفتار کر کے چتر سنگھ کے سامنے پیش کر دیا۔ امیر دوست محمد خان بھی اس وقت آ گیا۔ قلعہ اٹک بھی خلاص کرا لیا گیا اور درانی افغانوں کی فوج اس میں داخل ہو گئی اور تھانہ مقرر کر دیا گیا۔

چتر سنگھ اور درانی فوج کا ہزارہ میں داخل ہونا چتر سنگھ درانی فوج کو ساتھ لے کر جنگ کے لئے ہزارہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ درانی

---

[1] ۔ کابلی سردار کے زیر عنوان میجر سمتھ اپنی کتاب "لاہور کے حکمران خاندان" کے تحت ص ۱۶۸ پر لکھتا ہے۔ کابلی سردار (کابل کے امیر کے پنشن خوار اور رشتہ دار) سب خطرناک سازشی ہیں۔ ان سے ایک سال پہلے (یعنی ۱۸۴۸ء) میں انہوں نے کرنل جارج لارنس کے بھائی میجر جان لارنس اور اس کی بیوی کو حفاظت کے بہانے قید کر لیا اور بعد میں سکھ فوج کے حوالے کر دیا۔

ص ۲۲۲ کے فٹ نوٹ پر تحریر ہے۔ سردار سلطان محمد خان سب بھائیوں میں بڑا اور برا سردار تھا۔ وہ رات دن زنان خانہ میں رہتا۔ اس کی تین سو بیویاں دکنیزیں۔ مولف) تھیں۔ اس کو اپنے بال بچوں کی تعداد اور نام معلوم ہی نہ تھے۔ سب سے بڑے تیس چالیس یا سب سے چھوٹے دو تین بچوں کے نام اس کو معلوم تھے۔

میں نے اس کو شاہدرہ (لاہور) باغ سے نکلتے دیکھا جب وہ لارڈ گو (GOUGH) کو ملنے کے لئے گیا۔ اس کے کے پیچھے تین چار ہاتھیوں پر اس کے رتھ کے سوار تھے۔

فوج حیدر خان پسر دوست محمد خان و سید پیرزادہ پشاور کے زیر کمان ہزارہ میں داخل ہوئی۔

ہزارہ میں درانی فوج کے آنے سے پہلے میجر ایبٹ صاحب نے اپنی ملکی فوج کو غلام خان ترین، میر زمان خان (سید خانی کھلابٹ۔مترجم)، و منیر خان پنی (منیر خانی خاندان ساکن پنیاں کا سربراہ مترجم)، وغیرہ کو معاملہ کی وصولی کے لئے بھیجا ہوا تھا، جو انہوں نے وصول کر لیا تھا۔

جب درانیوں کی فوج ہزارہ میں داخل ہوئی تو میر زمان خان (سید خانی ساکن کھلابٹ۔مترجم)، اور قائم خان پنی (ساکن پنیاں)، وغیرہ جو خیر خواہ سرکار انگریزی تھے، اپنے لوگوں کے ساتھ مری کوٹ میں میجر ایبٹ کے پاس حاضر ہوئے۔لیکن غلام خان ترین جو فتنہ فساد کا عادی تھا، بمعہ اپنے بھتیجے فتح خان گلڈھیری ہی میں رہا اور میجر ایبٹ صاحب کے طلب کرنے پر حاضر نہ ہوا۔

لہ۔میر زمان خان۔خاندان سید خانی۔اتمان زئی ساکن کھلابٹ کا سربراہ تھا۔یہ خاندان میجر ایبٹ کا وفادار رہا۔ میر زمان کے والد سعداللہ خان کی وفات پر میجر ایبٹ نے انگلینڈ سے اس کی قبر کے لئے سنگِ مرمر کا ایک قبہ بھیجا تھا جس پر تحریر تھا "یہ یادگار سعداللہ خان سیدخانی، خان کھلابٹ، ناڑہ کا بہادر محافظ، جس نے سکھوں کے تین حملوں کا مقابلہ کیا۔اس نے زندگی مصائب اور تکالیف میں گزاری، معزز اور سب سے زیادہ قابلِ عزت، وفات ۱۸۵۲ء عمر ۹۵۔سال"۔

یہ پتھر اس کے دوست میجر جیمس ایبٹ نے نصب کرایا۔

لہ۔ قائم خان پنی قوم کا سربراہ تھا۔میر زمان خان ساکن کھلابٹ اس کا بہنوئی تھا۔یہ دونوں میجر ایبٹ کے وفادار اور حلیف تھے۔

میجر ایبٹ نے ضلع ہزارہ سے جاتے وقت جو سند عطا کی اس کا ترجمہ یہ ہے:

"قوم پنی کے خان قائم خان پنی نے گزشتہ جنگ سکھاں میں اپنی مخلصانہ اور دیانت دارانہ حوصلہ و شجاعت سے اس تمام عرصہ میں امتیازی درجہ حاصل کیا۔وہ ایک صاف گو اور نیک دل آدمی ہے۔

وہ ہزارہ بھر میں قابلِ عزت آدمی گنا جاتا ہے"

"جے۔ایبٹ۔سابق ڈپٹی کمشنر ہزارہ۔مورخہ ۲۳۔اپریل ۱۸۵۳ء"

اور خانیز مان[1] خان گندگر یہ (طاہر خیلی - مترجم) ولی دشمنی رکھنے کے باوجود سری کوٹ میں میجر ایبٹ صاحب کے پاس گیا اور شام کے وقت چار سو روپے نقد برائے خرچ بارود و گولی، درانیوں کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے وصول کئے اور آدھی رات کے وقت وہاں سے فرار ہو گیا۔ اسی دن غلام خان ترین کے آدمی فوج کے خرچ کے لئے بارہ سو روپے نقد میجر ایبٹ صاحب سے لے کر راتوں رات خانیز مان خان (طاہر خیلی - مترجم) کے پاس آ گئے۔

دوسرے دن صبح کے وقت غلام خان ترین نے گلڈھیری سے سوار ہو کر حیدر زمان خان درانی جو موضع برہان (نزد حسن ابدال - مترجم) میں مقیم تھا سے ملاقات کی اور درانیوں کی فوج کو خواہ مخواہ ہزارہ میں لے آیا۔

میجر ایبٹ صاحب ان لوگوں کی بے ایمانی سے بہت آزردہ ہوا۔ اس وقت ملک صالح محمد مشوانی بمعہ اپنی قوم کے چند افراد کے وفادار رہا۔ لیکن تمام مشوانی دل میں فریب و دغا بازی رکھتے تھے۔

میجر ایبٹ اور درانیوں کی جنگ

میجر صاحب اپنے سے متفق لوگوں کو لے کر سری کوٹ سے تنول کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب صاحب موصوف لے ناڑہ (یعنی علاقہ سری کوٹ - مترجم) سے کوچ کیا تو اسی وقت غلام خان ترین درانیوں کی ڈیڑھ ہزار فوج لے کر میجر ایبٹ صاحب کو گرفتار کرنے کے لئے دریائے سرن کے اس پار مقابلہ میں صف آرا ہو گیا۔

چونکہ ایبٹ صاحب کا سامان لشکر کھچی تک پہنچ گیا تھا، تو جوڑہ پنڈ کے ساتھ گڑھی میں چھوٹی توپیں مقابلہ میں نصب کر کے گولہ باری شروع کر دی۔ آخر کار درانی سوار قابو نہ پا کر پشیمان ہو کر واپس آ گئے۔

---

[1] - خان زمان خان - قوم طاہر خیلی کا خان تھا۔ اس کی جائے رہائش کوٹھڑہ - گندگر پہاڑ کے مغربی دامن میں تھی۔ ۱۸۴۸ء میں چتر سنگھ کی یورش میں ملک سے باہر - پار دریائے سندھ، علاقہ خیر میں چلا گیا - اور وہاں ہی فوت ہوا۔

راستہ میں بڈھارہ تعلقہ مجاروکوٹ کے زمیندار ستارہ خان جو میجر ایبٹ صاحب سے واپس ہو کر جا رہا تھا۔اس کے ساتھ اس کا بیٹا شیر خان جو چتر سنگھ کی ملازمت میں تین چار ماہ رہا تھا،ان دونوں کو درانیوں نے قتل کر دیا۔

میجر ایبٹ کا شیرواں میں قیام

اس کے بعد ایبٹ صاحب بخیر و عافیت شیرواں چلے گئے اور وہاں جا کر مورچہ بندی کا انتظام مکمل کر دیا۔شیرواں کے سب راستوں پر پہرہ مقرر کر دیا۔

دُرّانیوں کا موضع شنگرھی پر حملہ

ایک دن خبر ملی کہ غلام خان ترین اور حسن شاہ سید و بڈھا خان ولازاک دخاندان ولازاک سرائے صالح کا جدّ۔مترجم) سرائے صالح والا اور حیات خان ترک نے متفق ہو کر حیدر خان درانی کو سوار کرا کر شنگرھی کے دیہات کی طرف لے گئے اور وہاں سے چند مویشی اور ان کے ساتھ لوگوں کو پکڑ کر لے آئے اور بعض گھروں کو جلا دیا۔

سکھوں اور درانیوں کا مقابلہ انگریزی فوج سے

جو فوج گجرات اور جہلم کی طرف چتر سنگھ اور درانیوں کے ساتھ گئی تھی اس کا مقابلہ انگریزی فوج سے ہو گیا،جو ملتان کی فتح کے بعد گجرات پہنچ چکی تھی۔جس میں سکھوں اور درانیوں کی بہت سی فوج میدان جنگ میں ماری گئی اور لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔درانیوں نے شکست کھا کر راولپنڈی کے راستہ سے واپسی شروع کی اور ہزارہ میں جو درانی فوج تھی وہ بھی ان کے ساتھ مل کر کابل کی طرف روانہ ہو گئی۔اپنے مردوں کا حساب تک نہ کیا۔چتر سنگھ شکست کھا کر راولپنڈی میں آگیا وہاں پر سکھوں نے اپنے کیس (سر کے بال) اپنی تلواروں اور چھریوں سے مونڈ کر،اور لباس تبدیل کر کے اپنے گھروں کی طرف چلے گئے،تا کہ ان کو کوئی راستہ میں شناخت نہ کر سکے۔

میجر ایبٹ کا مارگلہ پہنچنا

اس کے بعد میجر ایبٹ صاحب نے بھی شیرواں سے کوچ کیا اور تیزی سے کنتھیلہ علاقہ خانپور میں آ گئے اور اپنی فوج کو حکم دیا کہ بھاگتے ہوئے فوجیوں (درانیوں۔مترجم) کے سامان و اسباب کو لوٹ لیں۔

یہ حکم انہوں نے مارگلہ میں دیا۔چنانچہ دو تین دن ایبٹ صاحب کی فوج نے درانیوں کے

اونٹ، خیمے و دیگر سامان لوٹ کر لے آئے۔

جب درانی بھاگ گئے تو سکھوں نے ہتھیار ڈال دئے اور جان کی امان مانگ کر اپنے وطنوں کی طرف چلے گئے۔

انگریزوں کا ہزارہ پر عمل دخل اس کے بعد میجر ایبٹ صاحب ہزارہ میں آئے اور قلعہ ہرکشن گڑھ کے سب سپاہیوں سے بندوق، کمر، شمشیر قبضہ طلائی لے لی۔ صرف سادہ تلوار ان کے پاس چھوڑی اور ان کو قلعہ سے باہر کر کے امان دے کر رخصت کر دیا۔ خود قلعہ میں داخل ہو کر اس میں اپنا تھانہ مقرر کر دیا۔

ہزارہ میں حکومت انگریزی کا عمل دخل ۱۶۔اپریل ۱۸۴۹ء سے شروع ہو گیا۔

کتاب کے آخر میں؛

جس صاحب علم نے اس کتاب کی نقل لکھی اس نے اپنا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے۔

"چونکہ یہ کتاب مشتمل بر ملک ہزارہ کے تمام علاقوں، حدود، مواضعات، میدان، پہاڑوں اور ساکنانِ ملک کے حالات بمعہ ان کے رئیسوں کی تھی اور چونکہ یہ کتاب تواریخ ہزارہ من و عن ابتدائی حالات اور سکھوں کے عہد حکومت کے واقعات اور جنگ ردوبدل پر تھی، لہٰذا اس گنہگار نے اس کو نقل کیا اس کے نقل کرنے کا باعث جناب حضرت قبلہ ام بڑے ماموں صاحب کا حکم تھا۔ جنہوں نے تحصیلدار صاحب لالہ حکم چند جو ماموں صاحب کے خاندان کا شاگرد رشید تھا، سے یہ کتاب نقل کرنے کے لئے لی تھی۔ اور اس کو بابا صاحب مراد آباد نے نقل کرا کے ماموں صاحب میر عالم جی مرحوم جو ان کے بڑے فرزند تھے کا نام آخر میں درج کر دیا اور شکایت کے بعد بڑے ماموں صاحب اس کو نہ لائے۔

میں نے اس کو دیکھ کر نقل کر لیا کہ یادگار رہے۔ اگرچہ میں اس کی تحریر و تقریر کے قابل نہ تھا۔ جو کوئی پڑھے اس سے دعا کی امید رکھتا ہوں۔

یہ کتاب میں نے اپنے پس ماندگان کے لئے لکھی۔

العبد: حاجی حسین احمد۔ بروز پنج شنبہ وقتِ عصر جنوری ۱۹۲۹ء

نوٹ:

صفحہ اول پھٹا ہوا۔ لیکن جو کچھ اس پر تھا میں نے لکھ لیا۔

نوٹ مترجم:

"میں نے مولانا غلام رسول مہر، مسلم ٹاؤن لاہور کے حسب خواہش نقل کی، جو دو ماہ میں مکمل ہوئی۔ اس کا خط پرانا بطرز شکستہ تھا۔ تحریر گنجان اور ادق۔ بعض جگہ پڑھنا بھی بہت مشکل تھا۔ نقل در نقل سے موجودہ نسخہ میں غلطیاں بہت زیادہ تھیں۔ اس واسطے بڑی عرق ریزی کرنی پڑی۔

ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی۔ دار الشفاء، ایبٹ آباد۔

۱۱ر اگست ۱۹۶۷ء

باب سوم

میجر ایبٹ کی ہزارہ میں آمد

جب میجر ایبٹ پہلی دفعہ لاہور سے ہزارہ میں برائے سرحد برآری سرحد کھاڑ و گندگر اور خان پور و ہزارہ جموں سے کرنے کے لئے مقرر ہو کر آیا تو اس وقت (۱۸۴۶ء) میں قاضی نادر علی حاکم ہزارہ تھا۔ جب دوسری بار میجر ایبٹ (۱۸۴۷ء) میں آیا تو اس وقت بخشی ہری سنگھ مقرر ہو چکا تھا۔

جب دیوان جوالا سہائے لاہور پہنچا تو اس نے تجویز پیش کی کہ "ہزارہ کی بجائے ان کو منادر[1] و رنجیت گڑھ عطا کیا جائے۔ کیونکہ ہزارہ کا انتظام نہیں ہو سکتا۔"

لاہور ریذیڈنسی کی طرف سے راجہ گلاب سنگھ کی یہ عرضداشت منظور کر لی گئی اور میجر ایبٹ صاحب کو دوبارہ سرحد کی طرف بھیجا گیا کہ حد جموں و لاہور کی پھر سے حد برآری کی جائے۔ میجر ایبٹ اور سردار چتر سنگھ اٹاری والہ کو حاکم مقرر کر کے بمعہ چند پلاٹن فوج، چند ضرب توپ اور ایک رجمنٹ سواراں زیر کمان سردار جھنڈا سنگھ بوتالیہ کے بھیجا گیا۔ میجر ایبٹ صاحب نے قدرے فوج اور سردار جھنڈا سنگھ کو ساتھ لے کر سنبل کھنڈ (سلم کھنڈ علاقہ گندگر نزدیک غازی) کی گڑھی مرمت کی۔ کچھ مدت کے بعد میجر ایبٹ دیول و گھوڑہ کے انتظام کے لئے تشریف لے گئے۔ دونوں قلعے تعمیر کر کے چھاریاں کی طرف تشریف لے گئے اور ملک ہزارہ کے خان پور و دناہ وغیرہ کے علاقوں کی مالیہ کی کتابیں ترتیب دیں اور ملک کہوڑہ و اگرور کی کتابیں درست کیں۔ اس کے بعد چھاریاں سے فوج، پلٹن اور سردار جھنڈا سنگھ وغیرہ کو رخصت اور خود چند سوار اور ایک کمپنی بطور پہرہ ساتھ لے کر سرحد کے ملاخطہ کے لئے گئے اور نئی سرحد مقرر

---

[1] جموں کے نزدیک کا علاقہ۔

کرکے واپس ہزارہ میں آگئے۔ سال ۱۹۰۴ بکرمی (۱۸۴۷ء) میں میجر ایبٹ صاحب نے ملک کی کتاب ہائے مالیہ مقرر کیں اور شروع ۱۹۰۵ بکرمی (۱۸۴۸ء) میں سرحد کا ملاحظہ کیا۔ پھر ۱۵ ماہ بیساکھ ۱۹۰۵ بکرمی مطابق ۶ اپریل ۱۸۴۸ء ہزارہ میں داخل ہوئے۔ سات آٹھ دن نبگلہ میں آرام کرنے کے بعد دورہ کے لئے باغِ خاکی و شیروان کی طرف گئے۔ دس بارہ روز باغِ خاکی میں گزارے۔ پھر شیروان کے ساتھ پہاڑی پر مقیم ہوئے۔

ان ایام میں مولراج[1] نے بغاوت کی اور دو انگریزوں کو قتل کر دیا اور آمادہ جنگ و فساد ہوا۔ میجر ایبٹ کو لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ سکھوں کی فوج باغی ہو گئی اور چتر سنگھ ان سے متفق ہے۔ اگرچہ یہ بات چتر سنگھ کے متعلق باور نہ کی جا سکتی تھی تاہم میجر ایبٹ نے ہوشیاری سے چند ضرب زنبورہ، سکہ و بارود مہیا کر لیا۔ ملکیہ زمینداروں کو بلا کر کہا کہ سنا جاتا ہے، سکھ آمادۂ فساد ہیں۔ اگر کچھ واقعہ ہو جائے تو ان کا کیا مشورہ ہے۔ ان سب نے کہا کہ وہ ہمیشہ سکھوں سے لڑتے رہے ہیں اور اب اس کے ساتھ دل و جان سے ہو کر مقابلہ کریں گے۔

اتنے میں سردار چتر سنگھ نے فوج کو قلعہ سے نکال کر دریائے دوڑ پر جمع کر دیا اور کنارا صاحب کو بھی جو سکھوں کا دوسرا یورپین ملازم تھا، سردار چتر سنگھ نے کہلا بھیجا کہ تم اپنی دو توپوں کو بھی ڈیرہ میں لے آؤ۔ اس نے جواب دیا کہ اگر کسی دشمن پر حملہ مقصود ہے تو ہم سوار ہوتے ہیں اور توپیں لے جاتے ہیں چھاؤنی[2] ابھی نئی نئی تیار ہوئی ہے اور سب گھوڑے بھی نئے سدھائے ہوئے اور منہ زور ہیں، تو کیوں اس جگہ سے حرکت کریں۔ اس جواب پر سردار چتر سنگھ نے دو کمپنیوں کو حکم دیا کہ وہ جا کر کنارا صاحب سے دونوں توپیں لے آئیں۔ ان کمپنیوں نے آتے ہی فائر کر کے کنارا صاحب اور ایک گولا انداز کو قتل کر دیا اور دونوں توپیں ڈیرہ میں لے آئے۔ جب یہ خبر شیروان میں میجر ایبٹ صاحب کو پہنچی تو اسی وقت ایک کمپنی سے جو اس کے ساتھ تھی بلا کر پوچھا کہ تمہاری کیا مرضی ہے جو شخص میرے ساتھ رہنا چاہتا ہے رہے اور

---

[1] ۔ مولراج حاکم ملتان اپنے باپ ساون مل حاکم ملتان کے قتل (دسمبر ۱۸۴۴ء) کے بعد حاکم ملتان ہوا تھا۔

[2] ۔ کنارا صاحب کی چھاؤنی جس میں گھوڑے اور توپیں تھیں اس جگہ اب اسسٹنٹ کمشنر کا نبگلہ اور اس کی ملحقہ عمارت ہے۔ ان کے بالمقابل سڑک کے کنارے موجودہ میونسپل گارڈن کے پاس قبر تھی جو چند سال ہوئے منہدم کر دی گئی ہے۔

جو اپنی پلٹن کی طرف جاتا ہے، اسی وقت اس کو پہرہ کی حفاظت میں وہاں پہنچا دیا جائے گا۔ چنانچہ سب کمپنی نے رضامندی سے رخصت طلب کی اور ان کو بحفاظت پہرہ کے ساتھ ہزارہ میں پہنچا دیا۔

دوسرے دن میجر ایبٹ شیروان سے روانہ ہو کر ناڑہ سید خانیاں (نزد داڑھی کھلابٹ) میں آگیا نئی فوج بھرتی شروع کی۔ ہزارہ، اتنول اور یوسف زئی سے بہت سے لوگ آکر ملازم ہوئے۔

ادھر چتر سنگھ نے تجویز کی کہ پکھلی کی فوج اور افسر ابھوپ سنگھ مان وغیرہ ایک جگہ جمع ہو جائیں۔ چنانچہ میجر ایبٹ نے اس پکھلی والی فوج کا راستہ بند کرنے کا حکم دیا۔ لیکن علاقہ کے زمینداروں نے اس حکم پر عمل نہ کیا۔ کیونکہ بعض سکھوں کے ساتھ دوستی رکھتے تھے۔ انہوں نے اس طرف سے چتر سنگھ کو سوار کر کے دھمتوڑ نواں شہر تک پہنچا دیا۔ ادھر سے بھوپ سنگھ کو فوج سمیت سوار کرا کر ادھر لے آئے۔ چنانچہ میرپور اور مانگل کے درمیان دونوں فوجیں متفق ہو کر ہزارہ کی طرف آئیں۔ اگرچہ میجر ایبٹ نے ناڑہ سے اور کپتان نکلسن نے (NICHOLSON) حسن ابدال سے بمعہ اپنی افواج کے دھمتوڑ پہنچ کر لوگوں سے کہا کہ ان کا راستہ بند کر دیں۔ لیکن ملکی سپاہ نے راستہ بند نہ کیا اور ہر دو افواج پکھلی و ہزارہ کو مل جانے دیا۔ چتر سنگھ جس دن سے ناظم ہزارہ ہو کر آیا۔ اسی دن سے فساد کا خیال اس کے دل میں تھا۔ اس نے ہزارہ میں آنے سے چند روز بعد ہی اپنے حجام مسمی مسند امام کو خط دے کر دوست محمد خان کی طرف بھیجا تھا اور اس کا جواب اس حجام نے چتر سنگھ کو اسی دن پہنچایا جس دن چتر سنگھ پکھلی کی فوج کو ساتھ لے کر سلطان پور د چنبہ پہنچا تھا۔ اور جب اس جوابی خط کو پڑھا تو اور زیادہ مغرور ہو کر ہزارہ پہنچا اور پندرہ سو بندوق بند سپاہی بمعہ دو ضرب توپ قلعہ ہرکشن گڑھ میں چھوڑ کر باقی سب فوج کے ساتھ چھچھ واٹک کی طرف روانہ ہو گیا۔ چند روز چھچھ میں ڈیرہ کیا اور پشاور فوج کے افسروں سے نوشت و خواند کرتا رہا، لیکن انہوں نے اس کی بات رد کر دی۔

جس روز ہری پور سے کوچ کر کے چتر سنگھ، موضع موڑ میں فروکش ہوا تو میجر ایبٹ اپنی فوج کو لے کر ناڑہ سے کوچ کر کے موضع بھیڈیاں اور پوڑ (میانہ) میں ڈیرہ کیا۔ کپتان نکلسن صاحب، حسن ابدال میں تھا، ایک دن کے قیام کے بعد میجر ایبٹ نے آگے بڑھ کر سلطان پور میں مقام کیا۔

چتر سنگھ اپنی غلطیوں اور تقصیرات کی معافی کے لئے نامہ و پیام درمیان میں لایا۔ تارا سنگھ پسر چتر سنگھ میجر ایبٹ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ صاحب موصوف نے اس کو اپنے ایک معتبر کے ساتھ

کپتان نکلسن کے پاس بھیج دیا اور خود کمربستہ سب فوج کو ساتھ لے کر موضع موڑہ (نزد موضع ڈنگی) کے کسی (نالہ) پر آگیا۔ دونوں طرف سے توپ و بندوق کے فائر شروع ہو گئے۔ شام سے رات کے ایک آدھ پاس گزرتے تک فائر جاری رہے۔ رات بھی۔ میجر ایبٹ طرح دے کر اپنے سب ہمراہیوں کے ساتھ حسن ابدال آگئے اور چتر سنگھ نے ایک اور پلٹن جو کھوڑ میں تھی، بلا کر ساتھ ملالیا۔ لیکن آخر کار کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔

میجر ایبٹ واپس ہزارہ میں آگئے اور تین دن موضع مانک رائے میں قیام کیا۔ چوتھے دن ناڑہ سید خانیاں پہنچ گئے۔ چتر سنگھ نے چھچھ پہنچ کر پشاور کی فوج اور امیر دوست محمد خان سے نامہ و پیام کیا اور چھچھ سے واپس (اکتوبر ۱۸۴۸ء) ہو کر سنبل کھنڈ (سلم کھنڈ) کے قلعہ میں متعین فوج کو ساتھ لینے کی غرض سے آیا یہ سن کر میجر ایبٹ سری کوٹ کے راستہ اپنی فوج کے ساتھ سنبل کھنڈ (سلم کھنڈ) پہنچا۔ وہاں پر اس کی سکھوں کے ساتھ زبردست جنگ ہوئی۔ سکھوں کی فوج کے بہت سے سپاہی اور افسر مارے گئے اور بہت سے زخمی ہو گئے۔ لیکن جاتے ہوئے چتر سنگھ سنبل کھنڈ کے قلعہ کی فوج کو اپنے ساتھ متفق کر کے لے گیا، تاکہ اٹک کے قلعہ کو خلاص کرائیں۔ لیکن اٹک کے قلعہ میں کپتان نکلسن نے فوج جمع کر رکھی تھی اور خود دو اور یورپین افسروں کے ساتھ اندر موجود تھا۔ چتر سنگھ قلعہ پر قابو نہ پا سکا۔ میجر ایبٹ نے قلعہ اٹک کے لئے کچھ امداد دریا کے راستہ بھیجی۔ لیکن یہ امداد اٹک کے قلعہ کے پاس کشتی کے ڈوب جانے سے نہ پہنچ سکی (اس کشتی میں غزن خان بنی بھی تھا، جس کا ذکر قوم بنی کے حالات میں درج کیا گیا ہے۔ ش ب)

آخر کار چتر سنگھ دریائے سندھ عبور کر کے پشاور کے افغانوں سلطان محمد خان و پیر محمد خان (اغلباً یار محمد خان ش ب) سے مشورہ کیا۔ آخر الامر دوست محمد خان کابل سے اور سلطان محمد خان و پیر محمد خان (یار محمد خان۔ غالباً) ظاہراً سکھوں کے ساتھ اور باطن میں انگریزوں کے ساتھ مصلحت رکھتے تھے۔

جس وقت پشاور کی افواج نے بغاوت کی تو ان کا کمانڈنگ آفیسر میجر جارج لارنس وہاں سے فرار ہو کر (آخر اکتوبر ۱۸۴۸ء) کوہاٹ چلا گیا، جہاں کہ سلطان محمد خان (یار محمد خان) کی جاگیر خاص تھی۔ چونکہ سلطان محمد خان و پیر محمد خان (یار محمد خان) کی اندرونی مصلحت سکھوں اور چتر سنگھ کے ساتھ تھی۔ وہ میجر جان لارنس کو معہ متعلقان گرفتار کر کے چتر سنگھ کے پاس لے آئے۔ امیر دوست محمد خان بھی اس وقت پہنچ گیا۔ اٹک کا قلعہ انہوں نے لے لیا اور درانی فوج نے قلعہ میں اپنا تھانہ بنا لیا۔

اس کے بعد چتر سنگھ درانی فوج کو ہمراہ لے کر بارادہ جنگ ہزارہ کی طرف روانہ ہوا (جنوری ۱۸۴۹ء)

درانی فوج کے ساتھ غلام حیدر خان پسر امیر دوست محمد خان و سید گل بادشاہ پیرزادہ پشاور ہزارہ میں داخل ہوئے۔ ان کے آنے سے پہلے میجر ایبٹ صاحب نے اپنی ملکیہ فوج معہ غلام خان (ترین) و میر زمان خان و سید خانی ساکن کھلابٹ، و قائم خان پنی (اس کا حال پنی قوم کے حالات میں پڑھیں) کو تحصیل سے معاملہ وصول کرنے کے لئے پہلے سے بھیج رکھا تھا اور معاملہ وصول ہو چکا تھا۔ اتنے میں درانی فوج آ گئی (اس فوج نے پنیاں کے قریب موجودہ موضع کمال پور کے سامنے ایک اونچی جگہ، موسوم بہ کوپرا پر ڈیرہ کیا تھا۔ ش ب) میر زمان خان و قائم خان پنی (میر زمان خان کی بیوی، قائم خان پنی کی بہن تھی۔ ش ب) وغیرہ جو نیک دل لوگ تھے اور دولت انگریزی کے دلی خیر خواہ تھے، اپنے لوگوں کے ساتھ، میجر ایبٹ کے پاس، جو اس وقت سری کوٹ میں تھا، حاضر ہوئے۔ لیکن غلام خان ترین اور اس کا برادر زادہ فتح خان گلڈھیری ہی میں رہے۔ میجر ایبٹ نے بہت دفعہ بلایا لیکن وہ نہ گئے۔ خان زمان خان گندگر یہ (طاہر خیلی خان) سری کوٹ میں میجر ایبٹ کے پاس گیا اور شام کے وقت چار سو روپیہ نقد برائے سکہ و بارود وصول کیا کہ درانیوں کے ساتھ جنگ کرے گا لیکن آدھی رات کو وہاں سے فرار ہو گیا۔

غلام خان کے آدمیوں نے بقدر بارہ سو روپیہ خزانہ میجر ایبٹ سے لے کر راتوں رات غلام خان کے پاس چلے گئے۔ صبح کے وقت غلام خان گلڈھیری سے سوار ہو کر غلام حیدر خان درانی کی ملاقات کے لئے برہان گیا۔ جہاں کہ غلام خان نے ڈیرہ لگا رکھا تھا۔ درانی اور ترین یک جدی ہیں۔ ش۔ ب) اس سے ملاقات کی اور اس کو ہزارہ میں لے آیا۔

میجر ایبٹ لوگوں کی بے وفائی سے بہت دلگیر ہوا اور مشوانیوں میں سے ملک صالح محمد اور اس کے جنبہ کے لوگ ہی صرف میجر ایبٹ کے ساتھ رہے۔ باقی سب مشوانی مخالف ہو گئے۔ لہٰذا میجر ایبٹ سری کوٹ سے کوچ کر کے (یعنی ناڑہ سید خانیاں سے) تنول کی طرف روانہ ہوا۔ اسی وقت غلام حیدر خان درانی فوج (ڈیڑھ ہزار) کے ساتھ میجر ایبٹ کو گرفتار کرنے کے لئے آگے بڑھا اور سرن کے آر پار مقابلہ ہوا۔ اس لئے میجر ایبٹ اپنا سب سامان لے کر کھچی تک آیا اور گڑھی جو متصل جوڑہ پنڈ ہے۔ وہاں پر زنبورہ لگا کر گولہ باری شروع کر دی۔ آخر کار درانی سوار تاب مقابلہ نہ پا کر واپس ہو گئے۔ راستہ میں درانیوں نے ستارہ خان ساکن پڈھانہ تعلقہ بھاروکوٹ[1] جو پہلے میجر ایبٹ کے ساتھ نوکر رہ چکا تھا اور

---

[1] درانی فوج نے بھاروکوٹ میں ڈیرہ کیا۔ یہاں سے سکھوں نے اس فوج کو اپنی مدد کے واسطے، انگریزوں کے خلاف بلایا لیکن وہاں پر ۲۱، فروری ۱۸۴۹ء میں گجرات میں ان کو شکست ہوئی اور درانی جلدی سے واپس چلے گئے۔ ہزارہ گزیٹر ۱۹۰۷ء)

اس کارڈ کا مسمی شیر خان جو تین چار ماہ چتر سنگھ کے ساتھ نوکر رہ چکا تھا، دونوں کو دیکھ کر قتل کر دیا۔

میجر ایبٹ خیر و عافیت سے شیروان پہنچ گیا۔ شیروان تک راستہ پر جا بجا مورچہ بندی کروا دی۔ اور خبر رسانی کا انتظام کر دیا۔

ایک دن غلام حیدر خان درانی کو غلام خان ترین و حسن شاہ، سید و بڈھا خان ولازاک سرائے صالح والہ و حیات خان ترک مانک رائے والہ متفقہ طور پر سوار کرا کر دیہات شنگڑی کی طرف لے گئے اور چند مواضعات سے مال مویشی چرانے والے لوگوں کو گرفتار کر لائے اور چند گھر جلا دیئے۔

جب گجرات و جہلم میں چتر سنگھ اور درانیوں کی فوج کو ایک سخت جنگ کے بعد شکست ہوئی اور سکھوں اور درانیوں کی فوج کے بہت سے سپاہی قتل ہو گئے تو دوسری طرف ملتان بھی فتح ہو گیا۔ اور درانی فوج شکست کھا کر واپس ہو گئی اور واپسی کے وقت ہزارہ میں موجود درانی فوج کو ساتھ لے کر جلدی سے کابل کی راہ لی اور اپنے مقتولوں اور زخمیوں کا حساب نہ لیا۔ چتر سنگھ وغیرہ سب سکھ شکست کھا کر راولپنڈی میں آئے۔ وہاں سے اپنے بال کٹوا کر اور لباس تبدیل کر کے بصورت مسافران اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔ اس طرح سے ان کو کسی نے نہ پہچانا۔

میجر ایبٹ صاحب نے اس کے بعد شیروان سے کوچ کیا اور جلدی جلدی کینتھلہ علاقہ خانپور میں فوج جمع کی۔ لوگوں کو اور اپنی فوج کو حکم دیا کہ مارگلہ کے راستہ پر بیٹھ جائیں۔ درانی فوج کو قتل کریں اور ان کا سامان لوٹ لیں۔ لہٰذا دو تین روز تک فوج درانیوں سے اونٹ، خیمے اور دیگر سامان لوٹ کر لاتی رہی۔ جب درانی فرار ہو گئے اور سکھوں نے ہتھیار ڈال کر جان کی امان مانگ لی اور اپنے گھروں کی طرف تیزی سے چلے گئے، تو میجر ایبٹ ہزارہ میں آیا اور قلعہ ہری کشن گڑھ کی سکھ فوج سے اسلحہ بندوق کمر، شمشیر حتیٰ کہ قبضہ شمشیر طلائی تک اتروا لیا۔ ان سپاہیوں کو قلعہ سے نکال دیا اور خود قلعہ میں داخل ہو گیا۔ اسی روز سے یعنی ۷ ماہ بیساکھ ۱۹۰۶ بکرمی مطابق ۱۲۔ اپریل ۱۸۴۹ء میں ہزارہ میں انگریزی عمل دخل ہو گیا۔ درانیوں کی واپسی کے بعد انتظامیہ کی کارروائی ڈپٹی کمشنر ہزارہ کے خط مورخہ ۱۱ جولائی ۱۸۴۹ء سے معلوم ہوتا ہے کہ غلام خان ترین، جب درانی ہزارہ کے نزدیک پہنچے تو ان کے ساتھ مل گیا۔ بعد میں خود بخود اس نے اپنے آپ کو میجر ایبٹ کے حوالے کر دیا اور اس کو اٹک کے قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ غلام خان کی جاگیر اس سے پہلے ہی بموجب خط ڈپٹی کمشنر ہزارہ مورخہ ۱۲ ۵/۱۸۴۹ء ضبط کی گئی تھی۔

جس کی منظوری گورنمنٹ آف انڈیا نے دے دی۔ لیکن یہ لکھا کہ اس کا جواب سنے بغیر قید کرنا ٹھیک نہیں۔ اس کا جواب اور دوسرے قیدیوں کو جو اٹک میں بند ہیں، پوری رپورٹ بھیجی جائے۔

بموجب خط مورخہ ۲۱ جنوری ۱۸۵۰ء بہ جواب طلب کرنے اور ان اشخاص کی فہرست جو درانیوں کے ساتھ شامل ہوئے تھے مانگی گئی۔ ایبٹ نے جواب دیا کہ اس فہرست اور بعد میں عدالتی کارروائی کی خبر سے تمام ضلع میں خوف وہراس پھیل جائے گا۔ لہٰذا یہ مناسب نہیں۔ بہت سے وفادار لوگ خوف اور لالچ کی وجہ سے درانیوں کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔

اس پر حکومت ہند نے جواب دیا کہ ایسے بااثر افراد کی فہرست بمعہ وجہ شمولیت جو واقعی دشمنوں سے مل گئے تھے بھیجی جائے۔ ان اشخاص کی فہرست مطلوب نہیں، جن کی وفاداری مشکوک تھی۔

پھر سے ہزارہ کو سکھ دربار کے حوالے کرنا

راجہ گلاب سنگھ ہزارہ کی حکومت اور مشکلات سے تنگ ہوا اور اس نے اس علاقہ سے ہاتھ اٹھانے کی پیش کش کر دی۔ اگر سکھ دربار اس علاقہ کے بدلے میں (دریائے جہلم سے مغرب کا علاقہ) جموں کے نزدیک کا علاقہ دے دے۔ یہ تبادلہ اس شرط پر منظور کر لیا گیا کہ پہلے ہزارہ کا منصفانہ بندوبست کیا جائے۔ اس آمدنی سے جاگیروں اور معافی ناموں کی رقم منہا کر لینے کے بعد بقیہ آمدنی نصف کے برابر کا علاقہ جموں کے نزدیک دیا جائے۔ اس طرح سے یہ جنت نظیر ضلع ڈوگرہ راج سے بچ گیا اور اس کے روشن مستقبل کی بنیاد اس دن سے پڑی۔

جیمس ایبٹ

یہ ایک قابل ترین انگریز فوجی افسروں میں سے تھا۔ جن کے ہاتھوں سے پنجاب میں انگریزی سلطنت کی مستحکم بنیادیں لارنس بھائیوں کی قیادت میں قائم ہوئیں فرنٹیر میں ہربرٹ ایڈورڈز، جارج لارنس، جان نکلسن اور ہاروئے لمسڈن کے ہاتھوں سے حکومت انگریزی کی بنیادیں مستحکم ہوئیں۔

ایبٹ آباد

یہ شہر میجر جیمس ایبٹ (ہزارہ کے پہلے ڈپٹی ۱۸۴۹ء تا ۱۸۵۲ء) کے نام سے موسوم ہے۔ اس کو ایبٹ کے جانشین میجر ایڈورڈ نے آباد کیا اور ایبٹ آباد نام رکھا۔ سب سے پہلے چھاؤنی کی تعمیر ہوئی اور ساتھ سرکاری دفاتر اور دیگر عمارات تعمیر ہوئیں۔

میجر ایبٹ کے وقت ضلع ہزارہ کی حکومت کا صدر مقام نواں شہر تھا۔ لیکن ہنگامی حالات

میں میجر ایبٹ کا قیام شیروان کے گاؤں کے عقب میں ایک پہاڑی پر ہوتا تھا، جہاں اس کے لئے کچا بنگلہ بنا ہوا تھا، جس کے آثار ۱۹۵۲، ۱۹۵۴ء تک موجود تھے۔

میجر ایبٹ کی سوانح زندگی

اس ضلع میں وہ انگریزی سلطنت کا صحیح معنوں میں معمار تھا۔ اپنی سیاسی قابلیت اور خوئے دل نوازی سے اس نے اہلِ ہزارہ کے دل جیت لئے۔ جس کے نتیجے میں اس نے صرف اہلِ ہزارہ کی مدد سے سکھوں کو اس ملک کی تیس سالہ حکومت کو چند ماہ میں معزول کر دیا۔

اس کے کارہائے نمایاں سے ہزارہ کی تاریخ کے اوراق بھرے ہوئے ہیں۔ اس کا نام زبان زدِ عوام ہے۔ اس کی تاریخی زندگی ایک افسانہ بن گئی اور یہ شہرت کی انتہا ہے۔

پیدائش

اس کی پیدائش انگلستان میں ۱۸۰۷ء میں ہوئی۔ وہ انگلستان کی مشہور سیاسی شخصیت ڈزرائیلی (DISRAELI) کا ہم جماعت تھا۔ ڈزرائیلی نے سیاست ملکی میں بڑا نام پیدا کیا تو ایبٹ نے اس ضلع میں تعمیر حکومت انگریزی کا کارنامہ انجام دیا۔

ملازمت

۱۸۲۳ء میں بنگال توپ خانہ میں بھرتی ہوا اور اسی سال کے آخر میں ہندوستان آیا۔ ۱۸۲۵ء میں بھرت پور کے محاصرہ میں موجود تھا۔ ۱۸۳۰ء میں ضلع آگرہ کے مالی بندوبست کا مہتمم رہا۔ ۱۸۳۸ء میں انگریزی فوج کے ہمراہ قندھار پہنچا۔ وہاں سے میجر ٹاڈ (DARCY TOAD) کا اسسٹنٹ ہو کر ہرات (افغانستان) بھیجا گیا۔

دسمبر ۱۸۳۹ء میں روسی قیدیوں کو خان خیوا کی قید سے رہا کرانے کے لئے مامور کیا گیا۔ مگر راستہ میں بحر کیسپین کے کنارے قزاقوں نے روسی سمجھ کر حملہ کر دیا۔ سب سامان لوٹ لیا اور اس کو بہت زدوکوب کیا، جس سے اس کے دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں کٹ گئیں۔ ۱۸ دن قید رہا۔ آخر رشوت اور دھمکیوں سے خلاصی حاصل کر کے، روسی قلعہ میں پناہ لی۔ وہاں اس کا علاج معالجہ کیا گیا۔ اس کے بعد ماسکو اور سینٹ پیٹرز برگ پہنچا اور قیدیوں کو چھڑانے میں کامیاب ہوا۔

۱۸۴۰ء میں انگلستان واپس ہوا۔ حکومت سے اس کارگزاری پر سند اور زخموں کی پنشن حاصل کی۔

۱۸۴۱ء میں پھر ہندوستان آیا۔ مارواڑ اور اندور میں تعینات رہا۔ ۱۸۴۶ء میں لاہور کی

ریذیڈنسی (RESIDENCY) کے ساتھ مقرر ہوا۔

ہزارہ میں آمد

پہلی بار وہ ۱۸۴۶ء میں یہاں آیا، تاکہ سرحد کھاٹر، گندگر اور علاقہ خان پور و جموں کی سرحدات کی حد برآری کرے۔

دوسری بار وہ ۱۸۴۷ء میں آیا، تاکہ ریاست جموں اور لاہور کے درمیان حد برآری کرے یہ حد برآری جون ۱۸۴۷ء میں مکمل کر دی گئی۔ اس کے بعد اس کو حاکم ہزارہ سردار چتر سنگھ کا مشیر مقرر کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس نے ہزارہ کا دورہ کیا۔ سب قلعے مرمت کرائے۔ سرحدات کا ملاحظہ کیا اور ملک کی کتاب ہائے مالیہ مقرر کیں۔ شروع ۱۸۴۸ء میں سرحدات کا دوبارہ ملاحظہ کیا۔ اس کے بعد کچھ دن اپنے بنگلہ، ہری پور شہر میں آرام کیا۔ بعد میں شیروان کے بنگلہ میں جا کر مقیم ہو گیا۔

سکھوں سے آویزش

ان ایام میں مولراج حاکم ملتان نے بغاوت کی۔ جس پر ہزارہ فوج نے بھی برایماء سردار چتر سنگھ (حاکم ہزارہ) نے بھی بغاوت کر دی۔ اس پر میجر ایبٹ اور سردار چتر سنگھ کے درمیان آویزش شروع ہو گئی، جس کے نتیجہ میں سکھوں کو شکست ہو گئی اور یہاں پر انگریزی حکومت قائم ہو گئی اور میجر ایبٹ اس ضلع کا پہلا ڈپٹی کمشنر مقرر ہوا۔

اس کے متعلق میجر ایڈورڈ اپنی کتاب "پنجاب و سرحد پر ایک سال ۱۸۴۸ء، ۱۸۴۹ء کے دیباچہ میں لکھتا ہے، کہ:

> "انگریزی حکومت، جنگ جیت لینے کے بعد اپنے فوجی افسروں کو تہذیب انگریزی کا پیام بر بنا کر وہاں بھیجتی ہے، جہاں مندروں میں بت پرستی، عدالتوں میں رشوت اور بددیانتی اور تخت حکومت پر براجمان حکمرانوں میں ظلم و تعدی رائج ہوتی ہے۔ میجر ایبٹ ایسا ہی ایک انگریز افسر تھا۔"

میجر ایبٹ کا اثر و رسوخ

اگرچہ وہ ہزارہ کے حاکم کا مشیر مقرر ہو کر یہاں آیا۔ لیکن عملاً وہی حکمران تھا۔ ہزارہ میں فوج کی نقل و حرکت، ان کی تنخواہ کی ادائیگی، مالیہ اور واجبات حکومت کی وصولی، خزانہ کا انتظام اسی کے حکم سے ہوتا تھا۔ نظام عدالت ہزارہ کا وہی سربراہ تھا۔ ہزارہ کے علاوہ اس کا حکم علاقہ چھچھ، کھاٹر، پوٹھوہار اور کھوٹہ ضلع راولپنڈی تک چلتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ پشاور میں متعین انگریز افسروں کا بھی مشیر تھا۔

ذاتی اوصاف اور خوئے دل نوازی

میجر ایبٹ نے اپنی پر امید اور مستعد طبیعت، دلیری، مخلص مزاجی اور سخاوت طبع کی وجہ سے باشندگانِ ہزارہ کے دلوں کو جیت لیا تھا۔ لوگ اس پر فدا تھے اور وہ ان پر مہربان تھا۔ بچے تو اس کے گرد پروانوں کی طرح جمع ہو جاتے اور شور مچاتے کہ چچا ایبٹ آ گیا۔ وہ بھی ان کی خوشنودی کے لئے اپنی جیبوں میں مٹھائی جمع رکھتا اور بچے دوڑ دوڑ کر اس کی جیب سے مٹھائی نکالتے اور کھاتے تھے۔

میجر ایبٹ کا ایک سال ہی یہاں ہوا تھا کہ ریذیڈنٹ نے اپنی رپورٹ میں لکھا، کہ:

"لوگ اس پر پرستش کی حد تک عاشق ہیں۔ جو لوگ بھی ہزارہ سے میری ملاقات کے لئے آتے ہیں، اس کی بے حد تعریف کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اس قوم سے ہر کام حسبِ خواہش لے سکتا ہے۔ جس قوم کو سکھ، اپنے تمام عہدِ حکومت میں کبھی بھی رام نہ کر سکے اور جس کو ہوشیار و چالاک راجہ گلاب سنگھ نے بھی ہر شرط پر دربار کے حوالہ واپس کرنا منظور کیا۔ اس قوم کو میجر ایبٹ نے اپنی خوئے دلنوازی سے رام کر لیا۔"

میجر ایبٹ کی یہاں سے تبدیلی

کاغان کی مہم ۱۸۵۲ء کے خاتمہ پر ایبٹ نے تجویز کی کہ کاغان میں پولیس کی چوکی برائے امن قائم کی جائے۔ لیکن کمشنر پشاور میجر ایڈورڈ کی رائے تھی کہ پہلے سڑک بنائی جائے، تا کہ وقتِ ضرورت اس چوکی کو فوری طور پر مدد پہنچائی جا سکے۔ ان دو قابل ترین اور ہم رتبہ انگریز افسروں کے اختلاف میں زیادتی ہو گئی اور آخر کار ایبٹ کو یہاں سے جانا پڑا۔

ایبٹ نے اس تبدیلی کے حکم کو خوشی سے منظور کیا۔ (زندہ قوموں میں نظم و ضبط کا ثبوت ہے) ہزارہ، جو اس کو بے حد محبوب تھا، سے چلے جانے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ ہزارہ کے لوگوں کو تین رات، ناڑہ سید خانیاں (کھلابٹ سے اوپر کے گاؤں)، کے مقام پر دعوت دیتا اور الوداع کہتا رہا۔ اپنا سب روپیہ خرچ کر کے جب جانے لگا تو اس کی جیب میں صرف ایک ماہ کی تنخواہ رہ گئی تھی۔ لوگوں نے حسرت و غم سے بھرے ہوئے دل کے ساتھ اس کو رخصت کرنے کیلئے حسن ابدال تک گئے۔

نوٹ: اس کا ایک ہم عصر نکلسن تھا۔ وہ ضلع راولپنڈی کا ناظم تھا۔ جس نے آخر میں دہلی کی فتح میں

حصہ لیا تھا۔ ان دونوں کے متعلق مؤرخین کی رائے ہے کہ لوگ نکلسن کی پرستش کرتے تھے، مگر اس سے ڈرتے بھی تھے۔ ایبٹ کی پرستش کرتے اور اس سے محبت بھی کرتے تھے۔

اہلِ ہزارہ سے ایبٹ کی محبت

۱۔ جاگیروں کی مقدار فراخدلانہ طور پر بہت زیادہ مقرر کر کے منظوری کے لئے مرکزی حکومت کو پیش کی۔ جس پر گورنر جنرل نے سخت ناراضی کا اظہار کیا۔ اس کے جواب میں میجر ایبٹ نے تحریر کیا کہ فراخدلانہ عطائیگی کے مفصل وجوہات پہلے ہی لکھ دیئے گئے ہیں۔ میری ایماندارانہ رائے کے مطابق اس سے سرکاری آمدنی میں کمی نہ ہوگی اور اس سے آخر کار جو طمانیت اور قوت نادار لوگوں کو حاصل ہوگی، اس سے پولیس اور فوج کی تعداد کم کرنے سے آمدنی میں اضافہ ہوگا۔

۲۔ گورنر جنرل کے بار بار اصرار پر بھی اس نے ان لوگوں کے نام، جو دورانِ جنگ میں سکھوں اور درانیوں سے مل گئے تھے، مرکزی حکومت کو نہ بتلائے اور لکھا:

> "جو خوانین دشمنوں سے مل گئے تھے، ان کے نام نہ بتلانے میں ہچکچاہٹ کی وجوہات یہ تھیں۔
>
> میں اپنی تفتیش کے نتیجہ سے خود ہی اتنا پر یقین نہ تھا، کہ حتمی طور پر ان کے نام لکھ سکتا، جنہوں نے واقعی غداری کی تھی۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ میں کہیں ایسے لوگوں کے نام لکھ کر غلط اقدام نہ کر لوں اور ایسے اشخاص کی وفاداری پر شبہ کروں، جن کا سخت قصور یہی تھا کہ انہوں نے اس وقت ہتھیار ڈالے جب مخالفت ناممکن تھی۔ میری زندگی اور آزادی کے محافظ یہی ہزارہ کے لوگ ہیں۔"

۳۔ مرکزی حکومت کی تجویز تھی کہ میدان ہزارہ یا ڈھونڈہ و کڑال کے پہاڑوں پر انگریزی فوجوں کے لئے چھاؤنی بنائی جائے۔ اس نے اس تجویز کی مخالفت کی اور اپنے دلائل تفصیل سے دیئے، جن کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ ہزارہ کے لوگ بہت غیرت والے ہیں۔ وہ کسی غیر قوم کے فرد کو، خواہ وہ انگریز حاکم ہی کیوں نہ ہو۔ اپنے گھروں کے سامنے جہاں ان کی مستورات پر نظر پڑ سکے، برداشت نہیں کر سکتے اور گورہ سپاہیوں کی بے باکانہ حرکات سے یہ لوگ مشتعل ہو جائیں گے اور حکومت کو مشکلات پیش آجائیں گی۔ لہٰذا ہزارہ کے پہاڑوں پر گورہ فوج اور انگریز افسران کا مقیم کر دینا ایک خطرناک

تجربہ ہوگا۔

میجر ایبٹ کی عادات اور اس کے روزانہ کے معمولات

آخر میں اس کی ڈائری سے اس عنوان پر روشنی ڈال کر اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں، تاکہ اس کی کامیابی کا راز معلوم ہو سکے۔

۱۔ وہ مذہب کا پابند تھا۔ ہر اتوار جہاں کہیں بھی مقام ہوتا، صبح کے وقت وہ عبادت کرتا تھا۔ اس کا ذکر اس نے بڑے شوق اور دلی طمانیت سے، اپنی بہت سی ڈائریوں میں کیا ہے۔

۲۔ صبح سویرے، ہر روز وہ سیر کے لئے جایا کرتا تھا۔

۳۔ سیر سے واپسی پر دس بجے تک سرکاری کام، دفتری کاغذات اور سرکاری خطوط کے جوابات لکھتا اور دیگر انتظامی معاملات کے بارے میں ملازموں کو ہدایات دیتا تھا۔

۴۔ دوپہر کے کھانے کے بعد شام (غروب آفتاب) تک لوگوں کی عرضیاں سنتا۔ ان پر احکام صادر کرتا۔ مقدمات کی سماعت کرتا اور فیصلے سناتا تھا۔ مقدمات کو بلا تاخیر روزانہ سننے اور بروقت فیصلہ کرنے کو وہ بہت زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ اس کی انصاف پروری سے لوگ مطمئن اور خوش تھے اور اس پر کلی اعتماد رکھتے تھے اور ہر وقت اس کی آواز پر لبیک کہنے کے لئے آمادہ رہتے تھے۔ وہ خود بھی لوگوں کے اس اعتماد کو اپنی قوت اور اثر و رسوخ کی بنیاد سمجھتا تھا۔

ایبٹ کی کارگزاری

ہزارہ میں قیام امن

ایبٹ یکم جون ۱۸۴۷ء کو ہزارہ میں داخل ہوا اور سید ھاہری پور پہنچا۔ ۲ جون کو اس کو خبر ملی کہ دیوان کرم چند کو علاقہ ڈھونڈ میں شکست ہوئی۔ اسی مہینہ میں اس نے نواں شہر اور مانسہرہ کے قلعوں کا معائنہ کیا۔ دونوں قلعوں میں فوج بوجہ مدت سے تنخواہ نہ ملنے کے بغاوت پر تیار کھڑی تھی اور علاقہ کے لوگوں کا حکومت کی ظلم و تعدی سے ناک میں دم تھا۔ مانسہرہ تحصیل کے دورہ میں وہ وانس اگنیو (VANSAGNEW) سے بھی گڑھی حبیب اللہ میں ملا اور اس کے ساتھ علاقہ ڈھونڈ اور کرڑال کے معاملات پر مشورہ کیا۔ ان علاقوں سے جموں کی فوجوں کو نکالنے کا انتظام کر کے مہینہ کے آخر میں ہری پور واپس پہنچ گیا۔

میجر ایبٹ کی تارخیلی قوم سے آویزش

یہ گندگر کی زبردست قوم میدانی علاقوں پر ہمیشہ یلغار کرکے واپس گندگر میں پناہ لیتی رہتی تھی۔ میجر ایبٹ نے ان کو مغلوب کرنے کے لئے لفٹیننٹ جان نکلسن سے مل کر حملہ کیا۔ نکلسن حسن ابدال سے براہ کھڑی سلم کھنڈ (تارخیلی قوم کے مرکزی گاؤں) پر اور ایبٹ ہری پور کی طرف سے یکبارگی ۴ جولائی ۱۸۴۷ء میں حملہ آور ہوئے۔ لیکن تارخیلی اس حملہ کی خبر پاکر جلدی سے گاؤں خالی کرکے سری کوٹ کے پہاڑوں پر چلے گئے۔ بہرحال دونوں فوجیں سلم کھنڈ پہنچیں اور اس علاقہ کے فتح ہونے سے باقی اقوام ہزارہ کے حوصلے بھی پست ہو گئے۔ اس کے فوراً بعد جہاں دادخان نواب امب، سادات کاغان اور ناڑہ کے کرڑالوں نے اطاعت قبول کرلی۔ طاہر خیلی خوانین بھی چند ماہ کھیل میں رہنے کے بعد واپس آگئے۔ کچھ عرصہ زیرحراست رہنے کے بعد ان کو رہا کرکے اپنے گھر جانے کی اجازت دے دی گئی۔

قوم ڈھونڈ سے آویزش

ہزارہ میں صرف ڈھونڈ ہی ایسی قوم تھی جو سب سے آخر مطیع ہوئی میجر ایبٹ جب ناڑہ میں گیا اور کرڑالوں کا نظم و نسق درست کرلیا تو پھر نومبر ۱۸۴۷ء میں خان پور گیا۔ وہاں سے وہ دریائے ہرو کے راستہ سے علاقہ ڈھونڈ کی طرف گیا اور ڈنہ (لورہ سے اوپر پہاڑ کی چوٹی) پر پہنچا۔ راولپنڈی سے بھی ایک فوج اس کی امداد کے لئے زیرکمان سردار جھنڈا سنگھ آکر مل گئی۔ ڈھونڈ مقابلہ کی تاب نہ لاکر جلد ہی مطیع ہو گئے وہاں سے وہ کہوٹہ ضلع راولپنڈی گیا۔ کیونکہ مری کا ڈھونڈ علاقہ بھی اس کے ماتحت تھا۔ ان کا انتظام وغیرہ کرنے کے بعد اس نے کشمیر پنجاب کی سرحد پر لگے ہوئے پیل پایوں (PILLARS) حد بندی کے میناروں کا بھی معائنہ کیا جو اس نے ایک سال پہلے لگوائے تھے۔

بغاوت ملتان

۱۶ اپریل ۱۸۴۸ء وانس اگنیو (VANUS AGNEVE) اور اینڈرسن (ANDERSON) کو ملتان میں قتل کر دیا گیا اور دوسرے سکھوں کی لڑائی شروع ہوئی اور جس کے اختتام پر تمام پنجاب حکومت انگریزی کے ماتحت آگیا۔ اس واقعہ کی اطلاع میجر ایبٹ کو ہری پور میں ۱۹ اپریل ۱۸۴۸ء کو ملی۔ ان ایام میں قلعہ ہری پور (ہرکشن گڑھ) میں چار ہزار فوج زیرکمان ناظم سردار چتر سنگھ اور نائب

ناظم سردار جھنڈا سنگھ تھی۔ دو رجمنٹ بمعہ توپ بمقام گاندھیاں (تحصیل مانسہرہ) زیر کمان کرنل بھوپ سنگھ اور بہادر سنگھ مقیم تھیں۔ اس طرح تھوڑی تھوڑی فوج جس میں سکھوں کے علاوہ پوربی اور مسلمان سپاہی تھے، ہزارہ کے چھوٹے چھوٹے قلعوں میں موجود تھی۔

سردار چتر سنگھ

سکھوں میں بہت بڑا سردار تھا۔ بہت بڑی جائداد اور جاگیر کا مالک تھا اور مہاراجہ کشمیر کا دلی دوست تھا۔ اس کی لڑکی مہاراجہ دلیپ سنگھ در نجیت سنگھ کا پوتا جوان دنوں پنجاب کا برائے نام حکمران تھا، کو منسوب تھی۔ یہ سکھ حکومت میں کافی مدت افسر اعلیٰ رہا۔ اگرچہ وہ بوڑھا تھا اور صحت کمزور تھی، تاہم بہت ہوشیار، زیرک اور زمانہ شناس تھا۔ جھنڈا سنگھ کا جو ایک قابل اعتماد اور اچھا سپاہی تھا۔ اس پر کافی اثر تھا۔

میجر ایبٹ کے ساتھی صرف محکمہ (SURVEY) (پیمائش) کے چند نفوس تھے اور ایک لفٹیننٹ رابنسن (R.C. ROBINSON) تھا۔ ۲ مئی ۱۸۴۸ء کو دربار لاہور سے حکم آیا کہ فوج زیر کمان جھنڈا سنگھ ہری پور سے جنوب کی طرف جائے تاکہ سندھ ساگر دواب میں امن قائم رکھے، لہٰذا ۵ مئی ۱۸۴۸ء رسالہ اور پیادہ رجمنٹ بمعہ خوانین ہزارہ کے بھیجی گئیں اور چند توپیں اور کچھ فوج ہری پور ہی رکھی گئی۔

ہزارہ مئی ۱۸۴۸ء

متذکرہ بالا فوج کے جانے کے بعد چند ہفتے امن وامان رہا۔ کبھی کبھی کرنل کنارا (CANARA) (جو امریکن تھا اور توپ خانہ کا کمانڈر تھا) کے سپاہیوں میں آثار بغاوت ظاہر ہوتے تھے، جو دیوان مولراج کی سازش کی وجہ سے تھے۔ کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ انگریزوں سے نجات حاصل کی جائے، لیکن ظاہری تعلق مابین میجر ایبٹ و ناظم اچھا رہا۔ میجر ایبٹ کی کوشش تھی کہ لوگوں میں امن رہے اور باوجود فوجوں کے چلے جانے اور کرڑاول میں بدامنی کی افواہوں کے لوگ عام طور پر پرسکون رہے۔

بغاوت کے آثار

میجر ایبٹ اور اس کے عملہ کی صحت ہری پور کے پانی سے خراب ہو گئی تھی، لہٰذا اس نے ۲۳ مئی ۱۸۴۸ء کو ۴ میل دور علاقہ تناول دچھی میں

اپنا کیمپ برائے تبدیلی آب و ہوا لگایا۔ اس کے ہری پور سے چلے جانے پر بدامنی کے آثار شروع ہو گئے۔ یکم جون کو وہ ہٹ کر اپنے بنگلے واقع شیروان چلا گیا۔ اس اثنار میں حالات خراب ہوتے رہے۔ میجر ایبٹ کی ڈاک کے تھیلے راستہ میں روکے جانے لگے۔

اس اثنار میں کوئی گرو لاہور سے آیا اور ناظم سے ملاقات کی اور جھنڈا سنگھ کی رجمنٹ باغی ہو گئی۔ جولائی کے شروع میں پکھلی والی فوج کے، جو ملتان جانے کے لئے بے تاب تھی، منحرف ہونے کی خبریں ملنے لگیں۔ اس پر میجر ایبٹ کو چتر سنگھ کے عزائم کے متعلق شک ہوا۔ وہی گرو پشاور سکھ فوجوں کے ورغلانے کے لئے بھیجا گیا اور ہزارہ کے رئیسوں کو بھی منحرف کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ یکم اگست کو خبر ملی کہ پکھلی کی افواج آخر کار اپنے کمانڈروں کے نیم دلانہ مخالفت کے لئے حرکت میں آنے کے لئے تیار ہو گئیں۔ ایبٹ ان کا راستہ روکنے کے لئے تیار رہا، تاکہ یہ افواج ہری پور کی افواج سے نہ مل سکیں۔ ایبٹ نے تنولیوں اور جدونوں کو درہ سلہڈ و مانگل پر بیٹھا دیا، تاکہ ان کا راستہ روک لیں۔ یہ دیکھ کر وہ افواج حرکت کرنے سے رک گئیں۔ اس اثنا میں سردار چتر سنگھ نے میجر ایبٹ کو شیروان میں ایک خط لکھا کہ وہ وفادار رہے۔ اور اس ضمانت کے لئے وہ اپنے لڑکے عطر سنگھ کو بھیجنے کے لئے تیار رہے۔ ایبٹ نے اس میں کوئی دھوکا محسوس کیا اور نہ مانا۔ دوسرے دن کرنل کنارا کا خط ملا کہ چتر سنگھ کی فوج قلعہ سے باہر آگئی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ توپوں پر، جو کرنل کنارا کے ماتحت تھیں، قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس حملہ میں کرنل کنارا مارا گیا۔

کرنل کنارا

یہ سکھوں کے توپ خانہ کا افسر تھا اور امریکی تھا، جو چتر سنگھ کے حکم سے مارا گیا۔ اس کی قبر ڈاک بنگلہ ہری پور سے جانب مشرق لب سڑک جرنیلی تھی۔ چند سال ہوئے یہ قبر گرادی گئی ہے اس کی قبر کا کتبہ پشاور کے عجائب گھر میں محفوظ ہے اور کتبہ یہ ہے۔ انگریزی عبارت کا ملخص حسب ذیل ہے:

"بیادگار کرنل کنارا، جو سکھ توپ خانہ کا افسر تھا۔ جب سکھ باغیوں نے اس سے

توپیں حوالے کرنے کا مطالبہ کیا تو اس کے انکار پر باغی سکھ فوجوں کے ہاتھ سے اکیلا جنگ کرتے ہوئے مارا گیا۔ کیونکہ اس کے اپنے ماتحت فوج سکھوں سے جا ملے۔

تاریخ ۶ر جولائی ۱۸۴۸ء"

سردار چتر سنگھ نے کرنل کنارا کے قاتلوں کو ایک ہزار روپیہ انعام دیا اور اپنے عمل سے یہ ظاہر کر دیا کہ وہ کس کا جانب دار تھا۔ اس کے بعد چتر سنگھ نے کوشش کی کہ نواب جہانداد خان والئی امب اس کے ساتھ مل جائے اور مہاراجہ کشمیر کو بھی امداد کے لئے خطوط بھیجے۔ یہ سب خطوط میجر ایبٹ نے راستہ میں پکڑ لئے۔

حکومت انگریزی کی طرف سے بموجب خط نمبر ۱۴۹۲ مورخہ ۱۱ر جون از سکرٹری گورنر جنرل ہند کرنل کنارا کے چار نابالغ بچوں کو اٹھارہ سال کی عمر تک کے لئے پندرہ روپیہ ماہوار فی کس بطور پنشن منظور کئے گئے۔

چتر سنگھ نے ان واقعات کو اپنی چالاکی سے دوسرا رنگ دینے کی کوشش کی اور ریذیڈنٹ لاہور کو لکھا کہ

ایبٹ، اہالیان ہزارہ کو سکھوں کے خلاف اکسا رہا ہے اور مجھ (چتر سنگھ) پر نہ اعتبار کرتا ہے اور نہ ہی کوئی اختیار میرے ہاتھ میں چھوڑا ہے اور مجھے محض صفر کر دیا ہے۔ میں نے لوگوں کی بغاوت کے اندیشہ سے فوج اور توپیں شہر سے باہر نکال لی ہیں، تاکہ محفوظ مقام پر چلے جائیں۔ کرنل کنارا میرے حکم کی تعمیل کے انکار کی وجہ سے لوگوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اس میں میرا کیا قصور ہو سکتا ہے"۔

ریذیڈنٹ نے چتر سنگھ کی بات سے اتفاق کیا اور کرنل کنارا کے قتل سے چتر سنگھ کو بری سمجھتے ہوئے اپنا اسسٹنٹ تحقیق کے لئے ہزارہ بھیجا، تاکہ وہ مکمل تحقیقات کرے اور اختیار ایبٹ کے ہاتھ سے لے لے۔ لیکن ہزارہ کی نازک صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ حکم منسوخ کر دیا اور سابق نائب ناظم ہری پور جھنڈا سنگھ کو ہزارہ بھیجا تاکہ ایبٹ اور چتر سنگھ میں صلح کرا دے، لیکن صورتِ حال

نوٹ: ان حالات کے ساتھ مہتاب سنگھ کی تحریر کردہ تاریخ ہزارہ سے مقابلہ کرنے سے بہت سے دوسرے پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

دن بدن خراب ہو رہی تھی - ایبٹ نے کوشش کی کہ چتر سنگھ کو نہ باہر سے اور نہ اندرون ہزارہ سے کوئی مدد مل سکے - وہ خود ۸ ر اگست ۱۸۴۸ء کو شیروان سے ناڑہ ، دامن گندگر میں آ گیا اور ۱۲ ر اگست لفٹیننٹ رابنسن کو درہ مانگل کی حفاظت کے لئے بھیج دیا - اس اثنار میں جان نکلسن نے قلعہ اٹک پر قبضہ کر کے سکھوں کو باہر کر دیا اور مارگلہ جا پہنچا - وہاں سے جو سکھ فوج زیر کمان پرتاپ سنگھ ہزارہ کی طرف آ رہی تھی اسے دھمکی سے واپس راولپنڈی بھیج دیا - لیکن ابھی تک ریذیڈنٹ چتر سنگھ کے ساتھ صلح کی کوشش کر رہا تھا - جب جھنڈا سنگھ ناکام ہو کر واپس گیا تو اس نے دیوان دینا ناتھ کو صلح کی غرض کے لئے بھیجا - لہٰذا نکلسن اور ایبٹ اس اثنار میں چتر سنگھ پر کوئی حملہ نہ کر سکتے تھے۔ یہ بات چیت جاری تھی کہ چتر سنگھ اپنی فوج کو لے کر حسن ابدال کی طرف جانے لگا - ایبٹ نے اس کا تعاقب کیا اور اس کے کیمپ کو جو حسن ابدال اور ہری پور کے درمیان تھا ، جا لیا - بات چیت کی گئی ، لیکن صلح نہ ہو سکی - چتر سنگھ پھر حسن ابدال کی طرف چل پڑا - چتر سنگھ اپنی فوج کو لے کر عثمان کھٹڑہ کی طرف چلا گیا ، تا کہ پرتاپ سنگھ سے مل جائے جو راولپنڈی سے پھر واپس آ گیا اور مارگلہ پار کر چکا تھا -

اب سکھوں کی فوج نے ہری پور کے راستہ سے آ کر رجوعیہ میں کیمپ کیا د ستمبر ۱۸۴۸ء تا کہ پکھلی کی فوج کی امداد کو پہنچ سکیں - ایبٹ اور نکلسن نے سلہڈ اور دھمتوڑ کے دروں پران کا مقابلہ کیا لیکن ناکام ہوئے - نکلسن حسن ابدال کو اور ایبٹ ، ناڑہ ، اپنے محفوظ مقامات کو چلے گئے۔

۸ ر اکتوبر ۱۸۴۸ء کو چتر سنگھ ہری پور میں چند روز قیام کرنے کے بعد میدان کو چلا گیا - وہاں دریائے سندھ کے بائیں کنارے سے ہوتا ہوا ضلع ہزارہ میں اس خیال سے داخل ہوا کہ سلم کھنڈ قلعہ کے سپاہیوں کو آزاد کرائے - ایبٹ نے اس کا مقابلہ کیا - لیکن وہ سلم کھنڈ کے سکھوں کو لیکر واپس ہو گیا - سکھوں کے دو سو فوجی قتل ہوئے - ایبٹ کی طرف سے عطا محمد خاں تارخیلی جو تلوار ہاتھ میں لئے حملہ کر رہا تھا ، مارا گیا - اس واقعہ کے ایبٹ سری کوٹ اور ناڑہ میں خاموش بیٹھا رہا - کہ آخر اکتوبر ۱۸۴۸ء میں امیر دوست محمد خان پشاور آ گیا - ایبٹ نے جب یہ خبر سنی تو دسمبر میں دوست محمد خان کو ایک خط لکھا - کہ آپ کی آمد امید ہے دوستانہ ہے - سرکار سکھوں کی بغاوت کو کچلنے کا پورا انتظام کر رہی ہے اور وہ آپ کی امداد کی بھی طالب ہے - اگرچہ اس کا یہ خط

گورنر جنرل کی منظوری کے بغیر تھا اور غیر ماتحتانہ۔ تاہم اس خط نے دوست محمد خان کے دلی خیالات کو ظاہر کروالیا۔ اس نے کہا کہ وہ اضلاع پشاور، ڈیرہ جات اور ہزارہ کو اپنے لئے حاصل کرنے کے لئے آیا ہے۔

سکھوں کے مقابلے میں یہ مصیبت زیادہ تھی کیونکہ افغان اور اہل ہزارہ مسلمان اور ایک قوم تھے۔ دوست محمد خان نے اپنی فوج زیر کمان اپنے لڑکے غلام حیدر خان جنوری ۱۸۴۹ء ہزارہ میں بھیجی اور کچھ خوانین ہزارہ ان کے ساتھ مل گئے۔ ان خوانین میں سے قابل ذکر خانی زمان خان طاہر خیلی اور غلام خان ترین ہیں۔ جب افغان فوجیں ہزارہ میں داخل ہوئیں تو ایبٹ گندگر سے ہٹ کر شیروان آگیا۔ کہ یہ محفوظ ترین مقام اور کشمیر کو جانے والی افواج کے راستہ میں بھی تھا اور یہاں ان کو کشمیر جانے کے لئے روکنا آسان تھا۔ ایبٹ کے گندگر سے چلے جانے کے بعد افغان افواج نے بہ رہنمائی خان خانی زمان خان طاہر خیلی، سری کوٹ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد افغان فوج نے دریائے دوڑ کو عبور کر کے شیروان پر حملہ کرنے کے لئے بھاروکوٹ[1] میں مقام کیا۔ وہاں سے ان کو سکھوں نے اپنی امداد کے لئے فوری طور سے واپس بلایا، تاکہ انگریزی فوج کا مقابلہ کرسکیں جو آخر کار شمال کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ لیکن ۲۱ فروری ۱۸۴۹ء کی جنگ گجرات میں انگریزی فوج کی مکمل فتح نے ان کے سب منصوبے خاک میں ملا دیئے۔ افغان فوجیں جلدی سے اٹک پار کر کے اور پشاور خالی کرتے ہوئے واپس افغانستان پہنچ گئیں اور ایبٹ اپنی لیوی (۷۶۲) سپاہیوں کے ساتھ مارگلہ پر جا پہنچا اور وہاں سے اس نے آخری نقشہ میدان راولپنڈی میں سکھوں

---

[1] ۔ بھاروکوٹ، مطابق صورت دیہی ۱۸۷۲ء یہ اخون خیلاں تربیلہ کی پرانی آبادی ہے اور اس عملداری کو جسے سو برس (یعنی ۱۸۷۲ء میں) گزرا ہو گا کہ اقوام اتمان زئی نے بہ باعث قتل ہو جانے رضا خان سید خانی کے از دست سلیمانیاں (شلمانی قوم موسوم بہ اخون خیل۔ ش ب)، ویران کر دیا۔ تھوڑی دیر کے لئے پھر آباد ہو گئی۔ لیکن دیوان ہری چند نے ۱۹۰۲ بکرمی (۱۸۴۵ء) میں جلا دیا۔ انگریزوں نے جوڑا پنڈ (متصل بھاروکوٹ) میں اپنی چھاؤنی بنائی۔ ۱۸۵۲ء میں انگریزوں نے دھمتوڑ میں چھاؤنی بنائی۔ اور بعد میں میجر ایبٹ نے ایبٹ آباد کو چھاؤنی بنایا۔ بھاروکوٹ کی وجہ تسمیہ اونچی جگہ ہے۔ اس واسطے یہ نام کوٹ نامزد ہے۔

کا انگریزی فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا نظارہ مارگلہ کی چوٹی سے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ سکھوں کی دوسری جنگ کے اختتام پر ایبٹ کے کارنامے بہادری اور اثرورسوخ پر حکومت اور پارلیمنٹ نے شکریہ ادا کیا اور اس کو ہزارہ کا پہلا ڈپٹی کمشنر بنا دیا۔ اس عہدہ پر ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۳ء تک رہا۔ اس عرصہ میں اس نے ہزارہ میں مکمل امن وامان قائم کر دیا۔ نظامِ حکومت میں اصلاح کی۔ مالیہ کا بندوبست ازسرِنو کر کے لوگوں کو مطمئن کر دیا اور ملک خوشحال ہوگیا۔ اس کے دورانِ حکومت میں صرف دو قابلِ ذکر واقعات ہوئے۔ پہلی مہم ڈھاکہ کی طرف ہوئی اور دوسری سادات کاغان کے خلاف ہوئی۔

نوٹ ۱: بموجب ڈائری ۱۱ راپریل ۱۸۵۰ء ہری پور کا قلعہ، جیل، خزانہ اور عدالتیں جو سکھوں نے تباہ کر دی تھیں، میجر ایبٹ نے پھر سے ان کو تعمیر کرایا۔ اس سے دو سال پہلے اس نے تمام ضلع میں مناسب جگہوں اور فاصلوں پر ضلع افسران کی آسانی اور رہائش کے لئے ڈاک بنگلے بنائے، تا کہ دورہ کرنے والے افسر آرام سے مقام کر سکیں۔ ضلع کے لوگوں کے امن اور خوشحالی کے لئے ضروری تھا کہ انگریز افسر ہر جگہ موجود نظر آئیں۔

بموجب ڈائری ۲: ۱۴ راگست ۱۸۵۰ء کے مطابق میجر ایبٹ نے سری کوٹ کے چار ملکوں کو جن کو خدمات کے صلہ میں تنخواہ نہیں ملی تھی۔ بیس ہزار روپیہ کی بچت سے دینا منظور کیا۔

۳۔ میجر ایبٹ کے وقت یہ فیصلہ کیا گیا تھا، تین سال سے زائد میعاد کے قیدی ضلع ہزارہ سے باہر بھیجے جائیں۔

مہم کاغان ۱۸۵۲ء

سادات کاغان کے سخت سلوک کی شکایت کاغان کے گوجروں نے میجر ایبٹ سے کی اور جاسوسوں نے ایبٹ کو یہ اطلاع بھی دی کہ سادات کاغان مجاہدین سے مل کر بغاوت کی تیاریاں کر رہے ہیں اور ڈھونڈ قوم کو بھی اکسا رہے ہیں۔ لہٰذا ایبٹ نے ضامن شاہ رئیس سادات کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ ہری پور میں رکھا۔ لیکن ضامن شاہ کی درخواست پر بورڈ آف ایڈمنسٹریشن، لاہور نے ضامن شاہ کو ضمانت پر رہا کر دینے کا حکم دیا۔ ایبٹ نے اس کو رہا کر دیا، مگر اس کے لڑکے کو اپنے پاس رکھا۔ بعد میں وہ بھاگ کر کاغان چلا گیا۔ واقعات بگڑتے گئے، یہاں تک کہ کمشنر پشاور کرنل میکسن

جب ہزارہ آیا تو ضامن شاہ اس کے بلانے پر اس کے پاس نہ آیا۔ لہٰذا ایبٹ کو فوج کے ایک دستہ کے ساتھ بالاکوٹ سے کاغان بھیجا گیا اور لفٹیننٹ پیرس (PEARSE) ایک اور دستہ کے ساتھ کشمیر سے کاغان کی طرف بڑھا اور ریوی کے سپاہی وادی بھوگڑمنگ میں موسٹے کے مصلے سے بڑھ کر کاغان کی طرف بڑھے۔ سادات نے کوئی مقابلہ نہ کیا اور اطاعت قبول کی بطورِ سزا ان کو کاغان سے ملک بدر کر کے تاحکم ثانی پکھلی میں رہنے کا حکم دیا۔ مہم کے اختتام پر ایبٹ کی تجویز تھی کہ کاغان میں پولیس کی چوکی برائے امن قائم کی جائے۔ کمشنر کی رائے تھی کہ پہلے سڑک بنائی جائے تاکہ وقت ضرورت اس چوکی کو فوری طور پر مدد پہنچائی جا سکے۔ ان دو قابل ترین انگریز افسروں[۱] کے اختلاف میں زیادتی ہوتی گئی اور آخر کار ایبٹ کو یہاں سے جانا پڑا۔

ایبٹ نے اس تبدیلی کے حکم کو خوشی سے منظور کیا اور ہزارہ سے جو اس کو بے حد محبوب تھا جانے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ ہزارہ کے لوگوں کو تین رات نارڑہ سید خانیاں کے مقام پر دعوت دیتا رہا اور الوداع کہتا رہا۔ اپنا سب روپیہ خرچ کر کے جب وہ جانے لگا تو اس کی جیب میں صرف ایک ماہ کی تنخواہ تھی۔ لوگ حسرت کناں و گریہ کناں حسن ابدال تک اس کو رخصت کرنے کے لئے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ نکلسن کی پرستش کرتے تھے، مگر اس سے ڈرتے بھی تھے۔ ایبٹ کی پرستش کرتے تھے اور اس سے محبت بھی کرتے تھے۔ انگریزی حکومت کو مضبوط بنیاد اس ضلع میں اس کے ہاتھوں سے پڑی۔

ایبٹ یہاں سے جا کر پھر فوج میں شامل ہوا اور اپنی پرانی رجمنٹ میں تعینات ہوا اور انگریزی بارود کا کارخانہ (GUNPOWDER) ایشاپور (نزد کلکتہ) کا انچارج مقرر ہوا۔ ۱۸۵۷ء میں کرنل بنا۔ اپنی شام زندگی (RYDE) جو جزیرہ وائٹ (ISLAND OF WIGHT) میں ہے، گزاری اور ۱۸۹۶ء میں مرگیا۔

ایبٹ کے بعد ہربرٹ ایڈورڈ (HERBERT EDWARD) ہزارہ کا ڈپٹی کمشنر بنا اور آتے ہی اس نے ایبٹ کے نام پر ایبٹ آباد کے نام پر چھاؤنی بنوائی۔ اس سے پہلے فوجوں کی چھاؤنی

۱۔ کمشنر میجر ایڈورڈ اور ڈپٹی کمشنر میجر ایبٹ

بھارو کوٹ برلب دریائے دوڑ تھی - وہاں گرمی زیادہ تھی اس لئے اسے چھوڑ کر ایبٹ آباد کو چھاؤنی بنایا گیا۔

ایڈورڈ کا یہاں اپنا بنگلہ بننے سے پہلے ہی میکیسن (MACKESON) کمشنر پشاور قتل کیا گیا اور ایڈورڈ پشاور کا کمشنر ہو کر وہاں چلا گیا۔

ہزارہ کے چند واقعات کی تفصیل (میجر ایبٹ کی ڈائری کی روشنی میں)

میں کتاب (تاریخ ہزارہ بشمول عہد میجر ایبٹ) کی تحریر سے فارغ ہو چکا تھا کہ میجر ایبٹ کی مفصل ڈائری ۱۸۴۸ء، ۱۸۴۹ء کا علم ہوا۔ اس کے مطالعہ سے میجر ایبٹ کی علمی قابلیت، سیاسی بالغ نظری، اوصاف حکمرانی اور دوراندیشی کا پورا علم حاصل ہوتا ہے۔ وہ اگرچہ ناظم ہزارہ سردار چتر سنگھ کے مشیر کی حیثیت سے یہاں مقیم تھا، لیکن عملاً وہی حکمران تھا۔ ہزارہ میں فوج کی نقل و حرکت، ان کی تنخواہ کی ادائیگی، مالیہ اور واجبات حکومت کی وصولی، خزانہ کا انتظام اس کے حکم سے ہوتا تھا۔ نظامِ عدالتِ ہزارہ کا وہی سربراہ تھا۔ ہزارہ کے علاوہ اس کے حکم کا سکہ ان سب اموراتِ بالا میں، علاقہ چھچھ، کھاٹڑ، پوٹھوہار اور کہوٹہ (ضلع راولپنڈی) تک میں چلتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ پشاور میں متعین انگریز افسروں کا بھی مشیر تھا اور ان کو وہاں کے حالات اور واقعات پر مؤثر رائے دیتا تھا اور ان کی کارکردگی پر نظر رکھتا تھا۔ ریذیڈنٹ لاہور کو ان سب علاقوں کے حالات سے بذریعہ اپنی روزانہ ڈائری مطلع کرتا رہتا تھا۔ یہ ڈائری بڑی زوردار ہوتی تھی اور اپنی رائے اور مشورہ کو صائب سمجھتا تھا اور اس پر عمل کے لئے زور بھی دیتا تھا، یہاں تک کہ آخر ریذیڈنٹ نے اس تحکمانہ انداز میں دیئے گئے مشورہ پر ایک بہت سخت تنبیہ بھی کی اور لکھا ہے کہ اس کی رائے کا انداز افسرانہ ہوتا ہے، حالانکہ اس کو ماتحتانہ ہونا چاہیے اور اس کا انداز تحکمانہ ضبط و نظم کے خلاف ہے، جس کے جواب میں اس نے لکھا کہ:

"میں اپنی قوم و سلطنت کی بہتری کے لئے مخلصانہ اور زوردار رائے دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ میں یقیناً ایک ماتحت ہوں۔ قانوناً اور عملاً، اور اپنے اس مقام سے بخوبی واقف بھی ہوں۔ لیکن صرف سلطنت کی بہتری کے لئے اپنی رائے اور مشورہ بے باکانہ طور پر پیش کرتا رہتا ہوں۔"

سردار چتر سنگھ اور دوسرے سکھ افسر میجر ایبٹ کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے۔

کیونکہ وہ انگریزی بالادستی کے اس محکم نشان کے ختم کرنے کو انگریزی سلطنت کے ختم کرنے کے مترادف سمجھتے تھے۔ وہ اس کو گرفتار یا قتل کرانے کے درپے رہتے تھے۔ ان کے اس مشورہ میں مہاراجہ والئی جموں و کشمیر بھی اندرونی طور پر شامل تھا۔ اگرچہ وہ اپنی فطری عیاری اور سیاسی چابکدستی سے اپنی شمولیت کو ظاہر نہ ہونے دیتا تھا اور ظاہراً انگریزوں کے ساتھ بھی راہ و رسم رکھتا تھا۔ میجر ایبٹ کو انگریزوں کے ساتھ اپنی وفاداری کا یقین دلاتا رہتا تھا، لیکن ایبٹ اس کی چالبازیوں سے واقف تھا اور اس کے فریب میں نہ آتا تھا اور ان سب پر کڑی نظر رکھتا تھا۔

سکھوں کی سازش گہری اور دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ میجر ایبٹ کی ڈاک بھی راستہ ہی میں اچک لی جاتی تھی۔ مگر سکھوں کی کوئی چال میجر ایبٹ کو نہ خوف زدہ کر سکی اور نہ کوئی نقصان پہنچا سکی۔ میجر ایبٹ ان انتہائی غیر موافق حالات میں اپنی فراست و ہوشیاری سے سکھوں کی تمام سازشوں کا تار و پود بکھیرتا رہا۔ ان کے داؤں اور فریبوں کا توڑ کرتا رہا۔ اس نے اپنے اخلاق فاضلہ، بہادری اور حوصلہ سے ملکی لوگوں کو ایسا گرویدہ کر لیا کہ وہ اس کی امداد کے لئے ہر وقت کمر بستہ رہتے تھے ہزارہ، چھچھ، کھاٹڑ، پوٹھوار اور رکموڑ کے سب لوگ سکھوں کے ظلم و زیادتی سے نالاں تھے اور میجر ایبٹ کی ذات میں ان کو ایک نجات دہندہ مل گیا اور وہ اس کو سکھوں سے گلو خلاصی کا ضامن سمجھتے تھے۔

میجر ایبٹ اپنی ڈائری میں جابجا ملکی لوگوں کی الفت اور امداد کا اعتراف کرتا ہے اور ایک جگہ لکھتا ہے کہ:

"اکیلے ہی ملکی لوگوں کی امداد سے سب سکھ فوجوں کو شکست دے سکتا ہے۔ وہ اپنی ڈائری مورخہ یکم جون ۱۸۴۸ء از شیروان میں لکھتا ہے کہ اس ملک میں میری طاقت کا اندازہ فوج کی تعداد سے نہیں بلکہ لوگوں کے اس اعتماد سے، جو وہ مجھ پر بطور اپنے خیر خواہ دوست کے رکھتے ہیں، لگایا جائے اور یہ بہت زیادہ ہے، لہٰذا میں اپنے اثر و رسوخ کو ان کے مقدمات نہ سن کر، ضائع نہیں کرنا چاہتا"

میجر ایبٹ کے دور کے تاریخی حالات، جو پہلے میں اپنی کتاب میں لکھ چکا ہوں، اس ڈائری سے ان کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ ڈائری ان واقعات کا پس منظر بڑی تفصیل سے پیش کرتی ہے میں صرف چند واقعات کے پس منظر کے متعلق جستہ جستہ اقتباسات کا خلاصہ تحریر کرتا ہوں، تاکہ

ان واقعات کی وضاحت ہو جائے۔

بغاوت ملتان

(چونکہ حکومت ہزارہ کا اس سے تعلق تھا، لہٰذا یہ باب یہاں لکھا جا رہا ہے۔)

اسباب: اس کی رائے میں تمام سکھ افسر اور دیگر افراد کے ایماء پر اور امداد سے یہ بغاوت ہوئی۔ سکھ اپنی سلطنت کا احیا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے مولراج کو اپنی امداد کا یقین دلا کر بغاوت کے لئے اٹھایا۔ میجر ایبٹ کی رائے میں اس بغاوت کا مشہور کردار بھائی مہاراج سنگھ تھا، جو اس بغاوت کے بانیوں یا امداد کرنے والوں میں سے تھا۔ جب وہ اس مقصد کے لئے سندھ گیا ہوا تھا تو میجر ایبٹ نے راجرس نیپئر (RODGERS NAPIER) سندھ کے انگریز فاتح کو مطلع کر دیا تھا کہ مہاراج سنگھ کو گرفتار کرنے کے لئے خاص اہتمام اور کافی فوج کی ضرورت ہوگی۔ مگر نیپئر نے اس کا اتنا اہتمام نہ کیا۔ لہٰذا وہ سندھ میں گرفتار نہ ہو سکا اور پنجاب بھاگ آیا۔ اسی طرح بھائی اچارہ سنگھ سودھی (جو چتر سنگھ کے پاس بغاوت کے جوڑ توڑ کے لئے آیا تھا، پھر پشاور بھی گیا تھا) بھی اس مہم کا ایک مؤثر کردار تھا۔ اس کے ہری پور آنے کے بعد یہ مشہور کیا گیا کہ مہاراجہ دلیپ سنگھ روپوش ہو گیا ہے یا ملتان چلا گیا ہے۔ (ڈائری مورخہ ۱۱ جون ۴۸ء) لہٰذا دلیپ سنگھ کو حفاظت سے زیر نظر رکھنے کے لئے میجر ایبٹ نے ریذیڈنٹ کو متوجہ کیا۔ بعد میں میجر ایبٹ کو اطلاع ملی کہ دلیپ سنگھ جموں چلا گیا ہے۔

مہاراجہ گلاب سنگھ والئی جموں و کشمیر بھی بغاوت ملتان کے حامیوں میں سے تھا اور اس بغاوت کے جوڑ توڑ میں درپردہ سکھوں کے ساتھ تھا۔ میجر ایبٹ کا یہ خیال تھا کہ بحیثیت قوم، سب سکھ بغاوتِ ملتان کے حامی ہیں۔ بعد کے واقعات نے اس خیال کو صحیح ثابت کر دیا۔ گاندھیاں کی فوج کا اضطراب، جھنڈا سنگھ کے جوڑ توڑ سے، اور ہزارہ سے جو فوج انگریزوں کی امداد کے لئے بھیجی گئی، اس کا مولراج سے مل جانا اس خیال کی تصدیق کرتا ہے۔ بغاوت ملتان کے دوران سکھوں میں یہ مشہور کر دیا گیا تھا کہ ۱۵ ارجیٹھ کو ان کا روپوش گرو ظاہر ہوگا، جس کی قیادت میں سکھ قوم کی حکومت پھر سے قائم ہو جائے گی۔ یہ تاریخ وقتاً فوقتاً ایک ایک ماہ پیچھے ہٹائی جاتی رہی۔

حتیٰ کہ انگریزوں نے ملتان فتح کر لیا۔ لیکن کوئی گڑ ظاہر نہ ہوا۔ سکھوں کا یہ حربہ سکھ قوم کو جرأت آموزی کے لئے ایک اشتہاری حرکت (STUNT) تھی۔

قلعہ ملتان کے متعلق میجر ایبٹ ریذیڈنٹ کو لکھتا ہے کہ :

"قلعہ ایک ڈھیری پر ہے۔ یہ ڈھیری کبھی پرانا شہر تھا۔ قلعہ اور ملتان شہر میں چار سو گز کا فاصلہ ہے۔ شہر بھی قلعہ بند ہے۔ قلعہ ملتان کی دیواریں مٹی کی ہیں، جس کو بیرونی طرف سے پختہ اینٹوں سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس قلعہ کی دیوار کو بھاری توپ خانہ کی گولہ باری سے ہی توڑا جا سکتا ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ بھی اس قلعہ کی دیوار کو اس وقت تک نہ توڑ سکا تھا جب تک بھنگیوں کی توپ جو ۴۴ پونڈ کا گولہ پھینکتی ہے، نہ لائی گئی۔ قلعہ کے گرد خشک کھائی (خندق) ہے، لہٰذا محاصرہ کرنے والی فوج کے لئے پانی کا انتظام ضروری ہے۔" ڈائری مورخہ ۳ مئی ۱۸۴۸ء ہری پور

چتر سنگھ کی بغاوت کے دوران میجر ایبٹ کی تگ و دو اور مختلف مقامات پر اقامت

ڈائری سے مندرجہ ذیل مقامات پر میجر ایبٹ کی اقامت کا پتہ چلتا ہے۔

موہٹ ۱۸ اپریل ۱۸۴۸ء، ہری پور ۲۰ اپریل تا ۲۱ مئی ۱۸۴۸ء۔ کچھی ۲۲ مئی تا یکم جون ۱۸۴۸ء، شیروان یکم جون تا ۸ اگست ۱۸۴۸ء۔ ناڑہ، گندگر ۹ اگست تا ۱ ستمبر ۱۸۴۸ء، اسلنڈ ۹ ستمبر ۱۸۴۸ء، ناڑہ گندگر ۱۴ ستمبر تا ۱ اکتوبر ۱۸۴۸ء۔

چتر سنگھ کی بغاوت کے لئے پختہ و پڑاؤ اور میجر ایبٹ سے مقابلہ آرائی

ڈائری مورخہ ۲ اگست ۱۸۴۸ء شیرواں سے

ظاہر ہوتا ہے کہ جرنیل محمود، کرنل رچھپال سنگھ اور سردار چتر سنگھ ہری پور میں تین دن رات باہم مشورے کرتے رہے۔ ۱۲ اگست ۱۸۴۸ء ناڑہ گندگر کی ڈائری کے مطابق سردار چتر سنگھ نے کرنل بدھ سنگھ مان (مہاراجہ رنجیت سنگھ کا چچازاد بھائی) کو طعنہ دیا کہ اس کے خاندان کی خاطر اس (چتر سنگھ) نے بغاوت کی اور (بدھ سنگھ مان) اس میں شامل ہو کر مدد دینے سے پہلو تہی کر رہا ہے۔

میجر ایبٹ نے اپنی ڈائری مورخہ ۲۹ اگست ۱۸۴۸ء ناڑہ میں چتر سنگھ کے ساتھ حسن ابدال کے

قرب وجوار میں مقابلہ اور دیگر حالات پر مفصل روشنی ڈالی ہے ۔ وہ لکھتا ہے کہ :

"جس وقت جھنڈا سنگھ لاہور سے نمائندہ ہو کر آیا تھا، اس وقت چتر سنگھ کی حالت مایوس کن ہو چکی تھی۔ اس کی پکھلی اور نواں شہر والی فوج مکمل طور پر محصور ہو چکی تھی۔ قلعہ اٹک ہمارے قبضہ میں تھا۔ مارگلہ کا درہ ہم نے (نکلسن نے) بند کر رکھا تھا۔ پرتاپ سنگھ کی فوج کو نکلسن نے اپنے قلعہ کو واپس بھیج دیا تھا۔ میں ہری پور کا محاصرہ کرنے والا تھا اور چتر سنگھ کو کوئی بیرونی امداد نہ مل سکی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ فوج کسی کے حوالے کر کے خود معہ اپنے لڑکوں کے پہاڑوں میں چلا جائے۔ لیکن جھنڈا سنگھ (سکھوں کا ماہر سازشی اور بہتر کپتان) نے آ کر نئے سرے سے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ ادھر مجھے اطمینان دلایا کہ چتر سنگھ صلح کرے گا۔ میں نے اس کی بات کا اعتبار کر کے قلعہ کا پانی بند نہ کیا۔ حالانکہ نکلسن کی دھمکی نے جھنڈا سنگھ کو اطاعت پر مجبور کر کے واپس کیا تھا۔ اس گفت وشنید کے دوران چتر سنگھ پکھلی کی فوج کو چھڑوانے کے لئے مضبوط ارادہ سے حملہ کے لئے تیار رہوا۔ میں فوراً سلہڈ اور دھمتوڑ کے دروں پر ان کا راستہ روکنے کے لئے پہنچا۔ وہاں پہنچنے پر دوسرے لون نکلسن کا پیغام ملا کہ چتر سنگھ ہری پور کی سب فوج کے ساتھ حسن ابدال کے لئے یکایک روانہ ہو گیا ہے اور اس کو میری (نکلسن کی) لیوی (رنگروٹوں کی جماعت) نے موضع موڑہ (ڈھنگی موڑہ۔ نزد حسن ابدال) کی گھاٹی (کھنڈر نالہ کوہ) پر روک لیا ہے۔ لہٰذا میری (ایبٹ کی) تھوڑی سی فوج نے نکلسن سے جا ملنے کے لئے مارچ کیا اور سخت دھوپ اور گرمی میں چالیس میل کا فاصلہ طے کر کے چتر سنگھ کی فوج کے عقب میں پہنچ گئی۔ دوسری صبح میں اس سے آگے نکل گیا۔ اس اثناء میں نکلسن اور چتر سنگھ کے درمیان گفتگو جاری تھی۔ چتر سنگھ نے بطور ضمانت اپنے لڑکے اوتار سنگھ (عطر سنگھ؟) کو نکلسن کے پاس بھیجنے کا وعدہ کر لیا۔ جب چتر سنگھ نے وعدہ ایفا نہ کیا تو میں نے نکلسن کی رائے کے مطابق ۲۴ / اگست ۱۸۴۸ء موضع موڑہ کے نالہ (کھنڈر) کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ تاکہ ہزارہ کی فوج (چتر سنگھ کی فوج) کی رسد کا راستہ کاٹ دیا جائے۔ میں نے اس کھنڈر کا جو تیس فٹ گہرا تھا اور جس کی کئی شاخیں تھیں، جائزہ لیا، تو اندازہ ہوا کہ یہ ماہر نشانہ بازوں کے لئے مورچہ کا کام دے سکتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ میں چتر سنگھ کی فوج کو یہاں پر روک سکتا ہوں یا سخت نقصان پہنچا سکتا ہوں۔ اتنے میں نکلسن کا پیغام آیا کہ اوتار سنگھ اس کے پاس حاضر ہو گیا ہے۔ چتر سنگھ نے شکوہ کیا کہ میں نے اس کے لڑکے کے جانے کے بعد

اس کا پیچھا کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے میری فوج کو نزدیک دیکھ کر ہی اپنے لڑکے کو نکلسن کے پاس بھیجا۔ نکلسن نے کہلا بھیجا کہ میں چتر سنگھ کی رسد کا راستہ کھول دوں۔ میں اس پیغام پر خفا تھا۔ اگر میں نے پہلے سے نکلسن کے ساتھ اتفاق نہ کیا ہوتا تو میں یہ بات نہ مانتا۔

میں نے فوج کو واپس کر لیا۔ حالانکہ میری فوج کے لوگ بہت ناراض تھے اور ملامت کرتے تھے۔ ان کا اعتماد مجھ پر نہ رہا۔ میں نے اپنا خیمہ سکھ فوج کے سامنے اونچائی پر کھڑا کیا۔ جہاں سے میں ان کی حرکات دیکھ سکتا تھا۔ اسی دن یعنی ۲۶ ار کو نکلسن نے ان سے گفتگو کرنی تھی۔ مجھے سکھوں کے کیمپ میں دغابازی کے آثار نظر آئے۔ سورج کے غروب ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ جھنڈا سنگھ جب اپنے مشن سے واپس سکھ کیمپ میں پہنچا تو سکھ کیمپ نے مارچ کی تیاری شروع کر دی۔ میں نے جلدی میں اپنے سپاہی دلیوی، نئے بھرتی شدہ سپاہی، جو ادھر ادھر دیہات میں پھیلے ہوئے تھے جمع کیے۔ کیونکہ ان کے پاس خیمے نہ تھے کہ وہ میرے خیمہ کے ارد گرد مقام کر سکتے ہیں۔ میں ان کو لے کر سکھوں سے مقابلہ کے لئے روانہ ہوا اور جلدی سے موضع موڑہ کے نالہ میں داخل ہو گیا تاکہ سکھوں کی توپیں نہ گزر سکیں۔ سکھ روانہ ہونے کے لئے بالکل تیار تھے۔ سکھوں کا کیمپ نالہ سے میرے مقابل کے فاصلہ سے ایک چوتھائی تھا۔ میرے سپاہی جو روزہ کے سخت پابند اور روزہ سے تھے، پیاس سے بدحال ہو رہے تھے۔ ان میں بہت سے اپنا کھانا تیار کر رہے تھے، لہٰذا مجھے اپنی بندوق سے مسلح فوج جو دو ہزار تھی کے بڑے حصہ کو حرکت میں لانے کے لئے کافی وقت لگ گیا۔ روانگی پر میں نے اپنی فوج کو ہمت دلانے کے لئے کہا کہ رات کے اندھیرے میں توپ کی گولہ باری بے اثر ہوتی ہے۔ ہم بہت بہادری اور یقینی کامیابی کی امید پر حملہ آور ہوئے۔ اس نالہ کے پار ہونے کے لئے اس کے کنارے پر قبضہ کرنا ضروری ہے۔ اگر دشمن کا ہراول دستہ اس نالہ کو پہلے پار کر کے دوسرے کنارے پر قبضہ کر لے اور وہاں اپنی توپیں نصب کر لے تو دن کے وقت اپنی حفاظت مشکل ہو جاتی ہے۔ لیکن رات کے وقت مجھے بڑی امید تھی کہ میں ان کو اتنا نقصان پہنچا سکتا تھا جو ہمارے لئے بعد میں بہت فائدہ مند ہوتا۔ جب میں اپنے ایک سو سواروں کے دستہ کے ساتھ نالہ کے نزدیک پہنچا تو شام کی شفق کافی بڑھ چکی تھی۔ پیدل سپاہ ہمارے پیچھے اکا دکا آ رہی تھی حالانکہ میں ان کو یکجا کرنے کے لئے بڑی کوشش کر رہا تھا۔ اندھیرے میں جب میں نے سامنے دیکھا تو دو

سیاہ پہاڑ نظر آئے۔ میں سمجھا کہ وہ ہاتھی آرہے ہیں۔ جن پر توپیں لدی ہوئی ہیں۔ میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی تاکہ میں ان کو اچانک پکڑ سکوں۔ اس سے پہلے ہماری تجویز یہ تھی کہ گھوڑے گاؤں کی آڑ میں پیادہ فوج آجانے تک، کھڑا رکھوں۔ جب میں ان کے نزدیک پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دو دور انداز توپیں (HOWITZERS) نصب ہیں اور وہ ہمارے سب دستہ پر دھڑا دھڑ فائر کرنے لگ پڑی ہیں میں نے رسالہ ایک اوٹ میں کھڑا کر دیا اور پیدل سپاہ کی طرف لوٹا اور ان کو نالہ میں چھپ جانے کا حکم دیا۔ آہستہ آہستہ ان کو پاس لے گیا۔ میں اپنے دو ہزار تنخواہ دار اور صرف روٹی پر خوانین کے آدمیوں میں سے اس ناگہانی حملہ کے وقت آٹھ سو سپاہی ہی اکٹھے کر سکا۔ جو میرے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو سکتے تھے اور میرے پیچھے پیچھے دست بدست لڑائی کے لئے آسکتے تھے۔ ہمارے توپوں تک پہنچنے سے قبل ہی سب سکھ فوج نالہ پار کر کے میدان میں آکھڑی ہوئی اور سخت اندھیرے کی وجہ سے ہم ان کے موقعہ کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ اس عالم میں میرے آدمیوں نے بہت سی گولیاں اندھا دھند فائر کر کے ضائع کر دیں۔ حالانکہ ان کو سنبھال کر رکھنے کی سخت ضرورت تھی۔ جب میں نے محسوس کیا کہ میں اپنی سب پیادہ فوج سکھوں سے دست بدست لڑائی کے لئے نہیں لا سکتا تو میں اپنی سب فوج کو صبح کے وقت مارچ کرا کر کیپٹن نکلسن کے کیمپ میں لے گیا۔

اس وقت پرتاپ سنگھ کی فوج معہ دو توپوں اور چار سو سپاہیوں کے درہ مارگلہ سے گزر چلی گئی تھی۔ ہم نے مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ حسن ابدال جا کر حالات کا جائزہ لیں۔ اگر ہم دونوں مل کر حملہ کر سکتے ہیں تو ایسا کریں۔ نہیں تو اپنے اپنے علاقہ کو واپس چلے جائیں اور ہزارہ اور اٹک کو قابو میں رکھنے کی کوشش کریں۔ وہاں پہنچنے پر ہماری یہ رائے قرار پائی کہ ہم ایک دن سے زیادہ سکھوں کی چار رجمنٹوں، چار سو بے قاعدہ سپاہیوں اور آٹھ توپوں کا مقابلہ صرف ایک دن ہی کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اپنی دونوں فوجوں کو شکست سے بچانے کے لئے ہمیں واپس جانا چاہیے۔ لہٰذا میں ۲۸ اگست صبح کوٹ نجیب اللہ کے لئے روانہ ہوا۔ جانے سے پہلے ہم دونوں (میں اور نکلسن) اس بات پر متفق ہو گئے کہ سردار جھنڈا سنگھ ہی ہماری موجودہ تکلیفات کا باعث ہے اور اس کو موقوف کر دینا چاہیے۔ میں نے اس کی موقوفی کے حکم پر دستخط کر کے خط بند کر دیا۔ لیکن بعد میں نکلسن نے اس پر ترس کھا کر اس پر عمل نہ کیا اور میرے لئے انتہائی پریشانی پیدا کر کے اس کو وہاں ہی رہنے دیا۔

اب میں اس سے سخت نتائج کے برآمد ہونے سے فکرمند ہوں۔

سردار جھنڈا سنگھ نے سردار گلاب سنگھ کا ایک خط دکھایا کہ سردار اوتار سنگھ (پسر چتر سنگھ) کو لاہور بھیج دیا جائے۔ ہم دونوں میں اور کیپٹن نکلسن نے اس تجویز کو بہتر سمجھا اور سردار اوتار سنگھ کی مرضی سے اس کو لاہور بھیج دیا۔ راستہ میں وہ اپنی خوشی سے باپ سے مل گیا ہے یا باپ نے راستہ روک کر اس کو اپنے ساتھ لے لیا۔ ہر دو حالت میں جھنڈا سنگھ کی کارستانی اور نئی غداری ہے جھنڈا سنگھ کا ہزارہ کی فوج کو خاموش اور مطمئن کر کے اپنی جگہ پر بیٹھانا، ایک بہانا تھا۔ بلکہ وہ سازش کے لئے آیا تھا۔ میں نے قلعہ ہرکشن گڑھ (قلعہ ہری پور) کے نزدیک کیمپ لگایا ہے اور صبح اس پر حملہ کروں گا۔"

۴؍ستمبر ۱۸۴۸ء تاڑہ کی ڈائری میں لکھتا ہے کہ:

"کیپٹن نکلسن اٹک کی طرف چلا گیا ہے۔ چتر سنگھ بھی اس کے پیچھے ۲۲؍اگست ۱۸۴۸ء کو روانہ ہو گیا۔ مگر پشاور سے کسی امید پر امداد نہ ملنے کی وجہ سے واپس آ گیا اور پھر حسن ابدال پر قبضہ کر لیا ہے اور کل (۳؍ستمبر ۱۸۴۸ء) آٹھ میل دور کیمپ لگایا تھا۔"

ڈائری مورخہ ۷؍ستمبر ۱۸۴۸ء تاڑہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سردار چتر سنگھ پوری طرح مخالفت میں سرگرم ہو گیا ہے اور اس نے مارگلہ کا ایک برج جلا دیا ہے اور پھر اپنی فوج کے ساتھ پکھلی کی فوج کا راستہ کھولنے کے لئے روانہ ہو گیا۔ میجر ایبٹ اس ضمن میں لکھتا ہے کہ "میں اس کا راستہ روکنے کے لئے پکھلی اور دھمتوڑ کے لوگوں کو جمع کر رہا ہوں اور ان کو ہمت دلانے کے لئے اعلان کر رہا ہوں کہ انگریزی فوج ہزارہ کے لئے روانہ ہو چکی ہے۔ توپوں سے مسلح مضبوط فوج کے ساتھ ہم کو مقابلہ کرنا ہو گا۔ جس میں آٹھ سو مسلح سپاہی، دو سو سوار، چار توپیں اور بیس زمبورے ہیں۔ تربیلہ بھاروکوٹ، اغازی، مارٹی، چھچیاں اور خان پور کے قلعے تھوڑے سے محاصرہ کے بعد فتح کر لئے گئے ہیں اور دوسرے قلعوں پر حملے جاری ہیں۔ جو قلعے وفادار ہیں ان پر حملہ مقصود نہیں۔ لیکن بعض قلعوں پر حفاظت خود اختیاری کے لئے قبضہ ضروری ہے۔ قلعہ سید پور (نزد خان پور) چتر سنگھ کا تھا۔ وہ میرے علم کے بغیر ہی محاصرہ کے بعد فتح کیا جا چکا ہے۔"

آگے چل کر پھر اس ڈائری میں لکھتا ہے کہ:

"چتر سنگھ اپنی بڑی توپیں اور فالتو سامان سرائے کالا نزد ٹیکسلا میں چھوڑ کر چھ توپوں، چھ سو سواروں اور کافی پیدل سپاہیوں کے ساتھ ایک ہی مارچ میں ۲۵ میل کا فاصلہ طے کر کے ہری پور پہنچ گیا ہے۔ نکلسن اس مارچ کا سن کر روانہ ہوگیا اور راتوں رات ۴۵ میل کا فاصلہ طے کر کے اس سے آگے ہوگیا ہے۔ میں سلہنڈ کے لئے روانہ ہو رہا ہوں"

۹ ستمبر ۱۸۴۸ء کی ڈائری میں ریذیڈنٹ کو لکھتا ہے کہ:

"درہ سلہنڈ اور دھمتوڑ پر پوری حفاظت نہ تھی۔ سلہنڈ پر صرف پچاس آدمی تھے۔ حالانکہ اس جگہ پر سات آٹھ سو آدمیوں کی ضرورت تھی اور درہ دھمتوڑ پر کوئی مسلح آدمی نہ تھا۔ حسن علی خان کرڑال باوجود صاف اور صریح حکم کے اپنے آدمی واپس لے گیا۔ میں نے سات سو آدمی سلہنڈ میں مقرر کر دئے ہیں اور اب دھمتوڑ کے انتظام کے لئے جا رہا ہوں"

وہاں پہنچ کر لکھتا ہے کہ:

"نکلسن اپنے نو سو پیدل سپاہیوں اور تین سو سواروں کے ساتھ دھمتوڑ میں آکر مجھ سے مل گیا۔ واقف کار لوگوں سے مشورہ کے بعد یہ طے ہوا کہ اس طویل لائن کی حفاظت گیارہ سو سے کم سپاہیوں سے نہیں ہو سکتی۔ نکلسن یہاں ٹھہرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کو فوراً واپس کرنا چاہا۔ میری رائے تھی کہ دشمن کو راستہ دینا چاہیے۔ لیکن نکلسن نے مجھ سے اتفاق نہ کیا اور دشمن سے مقابلہ کرنا چاہا۔ اس کے سپاہی حوصلہ مند ہیں اور مزید کہا کہ وہ اس طرح سے نواں شہر کے چار سو سپاہیوں کو عقب پر حملہ کرنے سے روک لے گا اور مجھے دشمن کے پہلو پر حملہ کرنے میں مدد دے گا۔ میں اس پر عمل کرنے کو خودکشی سمجھتا ہوں"

ایبٹ اپنی ڈائری مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۸۴۸ء سلہنڈ میں لکھتا ہے کہ:

"جب سکھ فوج روانہ ہوئی تو میں نے اپنے سات سو آدمی جمع کئے اور سکھ فوج کو رجوعیہ میں دھمتوڑ سے چھ میل کے فاصلہ پر جا لیا۔ سکھ فوج نے رجوعیہ میں مقام کیا۔ میں واپس دھمتوڑ چلا گیا اور نکلسن سے مل گیا۔ وہ آج ہم پر حملہ نہیں کر سکتے اور چونکہ میں نے درہ سلہنڈ خالی کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ درہ سلہنڈ کو مڑ جائیں گے۔ لہٰذا ان کو درہ سلہنڈ سے روکنے کے لئے میں نے چار سو مسلح سپاہی سلہنڈ کو روانہ کر دیئے ہیں۔ اب سکھ فوج جو تعداد میں ہم سے

تین گنا ہے اور جس میں چار ہزار سپاہی اور دس توپیں ہیں، ہمارے سامنے اور نزدیک ہے اور مقابلہ پر ملکی سپاہی ہیں۔ نہ معلوم یہ ان کے مقابلہ میں ٹھہر سکیں گے یا نہ"

اس کے بعد میجر ایبٹ کی آویزش سکھوں سے سربن پہاڑ (بالمقابل ایبٹ آباد) میں ہوئی وہ اپنی ڈائری مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۸۴۸ء دھمتوڑ میں لکھتا ہے کہ:

"سکھ فوج چار ہزار سے زیادہ تھی اور توپوں سے لیس تھی اور رجوعیہ سے روانہ ہو کر سربن پر چڑھ کر سلہڈ کو آرہے تھے۔ ان کو روکنے کے لئے سربن پر میجر ایبٹ صبح سویرے آدمی متعین کر کے خود دوسرے مورچہ کے انتظام میں لگ گیا۔ کیونکہ سکھوں کی فوج سویرے ہی حرکت میں آ گئی تھی اور سکھ فوج کا ہراول دستہ اس کے سامنے سربن پر چڑھ رہا تھا اور سلہڈ کو جانے کے لئے پیش قدمی کر رہا تھا"

ایبٹ لکھتا ہے کہ:

"میں نے پچاس آدمی سربن پہاڑ کے نصف پر ایک گاؤں میں بٹھا دئے اور پھر وہاں سے واپس اپنی فوج کی طرف جو عقب میں تھی آنے لگا۔ تو فتح خان گھیبہ کے آدمیوں نے جو سربن کی چوٹی پر تھے مجھے آواز دی کہ اگر میں واپس گیا تو ہمارے یہ سب لوگ بھاگ جائیں گے۔ ان کی گھبراہٹ دیکھ کر میں وہیں رک گیا اور اپنی فوج میں نہ آسکا، کہ کہیں یہ سب لوگ بھاگ نہ جائیں اور سب فوج پر برا اثر نہ پڑے"

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ:

"جب سکھ فوج نزدیک آگئی تو ان چوٹیوں پر جہاں میں اور فتح خاں گھیبہ کھڑے تھے، توپ کے گولے برسانے شروع کر دئے۔ ایک گولہ عین میرے سر پر سے گزرے۔ شاید سکھوں نے میرے سرخ وردی والے اردلیوں کی وجہ سے مجھے پہچان لیا۔ میرے سامنے اونچے پہاڑ پر نکلسن نے پشاوریوں کی چوکی بٹھا رکھی تھی۔ وہاں جنگل بھی تھا اور محفوظ مقام تھا لیکن یہ لوگ شاید رشوت لے کر رات کو ہی چوکی خالی کر گئے۔ صبح کے وقت جب نکلسن ان کی امداد کے لئے پچاس آدمی اور لے کر گیا تو چوکی خالی تھی اور وہ سب بھاگ چکے تھے۔ اسی وقت اس نے دیکھا کہ سکھوں کا ایک دستہ چوٹی کے نزدیک آگیا ہے تو وہ جلدی سے اور سپاہی لے جانے کے لئے واپس آیا۔ اس اثنا میں وہ پچاس آدمی مقابلہ پر ڈٹے رہے لیکن جب سکھ دس قدم دور رہ گئے تو وہ بھاگ آئے۔

ان کے بھاگنے سے ہماری سب فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ حالانکہ ان میں سے بہتوں نے دشمن کو دیکھا بھی نہ تھا۔ سکھوں نے اس چوٹی پر قبضہ کر لیا، جس پر ہم قبضہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان حالات میں ہم کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ میں مشکل سے نکلسن کو جا کر ملا جو اپنے رسالہ کے پاس ہماری پسپائی کی لائن پر کھڑا تھا۔ ہم سلہنڈ کے راستے سے واپس ہٹ آئے۔ میں ناڑہ (گندگر) میں آگیا۔ نکلسن اپنے ضلع دیو مٹھوار، کو چلا گیا۔ لفٹیننٹ رابنسن بھی میرے پاس آگیا۔ ۲۰ ستمبر ۱۸۴۸ء کو چتر سنگھ بھی اپنی فوج کے ساتھ ہری پور پہنچا۔ یعنی سر بن پر مقابلہ سے ۹ دن بعد۔"

ڈائری مورخہ ۲۳ ستمبر ۱۸۴۸ء۔ ناڑہ کے مطابق چتر سنگھ ہری پور میں تھا۔ اس نے شیروان کا قلعہ لینے کی کوشش کی۔ لیکن تنولیوں نے اسے مار بھگایا۔ پھر لکھتا ہے کہ ۲۰، ۲۱ ستمبر ۱۸۴۸ء کو اوتار سنگھ (عطر سنگھ)، پسر چتر سنگھ نے قلعہ سید پور (نزد خان پور) پر حملہ کیا۔ لیکن شکست کھائی۔ اس کی حملہ آور فوج کے لیڈر کا سر ملکی لوگوں نے کاٹ کر میجر ایبٹ کے پاس ناڑہ کے مقام پر بھیج دیا۔ وہاں پر میجر ایبٹ کے آدمیوں نے تجویز کیا کہ حسب رواج زمانہ اس سر کو بانس پر لگا کر مشتہری کی جائے لیکن میجر ایبٹ نے کہا کہ "ہم ایسی کمینہ حرکات نہیں کرتے اور نہ ہم بیواؤں اور یتیموں کے خلاف جنگ کرتے ہیں۔" اور حکم دیا کہ اس سر کو شریفانہ طور پر سکھوں کی رسوم کے مطابق جلا دیا جائے۔"

۲۰-۲۱ ستمبر ۱۸۴۸ء کی ڈائری ناڑہ میں لکھتا ہے کہ:

"چتر سنگھ ۲۰ ستمبر کو ہری پور پہنچا۔ وہ ناڑہ پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو میرے آدمی اس کی گردن توڑ دیں گے۔ اس کے پاس گیارہ توپیں اور چالیس زنبورے ہیں۔"

۲۴ ستمبر، ناڑہ کی ڈائری میں لکھتا ہے کہ "ہم چتر سنگھ کے حملہ کے منتظر ہیں۔ لوگوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ آخر دم تک میرے ساتھ رہیں گے۔ یہ مضبوط جگہ ہے۔ تاریخ میں صرف ایک دفعہ ہی، بہت زیادہ فوج، اور غداری سے اس پر فتح حاصل کی جا سکی تھی۔ مجھے امید ہے کہ ہم کامیاب ہوں گے۔ میں یہ موقع ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ فتح کی صورت میں چتر سنگھ اور اس کے حواری ختم ہو جائیں گے۔ اگر میں شکست کھا گیا اور مارا گیا تو یہ موت میری قوم کے ایک بہت حقیر فرزند (LEAST WORTHY OF HER SONS) کی موت ہوگی۔

۲۶ ستمبر نا ڑہ "چتر سنگھ کی فوج میں بے اتفاقی پیدا ہو گئی ہے۔ کچھ تو انگریزی فوج کی فتح ملتان کی خبر سے اور کچھ سپاہیوں کو تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے۔ ہری پور میں میرے دو بنگلوں کو بمعہ میرے اور رابنسن کے ذاتی اور سرکاری سامان کے سکھوں نے لوٹ کر تباہ کر دئے ہیں۔ چتر سنگھ ابھی ہری پور میں ہے۔

۲۹ ستمبر ۱۸۴۸ء ناڑہ کی ڈائری میں لکھتا ہے کہ "آج چتر سنگھ اپنی فوج سمیت چھچھ کو روانہ ہو گیا اور ۹ میل پر جا کر مقام کیا۔ یہاں وہ میرے ایک ہزار بندوقوں سے مسلح آدمیوں پر اپنی چھ رجمنٹ رسالا اور توپوں سے حملہ کی جرأت نہ کر سکا اور اپنا غصہ میرے ہری پور والے بنگلوں پر نکالا۔

چتر سنگھ نے یہاں سے جاتے وقت جن لوگوں کو قلعہ پر مقرر کیا تھا۔ وہ اس کے ہری پور سے ایک میل تک جانے کے بعد ہی قلعہ خالی کر کے بھاگ گئے۔

میجر ایبٹ کی ڈائری مورخہ ۸ راکتوبر ۱۸۴۸ء سے معلوم ہوتا ہے کہ چتر سنگھ شمس آباد میں تھا اور مہاراجہ دلیپ سنگھ کے سربراہ کی حیثیت سے احکام جاری کرتا رہا۔ ۳ راکتوبر ۱۸۴۸ء کو چتر سنگھ بیھڑ گڑھ، ۷ راکتوبر ۱۸۴۸ء شمس آباد، ۸ ردسمبر ۱۸۴۸ء جہانگیرہ میں تھا اور امیر دوست محمد خان والیٔ کابل کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ چار رجمنٹ فوج تھی، جو رچھپال سنگھ، بابو پانڈے اور شاید بدھ سنگھ کی فوج پر مشتمل تھی۔ اس کا ایک دستہ جھنگ باترا اور ایک حسن ابدال میں ہے۔ وہ ۲۹ ردسمبر ۱۸۴۸ء تک مانسر کیمپ میں تھا اور ۷ رجنوری ۱۸۴۹ء کو مانسر سے سیدھا راولپنڈی پہنچا اور وہاں کے صرافوں سے جبراً ساٹھ ہزار روپیہ لے کر جہلم چلا گیا۔

ضلع ہزارہ میں سکھوں کے قلعے

میجر ایبٹ کی ڈائری کے مطابق مندرجہ ذیل قلعے تھے۔

تحصیل ہری پور | غازی، اسلم کھنڈ، بھارو کوٹ، تربیلہ، ہری پور۔ دناہ دلورا، خانپور، سیدپور سری کوٹ دیہ قلعہ میجر ایبٹ نے اپنی زیر نگرانی بنوایا اور ۲۸ راپریل ۱۸۴۹ء کو اس کی تعمیر مکمل ہوئی۔

تحصیل ایبٹ آباد: نواں شہر، شیروان۔

تحصیل مانسہرہ: گاندھیاں (ہزارہ کی فوج کا مرکز)، شنکیاری۔

میجر ایبٹ کے وقت ضلع ہزارہ وملحقہ علاقہ جات کے سکھ فوجی افسران

۱۔ کرنل بھوپ سنگھ مان، کمانڈر پکھلی

بریگیڈ متعینہ گاندھیاں۔ یہ کرنل مان سنگھ کا بھتیجا تھا اور میجر ایبٹ اس کو قابلِ اعتبار اور معزز آدمی سمجھتا تھا۔ بھوپ سنگھ اور مان سنگھ دونوں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خاندان سے تھے۔

۲۔ ایڈجوٹنٹ جنرل اربیل سنگھ۔ ۳۔ کرنل دھاڑا سنگھ

۴۔ دیوان کرم چند۔ بہت مدت پکھلی میں رہا۔ بعد میں مہاراجہ کشمیر کی فوج کا کمانڈر ہوگیا۔

۵۔ کرنل امیر چند ۶۔ جنرل محمود شاہ۔ ہزارہ کے توپ خانہ کا افسر اعلیٰ۔

۷۔ سردار لال سنگھ ۸۔ کرنل بدھ سنگھ کمانڈر پکھلی

۹۔ بہادر سنگھ ۱۰۔ کرنل پرتاپ سنگھ۔ کمانڈر افواج کھوڑ (ضلع جہلم)

۱۱۔ کرنل بابو پانڈہ، کمانڈر فوج حسن ابدال ۱۲۔ جنرل کاہن سنگھ

۱۳۔ کرنل رچھپال سنگھ ۱۴۔ کرنل نورالدین افسر توپ خانہ مسل رسالہ پکھلی

۱۵۔ کرنل بالا سنگھ افسر توپ خانہ ہری پور۔ ۱۶۔ سردار جھنڈا سنگھ افسر توپ خانہ۔ شیروان۔

اس فہرست میں توپ خانہ کے دو افسر مسلمان ہیں اور جنرل الٰہی بخش خان مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مرکزی محکمہ توپ خانہ کا افسر تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان توپ خانہ کے محکمہ پر چھائے ہوئے تھے

سکھوں کے عہد کے مظالم

بروایت میجر ایبٹ، ڈائری مورخہ ۶ رمئی ۱۸۴۸ء میں وہ لکھتا ہے کہ

"ضلع ہزارہ میں گائے کا ذبیحہ سکھوں کے عہد میں بند تھا"

پھر حسرت کے ساتھ وہ لکھتا ہے کہ "میں آخری وقت تک (یعنی سکھوں کے عہد میں) اس پابندی کو دور نہ کر سکا"

ڈائری ۱۴ رمئی ۱۸۴۸ء میں لکھتا ہے کہ "ہری پور میں مسجد و مندر ساتھ ساتھ ہیں۔ اذان کے وقت سنکھ بجانے پر جھگڑا ہوگیا۔ سکھ ہندوؤں کی جانب داری کرتے ہیں۔ لہٰذا ہندو دلیر ہیں۔ میں

نے سنکھ بجانے کا وقت بدل دیا ہے۔

ڈائری مورخہ ۹ ؍جون ۱۸۴۸ء میں رقمطراز ہے کہ:

"مانسہرہ کے قلعہ دار نے اذان بند کر دینے کا حکم دیا اور ملّا کو بے عزت کیا۔ ملتان کے حالات کی وجہ سے قلعہ دار دلیر ہو گیا ہے۔ میں تفتیش کر رہا ہوں۔ اگر یہ بات ثابت ہو گئی تو قلعہ دار کو میں ہتھکڑی لگاؤں گا۔ کیونکہ اس کے اس عمل سے ملک میں بغاوت پھیل سکتی ہے۔"

سکھوں کے عہد کے چند تاریخی واقعات

(اخذ و اختصار ایک سال پنجاب سرحد پر ۱۸۴۸ء ۱۸۴۹ء از میجر ہربرٹ۔بی۔ایڈورڈ)

۱۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وقت فوج اپنے قلعے خود بناتی تھی۔ جمرود، پشاور اور علاقہ ڈھونڈ، ستی، مظفر آباد اور ہزارہ میں قلعے فوج ہی نے بنائے۔

۲۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں مختلف جرائم پر مختلف جرمانے کئے جاتے تھے، جو سب خزانہ سرکار میں جمع ہوتے تھے۔ مجروح و مضروب کو کچھ معاوضہ نہ ملتا تھا۔

۳۔ بنوں میں ریشم کی صنعت شروع نہ کی جا سکی کہ سکھوں نے سب توت کے درخت کاٹ کر ختم کر دئیے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ سکھ قوم جہاں بھی گئی۔ درختوں کا صفایا کر دیا۔

۴۔ رنجیت سنگھ کی عادت تھی کہ وہ جن لوگوں کو شکست دے دیتا تھا، ان سے رعایت کا سلوک کرتا تھا اور ان کو سرکاری خدمات کے صلہ میں بصورت روپیہ دے دیتا تھا۔

۵۔ شاہان دہلی کی سندات جاگیر، شاندار اور وجیہہ، چوڑے خوبصورت کاغذ پر، شاندار خطوط میں لکھی ہوتی تھیں، جن پر شاہانِ اعظم خاندان مغلیہ کی شاہی مواہیر ہوتی تھیں۔

رنجیت سنگھ کے فرامین، حقیر سے کاغذ کے پرزے پر، بدخط تحریر اور غلط ہجوں سے لکھے ہوئے ہوتے تھے، جن پر ناخن کے سائز کے برابر مہر لگی ہوئی ہوتی تھی۔

۶۔ رنجیت سنگھ نے اپنے عہد کے آخری دور میں سیکرٹریٹ قائم کیا۔ اس سے پہلے کوئی سرکاری حساب کتاب نہ رکھا جاتا تھا۔ وہ اپنی سب آمدنی، صوبوں کے محاصلات، کسی آدمی کو جو اس وقت پاس ہوتا تھا، دے دیتا۔ اور زبانی کہہ دیتا کہ وہ اس سے اخراجات ادا کرتا رہے۔ وہ شخص مختلف

اخراجات کے حساب کا، ایک لکڑی پر نشانات لگا کر کرتا رہتا۔ جب وہ رقم ختم ہو جاتی تو وہ لکڑی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے سامنے پیش کر کے حساب کر کے حساب سنا دیتا۔ مہاراجہ اپنی تیز یادداشت کی بنا پر جب یہ حساب سن کر تسلیم کر دیتا تو حکم دے دیتا کہ اس لکڑی کو توڑ دیا جائے۔

۷۔ سکھ قوم کی خاصیت اور تعریف

سکھ قوم کی مثال شاہراہ کے ایک ڈاکو کی ہے جو اپنے قلعہ میں مورچہ گزین ہو۔

اس قوم کے کسی ایک آدمی کو، خواہ کوئی بھی ہو، اگر اس کو ایک کچا برج ہی دے دیا جائے تو دوسرے ہفتہ میں علی بابا معہ چالیس چوروں کے گروہ کے منظر عام پر آ جائے گا۔

اگر اس سے کوئی حکومت تعرض نہ کرے تو وہ ایک بڑا آدمی بن کر مرے گا۔

مختصراً تاریخ پنجاب، دریا بکوزہ، یہی ہے۔

۸۔ ملتان کی بغاوت اپریل ۱۸۴۸ء میں رونما ہوئی اور یہ سال خشک سالی کا تھا اور ۱۸۴۹ء بارانی وسیلابی سال تھا۔

۹۔ قلعہ ملتان کی تاریخ: ملتان زمانہ قدیم سے شاہانِ وقت کی نظریں، حاصل کرنے کے قابل رہا۔ اس کا قلعہ بہت مضبوط اور مشہور ہے۔

ملکہ اسیریا۔ سمی رامس (SEMI RAMIS) نے دو ہزار قبل مسیح اس کو حاصل کرنے کی کوشش کی، مگر دریائے سندھ کے کنارے سے واپس کر دی گئی۔

دارائے اعظم کی سلطنت کا یہ حصہ تھا۔ بموجب ہیروڈوٹس، ملتان (مالی تھان، قوم مالی کا وطن)، کو سکندر اعظم نے فتح کیا۔

دسویں صدی عیسوی کے آخر میں سبکتگین نے اس پر حملہ کر کے تاراج کیا۔

گیارھویں صدی عیسوی میں محمود غزنوی نے اس کو فتح کیا۔

چودھویں صدی میں تیمور نے اس کو پامال کیا۔

پندرھویں صدی میں ملتان کے وائسرائے نے دہلی کے تخت پر قبضہ کر لیا۔

سولھویں صدی میں یہ مغلوں کے ماتحت آ گیا۔

الفنسٹن لکھتا ہے کہ صوبہ ملتان کو ایرانیوں نے مغلوں سے لے لیا اور نادر شاہ کی وفات

پر یہ احمد شاہ ابدالی کے قبضہ میں آیا۔ ۱۷۳۹ء میں جب نادر شاہ نے دہلی کو پامال کیا۔ تو اس وقت معاہدے کے مطابق اغلباً ملتان بمعہ ملحقات پار دریائے سندھ اس کو دئے گئے۔

۱۷۴۸ء میں جب احمد شاہ ابدالی نے سب پنجاب شاہانِ دہلی سے لے لیا تو ملتان میں اپنا حاکم مقرر کر دیا۔ دس سال بعد ۱۷۵۸ء میں اوینہ بیگ کی دعوت پر مرہٹے پنجاب میں آگئے تو احمد شاہ کے بیٹے تیمور کو سندھ پار دھکیل دیا۔ ۱۷۶۰ء میں احمد شاہ نے پھر پنجاب لے لیا۔

۱۷۷۲ء میں احمد شاہ فوت ہو چکا تھا۔ تیمور شاہ نے ملتان کی حکومت ایک ہندو لالہ دھرم داس اور ایک مسلمان مرزا شریف بیگ، دونوں کو مشترکہ طور پر دے دی۔ مسلمان نے ہندو کو قتل کر دیا۔ اور اپنے آقا کے ڈر سے ملتان کو دو سکھ سرداروں جھنڈا سنگھ اور گنڈا سنگھ کے حوالے کر دیا۔ جو سکھ حکومت کے آغاز میں پنجاب پر قابض ہو گئے تھے اور ملتان بھی ان کے قبضہ میں چلا گیا اور ۲۶ سال بعد ملتان ہی سکھ راج اور قوم کی تباہی کا باعث بنا۔

بموجب لفٹیننٹ میکلیگن ۱۷۷۹ء اور بموجب الفنسٹن ۱۷۸۱ء میں تیمور شاہ نے پھر ملتان پر قبضہ کر لیا اور نواب مظفر خان کو ملتان کا صوبہ دار مقرر کر دیا۔ قلعہ و شہر کے وہ حصے جو محاصرہ میں برباد ہوئے ان کی مرمت کے لئے تیمور شاہ نے ایک لاکھ روپے ادا کئے۔

نواب مظفر خان، ملتان کا آخری اور شریف حاکم تھا۔ وہ ۳۹ سال حاکم رہا۔ اس نے حج بھی کیا اور وہاں سے ایک درخت کی ٹہنی لایا، جو ملتان کے حضوری باغ میں لگائی۔ ایڈورڈ لکھتا ہے کہ "میں خود اس نادر درخت کے سایہ کے نیچے بیٹھا ہوں"

مارچ ۱۸۱۸ء میں رنجیت سنگھ نے آخری اور کامیاب محاصرہ ملتان کا کیا۔ ۲ جون کو بوڑھا نواب (سفید سر) قلعہ کے شگاف میں تلوار بدست سکھوں سے لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔ ملتان سکھوں کی حکومت میں شامل ہو گیا۔ اسی مظفر خان کے بیٹے اور پوتے ۱۸۴۸ء و ۱۸۴۹ء میں انگریزوں کے بہترین افسر تھے۔

رنجیت سنگھ نے ۱۸۲۱ء میں دیوان ساون مل (مولراج کا والد) کو ناظم ملتان مقرر کیا جو ۱۸۴۴ء میں ایک سپاہی کے ہاتھوں پستول کے فائر سے قتل ہوا۔ اس کے بعد مولراج حاکم مقرر ہوا۔

۲۰ اپریل ۱۸۴۸ء میں مولراج نے بغاوت کی اور ۲۲ جنوری ۱۸۴۹ء کو صبح کے وقت ہتھیار ڈال دیئے۔ اس پر مقدمہ چلایا گیا اور پھانسی کی سزا ملی۔ لیکن اس فیصلہ کے ساتھ عدالت نے اس کے لئے رحم کی درخواست بھی کی۔ کیونکہ وہ حالات سے مجبور تھا۔ لارڈ ڈلہوزی نے رحم کی درخواست منظور کر لی اور مولراج کو سمندر پار جلاوطن کر دیا۔

مہاراجہ گلاب سنگھ

(میجر ایبٹ کی ڈائری کے آئینہ میں)

ڈائری مورخہ ۱۱ جولائی ۱۸۴۸ء۔ یہ چتر سنگھ کا دلی دوست ہے اور میاں جواہر سنگھ پسر دھیان سنگھ مہاراجہ پونچھ سے خائف ہے کیونکہ جواہر سنگھ کشمیر میں گلاب سنگھ کی فوج میں ہر دلعزیز ہے۔ سب ڈوگرہ قوم کی ہمدردی میاں جواہر سنگھ کے ساتھ ہے۔

۲۔ سلطان حسین خان بنبہ والئی مظفرآباد پر گلاب سنگھ حملہ کرنا چاہتا ہے۔ لیکن میرے ڈر سے یہ اقدام کرنے سے ہچکچاتا ہے۔

۳۔ راجہ کرناؤ (علاقہ سرحد کشمیر) شیر احمد خان جو بموجب معاہدہ گلاب سنگھ کا باجگذار ہے گلاب سنگھ اس پر حملہ کر کے اس کے علاقہ پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اس کو لکھا ہے، کہ بموجب معاہدہ، وہ اس پر حملہ نہیں کر سکتا۔ اگر وہ اس کے علاقہ پر قبضہ کر کے الحاق کرے گا تو وہاں قبضہ رکھنے کے لئے قلعہ بنانے اور فوج رکھنے پر پانچ گنا زیادہ خرچ (یعنی اس علاقہ کی آمدنی سے پانچ گنا زیادہ) آئے گا اور یہ اس کے لئے مفید نہیں۔ گلاب سنگھ نے حملہ کرنے کے لئے یہ عذر تراشا ہے کہ راجہ کرناؤ نے ایک کھترانی کی آبروریزی کی ہے۔ اب ریذیڈنٹ کی خواہش پر گلاب سنگھ نے حملہ کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔

ڈائری مورخہ ۱۱ جنوری ۱۸۴۹ء دیوان جوالا سہائے کی لاہور میں موجودگی، اس کے آقا گلاب سنگھ کے اخلاص کی نشانی ہے۔ مہاراجہ کا تعلق، اپنے اس نوکر سے بہت گہرا ہے اور وہ اس پر بہت اعتماد کرتا ہے۔

کرنل کنّارا

(اور اس کے قتل کی تفصیل)

ڈائری ۷ راگست ۱۸۴۸ء نا ڑہ میں میجر ایبٹ لکھتا ہے کہ "سیر سے واپس آنے پر کرنل کنارا کی طرف سے اطلاع آئی کہ چتر سنگھ نے اس کو حکم دیا کہ وہ اپنی فوج اور توپوں کو شہر سے باہر لائے اور کیمپ لگائے۔ کنارا نے انکار کیا کہ میرے (میجر ایبٹ) حکم کے بغیر ایسا کرنا بغاوت کا اقدام ہوگا لہٰذا اس نے مجھ سے حکم مانگا ہے کہ وہ ایسی حالت میں کیا کرے۔ اسی اثنائیں اس کا سکھوں سے مقابلہ ہو گیا۔ سردار چتر سنگھ نے دو کمپنیاں بھیجیں کہ وہ دو توپیں جبراً لے آئیں۔ اس پر کرنل کنارا نے توپ میں خود بارود ڈال دیا اور گولہ انداز کو حکم دیا کہ توپ چلاؤ لیکن وہ سب پیچھے ہٹ گئے اور یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ وہ سردار کے نوکر ہیں۔ حوالدار کے پیہم انکار کرنے پر کرنل کنارا نے اس کو قتل کر دیا اور خود بتی لگائی۔ اتنے میں دو سپاہیوں نے فوراً اس پر فائر کر دیئے۔ اس پر کرنل اٹھا اور ایک حملہ آور کو قتل کر دیا، مگر دوسرے نے کرنل کنارا کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اس طرح سے ایک ایسا بہادر آدمی مر گیا جس میں گو تعلیم کی کمی اور دیگر فطری کمزوریاں تھیں، لیکن بہادر اور وفادار اعلیٰ درجہ کا تھا۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس کے لڑکوں کو جو لاہور میں ہیں، مناسب امداد دی جائے گی۔ مزید یہ کہ میں اس کے قتل کا بدلہ لینے کی سفارش کرتا ہوں۔"

ڈائری مورخہ ۹ راگست ۱۸۴۸ء نا ڑہ میں لکھتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد سردار چتر سنگھ فوجوں کو امداد کے لئے بلا رہا ہے حالانکہ میں نے اس کو یقین دلایا ہے کہ اگر وہ کرنل کنارا کے قاتلوں کو میرے حوالے کر دے تو میں سب ملک میں دو چپڑاسیوں کے ذریعہ سے امن بحال کرا دوں گا۔" ڈائری مورخہ ۱۲ راگست ۱۸۴۸ء میں لکھتا ہے کہ "چتر سنگھ پر حملہ کرنے سے پہلے اس کے وکیل کو مندرجہ ذیل شرائط صلح دے کر بھیجا گیا ہے۔

۱۔ کنارا کے قاتل میرے حوالے کئے جائیں اور اس مقدمہ کا فیصلہ میں کروں گا۔

۲۔ سب افواج اپنی چھاؤنیوں کو چلی جائیں۔

۳۔ مہلت صرف ایک دن کی ہے۔

کرنل بھوپ سنگھ سے بھی جواب طلب کیا گیا اور اس کو کہا گیا کہ اگر اس کی افواج اپنی چھاؤنی میں رہیں تو محاصرہ والے درے کھول دیئے جائیں گے اور تنخواہ افواج بھیج دی جائے گی۔ اشتہار بھی دیا گیا ہے کہ جو فوجی چھاؤنیوں سے آ گئے ہیں اگر وہ واپس چلے جائیں تو ان کو معاف کر دیا جائے گا۔ سردار چتر سنگھ نے کوئی جواب نہیں دیا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ باغی ہے۔"

لفٹیننٹ ہربرٹ

سردار چتر سنگھ کے اٹک پر حملہ کرنے کے وقت یہ قلعہ کا افسر انچارج تھا۔ سکھوں نے بہت عرصہ تک قلعہ کا محاصرہ کئے رکھا۔ لیکن اس افسر نے بڑی دلیری اور استقلال سے قلعہ کو محفوظ رکھا۔ چونکہ خشکی کے سب راستے سکھوں نے بند کر رکھے تھے، لہٰذا اس کو راشن پہنچانے کے لئے میجر ایبٹ نے تربیلہ سے بذریعہ کشتی سامان رسد وغیرہ بھیجنے کا انتظام کیا۔ اس کشتی میں غزن خان بن منیر خان پنی ایک انگریز کی معیت میں جا رہا تھا۔ قلعہ کے نزدیک جب کشتی پہنچی تو بڑے مشہور پتھروں سے جو آج تک بھی وہاں موجود ہیں، ٹکرائی اور غزن خان ڈوب گیا۔

لفٹیننٹ ہربرٹ کے متعلق میجر ایبٹ کی ڈائری سے حالات کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

"لفٹیننٹ ہربرٹ ۲۲ ستمبر ۱۸۴۸ء سے ۱۷ اکتوبر ۱۸۴۸ء قلعہ میں محصور رہا۔ قلعہ کے سامنے سکھوں کی بحیثیت فوج کے دو دستے کرنل رچھپال سنگھ، پرتاپ سنگھ اور بدھ سنگھ کی رجمنٹیں مع دس توپوں کے محاصرہ کئے ہوئے تھیں۔ اگاہے گاہے توپ کے فائر بھی ہوتے رہتے تھے۔

میجر ایبٹ لکھتا ہے کہ قلعہ اٹک کی دیوار ۵۲ فٹ اونچی ہے اور گھڑے ہوئے پتھروں سے بنی ہوئی ہے۔ میجر ایبٹ نے جب سنا کہ لفٹیننٹ ہربرٹ کی فوج کے کچھ آدمی چتر سنگھ کی طرفداری کرتے ہوئے غداری کریں گے اور قلعہ کا دروازہ کھول دیں گے تو اس نے ہربرٹ کو لکھا کہ وہ قلعہ کے دروازہ کو دس بارہ فٹ اونچی پتھر کی دیوار بنا کر بند کر دے، جو اس نے بنا دی اور اس قلعہ کے دروازہ پر قابل اعتبار گارد مع توپ کے مقرر کر دے اور اس بات کا خیال رکھے کہ گولہ انداز غداری سے غلط سمت میں گولے نہ پھینکے

آخر کار مورخہ ۲ جنوری ۱۸۴۹ء کے مطابق لفٹیننٹ ہربرٹ اپنے چھ سات آدمیوں سمیت بذریعہ جالا دریا پار کر کے بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا۔

خوانین ہزارہ

میجر ایبٹ نے اپنی ڈائری میں جابجا خوانین ہزارہ کا ذکر بھی کیا ہے۔ چند ایک مندرجات یہ ہیں۔

راجہ علی گوہر خان گکھڑ و جلال خان گکھڑ

علی گوہر خان کے متعلق لکھتا ہے کہ اس کی خط و کتابت سردار چتر سنگھ کے ساتھ ہے اور وہ اس کا ہمراز ہے۔

۶ جنوری ۱۸۴۹ء کی تاریخ کے تحت لکھتا ہے کہ "جلال خان گکھڑ کو امیر دوست محمد خان نے مہاراجہ کشمیر (گلاب سنگھ) کے پاس بھیجا ہے تاکہ مہاراجہ سے امیر کے لئے روپیہ کی امداد حاصل کرے۔ امیر دوست محمد خان نے دیگر خوانین ہزارہ کو بھی اطاعت کے پروانے بھیجے ہیں"۔

۱۳ جنوری ۱۸۴۹ء کی تاریخ کی ڈائری میں لکھتا ہے کہ "جلال خان مہاراجہ کا پیغام لے کر امیر کے پاس واپس آگیا ہے۔ جتنے دن وہ کشمیر میں رہا مہاراجہ کی طرف سے اس کو پانچ روپیہ روزانہ خرچہ ملتا رہا"۔

ڈائری مورخہ یکم اپریل ۱۸۴۸ء "میدان ہزارہ کے سب خوانین درانیوں سے مل گئے تھے اور اب ہماری فتح کے بعد سب دریائے سندھ کے پار رہتے ہیں"۔ مزید لکھتا ہے کہ "ہزارہ میں مشوانی قوم سب سے زیادہ بہادر قوم ہے"۔ یہ قوم میجر ایبٹ کی مخلصانہ طور پر وفادار رہی"۔

ڈائری مورخہ ۲۴ اپریل ۱۸۴۸ء "جہانداد خان والئ امب کالا ڈھاکہ کے لوگوں کو اگرور پر حملہ کرنے کے لئے اکسا رہا ہے"۔

ڈائری مورخہ ۸ مئی ۱۸۴۸ء "خانی زمان خان طاہر خیلی ہماری مخالفت پر نواب امب کو اپنی رعیت پر ظلم و زیادتی کی ترغیب کے زیر اثر کرتا ہے"۔ مزید لکھتا ہے کہ "جہانداد خان کا چچا نواب خان بھاگ کر میرے پاس پناہ لینے کے لئے آگیا ہے اور وہ شکایت کرتا ہے کہ بارہ سو روپیہ کی جاگیر اس کے لئے کافی نہیں"۔

اپنی ڈائری مورخہ ۱۶ اکتوبر ۱۸۴۸ء میں فتح خان ٹوانہ[1] کے قتل کا ذکر کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ "میں نے ان ہی دنوں میں اس کو مطلع کیا تھا کہ وہ محتاط رہے، کیونکہ سکھ اس کے قتل کا منصوبہ بنا رہے ہیں"۔

---

[1] اس کے مکمل حالات "جاگیرداران ہزارہ" میں تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا خط اس کو بروقت نہ مل سکا اور وہ قتل کر دیا گیا"۔

۱۹ر ستمبر کی ڈائری میں لکھتا ہے کہ وہ خان زمان خان طاہر خیلی، چتر سنگھ سے ساز باز کر رہا ہے اور اس کا ایک خط بنام چتر سنگھ پکڑا گیا ہے"۔ آگے چل کر لکھتا ہے کہ "وہ انہی ایام ۱۸۴۸ء میں ترس کھا کر میں نے اس کی اور سب تار خیلیوں کی جاگیر واگذار کر دی تھی"۔ پھر لکھتا ہے کہ "وہ فتح خان گھیبہ نے (فتح جنگ کا شہر اس کے نام پر آباد ہوا۔ ش ب)، جس کی ضبط شدہ جائداد نکلسن نے واگزار کر دی تھی۔ چتر سنگھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ (فتح خان) نکلسن کو قتل کرا دے گا۔ ہم ایسے لوگوں کے درمیان کام کر رہے ہیں"۔

۱۲ر مئی ۱۸۴۸ء کی ڈائری میں لکھتا ہے کہ وہ کڑالوں کے چیف سردار حسن علی خان، جس نے ڈھونڈوں کو مالیہ نہ دینے پر اکسایا تھا۔ میرے سمن میں حاضر ہوا۔ ہزارہ کے خوانین میں سب سے زیادہ بزدل ہے۔ (میجر ایبٹ کا یہ قول خلاف واقع ہے اور اس کی شدید ناراضی کا مظہر ہے۔ ش ب)

امیر دوست محمد خان

امیر کے متعلق میجر ایبٹ نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ وہ چتر سنگھ کی بغاوت کے دوران، اس (چتر سنگھ) کی دعوت پر ہزارہ پر حملہ آور ہونے کی غرض سے کابل سے آیا۔ میجر ایبٹ کے بیان کے مطابق امیر دوست محمد خان ۸ر دسمبر ۱۸۴۸ء کو پشاور پہنچا اور قلعہ بالا حصار پر قبضہ کر لیا۔ بارک زئی سردار (سردار یار محمد خان وغیرہ) اپنی جاگیروں (کوہاٹ ڈیرہ اسمٰعیل خان) کی طرف بھاگ گئے۔ اس نے اپنے پوتے ...... پسر محمد اکبر خان کو پشاور کا افسر عدالت اور لڑکے حیدر خان کو گورنر مقرر کر دیا۔ چتر سنگھ نے امیر دوست محمد خان کو جہلم تک کا علاقہ حوالہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ شرائط پیش کرنے میں مخلص نہ تھا۔ بلکہ اس نے یہ وعدہ بارک زئی سرداروں کو ڈرانے کے لئے کیا تھا تاکہ یہ سن کر بارک زئی سردار میجر لارنس کو اس (چتر سنگھ) کے حوالہ کر دیں۔ جب چتر سنگھ کا یہ مقصد پورا ہو گیا تو امیر کو درخواست کی کہ وہ اب نہ آئے لیکن امیر نے جواب دیا کہ اس نے فوج جمع کرنے پر بہت خرچ کیا ہے اور اب وہ کابل سے کافی دور ادھر آگیا ہے۔ لہٰذا اب واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ امیر کے ساتھ تین ہزار سپاہی اور توپیں بھی تھیں۔ اس نے ۲۶ر دسمبر ۱۸۴۸ء کو خیر آباد کے قلعہ سے اٹک کے قلعہ پر گولے برسائے تھے اور ۳۰ر دسمبر ۱۸۴۸ء کی ڈائری میں لکھتا ہے کہ وہ ایک ماہ ہوتا ہے کہ امیر کے ادھر آنے پر میجر ایبٹ نے اس کو ایک

خط لکھا تھا کہ " امید ہے کہ وہ دوستانہ ارادہ سے ادھر آیا ہے۔ مگر اس کا جواب ظاہر کرتا ہے کہ وہ پشاور، ڈیرہ جات اور ہزارہ کی ملکیت کا دعوٹی دار ہے اور وہ یہ علاقے اپنی فوج کے زور سے لے لیگا۔ اس کے بعد وہ انگریزوں اور سکھوں کے درمیان صلح صفائی کرا دے گا۔" پھر لکھتا ہے کہ " اس نے ہزارہ کے خوانین کو بھی اطاعت کے لئے بلایا ہے۔ اس کے قاصد کے بیان کے مطابق اس کے ساتھ بارہ ہزار فوج ہے جس میں چھ رجمنٹ پانچ پانچ سو کی اور تین سات سات سو کی ہیں۔"

ڈائری مورخہ ۱۲ جنوری ۱۸۴۹ء میں لکھتا ہے کہ " امیر اپنے خط کے جواب کا اصرار کر رہا ہے۔" میں نے اس کو جواب دے دیا ہے کہ اس کے جواب دینے کا میں مختار نہیں۔ یہ جواب میری حکومت ہی دے سکتی ہے۔" میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ " میری حکومت اس مطالبے کو دشمنی تصور کرے گی۔" مزید لکھتا ہے کہ " اگر اس نے اپنے لڑکے کو اٹک کے محاصرہ سے واپس نہ بلایا، یا اس نے دریائے سندھ کو پار کیا تو ہماری حکومت کے ساتھ دشمنی کا آغاز ہو گا۔ اس نے قاصد کو سمجھایا کہ وہ چتر سنگھ پر اعتبار نہ کرے۔ اگر چتر سنگھ موجودہ معرکہ میں کامیاب ہو گیا تو وہ امیر کو پشاور سے نکال دے گا۔"

مورخہ ۱۰ جنوری کی ڈائری میں لکھتا ہے کہ " کہا جاتا ہے کہ امیر دوست محمد خان کے ساتھ سات سو ملّا (مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ ش ب) جو انگریزوں کے حمایتی مسلمانوں پر کفر کا فتوٰی لگاتے ہیں۔" آگے چل کر لکھتا ہے کہ وہ امیر نے اٹک سے سکھوں کو نکال دیا ہے۔"

ضلع ہزارہ میں انگریزی فوجوں کے قیام کیلئے صحت افزا مقام تجویز کرنے کے متعلق خط و کتابت

اس خط و کتابت سے میجر ایبٹ کی سیاسی بیداری، لوگوں کے عادات کا علم اور تاریخی واقعات سے باخبری کا اظہار ہوتا ہے، جو قابل ستائش ہے۔

ڈائری مورخہ ۱۴ اپریل ۱۸۴۹ء سری کوٹ میں رقمطراز ہے کہ " کیپٹن ہومز (HOLMES) رسالہ متعینہ راولپنڈی آج یہاں آیا۔ وہ فوج کے لئے صحت افزا مقام کی تلاش میں ہے۔ مجھے اس معاملہ، ہزارہ میں انگریزی افواج کے قیام میں تشویش ہے۔ ہزارہ اگرچہ پرامن ہے اور لوگ انگریزی حکومت کی عزت بھی کرتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ ابھی تک اسلحہ بند ہیں اور تقریباً بیالیس ہزار کے قریب اسلحہ بند آدمی اس وقت اس ضلع میں ہوں گے۔ ان میں پہاڑی علاقہ کے لوگ مثلاً گندگر

کڑال اور ڈھونڈ بہت مضبوط ہیں اور ان سے مقابلہ میں سکھوں کا بہت سا خزانہ اور آدمی خرچ ہو چکے ہیں، جو سکھوں کے ظلم و زیادتی کا نتیجہ تھا۔ اب چونکہ مالیہ کم کر دیا گیا ہے، بیگار ختم کر دی گئی ہے۔ ملک آباد ہے، لوگ مطمئن اور خوش ہیں۔ امید ہے کچھ مدت کے بعد وہ اپنی پرانی عادت، اسلحہ سے کام لینا بھول جائیں گے۔ اس طرح سے حکومت کا خرچ بھی کم ہوتا جائے گا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ سب لوگ مسلمان ہیں۔ اگرچہ متعصب نہیں لیکن مذہب کے مخلص پابند اور پرہیزگار ہیں۔ اس وجہ سے پردہ کے سخت پابند ہیں۔ اپنے پیغمبر کے حکم کے خلاف کسی بھی بات پر سخت برانگیختہ ہو جاتے ہیں۔ ان میں نافرمان اور بد عقیدہ لوگ بھی ہیں۔ لیکن یہ لوگ ان امورات کا اظہار ظاہراً نہیں کرتے۔ ان کی سکھوں سے عداوت کی بنیاد ان کی اپنے مذہب پر پختگی، سکھوں کی بت پرستی کی مخالفت ان کے سور کھانے اور شراب نوشی کی عادت سے بیزاری کی وجہ سے ہے۔ حالانکہ سکھوں کے یہ معمولات سرِ عام نہیں ہوا کرتے تھے۔ جیسے کہ انگریزی سپاہیوں (گورہ فوج) کی بارکوں سے باہر نظر آتے ہیں۔ سکھ شراب پینے میں شریفانہ خو، خوش باش، باتونی اور لاف زن تھے، لیکن بدمعاش نہ تھے۔ تاہم اہلِ ہزارہ ان کی ان عادات سے بیزار تھے۔

لہٰذا جب تک ہزارہ کے لوگوں میں نظامِ حکومت کی مکمل اطاعت کا جذبہ پیدا نہ کر لیا جائے اور ہمارے گورہ فوج کے سپاہی ان لوگوں کے نزدیک رہنے لگے تو یہ ان کے ایسے حالات کو دیکھ کر سکھوں سے بھی زیادہ ان سے بیزار ہو جائیں گے اور ہماری حکومت کی عزت ان کی آنکھوں میں نہ رہے گی۔ دوسرے یہ کہ انگریز افسر ہزارہ کی زبان سے ناواقفیت اور اس ملک کے حالات سے لاعلمی کو اپنی حاکمانہ دلیری کے زور سے پورا کریں گے اور وہ ان پہاڑوں کے شوریدہ سر مسلح علاقہ میں جو قانون سے یکسر ناواقف ہے۔ بے محابا بغیر ہتھیار اور محافظ نوکروں کے، ان کی آبادیوں میں گھومیں گے اور یہ امر بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ کسی قاتل کو ان علاقوں سے گرفتار کرنا بالکل ناممکن ہے اور یہ لوگ ان افسروں کے رتبہ و حیثیت کو جو بغیر نوکروں اور اردلیوں کے پھرتے ہیں، جاننے سے قاصر ہیں۔ نیز یہ کہ وہ اپنی عورتوں کے بارے میں بہت حساس ہیں اور خود ہی بدلہ لینے پر تیار ہو جاتے ہیں، لہٰذا یہ لوگ کسی ایسی جگہ پر فوج کا کیمپ نہ لگانے دیں گے جہاں سے ان کے گھر، مستورات، نظر آئیں۔ لہٰذا میری رائے میں ہزارہ (میدان ہزارہ)، ڈھونڈ اور کڑال کے پہاڑوں

پر فوراً قبضہ کرنا اور وہاں پر انگریزی افسران اور افواج کا مقیم کر دینا ایک خطرناک تجربہ ہوگا۔ انگریز افسروں کی حفاظت زندگی اور رعب میں ہماری سلطنت کا راز ہے اور ان کو محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ اگر مسلم آبادی کے جذبات کو برانگیختہ کر کے ان کو مقابلہ کے لئے اکسایا جائے تو ہم انگریزوں کے قاتلوں سے بدلہ نہ لے سکیں گے اور ہمارے افسران کی جان، عزت کا تقدس برقرار نہ رکھا جا سکے گا۔ حکومت انگریزی کے تسلط سے پہلے یہ ضلع اس علاقہ کے قلعوں میں متعین افواج حکومت کے ساتھ کامیابی سے مسلح جنگیں کر چکا ہے۔ حالانکہ یہ قلعے ان پہاڑی علاقوں کو فتح کرنے کے بعد میں نے ہی شروع میں بنوائے تھے اور پھر ان کا انتظام چتر سنگھ پر بہت اعتماد کرتے ہوئے اس کے حوالے کر دیا تھا۔ اس وقت میں اس کے ارادۂ بغاوت سے آگاہ نہ تھا۔ ان سب قلعوں پر چتر سنگھ کے اپنے آدمی قابض تھے۔ اگر جنگ طول پکڑ جاتی اور سکھ ہزارہ میں جمع ہو جاتے تو ان قلعوں کی وجہ سے ہمیں جنگ میں سخت تکلیف اٹھانی پڑتی۔ میں نے ان قلعوں کی ناکہ بندی کر دی تاکہ قلعہ والوں کو باہر سے کوئی امداد نہ مل سکے۔ اس ناکہ بندی کی تاب نہ لا کر وہ ان کو خالی کر کے چلے گئے۔

سکھوں کے عہدِ حکومت میں ان ملکی لوگوں سے ہتھیار لینے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن میدانی علاقہ کے سوا کامیاب نہ ہو سکی اور پہاڑوں پر اسلحہ اسی طرح موجود رہا۔ جس سے میدانی علاقہ کے لوگ پہاڑوں کے رحم و کرم پر رہ گئے۔ اور یہ پہاڑی لوگ کمزور حکومت کے لئے اسی طرح خطرہ بنے رہے اب (یعنی اپریل ۱۸۴۹ء ش ب) راولپنڈی ضلع کے لوگوں سے اسلحہ لیا جا رہا ہے تو یہ سب ہزاروں کی تعداد میں پہاڑی لوگ چوتھائی قیمت پر خرید رہے ہیں۔ جب پہاڑی لوگوں کو ہم پر مکمل اعتماد ہو جائے گا اور وہ یقین کر لیں گے کہ ان کو اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے اسلحہ کی ضرورت نہیں تو پھر ان سے اسلحہ لیا جا سکے گا۔ لیکن یہ کافی مدت کے بعد اور قانون تدریجی (LAW OF GRADUAL PROGRESSION) کے مطابق آہستہ آہستہ اور اسی طریق سے فطری اور اخلاقی امور میں امن و امان پیدا ہوتا ہے۔ تیزی کے عمل سے فساد اور بدامنی پیدا ہوتی ہے۔ حالات متذکرہ بالا کی بنا پر میں تجویز کرتا ہوں کہ یہ چھاؤنی:

۱۔ موضع نور جو دریائے جہلم کے سامنے اور پہاڑ کے جنوبی سرے پر واقع ہے میں ۔۔ موزوں ہوگی۔ اس کی بلندی چھ ہزار فٹ ہے۔ پانی وافر اور جگہ کشادہ ہے۔ چیڑھ کے جنگل ہیں۔ موسمی بخار (ملیریا) سے بھی جو ہزارہ کے سب پہاڑوں میں موجود ہے۔ پاک ہے۔ اس پہاڑ پر برف رہتی ہے۔

راولپنڈی سے چالیس میل کے فاصلہ پر ہے اور میدانی علاقہ سے ایک منزل کے مارچ سے یہاں پہنچا جا سکتا ہے۔

۲۔ کروڑی پہاڑ، جس کی بلندی کم ہے۔ مون سون کے موسم میں بخار عام ہوتا ہے۔ باقی موسم اس میں اچھے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے لئے جو کروڑی نہیں پہنچ سکتے، نور اچھا ہے۔ یہ جگہ راولپنڈی سے بیس میل کے فاصلہ پر ہے۔

میری رائے میں انگریزی اور دیسی فوج کی مستقل رہائش کے لئے میدانی علاقے بہتر رہیں گے۔ تبدیلی آب و ہوا کے لئے گرمی کے موسم پر جا سکتے ہیں۔ چونکہ نور (NAVRAV) اور کروڑی ہزارہ کے پہاڑی علاقوں کے سرے پر ہیں، لہٰذا ہزارہ کے لوگوں کا اعتراض کم ہوگا بہ نسبت دوسری جگہوں کے۔ ان ہر دو جگہوں پر ہزارہ سے دور کے علاقہ کے لوگوں، قوم ستی، سے چھاؤنی والوں کو واسطہ پڑے گا۔ اس قوم کے ہمسایوں سے کوئی ہمدردی نہیں (قوم ستی، تحصیل مری کے پہاڑوں اور کہوٹہ کے شمال مغربی کونے میں آباد ہیں۔ ش ب)

۳۔ اگر میری رائے بالا قابل قبول نہ ہو تو پھر میاں جانی کی چوکی اور موچھ پوری (نتھیا گلی اور ڈونگا گلی کے پہاڑ) بہتر ہوں گے۔ ان کی بلندی دس ہزار فٹ ہے اور یہ دونوں مقامات خود سر قوم ڈھونڈ کے درمیان ہیں۔ یہ قوم ناقابل اعتبار اور جنگ جو قوم ہے۔ ان ہر دو مقامات کو بلند پہاڑوں نے میدانی علاقہ سے الگ تھلگ کر رکھا ہے۔

۴۔ آخری تجویز۔ خان پور علاقہ کے پہاڑ راولپنڈی سے نزدیک لیکن موسمی بخار کا گھر ہیں۔ خاص کر مون سون سے اور اس کے بعد۔ حکومت کا جو حکم ہو تعمیل کی جائے گی۔ میں نے اپنی رائے دیانتداری سے دے دی ہے اور جو اعتراض اور مشکلات تھیں بیان کر دی ہیں۔ مکرر یہ کہ دو تین سال بعد ہماری جو پوزیشن بھی پنجاب میں ہوگی سو ہوگی۔ بہرحال اس اثنا میں ہزارہ کے لوگوں کو بددل کرنا اور ناراض کرنا ٹھیک نہیں۔ میرا یقین ہے کہ اس عرصہ کے بعد ہزارہ کے لوگ ہماری حکومت پر اعتماد کلی کریں گے اور اس وقت یہ لوگ انگریزی فوج کے افراد کا نشۂ شراب میں چور ہو کر لڑکھڑانے اور گرنے کی حالت کو دیکھ اور ان کے سور کھانے کی عادت کو برداشت کر سکیں گے؟

میجر ایبٹ کے عہد کے بہت مدت بعد انگریزی حکومت نے خانس پور میں انگریزی چھاؤنی بنائی

جواب "ایوبیہ" میں تبدیل ہو چکی ہے۔

نوائے وقت مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۷۰ء میں "مری کی تاریخ" ایک مضمون خواجہ عبدالطیف صاحب کا شائع ہوا جو اس ضمن میں قابلِ اندراج ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

"مری کو عہدِ برطانیہ کے دوران ۱۸۴۹ء میں بسایا گیا تھا۔ اس مقام کے لئے مینیاڑی نامی گاؤں کا علاقہ منتخب کیا گیا۔ اس گاؤں کا باقی ماندہ علاقہ "کشمیر پوائنٹ" اور "پنڈی پوائنٹ" کے ساتھ ساتھ واقع پہاڑیوں سے دیکھا جا سکتا ہے"۔

مری کی وجہ تسمیہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"نواحی علاقوں میں لفظ ماڑی (بلندی پر واقع مقام) سے لیا گیا۔ انگریز "ڑ" کا تلفظ "ر" سے کرتے تھے۔ لہٰذا ان کی زبان پر "ماری" ہوا۔ جس سے "مری" بن گیا۔ جب انگریزوں نے ۱۸۴۸ء میں سکھوں کو شکست دے دی تو پنجاب کی گرم آب و ہوا سے بچنے کے لئے پہاڑی مقام کی تلاش ہوئی تو انہوں نے اس جگہ (۷۵۰۰ فٹ بلند) کو منتخب کر لیا"۔

۱۹۰۴ء میں مشہور جنرل لارڈ کچنر بھی مری آئے اور یہیں سے مہدی سوڈانی کے درویشوں کی تحریک کو ختم کرنے کے لئے سوڈان گئے۔

غلام خان ترین کی گرفتاری

مقامی روایات کے مطابق غلام خان ترین نے، جبکہ درانی واپس چلے گئے اور سکھوں کا اقتدار ختم ہو گیا تو اپنے معتمدوں یا مقامی سربرآوردہ لوگوں کے ایماء پر خود ہی میجر ایبٹ کے پاس حاضر ہو گیا تھا۔ ان لوگوں نے اس کو تسلی دی کہ میجر ایبٹ اس کو گرفتار نہیں کرے گا، بلکہ معاف کر دے گا۔ کہا جاتا ہے کہ میجر ایبٹ کا ان سرکردہ لوگوں کو اپنے اعتماد میں لے کر غلام خان کو اس طریقہ سے آسان طور پر گرفتار کرنا مقصود تھا۔ اگر وہ خود اس کے پاس حاضر نہ ہوتا تو اس کی گرفتاری مشکل سے ہی عمل میں آ سکتی تھی۔ جب غلام خان بمقام نارہ میجر ایبٹ کے پاس حاضر ہوا تو اس کو گرفتار کر کے قلعہ ہرکشن گڑھ (قلعہ ہری پور) میں قید کر دیا گیا۔ اس کے بعد کے واقعات میجر ایبٹ کی ڈائری مورخہ ۲۵ اپریل ۱۸۴۹ء کے مطابق حسب ذیل ہیں۔

"غلام خان میدان ہزارہ کا چیف (رئیس)، ہرکشن گڑھ کے قلعہ میں قید ہے۔ اس سے علاقہ میں جوش اور اشتعال پیدا ہو گیا ہے۔ قلعہ کی حفاظت کے لئے فوج نہیں ہے۔ ملکی سپاہی ہی حفاظت پر مامور ہیں، جن کی ہمدردیاں ان قیدیوں (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غلام خان کے ساتھ اور لوگ بھی اس وقت قلعہ میں زیر حراست تھے۔ ش ب) کے ساتھ ہیں۔ جو ان کے ہم خاندان، ہم قوم اور ہم مذہب ہیں، لہٰذا میں نے کمان افسر قلعہ اٹک کی اجازت بہ امید منظوری لفٹیننٹ کرنل سر ایم ایم لارنس کمانڈنگ افسر راولپنڈی سے لے لی ہے کہ اس خان مذکور کو قلعہ اٹک میں بند کر دیا جائے اور درخواست کی ہے کہ اس کے ساتھ کوئی سختی نہ کی جائے، سوائے اس کے کہ جو حفاظت کے لئے ضروری ہو۔

جہانداد خاں (نواب امب) کا وکیل نواب کو اکسا رہا تھا کہ وہ اپنے دوست غلام خان کو طاقت کے زور سے رہا کرانے کی کوشش کرے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ جہانداد خان کافی پیدل اور سوار فوج کے ساتھ ہزارہ میں اس دن داخل ہوا جس دن غلام خان کو قلعہ ہرکشن گڑھ سے نکال کر اٹک بھیجا جا رہا تھا۔ ممکن ہے اس کی یہ آمد میاں اتفاقیہ اور غیر ارادی ہو۔ لیکن میں نے جہانداد خان کو بغیر اجازت اس طرح ہزارہ میں داخل ہونے پر ملامت کی۔ میں سارا دن ان حالات کی وجہ سے پریشان رہا لیکن میری پارٹی قیدی (غلام خان) کو لے کر خیریت سے اٹک پہنچ گئی۔"

میجر ایبٹ کا ہزارہ کا مکمل دورہ اختتام بغاوت پر

فساد کے دوران میجر ایبٹ زیادہ تر شیروان (تناول)، اور نارڑہ سید خانیاں (گندگر) میں مقیم رہا۔ اول الذکر مقام پر حفاظت ذاتی آرام اور امن کی فضا میں مستقبل کی کارروائی کا پروگرام بنانے کے لئے اور آخر الذکر میں عملی کارروائی۔ سکھوں پر حملہ اور مدافعت کے لئے رہتا تھا۔ جب بغاوت فرو ہو گئی تو اس نے کل ضلع کا دورہ کر کے صورت حالات کا جائزہ لیا۔ اس کی ڈائری کی روشنی میں اس دورہ کی تفصیلات یہ ہیں۔

۲۸ر اپریل ۱۸۴۹ء۔ خازی۔ کڑی دھرچٹی کے لئے خازی کے راستہ سے مارچ کیا۔ دھرچٹی علاقہ غلام محی الدین خان طاہرخیلی میں ایک قلعہ بنانا چاہتا ہوں۔ جہاں سے وہ خود بخود ملک بدر ہو گیا ہے۔ میرا منشاء ہزارہ میں موزوں جگہوں پر چوکیاں بنانا اور ان علاقوں کو دیکھنا ہے، جہاں سے

پہلے کبھی نہیں گیا ہوں۔ تاکہ مشکل کے وقت حفاظت کا انتظام کرنے کا بندوبست کرسکوں۔ اس وقت تک میں سری کوٹ کے قلعہ کی تعمیر میں مصروف رہا اور کہیں باہر نہ جاسکا۔

۲۸ اپریل ۱۸۴۹ء کڑی دھرچٹی۔ باغدرہ کے راستہ دھر چٹی گیا۔ یہ چڑھائی دنیا کی چڑھائیوں میں سخت ترین ہے۔ ایک سو ماہر نشانہ باز یہاں بیٹھ کر بڑی سے بڑی فوج کو تباہ کرسکتے ہیں۔ سری کوٹ کی چڑھائی اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔ یہاں قلعہ کا پانی ختم ہو چکا ہے۔ حالانکہ پتھر اور پانی دور سے لانا پڑتا ہے۔ یہ بہت ضروری قلعہ ہے۔ طاہر خیلی قوم کے بہت سے محفوظ مقامات اس کے نیچے ہیں۔ دوپہر کے وقت پیر تھان گندگر کی چوٹی پر چڑھا۔ یہ سات میل کا فاصلہ تھا۔ پانی یہاں نہیں۔ اس چوٹی کے دونوں طرف اترائی بہت زیادہ ہے۔ نیچے میدان میں کسی نشانہ پر بھی گولی بڑی خوبی سے مار کرسکتی ہے۔ اندازہ ہے کہ اس کی بلندی ۴۰۰۰ فٹ ہوگی۔ یہ جگہ گندگر کے جنوبی حصہ کی کنجی ہے اور تمام دیہات اس سے نیچے کی چوٹیوں پر ہیں۔ یہاں آنے پر مجھے اس علاقہ کی فوجی اہمیت کے مقامات کا علم ہو گیا ہے۔"

۳۰ اپریل ۱۸۴۹ء تربیلہ۔ آج تربیلہ آیا۔ یہاں ایک قلعہ بنا رہا ہوں۔ سکھوں کی بغاوت کے دوران میں نے یہاں کا چھوٹا سا قلعہ خود ہی برباد کرا دیا تھا، تاکہ ان کے ہاتھ نہ لگ سکے۔ اس قلعہ کے عین سامنے (موجودہ تھانہ تربیلہ اسی قلعہ میں ہے۔ ش ب) دریا کے پار باغی رہتے ہیں (موضع کھبل وکیا جو تھانہ تربیلہ کے سامنے ہیں۔ ش ب)، یہ قلعہ ایسے لوگوں کے حملہ سے بچاؤ کا آسان طریقہ ہے۔ یہ قلعہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ دریائے پار اسلحہ بند قوم ہے چھاؤنی بنانے کی بجائے قلعہ بنانے پر خرچ پانچواں حصہ ہوتا ہے اور بعض دفعہ دسواں۔

خانی زمان خان (طاہر خیلی قوم کا رئیس) کھبل میں ہے۔ میں نے اپنی دوربین سے اسے کھبل سے ستھانہ جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ کھبل اس واسطے گیا کہ لوگوں کو رشوت دے کر ہزارہ اور چھچھ کے فصلات کو تباہ کرنے کیلئے۔ سنا ہوں (ہوا سے بھری ہوئی کھال جن پر لوگ لیٹ کر دریا پار کرتے ہیں ش ب) کے ذریعہ دریا پار کرنے پر آمادہ کرسکے۔ میں میجر لارنس سے کہوں گا کہ وہ پیہور کے قلعہ پر قبضہ کرلے۔ اسی راستہ سے ان دیہاتوں (دریائے سندھ سے مغربی کنارے والے) کو رسد آتی ہے۔"

۱۱رمئی ۱۸۴۹ء ہری پور واپس آیا ہوں اور بارشوں کی وجہ سے رکا ہوا ہوں۔ ۱۸رمئی ۱۸۴۹ء تک پچھلے آٹھ دس ماہ کے حسابات کی پڑتال اور درستی کر رہا ہوں۔ اس حساب کی درستی کی مشکلات تین قسم کے روپوں میں حسابات رکھنے سے ہے۔ ۲۶رمئی ۱۸۴۹ء تک ہری پور ہی میں رکا رہا۔ علاقہ کرڑال میں جانا ضروری ہے، لیکن کوئی افسر یہاں موجود نہیں جو دریائے سندھ پار مفروروں پر نظر رکھ سکے میں مختلف مقامات کا دورہ کر کے مقدمات کو ان کے جائے وقوع پر ہی فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے لوگوں کو آرام ہوگا۔

حکومت کے ملٹری پولیس کے قیام کے حکم سے ناواقف ہوں۔

۱۰رجون ۱۸۴۹ء رجوعیہ ۔ ۱۱رجون بھی یہاں ہی رہا۔

۱۲رجون ۱۸۴۹ء ناڑہ نیلاں (علاقہ کرڑال) یہ میاں جانی کی چوکی کی شاخ کے سرے پر واقع ہے۔ پہلے میں یہاں کبھی نہ آیا تھا۔ بلندی پانچ ہزار فٹ ہے۔ لیکن اس کے مناظر معمولی، غیر دلچسپ مثل شیروان، ڈنہ، سری کوٹ، سری بنگ، مارٹی، جموں اور رچھ ہیں۔

۱۳رجون ۱۸۴۹ء میرانملی۔ "یہ مارچ بیس میل کا تھا۔ یہ دیہات میاں جانی کی چوکی کے دامن میں ہیں۔ یہاں بڑے تناور درختوں از قسم چیڑھ، شاہ بلوط، ییو (YEW)۔ سدا بہار درخت، اور منون کے درمیان ایک چھوٹا سا قلعہ ہے، جہاں چند پولیس کے سپاہی حفاظت کے لئے مقرر ہیں"۔

۱۴رجون ۱۸۴۹ء میاں جانی کی چوکی۔ بلندی دس ہزار فٹ۔ اس کی چوٹی سے سب میدان ہزارہ نظر آتا ہے۔ مری، گھوڑا گلی، افواجوں کے لئے صحت افزا مقامات ہیں۔ مری میں چار ماہ برف رہتی ہے۔ ڈھونڈ کرڑال اور ستی قوم، حکومت کی کمزوری سے قلعوں پر حملے کرتی رہتی ہیں۔ مری کی بلندی سات ہزار فٹ ہے"۔

۱۸رجون ۱۸۴۹ء مانسہرہ۔ "یہ بڑا قلعہ ہے۔ اس جگہ کرنل بھوپ سنگھ سکھوں کا ایک اچھا اور قابل افسر ہے۔ مگر بغاوت میں ملوث ہے۔ اس نے بہت دنوں تک اپنی فوج کا کیمپ رکھا۔ اگر جھنڈا سنگھ ہزارہ نہ بھیجا جاتا تو یہ فوج ہتھیار ڈال دیتی اور بغاوت فرو کر دی جاتی۔ ان حالات کا ایک سکھ افسر کے پکڑے خطوط سے پتہ چلا"۔

۱۹رجون ۱۸۴۹ء شنکیاری۔ آج یہاں آیا۔ یہ جگہ پکھلی کے سرے پر واقع ہے پہلے میں

حد بندی میں مشغول رہا۔ پھر بغاوت ہو گئی، لہٰذا بہت مدت کے بعد پکھلی آیا ہوں۔ اب سب ملک زیر کاشت آگیا ہے۔ ایک مربع گز زمین بھی کاشت کے بغیر نہیں رہی۔ یہ سب امن کی برکت ہے ہزاروں لوگ واپس آگئے ہیں اور زمین پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے لگاتار جھگڑے ہو رہے ہیں۔

۲۰ر جون ۱۸۴۹ء کو یہاں ہی مقدمات فیصلہ کرنے کے لئے ٹھہر گیا ہوں۔ بھوگڑ منگ کے درے میں بہت ظلم و جبر ہوتا ہے۔ یہاں میرا کوئی قلعہ نہیں۔ لوگ ڈر کے مارے شکایت نہیں کر سکتے۔ میں ان حالات کی اصلاح کے لئے اس کے گرد و نواح میں سال میں چند ماہ گزاروں گا اور اس درہ کا دورہ اکثر کروں گا۔ کچہری حسب معمول کی گئی۔

۲۱ر جون ۱۸۴۹ء "آج میں مانسہرہ واپس آگیا ہوں۔ میں کئی مہینوں سے پشاور لکڑی بھیجنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پکھلی میں لکڑی کافی ہے۔ لیکن دریائے سرن میں پندرہ میل سے زیادہ دور نہیں پہنچ سکتی۔ خشکی کا راستہ تنگ ہونے کی وجہ سے ڈھلائی بذریعہ باربرداری بہت مشکل نہیں۔ میں نے راستہ چوڑا کرنے کا حکم دیا ہے۔ پشاور کے لئے عمارتی لکڑی کی بہت ضرورت ہے، ہری پور میں نہیں مل سکتی۔ دریائے دوڑ اور دریائے ہرو سے نہریں نکل جانے سے بہت کم ہو گیا ہے اور لکڑی بہہ کر نیچے نہیں جا سکتی۔

۲۲ر جون ۱۸۴۹ء تک مقدمات کے فیصلہ کے لئے ٹھہر گیا ہوں۔

۲۳ر جون ۱۸۴۹ء مانگل "یہاں خان پور کے کاردار کا خط ملا کہ راجہ حیدر بخش خان باغی ہو کر خان پور کے پہاڑوں میں چلا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کاردار اور راجہ کے درمیان کوئی ذاتی تنازعہ ہے۔ بہر حال تفتیش ضروری ہے۔ ہزارہ میں تھوڑی سی غفلت سے آگ بھڑک سکتی ہے۔ تھوڑا سا کام یہاں کرنے کے بعد نواں شہر گیا۔ کچھ مقدمات وہاں فیصلہ کرنے تھے۔"

۲۴ر جون ۱۸۴۹ء "موضع چلبہ (نزد بال ڈھیر۔ ش ب) آگیا ہوں۔"

۲۵ر جون ۱۸۴۹ء گلڈھیری "یہ غلام خان ترین کا مسکن ہے۔ جو اب قلعہ اٹک میں قید ہے۔ وہ ایک ہوشیار آدمی ہے کہ اس نے اپنے گاؤں کی عورتوں کو یقین دلا رکھا ہے کہ اس نے ان کی حفاظت کے لئے اپنی جان قربان کر دی۔ حالانکہ یہ سب کو معلوم ہے کہ ہزارہ میں درانی اس کے بلانے پر آئے۔ مجھے یہ گمان نہ تھا کہ یہ جگہ اتنی محفوظ ہے۔ اگر ایک سو بندوقچی اس جگہ پر بیٹھے

ہوئے ہوں تو درانیوں کی پوری فوج اس پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکے گا۔ میں نے غلام خان کو آدمی دئے تھے جن کی تنخواہ میں دیتا تھا۔ اور مزید امداد کا وعدہ بھی درانیوں کے حملہ کی صورت میں کیا تھا۔

گاؤں کی بوڑھی عورتیں جرگہ کی شکل میں میرے پاس اس کی رہائی کی درخواست لے کر آئیں۔

یہاں میرے بلانے پر راجہ حیدر بخش خان حاضر ہوا۔ لیکن صحیح حالات معلوم کرنے کے لئے کہ آیا راجہ کا قصور ہے یا نہیں۔ مجھے خان پور جانا پڑے گا"

۲۶ جون ۱۸۴۹ء چھجیاں کے چھوٹے سے قلعہ پر چڑھا۔ اس کی بلندی ساڑھے پانچ ہزار فٹ ہے۔ اس سے اونچا پہاڑ سری بنگ سات ہزار فٹ ہے۔ یہ قلعہ میں نے اس وقت بنایا تھا۔ جب میں نے اس ضلع کی حدبراری پہلی دفعہ کی تھی، اس کے بعد آج یہاں آیا ہوں۔ یہ قلعہ اس لحاظ سے ضروری ہے کہ گلڈھیری سے اونچا ہے اور خان پور کے علاقہ کا حصہ ہے۔ یہاں باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا کہ مہاراجہ کشمیر نے چھ سو توپیں چھپا کر رکھی ہوئی ہیں"

چند مزید مندرجات

۱۔ میجر ایبٹ نے ۳۰ جون ۱۸۴۹ء نئی فوجی بھرتی کے لئے لکھا۔

۲۔ ۱۷ اگست ۱۸۴۹ء ڈائری۔ مہاراجہ جموں کی دو توپیں سکھوں کے ساتھ جنگ کے زمانہ میں میجر ایبٹ کے پاس تھیں۔

۳۔ ارسلہ خان زیدہ ضلع مردان کے متعلق ڈائری مورخہ ۲۱ ستمبر ۱۸۴۹ء میں لکھا ہے کہ گائیڈ رسالہ متعینہ مردان کے افسر نے ارسلہ خان کو گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کو گرفتار نہ کر سکا۔

میجر ایبٹ کے روزانہ کے معمولات

اس ڈائری کے مندرجات کو اس کے روزانہ کے معمولات کے ذکر کے ساتھ ختم کرتا ہوں، تاکہ اس کی شخصیت، عادات اور رجحانات کا صحیح اندازہ ہو سکے کہ وہ کس قسم کا انسان تھا، جس نے اس ضلع کے لوگوں کے دلوں کو اپنے اخلاق اور قابلیت سے مسخر کر لیا تھا اور یہ اندازہ ہو سکے کہ اس کی کامیابی کا راز اس کے احساس فرض شناسی، مذہبی پابندی، اپنے معمولات میں استقلال، مستعدی اور محنت میں مضمر تھا۔

۱۔ وہ مذہب کا پابند تھا۔ ہر اتوار، جہاں کہیں بھی مقام ہوا صبح کے وقت وہ عبادت کیا کرتا تھا۔ اس کا ذکر اس نے بڑے شوق اور دلی طمانیت سے بہت سی ڈائریوں میں کیا ہے۔

۲۔ صبح سویرے، ہر روز وہ سیر کے لئے جایا کرتا تھا۔

۳۔ سیر سے واپس ہو کر دس بجے تک سرکاری کام، دفتری کاغذات اور سرکاری خطوط کے جوابات لکھتا تھا اور دیگر انتظامی معاملات کے بارے میں ملازمان کو ہدایات دیتا تھا۔

۴۔ دوپہر کے کھانے کے بعد شام (غروب آفتاب) تک لوگوں کی عرضیاں سنتا اور ان پر احکام صادر کرتا تھا۔ مقدمات کی سماعت کرتا اور فیصلے سناتا تھا۔ مقدمات کو بلا تاخیر روزانہ سننے اور بروقت فیصلہ کرنے کو وہ بہت زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ اس کی انصاف پروری سے لوگ مطمئن اور خوش تھے اور اس پر کلی اعتماد رکھتے تھے اور ہر وقت اس کی آواز پر لبیک کہنے کے لئے آمادہ رہتے تھے اور وہ اپنی ایک ڈائری (جس کا ذکر صفحات گزشتہ میں کیا جا چکا ہے) لوگوں کے اس اعتماد کو اپنی قوت اور اثر و رسوخ کی بنیاد سمجھتا تھا۔

ہزارہ دورانِ بغاوت میں

۱۸۵۷ء تا ۱۸۵۸ء

اس مدت کے قابلِ ذکر واقعات میں سے ایک سادات کاغان کا واپس جانا ہے کہ یہ ایڈورڈز کے حکم بحیثیت کمشنر کے ۱۸۵۵ء میں واپس گئے۔ ان ایام میں میجر بیچر ڈپٹی کمشنر تھا۔ ۱۸۵۷ء میں غدر کے شروع ہونے سے کچھ فوج دہلی بھیجی گئی اور مقامی لیوی بھرتی کر کے گزرگاہوں، کشتیوں کے گھاٹ کی نگہبانی اور اندرونی حفاظت کے کام میں لگائی گئی اور بقیہ فوج مری کی پہاڑیوں میں برائے حفاظت مقرر کی گئی۔ ۳۰ جون ۱۸۵۷ء، ہندوستانی فوج ۵۵ کے جو سپاہی مردان سے بھاگ کر ہزارہ میں داخل ہوئے۔ ان کو تمام فوج اور عام لوگوں کے مجمع کے سامنے توپ سے اڑا دیا گیا، جس کی تصدیق اقتباس درج ذیل سے ہوتی ہے۔

اقتباس ۱؎ از اخبار "چشمہ فیض" لاہور "ماہنامہ اردو ڈائجسٹ لاہور" ماہ اکتوبر ۱۹۰۳ء

"۲۲ اگست ۱۸۵۷ء ہزارہ، میجر بیچر صاحب ڈپٹی کمشنر ہزارہ نے تحریر فرماتے ہیں کہ چھٹی تاریخ اگست ۱۸۵۷ء کو اکتالیس سپاہی رجمنٹ ۵۵ سے قلعہ مان سر آئے میں بعد تحقیقات توپ سے اڑا دیے گئے۔"

نوٹ ۱ (کیپٹن جے آر بیچر اکتوبر ۱۸۵۲ء تا ۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء (ساڑھے پانچ سال) ہزارہ کا ڈپٹی کمشنر رہا۔

۲۔ مان سرائے۔ (مانسہرہ مراد ہے۔ عام روایت بھی یہ ہے کہ مان سنگھ سے موسوم ہے۔ شاید مان سنگھ نے سرائے بنائی ہو اور مان سرائے سے مانسہرہ نام بن گیا۔ مولف)

یہ سپاہی مردان سے بھاگ کر سوات سے ہوتے ہوئے کاغان میں داخل ہوئے اور پوربی ناڑ (کاغان میں ان کے نام پر ہی موسوم ہے) میں گرفتار ہوئے اور توپ سے اڑائے گئے تھے۔ ان کی گرفتاری میں سواتی سادات اور گوجر سب کی اعانت شامل تھی۔ ان کو دریائے سندھ پار کرتے ہی گرفتار کرنے یا واپس دھکیل دینے کا کام کالا ڈھاکہ کی اقوام نے کرنل بیچر ڈپٹی کمشنر ہزارہ کے ایماء پر کیا۔ ان ہندوستانی سپاہیوں میں سے نصف کے قریب کاغان سے اس طرف ہزارہ میں گرفتار کئے گئے۔ ان کو توپوں سے اڑا دیا گیا اور ان کی نعشوں کو ایک گڑھے میں پھینک دیا گیا۔ اب ان شہیدوں کی زیارت، ایوب منزل ایبٹ آباد کے بائیں گڑھے میں بالمقابل آبادی جیل موجود ہے۔ لیکن ان شہیدوں کے نام اور کام سے محلے کے لوگ، یعنی ملک پورہ، ایبٹ آباد کے لوگ ناواقف ہیں۔

ان ایام میں مری پر ڈھونڈوں نے حملہ کیا۔ اگرچہ آخری وقت میں سردار حسن علی خان رئیس کرڑال ان سے الگ ہوگیا۔ لیکن راولپنڈی ضلع کے ڈھونڈوں نے حملہ کر دیا اور وہ پسپا ہوئے۔

غدر کے بعد کے واقعات

۱۔ اگرور کی مہمیں، جن کا ذکر کسی دوسری جگہ کیا جائے گا۔

۲۔ گلیات میں موسم گرما کی رہائش کے لئے بنگلے اور چھاؤنیاں ۱۸۷۰ء میں بنائی گئیں۔

۳۔ پہلا مکمل بندوبست ۱۸۷۲ء، ۱۸۸۰ء کو مکمل ہو کر لوگوں کے لئے باعث اطمینان ہوا اور مالیہ نصف پیداوار کے حساب سے لگایا گیا اور یہ ۲۰۸۳۹۴/- روپیہ سے بڑھ کر ۵۰۴۲۲۸/- روپیہ ہوگیا۔

۴۔ حسن ابدال تا ایبٹ آباد کی سڑک ۱۸۹۲ء تا ۱۸۹۴ء پختہ کر دی گئی۔ یہ شاہراہ عام

مغلیہ سلطنت سے پہلے کی ہے۔

۵۔ سڑک وادی کاغان تا چلاس خچروں کی آمدورفت کے لئے ۱۸۹۵ء سے ۱۸۹۹ء تک بنائی گئی۔

۶۔ ۱۹۰۰ء میں ایک سڑک برائے آمدورفت ٹانگہ مانسہرہ سے ہوتی ہوئی گڑھی حبیب اللہ تک بنائی گئی اور ۱۹۰۰ء میں ضلع میں کافی سڑکیں بن جانے سے آمدورفت کی کافی سہولتیں مہیا ہوگئیں۔

۷۔ ۱۹۰۰ء میں اٹک تحصیل ہزارہ کے ساتھ ملادی گئی۔ لیکن ۱۹۰۱ء میں صوبہ سرحد بن جانے سے اٹک تحصیل پھر راولپنڈی کے ساتھ ملادی گئی اور ہزارہ صوبہ سرحد کا حصہ بن گیا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان بنا اور ہزارہ صوبہ سرحد کا حصہ ہی رہا۔

اہل ہزارہ کی معیشت

(از منہ قدیم و حال میں)

اقوام عالم کا جو پہلا دور تاریخ کی روشنی میں آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ابتدار میں منتشر جنگلوں اور پہاڑ کے غاروں میں زندگی بسر کرتے تھے۔ جڑی بوٹی اور شکار پر زندگی کا مدار تھا۔ پھر ایسا وقت آیا کہ ان کو یک جا رہنے کی ضرورت کا احساس ہوا۔ تاکہ وہ اجتماعی طور پر جنگلی درندوں اور جانوروں سے حفاظت کرسکیں۔ محض رہنے کی حالت و ماحول سے جب تہذیبی ترقی پر پہنچنے کی کوشش شروع ہوئی تو درمیانی حسب ذیل مدارج سے یہ راستہ طے ہوا۔

۱۔ کاشت کاری کی ابتدار۔

۲۔ معدنیات کی دریافت اور ان کے استعمال کا علم۔

۳۔ آخری درجہ مندرجہ بالا دونوں وجوہات کی بنار پر شہری زندگی کی ابتدار۔

اقوام ہزارہ میں ان مراتب تہذیب سے گزری ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے قدیم ایام ہی سے مختلف مدارج کو بہت سست روی سے طے کیا اور حقیقت یہ ہے کہ آخری درجہ تہذیب یعنی شہری زندگی تک ان کے سست رو قدم زمانہ حال ہی میں پہنچتے ہیں اور ابھی وہ اس منزل پر پوری طور پر متمکن نہیں ہوئے۔ تاہم یہ قدم پاکستان بن جانے (۱۹۴۷ء) کے بعد تیزی سے اٹھے اور شہری تمدن بھرپور طور پر نافذ العمل ہونے لگا۔ تاریخ کے مختلف ادوار کا

نشان اب بھی ہزارہ میں پایا جاتا ہے۔ مشرقی اور شمالی و غربی علاقہ کے پہاڑی حصوں میں اب بھی چوپانی عام ہے اور بقیہ آبادی زراعت پیشہ۔ چونکہ یہ دونوں پیشے موجودہ زمانہ میں آسائش و آرام کی زندگی کے متحمل نہیں ہو سکتے اس واسطے آبادی کی کثرت کی زندگی کا مدار سرکاری و نجی ملازمت پر رہا ہے۔ اس تنگیٔ معیشت نے اہلِ ہزارہ کو دنیا کے سب گوشوں میں منتشر کر دیا ہے۔ امریکہ اور انگلینڈ تک یہ پہنچ چکے ہیں اور جنوب وسطی ایشیا میں ان کی کافی تعداد ہے۔ چونکہ باشندگان ہزارہ شہری اور متمدن زندگی کے اسباب و ذرائع سے محروم ہیں اور ابھی تک پرانے زمانہ کے آباد شدہ دیہات میں جو شاہراہوں سے دور، پہاڑوں کی چوٹیوں، کھنڈروں کے کناروں یا جنگلوں میں واقع ہیں، اسکونت پذیر ہیں۔ تعلیم و تربیت اور عصری تہذیب کے فوائد سے محروم ہیں۔ اس واسطے بہت ہی پس ماندہ ہیں۔ پاکستان بن جانے کے بعد اہل ہزارہ نے بھی ترقی شروع کی شہروں میں تجارت کی افزونی ہو رہی ہے اور بڑے بڑے کارخانے بھی لگ چکے ہیں۔ سب سے پہلے ہری پور میں ٹیلیفون فیکٹری بہ عہدِ وزارت سردار بہادر خان ترین ساکن ریحانہ وزیر مواصلات پاکستان کی کی خاص کوشش سے بنی۔ جس کا سنگِ بنیاد گورنر جنرل غلام محمد نے اکتوبر ۱۹۵۲ء میں رکھا۔ اب وہ روز بروز ترقی کر رہی ہے۔ پہلے پہل جرمن انجینیروں نے اس میں کام کی ابتدا کی۔ اب پاکستانی خاص کر ہزارہ کے باشندے کافی تعداد میں اس فیکٹری میں کام کر رہے ہیں۔

اس کے بعد ہری پور میں سوات ٹیکسٹائل مل ۱۹۵۴ء میں بنی اور ۱۹۶۲ء میں خیبر ٹیکسٹائل مل بالڈھیر میں بننی شروع ہوئی اور اوائل ۱۹۶۳ء میں سوت بھی تیار کرنا شروع کر دیا۔ یہ فیکٹری بھی سردار بہادر خان کی راہ نمائی اور اثر و رسوخ سے بنی ہے اور ان کے ہی زیرِ اہتمام چل رہی ہے۔

ضلع ہزارہ میں پرانی تہذیبیں اور ان کے باقیات و اثرات

چونکہ یہ پرانی تہذیبیں دنیا کے ہر حصہ کے لوگوں کے اخلاق و اعمال پر اثر انداز ہوتی رہیں لہٰذا ان کے اثرات جو اہلِ ہزارہ پر پڑے۔ ان کی دریافت کے لئے ان تہذیبوں کا مجمل ذکر ضروری ہے۔

شمالی ہندوستان (ضمناً ہزارہ)، از منہ قدیم سے باہر کی اقوام مثلاً مصریوں (شاہ مصر

(OSIRIS) جس سے اسیور کا لفظ مشہور ہوا)، شاہانِ بابل، شام میڈیا، سفید ہن ستھین ایرانی یونانی، عرب، ترک، مغل، پھر ایرانی، افغان اور آخر کار انگریزوں کے حملوں سے تاخت و تاراج ہوتا رہا اور یہ سب اقوام اپنے اثرات کسی نہ کسی رنگ میں چھوڑتی رہیں۔ دنیا کی ان پرانی تہذیبوں میں زیادہ مشہور تین ہی تہذیبیں ہوئی ہیں۔

۱۔ وادی نیل کی تہذیب، یعنی مصری تہذیب۔

۲۔ وادیٔ دجلہ و فرات کی تہذیب یہ شہری تہذیب تھی۔ ان تہذیبوں کے باقیات ہڑپہ (ضلع ساہیوال)، موہنجو ڈارو (لاڑکانہ سندھ) میں ملے ہیں۔ حالانکہ ان دو مرکزوں میں چودہ سو میل کا فاصلہ ہے۔ لہٰذا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں مراکز کے درمیان سلسلہ آمد و رفت اور تجارت عام ہوگی۔

۳۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب اس کا زمانہ ۳۲۵۰ سنہ ق م سے ۲۷۵۰ سنہ ق م تک ہے۔ اس تہذیب کے آثار اگرچہ ابھی تک اس ضلع میں روشنی میں نہیں آئے۔ لیکن یقین غالب ہے کہ دریائے سندھ کے کنارے پر کہیں نہ کہیں مدفون آثار ضرور ہوں گے۔

یہ تہذیب دراوڑ قوم کی تہذیب تھی۔ اس قوم کے آثار شمالی سرحد پر پامیر کی دَرد قوم اور کافرستان کے علاقہ میں پائے جاتے ہیں اور ایک رپورٹ کے مطابق سندھ کوہستان میں دَرد قوم آباد ہے۔

ان مندرجہ بالا تین قدیم تہذیبوں کے بعد مندرجہ ذیل اقوام اس خطۂ عالم پر ظہور پذیر ہوئیں اور اپنے وقت میں اس ضلع میں اپنے اثرات چھوڑتی گئیں۔

۱۔ آریہ تہذیب

ان کا زمانہ ۱۵۰۰ سنہ ق م سے ۲۰۰۰ سنہ ق م تک ہے۔

اب سے کوئی چار ہزار سال پہلے آریہ قوم ہندو کش پہاڑ کو عبور کر کے براستہ کابل، غزنی، قندھار اور کوہ سلیمان، وادی سندھ میں داخل ہوئی۔ اس ضلع میں خاص کر ٹکڑی و نندھیاڑ میں مواضعات کے نام سنسکرت میں ہونے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آریاؤں کا عمل و اثر یہاں رہا ہے۔

(وادی سندھ و پنجاب) دراوڑ قوم کو جو اس خطہ کے مالک تھے، اپنے دخل کر کے قابض ہو گئے اور دراوڑ قوم کو جنگلوں اور پہاڑوں کی طرف دھکیل دیا ہوگا۔ اگر یہ مفروضہ صحیح ہو تو دراوڑ قوم کے افراد ہزارہ کے شمال مشرقی پہاڑوں میں آکر آباد ہو گئے ہوں گے۔

ان کی آمد سے پہلے ہندوستان قبیلوں کی زمین اور بستیوں کا مجموعہ تھی۔

پروفیسر احمد حسن دانی (پشاور یونیورسٹی) کے مطابق آریہ قوم براہ باجوڑ برصغیر پاک و ہند میں ایک ہزار قبل مسیح آئے اور ان کے قبرستان واقع نزد چکدرہ علاقہ دیر میں ہیں۔ ان کے قبرستان کی دریافت سے تاریخ کا ایک خلا پر ہو گیا ہے۔

۲۔ ہندو تہذیب

آریہ قوم ہی اصل میں ہندو قوم کے اجداد ہیں اور انہوں ہی نے اس ملک میں آکر ہندو تہذیب کی بنیاد رکھی۔ یہ قوم ہندوستان میں آباد ہو کر اپنے عروج کو پہنچی اور اس مدت میں نہ کوئی بیرونی حملہ آور آیا اور نہ اندرونِ ملک کے اصلی باشندوں ہی سے جنگ ہوئی۔ چوتھی صدی ق م کے آخر میں موریا سامراج قائم ہوا۔ سلطنت موریہ کے بادشاہ چندر گپت نے کشمیر اور شمالی سرحد پر حکومت کی اور اس کے پوتے اشوک نے مانسہرہ (ضلع ہزارہ) کے ساتھ کی پہاڑی کے دامن میں ایک کتبہ کندہ کرایا تھا۔ جو آج تک موجود ہے۔ یہ کتبہ پرانے شاہراہ پر جو پکھلی کو جاتا تھا ایک پتھر پر کندہ کرایا ہوا ہے۔

اشوک کی موت (۲۳۱ ق م) کے بعد بدھ مت کو زوال شروع ہوا اور ۱۶۵ء ق م میں بدھ سلطنت ہندوؤں کے قبضہ میں چلی گئی۔ موریا سامراج کے دو سو برس بعد شمالی ہند میں کشن سامراج قائم ہوا۔ کشن قبیلے منگول ہندوستانیوں کے لئے بالکل غیر لوگ تھے اور ان کا سامراج ایک دیو تھا، جس کا ایک قدم سندھ اور گنگا اور دوسرا قدم جیحوں و سیحوں کی وادیوں میں تھا۔ کشن خاندان کے سب سے ممتاز بادشاہ کنشک نے ہندوستانی اور وسط ایشیا کی یونانی تہذیبوں کو ملایا اور مذہب کو اتحاد کا ذریعہ بنایا۔ موریا سامراج گنگا کی وادی (مرکز پاٹلی پتر) سے شمال کی طرف اور وسط ہند کی شاہراہ سے مغرب کی طرف پھیلا تھا۔ کشن سامراج پشاور سے جنوب کی

طرف وسط ہند کے پہاڑوں اور جنگلوں تک جا پہنچا۔ گپت سامراج جو ان کے بعد چوتھی صدی عیسوی میں قائم ہوا۔ گنگا کی وادی اور وسط ہند کی تجارتی شاہراہ تک محدود رہا۔ اس زمانہ کی خصوصیت بڑے شہر، ترقی یافتہ صنعت اور بیرونی تجارت کا پھیلاؤ ہے۔ صنعت و تجارت دوسرے پیشوں پر غالب آ گئیں۔ اگرچہ قوم کا کوئی تصور تو نہیں تھا لیکن کالی داس اور بھرتری ہری کے نظموں سے یقین ہوتا ہے کہ ملک کا تصور قائم ہو رہا تھا۔

اس کے بعد راجپوت دور ہے جس نے ہندوستان کو وادیوں اور شاہراہوں کی قید سے نکالا۔ ہندوستان کے مغربی حصے میں ایسے قبیلے جو پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں ملک کے اندر گھس آئے تھے اور مشرقی حصے میں پرانے نیم مہذب قبیلے جو موقع کے انتظار میں بیٹھے تھے سیاسی میدان میں اتر آئے۔ یہ لوگ دیہاتی زندگی کے عادی تھے۔ انہوں نے شہر آباد نہیں کئے لیکن جنگل اور آبادی کی جو حدیں قائم ہو گئی تھیں، ان کو انہوں نے توڑ دیا۔ اصول اور قواعد کے مطابق ان کی سلطنتیں محفوظ و محدود نہ تھیں۔ انہوں نے سارے ہندوستان کو ایک دیہات، ایک زمینداری کی شکل دے دی۔

راجپوت دور، وہ زمانہ بھی ہے جب جنوبی ہندوستان اور دکن کے حوصلہ مند بادشاہ شمال پر حملے کرنے لگے اور شمال اور جنوب کے درمیان جو بیگانگی کی دیوار تھی وہ گرا دی گئی۔ اس طرح گپت سامراج کے تباہ ہونے سے تہذیب اور تمدن کو جو نقصان ہوا تھا وہ ملک کے تصور کو وسعت دے کر پورا کیا گیا۔ نشو و نما کے اس سلسلہ کی تکمیل مسلمانوں کے ہاتھوں ہوئی۔ ہندوستان کا لفظ وہ اپنے ساتھ لائے اور یہ اس ملک کا پہلا اور سب سے مستند نام ہے۔

ہندوستان کی آبادی کو ذات اور فرائض کی تقسیم کی دلدل سے گوتم بدھ نے نکالا لیکن اشوک کے مرنے کے بعد بدھ مت نے اپنی حیثیت کھو دی۔ کشن سلطنت نے نئی نسلوں کے لئے ہندوستان کا دروازہ کھول دیا اور اس کے بعد سے بیرونی نسلیں ہندوستان کے اندر آئیں اور آباد ہوتی رہیں۔ پنجاب، سندھ اور راجپوتانہ گپت سلطنت میں شامل نہ تھے۔ گپت سلطنت کی تباہی کے بعد ایک نئی نسل جو کشتری کہلائی، تاریخ کے اس عہد میں نمودار ہوئی اور اس کا حاکم طبقہ راجپوت تھا۔ راجپوتوں کو بدھ متی عقائد سے عداوت تھی، جب مسلمان یہاں آئے تو ہندوستان کے نام کی

طرح سیاسی اتحاد کا ارادہ بھی ساتھ لائے۔ محمود غزنوی کے بعد غزنی کی ریاست سلجوقیوں اور غز ترکوں کے سیلاب میں ڈوب چکی تھی۔ محمد غوری بھی اسی سیلاب کو روکنے کی کوشش میں لگا رہا اور اسی سے بچنے کے لئے ہندوستان کو ایک جائے پناہ بنانے کی فکر کی۔ اس کے مرنے کے بیس برس بعد تاتار خوارزم خراسان اور ایران پر وہ ٹوٹ پڑے اور ۱۲۲۲ء سے کچھ اوپر اسی برس تک افغانستان اور ماوراء النہر کے تاتار حاکم اسی طرح گھات میں بیٹھے رہتے تھے کہ ہندوستان والوں کی ذرا سی غفلت کرنے پر غضب ہو جاتا تھا۔ یہی مستقل خطرہ تھا، جس کی بدولت ہندوستانی ترکوں کی سیاسی اہلیتیں ابھریں اور ان کی سلطنت ایک مکمل سیاسی ادارہ بنی۔ ریاست کی سرحدیں محفوظ ہو گئیں۔ آٹھویں اور نویں صدی میں بدھ مت ہندوستان سے غائب ہو گیا۔

۳۔ ایرانی سلطنت کا غلبہ

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وادئ سندھ پر ایرانیوں کی سلطنت ۵۰۰ ق م میں قائم ہوئی جبکہ جین مت اور بدھ مت اس علاقہ میں امن و امان سے ترقی کر رہے تھے۔ سائرس (قرآن مجید کا ذوالقرنین) شاہِ ایران نے بلوچستان اور افغانستان پر قبضہ کر لیا اور دارائے اول نے گندھارا (ضلع پشاور اور راولپنڈی) پر قبضہ کر لیا۔ ایرانی سلطنت کا دور دو سو سال رہا۔
سکندرِ اعظم کی وفات (۳۲۳ ق م) کے بعد یہ علاقے پھر خود مختار ہو گئے۔
پروفیسر احمد حسن دانی کی تحقیق سے اخمینی تہذیب کے نقوش ڈیرہ بمقام بلم ہٹ ملے جہاں ایک آتشکدہ بھی دریافت ہوا۔

۴۔ یونانی دور

ایرانی سلطنت سے ہندو بادشاہوں نے اپنی حکومت واپس لے لی تھی۔ جب سکندرِ اعظم ۳۲۶ ق م ایرانی شاہنشاہیت کو شکست دے کر افغانستان اور گندھارا کو (جس کا دارالخلافہ پشکلاوتی حال چارسدہ تھا) فتح کرتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوا تو ٹیکسلا (جو بدھ مت کا علمی سنٹر تھا) کے حکمران نے جو راجہ پورس حکمرانِ جہلم سے تنگ تھا، سکندرِ اعظم سے اتحاد کر کے اس کو

راجہ پورس پر حملہ کرنے کے لئے بلایا۔ پورس کو شکست ہوئی۔

یہاں یہ حقیقت بیان کر دینی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ تاریخ ہند و پاکستان کی ابتداء عام طور پر سکندرِ اعظم کے حملہ سے کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سکندرِ اعظم کے ساتھ بہترین دل و دماغ کے لوگ آئے تھے، انہوں نے اپنے سفر کے حالات لکھے۔ ان علاقوں کے نقشے کھینچے جہاں سے ان کا گزر ہوا تھا۔ مختلف آبادیوں کے افکار سے اپنی تصانیف کو مزین کیا۔

ضمناً سکندرِ اعظم کے حملوں کی چند تاریخیں تحریر کی جاتی ہیں:

افغانستان سے روانگی جون ۳۲۷ سنہ ق م۔

اساکینوں (باجوڑ) سے مقابلہ، مقابلہ ۳۲۷ سنہ ق م۔

مہابن (دارنوس)، کا محاصرہ نومبر ۳۲۷ سنہ ق م۔

مہابن کی فتح دسمبر ۳۲۷ سنہ ق م۔

ہند میں آمد جنوری ۳۲۶ سنہ ق م

ایرانی و یونانی اثرات

ایرانی و یونانی اثرات کے متعلق رہنمائے ٹیکسلا، از سر جان مارشل نے جو مفصل حالات لکھے ہیں، سے چند اقتباسات تحریر کئے جاتے ہیں، تاکہ ضلع ہزارہ، جو اس خطہ ہی میں واقع ہے، ان حکومتوں کے عہد کے اثرات کا اندازہ ہو سکے۔ اس سے تاریخ کے ایک عظیم اور پرانے دور پر روشنی پڑتی ہے۔

ٹیکسلا ــــ تاریخی واقعات

شہر کا اصلی نام ٹکر سلا یا ٹکھ شلا (سنسکرت ٹکشہ شلا) یعنی ترشے ہوئے پتھر ا ہے جس کو یونانی اور رومی مصنفوں نے ٹیکسلا لکھا ہے۔ شہر کی بنیاد نہایت قدیم زمانے میں رکھی گئی تھی۔ مہابھارت میں راجہ جنمے جیا کی مشہور سانپ کی قربانی کے حال میں ٹیکسلا کا ذکر آتا ہے۔ بندوسارا کی وفات کے بعد اس کا لڑکا اشوک جانشین ہوا۔ یہ اپنے زمانہ ولیعہدی میں ٹکسلہ کا گورنر رہا تھا۔ اس جگہ کی گورنری عموماً شہزادوں ہی کو دی جاتی تھی، تاکہ اس جگہ افغانستان اور پنجاب کے علاقوں پر مرکزی حکومت کا رعب قائم رہے۔ ٹکسلا کی گورنری کے بعد اشوک، اجین (ملک مالوہ) کا گورنر

ہوا۔ اس نے اپنے زمانہ بادشاہت میں عام شاہراہوں پر بڑے بڑے پتھروں پر احکامات نقش کرائے تھے۔ اس قسم کے احکامات بریٹی پہاڑ نزد مانسہرہ شہر جو زمانہ قدیم کی کشمیری شاہراہ پر واقع تھا پر کندہ کروائے۔ ہزارہ میں بدھ مت اشوک ہی کے عہد میں پھیلا۔ اس کا عہد حکومت ۲۷۳ ؁ قبل مسیح سے ۲۳۲ ق م تک رہا۔

اس کے بعد پانچویں صدی کے آغاز کے قریب ٹیکسلا کا صوبہ غالباً ایران کی اخمینی سلطنت میں شامل کیا گیا۔ کیونکہ دارا کے جو کتبے پرسی پولس (قدیم ایران کا شہر) کے آثار پر اور نقشِ رستم میں دارا کی قبر پر کندہ ہیں۔ ان میں ایک نئے ہندی صوبہ کا ذکر ملتا ہے۔ جس کو سلطنت کے تمام صوبوں سے زیادہ آباد اور زرخیز کہا گیا ہے۔ یہ صوبہ ایریہ ''ارکوسیہ اور گندار یہ سے بالکل جدا اور مختلف ہے۔ جس سے خیال ہوتا ہے کہ اغلباً پنجاب کے اس علاقے کا اکثر حصہ جو دریائے اٹک کے مشرق میں واقع ہے (جس میں ہزارہ بھی شامل ہے ش ب) اور نیز تمام ملک سندھ اس صوبے میں شامل تھا۔

سکندر اعظم پنجاب میں ۳۲۶ ؁ ق م کے موسم بہار میں داخل ہوا۔ اس وقت سلطنت ٹیکسلا بہت آباد تھی۔ اس کی حدود ایک طرف اٹک اور دوسری طرف دریائے جہلم سے ٹکراتی تھی۔ راجہ امبھی والئی ٹیکسلا جو راجہ پورس والئی علاقہ جنوب جہلم (جو زبردست راجہ تھا) سے برسرپیکار تھا۔ اس نے سکندر کے پاس اپنا وفد بمقام اوند (ہنڈ) بھیجا۔ سکندر کے ٹیکسلا آنے پر اس کی بہت خاطر کی اور اپنی فوج حملہ کے وقت امداد کے لئے دی۔ سکندر نے مفتوحہ علاقہ سے راجہ ٹیکسلا کو انعام دیا اور راجہ پورس سے صلح کرا دی۔ سکندر نے مختلف قلعوں میں قلعہ گیر فوجیں متعین کر کے جا بجا یونانی آبادیاں بھی قائم کیں۔ لیکن اس کی وفات کو جو ۳۲۳ ؁ ق م میں ہوئی۔ چھ سال بھی نہ گزرے تھے کہ یونانی حکومت الٹ گئی اور چندر گپت نے یونانی افواج کو دریائے اٹک کے پار بھگا کر ٹیکسلا اور پنجاب کی دیگر ریاستوں کو سلطنت مگدھ میں شامل کر لیا۔ اشوک کے بعد جو علاقے دارالخلافہ پٹنہ سے دور تھے وہ سب خود مختار ہو گئے اور اسی طرح ٹیکسلا بھی خود مختار ہو گیا اور پھر باختری یونانیوں کے حملہ کا شکار ہوئے۔ یہ باختری یونانی حملہ آور ان یونانیوں تھے۔ جن کو سکندر اعظم نے باختر میں آباد کیا تھا۔ مگر ان کی حالت پنجاب کی نو آبادیوں سے مختلف تھی۔ کیونکہ نو آبادی کے قیام سے اس حملہ

کے وقت تک یہ لوگ میدانِ ترقی میں برابر سرگرم رہے تھے۔ اس طرح گو سکندر کے ملک پنجاب کو فتح کرنے سے ہندوستان پر کوئی مستقل اثر نہیں پڑا۔ لیکن پنجاب کے آس پاس کے ممالک کی تسخیر شمال مغربی ہند میں یونانی تہذیب و تمدن کے قیام و ثبات کی بالواسطہ ذمہ دار ہوئی۔ باختری حملہ آوروں نے سب سے پہلے انٹی اوکس کے داماد ڈیمیٹریس (DEMETRIUS) نے ۱۹۰ ق م کے قریب وادیٔ کابل، پنجاب اور سندھ کے علاقے فتح کر لئے اور اس کے بیس سال بعد یوکرے ٹائیڈیز (EUCRATIDES) نے ڈیمیٹریس سے باختر اور پھر تمام ہندوستانی مقبوضات چھین لئے جن میں ٹیکسلا بھی شامل تھا۔ یونانیوں کی حکومت ٹیکسلا میں ایک صدی سے کچھ ہی زیادہ رہی ہوگی کہ مغرب سے وحشی حملہ آوروں کے ایک ہی ریلے نے ان کو بھی صاف کر دیا۔ یہ وحشی جو ہندوستان میں شاکا کے نام سے مشہور ہوئے اصل میں تورانی تھے۔ مگر ایک زمانے سے سلطنت پارتھیا کے صوبہ سیستان میں بود و باش رکھتے اور وہاں کے پارتھیائی آبادی میں بے تکلف ملتے جلتے اور ان میں شادیاں کرتے تھے۔

سیستان سے نکل کر انھوں نے پہلے ارکوسیہ اور گرد و نواح کے ممالک پر قبضہ کیا اور اس کے بعد دریائے اٹک کو عبور کر کے پنجاب کی جانب بڑھے۔ ٹیکسلا کو فتح کیا۔ ارکوسیہ میں ان کا اقتدار ۹۵ ق م میں ہوا اور دس یا پندرہ برس بعد وہ ٹیکسلا پہنچے۔ ملک میں حسبِ طریق قدیم مروجہ پنجاب جابجا مرزبان یا صوبہ دار مقرر کئے۔ ٹیکسلا اور متھرا میں جو حاکم ان کے نائب تھے وہ بھی شاکا قوم کے تھے۔ اور قریبی رشتہ داریوں کی وجہ سے آپس میں ان کے گہرے تعلقات تھے۔

ایزز (AZES) دوم کی وفات کے بعد پارتھیائی بادشاہ گونڈوفرنیز (GONDOPHARNES) نے ٹیکسلا اور آرکوسیہ کی سلطنتوں کو متحد کر کے اپنے زیرنگیں کر لیا۔ یہ بادشاہ نہایت باوقعت اور زبردست حکمران گزرا ہے، اس کی شہرت کا غلغلہ یورپ تک جا پہنچا تھا۔ قدیم عیسائی تصنیفات میں مذکور ہے کہ اس کے دربار میں طامس حواری (ST. THOMAS) کو بھیجا گیا تھا اس کے بعد گونڈوفرنیز وادیٔ کابل کو ملحق کرنے کی متوجہ ہوا۔ اس خطے میں ایک چھوٹی سی یونانی ریاست تھی، اس کا قلع قمع کیا اور اس کا آخری بادشاہ ہرمیوس (HERMAEUS) کو وہاں سے بھگا دیا۔ لیکن گونڈوفرنیز کے مرنے کے بعد اس کی سلطنت کے ٹکڑے ہو گئے۔

کہتے ہیں کہ اپولونیس ساکن تیانہ (APPOLOIUS OF TYANA) غالباً ۴۴ء میں ٹیکسلا میں آیا تھا۔ یہ عہد ہندی پارتھیائی حکومت کا تھا۔ شاہ ٹیکسلا خود مختار تھا یعنی کابل کے پارتھیائی بادشاہ ورڈنیز (VARDANES) کے ماتحت نہ تھا اور صوبہ قندھار بھی شاہ ٹیکسلا کے ماتحت تھا۔

ہندی پارتھیائی سلطنت کے زوال نے ہرمائنس کے لئے اپنی کھوئی سلطنت کو دوبارہ حاصل کرنے کا موقع دے دیا۔ اس نے اہلِ کشان کے طاقتور سردار کجولا کڈ فائزیز (KAJLA KED PHISES) کے ساتھ اتحاد کر کے کابل، قندھار اور ٹیکسلا کو فتح کر لیا۔ قریباً ۵۰ء یا ۶۰ء میں دوسری صدی عیسوی میں شاہ کنشک سریر آرائے سلطنت ہوا۔ یہ بادشاہ نہایت زبردست اور باعظمت گزرا ہے اور اہلِ کشان میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔ کنشک نے اپنا سرمائی دارالسلطنت پرش پور یعنی موجودہ پشاور مقرر کیا اور اپنی سلطنت کو اس قدر وسعت دی کہ وسطِ الیشیا سے حدودِ بنگالہ تک تمام ملک زیرِ نگیں کر لیا۔

اس کے پوتے واسودیو کی وفات جو غالباً تیسری صدی عیسوی کے پہلے نصف حصے میں واقع ہوئی کے بعد بتدریج اہلِ کشان کی طاقت کا زوال شروع ہو گیا۔ اگرچہ کچھ عرصہ کے لئے وہ پنجاب میں پھر سنبھل گئے لیکن یہ سنبھالا بھی صرف پانچویں صدی عیسوی تک رہا۔ جب کہ آفتائیلیوں (EPHTHALITES) یعنی سفید اہل ہن (WHITE HANS) کے ایک زبردست حملے نے ان کو بالکل صاف کر دیا۔

(نوٹ): سلطنت کشان کا زوال غالباً کسی ساسانی حملے کی وجہ سے جلد مکمل ہوا۔ جس کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا۔ ٹیکسلا میں بہت سے ساسانی سکے کھدائی سے برآمد ہوئے ہیں۔)

چینی سیاح فاہیان نے ۴۰۰ء میں ٹیکسلا آکر بدھ مذہب کے مقدس مقامات کی زیارت کی جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی آمد و رفت کے وقت شمال مغربی ہندوستان میں بدھ مذہب کی بڑی بڑی مشہور زیارت گاہیں نسبتاً آباد اور آسودہ حال تھیں ...... اور ان عمارات کی موجودہ حالت سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس بے دردی اور بے جگری سے تباہ و برباد کی گئی ہوں گی۔ اس کے ذمہ دار یقیناً وحشیوں کے وہ گروہ تھے جو سفید ہن کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ ۴۵۵ء میں آئے اور سلطنت کشان کو اپنے قبضہ و تصرف میں لانے کے بعد خاندانِ گپتا کی

عظیم الشان سلطنت کا شیرازہ بھی بکھیر دیا۔

اس صدمہ عظیم کے بعد ٹیکسلا پھر کبھی نہ پنپ سکا اور جب ہیوان چوانگ سانگ ساتویں صدی عیسوی میں یہاں آیا تو اس نے دیکھا کہ ٹیکسلا سلطنت کشمیر کا صوبہ بن چکا ہے مقامی حکام آپس میں برسرِ پیکار رہتے ہیں اور بہت سی عبادت گاہیں تباہ و برباد ہو چکی ہیں۔

ٹیکسلا کے متعلق مشہور تاریخی واقعات

۵۵۸ - ۵۲۹ قبل مسیح سائرس (CYRUS) یا گورش بانیِ اخمینی سلطنت ایران۔
۵۶۳ - ۵۶۲ ق م شاکی مُنی گوتم بدھ کی ولادت —— ۵۲۷ یا ۴۶۷ ق م مہابیر بانیٔ جین مذہب کی وفات —— ۵۲۱ - ۴۸۵ ق م دارائے گشتاسپ شاہ ایران۔ ٹیکسلا اور شمال مغربی ہند کا ایرانی سلطنت سے الحاق —— ۴۸۸ ق م، بدھ کی وفات یا نروان ۳۱۷ ق م خاندان موریا کی بناء —— ۳۱۲ ق م یکم اکتوبر سن سلجوقی کی ابتداء —— ۲۷۳ ق م اشوک کی تخت نشینی —— ۲۵۰ ق م باختر اور پارتھیا کا اعلان خود مختاری —— ۳۱۹ ق م گپتا خاندان کے بانی چندر گپت اول کی تاجپوشی، سن گپتا کا اجراء —— ۲۲۶ ق م اور شیر بابکاں کا ایران کے ساسانی خاندان کی بناء ڈالنا۔
۵۲۰ قبل مسیح میں چینی سیاح چنگ یوں کی آمد —— ۶۲۹ - ۶۳۵ء ہندوستان میں چینی سیاح چنگ یوں کی آمد۔

بیرونی حملہ اور شاہانِ باختر (بلخ)

ان کے حملے ۱۳۵ ق م سے شروع ہوئے اور گندھارا مع ٹیکسلا ان کے زیرِ نگین ہوا۔ ان کی حکومت دو سو سال رہی۔ اس سلسلہ کا نامور حاکم جو پنجاب و کابل کا حکمران ہوا مینانڈر تھا۔

ستھین دور۔ قریب ۱۳۵ ق م | ستھین یعنی ساکا قوم نے چینیوں کے دباؤ سے مغرب کی طرف کوچ کیا اور باختر کو فتح کر لیا اور پھر کابل اور بلوچستان بھی یونانیوں سے فتح کر لیا۔ انہی کے ساتھ پارتھین (پہلوا) سیستان اور قندھار سے

آئے لیکن باختری یونانی گندھارا اور ٹیکسلا پر ۲۵ ق م تک قابض رہے۔

کشن دور ۱۶۵ قبل مسیح سے پہلی صدی عیسوی کے نصف تک اس قوم کے حملے سرحد پر شروع ہوتے اور یاونا (YAVANA)، ساکا نے پہلوی حکمرانوں پر غلبہ حاصل کر لیا۔ ۹۷ ق م یہ ٹیکسلا پر حکمران ہو گئے۔ اس اثنار میں ساکا اور پہلواز زیر سایہ کشن حکومت زیرین سندھ پر حکومت کرتے رہے۔ ساکا حکمرانوں مثلاً مینز (MANES) اور آزی لوس (AZILIOES) کے سکے عام طور پر ٹیکسلا اور گندھارا سے ملتے رہتے ہیں۔ کشن بادشاہان میں سے تیسرے حکمران کنشک کی حکومت شمال مغربی ہندوستان اور کشمیر پر حاوی تھی اور پشاور اس کا دارالسلطنت تھا۔ اس خاندان کی حکومت سو سال تک رہی۔ اس خاندان کے خاتمہ کے بعد دو سو سال تاریخ ہند کے اوراق تاریکی میں ہیں۔ اس دوران سقین وغیرہ (تاتاری) کے دوسرے قبیلے اس طرف آتے رہے۔ کنشک کے بعد وسط ایشیا کو ایک مضبوط قوم "سفید ہن" نمودار ہوئی۔ ان ہنوں نے گندھارا پر قبضہ کرنے کے بعد گپتا خاندان کی قیادت ختم کر دی۔ لیکن یہ حکومت دیرپا ثابت نہ ہو سکی۔ بعض مؤرخین کے خیال میں جاٹ اور راجپوت ان تاتاریوں کی اولاد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہن کی آمد کے بعد اندازہ کے مطابق ۶۵۰ء سے ۱۰۰۰ء تک پھر کسی بیرونی حملہ کا پتہ نہیں چلتا۔

ہندو شاہیہ

دسویں صدی عیسوی میں ہندو شاہیہ گندھارا (صوبہ سرحد سے نکل کر سوات اور لغمان افغانستان تک) کی حکومت تھی۔ راجہ جے پال اس خاندان کا بادشاہ تھا۔ اس خاندان کا پایۂ تخت لاہور تحصیل صوابی، ضلع مردان تھا، نہ کہ پنجاب کا لاہور۔

انند پال اور محمود غزنوی کی جنگ میدانِ پشاور میں ہوئی، جبکہ وہ بھاگ کر کشمیر چلا گیا۔ اسی لاہور تحصیل صوابی میں محمود غزنوی نے راجہ جے پال کو گرفتار کیا تھا۔ جے پال نے شکست کے بعد ہنڈ کی بجائے نندانہ (جو تحصیل پنڈ دادن خان میں چوہا سیدن شاہ سے ۱۴ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس جگہ اب بھی آثارِ قدیمہ موجود ہیں) کو ۱۰۰۲ء کے بعد پایۂ تخت بنایا۔

مسلمانوں کے حملوں کا آغاز

دسویں صدی عیسوی تک شمالی ہندوستان ہندو راجگان کے زیرِ نگین رہا۔ اس صدی میں ترکوں کے حملے وسطِ ایشیا اور افغانستان سے ہندوستان پر شروع ہوئے۔ اس وقت کابل کشمیر اور ملتان کا راجہ جے پال تھا۔ اس کے زمانہ میں غزنی کی مسلمان سلطنت اٹھ رہی تھی۔ راجہ جے پال نے اس سلطنت کو ابتداء ہی سے مٹا دینے کے منصوبے باندھے اور حملہ کر دیا، لیکن شکست کھائی اسی راجہ نے ۹۷۹ء میں دوسرا حملہ کر دیا لیکن صلح ہو گئی۔ ہندوستان پر سبکتگین اور محمود غزنوی کے حملوں کی ابتداء ان دو جنگوں سے ہوئی جو جے پال نے حملے کر کے شروع کی تھیں۔ ہزارہ میں موجودہ افغان قوموں کے اجداد محمود غزنوی کے ہمراہ تھے۔ گویا اس عہد میں پٹھانوں کا خروج سرحد ہزارہ و ہندوستان کی طرف ہوا۔

نوٹ: وادی ٹوچی میں بمقام عیدک اور سپین وام تین پتھروں پر سنسکرت، باختری، عربی میں یہ تحریر کندہ ہے۔

"۸۵۶، ۸۵۷ء میں یہاں حیی بن حامر کا مکمل تسلط تھا۔۔۔۔ قابض بھی رہے"۔

اس سے معلوم ہوا شمالی ہند پر عربوں کا حملہ سب سے پہلے ہو چکا تھا اور وہ سرحدی علاقوں پر قابض بھی رہے"۔)

درانیوں (افغانوں) کی آمد سے پہلے اس خطہ (ہزارہ) کی صحیح تاریخ تاریکی میں ہے۔ اگرچہ اس خطہ کا نام آئینِ اکبری میں ہے اور فرشتہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ میدانِ ہزارہ (حال علاقہ ہری پور) حاکم اٹک کے ماتحت تھا جبکہ اس ضلع کے دوسرے حصوں پر گکھڑوں کی حکومت تھی۔ جنہوں نے ضلع راولپنڈی و جہلم کی تاریخ میں اپنا نام روشن کیا ہے اور ان کی سلطنت کا اصلی مرکز اور حکومت کا دارالخلافہ بھی وہیں تھا۔ جب مغلیہ سلطنت میں ضعف آ گیا (گکھڑ مغلوں کے حلیف اور مستقل بازو تھے) تو دریائے سندھ سے پار افغان قوموں کے حملے شدت اختیار کر گئے اور ان کے لئے ہزارہ ایک آسان شکار بن گیا۔ خاص ایسے وقت میں جبکہ گکھڑوں کی حکومت بھی کمزور ہو گئی تھی اور پرانی قومیں گوجر، کرڑال اور ڈھونڈ بھی اپنی طاقت کھو چکی تھیں۔

ہزارہ کے بندوبست

(نقل از قوم گکھڑ کے حالات وغیرہ مندرجہ بندوبست ۱۸۶۶-۷۲ء)

ابتدائی عملداری سرکار انگریزی میں بھی ۱۸۴۹ء میں سے بندوبست سرسری اول تین سالہ بندوبست دوم پنج سالا بلا دریافت حقوق ملکیت اس علاقہ کے دیہات کا علی العموم بنام اقوام متفرق قابضان ملکیت کل علاقہ بندوبست قانونی پر ہوتا رہا اور گو کہ میعاد بندوبست سرسری دوم کی ۱۹۱۳ بکرمی مطابق ۱۸۵۶ء گزر چکی تھی۔ مگر ۱۸۶۱ء تک بندوبست قانونی شروع نہ ہوا۔ کچھ تحقیقات وغیرہ معمولی بطور سرسری کے بہ تیاری شجرہ ہائے انساب وغیرہ ہوتی رہی۔ ۱۸۶۲ء میں بندوبست قانونی ماتحت حکام ضلع بہ عہد میجر آدمس صاحب جاری ہوا اور تحقیقات حقوق اس علاقہ کی بطور کلیات شروع ہوئی اور ایک مسل بہ تحریر اظہارات معتبران قوم گکھڑ یعنی راجگان وغیرہ اور اسی طرح نمبرداران اقوام متفرق معتبران و قابضان علاقہ میرے (اعظم بیگ) محکمہ میں مرتب ہوئے۔ اسناد ضروری بھی جس کے پاس جو تھیں وہ شامل اس کے کرائی گئیں اور وہ مسل زیر دستخط میجر آدمس صاحب (ADAMS)، کے بمقام بھلڑ بہ حاضری تمام متعلقین مقدمہ بعد سماعت تمام اظہارات و ملاحظہ اسناد و گفتگو ہائے زبانی ہر ایک فریق کے جلسہ عام میں تصدیق ہوئے۔ صاحب بہادر نے بموجب خیال اس وقت کے چٹھی انگریزی میں کچھ تجویز قائم کرنے۔ حقوق اس قوم گکھڑ کی تجویز اپنے صدر میں پیش کی۔ وہ واسطے دریافت بعض امور اور بہ لحاظ بعض حالات کے واپس آئی اور بہ سبب تغیر و تبدل اور کم فرصتی حکام ضلع کے امورات سرحدی سے بندوبست قانونی پورا نہ چلا اور اس تجویز پر ملتوی ہو گیا کہ صاحب مہتمم بندوبست علیحدہ مقرر ہو کر اس کو انجام دیں۔ تا ۱۸۶۸ء میں محکمہ بندوبست بہ تشریف آوری کپتان ویس صاحب مہتمم بندوبست کے قائم ہوا۔ اب مارچ ۱۸۷۰ء میں قواعد بندوبست تحقیقات و تشخیص حقوق ہر قسم کے حقداران اراضی کے سرکار تجویز ہو کر آئے۔

سب سے پہلا سرسری بندوبست سکھ دربار کے حکم سے میجر ایبٹ نے ۱۸۴۷ء میں کیا۔ اس بندوبست کی نظر ثانی ۱۸۵۲ء میں کی گئی۔ بموجب کاغذات سنٹرل گورنمنٹ آف انڈیا

خط مورخہ ۲۶ اپریل ۱۸۵۰ء یہ بندوبست ۱۸۵۰ء میں نیول چیمبرلین کے زیر نگرانی ہوا تھا۔ کیونکہ اس خط میں یہ تحریر ہے کہ موضع دو بندی جو رتن چند منشی سرکار سکھاں کی جاگیر ایک ہزار روپیہ کی تھی، ضبط کی جائے اور اس گاؤں سے مالیہ کنکوت پر نہ لیا جائے، بلکہ حسب ضابطہ پیمائش سے مقرر کیا جائے۔

پہلا قاعدہ بندوبست برطانوی عہد میں ۱۸۷۲ء، ۱۸۷۳ء میں ہوا جو کپتان ویس صاحب نے ۱۸۶۸ء میں شروع کیا اور ۱۸۷۴ء میں مکمل ہوا۔ دوسرا بندوبست ۱۹۰۱ء شروع ہو کر ۱۹۰۴ء میں ختم ہوا۔ اس کے بعد اور بندوبست ہوئے جن کا حال کسی اور جگہ درج ہے۔

پاکستان بن جانے کے بعد

ہزارہ کا ترمیمی بندوبست مارچ ۱۹۴۹ء میں کیا گیا۔ کل مالیہ ۵۵۳۰۳۰/- روپیہ مقرر کیا گیا۔ جبکہ اس سے پہلے مالیہ ۴۴۵۸۴۰/- روپیہ تھا۔

بالائی تناول (جاگیر نواب صاحب امب) کا علاقہ ۱۹۵۰ء میں باضابطہ ضلع سے مدغم کر دیا گیا۔ اور اس کا پہلا بندوبست ۵۲-۱۹۵۱ء میں ختم ہوا۔ کل مالیہ ۴۱۶۵۵/- روپیہ مقرر ہوا۔ اتمان زئی، امازئی، مجہ گدون علاقہ کا پہلا بندوبست ۶۲-۱۹۶۰ء میں ہوا۔ ان علاقوں کا کل مالیہ ۳۷۰۰۰/- روپیہ اور دیگر محاصلات ۶۶۴۵/- روپیہ اور چندرات کا ۱۰۶۴/- روپیہ مقرر ہوا جو خریف ۱۹۶۲ء سے وصول کرنا شروع کیا گیا۔

بندوبست ہزارہ ۱۸۷۲ء

چند حقائق ماخوذ از تاریخ ہزارہ۔ مرتبہ ویس مہتمم بندوبست

۱۔ تعداد دیہات تحصیل ہری پور ۳۱۰، ایبٹ آباد ۲۵۸، مانسہرہ ۲۱۸۔ کل میزان ۷۸۶

۲۔ بڑا شہر ہزارہ میں ہری پور ہے جو سردار ہری سنگھ نے ۱۸۸۰ بکرمی ۱۸۲۳ء خاص میدان ہزارہ میں آباد کیا۔ سکھوں کے اور ابتدائی عہد انگریزی میں بھی یہی قصبہ ہزارہ کا صدر مقام رہا۔ ۱۸۵۳ء میں دھمتوڑ کے علاقہ میں صدر مقام مقرر ہوا۔ بعد میں موجودہ جگہ پر جو میجر ایبٹ کے

پر مشہور ہے ایبٹ آباد آباد ہوا۔

۳۔ تعداد پٹواریاں، مسلمان ۔۵۵، ہندو ۔۳۶، سکھ ۔۱۰ کل ۔ ۱۰۱

۴۔ نتھیا گلی اور مری کے پہاڑوں میں سڑکیں ۱۸۵۷ء کے بعد بنائی گئیں۔ جب قوم ڈھونڈ نے ۱۸۵۷ء میں مری میں شورش کی اور خانس پور میں گورہ فوج کی چھاؤنی بنا دی گئی۔

۵۔ علاقہ کاغان کی بولی بہت شیریں ہے۔ باشندگانِ علاقہ اپنی شیریں گفتاری سے مثل پکا راگ، سننے والے کو مسحور کر دیتے ہیں۔ مگر سننے والا ان کی بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا۔

۶۔ دریائے سندھ میں دو دفعہ سخت طغیانی آئی۔ ۱۔ ۲۱ر ماہ جیٹھ ۱۸۹۸ بکرمی مطابق ۱۴ر جون ۱۸۴۱ء، ۲۔ ۱۲ر ماہ بھادوں ۱۹۱۴ بکرمی مطابق ۲۶ر اگست ۱۸۵۷ء

۷۔ کٹھ رنگیلا، ہری پور۔ ایک ہندو ساکن درویش کا بنایا ہوا ہے۔

۸۔ کٹھ جاگل۔ جاگل نجیب اللہ خان ترین کے حصہ میں تھا۔ اس نے اپنے خرچ سے کٹھ کلاں رنگیلا سے جس قدر زائد پانی فالتو ہو کر گرے وہ کٹھ جاگل میں جاتا تھا۔

۹۔ ذکر جھیل ہائے۔ سیف الملوک سَر، لولو سَر، بال سَر تینوں کاغان میں ہیں۔

۱۰۔ پہاڑوں کی چوٹیاں اور ان کی بلندی، موسیٰ کا مصلیٰ کاغان ۱۳۳۷۸۔ بھلیچہ (کالا ڈھاکہ) ۹۶۴۴۔ سر بن (ایبٹ آباد) ۴۲۲۳۔ میاں جانی دی چوکی (جنوب مشرق ایبٹ آباد) ۹۷۹۲۔ موج پوری (جنوب مشرق ایبٹ آباد) ۹۲۳۲۔ پیر تھان (گندگر) ۴۴۱۹۔

۱۱۔ سڑک ہائے۔ ۱۔ پہلے زمانہ میں کوئی خاص سڑک اس ضلع میں نہ تھی۔ حاکمانِ وقت سیر کے لئے ہندوستان سے کشمیر یا کابل سے کشمیر کو جاتے ہوئے اس ضلع سے گزرتے تھے تو کوئی پختہ سڑک نہ تھی۔ راستہ حسب ذیل تھا۔

کشمیر سے پشاور: کشمیر سے بارہ مولا، اوڑی، مظفر آباد، بیرن گلی، نواں شہر، دھمتوڑ، سرائے صالح۔

دوسرا راستہ: اوڑی سے دوپٹہ سلطان، مظفر آباد، گڑھی حبیب اللہ خان، چھتر، ٹھانسہ، مانگل، سلہڈ، نوشہرہ، سرائے صالح۔ دسرائے صالح سے آگے۔ سرائے صالح میں میر لنگ دیو پر مقام ہوتا تھا۔ سرائے صالح، سلطان پور، علاقہ ہرو، حسن ابدال، اٹک، یہ کابل کیلئے تھا۔

لاہور کے لئے، سرائے صالح کے میرا سنگ ڈیو سے حطار سرائے کالا، مار گلہ، راولپنڈی۔

نوٹ: تجارت کشمیر زیادہ تر پشمینہ کی تھی۔ عموماً اکتوبر میں بقچہ ہائے پشمینہ جس کو بدری کہتے تھے کشمیر سے کابل کو روانہ ہوتے تھے۔ گڑھی حبیب اللہ سے مانگل تک سعادت خان صواتی کے زیر حفاظت قافلے چلتے تھے اور اس کا بدرقہ ساتھ ہوتا تھا اور پانچ روپیہ فی صد حق حفاظت مقرر تھا۔ مانگل سے مقصود تک قوم جدون کی حفاظت تھی اور وہ بھی یہی حساب لیتے تھے۔ اس کے بعد علاقہ میدانی تھا اور بدرقہ کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔

جب سکھوں کی بدامنی شروع ہو گئی تو یہ قافلے مانسہرہ سے جلو، مرلقہ، پھوہار، بیڑ کے راستے سے جانے لگے اور تنولیوں نے ان کی حفاظت کا ذمہ اٹھایا اور وہ حقِ حفاظت پانچ فیصد لینے لگے۔ جب حکومت درانی میں زیادہ ضعف ہونے لگا تو تنولیوں نے پندرہ، بیس اور پچیس فی صد تک لینا شروع کر دیا۔

یہ راستہ صرف پشمینہ (بدری) کے لئے تبدیل ہوا تھا۔ باقی فوج اور تجارت کا وہی پرانا راستہ رہا۔

۲۔ راولپنڈی سے ایک سڑک جو شاہراہ لاہور پشاور سے جدا ہو کر اس ضلع میں آتی ہے وہ موضع حطار، کوٹ نجیب اللہ، ہری پور، چنبہ، سلطان پور، ایبٹ آباد سے ہو کر مانگل، مانسہرہ گڑھی حبیب اللہ، مظفر آباد جاتی ہے۔ اسی سڑک کی ایک شاخ مانسہرہ سے نکل کر میدان پکھلی سے ہوتی ہوئی اگرور کو جاتی ہے۔ اس کی ایک شاخ ایبٹ آباد سے نکل کر شیروان، کرلیاں، دربند تک جاتی ہے اور اس کی ایک اور شاخ ایبٹ آباد سے دھمتوڑ، ڈونگا گلی، چھانگلہ گلی، مری پہنچ جاتی ہے۔ ایک شاخ ہری پور سے تربیلہ تک اور اسی کی ایک شاخ داڑی، اتھپلہ صوابی میرا، علاقہ بدھنک، نواں گراں، کھر کوٹ، علاقہ کلائی تک۔

پرانے شاہراہ

اگرچہ مندرجہ بالا بیان بندوبست ۱۸۷۲ء کے مطابق پہلے زمانہ میں کوئی خاص سڑک اس ضلع میں نہ تھی، لیکن تاریخی ثبوت موجود ہے کہ پرانے شاہراہ اس ضلع میں موجود تھے اور اس علاقہ میں ٹمکسلہ کو ایک تجارتی مرکز کی حیثیت سے اہمیت حاصل تھی۔ یہاں زمانہ قدیم میں

تین شاہراہیں ملتی تھیں۔

۱۔ جنوبی و مشرقی ہندوستان کی شاہراہ عام جو بقول میگاستھینز، پاٹلی پترا (پٹنہ) سے سلطنت موریہ کے شمال مغربی کنارا تک جاتی تھی۔

۲۔ مغربی ایشیا کی شاہراہ، باختر، کپسی پشکلاوتی (چارسدہ) سے گزر کر موضع ہنڈ سے پار ہو کر ٹیکسلا جاتی تھی۔

۳۔ کشمیر اور وسطی ایشیا کی شاہراہ، سری نگر، بارہ مولا، مانسہرہ، ہری پور سے ہو کر ٹیکسلا جاتی تھی۔

یہ تینوں شاہراہیں ٹیکسلا کی قدیم شہرت و آبادی کا باعث تھیں۔

سندھ تہذیب کے اثرات۔ موہنجوڈارو سے دو پہیوں والی گاڑی کے کھلونے برآمد ہوئے ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اس ملک (موجودہ پاکستان) میں گاڑی کا رواج تھا اور لازماً اس کے لئے سڑکیں بھی تھیں۔

۳۲۳ قبل مسیح میں جب سکندر اعظم ٹیکسلا پہنچا تو ملک میں سڑکیں موجود تھیں، جن پر قافلے اور مختلف قسم کی گاڑیاں چلتی تھیں اور مقررہ فاصلہ پر سرائے اور فاصلوں کے نشان تھے اور ڈاک رسانی کا مکمل انتظام تھا۔ یونانی مؤرخ میگاستھینز لکھتا ہے: "کہ پاکستان میں ایرانی شاہی سڑکوں کی طرح سڑکیں موجود تھیں، جن کی چوڑائی ۴۸ فٹ تھی اور ہر ۲/۳ میل پر ایک سنگ میل تھا۔ مسافروں کے لئے سرائیں تھیں اور پولیس تھانے تھے۔ جو سڑکیں شہروں کے درمیان سے گزرتی تھیں تو وہاں کے لوگ سڑکوں کو درست حالت میں رکھنے کے ذمہ دار تھے اور جو کوئی سڑک کو خراب کرتا تھا یا استعمال میں حارج ہوتا تھا، اس کو جرمانہ کیا جاتا تھا" آگے چل کر شیر شاہ سوری نے ان ہی شاہراہوں کو بہتر طور پر منظم کیا۔

ان تاریخی واقعات سے یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ ٹیکسلا اور ہزارہ میں کشادہ سڑکیں تھیں، جن پر آمد و رفت ہوتی تھی۔ مغل بادشاہوں کے لشکر، سامان اور شاہی سواریاں اس ضلع سے گزر کر ہی کشمیر جاتی تھیں اور یہی حال درانی اور سکھوں کی حکومت میں تھا۔ ان کی توپ گاڑیاں جن میں گھوڑے جتے ہوئے ہوتے تھے، ان سڑکوں ہی سے گزرتے ہوں گے۔

قحط

حال قحطِ کلاں جو ۱۸۳۶ بکرمی مطابق ۱۷۷۹ء میں ہوا

حال قحط کلاں۔ ابن بطوطہ اپنے سفر نامہ میں لکھتا ہے کہ سلطان محمد بن تغلق کے زمانہ میں شمالی ہند میں قحط تھا۔ دوسری تاریخوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قحط محمد بن تغلق کے دولت آباد سے واپسی پر ۷۴۴ھ مطابق ۱۳۴۴ء میں شمالی ہندوستان میں پڑا تھا (معارف، جولائی ۱۹۷۰ء ص ۴۸) گویا سب سے پہلے قحط شمالی ہند میں ۱۳۴۴ء میں آیا۔

۵ ماہ کاتک ۱۸۳۶ بکرمی (۱۷۷۹ء) دو بجے دن ناگاہ ایک زلزلہ نہایت ہی زور سے ہوا کہ اس کی ایک ہی جنبش سے ضلع کے سب دیہات کے کوٹھے ہائے گر گئے اور ہزاروں آدمی دب کر مر گئے۔ جملہ مسلمانوں کو ایک ہی جگہ دفن کر دیا گیا اور ہندوؤں کو ایک جگہ، گرے ہوئے مکانوں کی لکڑیوں سے جلا دیا گیا۔ اس کے بعد ایک مہینہ تک نرم نرم بارش ہوتی رہی اور زلزلہ بھی نرم نرم آتا رہا۔ لوگ بہت زیادہ ڈرے ہوئے تھے۔ اسی سمت ۱۸۳۶ سے قحط کے آثار شروع ہو گئے۔ بارش بند ہو گئی۔ اس دوران پکھلی کے ہوتروں میں صرف کچھ پیداوار ہوتی رہی۔ نالہ سرن میں پانی اتنا کم ہو گیا تھا کہ لوگ پتھروں پر خشک پاؤں پار ہو جاتے تھے۔ کھلابٹ کے نزدیک جلبسی اور مقصود کا پانی کم رہا۔ اور ان علاقوں سے کچھ غلہ پیدا ہوتا رہا۔ پوٹھوہار سے اکثر لوگ اس ضلع میں آ گئے اور کشمیر سے بھی۔ یہ قحط ربیع ۱۸۳۷ بکرمی (۱۷۸۰ء) سے شروع ہو کر بڑھتا ہی گیا۔ آخر کار ہاڑ سمت ۱۸۴۱ (۱۷۸۴ء) میں بارشیں شروع ہو گئیں اور قحط ختم ہوا۔

۲۔ شہنشاہ اکبر کے عہد میں پنجاب اور کشمیر میں ۱۵۹۵ء تا ۱۵۹۸ء میں سخت قحط پڑا جس سے ہزارہ بھی متاثر ہوا۔ جون ۱۵۹۷ء میں اکبر بادشاہ کشمیر میں تھا۔ کشمیر سے بہت سے لوگ ہجرت کر کے چلے گئے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان و پاکستان میں جتنے کشمیری آباد ہیں، ان کے آباؤ اجداد اسی وجہ سے آئے ہوں گے۔ اکبر بادشاہ نے لوگوں کے لئے مفت لنگر جاری کئے اور سب جبوبات و ٹیکس معاف کر دیئے۔

۲- پنجاب و ہندوستان میں ۶۱-۱۸۶۰ء اور ۷۰-۱۸۶۹ء میں شدید قحط پڑے تھے، مگر ہزارہ اس سے محفوظ رہا۔

۴- ۱۹۲۱ء کا قحط غلہ کی سخت گرانی کی شکل میں نمودار ہوا لیکن جلد ہی اس پر قابو پا لیا گیا۔

رواج نامہ —— اقوام ہزارہ

مرتبہ تاریخ ۱۷- اپریل ۱۸۶۹ء بندوبست قانونی ضلع ہزارہ سے چند اقتباسات

قوم تارخیلی | ۱- رواج پگ ونڈ ہے۔ لیکن والد کو عین حیات میں اختیار ہے کہ پگ ونڈ کرے یا چونڈہ ونڈ (پگ ونڈ- لڑکوں کے درمیان مساوی تقسیم، چونڈہ عورت کی بناء پر تقسیم-)

۲- والد کو اختیار ہے کہ جس بیٹے کو زائد حصہ دیوے، بعد فوتیدگی والد کے تقسیم برابر ہوگی۔

۳- خانی کا حصہ جدا ہوتا ہے۔ ۱/۳ کے منہا کرنے کے علاوہ حصہ خانگی کی تمام تقسیم بموجب شرعی والد کو اختیار ہے کہ حصہ خانی کم کرے یا زیادہ۔

۴- حصہ فرزندان مختلف اقوام کی عورت کا- والد کو اختیار ہے کہ فرزندان عورات اقوام اشراف و کمیان کو جس قدر چاہے حصہ دیوے- کچھ حصر اس بات پر نہیں کہ فرزندانِ اقوام اشراف مثلاً افغان و کھٹڑ و تنولی کو بہ نسبت فرزندان عورات اقوام کمینہ مثلاً تیلی و بافندہ زاید حصہ دیوے خواہ کم دیوے اور بعد وفات اس کی اولاد عورت اشراف کو فوق ہے۔ اولاد عورت کمین پر- کمی ذیل ہیں - آوان، تیلی، گوجر، لوہار وغیرہ کو کچھ حصہ نہیں ملتا- ہاں اگر ڈولی میں کمی قوم سے منکوحہ ہو کر آوے، تو اس کو رواج محروم نہیں کر سکتا اور حصہ مساوی پاتا ہے- گذارہ غلہ پانچ چھٹ تک پاتا ہے یا اراضی دو قلبہ ہا۔

رواج نامہ اتمان زئی و ترین قوم کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے:

۱- کہ ہزارہ میں آوان، تنولی اور گوجر، ان سے پہلے آباد تھے۔

۲- تنولیوں میں صوبہ خانی اور کرڑالوں میں سرداروں کا گھر ہی ان (اتمان زئی و ترین اقوام) کے نزدیک قابل عزت تھا اور ان کی ہمسری کے یہ قائل تھے۔

۲- اتمان زئی قوم کے رواج نامہ پر سب اکابرین کے انگوٹھے ثبت ہیں۔ سوائے خانی زمان خان آف کھلابٹ۔ انہوں نے اپنے قلم سے پختہ خط میں دستخط کیا ہے۔ دخانی زمان خان بقلم خود کلابٹ والا) انہوں نے اپنے نام کے ساتھ کلابٹ (نہ کہ کھلابٹ) والا تحریر کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی زبان میں اس وقت تک پشتو لہجہ و تلفظ کا اثر موجود تھا۔ ان کے والد خان میر زمان خان اتمان زئی دپار دریائے سندھ سے) موضع کوٹھہ یا ٹوپی سے یہاں آئے اور خان زمانی خان نے یہ دستخط ۱۸۷۲ء کے بندوبست کے رواج نامہ پر کئے ہیں۔ اس سے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ ان کے آئے صرف ایک پشت دپچیس سال) گزر کر دوسری پشت کا یہ عہد تھا۔ اس امر کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ سید خانوں کی جاگیر نئی اور عہد انگریزی ہی سے ہے۔ باقی جاگیرداران، پرانے جاگیردار، عہدِ مغلیہ، درانی و سکھان سے ہے۔ تیسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ اس وقت باقی خوانین خاص کر اتمان زئی ان پڑھ تھے۔

رواج نامہ قوم ڈھونڈ میں جولاہا، ترکھان، موچی، لوہار، گوجر اور آوان مستورات کو کمتر درجہ کا خیال کیا جاتا تھا اور ان کی اولاد دوسری اقوام کی عورتوں سے کمتر درجہ کی خیال کی جاتی تھی۔

سکھوں کا عہد

ان کے مظالم کی داستانیں۔ چند زبانی روائتیں

سکھ قوم مسلمانوں سے عناد و دشمنی کے گہوارہ میں پروان چڑھی اور ان کا قومی کردار مسلمانوں کی حکومت کی تخریب کے خمیر سے گوندھا گیا۔ وجہ جو کچھ بھی ہو لیکن حقیقت کا اظہار مختصراً ان لفظوں میں ہی کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا جب سکھوں کو اقتدار حاصل ہوا تو انہوں نے اپنے عہدِ حکومت میں مسلمانوں کے ساتھ ظلم و سختی کی انتہا کر دی۔ ان کے نزدیک کسی قانون یا اخلاق کی پابندی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ان کے اس خلل مزاج نے آخر کار ان کے درمیان ایسی پھوٹ ڈالی کہ قوم اپنے ہی افراد کو قتل کرتی رہی اور اپنا چراغ اپنی ہی پھونکوں سے بجھا دیا۔

چونکہ اس قوم کی اٹھان کی بنیاد کسی تعمیری جذبہ کے ماتحت نہ ہوئی تھی۔ وہ تخریب کے جذبے سے اٹھی اور اپنا تخریبی کردار ادا کر کے فنا ہوگئی۔ اصلاً یہ مسلمانوں کی تخریب کے لئے اٹھی اور اپنا پارٹ ادا کر کے سلطنت کی سٹیج سے اتر کر حکومت انگریزوں کے حوالہ کر کے نابود ہوگئی۔

سکھوں کی سختی اور مظالم کی داستانیں

ان داستانوں کا پوری طرح اندراج تو ممکن نہیں کیونکہ وہ بہت ہیں اور ہزارہ کے چپہ چپہ پر ان کے اثرات پائے جاتے ہیں اور بطور قصہ ہائے پارینہ اب بھی بیان کی جاتی ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے۔

۱۔ ان کے عہد میں گائے بھینس ذبح کرنا اپنی ہلاکت کو دعوت دینا تھا۔ اس ضمن میں زبانی روائتوں کی بجائے ایک تاریخی شہادت کافی ہے، جو پنجاب ریکارڈ آفس کے مانوگراف ۱۷ ہے جس میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار کے حالات باجی راؤ پیشوا پونا کو اس کا سفیر لاہور سے بھیجتا رہتا تھا، درج ہیں۔ وہ اپنی ڈائری مورخہ ۵ ارمارچ ۱۸۱۲ء میں لکھتا ہے کہ: "جالندھر کے مسلمانوں پر ایک گائے ذبح کرنے پر تین ہزار روپیہ جرمانہ کیا گیا۔

۲۔ سکھ حکومت کے زمانہ میں بیگار اور سختی کا عام رواج تھا۔ راستہ چلتے کسی شخص کو بھی بیگار میں پکڑ لیتے تھے۔

۳۔ سکھوں کے عہد میں مجرموں (یا ملزموں کو) مجمع عام میں سزا دی جاتی تھی۔ اس کی وضاحت کے لئے ایک مثال دی جاتی ہے۔ ان کے زمانہ میں موضع ڈھینڈہ کے ایک مشہور ڈاکو کو موسم خان نمبردار دیہہ نے پکڑ کر سکھ حاکم کے سامنے پیش کیا۔ سکھ نے وہیں حکم دیا کہ اس کو درخت سے سولی دی جائے۔

حسب دستور ڈھول پٹوایا گیا تا کہ لوگ جمع ہو جائیں۔ لوگ جمع ہو گئے اور ڈاکو کو سولی دینے کا انتظام کیا جانے لگا۔ چور سکھوں کی ذہنیت سے واقف تھا۔ وہ تفتیش کے فن سے ناآشنا اور فوری حکم دینے کے عادی ہیں۔ کیوں نہ موسم خان نمبردار کو بھی اپنے ساتھ اپنا ساتھی بنا کر سولی پر لٹکوا دیا جائے۔ اس ڈاکو نے ہزارہ کی زبان میں یہ گیت گانا شروع کر دیا ؎

موت دی ڈھولکی نہ مار سکھا — میں تے موسم خان کدے دے یار سکھا

ترجمہ: اے سکھ، موت کی ڈھولکی میرے لئے اکیلی نہ بجا۔ میں اور موسم خان نمبردار پرانے دوست اور ہم پیشہ ہیں، لہٰذا یہ بھی میرے ساتھ سولی پر لٹکایا جائے۔

موسم خان زیرک آدمی تھا وہ سمجھ گیا کہ سکھوں کی حکومت میں دلیل واپیل کی گنجائش نہیں اور نہ صفائی وشہادت کارگر ہو سکتی ہے۔ اس نے اپنی جان بچانے کے لئے فوراً اپنی حاضر جوابی سے جان بچالی اور کہا ؎

دَب دَب کے ڈھولکی مار سکھا   نہ چور، نہ چوراں دے یار، سکھا

یعنی زور زور سے ڈھولکی بجاؤ مجھے کوئی فکر نہیں، کیونکہ نہ میں چور ہوں اور نہ چوروں کا دوست

۴۔ سکھوں کی حکومت کوئی باضابطہ حکومت نہ تھی۔ مالیہ اور دیگر واجبات حکومت کے جمع کرنے کے لئے کوئی مستقل نظام نہ تھا۔ عموماً گاؤں کے خان سے گاؤں کا مالیہ اجارہ کے طور پر اور تخمینہ سے مقرر کرکے وصول کیا جاتا تھا۔ اگر یہ خان کسی شخص کو عدم ادائیگی پر حاکم کے سامنے پیش کرتا تو حاکم سخت جبر اور تکلیف دہی سے اس شخص سے مالیہ وصول کرتا تھا۔ ہمارے گاؤں سے دکھا جاتا ہے، کہ ایک شخص سے وصولی کے لئے سر پر بہت بھاری پتھر رکھ دیا گیا اور وہ شخص سارا دن کھڑا رکھا گیا۔

۵۔ جس طرف سے سکھوں کی فوج یا کسی گروہ کی آمد ہوتی ہے، لوگ ان کے مظالم کے خوف سے گاؤں ویران کرکے پہاڑوں کے دامن میں پناہ لے لیتے تھے۔ غلہ و دیگر سامان جو ساتھ نہ لے جاسکتے تھے، گھروں میں زمین کھود کر اس میں چھپا دیتے تھے۔ ان مظالم کی وجہ سے ان کی حکومت کو ہزارہ میں صرف ایک انگریز میجر ایبٹ ہی نے آکر ختم کر دیا۔ جس ملک کو سکھ حکومت کے زور سے رعیت نہ کر سکے اس کو ایک ہوشیار، رحمدل اور قابل انگریز نے اپنا گرویدہ بنالیا۔

ہزارہ کے عہد ماضی کی چند نامور ہستیاں

میدان ہزارہ میں۔ قوم ترین کے حاکمانہ عہد کی زیادہ مشہور ہستی نجیب اللہ خان کی ہے۔ جو ابنائے ہزارہ میں پہلا شخص ہے جو اس علاقہ کا حاکم حکومت درانی کی طرف سے

مقرر ہوا۔ اس کا آبائی گاؤں درویش تھا۔ کوٹ نجیب اللہ خان (یعنی قلعہ بنا کردہ نجیب اللہ خان) اس کا بنا کردہ ہے۔ اس کی وفات کے بعد اس کی بیوی بنی بیگم حکومت کا کام بڑی قابلیت سے چلاتی رہی۔ کیونکہ اس کا بیٹا محمد خان نابالغ تھا۔ اس نے مقدم مشرف کو اپنا نائب بنایا اور اپنی فراست، قابلیت اور معاملہ فہمی سے کارِ حکومت کو خوب طور پر چلایا۔ جب محمد خان جب جوان ہوا، تو اس نے کاروبار حکومت سنبھال لیا۔ اسی اثنا میں سکھوں کی آمد اس ضلع میں ہو چکی تھی۔ اس نے مردانہ وار ان کا مقابلہ کیا اور آخر جان کی بازی ان کے ہاتھوں سے ہاری۔ اس کے بعد غلام خان نے سکھوں اور پھر انگریزوں کا مقابلہ بڑی بہادری سے کیا اور اپنے مشیروں کی بیوفائی سے آخر کار انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا اور انجام کار شہادت پائی۔

سکھوں کے زمانہ میں صالح محمد مشوانی، بوستان خان ترین اور شیخا جدون بھی نامور ہستیاں گزری ہیں، جو سکھوں سے مقابلہ کرنے کی پاداش میں توپ سے اڑا دئے گئے تھے۔ سکھوں کے عہد میں ایک نامور ہستی میر زمان خان سید خانی کھلابٹ میں نمودار ہوئی اور اپنی بہادری اور ہمت سے علاقہ خالصہ میں اپنا رسوخ پیدا کیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا خانی زمان خان عہدِ انگریزی میں بہت نامور گزرا ہے۔

سکھوں کے آخری زمانہ میں سید اکبر ستھانہ والے اور نواب خان تنولی، خان ششنگاڑی باا ثر ہستیاں نمودار ہوئیں۔ انہوں نے سکھوں کی حکومت کی جڑیں بامداد غلام خان ترین ہلا دیں۔

قوم گکھڑ میں بہت سے نامور لوگ پیدا ہوئے۔ ان کے مفصل حالات اس قوم کی تاریخ میں درج ہیں۔ یہ سلطان محمود غزنوی اور مغلیہ عہد میں بہت با اثر اور صاحب حکم رہے سکھوں کے عہد میں راجہ حیدر بخش خان نامور سردار ہوا ہے۔

تارخیلی قوم سے انگریزی عہد میں خانی زمان خان ایک زبردست انسان پیدا ہوا۔ اس نے جلاوطنی منظور کر لی لیکن انگریز کی غلامی قبول نہ کی۔

حاکمانِ ہزارہ

ہزارہ، تاریخ کے مختلف ادوار میں جن حکومتوں کے ماتحت رہ چکا ہے، ان کے

حاکمان کی فہرست پیش کی جاتی ہے۔

زمانہ ماضی یہ ضلع ماضی بعید میں شمال مغربی ہند کے ہندو راجاؤں کے زیرِ نگین رہا ہے۔ اس ضلع میں مختلف مقامات کے نام سنسکرت میں ہیں، جو اس امر کی شہادت دیتے ہیں۔

سلطان محمود غزنوی کی آمد سے پہلے، یہ ضلع چندر گپت اور اشوک اعظم کی مملکتوں کا حصہ رہا ہے۔ متعدد مقامی راجے اس پر حکومت کرتے رہے۔ ساتویں صدی عیسوی کے چینی سیاح "ہیون سانگ" کی آمد کے وقت یہاں ہندوؤں کا راج تھا اور مانگل اس ضلع کا دار السلطنت تھا اور راجہ رسالو جیسا افسانوی رہبر اس کا حاکم رہا ہے۔ ر جوعیہ اور گندگر کے مابین کا علاقہ اس کی جولانگاہ رہے ہیں۔

دوسری سے ساتویں صدی عیسوی تک یہاں ہندوؤں کی حکومت کا زور رہا۔ لیکن ان کے حاکمان کے نام اور عہد کو تاریخ نے محفوظ نہیں رکھا۔ ہندو علم تاریخ سے ناواقف اور اس کی اہمیت سے بے خبر تھے۔ تاریخ کے علم کے موجد مسلمان ہوئے۔ لہٰذا دنیا کے ہر خطہ میں جہاں بھی مسلمانوں کے قدم پہنچے، وہاں کی تاریخ مسلمانوں کے عہد سے روشن چلی آرہی ہے۔

سلطان محمود غزنوی کے ابتدائی حملے کے زمانہ میں بالائی ہزارہ کشمیر کے زیر اثر تھا اور زیریں ہزارہ، اجے پال کی حکمرانی میں تھا۔ جس سے ۱۰۲۱ء میں ہندو شاہیہ برہمن لآلیا نے اقتدار چھین لیا تھا۔ اس طرح سلطنت ٹیکسلہ کے علاقے کے علاوہ ولایت پکھلی اور ولایت کشمیر کا علاقہ ہندو شاہیہ گندھارا کے حکمرانوں کے ماتحت ہو گیا تھا۔

سلطان محمود غزنوی اور مہاراجہ انند پال کے درمیان فیصلہ کن جنگ، ولایت پکھلی کے آخری سرے پر یعنی حضرو (چھچھ) کے میدان میں لڑی گئی۔

گیارھویں صدی عیسوی میں سلطان محمود غزنوی نے جہاں ہندوستان میں ہندو راجاؤں کی مجموعی طاقت کو توڑا، وہاں اس ضلع کے نظام میں بھی تغیر آگیا۔

بارھویں صدی عیسوی میں چنگیزی مغلوں (ترکوں) کے حملوں نے اس ضلع میں ہندوؤں کی حکومت کو ختم کر کے رکھ دیا۔

تیرھویں صدی میں ہزارہ میں ترکی حکومت (سلاطین پکھلی) قائم ہو گئی جس کی مدد کے لئے

تیموری حملہ ۱۳۹۸ء میں قارلق قبیلہ کی ایک رجمنٹ برائے امداد وایزادی قوت ترکان پکھلی کے یہاں آباد کیا گیا۔ ان سلاطین پکھلی کی حدود سرحد کشمیر اور اٹک تک رہیں۔

مری کے نزدیک موہر کوٹ اور نند کوٹ کے مشہور قلعے ولایت پکھلی کے اسی حصہ سرحد کشمیر میں واقع تھے۔ ان کا محل وقوع، وادئ کشمیر کو جانے والے قدیم راستے کو کنٹرول کرنے کے لئے یہ مقامات نہایت موزوں تھے۔ کشمیری حکمرانوں نے ان قلعوں کی حفاظت کا ایسا معقول انتظام کر رکھا تھا کہ سلطان محمود و سلطان مسعود کے زمانہ میں ان پر تین بار چڑھائی کی گئی لیکن شدید برف باری کی وجہ سے فتح نہ ہو سکے۔ اور یہ قبیلہ اٹھارویں صدی کے شروع تک حکمران رہا۔ مرکز سلطنت (پکھلی) تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ اسی علاقہ میں اشوک کے عہد کے فرمان، پہاڑی کے دامن، بر سرِ شارع عام قدیم (نزد مانسہرہ شہر) اب بھی موجود ہیں۔

ترک حکمران

(ترک حاکمانِ ہزارہ کے حالات تاریخ ہزارہ، مؤلفہ محمد ارشاد خان سے لئے گئے ہیں۔)

۱۔ سلطان شہاب الدین بابر جو ابو سعید سلطان سمرقند کا پوتا اور ظہیر الدین بابر کا سگا چچازاد بھائی تھا ۱۴۰۲ء میں ولایت پکھلی میں آیا اور گلی باغ کی چھاؤنی اور قلعہ فیروز آباد کیا۔

۲۔ سلطان شہاب الدین کی وفات کے بعد اس کا بیٹا دریا خان، سلطان فقیر الدین کے لقب سے حکمران ہوا۔ اسی کے عہد میں سلطان ظہیر الدین بابر ہندوستان پر حملہ آور ہوا جس نے ۱۵۱۹ء میں حملہ سوات میں یوسف زیوں اور ۱۵۲۶ء میں پانی پت کے مقام پر ابراہیم لودھی کو شکست دی۔

۳۔ تیسرا فرمانروا عبداللہ خان الملقب بہ سلطان غیاث الدین پسر سلطان فقیر الدین ہوا۔ وفات اغلباً ۵۲-۱۵۵۲ء

۴۔ سلطان غیاث الدین کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سلطان محمود کلاں ولایت پکھلی کا حکمران بنا۔ اس کے ماتحت دھمتوڑ کی ذیلی ریاست کا انتظام مرزا شاہ رخ چلاتا رہا۔ ۱۵۵۶ء میں یہ حکمران تھا۔

اکبر بادشاہ نے کشمیر کو مکمل طور پر ۱۵۸۶ میں فتح کیا۔ جس میں سلطان محمود کلاں نے پورا حصہ لیا تھا۔ اس فتح کے کچھ عرصہ بعد سلطان محمود کلاں فوت ہوگیا۔

۵۔ سلطان محمود کلاں کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا سلطان حسین خان والئی پکھلی بنا۔ اس کا سن پیدائش ۱۵۲۳ء اور سن وفات ۱۶۲۳ء ہے۔

جب اکبر بادشاہ ۱۵۸۶ء میں کشمیر کے دورے پر گیا تو شاہی کمپ ہاتھی میرا نزد چھٹی گٹی میں لگایا گیا اور وہاں سے شہنشاہ اکبر سلطان حسین کی دعوت پر گلی باغ بطور ذاتی مہمان گیا۔ اس دورے میں اکبر بادشاہ دھمتوڑ بھی گیا اور شاہ رخ کا ذاتی مہمان بنا۔ سلطان حسین اکبر بادشاہ کی واپسی پر اس کے ساتھ اٹک تک گیا۔

اس دورہ میں شاہی کارندوں نے کشمیر سرکار کی طرح پکھلی سرکار کا بندوبست کرنا اور سالانہ لگان اور خرچ بھی مقرر کرنا شروع کر دیا۔ سلطان حسین خان نے اس بندوبست کو اپنی ریاست اندرونی معاملات میں مداخلت بے جا سمجھا اور شہنشاہ سے درخواست کی کہ ریاست کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی نہ کی جائے۔ یہ درخواست منظور نہ ہوئی۔ چنانچہ اٹک بنارس کے مقام سے شہنشاہ کو الوداع کہنے کے بعد جب وہ واپس لوٹا تو اس نے شہنشاہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس نے نصیر الدین لقب اختیار کیا اور اپنے آباؤ اجداد کی طرح پکھلی کے مطلق العنان بادشاہ کی حیثیت سے حکمرانی کرنے لگا۔

اکبر بادشاہ نے پکھلی پر حملہ کر کے سلطان حسین خان کو ریاست بدر کر دیا۔ لیکن علاقہ میں امن وامان بحال نہ ہو سکا تو دوسرے سال اکبر بادشاہ نے پھر اس طرف کا دورہ کیا۔ سلطان حسین کو معاف کر دیا اور اس کی ریاست بحال کر دی گئی اور سلطان حسین نے مغلیہ سلطنت سے الحاق مثل سابق بحال کر دیا۔ اور اندرونی خودمختاری حاصل کر لی۔ جہانگیر بادشاہ بھی اس کا مہمان ہوا، جبکہ وہ کشمیر کے لئے جا رہا تھا۔

۶۔ سلطان حسین خان عہدِ جہانگیری میں ۱۶۲۳ء میں فوت ہوا اور شہنشاہ نے اس کی وفات کی خبر سن کر اس کے بڑے بیٹے شادمان خان کو اس کے منصب پر بحال کر دیا اور اس ریاست پر ہمیشہ سلطان حسین خان کی اولاد ہی حکمران رہی۔

سلطان شادمان خان، جنگی صلاحیت کا مالک تھا۔ شاہی فوج کی مہمات میں نمایاں کردار ادا کرنے اور بہادری، دلاوری کے عمدہ کارنامے بجا لانے پر ہزاری منصب پر فائز کیا گیا اور وہ تمام کشمیر اور سرحدی علاقے میں پہلا ہزاری منصب دار تھا۔ اس کا عہد حکومت (عہدِ شاہجہانی کا دور) پکھلی سرکار کا سنہری زمانہ قرار دیا گیا۔ جس طرح شاہجہان کے زمانے کو مغلیہ سلطنت کا سنہری زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

۷۔ سلطان شادمان خان کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا سلطان محمود (خورد) پکھلی سرکار کا حکمران ہوا اور اپنے پیش روؤں کی طرح ایک بہادر اور قابل حکمران تھا۔ اسی سلطان نے سید جلال بابا کو اپنی دامادی میں، بوجہ ہونے اولاد حضرت پیر بابا کے لے لیا۔ اسی سید جلال بابا نے ۱۷۰۳ء میں حملہ کر کے گلی باغ پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت سلطان محمود خورد سرحدی جنگوں میں شہید ہو کر عدم پتہ ہو چکا تھا اور اس کی اولاد کم سن تھی۔ اس کے بعد سلاطین پکھلی کا خاندان اور حکومت ختم ہو گئی۔

جنوبی ہزارہ میں تاریخی لحاظ سے سب سے پہلے گکھڑ قوم کی حکومت ہوئی۔ ان کی آمد غالباً دسویں صدی عیسوی کے وسط میں (سلطان محمود غزنوی کی آمد سے پہلے) ہوئی۔ اس قوم کا انندپال کی طرف سے سلطان محمود کے خلاف لڑنا بھی تاریخ میں بیان ہوا ہے۔

حاکمانِ گکھڑ

گکھڑ قوم کا دارالسلطنت "پوٹھوہار" میں بمقام پرہالہ (دیا بھروالہ) تھا۔ ضلع ہزارہ میں علاقہ خان پور، اور قوم ڈھونڈ اور کرڑال کے علاقے میں شامل تھے۔ پکھلی سرکار یا میدانِ ہزارہ ان کے ماتحت نہیں رہا۔

اس قوم میں بہت مشہور اور نامور سلطان ہوئے ہیں۔ اس قوم کی رانی - رانی منگو (دیوان اللہ داد خان کی بیوی) ایک مشہور حکمران ہوئی ہے۔ گکھڑ قوم اس پر اسی طرح فخر کر سکتی ہے، جس طرح رضیہ سلطانہ، چاند بی بی اور اہلیا بھائی پر ان کی قوم فخر کرتی تھی۔ اس کا زمانہ شاہ اورنگ زیب عالمگیر کا عہد تھا۔

آغازِ سلطنت قوم گکھڑ میں سلطان تاتار اور سلطان ہاتھی مشہور گزرے ہیں۔ بابر بادشاہ کے حملہ ہندوستان کے وقت یہ اپنی قوم کے سربراہ تھے۔

یہ قوم خاندان تیموریہ کے ہمیشہ وفادار رہی۔شاہانِ مغلیہ نے ان کے خاندان سے رشتے بھی کیے۔ان کے خلاف افغان اقوام شاہانِ مغلیہ کے ہمیشہ مخالف رہے۔ ہمایوں بادشاہ سے افغانوں نے سلطنت چھینی اور پھر ہمایوں بادشاہ نے ان سے سلطنت واپس لے لی۔ یہ چپقلش دائمی رہی۔ اور گکھڑ اور افغان بھی اس سلسلہ میں (افغانوں اور مغلوں کے درمیان) باہم دست و گریبان رہے۔

سلاطینِ گکھڑ

۱۔ سلطان تاتار ۱۴۹۴ء سے ۱۵۲۴ء تک حکمران رہا۔ بابر بادشاہ نے اس کے بھائی ہاتھی سلطان کو ۱۵۱۹ء میں شکست دی تھی۔

۲۔ سلطان سارنگ ۱۵۲۴ء سے ۱۵۴۲ء تک شیر شاہ سوری نے اس کو گرفتار کر کے گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا تھا۔

۳۔ سلطان آدم (سلطان سارنگ کے قید ہو جانے کے بعد) ۱۵۴۲ء سے ۱۵۵۷ء تک سلطان رہا۔

۴۔ کمال خان ۱۵۵۷ء سے ۱۵۷۶ء تک سلطان رہا۔ یہ بھی سلطان سارنگ کے ساتھ قلعہ گوالیار میں قید تھا۔ جب قلعہ اڑایا گیا تو سب قیدی ہلاک ہو گئے، مگر یہ بچ گیا۔ اکبر بادشاہ نے خدمات کے صلہ میں کمال خان کو آدم خان کی جگہ سلطان بنا دیا۔ کمال خان نے اپنی زندگی ہی میں سید خان کو سلطان نامزد کیا۔ کیونکہ اس کی اولاد نابالغ تھی۔

۵۔ سید خان ۱۵۷۷ء سے ۱۵۹۶ء تک سلطان رہا (آباد کنندہ سید پور)

۶۔ فتح خان (آباد کنندہ خان پور) ۱۵۹۷ء سے ۱۶۱۰ء تک سلطان رہا۔

۷۔ شاہ بیگ خان ۱۶۱۴ء سے ۱۶۳۵ء تک سلطان رہا۔ اس کی اولاد جانی بیگی کے نام سے مشہور رہے۔ (گرم تھون والے)

۸- اجمیر خان ۱۶۳۶ء سے ۱۶۵۹ء تک سلطان رہا۔

۹- بشارت خان ۱۶۶۰ء سے ۱۷۱۲ء تک۔

۱۰- نامدار خان ۱۶۷۹ء سے ۱۷۱۲ تک۔

۱۱- جلال خان ۱۷۱۳ء سے ۱۷۳۳ء تک (اس کا نام مغلیہ حکومت کے فرامین میں جلال قلی خان لکھا ہوا ہے۔ یہ نامدار خان کا بڑا بیٹا تھا۔

چھوٹا مرید خان تھا۔ ان دونوں نے علاقے تقسیم کر لئے اور اسی طرح سے بعد میں اس قوم کے دو سلطان ہوتے رہے۔

۱۲- رستم علی خان ۱۷۳۴ء سے ۱۷۸۰ تک۔

۱۳- نوازش علی خان ۱۷۳۸ء سے ۱۷۷۹ء تک۔

۱۴- شاہولی خان ۱۷۸۰ء سے ۱۸۰۱ء تک۔

۱۵- جعفر خان ۱۷۸۹ء سے ۱۸۰۱ء تک۔

۱۶- مہدی خان ۱۸۰۲ء سے ۱۸۲۴ء تک۔

۱۷- نجف علی خان ۱۸۲۵ء سے ۱۸۶۲ء تک۔

۱۸- علی گوہر خان ۱۸۲۵ء سے ۱۸۶۳ء تک۔

۱۹- حیدر بخش خان ۱۸۴۶ء سے ۱۸۶۵ء تک۔

۲۰- حیدر بخش خان کا بیٹا جہانداد خان ۱۸۷۲ء تک حاکم رہا۔ یہ بڑا ہی صاحب علم و فراست اور قابل انسان تھا۔

۲۱- دوسری شاخ کا حاکم فیروز خان ۱۸۶۰ء سے ۱۸۷۲ء تک رہا۔

اس قوم کے شاندار ماضی کے لئے ایک دلیل پیش کرتی ہے کہ اس کے حکمرانوں کا عہد تاریخی طور پر ثابت ہے۔

پکھلی سرکار

ماضی قدیم، پکھلی، تناول، علاقہ جدون (یعنی سرکار پکھلی)، کشمیر سے متعلق رہا۔ ان

کے حکام کا صدر مقام کشمیر تھا۔ ان کے نائب یہاں رہا کرتے تھے۔

عہدِ مغلیہ میں بھی یہ علاقہ کشمیر کے ماتحت رہا۔ اکبر بادشاہ کے عہد میں راجہ بیربر حاکم کشمیر و ہزارہ رہا۔

میدانِ ہزارہ و چھچھ ہزارہ

زمانہ ماضی میں یہ علاقہ ہندوستان کا شمال مغربی حصہ تھا۔ یعنی راولپنڈی تا اٹک۔ اس کا حاکم راولپنڈی میں رہتا تھا۔ عہد مغلیہ (زمانہ اکبر بادشاہ) میں اس علاقہ کا حاکم اٹک میں رہتا تھا۔ قلعہ اٹک کے ساتھ ہی مشرق کی جانب اکبر بادشاہ کے زمانہ میں ایک شہر آباد ہوا جس کا نام دریائے اٹک کی مناسبت سے اٹک بنارس (بمقابلہ کٹک بنارس ہندوستان میں ہندوؤں کا مذہبی مرکز) رکھا گیا تھا۔ اس شہر کے کھنڈرات شاہراہِ پشاور پر موجود ہیں اور شوالوں، مندروں، مکانات، سراؤں اور قبرستان کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ سڑک سے جنوبی جانب مغلیہ طرز کی ایک حویلی جو حاکم کی رہائش کے لئے ہوگی، اب بھی موجود ہے۔ قلعہ اٹک اور یہ شہر (اٹک بنارس) اکبر بادشاہ نے ۱۵۸۱ء میں بنایا تھا تاکہ یوسف زئی پٹھانوں کی سرکوبی کی جا سکے۔ اس جگہ پر اس کو اپنی فوج کی شکست بہ علاقہ بُنیر جس میں اس کا سالار فوج بیربل قتل ہوا تھا، کی خبر ملی تھی۔ جبکہ وہ خود اس قلعہ میں مقیم تھا۔ یہ مہم اکبر بادشاہ نے روشن (پیر روشن۔ بایزید انصاری) کے خلاف بھیجی تھی جو ناکام واپس آ رہی تھی کہ کڑاکڑ پہاڑ عبور کرتے ہوئے اس فوج کا سالار مارا گیا تھا۔

عہدِ دُرّانی

تیمور شاہ نے ۱۲۱۰ھ/۱۷۹۵ء میں علی مردان کو خان حاکم اعلیٰ اٹک، چھچھ ہزارہ مقرر ہوا۔ لیکن میدانِ ہزارہ (تحصیل ہری پور) پر نجیب اللہ خاں ترین ۱۷۶۲ء سے ۱۷۹۹ء تک حاکم رہا۔ (ترین قوم درانیوں کی ہم جدی ہے۔)

اس کی وفات کے بعد اس کی بیوہ، بیوی بنی بیگم نے ۱۷۹۹ء سے ۱۸۱۱ء تک

حکومت کی اور بڑی قابلیت سے حکومت کی۔ یہ بڑی ہی دین دار اور تہجد گزار عورت تھی۔ حکومت کرنے کی قابلیت میں وہ بڑی بڑی حکومتوں کی حکمران خواتین مثلاً رضیہ بی بی، چاند بی بی کے ہم پلہ تھی۔

۳۔ محمد خان پسر نجیب اللہ خاں ۱۸۱۷ء سے ۱۸۲۸ء تک حکمران رہا۔ رنجیت سنگھ نے فریب سے اسے گرفتار کر لیا اور آخر ہری سنگھ نے اس کو جیل میں مروا ڈالا۔

۴۔ غلام خان پسر محمد خان ۱۸۲۸ء سے ۱۸۴۹ء تک حکمران رہا۔ اس نے سکھوں کے ساتھ خوب مقابلے کئے۔ مگر آخر کار میجر ایبٹ کے ہاتھوں گرفتار ہو کر قید ہوا۔ چندے اٹک قلعہ اور پھر الہ آباد کے قلعہ میں قید رہا۔ آخر کار ایک سازش کے تحت اس کو وہاں پھانسی دے دی گئی۔

علاقہ تناول

تنولی قوم کے دو پتے ہیں۔ ۱۔ پلال ۲۔ تناول۔

تمام علاقہ ان دو پتوں بر حصہ مساوی تقسیم ہے۔

پتہ پلال، قدیم زمانہ سے نامور رہا۔ اس پتہ کا نامور خان، زبردست خان الملقب بصوبر خان ۱۷۴۷ء میں اس علاقہ کا حاکم تھا۔ اس کی وفات کے بعد محمد خان کچھ مدت حاکم رہا۔ اس کے قتل ہونے پر پہلے فتح شیر خان حاکم ہوا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بھائی گلشیر خان حاکم ہوا۔

پتہ ہندوال میں زمانہ قدیم میں کوئی نامور خان نہیں ہوا۔ ہر دو پتے کے خوانین اپنے اپنے علاقہ پر حکمران رہے۔ ۱۷۷۲ء میں پتہ ہندوال کے خان ہیبت خان نے قوت پیدا کر لی۔ اس کی وفات ۱۸۰۳ء میں ہوئی۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ہاشم علی خان، خان ہوا۔ اس زمانہ میں پتہ پلال کا خان احمد علی اخان ہوا۔ ان دونوں خوانین میں باہمی نزاع رہی۔ جس کا آغاز نواب خان سے شروع ہوا تھا۔ آخر کار پائندہ خان کے وقت ہندوال کا پلہ بھاری ہو گیا۔ اس کی وفات ۱۸۴۳ء میں ہوئی۔ اس کا جانشین جہانداد خان ہوا۔ اس کی وفات ۸ نومبر ۱۸۵۰ء کے بعد ان کا اکلوتا بیٹا محمد اکرم خان بہ عمر نو سال نواب ہوا۔ ان کی وفات ۱۹۰۷ء میں ہوئی اور خانی زمان خان نواب ہوا۔ ان کے بعد ان کا فرزند محمد فرید خان نواب ہوا۔ ان کی وفات ۱۱ دسمبر ۱۹۷۰ء کو ہوئی۔ ان کی وفات کے بعد یہ خاندان گوشہ گمنامی میں چلا گیا۔

پکھلی (بعد از سلاطین ترک)

سعادت خان سواتھی (خان خیل) ۱۷۶۲ء سے ۱۸۰۷ء تک حاکم رہا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا علی نہان حاکم ہوا۔ اس کے بعد اس کا بھائی نجیب اللہ خان ۱۸۰۷ء تا ۱۸۲۱ء حاکم رہا۔ یہ جنگ نانگل میں جب سکھوں کے ہاتھوں سے شہید ہوا، تو خانی کی دستار اس کے کم سن بیٹے ہیبت خان کے سر پر رکھی گئی اور حبیب اللہ خان کو سربراہ مقرر کیا گیا۔ اس کا عہد سکھوں کی حکومت کے آغاز سے چند سال تک رہا۔ اس نے سردار ہری سنگھ کو ناک چنے چبوائے۔

ہیبت خان نے جوان ہونے پر (غالباً ۱۸۳۴ء) میں اختیارات سنبھال لئے۔ ہیبت خان کی وفات پر اس کا چچا حبیب اللہ خان (خان ہوا، جو مظفر آباد کی جنگ میں (غالباً ۱۸۴۵ء) میں مارا گیا۔ عہدِ انگریزی میں محمد امین خان اور سمندر خان اس علاقہ کے خان رہے۔

سکھوں کا عہد

سکھوں نے ۱۸۱۸ء کے شروع سے میدانِ ہزارہ میں اپنے پاؤں جمانے شروع کئے۔ سب سے پہلے:

۱۔ سردار مکھنا سنگھ وجون سنگھ اس علاقہ کے سربراہ مقرر ہوئے۔ وہ خود توراولپنڈی میں رہتے تھے اور ان کی جانب سے بخشی لیکھراج مالیہ کے حصول کے لئے مقرر ہوا۔

۲۔ حکم سنگھ چمنی ۱۸۱۹ء میں حاکم ہزارہ و چھچھ مقرر ہوا۔ اس کا صدر مقام اٹک تھا۔ اس کے عہد میں تحصیل دار مکھن سنگھ نے موضع شاہ محمد میں گڑھی (قلعہ) دریائے دوڑ کے کنارے اور موضع سرائے صالح میں برلبِ سڑک جرنیلی بالمقابل موجودہ ہائی سکول کے قلعہ بنوائے۔ اب یہ دونوں قلعے معدوم ہو چکے ہیں۔

۳۔ سردار امر سنگھ مجیٹھیہ ۱۸۲۱ء میں حاکم ہوا۔

۴۔ سردار ہری سنگھ نلوہ ۱۸۲۲ء تا ۱۸۳۷ء حاکم ہزارہ رہا۔ ۱۸۲۷ء سے ۱۸۳۱ء تک مہان سنگھ اس کی جانب سے بطور نائب کام کرتا رہا۔ ان ایام میں سردار ہری سنگھ پنجاب کے دوسرے

علاقوں میں رہا۔

ہری سنگھ سے پہلے سکھ حاکم اور فوج موجودہ بنگلہ اسسٹنٹ کمشنر ہری پور کی جگہ ایک قلعہ میں رہتے تھے۔ اب اس کے احاطہ کی مغربی دیوار ہی اس قلعہ کا بقایا ہے۔ ہری سنگھ نے موجودہ قلعہ ہری پور اموسوم بہ کشن گڑھ (جس میں آج کل تحصیل و تھانہ کے دفاتر ہیں) ۱۸۲۲ء میں تعمیر کیا اور ساتھ ہی شہر ہری پور بھی بسایا۔

۵۔ سردار تیجا سنگھ ۱۸۳۷ء تا ۱۸۴۱ء حاکم ہزارہ رہا۔

۶۔ پیارا سنگھ ساکن موضع برہان (نزد حسن ابدال) ۱۸۴۱ء سے ۱۸۴۳ء تک حاکم رہا۔

۷۔ راجہ گلاب سنگھ ڈوگرہ بذریعہ اپنے نائب اربیل سنگھ ۱۸۴۳ء میں حاکم ہوا۔

۸۔ دیوان مولراج (یہ ملتان والا مولراج نہیں ہے) از طرف دربار لاہور ۱۸۴۳ء حاکم مقرر ہوا۔

۹۔ منشی بنوں۔ از طرف راجہ ہیرا سنگھ ۱۸۴۳ء میں چند ماہ کے لئے حاکم رہا۔

۱۰۔ دیوان مولراج (دوسری بار) ۱۸۴۴ء تا ۱۶ اپریل ۱۸۴۶ء تک حاکم رہا۔

۱۱۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کو ہزارہ کا ضلع بمعہ کشمیر دیا گیا اور اس کی جانب سے دیوان ہری چند ۲۲ مئی ۱۸۴۶ء تا کاتک (سرما) رہا۔

۱۲۔ سردار گلاب سنگھ بذریعہ قاضی نادر علی (ساکن موضع تلوکر۔ ہری پور) سرما ۱۸۴۶ء سے قابض رہا۔

۱۳۔ بخشی ہری سنگھ کاتک ۱۸۴۶ء تا ۱۸۴۷ء حاکم رہا۔

۱۴۔ سردار چتر سنگھ ناظم بمعہ میجر ایبٹ بطور مشیر اور سردار جھنڈا سنگھ نائب ناظم۔ یہ سکھ حکومت کے آخری حاکم ہزارہ تھے۔ اس کے بعد ۱۸۴۹ء میں میجر ایبٹ کی نگرانی میں اس ضلع میں انگریزی حکومت قائم ہو گئی۔

عہدِ انگریزی

۱۔ میجر جیمس ایبٹ ۱۸۴۹ء ۱۸۵۲ء تک اس ضلع کا ڈپٹی کمشنر رہا۔

۲۔ میجر ایچ۔ بی۔ ایڈورڈ مئی ۱۸۵۲ء تا ستمبر ۱۸۵۳ء۔ یہ بہت لائق انگریز افسر تھا۔

اسی نے میجر ایبٹ کی یاد میں ایبٹ آباد شہر کی بنیاد رکھی۔ ان کے بعد قابل ترین انگریز ڈپٹی کمشنر ہوتے رہے۔ جو سلطنت انگریزی کے معماران کی حیثیت رکھتے تھے۔ ۱۹۰۵ء تک کل ۶۷ انگریز ڈپٹی کمشنر ہوئے۔ ۱۹۰۵ء تا ۱۹۲۶ء کے ڈپٹی کمشنروں کے نام معلوم نہ ہو سکے۔

آخری انگریز ڈپٹی کمشنر میجر سینٹ جان نومبر ۱۹۴۶ء تا ۳ اکتوبر ۱۹۴۷ء تک رہا۔ اس کے بعد پاکستانی سول افسران اس ضلع میں بطور ڈپٹی کمشنر مقرر ہونے لگے۔

مختلف حکومتوں کے طرزِ حکمرانی کا جائزہ

زمانۂ قدیم میں ملکی خوانین و رؤساہی کے ذریعہ حکومت کا کاروبار چلایا جاتا تھا۔ اس کے معاملات سادہ تھے اور مسائل کا حل مقامی طور پر فوری ہو جاتا تھا۔ راعی و رعایا میں تعلق مخلصانہ تھا۔ حاکم اور محکوم میں موجودہ دور والے فاصلے نہ تھے۔ امن و امان کی صورت تسلی بخش تھی۔

مغلوں کی حکومت اسی طرز پر چلتی رہی۔ ان کی اطاعت ایسی مکمل تھی کہ کسی مؤرخ نے لکھا ہے کہ "مغلوں نے بادشاہی نہیں، بلکہ خدائی کی ہے"۔ ان کے بادشاہ، امرا اور حکام، مقامی خوانین و عوام کو دربارِ عام میں حاضر ہونے کا موقع دیتے تھے۔ ہر شخص اپنی عرض برملا، اور براہِ راست بادشاہ وقت سے کر سکتا تھا۔

ان کے بعد درانی آئے، چونکہ وہ افغانستان سے آئے اور ہزارہ میں افغان اقوام بھی پہلے سے موجود تھیں، لہٰذا ان کے حکام یہاں کے خوانین اور عوام سے شیر و شکر رہتے تھے۔ ان کے حکام کی آمد سے دو تین دن پہلے ان کے خیمہ و خرگاہ آجاتے تھے۔ آتش پز (باورچی) اور دیگر ملازمین مطبخ پہنچ جاتے۔ دیگ۔ دیگ برے اور دیگر اسباب طعام و خوراک، دنبے اور بکرے جمع کئے جاتے تھے۔ حاکم جب آجاتا تو مقامی خوانین و سفید پوش اشخاص کو مدعو کیا جاتا اور سب یک جا ایک دسترخوان پر جمع ہو کر خورد و نوش کرتے۔ جتنے دن حاکم رہتا یہی سلسلہ روز و شب جاری رہتا۔ محفلیں جمتیں۔ لوگوں سے تعلقات پختہ ہوتے۔ راعی و رعایا میں تعلق خاطر پیدا ہوتا۔ حکومت کا اثر و رسوخ بڑھتا۔

ان کے بعد سکھ آئے۔ ان کی طرزِ معاشرت، کھانا پینا تو الگ طرز کا تھا۔ لہٰذا درانیوں

کی طرح لوگوں کی دعوتِ عام میں شرکت نہ ہوتی تھی۔ لیکن ان کے حاکم مقامی خوانین و شرفاء کو انعام و اکرام سے اپنا لیتے تھے۔ سکھ حاکم بازو جُرّے سے شکار کھیلنے کے شوقین تھے اور خوانین ہزارہ بھی۔ شکار میں ان کے ساتھ یکجا ہوتے۔ سکھ حکام جب کسی پر خوش ہوتے تو گلے سے سونے کا ہار یا ہاتھ سے سونے کا کنگن اتار کر دے دیتے تھے۔

جب ان کا دور گزر گیا تو انگریز آیا۔ ان کے زمانہ میں پرانا نقشہ بدل گیا۔ حاکم و محکوم کے درمیان ایک دیوار کھنچ گئی۔ مقامی خوانین کے ساتھ نہ یہ ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھاتے، نہ ہی سونے کے کنگن یا مالا کا انعام دیتے۔ کہ وہ خود ایک پتلون (یا جانگیہ) اور کرتے میں ملبوس ہوتے۔ یہ اصلاً ایک بنیا قوم ہے۔ لہٰذا ان کا مطمعِ نظر بھی بنیا پن تھا۔ مشرقی اطوار شاہیت سے ان کو کوئی مناسبت نہ تھی۔ عوام سے ان کی دوری بہت زیادہ تھی۔ انہوں نے راعی و رعایا کے درمیان ایسی دیوار کھینچ دی کہ زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ پختہ تر ہوتی گئی۔ ان کا دور ختم ہوا تو ان کا نام و نشان بھی نہ رہا۔ لیکن ان کی یہ دیوار راعی و رعایا کے درمیان، اب تک موجود ہے۔ ان کے اس زہر نے پاکستان میں ایک مسموم فضاء پیدا کر دی۔ پاکستانی حاکم نخوت و تکبّر کے انداز سے عوام سے برتاؤ کرنے لگے اور انگریزی اطوار و سلوک اور زبان تک انہوں نے قائم کر رکھی ہے۔

سکھوں کے دورِ سلطنت کے حالات، حکمران خاندان کے افراد کے ذاتی حالات، ان کے اخلاقی طور طریقے اور ان کے نسب کے اختلاط پر گزشتہ اوراق میں روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا کہ رنجیت سنگھ یا اس کے اجداد صحیح النسب نہ تھے اور تقریباً ہر ایک نے اپنی ماں کو خود قتل کیا یا کرایا۔ عزیز و اقارب کو قتل و زہر خوردنی سے اپنے راستے سے ہٹایا۔ اس پس منظر میں ان کی سلطنت میں بدچلنی اور تخریب پسندی عام تھی۔ وہ ظلم زیادتی اور تخریب پسندی پر ہی عمل پیرا رہی۔ ہزارہ میں ان کی حکومت کے کم و بیش تیس سال، اہلِ ہزارہ کے لئے سخت ابتلاء کا دور تھا۔

انگریز مصنفین (جن کی کتابوں کا حوالہ گزشتہ اوراق میں دیا گیا) کے بیان کے مطابق سکھ سلطنت ایک خاندان کی سلطنت تھی اور وہ ملک کو اپنی ذاتی جائداد سمجھتے رہے اور لوگوں سے ظلم و جور کا سلوک کرتے رہے۔ بے قانونی اور زیادتی عام تھی۔

ان انگریز مصنفین کی رائے ممکن ہے، کہ کسی بیان میں نقطۂ اعتدال سے ہٹ گئی ہو۔ تاہم تاریخی واقعات میں ان کا جائزہ صحیح، مفصل اور باوزن ہے۔

عہد انگریزی کے اعلیٰ حکام صوبہ سرحد

چیف کمشنران

۱۔ سر ہیرلڈ ڈین ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۸ء تک۔

۲۔ سر جارج روس کیپل ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۹ء تک۔ یہ صاحب اثر و جلال چیف کمشنر ہو گزرا ہے۔ سیاست و سخاوت اس کے امتیازی وصف تھے۔ سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان کامزنی اور وہ اس کے دستِ راست تھے۔ اسی کے عہد میں اسلامیہ کالج پشاور کی بنیاد رکھی گئی۔

۳۔ سر ہملٹن گرانٹ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۱ء تک۔

۴۔ سر جان میفی ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۳ء تک۔

۵۔ سر نارمن بولٹن ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۰ء تک۔

۶۔ سر سٹورٹ پیرس ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۱ء تک۔ یہ ایک جابر، کم آمیز اور سخت گیر آدمی تھا۔ انگریز افسران اس سے ڈرتے تھے۔ نتھیا گلی کی پہاڑی سے گر کر مر گیا۔

۷۔ سر رالف گرفتھ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۷ء تک۔

اس کے بعد صوبہ سرحد کو گورنری کا صوبہ بنایا گیا۔

گورنرانِ سرحد

۱۔ سر رالف گرفتھ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۷ء تک۔

۲۔ سر جان کننگھم ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۶ء تک۔

۳۔ سر آلف کیرو ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۷ء تک۔

یہ صاحبِ علم، تجربہ کار اور منتظم گورنر تھا۔ اس نے تاریخ "پٹھان" لکھی، جو اعلیٰ درجہ کی تاریخی کتاب ہے۔

عہدِ پاکستان میں صوبہ سرحد کے گورنر

۱۔ سر جارج کننگھم ۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۸ء

۲۔ سر امبروز ڈنڈاس ۱۹۴۸ء تا ۱۹۴۹ء

۳۔ صاحبزادہ محمد خورشید ۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۰ء

۴۔ خان بہادر محمد ابراہیم خان۔ قائمقام جنوری، فروری ۱۹۵۰ء

۵۔ ابراہیم اسمٰعیل چندریگر ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۱ء

۶۔ خواجہ شہاب الدین ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۴ء

۷۔ خان قربان علی خان ۱۹۵۴ء تا ۱۹۵۵ء۔

وحدتِ مغربی پاکستان کے ٹوٹ جانے کے بعد سرحد کے گورنر۔

۱۔ لفٹیننٹ جنرل محمد اظہر

۲۔ ارباب سکندر خاں خلیل۔

۳۔ خان حیات محمد خاں شیر پاؤ۔

۴۔ خان محمد اسلم خاں خٹک ۱۵ر فروری ۱۹۷۳ء

۵۔ ریٹائرڈ میجر جنرل غواص ۲۳ر مئی ۱۹۷۴ء

۶۔ ریٹائرڈ میجر جنرل نصیر اللہ خان بابر۔ ۶ر جولائی ۱۹۷۷ء تک۔

۷۔ چیف جسٹس سرحد ہائی کورٹ عبدالحکیم خاں ۶ر جولائی ۱۹۷۷ء سے

پاکستان کے گورنر جنرل

۱۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء سے ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء تا وفات۔

۲۔ خواجہ ناظم الدین ۱۴ر ستمبر ۱۹۴۸ء سے ۱۷ر اکتوبر ۱۹۵۱ء تک۔

۳۔ ملک غلام محمد۔ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۵۱ء سے ۸ر اگست ۱۹۵۵ء تک۔

۴۔ اسکندر مرزا ۵ر اگست ۱۹۵۵ء قائمقام۔ ۵ر اکتوبر ۱۹۵۵ء سے مستقل تا ۲۳ر مارچ ۱۹۵۶ء

پاکستان کے صدر

۱۔ اسکندر مرزا ۲۳ر مارچ ۱۹۵۶ء سے ۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ء تک۔

انقلابِ حکومت (مارشل لاء) کے بعد صدر

۱۔ اسکندر مرزا ۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ء سے ۲۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ء تک۔

۲۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان ۲۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ء سے ۲۵ر مارچ ۱۹۶۹ء تک۔

۳۔ جنرل آغا محمد یحییٰ خان از ۲۵ر مارچ ۱۹۶۹ء سے ۲۰ر دسمبر ۱۹۷۱ء تک۔

۴۔ ذوالفقار علی بھٹو ۲۰ر دسمبر ۱۹۷۱ء بعد میں جولائی ۱۹۷۷ء تک وزیر اعظم۔

۵۔ فضل الٰہی چوہدری ء سے ۱۹۷۷ء

پاکستانی حکمرانوں کا عرصۂ اقتدار ـــــ ایک جھلک

پاکستان میں گزشتہ تیس برسوں میں کتنے حکمران برسرِ اقتدار آئے اور انہوں نے کتنا عرصہ ملک پر حکومت کی۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

سربراہ حکومت	عرصہ اقتدار	اقتدار سے علیحدگی کی وجہ
۱۔ لیاقت علی خان	اگست ۱۹۴۷ء ـــ اکتوبر ۱۹۵۱ء	(قتل کر دیے گئے۔)
۲۔ خواجہ ناظم الدین	اکتوبر ۱۹۵۱ء ـــ اپریل ۱۹۵۳ء	(برطرف کر دیے گئے)
۳۔ محمد علی بوگرہ	اپریل ۱۹۵۳ء ـــ اگست ۱۹۵۵ء	(مستعفی ہو گئے)
۴۔ چودھری محمد علی	اگست ۱۹۵۵ء ـــ ستمبر ۱۹۵۶ء	(مستعفی ہو گئے)
۵۔ حسین شہید سہروردی	ستمبر ۱۹۵۶ء ـــ اکتوبر ۱۹۵۷ء	(مستعفی ہو گئے)
۶۔ آئی۔ آئی۔ چندریگر	اکتوبر ۱۹۵۷ء ـــ دسمبر ۱۹۵۷ء	(مستعفی ہو گئے)
۷۔ ملک فیروز خان نون	دسمبر ۱۹۵۷ء ـــ اکتوبر ۱۹۵۸ء	(فوجی انقلاب کے نتیجے میں رخصت ہوئے)
۸۔ اسکندر مرزا۔	۲۳ر مارچ ۱۹۵۶ء کو صدر کے عہدے کا حلف اٹھایا ـــ اکتوبر ۱۹۵۸ء	" " " " "

۹- ایوب خان اکتوبر ۱۹۵۸ء ـــ مارچ ۱۹۶۹ء (فوجی انقلاب کے نتیجے میں رخصت ہوئے)

۱۰ یحییٰ خان مارچ ۱۹۶۹ء ـــ دسمبر ۱۹۷۱ء (اعصاب جواب دے گئے۔)

۱۱- ذوالفقار علی بھٹو دسمبر ۱۹۷۱ء ـــ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء (فوجی انقلاب کے نتیجے میں رخصت ہوئے)

۱۲- جنرل محمد ضیاء الحق ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو برسرِ اقتدار آئے۔

ہزارہ کی تاریخ پر اثر انداز حکومتیں

یہ وہی حکومتیں ہیں، جنہوں نے پاک و ہند کی تاریخ کو بدل ڈالا۔ اپنے اپنے وقت ان حکومتوں کے اثرات کم و بیش ہزارہ پر پڑتے رہے۔ اس باب میں اگر تحقیق کی جائے تو بڑی عبرت آموز تفاصیل معلوم ہو سکتی ہیں اور "ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت" کا منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ ان حکومتوں کی فہرست بمعہ سن ذیل میں درج کی جارہی ہیں۔

۱- خاندان غزنویہ (یہ ترک تھے) ۹۸۸ء سے ۱۱۸۶ء تک۔

۲- خاندانِ غوری (پٹھان) ۱۱۸۶ء سے ۱۲۰۶ء تک۔

۳- خاندان غلاماں (ترک) ۱۲۰۶ء سے ۱۲۹۰ء تک۔

۴- خاندان خلجی (پٹھان) ۱۲۹۰ء سے ۱۳۲۰ء تک۔

۵- خاندانِ تغلق (پٹھان) ۱۳۲۰ء سے ۱۴۱۴ء تک۔

۶- سادات- ۱۴۱۴ء سے ۱۴۵۰ء تک۔

۷ خاندان لودھی (پٹھان) ۱۴۵۰ء سے ۱۵۲۶ء تک۔

۸- مغل (ترک) ۱۵۲۶ء سے ۱۷۴۷ء تک۔

۹- سدوزئی (پٹھان- درانی) ۱۷۴۷ء سے ۱۸۱۸ء تک۔

۱۰- عہدِ سکھاں ۱۸۱۸ء سے ۱۸۴۹ء تک۔

۱۱- انگریز- ۱۸۴۹ء سے ۱۹۴۷ء تک۔

ہزارہ کی اقوام کی آمد: ترک، پٹھان اور سادات مختلف اقوام کے عہدِ حکومت سے وابستہ ہے، جس کی تصدیق مختلف اقوام کے حالات سے (جو بعد کے اوراق میں درج ہے) واضح ہو جاتی ہے۔

باب چہارم

سید احمد شہید علیہ الرحمۃ اور ان کی جماعت مجاہدین

سوانح حضرت سید احمد شہیدؒ پر مولانا غلام رسول مہر مرحوم کی کتاب "سیرت شہید" تحقیق و تفصیل کا شاہکار ہے۔ میری غرض صرف ان کی آمد ہزارہ کے متعلق معلومات کا تحریر کرنا ہے اور ان کی دعوت کے پس منظر کا مختصراً ذکر کرنا ہے اس عنوان پر دو مستند ماخذوں تک رسائی حاصل ہوئی۔

۱۔ اول تاریخ مہتاب سنگھ (دبیر سلطنت سکھان ہزارہ)

۲۔ سلطنت انگریزی کے سرکاری امتلہ جات خط و کتابت (خاص کر ۱۸۶۲ء سے ۱۸۷۵ء تک) جو انگریز افسران سرحد و افسرانِ ہند کے درمیان ہوتی رہی۔

سید احمد شہیدؒ کی زیر قیادت مجاہدین نے اس ضلع کی تاریخ پر کافی اثر ڈالا اور شمع حریت جلائی۔ مگر افسوس مسلمانوں نے اپنی بد نصیبی سے اس زریں موقع سے فائدہ نہ اٹھایا۔ اور اس چراغ سے روشنی حاصل نہ کی اور غلامی کی تاریکی کا دور لمبا ہو گیا۔ ورنہ پاکستان سو ڈیڑھ سو سال پہلے ہی بن جاتا اور اس کا دائرہ تمام برصغیر پر حاوی ہوتا۔ بہر حال سید احمد شہید علیہ الرحمۃ نے جہاد فی سبیل اللہ میں اپنی جان لٹا دی۔ آخر کار اس راہ میں شہادت سے ابدی مقام حاصل کر لیا۔ ؎

ثبت است بر جریدۂ عالم ، دوام ما

ایسے مجاہدین کے بارے میں مولانا ابو الکلام آزاد نے اپنے جریدہ "الہلال" میں تحریر فرمایا تھا:

"ایک چراغ سے ہزاروں چراغ روشن ہو جاتے ہیں۔ آگ کی ایک چنگاری بڑے بڑے آتش کدوں اور تنوروں کو شعلوں سے بھر دیتی ہے۔ ایک بیج صدہا شاخیں اور ہزاروں پھل پیدا کر دیتا ہے۔ بارانِ رحمتِ الٰہی کا ایک شاداب دن، پوری فصل کو سرسبز کر دینے کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔ موتی کا ایک بڑا دانہ، پورے ہار کی عزت بڑھا دیتا ہے۔ ہیرے کا ایک سو رخشندہ ٹکڑا، پورے تاج کے حسن و جمال کے لئے بس کرتا ہے۔ کیوڑے کا ایک درخت پورے باغ کے معطر ہونے کے لئے، گلاب کا ایک قیمتی پھول پورے ایوان و منزل کی رونق کے لئے اور بہ تمثیل سادہ تر، ایک چراغ پورے کمرے کی روشنی کے لئے کافی ہوتا ہے۔

یہی حال قوموں اور ملکوں کا بھی ہے۔ قوموں میں جب زندگی آتی ہے تو ہزاروں افراد کے ذریعہ نہیں، بلکہ سرچشمۂ حیات، ایک یا ایک سے زیادہ چند نفوس قلیلہ و عدیدہ میں ہوتا ہے۔ اس عالم کی زندگی قوموں سے ہے۔ مگر قوموں کی زندگی صرف اشخاص کے دم سے وابستہ ہے۔ سرزمین انسانیت میں جب ایک عمدہ بیج بارآور ہو کر سر اٹھاتا ہے تو اس کی صدہا شاخیں پھوٹتی ہیں اور ان میں ہزارہا تر و تازہ پھل لٹکنے لگتے ہیں۔ پس باغ کی اس سرزمین کی شادابی کے لئے بھی بہت سے خاردار اور بے ثمر جھاڑیوں اور درختوں کی ضرورت نہیں، بلکہ صرف ایک ہی درخت کی، ایک ہی انسان چاہیے، جو انسان ہو۔ اور ایک پوری قوم اور ایک پورے ملک کو زندہ کر دے۔ اس عالم کی رونق اقوام کے دم سے ہے، مگر اقوام کی زندگی، صرف اشخاص ہی کے دم سے وابستہ ہے۔ قومیں مرتی ہیں اور زندہ ہوتی ہیں لیکن ان کی موت و حیات کے یہی معنی ہیں۔۔۔۔۔

کہ پہلی صورت میں ان نفوس عالیہ سے خالی ہو جاتی ہیں، جن کے دم سے ان کی زندگی وابستہ تھی اور دوسری حالت میں ان کے اندر ایسے وجود قدسیہ موجود ہوتے ہیں جو اپنی زندگی کے سرچشمے سے پوری قوم کے کشتِ اقبال کو سرسبز و شاداب کر دیتے ہیں۔

کیا نہیں دیکھتے کہ کتنے آدمی ہیں جن کا مرنا قوموں کا مرنا ہوتا ہے اور کتنے ہیں جو اپنے ظہور کے اندر ایک پوری قوم اور ملک کی زندگی کو پوشیدہ رکھتے ہیں۔ ؎

قیس سا پھر کوئی اٹھا نہ بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

اسی طرح برصغیر پاک و ہند میں ایک ایسا ہی عبرت آموز اور غلام قوم کو زندگی عطا کرنے کا واقعہ سید احمد شہیدؒ اور ان کے مجاہدین رفقاء کا ظالم حکمرانوں کے مقابلہ میں شہید ہونے کا ہے جس کے تقریباً سو سال بعد یہ خونِ شہیداں رنگ لایا، اور جن علاقوں میں یہ خون بہا، ان ہی دونوں علاقوں وادیٔ سندھ اور مشرقی بنگال میں پاکستان بنا اور اسی نظریہ پر بنا جس پر عمل کرتے ہوتے ان شہداء نے اپنی جانیں قربان کردی تھیں۔

جہادِ آزادیٔ برصغیر کا پس منظر

حضرت مجدد الف ثانی سے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ تک تمام واقعات وحالات علمائے حق کا برصغیر میں کتاب وسنّت کی تبلیغ واشاعت اور غیرملکی آقاؤں کے خلاف جدوجہد کرنا اعلاء کلمۃ الحق کی تاریخ کا قلعہ گوالیار سے اسارتِ مالٹا اور اس کے بعد مقدمۂ کراچی وغیرہ ایک ہی مربوط زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں۔ جس میں کہیں الامام المحدث شاہ ولی اللہ دہلویؒ۔ ان کے صاحب زادگان والا تبار۔ اور اس خاندان کے پیروان حضرت سید احمد بریلویؒ اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نظر آتے ہیں تو کہیں سالارِ قافلہ عشق ومحبت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور ان کے خلفائے مجاز حضرت نانوتویؒ، حضرت گنگوہیؒ اور حضرت حافظ ضامن شہیدؒ جیسے مقدس، جانباز لوگ نظر آتے ہیں، کہیں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور ان کے جانشین مولانا حسین احمد مدنیؒ تو کہیں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نظر آتے ہیں یا حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ عبقری زمانہ امام انقلاب نظر آتے ہیں۔

یہ سب لوگ مندرجہ ذیل شعر کی صحیح تصویر تھے ؎

مقصدے از آسمان بالا ترے　　دلِ ستانے، دل ربائے، دلبرے

اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔

حضرت سید احمد شہیدؒ

حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد ہزارہ کے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے اس کے پس منظر کا بیان ضروری ہے۔ تاکہ حضرات علمأ کا احساس اور ان کی فراست مومنانہ کا اندازہ ہو سکے فرنگی اقوام (اقوامِ یورپ) کی ہندوستان پر قبضہ جمانے کی کوشش لودھی خاندان کے آخری فرمانروا ابراہیم لودھی کے وقت سے شروع ہوئی، جبکہ انہوں نے ہندوستان کے ساحل پر قبضہ جمانا شروع کر دیا۔

بعد میں اکبر بادشاہ کے وقت ولندیزیوں (اہلِ ہالینڈ) نے سورت (گجرات) میں فساد شروع کر دیا۔

اکبر بادشاہ نے یورش کی تو انہوں نے صلح کی درخواست کر دی، جو اس نے منظور کر لی۔ بالغ نظر اکبر کی سیاست دانی، ان کے مستقبل کے عزائم اور اسبابِ عروج کا اندازہ نہ کر سکی اور نہ ہی ان کے ظلم وفساد کے ازالہ کا بندوبست کر سکی۔ یہ صرف حضرت مجددؒ سرہندیؒ کی فراستِ مومنانہ ہی کر سکی۔

حضرت مجددؒ کے دورِ آخر ۱۶۲۵ء تک پرتگیز (پرتگالی)، ولندیز (اہلِ ہالینڈ) اور ڈینز (اہلِ ڈنمارک) سواحل ہندوستان پر پہنچ چکے تھے اور اپنی آمد کے جلوے دکھا چکے تھے۔ ان کے متعلق حضرت مجددؒ کی ان سے کراہت کا اندازہ ان کے متعلق "کافر فرنگ" کا لفظ استعمال کرنے سے (انہوں نے انگریز کا لفظ استعمال نہ فرمایا، کیونکہ انگریز اس وقت تک آئے بھی نہ تھے) حضرت مجددؒ کی پورے یورپ کے باشندوں سے تلخی و ترشی ظاہر کرتا ہے۔

بعد میں حضرت شیخ مولانا محمود حسنؒ کا واسطہ انگریز سے پڑا۔ لہٰذا ان کے قول میں لفظ انگریز اور اس قوم سے بے زاری کا عمل واضح رہا۔

ؑ۔ اخذ و تلخیص "تحریک شیخ الہند وریشمی خطوط کی سازش" مرتبہ مولانا سید محمد میاںؒ

حضرت شاہ ولی اللہ کے وقت میں جن عناصر نے تختِ دہلی کو بازی گاہ عروج و زوال بنا رکھا تھا۔ جہاں پچاس سال میں تخت اور تختہ کے دس تماشے ہو چکے تھے۔ وہ پوری دہلی بلکہ اس وقت کی پوری مملکت پر چھائے ہوئے تھے۔ کسی آواز کو بلند ہونے کا حق نہیں تھا۔ اگر وہ ان کی مرضی کے مطابق نہ ہو۔ عوام کی بیداری ان کے لئے پیغام فنا تھی۔

ان حالات میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے قرآن کا ترجمہ اس وقت کے دفتری زبان فارسی میں کیا تاکہ عوام بیدار ہوں۔ اس پر مولوی نما جاہ پرست لوگوں نے حضرت شاہ صاحب پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ خدا نے ان کی مدافعت کی جو تاریخ عالم میں عظمت پانے والوں کی حفاظت ہر ایسے موقعوں پر کرتا ہے۔

اس علَم بیداری کو ان کی وفات (۱۷۶۲ء) کے بعد ان کے سترہ سالہ فرزند اور خلیفہ ارشد شاہ عبدالعزیز نے اٹھایا۔

ہمہ گیر انقلاب کا جو تصور جو شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی وفات تک چند دماغوں کی مخصوص امانت تھا۔ شاہ عبدالعزیز کے دور میں وہ ملک کا خصوصاً مسلمانوں کا عام جذبہ بن چکا تھا اور ہزاروں نوجوان اس کے لئے زندگیاں وقف کر چکے تھے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل صاحبؒ شہید نے انہیں نوجوانوں کو منظم کیا اور ۱۸۲۶ء میں جو فوج راجستھان اور سندھ ہوتے ہوئے آزاد قبائل کا رخ کر رہی تھی وہ انھیں نوجوانوں کی فوج تھی۔

آزاد علاقہ میں حکومت کا قیام

۱۰ جنوری ۱۸۲۷ء سرحد میں ایک حکومت قائم کی گئی جس کے امیر سید احمد شہیدؒ بنائے گئے۔ حکومت قائم کرنے والی جماعت وہی تھی، وہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے اصول پر تربیت یافتہ تھی۔ انہیں اصول پر عوام کی تربیت، حکومت کا اہم ترین مقصد ہے چنانچہ انتظامیہ اور عدلیہ کے ساتھ محکمہ احتساب بھی قائم کیا گیا جو اخلاقی اصلاحات کو نافذ کرتا اور غلط کاریوں کی تادیب کرتا۔ ان تربیت یافتہ مجاہدین (رنگروٹوں) کا رنگ کیسا تھا، ان کے اخلاق کیسے تھے

ان کی حکومت کا طور طریق کس شان کا تھا اس کی پوری تصویر مولانا غلام رسول مہر مرحوم کی تصانیف میں دیکھی جا سکتی ہے۔

اس حکومت کی مقبولیت اور عوام کے رجحانات کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ابھی چند ہفتے گزرے تھے کہ "شیدو" (نزد اکوڑہ خٹک صوبہ سرحد) کے میدانِ جنگ میں سید احمد شہیدؒ کے ساتھ تقریباً ایک لاکھ کا ہجوم تھا۔

شکست اور وجہِ شکست

مگر یہ ہجوم جو اتنی تیزی سے بڑھا تھا، وہ غیر تربیت یافتہ تھا۔ اس کے بے پناہ جذبات کا کوئی خاص نصب العین نہیں تھا۔ ظاہر ہے خاص نصب العین رکھنے والی جماعت سے نبھاؤ مشکل تھا۔ ادھر مخالف طاقتیں جن کے ذرائع ہر لحاظ سے زیادہ تھے توڑ پر لگی ہوئی تھیں۔ چنانچہ جیسے ہی سید صاحب نے اپنے نصب العین کے موجب اخلاقی اور سماجی اصلاح کی طرف قدم بڑھایا۔ مخالف طاقتوں نے ان اصلاحات کو "وہابیت" کا نفرت انگیز عنوان دے کر عوام کو مجاہدین کی پوری جماعت سے برگشتہ کر دیا۔ پورے علاقے میں حکومت کا نظام تھا۔ جگہ جگہ اس کے ذمہ دار افسر تھے۔ عوام نے ہر مقام کے ذمہ داروں کو شہید کر دیا۔ سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء نے پھر طاقت فراہم کی تو سکھوں کی فوجوں سے مقابلہ ہو گیا نتیجہ شکست تھا۔ "بالاکوٹ" کے مقام پر بہت سے مجاہدین اور سید احمد شہیدؒ اور مولانا اسمٰعیلؒ میدانِ جنگ میں بروز جمعہ ۶ مئی ۱۸۳۱ء شہید کر دیئے گئے۔

دوبارہ تنظیم

یہ سربراہ شہید ہو گئے مگر بقول ڈاکٹر ہنٹر "یہ تحریک کسی رہنما کی موت و حیات سے بالکل مستغنی ہو گئی تھی۔ خود سید صاحب کی وفات کو بھی ان کے پرجوش حامیوں نے اپنے مسلک کی اشاعت کے لئے ایک مستقل ذریعہ بنا لیا تھا۔

اس تحریک کے جاری رہنے کا راز

اس تحریک میں کام کرنے والوں کو آپ رنگروٹ کہیں یا مجاہدین۔ ان میں جہاد کی حقیقی روح یعنی راہِ حق میں فنا ہونے کا شوق پوری طرح سرایت کر چکا تھا۔ سربراہ کی موت ان کو مایوس کر دیتی ہے جن کا نصب العین حصولِ منصب و اقتدار ہو۔ لیکن جو سرفروش راہِ حق میں فنا ہونے کے لئے کفن بردوش آیا ہے کہ جانِ آفرین کو جانِ عزیز کا گرانمایہ ہدیہ پیش کر دے۔ سربراہ کی شہادت

اس کے لئے نوائے نامرادی نہیں بلکہ نویدِ کامیابی ہوتی ہے۔ اس کا یہ یقین ہوتا ہے کہ موت فنا نہیں، بلکہ شاہراہِ حیات کا وہ پل ہے جو اسکو محبوبِ حقیقی تک پہنچا دیتا ہے۔

چنانچہ معرکہ بالاکوٹ کی شکست کے بعد مجاہدین کی بڑی جماعت کچھ عرصہ کے لئے منتشر ہوگئی۔ مگر اس شکست کے بعد چھوٹی چھوٹی جماعتیں بنیں۔ انہوں نے عَلَم جہاد بلند کر دیا اور گوریلا جنگ شروع کر دی۔ حضرت مولانا نصیر الدین دہلوی کے پہنچنے تک یہی سلسلہ رہا۔

دوبارہ تنظیم

حضرت مولانا سید نصیر الدین دہلوی خانوادہ شاہ ولی اللہ کے ایک نونہال تھے۔ جوانی ہی میں ذوقِ شہادت سے سرفراز تھے۔ جب ۱۸۲۵ء سید صاحب کا قافلہ سفرِ جہاد کی تیاری کر رہا تھا تو حضرت شاہ اسحٰق صاحب وعظ فرماتے تھے اور مولانا نصیر الدین صاحب مدرسہ کے دروازہ پر فراہمیِ زرِ اعانت میں مصروف رہتے تھے۔

آپ نے ۱۲ اپریل ۱۸۳۵ء کو جہاد کے لئے وطن عزیز دہلی سے ہجرت کی۔ ٹلیواڑہ، جے پور، ٹونک، اجمیر، جودھپور سے ہوتے ہوئے "آزاد مرکز" ستھانہ پہنچے۔ راستہ میں تبلیغ جہاد سے قدیم آشناؤں اور ناآشناؤں کو تحریک سے آشنا کرتے ہوئے یہ سفر پورا کیا۔ اس سفر میں قریباً چار سال لگ گئے۔ ۱۸۳۹ء کے اواخر یا ۱۸۴۰ء کے آغاز میں آپ ستھانہ پہنچے۔ ابھی سال بھی پورا نہ ہوا تھا کہ ۱۸۴۰ء میں آپ نے وفات پائی۔

اس طویل سفر میں جو مصلحتاً غیر معروف راستہ سے ہوا تھا۔ دعوتِ جہاد کے علاوہ جگہ جگہ مخالف طاقتوں سے جہاد کی نوبت بھی رہی۔

سکھوں سے مقابلہ

یہ بہت ہی تکلیف دہ اور دلخراش سانحہ ہے کہ حضرت سید صاحب کے مقابلہ پر سکھ آ گئے۔ حالانکہ انہوں نے رنجیت سنگھ کو خاص ایلچی کے ہاتھ خط بھیجا اور اس کی رفاقت چاہی کہ ہندوستان کو دشمنوں (انگریزوں) سے نکالنے میں مدد کرو۔ ہم تیرا ملک تیرے حوالے کر دیں گے۔ یہ دعوت منظور نہ ہو تو لڑائی کے سوا چارہ نہیں۔

علماء صادق پور

حضرت مولانا سید نصیر الدین دہلوی کی وفات کے بعد جماعت مجاہدین میں انتشار پیدا ہوا لیکن جلد ہی علماء صادق پور (پٹنہ) عَلَم جہاد اٹھائے

ہو ئے مجاہدین کے خیمے پشاور سے بہار و بنگال تک تان دیئے۔

۹۔ اکتوبر ۱۸۴۶ء بمطابق ۱۷ شوال ۱۲۶۲ھ کو مقام بالاکوٹ ان حضرات کی قیادت کا آغاز ہوا اور سربراہ حضرات کے اسماء گرامی اور ان کے سن وفات یہ ہیں۔

۱۔ حضرت مولانا ولایت علیؒ متوفی محرم ۱۲۶۹ھ، اکتوبر ۱۸۵۲ء وفات بعمر ۶۴ سال مدفن ستھانہ۔

۲۔ مولانا عنایت علی برادر خورد مولانا ولایت علی متوفی ۱۲۷۴ھ ۱۸۵۸ء بعارضہ بخار۔

۳۔ مولانا نوراللہ متوفی ۱۸۶۰ء بعارضہ بخار۔

۴۔ میر مقصود علی متوفی ۱۲۷۸ھ، ۱۸۶۲ء

ان اصحاب کے دورِ امارت کے متعلق ڈاکٹر ولیم ولسن ہنٹر کا ایک طویل نوٹ ہے۔ جس کا ملخص یہ ہے:

"۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک ہم علیحدہ علیحدہ سولہ جنگی مہمیں بھیجنے پر مجبور ہوئے جس سے باقاعدہ فوج کی تعداد ۳۵ ہزار ہو گئی تھی اور ۱۸۵۶ء، ۱۸۶۰ء تک ان فوجی مہموں کی گنتی بیس تک پہنچ گئی تھی اور باقاعدہ فوج کی تعداد ساٹھ ہزار تک ہو گئی تھی۔ بے قاعدہ فوج اور پولیس اس کے علاوہ تھی۔ بہر حال جب ہم نے اس مہلک گھاٹی کو چھوڑا تو اس کے چپہ چپہ پر برطانوی سپاہیوں کی قبریں تھیں۔"

جنگ امبیلہ (دسمبر ۱۸۶۳ء) میں ان مجاہدین کی بے جگری کی داد "ایڈجوٹنٹ جنرل" نے اپنے مراسلہ بنام سکرٹری گورنمنٹ پنجاب مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۸۶۳ء ان الفاظ میں دی۔

"تمام مذہبی تعصبات میں مسلمانوں کا مذہبی تعصب نہایت پرجوش اور بہت تند و تیز ہے"

۵۔ مولانا عبداللہ صادق پوری فرزند اکبر مولانا ولایت علی صاحب نے تقریباً چالیس سال تک علم جہاد بلند رکھا۔ آپ نے ۲۷ شعبان ۱۳۲۰ھ، ۲۹ نومبر ۱۹۰۲ء میں وفات پائی۔

۶۔ ان کے بعد ان کے برادر خورد مولانا عبدالکریم کو یہ خدمت سپرد ہوئی۔ ۲۵ ربیع الاول ۱۰ فروری ۱۹۱۵ء بہ مقام اسمسٹ ان کی وفات ہوئی۔

۷۔ ان کے بعد عبداللہ صاحب کے پوتے نعمت اللہ امیر مقرر ہوئے اور ان کی شہادت ۲۹ شعبان ۱۳۳۹ھ / ۴ مئی ۱۹۲۱ء بروز یک شنبہ ہوئی۔ ان کے بعد مولانا عبداللہ صاحب کے دوسرے پوتے رحمت اللہ غازی امیر مقرر ہوئے۔

اہلِ یورپ کا غلبہ

یہ آگ جس کی لپیٹ میں تمام دنیا آگئی ہے اس کا تنور سفید فام یورپ ہے۔ مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے چشمِ بصیرت سے اس کا مشاہدہ کر لیا تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے نظریات پر اگر حکومت قائم ہوجاتی تو وہ اس آگ کی لپٹوں کو روک سکتی تھی۔ ان کے جانشینوں نے آگ بجھانے کی کوشش کو اپنا فرض سمجھا۔

یہ ہے خلاصہ ان فداکارانِ حق کی کوششوں کا جس کی آخری کڑی تحریک شیخ الہند کا جسے ریشمی رومال والی تحریک کہا جاتا ہے۔

(ماخوذ و تلخیص تحریک شیخ الہند، ریشمی خطوط کی سازش، مرتبہ مولانا سید محمد میاںؒ)

فٹ نوٹ:

حضرت شاہ ولی اللہ کے سیاسی و اقتصادی اصول

حضرت شاہ ولی اللہ کی پیدائش ۱۷۰۲ء ہے اور شاہ عالمگیر اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء یعنی مسلمانانِ ہند کے زوال کی تاریخ۔

حضرت شاہ ولی اللہ ۱۷۳۰ء میں حجاز تشریف لے گئے۔ دو سال وہاں رہے۔

واپسی پر آپ نے اپنے غور و فکر کے بعد فیصلہ کیا کہ ملوکیت و شاہ پرستی کا دور ختم ہوگیا ہے۔ اس سے اب کوئی فائدہ نہیں اور ——— ہر ایک نظام کہنہ کو شکست دینا اور اس میں انقلاب پیدا کر دینا وقت کی ضرورت ہے۔ اسی ضرورت کی بناء پر اپنی تصانیف خاص کر حجۃ البالغہ میں اپنے نظریات اور اصول کی تلقین شروع کر دی۔

۱۔ دولت کی اصل بنیاد محنت ہے۔ محنت اور کاشت کار قوت کاسبہ ہیں۔ باہمی تعاون

مدنیت (شہریت) کی روح رواں ہے۔ جب تک کوئی شخص ملک اور قوم کے لئے کام نہ کرے ملک کی دولت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔

خاندان ولی اللّٰہی

دلی میں اسلامی حکومت کا آفتاب جب ڈوب رہا تھا تو اسی مطلع سے اسلام کا ایک اور آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ یہ شاہ ولی اللہ دہلوی کا خانوادہ تھا۔

سچ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی پیش گوئی کے مطابق اس کے بعد جس کو ملا اور جو کچھ ملا، اسی دروازہ سے ملا اور جو کچھ رد بدعات کا ولولہ، ترجمہ قرآن پاک کا ذوق وصحاح ستہ کا درس، شاہ اسمٰعیل اور سید احمد شہید بریلویؒ کا جذبۂ جہاد و فرقِ باطلہ کی تردید کا شوق، دیوبند تحریک۔ ان میں سے کون سی چیز ہے، جس کا سررشتہ اس مرکز سے وابستہ نہیں ؎

ایں سلسلۂ طلائے تاب است

ایں خانہ، ہمہ آفتاب است

آغاز تحریک جہاد

اٹھارویں صدی عیسوی میں انگریزوں کی ہوسِ ملک گیری کھل کر سامنے آئی مغل حکومت کی کمزوری کی وجہ سے انگریزوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ جنگ پلاسی اور جنگ بکسر کے بعد تو ان کے اقتدار و استیلاء کا سیلاب پورے زور کے ساتھ بڑھا۔ تا آنکہ ۱۸۰۳ء میں انہوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا اور تھوڑی ہی مدت میں ملک کے دوسرے بڑے بڑے حصوں پر قابض ہو گئے۔

دہلی پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد حضرت شاہ عبد العزیزؒ (ف ۱۲۳۹ھ، ۱۸۲۴ء) نے دار الحرب کا فتویٰ مرتب کیا اور اس فتویٰ سے ملک کے دوسرے علمائے نے بھی اتفاق ظاہر کیا۔ یہاں تک کہ یہ آواز دہلی سے ٹھٹھہ (سندھ) تک پہنچی۔ اس سے شاہ عبد العزیز کی سیاسی بیداری اور افکار کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی زاویۂ نظر کے تحت جماعتِ مجاہدین نے حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی زیر امارت و قیادت ملک سے غیر ملکی اقتدار کو نیست و نابود

کرنے کی کوشش کی۔

اس تحریک کی مرکزی شخصیت سید احمد شہیدؒ تھے اور ان کے رفقائے نامدار سے سید اسمٰعیل شہیدؒ ہر دو میدان بالاکوٹ میں ۱۸۳۱ء میں شہید ہوئے۔

حضرت سید احمد شہید۔ جہاد کے لئے روانگی

آپ اپنے وطن سے ۱۸۲۵ء میں جہاد کے لئے براہ راجپوتانہ، مارواڑ، سندھ، بلوچستان، سرحد افغانستان پر پہنچے۔ وہاں سے کابل گئے۔ وہاں سے پشاور آئے۔ تین روز پشاور ٹھہر کر ہشت نگر (چارسدہ) چلے گئے اور جہاد کی تبلیغ شروع کی۔ وہاں سے خویشگی اور پھر نوشہرہ آئے۔ جہاں آنے سے پہلے آپ تورڈھیر گئے اور وہاں رہنا پسند کیا۔ اخون صاحب سوات اور ملا صاحب کوٹھہ ان کے مرید ہوئے۔ اس علاقہ کے لوگوں نے عشر دینا منظور کیا۔ سید اکبر ساکن ستھانہ بھی حاضر ہو کر مرید ہوا۔

ہزارہ میں جو لوگ حکومتِ سکھاں سے باغی ہو جاتے، دریائے سندھ سے پار جا کر آپ کی بیعت کر لیتے تھے۔ مثلاً نواب خان تنولی کا والد سربلند خان اور صالح محمد مشوانی والدِ سید غلام ساکن سری کوٹ۔

نوشہرہ سے آپ نے موسمِ بہار ۱۸۲۷ء میں دربار لاہور کو شرعی دستور و حکم کے مطابق یہ اعلام نامہ تحریر فرمایا۔

"۱۔ یا تو اسلام قبول کرو، جس سے بھائی اور مساوی ہو جاوگے۔ لیکن اس میں کوئی جبر نہیں۔

۲۔ یا ہماری اطاعت اختیار کر کے جزیہ دینا قبول کرو۔ اس وقت ہم اپنی جان و مال کی طرح تمہاری جان و مال کی حفاظت کریں گے۔

۳۔ آخری بات یہ کہ اگر تم کو دونوں باتیں منظور نہیں، تو لڑنے کیلئے تیار ہو جاؤ۔ مگر یاد رکھو کہ سارا یاغستان اور ملکِ ہندوستان ہمارے ساتھ ہے اور تم کو شراب کی محبت اتنی نہ ہوگی، جتنی کہ ہم کو شہادت کی ہے۔"

اس کے بعد ان جنگوں کا آغاز ہوا جو سرحد کے میدانوں میں لڑی گئیں اور جو تاریخ کے صفحات پر ثبت ہو چکی ہیں ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

چونکہ میرا مقصد تاریخ ہزارہ لکھنے کا ہے، لہٰذا ان جنگوں کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا جو بیرونِ ہزارہ لڑی گئیں۔ لیکن ہنٹر (HUNTER) کا یہ بیان ان کے جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت کے اظہار کے لئے ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔

"اسی دوران مذہبی دیوانوں نے سرحدی قبائل کو انگریزی حکومت کے خلاف متواتر اکسائے رکھا۔ ایک ہی بات سے حالات کا بڑی حد تک اندازہ ہو جائے گا۔ یعنی ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک ہم علٰحدہ علٰحدہ سولہ جنگی مہمیں بھیجنے پر مجبور ہوئے۔ جس سے باقاعدہ فوج کی تعداد ۳۵ ہزار ہو گئی تھی اور ۱۸۵۶ء، ۱۸۶۰ء تک ان فوجی مہموں کی گنتی بیس تک پہنچ گئی تھی اور باقاعدہ فوج کی تعداد ساٹھ ہزار ہو گئی تھی"

یہی شہرۂ آفاق انگریز تاریخ نویس مسٹر ہنٹر انگریزی فوج کی پسپائی اور مجاہدین آزادی کی فتح کے متعلق لکھتا ہے:

"بہر حال جب ہم نے اس مہلک گھاٹی کو چھوڑا تو اس کے چپہ چپہ پر برطانوی سپاہیوں کی قبریں موجود تھیں"

ہزارہ میں حضرت شہید کی آمد، جنگوں کے حالات اور آخر کار شہادت کا مفصل حال کا ایک باب (عہدِ سکھاں) میں از قلم مہتاب سنگھ لکھا جا چکا ہے جو چشم دید اور عصری تاریخ ہے ان کے جانشینوں نے جو کارنامے اس ضلع میں انجام دئیے ان کا ذکر بھی کروں گا۔

حضرت سید احمد شہید کی شہادت (۶ مئی ۱۸۳۱ء) کے بعد بقیہ مجاہدین، سید صاحب کے اہل و عیال کو ستھانہ واپس لائے۔ یہاں سے وہ سب ٹونک چلے گئے۔ ٹونک کا والی امیر خان پٹھان، بنیر (علاقہ سوات) کا رہنے والا تھا جس نے اپنے زورِ بازو سے ٹونک کی ریاست بنائی۔ یہ حضرت سید صاحب کا معتقد تھا۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کے خلفاء حضرت کی شہادت کے بعد اس تحریک مجاہدین کی قیادت صادق پور (پٹنہ) مولانا ولایت علی (ف ۱۸۵۲ء) اور مولانا عنایت (ف اپریل ۱۸۵۸ء) نے سنبھالی - یہ تحریک ابتداً سکھوں کے خلاف شروع ہوئی - جب ۱۸۴۹ء میں پورے پنجاب پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو انگریزوں سے مقابلہ شروع ہوگیا - سرحدی جھڑپیں جاری رہیں - سرحد کے جہاد کے لئے مجاہدین، رقوم اور سامان اندرونِ ملک سے آتا تھا - بنگال و مدراس سے سرحد تک ایک سلسلہ بندھا ہوا تھا صادق پور اور تھانیسر اس تحریک کے خاص مقامات تھے -

۱۸۶۳ء میں امبیلہ (AMBEYZA) کی لڑائی میں انگریزوں کو منہ کی کھانی پڑی - اس پر جنرل چیمبرلین سپہ سالار زخمی ہوگیا -

اب انگریزی حکومت کو مجاہدین کی طاقت اور منظم تحریک کا اندازہ ہوا - لہٰذا حکومت نے باقاعدہ اور منظم منصوبے کے تحت مجاہدین کی تحریک پر توجہ کی اور ان کے خلاف مستقل مہم شروع کردی -

انبالہ (۱۸۶۴ء)، پٹنہ (۱۸۶۵ء) مالدہ (۱۸۷۰ء) راج محل (۱۸۷۰ء) اور پٹنہ (۱۸۷۱ء بار دوم) میں بہت سے علماً، تجار اور مبلغین پر بغاوت اور سازش کے الزام میں مقدمے چلائے گئے - ان کو "وہابی" کے نام سے بدنام کیا گیا - انگریزوں نے خود مسلمانوں میں سے ایک ایسا گروہ پیدا کردیا جس نے ان کے خلاف اتہامات و نفرت کا ایک طوفان کھڑا کردیا - مساجد کے دروازے ان پر بند کر دیئے گئے - معاشرتی طور پر ان کی تضحیک کی گئی -

اس تحریک آزادی کے خاص اکابر مولانا احمد اللہ صادق پوری (ف ۱۸۸۱ء) مولوی یحییٰ علی صادق پوری (ف ۱۸۶۸ء) مولوی عبدالرحیم صادق پوری (ف ۱۹۲۲ء) اور مولوی محمد جعفر تھانیسری (ف ۱۹۰۵ء) وغیرہ کو حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی - "وہابی" اور "باغی" مترادف الفاظ قرار پائے

داستانِ مجاہدین سرحد پر تحقیقی نظر ماخذ و اقتباس از مضمون "کوہستان سیاہ کے مجاہدین" از قلم کپتان محمد حامد صاحب پروفیسر کاکول اکیڈیمی -

۱- ۱۸۳۱ء میں سانحہ بالاکوٹ پیش آیا۔

۲- ۱۸۵۷ء میں تحریک آزادئ ہند کا ظہور ہوا۔

۳- ۱۸۶۳ء میں جنگ امبیلہ (حد سوات پر) پیش آئی۔ جس میں انگریزی فوج کا کمانڈر جنرل چیمبرلین زخمی ہوا اور ایک ہزار کے قریب انگریزی سپاہ تہ تیغ ہوئی۔ کوہستان سیاہ (ہزارہ کی شمالی سرحد پر) مجاہدین کا مضبوط دفاعی حصار تھا۔ اور اس کا مرکز مجاہدین کی چھاؤنی تھی۔ اور مجاہدین کا ہیڈ کوارٹر بھی۔ یہ ایسا کیمپ تھا، جہاں سے مختلف جگہوں پر چھاپے مارے جا سکتے تھے۔

مجاہدین کی سرگرمیاں

جماعت مجاہدین کے رہنماؤں کی شہادت کے بعد ان میں کسی حد تک انتشار پیدا ہو چکا تھا۔ لہٰذا بڑے پیمانے پر کوئی لشکر سامنے نہیں لا سکتے تھے۔ ان کے وسائل بھی محدود تھے۔ لیکن اس کے باوجود کسی نہ کسی طرح اپنی کوششوں میں مصروف رہے۔ ان میں شکست خوردہ ذہنیت یا انفعالیت قطعاً پیدا نہیں ہوئی اور بنگال سے لے کر سرحد تک روپوں کی تھیلیاں برابر پہنچتی رہیں۔ بنگال سے مجاہدین منزل بہ منزل مرکز میں پہنچتے رہے۔ یہاں ان کی فوجی تربیت ہوتی اور جلد ہی میدانِ جنگ میں اپنے جوہر دکھانے کے قابل ہو جاتے تھے۔ شروع سے ہی بنگال ان مجاہدین کی بھرتی کا علاقہ رہا۔ بنگال میں جن علاقوں میں نرینہ اولاد نہ ہوتی تھی وہ منت مانتے تھے کہ اولاد نرینہ ہونے پر وہ اسے مجاہدین کے لئے وقف کر دیں گے۔ ان بچوں کو معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے فرنگیوں کے خلاف جہاد کرنا ہے۔

وہ مختلف مدارس میں تعلیم حاصل کرتے اور بالآخر یہی مدرسے اسے منزل بہ منزل سرحد تک پہنچانے کے ضامن ہوتے۔ یہ مدرسے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ، تحریک کے ڈاک بنگلوں کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ گوریلہ جنگ کی اصطلاح میں یہ خفیہ پناہ گاہیں تھیں، جو کہ دشمن کے علاقے میں موجود ہونے کے باوجود اس کی دسترس سے باہر تھیں۔ انہی ذریعوں سے اشرفیوں کی تھیلیاں اور ہنڈیاں سرحد پر پہنچتی تھیں۔ یہ ہنڈیاں ابتدائی دور کے کراس چیک کی حیثیت رکھتی تھیں۔

ماہ بہ ماہ، سال بہ سال تھیلیاں اور ریکروٹ ستھانہ کی فوجی چھاؤنی میں پہنچا کرتے تھے۔

مجاہدین کا طرزِ جنگ

اگرچہ ۱۸۶۳ء میں اس تحریک کے رہنما مولانا عبداللہ کی امارت میں امبیلہ کے مقام پر انگریزوں کے ایک بہت بڑے لشکر سے مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ لیکن عام طور پر مجاہدین کا طریقِ جنگ گوریلہ لڑائی ہی کار رہتا تھا۔

انگریز وقائع نگاروں کے ترتیب کردہ واقعات بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ اگرچہ انگریزوں نے ہزارہ اور سرحد کے علاقے سکھوں سے لے لئے تھے، لیکن وقائع نگاروں کے قول کے مطابق ان تمام علاقوں میں امن وامان کی صورتِ حال تسلی بخش نہ تھی۔ مجاہدین نے انگریزوں کے علاقوں پر پے در پے حملے کر کے ان کا سکھ چین غارت کر رکھا تھا۔ ایک بار راولپنڈی سے چند میل دور سرحد کی جانب ایک فوجی چوکی پر شبخون مارا گیا اور مجاہدین نے تمام فوجی چوکی غارت کر دی۔ یہ واقعات اگر اکا دکا ہوتے تو خیر تھی۔ لیکن انگریزوں کو تشویش اس بات کی تھی، کہ یہ اکثر و بیش آتے رہتے تھے اور ویسے بھی ان کی سرحدوں پر ایک مستقل خطرے کا منڈلاتے رہنا، ان کے وقار اور ساکھ کا مسئلہ بن گیا تھا۔

مجاہدین کی سرگرمیوں کا نشانہ

ستھانہ میں موجود مجاہدین کی گوریلہ سرگرمیوں کا نشانہ انگریزوں کے قافلہ ہائے رسد، ہندو تاجر اور ایسے مسلمان بنتے تھے جو انگریزی علاقے میں رہ کر مجاہدین کے خلاف جاسوسی کیا کرتے تھے۔ مجاہدین انتہائی برق رفتاری سے شبخون مارتے اور راتوں رات واپس اپنے مرکز (BASE) پر پہنچ جایا کرتے تھے ان کے خلاف کوئی کارروائی کرنا انتہائی دشوار تھا۔ ان کی پناہ گاہ علاقہ کوہستان سیاہ اور اس کے ملحق علاقے، جن پر انگریزوں کا کوئی عمل دخل نہ تھا، ایک محفوظ قلعے کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس علاقے کے بلند و بالا پہاڑ، گہرے ندی نالے اور گھنے جنگل، انگریزوں کے لئے خاصی مشکلات پیدا کئے ہوئے تھے۔ ۱۸۶۳ء کی ناکامی کے بعد عرصہ تک انگریز اس علاقے میں قدم نہیں رکھ سکے۔

امبیلہ کی جنگ کے اختتام پر مقامی افراد کی حفاظت میں، انگریزی فوج کا ایک دستہ ملکا (مجاہدین کا گاؤں) کے قریب چند چھپروں کو آگ لگا کر واپس آگیا تھا۔ جس کو انہوں نے

ان الفاظ میں تحریر کیا:

"ہم نے مجاہدین کے مرکز اور ان کی تمام رہائش گاہوں کو مسمار کر کے آگ لگادی ہے اور ان کو عبرت ناک سزا دی ہے۔

وائسرائے اپنی رپورٹوں میں ملکہ معظمہ اور اس کی کونسل کو جو روزنامچے بھیجتے، ان میں تحریر ہوتا کہ مجاہدین کو بالکل ختم کیا جاچکا ہے اور دوسری طرف آئے دن چھاپے پڑتے رہتے تھے۔

مجاہدین کو ختم کرنے کا منصوبہ

آخر کار انگریزوں نے مجاہدین کی فوجی قوت کو بالکل ختم کر دینے کے خیال سے بڑی تعداد میں لشکر کشی کا فیصلہ کر لیا۔

۱۸۰۸ء میں میجر جنرل میکوین کی سرکردگی میں ہزارہ فیلڈ فورس کے نام سے ایک بڑا لشکر ترتیب دیا گیا۔ اس کی تعداد بارہ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اس کے علاوہ تین سو سپاہی خیبر رائفلز جس کی قیادت میجر محمد اسلم خان (المعروف بہ کرنل اسلم خان جو جنرل سر حسام الدین مرحوم ساکن پشاور کے والد تھے)، کے سپرد تھی۔ اس فوج کے ہمراہ مہاراجہ کشمیر نے بھی دو پیادہ رجمنٹیں اور دو توپیں بھجوادی تھیں۔

سرحد کی جنگوں، امبیلہ کی جنگ کے علاوہ شاید ہی کہیں اتنی بڑی تعداد میں برطانوی سپاہ میدان میں آئی ہو۔ اس سے مجاہدین کی قوت اور ان کی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے انگریزوں کے دل میں کتنی دہشت بٹھا رکھی تھی۔ لیکن اتنی بڑی فوج کے باوجود کوئی فیصلہ کن نتیجہ نہ نکل سکا اور مجاہدین کے مراکز انگریزوں کے قبضے میں نہ آسکے اور ان کی سرگرمیاں حسب معمول جاری رہیں۔

حضرت سید احمد شاہؒ کی ہزارہ میں آمد اور شہادت پر تفصیل سے ذکر ایک گزشتہ باب سکھوں کے عہد حکومت کے حالات میں کیا جاچکا ہے۔

اس مجاہدانہ کارنامے کی عام تاریخ لوگوں کو بس یہیں تک معلوم ہے کہ ان مجاہدین نے سرحد پار کر کے ہزارہ میں آکر سکھوں سے مقابلہ کیا اور آخر کار اس ضلع کے کوہستانی علاقہ وادی کاغان کے جنوبی دہانے پر بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔

بادی النظر میں یہ تاریخ کا ایک معمولی سا واقعہ نظر آتا ہے کہ کچھ خانقاہ نشین مسند ارشاد

سے اٹھ کر جہاد کے میدان میں اتر آئے اور اپنے ہم مذہبوں اور اپنے مذہب کی سربلندی کی عزت و آبرو کی خاطر وقت کی ایک قوت سے ٹکر لی اور ناکام رہے۔ لیکن اس ناتمام کوشش کے اثرات اس وقت تک برصغیر پاک و ہند کی سیاسی زندگی پر چھائے ہوئے ہیں۔

حضرت سید احمد شہیدؒ نے اپنے اخلاص عمل سے اپنے عقیدت مندوں کے دلوں میں ایسی جگہ حاصل کر لی تھی کہ بہتوں کو ان کی وفات کا یقین تک نہ آتا تھا۔ ایک مدت تک یہی خیال رہا کہ آپ مصلحتاً روپوش ہو گئے ہیں اور مناسب وقت پر ظاہر ہوں گے۔

مجاہدین نے اپنے خون سے جو شمع روشن کی وہ ہماری سیاسی زندگی کو مسلسل نور عطا کرتی رہتی ہے۔ وہ مجاہدین خواہ خلفاء حضرت سید احمدؒ کا گروہ ہوں جو سرحد میں جہاد کرتا رہا، یا علمائے صادق پور ہوں یا علمائے دیوبند کی ۱۸۵۷ء کی تحریک ہو یا تحریک پاکستان وغیرہ، ان سب کا محور یہی شہید بالاکوٹ ہے۔

شہدائے بالاکوٹ کی تحریک اس برعظیم میں مظلوموں کی دادرسی اور حق کی حمایت میں پہلی عوامی تحریک تھی۔ بعد کی ہماری ہر سیاسی سعی میں شہدائے بالاکوٹ کا خون جھلک رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سانحہ کے چالیس برس بعد بھی سیاسی ملزم پھانسی کی کوٹھڑیوں کے روشن دانوں میں سے حضرت سید احمد شہید کی راہ دیکھا کرتے تھے اور ان کے اشتیاق و انتظار میں نہایت درد سے میر دردؔ کے یہ اشعار پڑھتے رہتے تھے ؎

اتنا پیغام درد کہنا، جب صبا، کوئے یار میں گزرے
کون سی رات آپ آئیں گے، دن بہت انتظار میں گزرے

یہ حقیقت ہے کہ شہید نہیں مرتے بلکہ وہ زندہ جاوید ہستی رکھتے ہیں۔ قرآن حکیم فرماتا ہے "جو لوگ اللہ کے راستے میں مارے گئے، ان کو مردہ ہونے کا گمان مت کرو۔ بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے اللہ کے ہاں سے رزق دیئے جاتے ہیں"۔

سید شہیدؒ اور ان کے خلفاء کی زندگی، ایک نظر میں	عمر شریف ۱۷۸۶ء - ۱۸۳۱ء حج ۱۸۲۲ - ۱۸۲۴ء - دوران حج

ملاقات۔ محمد بن عبدالوہاب کے خلفاء، محمد بن علی سنوسی، الفرا امام بنجل د جو علاقہ سماٹرا میں

ڈچ حکومت کے خلاف جنگ آزما تھے)، مجاہد اعظم مشرقی پاکستان ۔ تیتومیر۔

جہادِ آزادی کا اعلان ۔ سرحد میں مرکز کے قیام اور امارت سید شہیدؒ دسمبر ۱۸۲۶ء، آزاد اسلامی ریاست کا اعلان فروری ۱۸۲۷ء۔

حد مملکت ۔ پشاور کی فتح کے بعد از پشاور تا امب (ہزارہ)

شہادت : معرکہ بالاکوٹ (ہزارہ)، سکھوں کے خلاف ۶ مئی ۱۸۳۱ء

خلفاء سید شہید کے معرکے ۔ ۱۸۴۹ء سکھوں کی سلطنت کے خاتمہ پر انگریزی حکومت سے مقابلہ شروع ہوا۔

انگریزی فوج (دیسی عنصر) میں مجاہدین کا اثر و رسوخ ۔ ۱۸۳۹ء میں سکندر آباد (دکن)، ناگ پور کی افواج میں ظاہر ہوا۔ ۱۸۴۵ء دنیا پور و دیگر چھاؤنی ہائے صوبجات متحدہ و بہار میں پھر ۱۸۵۲ء میں راولپنڈی کی فوج اور شروع ، ۱۸۵۰ء پشاور ۶۴ اور مردان، نوشہرہ میں ۵۵ ہندوستانی پیادہ افواج نے بغاوت کر کے مجاہدین کے ساتھ منگل تھانہ (مہابن) جا ملے۔ سید شہید کے جہاد کی تحریک کا سلسلہ تحریک آزادی ہند، ۱۸۵۷ء سے جا ملتا ہے۔

مجاہدین کا نظام رُسل و رسائل | بہت خفیہ اور راز دارانہ تھا اور نقل و حرکت مختلف خفیہ راستوں سے ہوتی تھی اور دشمن کے دو ہزار میل کے علاقہ سے ہوتی تھی ۔ نامہ و پیام خفیہ لغت میں ہوتا تھا، جس کی تصدیق، مجاہدین کے مقدمات ۱۸۶۴ء ۔ ۱۸۷۱ء سے ہوتی ہے۔

مالیات | تمام مدات مندرجہ ذیل ٹیکس سے بذریعہ سفراء جمع ہوتا تھا۔

ا۔ تمام مسلمان ریاستوں خاص کر دکن سے ۔

ب ۔ غریب عوام سے بذریعہ مٹھیا (ایک مٹھیا چاول)

ج ۔ محکوم علاقہ سے زکوٰۃ، خراج اور عشر۔

د۔ مالِ غنیمت، دشمن کے علاقہ سے ۔

نظامِ فوج | مجاہدین سمع و اطاعت کا مجسمہ ہوتے تھے ۔ جذبہ جہاد کی لگن نے ان کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار (بنیان مرصوص)، بنا دیا تھا ۔ سید شہیدؒ کی زندگی میں بھرتی

کا مرکز دہلی تھا۔ ان کی شہادت کے بعد پٹنہ ہوا۔ تربیت کا خاص انتظام تھا۔ امیر و مجاہدین صوبہ متحدہ بہار اور بنگال سے تھے۔ بعد میں پنجابی، قندھاری اور باشندگان نواکھالی، پبڑہ اور بوگرہ (اضلاع مشرقی پاکستان) سے بھی شامل ہوئے۔

فوجی تنظیم ضلع وار آبادی پر تھی۔ ان کا اپنا افسر ہوتا تھا۔ یہ سب افسر امام (امیر) کے ماتحت ہوتے تھے۔

مجاہدین اور اسلحہ جات یہ سب ہتھیار معمولی قسم کے تھے۔ مثلاً ٹوپی دار، توڑے دار، اور چقماق والی بندوقیں اور تلواریں، دشمن سے چھینا ہوا ایک توپ خانہ بھی تھا۔ آخر میں مجاہدین نے دھاتوں کے ڈھالنے کا اور بارود بنانے کا کارخانہ ملکا میں بنالیا تھا۔ جس کو انگریزوں نے ۱۸۶۳ء میں تباہ کر دیا۔

حضرت سید شہید اور ان کے مجاہدین کی جنگیں یہ جنگیں دسمبر ۱۸۲۶ء سکھوں کے کیمپ اکوڑہ خٹک سے دسمبر ۱۸۶۳ء جنگ امبیلہ (علاقہ بنیر) تک جاری رہیں۔

سب سے بڑی دو جنگیں حضرت سید شہیدؒ کی زیر قیادت لڑی گئیں:

۱۔ اکوڑہ خٹک ۱۸۲۶ء

۲۔ بالاکوٹ (ہزارہ) ۱۸۳۱ء

جرأت مندانہ شبخون سکھوں کے خلاف ۱۔ شیدو، ۲۔ حضرو، ۳۔ تنگی، ۴۔ ڈُومَ گلہ اور ۵۔ شنکیاری (ہر دو ہزارہ میں ہیں)

منحرف قبائل کے خلاف معرکے ۱۔ اتمان زئی، ۲۔ ہنڈ، ۳۔ زیدہ، ۴۔ عشرہ اور ۵۔ امب (ہر دو ہزارہ میں ہیں)، ۶۔ مردان، ۷۔ مایار اور بہت سی معمولی جھڑپیں اس کے علاوہ تھیں۔

حضرت سید شہیدؒ کی شہادت کے بعد مجاہدین نے انگریزی کیمپ ۱۔ شیخ جانہ، ۲۔ نارنجی ۱۸۵۷ء (ہر دو ضلع مردان میں ہیں)، پر حملے اور زبردست مقابلہ امبیلہ ۱۸۶۳ء میں ۱۸۴۹ء اور ۱۸۹۰ء کے درمیان انگریزوں نے تقریباً چالیس مہمیں مجاہدین کے خلاف کیں۔ ان میں

انگریزی اموات ۲۱،۳ ہوئیں، جن میں سے ۹۰۰ صرف امبیلہ میں ہوئیں۔

مجاہدین کے جنگی مراکز کی تباہی جنگ امبیلہ کے بعد ملکہ وادی چملہ۔ مہابن، علاقہ امازئی کی قوم، کا مرکز تباہ کر دینے کے بعد انگریز پٹنہ کے مرکز کی طرف متوجہ ہوئے اور سازش کے مقدمات دائر کر دئے گئے۔ انبالہ میں ۱۸۶۴ء، پٹنہ ۱۸۶۵ء مالدہ اور راج محل ۱۸۷۰ء اور دوبارہ پٹنہ ۱۸۷۱ء۔ ان میں ماخوذ رہنما عموماً صادق پور، پٹنہ کے خاندانوں سے تھے۔

اس کے باوجود انگریزوں کو سرحد میں اس تحریک کے دبانے کے لئے ۱۸۶۳ء — ۱۸۹۱ء تک مہمیں کرنی پڑیں۔ آخری مہم ۱۸۹۱ء کے بعد بھی یہ تحریک جاری رہی۔ ریشمی رومال کی تحریک ۱۹۱۶ء میں دو انگریزوں کا مری میں قتل، فقیر النگر (علاقہ جلال آباد۔ افغانستان)، کی تحریک ۱۹۳۶ء، تحریک مجاہدین کا اثر تھا۔

مجاہدین کی آبادیوں (چرقند علاقہ باجوڑ اور اسمتہ علاقہ بنیر)، نے پاکستان بن جانے کے بعد ہی ہتھیار ڈالے۔

"ماخذ و اختصاو از مضمون۔ میجر رفیع الدین احمد"
"پاکستان ٹائمز"۔ ۲۵/۶/۱۷"

سادات ستھانہ

ستھانہ کی تاریخ عزم و شجاعت کی داستان ہے اور ہزارہ کی تاریخ کا زریں باب۔ اس سرزمین سے تحریک آزادی کے مجاہد پیدا ہوئے۔ سید احمد شہیدؒ کی حکومت کا اس کو شرف حاصل رہا۔ ان کے بعد ان کے خلفاء کا مسکن اور جہاد آزادی کا مرکز رہا۔

ستھانہ کی بنیاد ڈپٹی کمشنر ہزارہ کے ایک خط مورخہ ۱۷ اپریل ۱۸۶۸ء سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سال گذرے ہیں کہ سادات کے چند گھر یہاں آباد تھے۔ جن کے گرد پنجاب، سرحد اور پٹنہ کے لوگ جمع ہو گئے اور اس وقت ان کی تعداد پانچ سو کے قریب تھی۔

پرانا ستھانہ برلب دریائے سندھ تھا، جو ۱۸۴۱ء کی طغیانی میں برباد ہو گیا۔ موجودہ ستھانہ دریائے سندھ کے کنارے سے کافی دور بنایا گیا۔ جو اب تربیلہ ڈیم کی وجہ سے زیرآب ہے۔

شجرۂ نسب یہ سادات پیر بابا بنیر والے کی اولاد ہیں۔ ان کے نامور اشخاص مندرجہ ذیل تھے۔

۱۔ **سید اکبر شاہ:** اس کا نام سب سے پہلے سکھوں سے نبرد آزمائی کے سلسلہ میں مشہور ہوا۔ سکھوں کے خلاف جنگ ۱۸۲۲ء میں یہ قائد یوسف زئی اقوام تھا۔ اس نے اپنی قابلیت اور حوصلہ سے طاقت حاصل کر لی۔ ہزارہ کے خوانین اور دوسرے لوگ جو سکھوں سے بھاگ کر ستھانہ پہنچتے، ان کو وہ پناہ دیتا تھا اور ان کو وہاں آباد کرتا۔ ان سے خراج وعشر وغیرہ لیتا۔ پٹھانوں، امازئی مداخیل، اتمان زئی، اگدون وغیرہ کا پیر تھا۔

۱۸۴۲ء میں ہری سنگھ نلوہ کی شکست پر ہزارہ کا بادشاہ بنا اور اس کی دستار بندی قلعہ ہری پور میں کی گئی۔ نواب خاں رئیس شنگڑی (سرائے نعمت خان) اور غلام خان ترین، ساکن درویش وزیر مقرر ہوئے اور سیف اللہ خان رسالدار کو میر منشی کے عہدہ پر مامور کیا گیا۔ چونکہ یہ انتظام بہت تھوڑی مدت قائم رہا، اس لئے مقامی لوگوں میں یہ دور "گنڈی مسلمانی" (تھوڑے عرصہ کی مسلمان بادشاہی) کے نام سے مشہور ہوا۔

۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۷ء تک سوات کا بادشاہ رہا جو اخون صاحب سوات کی منظوری سے ہوا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں فوت ہو گیا

اس کے بعد اس کا بیٹا مبارک شاہ بادشاہ بنا۔ لیکن جلد ہی معزول کر دیا گیا۔ اس کی وفات ۱۸۶۲ء میں ہوئی۔

اس کے بعد اس کا بیٹا فیروز شاہ مشہور رہا۔ انگریزوں کے مخالف رہا لیکن کامیاب نہ رہا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اس کے بعد ترکستان چلا گیا اور وہاں سکونت اختیار کر لی۔ لیکن دوسری روایت ہے کہ وہ مکہ معظمہ چلا گیا اور وہاں ۱۸۵۷ء میں وفات پا گیا۔

سید عبد الجبار شاہ اس خاندان کا آخری نامور انسان سید عبد الجبار شاہ ہوئے۔ آپ ایک قابل اہلِ قلم، تجربہ کار سیاستدان اور عربی، فارسی کے

فاضل تھے۔ سرحد و ماورائے سرحد کے اقوام کی تاریخ بڑی شرح و لبسط کے ساتھ دو ضخیم جلدوں میں لکھی۔ افسوس یہ علمی ذخیرہ شائع نہ ہو سکا۔

آپ کی پیدائش ۱۸۸۰ء اور وفات ۱۹۵۶ء[1] میں ہوئی۔

۱۸۹۷ء میں سوات کی جنگِ آزادی بہ مقام لنڈاکی میں انگریزی افواج کے خلاف شامل تھے۔

اگست ۱۸۹۸ء میں نواب محمد اکرم خان والئی امب کی دعوت پر ان کے پاس چلے آئے۔

جنوری ۱۸۹۹ء میں ان کے ولیعہد خانیزمان خان کے اتالیق مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۷ء میں ریاست امب کے وزیر مختار ہوئے۔ ۱۹۱۲ - ۱۹۱۳ء تا ۱۹۱۷ء ریاست سوات کے بادشاہ رہے۔ وہاں سے واپس آنے تک ۱۹۵۶ء تک ریاست امب کے وزیر رہے۔

---

[1] نقشِ آزاد (مکتوبات مولانا ابوالکلام آزادؒ کے سیکرٹری اجمل خان نے ۱۵ ردسمبر ۱۹۵۶ء کے خط میں لکھا: مولانا کو سید عبدالجبار صاحب کے انتقال کی خبر سے بہت افسوس ہوا۔ مولانا ان سے خوب واقف تھے۔

باب پنجم

اقوامِ ہزارہ

قوم پنی

افغانوں کے شجرے کے مطابق، پنی بن وانے بنِ غور غشت بن قیس عبدالرشید کی اولاد ہیں۔ کاکڑ، پنی کا بڑا بھائی تھا۔ جس کی اولاد کثیر تھی۔

آبائی وطن

ان کا آبائی وطن بھی (تمام اقوام افاغنہ کی طرح) کوہ سلیمان کا علاقہ تھا۔ راورٹی (RAVERTY) کے مطابق یہ قوم، اپنی تاریخ کے سب سے قدیم دور (سب افغانوں سے پہلے) میں اپنے آبائی وطن سے، مغلوں کی تاخت و تاراج سے تنگ آکر، کافی تعداد میں، ہندوستان چلے گئے۔ جہاں انہوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

بعد میں دوسری افغان اقوام بشمول پنی نے بہ جمع کثیر، سلطان بہلول لودھی (ہندوستان کا پہلا پٹھان حکمران) کی خواہش اور بلاوے پر ہندوستان گئے۔

لودھی افغان ۱۴۵۱ء سے ۱۵۱۶ء تک ہندوستان پر حکمران رہے۔

سلطان بہلول نے پنی قوم کے افراد کو ڈھونڈھار (مارواڑ) میں آباد کیا۔ ۱۸۰۲ء، ۱۸۰۳ء تک پنی قوم کی رہائش کے آثار جے پور، امبار، جودھ پور اور ملحقہ علاقہ ڈھونڈھار میں ملتے ہیں سو یہاں انکے سینکڑوں گاؤں آباد تھے۔

تاریخ خان جہانی کے مطابق مارواڑ میں پنی افغانوں نے شیر شاہ کے دستِ راست حاجی خان کی امداد اس وقت کی، جب اس پر رانا اودے سنگھ نے حملہ کیا۔ پنی قوم کے ۵۰۰ سردار زیر کمان میاں برہان پنی نے حاجی خان کی امداد کی اور رانا اودے سنگھ کو شکست دی۔

یہ قوم تجارت پیشہ تھی اور ان کے کاروان دکن تک جایا کرتے تھے۔ جہاں پر اس قوم کے بہت سے آدمی آباد ہو گئے تھے۔ تجارت پیشہ ہونے کی وجہ سے کافی آسودہ اور دولت مند تھے۔

جب افغانوں کے قبیلہ سُور کی سلطنت کو زوال ہوا اور ہمایوں بادشاہ، واپس آکر تخت دہلی پر بیٹھا تو قوم پنی اور میانڑا (یہ دونوں یک جدی ہیں)، نے قسمت آزمائی کے لئے دکن کا رخ کیا اور وہاں کے خود مختار حکمران کی ملازمت اختیار کر لی اور اپنی چند ریاستیں بھی بنا لیں، جن میں مشہور ریاست کرنول تھی۔ نوابانِ کرنول کے خاندان کے مورثِ اعلیٰ خضر خان پنی تھے۔ اس قوم کے مشہور افراد نے مغلیہ سلطنت میں اعلیٰ عہدوں پر خدمات انجام دیں۔ مثلاً بہلول خان، میانڑا، خضر خان پنی اور داؤد خان پنی (پسر خضر خان پنی)، نے

داؤد خاں پنی شاہ عالمگیر کے عہد میں مشہور جرنیل تھا۔ وہ بیجا پور کا تین سال تک فوجدار رہا۔ اس کے بعد پائین گھاٹ، صوبہ بمبئی کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔

داؤد خان پنی بادشاہ عالمگیر کے ساتھ آخر عمر تک رہا۔ عالمگیر بادشاہ کی وفات کے بعد تخت نشینی کے لئے جنگ برادران میں داؤد خان پنی نے سلطان محمد اعظم (جو اس وقت دکن میں تھا)، کا ساتھ دیا۔

اس کی وفات فرخ سیر کے عہد میں ہوئی۔

نوابانِ کرنول نے دکن میں اپنی ہستی برقرار رکھی اور ٹیپو سلطان کے ساتھ رہے۔ آخر کار یہ ریاست ۱۷۹۹ء میں انگریزوں نے فتح کر کے ختم کر دی۔

قوم پنّی کی ہزارہ میں آمد

سترھویں صدی کے وسط میں اس قوم کے چند قبیلے (ممبہ جدون جو ان کے ہم جدی ہیں)، ہندوستان سے واپس آئے، اور موضع غورغشتی میں مقیم ہو گئے (اس جگہ کا نام بھی قوم پنی کے جد غورغشت کے نام پر پڑا) اس جگہ سے جدون، مہابن ضلع مردان میں چلے گئے اور پنی میدانِ ہزارہ میں اپنی موجودہ جگہ پر آکر آباد ہو گئے۔

اس قوم کا مرکزی گاؤں اور خانی کی جگہ پنیاں ہے، جو اس قبیلے کے مورث پنی خان کے نام پر آباد ہوا۔

پنی خاندان ۔ عہدِ اکبری میں

عہد اکبری میں سیوی (نزد قندھار) کا حکمران اسحٰق پنی تھا۔ اس کے اکلوتے بیٹے باروخان سے ہی باروزئی قبیلہ منسوب ہے۔ اس قبیلہ کی سلطنت، سیوی، ملتان سندھ اور مکران تک رہی۔ جس کو ۱۵۹۲ء (عہد اکبری) میں شاہی لشکر نے فتح کر لیا۔

پانی نی (پانینی۔ سنسکرت گرامر کا عالم، جس کو تاریخ ہندو قوم سے بتلاتی ہے)، اصل میں پنی قوم سے تھا اور اس کا صحیح نام پنی تھا اور وہ نسلاً ان اسرائیلیوں کی اولاد سے تھا جو مادیوں (ایران) کے ملک میں جلاوطن ہو چکے تھے۔ افغان مورخین نے اس کو غرغشت قبیلہ سے بتلایا ہے اور ان کی غالب رائے یہ ہے کہ پنی - دانی بنی کا بیٹا ہے۔ افغانوں کا یہ نامور قبیلہ ہے اور مختلف مقامات تک پھیلا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ ضلع چٹاگانگ (بنگال) میں ایک قبیلہ پینیا کے نام سے موجود ہے۔

غرغشت قبائل کا اپنا وطن کوہ سلیمان کا علاقہ ہے۔ ان میں سے قبیلہ پنی زیادہ تر علاقہ سیوی (سبی) میں آباد ہے۔

پنی اور کاکڑ (غرغشت)

ان کے کچھ گھرانے یوسف زیوں کے ساتھ افغانستان سے آئے تھے۔ (غالباً ۱۴۶۸ء – ۱۵۰۲ء کے درمیان بش بل) اور ان کی برادری میں شامل ہوئے تھے (اگرچہ ان کا بڑا قبیلہ، اس وقت شمالی بلوچستان کے علاقہ کوہ سلیمان میں آباد ہے) جب یوسف زیوں کا موجودہ تحصیل ہری پور پر نیا قبضہ ہوا تو ان کو میدان ہزارہ اور صوابی میرا میں حسب منشا حصہ دیا گیا اور وہ اس وقت تک یوسف زئی کی ذیلی شاخ اتمان زئی (سید خانی۔ طاہر خیلی ش ب) کے ساتھ آباد ہیں۔

یہ لوگ بموجب تحریر تاریخ خان جہانی و مخزن افغانی، یوسف زئی کے رشتہ دار بھی تھے۔ جب وہ (پنی)، قندھار کے مغربی علاقہ میں آباد تھے تو ان کے ملک سلیمان پر ملک یوسف بن خشی (یوسف زئی)، کی بیٹی کا بیاہ ہو چکا تھا۔ اور سلیمان کو پنی کے بیٹے میہودا کی پانچویں پشت

بحوالہ حواشی تواریخ حافظ رحمت خانی ص ۵۶۵ ، ص ۴۷۸-۴۷۹ ، ص ۶۶۷-۶۶۸

میں بتایا جاتا ہے اور پھر سلیمان کی اس بیوی سے پیدا شدہ دو بیٹے عیسیٰ (علی) اور موسیٰ کے نام بتائے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے پنی لوگ جو موضع پنیاں، تحصیل ہری پور میں آباد ہیں، عیسیٰ اور موسیٰ کی اولاد ہوں گے جو یوسف زئی کے بھانجے تھے۔

یہ بھی معلوم رہے کہ ابتدا میں پنی و کاکڑ کو شیخ ملی کی تقسیم میں پتہ بائی زئی علاقہ مردان کے موضع پیر سدو میں حصہ ملا تھا اور کچھ حصہ قطب گڑھ میں بھی ملا تھا۔ اس وقت بھی وہاں یہ سب کاکڑ کے نام سے موسوم اور آباد ہیں۔

ضلع ہزارہ میں ان کو اس نئے مقبوضات میں دوبارہ حصہ دیا گیا تو پیر سدو اور قطب گڑھ سے کچھ لوگ ہزارہ میں آکر آباد ہو گئے اور کچھ گھرانے وہاں ہی موضع پیر سدو اور صرف ایک گھرانہ قطب گڑھ میں رہا، جو اب تک وہاں آباد ہیں۔ ان سب کو کاکڑ (پنی و کاکڑ) بولا جاتا ہے۔ پنی کا الگ نام نہیں۔ اسی پتہ میں موضع جھونگڑہ میں ان کو حصہ ملا تھا اور ان کے چند گھرانے کاٹ لنگ ڈھیری، شکرے بابا، موضع سلیم خان اور محبّی ضلع مردان میں مالکانہ حیثیت سے آباد ہیں۔ مگر یہ لوگ پنی اور کاکڑ کے نام سے نہیں بلکہ غرشتی کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔

علاقہ پنیاں کی قدیم تاریخ

راورٹی نے اپنی کتاب "افغانستان کے متعلق یادداشتیں" میں لکھا ہے کہ یہ علاقہ مغلوں کے حملوں ۱۲۲۱ء، ۱۲۲۲ء میں "بنیان" کے نام سے مشہور تھا اور والئی خوارزم کے زیر حکومت علاقوں غزنی، کرمان (کرم ایجنسی)، اور بنیان (غالباً موجودہ پنیاں) کا ذکر کرتا ہے اور علاقہ بنیاں سلاطین دہلی اور مغلوں کی رزمگاہ رہا۔

تاریخ سنٹرل ایشیا حصہ اول مصنفہ جی ایم میکریگر کلکتہ ۱۸۷۲ء میں تحریر ہے:

"پنیاں ... اس گاؤں میں ۴۱۳ مکان، ۱۲۰ دکانیں، آٹھ مسجدیں، اور ۱۶۲۲ نفوس ہیں۔ یہ موضع سات کنوؤں سے سیراب ہوتا ہے۔ اس موضع میں ۳۱ گھوڑے، ۹۰۸۴ مویشی، ۴۰ بھیڑ بکریاں، ۹۴ اونٹ گدھے، ۲ خچریں اور ۱۸۱ دوسرے جانور ہیں۔"

بندوبست ہزارہ ۱۸۷۲ء میں قوم پنی کی سیرت و کیرکٹر کے متعلق تحریر ہے:

"اس ضلع کے گوشہ شمال مغرب میں بکثرت قوم پنی پٹھان کی ہے۔ اس قوم کے قد طویل ۶ فٹ تک اور بدن فربہی و لاغری میں متوسط، قوی، صحیح المزاج، متناسب الاعضاء، زبان ہندی ایک خاص لہجہ کی ملائم، لباس اکثر سفید، رنگ سفید گندم گوں، چہرہ اکثر گول، کمر بندی کے معمولی، دنگہ فساد نہایت کم، جرائم سرقہ و قتل بالکل نہیں، کارِ زراعت میں بہت محنتی، خوراک گندم و مکی باجرہ، بہ سبب فراخیٔ زمین پر ایک آسودہ قوم ہے، روپیہ اکثر جمع رکھتے ہیں، فضول خرچ قطعاً نہیں، نہ خوراک و لباس پر اور نہ زیادہ بیاہ شادی پر یا ماتم پر۔"

صورت دیہی پنیاں بموجب بندوبست ۱۸۷۰ء - ۱۸۷۲ء اس گاؤں کی دو آبادیاں ہیں۔ ۱۔ پنیاں اور ۲۔ ڈھیری۔

پنیاں مرکزی گاؤں اور ڈھیری پنیاں سے جانب مشرق مائل بہ جنوب بفاصلہ ۳۰۰ کرم ہے۔

یہ دونوں مواضعات زمانہ قدیم میں ویران ہوتے رہے اور پھر آباد ہوتے رہے۔ دوسری جنگ سکھاں بمقابلہ انگریزاں پنی خاندان موضع سری میں تھا۔ (موضع بھیرہ سے شمال مغرب کی طرف) یہیں پر خاندان کو غزن خان پسر منیر خان کے دریائے سندھ میں ڈوب جانے کی خبر ملی۔ وہ میجر ہربرٹ کو تربیلہ سے کشتی میں سوار ہو کر سامان رسید، قلعہ اٹک جہاں وہ محصور تھا، پہنچانے کے لئے جا رہا تھا۔

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ موضع ڈھیری زمانہ قدیم، قبل از اسلام میں بہت بڑی آبادی کا قلعہ بند شہر تھا۔ آج کل دو چار گھر ہی رہ گئے ہیں۔

پنیاں کے خاندان یہ گاؤں نمبرداری کے لحاظ سے دو حصوں پر منقسم ہے۔
۱۔ خیل دریا خانی نصف اور،
۲۔ خیل یوسف خانی نصف۔

شجرہ ذیل کے مطابق اس گاؤں اور ملحقات میں ان کی چار خیل آباد ہیں، جو ان خانوں کی اولاد ہیں۔

پنی خان

دریا خان — یوسف خان — مظفر خان — موسیٰ خان

دریا خان کی اولاد میں خانی رہی۔ جس کی اولاد سے اب منیرؒ خانی اب خان ہیں۔

۲۔ صدر خانی —— حاجی محمد اشرف خان مرحوم کا خاندان۔

۳۔ امیر خانی —— جو معروف بہ نام گھوپے ہیں۔

۴۔ کمال خانی —— معروف بہ نام بھنگی ہیں۔

قوم پنی

دریا خانی ثمہ منیر خانی قوم کے سربراہ رہے۔ ان کے مشہور افراد یہ گذرے ہیں۔
۱۔ جلال خان پنی بن دلیل خان۔ یہ عہد مغلیہ کے آخر اور درانی اور آغاز عہد سکھاں میں ہوا۔ یہ بڑا نامور خان گزرا ہے۔ اس کی سخاوت گاؤں میں بہ ضرب المثل زبان زدِ عوام تھی:

"نبی تے بنی، نہیں تے جلال خان پنی"

یعنی اگر کہیں ملازمت نہ ملی تو جلال خان پنی کے ہاں ضرور مل جائے گی۔

یہ بڑا زیرک اور ہوشیار انسان تھا۔ اس کے بعد اس کا بھتیجا منیر خان، خان ہوا۔ منیر خان کو جلال خان نے، اپنی زندگی میں ہی جانشین مقرر کر دیا تھا، کیونکہ وہ اپنے بیٹے تہور خان کو اس منصب کے قابل نہ سمجھتا تھا۔

زمانہ قدیم سے پٹھانوں میں صحیح جمہوریت اور مساوات ہے۔ جس کا عملی نمونہ، خان کے انتخاب میں دیکھا جاتا ہے۔ مثلاً یوسف زیوں کی حکومت (دریائے سندھ کے علاقے میں) یکے بعد دیگرے جو خوانین، قوم کے سربراہ بنے وہ مختلف قبیلوں (یعنی خیلوں) کے خان تھے لیکن قابلیت کی بنا پر ایک سربراہ کی موت کے بعد، قوم نے ان کو چنا۔ اسی طرح جلال خان نے اپنے قابل بھتیجے کو اپنی قوم کی سربراہی کے لئے چنا اور تاریخ نے اس کی اصابت رائے

نوٹ: دریا خان اور یوسف خان کی اولاد پنیاں میں آباد ہے۔ مظفر خان کی اولاد بھی یہاں ہی ہے۔ موسیٰ خان کی اولاد موسیٰ خیل، ٹوڈو، بھیرہ، کالو ہنڈ اور پہاڑ دیں آباد ہے۔

پر مہر تصدیق ثبت کر دی اور جلال خان کی وفات کے بعد اس کے بیٹے یا پوتے کا نام کسی قومی معرکہ میں نظر نہیں آیا، بلکہ اب تو اس کی اولاد ہی ختم ہو گئی۔ جبکہ منیر خاں کی اولاد نے عہد درانی، عہدِ سکھاں اور عہدِ انگریزی میں نمایاں کردار ادا کر کے اپنا نام روشن کیا اور زمانہ موجودہ میں اس کی اولاد قوم پنی میں صاحب عزت اور کثرت سے موجود ہے۔

منیر خانی پہلے انگریز ڈپٹی کمشنر ہزارہ میجر ایبٹ کے طرفدار تھے، جس کا ثبوت میجر ایبٹ کی سندات ہیں۔

میجر ایبٹ کی طرفداری کا بنیادی سبب ان کے خاندان کی کھلابٹ سے قرابت داری تھا۔ منیر خانی خاندان کی قرابت اور رشتہ یہ تھا کہ منیر خان کی بیٹی، میر زمان خان سید خانی۔ خان کھلابٹ سے بیاہی ہوئی تھی اور میر زمان خان میجر ایبٹ کا معاون اور دوست تھا۔

منیر خانیوں کے رشتے، خاندانِ کھلابٹ کے علاوہ تربیلہ کے اتمان زیوں اور لنگرہ تحصیل ایبٹ آباد کے جدونوں اور موضع ڈنگی کے ترینوں کے ساتھ بھی رہے ہیں۔

میجر ایبٹ (پہلا ڈپٹی کمشنر ہزارہ) کی سند	سکھوں کی سلطنت ہزارہ کا انجام میجر ایبٹ کے ہاتھ سے ۱۸۴۹ء میں ہوا۔

وہ اس ضلع کا ۱۸۵۳ء تک ڈپٹی کمشنر رہا۔ اس نے ضلع سے رخصت ہوتے ہوئے، قائم خان پنی (متوفی ۲۳ رمئی ۱۸۷۲) کو ایک سرٹیفکیٹ مورخہ ۲۳۔ اپریل ۱۸۵۳ء دیا۔ جس میں اس نے قائم خان پنی، اس کے بھائیوں اور بھتیجوں کی خدمات کا ذکر کیا اور افسوس ظاہر کرتا ہے کہ وہ ان کی مخلص خدمات کا کوئی صلہ نہ دے سکا۔

منیر خان کی اولاد	ان کے پانچ بیٹے تھے۔

۱۔ قائم خان۔ ۲۔ نجیم خان (وفات ۱۶ رجون ۱۸۴۸ء) ۳۔ غزن خان (وفات ۱۸۴۸ء، قلعہ اٹک کے سامنے دریائے سندھ میں کشتی ٹوٹ جانے پر) ۴۔ عبدہ خان (وفات ۵ ستمبر ۱۸۹۲ء) اور ۵۔ میر زمان خان (متوفی اکتوبر ۱۸۹۲ء)

قائم خان کی اولاد میں احمد خان (متوفی ۸۔ جون ۱۹۰۹ء) ہوشیار اور صاحب اثر خان ہوا۔ اس کا پوتا رسالدار میجر دوست محمد خان بن فضل خان، صاحب بخت و اثر انسان تھا۔ باپ کی

زندگی ہی میں (۱۹۳۱ء) میں فوت ہوا۔ اس کی وفات کے صدمے سے اس کا والد بھی ایک ماہ بعد فوت ہو گیا۔

محمد اکبر خان بن آزاد خان بن نجیم خان

تعلیم پرائمری تک تھی۔ لیکن ذاتی قابلیت سے عمدہ ہیڈ کانسٹیبلی سے ترقی کر کے سب انسپکٹر ہو گئے۔

۱۸۸۱ء، ۱۸۸۲ء میں مختلف تھانہ جات ہزارہ میں تعینات ہوتے رہے۔ ۱۸۸۶ء میں یہاں کی ملازمت چھوڑ کر ملک برما چلے گئے اور وہاں انسپکٹر ہو گئے۔ ۱۹۱۱ء میں وہاں ہی وفات پائی وہاں ان کے دو بیٹے تھے۔ ۱۔ سلطان محمد خان جو وہاں ڈپٹی کمشنر ہوئے اور ۲۔ سید محمد خان جو فوج میں کرنل ہوئے۔

پنیاں میں ان کے ایک ہی بیٹے، خواجہ محمد خان (المعروف بہ لالہ جی) ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے اردو مڈل ۱۹۰۲ء میں پاس کیا۔ لیکن تحریر و قابلیت میں زمانہ حال کے بی۔ اے سے بہتر تھے۔ ملازمت نہیں کی۔ زمینداری میں ماہر اور بڑے منتظم تھے ۱۹۴۷ء میں وفات ہوئی۔

غزن خان بن منیر خان

غزن خان بڑا بہادر اور دلیر انسان تھا۔ جب دوسری جنگ سکھاں میں میجر ہربرٹ، قلعہ اٹک میں محصور ہو گیا۔ اس کو سامان رسد وغیرہ پہنچانے کے لئے میجر ایبٹ نے اس کو مقرر کیا۔ وہ سامان لے کر معہ ایک انگریز ساتھی تربیلہ سے بذریعہ کشتی اٹک کے لئے روانہ ہوا تو کشتی قلعہ اٹک کے نزدیک ایک چٹان سے ٹکرائی اور ٹوٹ گئی۔ انگریز تو تیر کر کنارے پہنچ گیا۔ لیکن غزن خان وہاں ہی ڈوب گیا۔

اس کی وفات پر اس کے بڑے بیٹے میر حسن خان کو انگریزی گورنمنٹ نے بموجب سیکرٹری گورنمنٹ ہند محکمہ خارجہ کے حکم ۲۰۲۴ مورخہ ۸۔ جولائی ۱۸۵۲ء مبلغ ۵/۱۷ روپیہ پنشن تاحیات منظور کی، جو وہ اپنی وفات ۱۸۹۰ء تک لیتے رہے۔

یہ میرے نانا تھے۔ بڑے ہی دیندار انسان تھے۔ ان کا بیٹا خدا بخش خان بڑا زبردست پہلوان ہوا، جو ۱۲ اگست ۱۹۱۶ء میں فوت ہوئے۔ ان کا بیٹا محمد اسلم خان فوج میں رہا۔ یہ بڑا شہسوار تھا۔ رسالہ میں منہ زور گھوڑوں کے سدھانے کے کام پر متعین رہا۔ ۱۹۱۴ء تا ۱۸۱۹ء کی جنگ عالمگیر اول میں اس کا رسالہ عراق میں تھا۔ جہاں اس فوج نے ترکوں کے خلاف جنگ

کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر یہ رسالہ کالا پانی بھیجا گیا۔ مدت بعد رہا ہو کر آیا۔ تقریباً نوے سال کی عمر میں ۱۹۰۵ء میں فوت ہوا۔

عبدو خان بن منیر خان اس کی اولاد بہادر اور غیرت مند ہوئی۔ خاندان اور گاؤں میں قائدانہ صلاحیت کے مالک رہے۔ منیر خان کی اولاد میں سے یہی لوگ تعلیم کی طرف پہلے پہل راغب ہوئے۔ عبدو خان کا بیٹا مولوی کرم خان ایک قابل حکیم تھا اور تقریباً ساری عمر بمبئی میں مطب کرتا رہا۔ ان کی وفات ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ ہوئی۔

ان کا دوسرا بھائی حسن علی خاں تھا۔ جس کے بیٹوں رسول خاں، محمد جعفر خان اور شجاع الدولہ خان نے رائج الوقت تعلیم حاصل کی۔ رسول خان مدرس رہے اور ساری عمر برلب، دریائے سندھ موضع غازی کے سکول میں بحیثیت اول مدرس گزار دی۔ وہاں بہت ہر دل عزیز رہے۔ ۱۹۲۱ء میں وفات پائی۔

محمد جعفر خاں اور شجاع الدولہ خان اپنے دونوں بھائیوں کو اپنے پاس غازی میں تعلیم دلائی۔ یہ دونوں بھائی پہلے ملایا اور پھر امریکہ میں (۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۹ء) چلے گئے۔ وہاں ہی دونوں نے وفات پائی۔ (محمد جعفر خان نے ۱۹۶۱ء اور شجاع الدولہ خان نے ۱۹۷۱ء میں)

رسول خان کی تبدیلی (۱۹۲۱ء میں) پر علماء و خوانین علاقہ نے ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔ ان میں سے صرف دو حضرات کے الوداعی خطوط کی نقل تحریر کرتا ہوں۔

۱۔ مولوی فضل احمد۔ خطیب جامع مسجد غازی لکھتے ہیں؛

"خبر کوچ کی سن کر تعجب حاصل ہوا کہ بادِ صرصر کہاں سے آئی جو ایسے پرانے درخت کو علیحدہ کر دیا۔ خداوند عزوجل کے کام احاطۂ عقل سے باہر ہیں۔ اگرچہ دوستوں سے دوری ہوئی۔ اما اہل و عیال کا قرب حاصل ہوا۔ آخر عمر میں حرص و ہوا کم کرنی چاہیے اور زادِ آخرت کا تیار کرنا چاہیے (یہ الہامی فقرہ تھا۔ وہاں سے آنے کے بعد چند ماہ میں سفر آخرت پیش آگیا۔ ش۔ب) ع

ہر جا کہ باشی با خدا باش"

احقر العباد عفی عنہ

۲۔ خان محمد عمر خان۔ جاگیردارِ غازی نے تحریر فرمایا:

مکرمی و معظمی جناب مولوی صاحب

السلام علیکم ۔

آنچہ دل از فکرِ آں میسوخت ، بیم ہجر بُود
آخر از بے مہری گردوں ، آنہم ساختیم

جناب کی تبدیلی کا سن کر، دل از حد زیادہ بے قرار ہے، مگر واقعاتِ زمانہ تابع قانونِ قدرت ہیں ، جو اٹل ہیں ۔ جناب نے اپنی خاص دلی توجہات سے ہماری اولاد کی تعلیم و تربیت میں جس مستعدی کا عملی ثبوت وقتاً فوقتاً دیا ہے وہ قابلِ ہزار شکر گزاری ہے ۔ جزاک اللہ فی الدارین خیرا ۔ الوداعی ملاقات کے لئے کچھ وقت بچا کر مطلع فرماویں کہ میں بیمار ہوں ۔ زیادہ نہ ٹھہر سکوں گا"

آپکا صادق نیازمند بندہ محمد عمر بقلم خود ۳۱-۳-۱۹۲۱

موضع کالو پنڈ میں پنی قوم ، خیل موسٰی خیل آباد ہے ۔ اس گاؤں میں حاجی بلند خاں صاحب نامور آدمی ہوا ہے ۔ ان کی وفات بعمر ۱۲۵ سال ۱۹۰۹ء میں ہوئی ۔

ان کا بڑا بیٹا، محمد اسلم خان ایک مخلص ، محب قوم اور وطن دوست انسان تھا ۔ ابتدائی عمر میں کافی عرصہ ایران میں ملازمت کی ۔ بعد میں وہاں سے آکر خیبر ایجنسی میں خاصہ دار کلرک رہے ۔

زندگی بھر خاندان ، قوم اور دوستوں کی بہتری میں کوشاں رہے ۔ کالو پنڈ سکول ، پنیالہ تا کالو پنڈ سڑک ان کی جانفشانی اور کوشش کی یادگار ہے ۔ قومی خدمات کے جذبہ سے دو تین انتخابات میں حصہ لیا ۔ لیکن قومی بے حسی اور سرمایہ کی کمی سے کامیاب نہ ہو سکے ۔

موضع بھیرہ میں قوم پنی کے موسٰی خیل اور مفری آباد ہیں اس گاؤں میں عطا محمد خاں قابل اور نامور نمبردار تھے ۔ اس کا بھتیجا سردار بہادر خان بن عبداللہ خان ایک لائق سب انسپکٹر تھا ۔ جوان العمری میں ہی فوت ہو گیا ۔

قوم پنی شاخ سید خان سے جمعدار امیر عالم خان انگریزی عہد حکومت میں فوج میں جمعدار تھے ۔ ان کا بڑا بیٹے محمد اشرف خان نے انگریزی تعلیم میٹرک تک حاصل کی ۔ محکمہ مال

میں افسر مال رہے۔ قوم میں تعلیم کی اشاعت میں سرگرم رہے۔ پنیاں میں پرائمری سکول ان ہی کی کوشش سے ۱۹۰۷ء میں قائم ہوا تھا۔ پنشن پر آنے کے بعد زمینداروں کی ترقی میں کوشاں رہے۔ ۱۹۳۰ء میں حج کیا۔ ایک کتاب "رہنمائے مقامات مقدسہ" لکھی۔ ۱۹۴۶ء میں صوبائی انتخاب کے لئے امیدوار کھڑے ہوئے لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ ۱۹۶۶ء سے دماغی کمزوری کی وجہ سے خانہ نشین ہو گئے اور ۱۶ راپریل ۱۹۷۱ء میں وفات پائی۔

ان کا بڑا بیٹا محمد اسلم خان ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر رہا اور ہر دل عزیز انسان تھا۔ خاندان پرور تھا۔ ۲۶ رجنوری ۱۹۷۱ء میں فوت ہوا۔

مشوانی

یہ افغانوں کا مشہور قبیلہ ہے۔ یوسف زیوں کے ساتھ ان کے تعلقات و مراسم افغانستان میں رہائش کے وقت سے ہیں۔ ملک گیری میں یہ یوسف زئیوں کے ساتھ رہے۔

شیخ ملی کی تقسیم کے مطابق علاقہ دیر میں درہ جندول میں ایک زرخیز علاقہ ان کو ملا۔ جس میں آج تک ان کے کافی گھرانے آباد ہیں۔

نئے مقبوضات ہزارہ میں یوسف زئی کی ذیلی شاخ اتمان زئی منڈڑ نے ان کو کوہ گندگر کے علاقہ میں کچھ اراضی بطور انعام دی۔ جہاں ان کی آبادی کی کثرت، کوہ گندگر میں، سری کوٹ، کنڈی امرخانہ دانبار خانہ، اور گدوالیاں میں آباد ہے۔

روز اول سے اب تک ان کی زبان، پوشاک اور بود و باش افغانی ہی ہے۔

ان کے کچھ گھرانے اسماعیلیہ اور ساول ڈھیر (ضلع مردان)، اور چند گھرانے علاقہ چھچھ میں آباد ہیں۔

قوم مشوانی تاریخ یوسف زئی پٹھان میں اللہ بخش یوسفی صاحب مرحوم نے ان کے نسب کے متعلق فرمایا ہے۔

لہ۔ حواشی تواریخ حافظ رحمت خانی صہ ۶۷۲-۶۷۳

"سید محمد گیسو دراز کی اولاد سے ہیں۔ ان کے چار لڑکے بیان ہوتے ہیں جو کرلانی افغان مشہور ہیں، جن میں ایک کا نام مشوانی تھا۔ مشوانی نے غرغشت کی اولاد میں کاکڑ کی بیٹی یا اس کی پوتی سے شادی کر لی تھی اور مشوانی کو کاکڑ کے باپ دانی نے چونکہ متبنیٰ بنا لیا تھا۔ اس وجہ سے وہ پٹھانوں میں گھل مل گیا اور نسلاً سید ہونے کے باوجود، اپنی اہلیہ کے خاندان کی سرپرستی کی وجہ سے پٹھانوں میں شمار ہوتا رہا۔ اس وقت تک پٹھان قبائل انہیں اپنے میں کا ہی خیال کرتے ہیں۔ یہ امر بھی باعثِ دلچسپی ہے کہ ان کے پٹھانوں سے ربط و گہرے تعلقات کی وجہ سے علاقہ کے اکثر سید انہیں اپنی برادری میں شمار نہیں کرتے اور انہیں پٹھان ہی ظاہر کرتے ہیں اور یہ لوگ بھی اپنے آپ کو پٹھان ظاہر کرتے ہیں اور پٹھان ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ یہ لوگ پشتو زبان بولتے ہیں۔ ان کی آبادی اب بھی کثرت سے افغانستان میں کابل اور قندھار کے گرد و نواح میں مقیم ہے۔ ان کے چند خاندان افغانستان سے نکل کر اس وقت علاقہ یوسف زئی میں پہنچے، جب یوسف زیوں کا ستارہ چمک رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اتمان زیوں نے انہیں گندگیر کے علاقہ میں اراضی بطور سیدی دے دی تھی جہاں وہ اس وقت مقیم ہیں۔"

سید محمد گیسو دراز کے متعلق ڈاکٹر سید معین الحق اپنی کتاب معاشرتی و علمی تاریخ میں تحریر فرماتے ہیں:

"ان کے مورثِ اعلیٰ ہرات سے آکر دہلی میں سکونت پذیر ہوئے تھے اور یہیں سید محمد گیسو دراز ۷۲۱ھ / ۱۳۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید یوسف حسینی عرف سید راجا شیخ نظام الدین اولیاؒ کے معتقدین میں تھے۔ سلطان محمد تغلق نے دولت آباد کو دوسرا دار الحکومت بنا کر جب عمائدین و علماء و مشائخ دہلی کو وہاں بھیجا تو سید یوسف حسینی کو بھی ترکِ وطن کر کے جنوب کی طرف جانا پڑا۔ چنانچہ یہیں ابتدائی تعلیم پائی ان کی عمر دس سال تھی کہ والد کی وفات ہوگئی۔ اس کے پانچ چھ سال بعد ان کی والدہ دولت آباد سے دہلی آگئیں . . . . ۷۳۶ھ میں سید محمد خواجہ نصیر الدین چراغِ دہلی

سے بیعت ہو گئے۔ یہاں ہی مرشد کی ہدایت کے مطابق علوم ظاہری کی تکمیل کی۔ مرشد سے گیسو دراز کا لقب پایا۔ مرشد کی وفات کے بعد (۷۵۰ھ) میں یہی ان کے جانشین ہوئے۔ اس کے بعد خواجہ گیسو دراز ۴۵ سال دہلی میں مقیم رہے۔

نویں صدی ہجری کے شروع میں دکن کا قصد کیا"

اس لحاظ سے یوسفی صاحب کی روایت قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ وفات سید گیسو دراز ۸۲۵ھ مطابق جون ۱۲ر ۱۴۲۱ء ہے۔

عادات یہ قوم فوجی خصوصیات کی حامل ہے۔ بڑے محنتی اور جفاکش لوگ ہیں۔ ان کا صدر مقام سری کوٹ، علاقہ گندگر، تاریخی لحاظ سے مشہور مقام ہے۔ ہزارہ کی اقوام ہر جنگ آزادی کے موقع پر اس کو اپنا مرکز بنا کر مقابلہ کرتی رہی ہیں۔ کبھی غالب اور کبھی مغلوب ہوتے رہے۔ آخر ہی سکھوں نے جب اس کو فتح کر لیا تو ان کے سرگروہ ملک صالح محمد کو معہ بوستان خان ترین اور جلال خان دلازاک، توپ سے اڑا دیا۔

ہزارہ گزیٹر ۱۹۰۷ء کے مطابق:

"یہ قوم مضبوط، اچھی عادات کے مالک، دیانتدار اور وفادار ہیں۔ ان کی ملکیت زمین تنگ ہونے کی وجہ سے ان کے بہت سے افراد ملازمت میں ہیں"

۱۸۴۸ء میں میجر ایبٹ کے مضبوط حمایتی تھے۔ وہ ان کو "دنیا کی بہترین شجاع قوموں" کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ اپنے کالے کپڑوں، پرانی لمبی بندوقوں، تلواروں، ڈھالوں اور قومی جھنڈے کے ساتھ جب سری کوٹ کے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جاتے ہیں تو یہ عجیب منظر ہوتا ہے۔ ان کا سرگروہ سید شریف ساکن سری کوٹ ہے۔ وہ ۹۲ پنجابی رجمنٹ میں جمعدار رہے۔ گاؤں میں اس کا چچا سید محمود سربراہی کرتا ہے۔

ان کے مشہور مواضعات سری کوٹ، کنڈی اور عمر خانہ (انبار خانہ) ہیں۔ تربیلہ ڈیم کے بن جانے سے ان کے علاقہ میں بہت تعمیری کام ہوئے ہیں اور بہت ترقی ہوئی۔

زمانہ حال میں اس قوم کے مشہور افراد سید عبدالملک شاہ مرحوم اور ان کے عزیز سید غلام صفدر شاہ ہیں۔ جو عدالت عالیہ سرحد کے چیف جسٹس رہے ہیں اور قابل عزت انسان ہیں۔

گوجر

ضلع ہزارہ کی قدیم ترین قوم ہے ۔ ماضی بعید میں اس ملک پر ان کا قبضہ واقتدار کافی مدت تک رہا۔

خان روشن خان ساکن نواں کلی صوابی مردان اپنی کتاب تواریخ رحمت خانی کے حواشی ۳۳۲ پر تحریر یہ فرماتے ہیں کہ :

"پانچویں صدی عیسوی گوجر قوم ہندوستان میں آئی ۔ اس کا اصلی وطن ایرانی سلطنت میں دریائے سندھ کے مغربی پہاڑوں میں تھی ۔ وہاں سے یہ ۵۰۰ صدی عیسوی میں آکر پہلے پنجاب ، پھر راجپوتانہ ہوتے ہوئے گجرات ، پونا اور دکن تک پہنچے اور سلطنتیں قائم کیں "

محمود غزنوی (دسویں صدی عیسوی) سے افغان وقتاً فوقتاً یہاں آتے رہے اور بزور یا بذریعہ خرید وفروخت گوجروں کو اپنے املاک اور وطن سے محروم کرتے رہے۔

سر آلف کیرو (مصنف " پٹھان ") کے مطابق سفید ہن کے ساتھ (۶۰۰ء کے قریب) گرجارا (گوجر) آئے ۔ ہن یعنی حکمران تو ختم ہو گئے لیکن ان کے محکوم (گوجر) باقی رہ گئے ۔

میجر بیلیو کے مطابق سفید ہنوں کی جگہ بعد میں پٹھانوں نے لے لی ۔ ہندوستان کے پہلے عرب سیاح سلمان تاجر نے اپنا سفر نامہ ۲۳۷ھ (۸۵۱ء) میں گجرات کے راجہ کو جزر قوم (گوجر) لکھا ہے ۔ راجہ جزر کے متعلق سید سلیمان ندوی اپنی کتاب ہندو عرب تعلقات کے سلسلہ میں لکھتے ہیں :

"جزر اصل میں گوجر ہے ۔ گوجر ملک گجرات کے راجہ تھے "

تاریخ ہزارہ مصنفہ میجر ویس مہتمم بندوبست ہزارہ ۱۸۷۲ء لکھتا ہے :

"موجودہ تحقیقات بندوبست وملاحظہ اسناد قوم گوجر و دلازاک وغیرہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس ضلع میں قوم گوجر کی آبادی بہت پرانی ہے ۔ شاہان مغلیہ کے وقت بھی یہ لوگ یہاں آباد تھے ۔ اس قوم کا بڑا گھر دولتا گوجر (موجودہ کوٹ نجیب اللہ جس کے جنوب میں اب ایک تالاب موسوم بہ

دولتاکی یں موجود ہے : کا تھا۔ شاہان مغلیہ کے عہد میں جو چار پٹی میدان ہزارہ میں بہ تفصیل ذیل مقرر تھیں۔

۱۔ پیٹی ترک مانگرائے ۲۔ پٹی دلازاک سرائے صالح۔

۳۔ پٹی گوجر دولتا۔ ۴۔ پٹی ترینی درویش۔

پٹی گوجری میں درانی، سکھ اور انگریزی دور میں مقدم مشرف مشہور سربراہ گزرا ہے۔

اس قوم کا ورثہ اور قبضہ مندرجہ ذیل دیہات پر چلا آیا ہے۔

کوکلیا۔ ہنڈوری، ڈنگی، جھاڑ۔ کوٹ نجیب اللہ، دیدڑ، چنبہ پنڈ۔

ہزارہ گزیٹر میں تحریر ہے :

"قوم گوجر اس ضلع میں بہت پرانے وقتوں سے آباد ہے اور ہزارہ کے میدان میں دلازاک اتمان زئی اور ترین کے یہاں آنے سے بہت پہلے سے قابض تھے اور پہاڑوں پر تو ان کی آبادی بہت ہی پرانی ہے۔ اس ضلع میں ان کی آبادی سب اقوام سے زیادہ ہے۔

اس قوم میں کٹھانہ گوجر کوٹ نجیب اللہ میں اور جاگل گوجر ہری پور کے نزدیک قابل ذکر ہیں۔"

زمانہ حال میں سردار امیر عالم خان اسسٹنٹ کمشنر ہوئے۔ جب ریٹائر ہوئے تو آنریری مجسٹریٹ درجہ اول مقرر ہوئے۔

مقدم مشرف کو جاگیر مہاراجہ رنجیت سنگھ مواضعات ڈنگی، جھاڑ اور کوکلیہ اور ایک جندر (پن چکی)، جاگیر دی۔

میجر ایبٹ (پہلے انگریز ڈپٹی کمشنر ہزارہ نے مقدم مشرف کے بعد مقدم احمد کو جاگیر دار منظور کیا۔ مقدم احمد، ۲ اگست ۱۸۷۱ء میں فوت ہوا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے مقدم میر احمد کو جاگیر دی گئی۔ ان کا انتقال ۲۴ اکتوبر ۱۸۷۹ء میں ہوا۔ اور جاگیر ان کے بڑے بیٹے غلام محمد کو ملی۔ وہ یکم مئی ۱۸۸۰ء کو فوت ہوئے۔ اس کے بعد ان کے بڑے بیٹے مقدم میر عبداللہ کو ملی۔

ترین

یہ خوش نصیب قوم جب سے چھچھ ہزارہ میں وارد ہوئی، رو بہ عروج رہی۔ اگرچہ اس پر زمانہ کے نشیب و فراز آتے رہے۔ لیکن ہر دفعہ گرنے کے بعد اٹھ کر آگے ہی بڑھتی رہی۔ ان کا پہلا

عروج احمد شاہ ابدالی جو اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخری نصف سے ذرا پہلے افغانستان کا بادشاہ بن گیا، کے وقت میں ہوا۔ ترین اور ابدالی ہم جدی ہیں۔ درانیوں کی طرف سے نجیب اللہ خان ترین ۱۷۶۲ء سے ۱۷۹۹ء تک حاکم ہزارہ رہا۔ اس کی وفات کے بعد اس کی نیک بخت اور پرہیزگار بیوی بنی بیگم نے بڑی قابلیت سے اپنے صغر سن بیٹے محمد خان کا سربراہ ہو کر کاروبار حکومت چلایا۔ محمد خان کے جوان ہونے کے وقت ۱۸۱۷ء ہزارہ پر سکھوں کے حملے شروع ہو گئے۔ محمد خان نے بڑی جوانمردی سے ان کا مقابلہ کیا۔ آخر کار دھوکہ اور فریب سے اُن کو اِن ظالموں کے ہاتھ سے موت کا پیالہ چکھنا پڑا۔

محمد خان کی موت کے بعد اس کا بیٹا غلام محمد خان (المعروف بہ غلام خان) اس قوم کا چیف بنا اور سکھوں کے ساتھ بڑی ہوشیاری اور شجاعت سے مقابلہ کرتا رہا۔ سکھوں کے زوال کے بعد انگریزوں سے آویزش جاری رکھی۔ مگر اپنوں کی غداری اور انگریزوں کی چالاکی کے ہاتھوں مات کھا گیا۔ گرفتار کر کے الہ آباد لے جایا گیا اور چند مدت کے بعد فریب سے پھانسی دے دیا گیا۔

اس کی وفات کے بعد اس قوم کا آفتاب گہنا گیا۔ لیکن یہ قوم آہستہ آہستہ اٹھنے کا سامان کرتی رہی۔ تقریباً سو سال کے بعد (اور یہ زمانہ قوموں کی زندگی میں نہایت قلیل ہے) اس قوم کا ایک نامور فرد فیلڈ مارشل محمد ایوب خان ساکن ریحانہ ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۹ء میں پاکستان (متحدہ مغربی اور مشرقی) کا صدر ہوا اور یہ قوم پھر اپنے انتہائی عروج کو پہنچی۔

ترین قوم کا آبائی وطن اس قوم کا آبائی وطن قندھار ہے۔ ان کی کافی آبادی کوئٹہ پشین سبی اور لورالائی میں آباد ہے۔

ہزارہ میں ہزارہ میں تور اور سپین ترین دونوں آباد ہیں۔ کثرت ان کی تحصیل ہری پور اور درویش و علاقہ ریحانہ میں ہے۔

تربیلہ اور ڈنگی کے مواضعات میں چند گھرانے ہیں۔ اور کچھ موضع ملکیار (ملکیار بھی ترین ہی کی ایک شاخ ہے) میں آباد ہیں۔

ہزارہ گزیٹر ۱۹۰۷ء کے مطابق ترین ہزارہ میں گوجر قوم کی دعوت پر یہاں آئے۔ بعد میں گوجروں کو بے دخل کر کے ان کے علاقوں پر آہستہ آہستہ قابض ہو گئے۔ تاریخ ہزارہ مرتبہ ویس

کے مطابق قوم ترین دوسری افغان اقوام کی طرح بہ عہد سلطان محمود غزنوی اس طرف آئے۔
۱۰۲۷ء میں قوم ترین کا مورث اعلیٰ المسمیٰ ہارون علاقہ چھچھ میں آکر موضع ہروآن میں آباد ہو گیا۔ بہت مدت بعد اس کی نسل سے بوستان خان مورث قوم ترین ہزارہ نے ۱۶۲۰ء میں موضع ڈویاں آبی دنزد موضع درویش آباد کی۔ اس کے بعد اس کے پوتے ملک درویش نے ۱۶۵۸ء میں اپنے نام پر موضع درویش آباد کیا۔ تاریخ ہزارہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گدائی خان پسر ملک درویش نے سرائے گدائی اور دیگر مواضعات آباد کیے۔

۱۷۹۰ء میں ہمت خان ترین گوجری پٹی پر قابض ہو گیا اور کابل و کشمیر کا راستہ بھی اس کے ہاتھ میں آگیا۔ ہمت خان کی وفات کے بعد اس کا بیٹا نجیب اللہ خان سردار ہوا۔
اس کی وفات کے بعد محمد خان نے سکھوں کا مقابلہ کیا۔ آخر کار رنجیت سنگھ کی بدعہدی سے مات کھا کر فوت ہوا۔
اس کی گرفتاری کا قصہ میجر سمتھ مؤلف کتاب "لاہور کے سکھ حکمران" کی زبان سے پڑھیے۔

"سکھوں نے اس کو آخر کار دھوکہ سے گرفتار کر لیا۔ اس مقصد کے لیے رنجیت سنگھ نے اپنے ایک افسر مصر دیوان چند کو بھیجا اور وہ محمد خان کو عہد و پیمان کے ساتھ رنجیت سنگھ کے کیمپ واقعہ راولپنڈی میں لے گیا۔

رنجیت سنگھ نے پہلے تو محمد خان کے ساتھ آبرومندانہ سلوک کیا اور دیوان چند نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی اور وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ لاہور چلا گیا وہاں اس نے وعدہ خلافی کر کے محمد خان کو جیل میں ڈال دیا۔ اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا کہ اس کی جان خطرہ میں پڑ گئی۔

دیوان چند نے مہاراجہ سے کہا کہ وہ اس کو اپنی ضمانت پر لے کر آیا ہے اور یہ ناروا سلوک اس کے ساتھ نہ ہونا چاہیے۔ اس پر رنجیت سنگھ نے محمد خان کو خفیہ طور پر کانگڑہ کے قلعہ میں بھیج دیا اور دیوان چند کو پتہ ہی نہ چلا۔
ایک دن مصر دیوان چند نے بھرے دربار میں رنجیت سنگھ کو غصہ سے کہا کہ آپ کو میری ضمانت اور وعدہ پر لائے ہوئے محمد خان کو رہا کرنا پڑے گا۔ اس پر

رنجیت سنگھ غصہ میں آگیا اور کہا کہ تم کو اپنی جان کی فکر کرنی چاہیے، نہ کہ محمد خان کا۔ اس پر دیوان چند خاموشی سے دربار سے نکل کر گھر آگیا۔ شرم و ندامت سے زہر کھالیا اور چوبیس گھنٹے کے اندر مر گیا۔

رنجیت سنگھ کو اپنے اس وفادار افسر کی موت پر صدمہ ہوا اور محمد خان کی رہائی کا حکم دے دیا۔ لیکن اس اثنا میں محمد خان وحشیانہ سلوک سے فوت ہو چکا تھا۔

ان دونوں واقعات پر رنجیت سنگھ سخت شرمندہ ہوا اور دو دن تک کھانا نہ کھایا اور بہت دن تک پریشان رہا۔"

محمد خان کو قلعہ کلر کہار (علاقہ کھٹڑ) میں ہلاک کر دیا گیا۔ اس کے بعد غلام خان نے سکھوں اور پھر انگریزوں سے مقابلہ جاری رکھا۔ میجر ایبٹ نے وعدہ کر کے اس کو بلایا اور قید کر کے ۱۲۔ مئی ۱۸۴۹ء کو اٹک کے قلعہ میں محبوس کر دیا۔ بعد ازاں اس کو الہ آباد بھیج دیا گیا اور ۱۸۵۷ء میں وہاں اس کو پھانسی دے دی گئی۔

ترین قوم کے نامور افراد

اس قوم کے عہد ماضی کے ممتاز افراد کے حالات بیان ہو چکے ہیں۔ انہوں نے ہزارہ (میدان ہزارہ) پر حکومت کی۔ سکھوں اور انگریزوں سے مقابلہ میں جان تک لڑا دی۔

عہدِ حاضر کے چند قابلِ ذکر اشخاص

۱۔ خان میر افضل خان مرحوم۔ خان آف درویش۔ آپ نیک سیرت، پرہیزگار اور قابلِ عزت خان ہوئے ہیں۔ شیخ سعدیؒ کی "گلستان اور بوستان" بر نوک زبان تھی۔ گفتگو میں اس کی حکایات اور اشعار خوب برمحل چسپاں کرتے تھے۔

۲۔ رسالدار میجر میرداد خان صاحب مرحوم۔ آپ موضع ریحانہ کے سربرآوردہ ترین خاندان کے ممبر تھے۔ آپ کی قابلیت اور لیاقت کا زندہ ثبوت ان کے دو نامور فرزندان:

(۱) فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم سابق صدر پاکستان

(۲) سردار بہادر خان مرحوم سابق مرکزی وزیر (مغربی و مشرقی) پاکستان تھے۔

(۳) خان عبدالمجید خان ساکن موضع تلوکر، آپ بیرسٹر تھے۔ تعمیری کردار کے مالک تھے۔

سرکاری ملازمت میں تھے۔ ۱۹۳۵ء میں پنشن پر تشریف لائے۔ ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں سرحد اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔

ترین موضع ڈنگی

ترین قوم کی ایک شاخ تور ترین (موضع ڈنگی، کوٹ نجیب اللہ سے جانب غرب آباد ہے۔ یہ گاؤں خداداد خان ترین کے وقت سے آباد ہے۔ اس کا محل وقوع دو نالوں کے درمیان ٹیڑھی سی جگہ ہے۔ الہذا ڈنگی نام ہوا۔

بڑے قحط ہزارہ (۱۷۸۳ء) میں یہ گاؤں غیر آباد نہیں ہوا تھا۔

ہزارہ میں ترین قوم کے زوال کے بعد یہ خاندان بھی اس گاؤں سے کچھ مدت کے لئے نکل گیا تھا۔

سکھوں کے عہدِ حکومت میں یہ گاؤں مقدم مشرف ساکن کوٹ نجیب اللہ کو جاگیر میں ملا تھا۔

جنگ موڑہ یہ جنگ ۱۸۲۱ء میں بمقام موڑہ نزد موضع ڈنگی مابین حکمان سنگھ حاکم اٹک اور اور غلام خان ترین میں ہوئی۔ یہ علاقہ سرحد ہزارہ پر ہے۔

حکماں سنگھ اٹک سے ہزارہ میں امن قائم کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس جنگ میں ترین خاندان سے وارث خان و سردار خان (دونوں بھائی)، اور ان کے تین نوکر (ایک لوہار اور دو موچی)، شہید ہوئے تھے۔ اس جنگ میں سکھوں کو شکست ہوئی تھی۔ ان شہیدوں کی قبریں اب بھی موضع ڈنگی میں مشہور ہیں۔

قوم تنولی

ابتدائی تاریخ سلطان سبکتگین نے اپنے عہد میں مردان اور سوات کے علاقہ کو بدھ مذہب سے خالی کر دیا تو غزنی کے درہ تانال سے آوان، پٹھان اور سادات کرام کے سینکڑوں خاندان لا کر اس علاقے میں آباد کئے۔ جو آگے چل کر تناولی قوم کے نام سے مشہور ہوئے۔

ہزارہ میں آمد

۱۴۷۲ء اس قوم نے دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر آباد ترکوں پر حملہ کیا اور مانسہرہ، اشنکیاری تک کا علاقہ فتح کرلیا۔ دریائے سندھ کو پار کرنے کے بعد مشرقی کنارے کے پہاڑ کی جس بلندی پر ان کا لشکر خیمہ زن ہوا۔ اس جگہ کا نام ڈیرہ رکھا جو ان کی ابتدائی ریاست کا دارالحکومت بنا۔

قوم تناولی کے دو قبیلے ہیں: ہندوال اور پلال۔

جو ان کے جد امیر اعظم خان کے دو بیٹوں ہندو خان اور پال خان کی اولاد سے ہیں امیر اعظم خان تو خود سوات ہی میں کسی جنگ میں کام آئے۔ اس کے بعد ان دو بھائیوں ہی نے ہزارہ پر حملہ کر کے یہ علاقہ لے لیا، جو تناول کے نام سے موسوم ہوا۔

تقسیم ملک

ان دو بھائیوں نے اپنا یہ فتح شدہ ملک دو حصوں میں تقسیم کرلیا۔ ہندوال پتہ کے حصے میں امب، دربند اور متعلقہ علاقے۔ تناول بالا، آیا اور پلال کے حصے میں تناول پائیں مشتمل برعلاقہ بلاہنک و گڑھیاں آیا۔

ریاست بالائی تناول

یہ ضلع ہزارہ کے مغربی حصہ کے وسط میں ہے۔ اس کے جنوب میں علاقہ بدہنک، مغرب میں دریائے سندھ اور اس سے اوپر شمال کی جانب کالا ڈھاکہ ہے۔ مشرق میں ایبٹ آباد اور مانسہرہ کی تحصیلیں ہیں اور شمال میں وادئ اگرور۔

اس علاقے کے مشرقی کونے سے دریائے سیرن اور شمالی حصہ سے نالہ نار جو وادئ اگرور سے آتا ہے، گزرتا ہے۔ اس علاقہ کا بڑا پہاڑ بھینگڑہ ان دو دریاؤں کے درمیان ہے جس میں بے شمار چیڑھ اور دیار کے درخت ہیں۔ اس کی بلندی ۸۵۰۰ فٹ تک ہے۔

ریاست امب (ہندوال)

یہ ریاست نواب ہیبت خان کے وقت سے ہے، جس نے اٹھارویں صدی میں باقی خوانین ہندوال پر سرداری حاصل

ماخذ ۱۔ تاریخ ہزارہ مرتبہ ویس ۱۸۷۲ء ۲۔ ابٹسن اقوام شمال مغربی سرحد۔ ۳۔ ہزارہ گزیٹر ۱۹۰۷ء ۴۔ تاریخ تنولیاں، سید مراد علی ۱۸۷۵ء۔

کر لی تھی۔ ۱۷۰۲ء سے ۱۸۰۳ء تک حکمران رہا۔

پلال ریاست اس قوم کا مشہور سردار زبردست خان المعروف بہ صوبہ خان ہوا۔ یہ بہت بلند اقبال شخص تھا۔ میدان ہزارہ، جدون اور پکھلی کے علاقوں پر غلبہ حاصل کر لیا۔ بہت رعیت پرور حاکم تھا۔ اس کی اپنی رہائش موضع بھوہار بر لب دریائے سرن تھی یہ موضع بیٹر اس نے آباد کیا اور باہر سے لوگ لاکر بسائے۔

درانی حکومت کے عہد میں ہزارہ کا حاکم تھا اور خدمات کے صلہ میں اس حکومت نے اس کو صوبہ خان کا خطاب دیا تھا۔

۱۸۰۳ء میں عمر رسیدہ ہو کر دستارِ سرداری اپنے بڑے بیٹے فتح شیر خان کے سر پر رکھی۔

قوم تنولی کی شاخیں بندوبست ۱۸۷۲ء کے رواج نامہ کی رو سے مندرجہ ذیل دو بڑی شاخیں ہیں۔ ۱۔ ہندوال۔ ۲۔ پلال۔

پتہ ہندوال میں سے نوابان امب و دربند ہوتے ہیں اور خان پھلڑہ بھی اسی پتہ سے تھا۔

پتہ پلال۔ یہ شاخ زمانہ قدیم سے معزز چلی آتی ہے۔ بڑے بڑے معرکوں میں ان کے قدیمی کارنامے تاریخ کے اوراق پر پائے جاتے ہیں۔ ان کا ایک جدامجد زبردست خان المعروف بہ صوبہ خان (صوبہ دار علاقہ ہونے کی وجہ سے) بڑا نامی گرامی گزرا ہے۔ اس کے نام پر اس کی اولاد کے معززین صوبہ خانی کہلاتے ہیں۔

تنولیوں کی ذیلی سات بڑی شاخیں ہیں۔

۱۔ میرال۔ ۲۔ سیدال۔ ۳۔ بتیال۔ ۴۔ ٹنکریال۔ ۵۔ کرگوال۔ ۶۔ زری تال (مجی تال) ۷۔ بھوال۔

پتہ ہائے تنولی کی باہمی آویزش کا پس منظر ہیبت خان پتہ ہندوال کا خان موضع گلی بدرہال میں رہائش رکھتا تھا۔ اس نے قوت بہم پہنچائی۔ گل شیر خان (پسر صوبہ خان)، پتہ پلال کے خان کو ناگوار گزری اور اس نے حملہ کر کے موضع گلی بدرہال کو جلاکر خاکستر کر دیا۔ ہیبت خان مقابلہ کی طاقت نہ رکھتا تھا۔ مجبوراً گل شیر خان کی تابعداری اختیار کی۔ گل شیر خان نے اس موضع گلی کو پھر سے آباد کرنے کی اجازت دے دی۔

اس مصالحت کی رو سے احمد علی خان پسر گل شیر خان کا رشتہ ہیبت خان کی لڑکی سے ہوگیا اور گلشیر خان کی لڑکی کا رشتہ ہاشم علی خان پسر ہیبت خان سے ہوگیا۔ لیکن جانبین کے دل میں کینہ کا تخم بویا گیا جو مدت تک ایک دوسرے پر دست درازی اور قتل مقاتلہ کی صورت میں جاری رہا۔

نواب خان برادر ہاشم علی خان (جو اس اثنا میں فریب سے قتل کر دیا گیا تھا)، نے آہستہ آہستہ اپنی قوت جمع کرنا شروع کر دی۔

پتہ پلال میں خانہ جنگی کی وجہ

اکبر علی خان (احمد علی خان کا بھتیجا)، اپنے پدری ورثہ سے محروم ہو کر عطا محمد خان درانی ناظم کشمیر سے امداد کا طالب ہوا۔ اس نے فوج بھیجی تو احمد علی خان بھاگ کر گندگر (سری کوٹ کا پہاڑ)، کے پہاڑ موضع بھروسہ چلا گیا۔ درانی فوج نے اکبر علی خان کو موضع پھوہار اور بیٹر میں مقیم کر دیا۔ اور احمد علی خان کے مسکن ڈیرہ کو جلا دیا۔ درانی فوج کے جانے کے بعد احمد علی خاں واپس آگیا اور موضع ڈیرہ میں مقیم ہوگیا۔

۲۔ پتہ ہندوال کے سردار نواب خان نے ان ایام میں زور پکڑا۔ پرانی دشمنی (برادر خود ہاشم علیخان کے قتل)، کی بنا، پر پھوہار اور بھاروکوٹ پر قبضہ کر لیا۔ لیکن محمد خان ترین کے خوف مقابلہ سے واپس چلا آیا۔ احمد علی خان نے نواب خان کے ڈر سے اپنے عم زاد سر بلند خان سے صلح کرالی۔ لیکن شیروان میں سر بلند خان نے احمد علی خان کو دھوکہ سے بحالت نماز گولی سے مروا دیا اور خود پتہ پلال کا خان بن کر موضع شنگڑھی میں اقامت اختیار کی۔

نواب خان اور محمد عظیم خان درانی کی مخالفت

بی بی ادعیہ بیگم والدہ محمد عظیم خان (امیر دوست محمد خان کشمیر سے کابل جا رہی تھی کہ رستے میں نواب خان نے محصول مانگا۔ بہت سے لیت ولعل کے بعد مال کا محصول دینے پر والدہ امیر دوست محمد خان راضی ہوگئی۔ اس اثنار میں ایک گٹھڑی قیمتی سامان پر نواب خان کی نظر پڑی۔ جس میں والدہ دوست محمد خان کا ایک آزار بند طلا کار تھا۔ وہ نواب خان نے نکال لیا۔ یہ بے ادبی تھی۔ لہٰذا بیگم صاحبہ نے خط میں اس واقعہ کا ذکر اپنے بیٹے عظیم خان کو کشمیر لکھ بھیجا اور خود کابل روانہ ہوگئی۔

جب خط عظیم خان کو پہنچا تو اس وقت وہ سکھوں سے شکست کھا کر عازم کابل براہ مظفر آباد

ہونے والا تھا۔

وہ بمعہ افواج یہاں آیا۔ موضع بھوج درہ پر نواب خان سے مقابلہ ہوا۔ دو دن کے کشت و خون کے بعد نواب خان کو شکست ہوئی۔ وہ بمعہ اہل و عیال یاغستان چلا گیا۔

عظیم خان نے عہد و پیمان دے کر نواب خان کو بلایا اور پھر قید کر کے ساتھ لے گیا اور دریائے لنڈا دو دریائے کابل، میں چمڑے میں سی کر غرق کر دیا۔

عہد پائندہ خان

نواب خان کے بعد یہ بہت صاحب اقبال ہوا۔ پتہ ہندوال کے سب خوانین کو مطیع کر لیا۔ سب ملک پر قبضہ کر کے سب کو مزارع بنا دیا۔

اس نے سکھوں سے مدت تک جنگ و جدل جاری رکھا۔ اپنے ملک کو آزاد رکھا اور سکھوں پر اپنا رعب جمائے رکھا۔ اس کی وفات ۱۸۴۳ء میں ہوئی۔

اس کے بعد جہانداد خان پسر پائندہ خان نواب ہوا۔ اپنی موت (۱۸۵۸ء) تک انگریزی حکومت کے ساتھ اتحاد رکھا، جس کے صلہ میں انگریزوں سے نوابی کا خطاب حاصل کیا۔ صلح کن طبیعت کا آدمی تھا۔

نواب محمد اکرم خان

نواب جہانداد خان کی اچانک وفات (کشتی میں عبور دریا کے وقت) کے بعد محمد اکرم خان ۹ سال کی عمر میں نواب ہوا۔

سیرت و کردار میں اپنے دادا پائندہ خان کی طرح شجاع بہادر اور مضبوط کیرکٹر کا آدمی تھا

مختصر شجرہ نوابان امب

ہیبت خان

نواب خان — ہاشم خان (۱۸۱۶ء میں قتل ہوا۔)

پائندہ خان (وفات ۱۸۴۳ء) — مدت خان (خان پھلڑہ وفات ۱۸۷۸ء) — امیر خان

جہانداد خان (وفات ۶ر نومبر ۱۸۵۸ء)

نواب سر محمد اکرم خان (پیدائش ۱۸۴۶ء وفات ۱۹۰۷ء، ۱۸۵۸ء میں بعمر نو سال نواب ہوا۔)

نواب سر محمد اکرم خان
|
نواب خانیزمان خان (وفات ۱۹۳۴ء)
|
نواب محمد فرید خان (ولادت ۱۶ر جون ۱۸۹۲ء۔ گدی نشینی ۲۶ر جولائی ۱۹۳۶ء وفات ۲۱ر دسمبر ۱۹۷۰ء)
|
محمد سعید خان (وفات ۱۹۷۴ء)

سردار پائندہ خان اور سید احمد شہیدؒ

۱۸۳۰ء میں سید احمد شہیدؒ پشاور اور کوہاٹ پر قبضہ کرنے کے بعد ہزارہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ سب خوانین تناول نے سید شہیدؒ کی بیعت کر لی۔ لیکن پائندہ خان نے بیعت سے انکار کیا۔ اس پر سید شہیدؒ نے اپنے بھانجے سید احمد علی کو ہمراہ سر بلند خان پلال، سردار مدد خان برادر پائندہ خان (یہ دونوں پائندہ خان کے مخالف اور سید شہیدؒ صاحب سے بیعت تھے)، کو بھیج کر ملک تنول فتح کر لیا اس پر پائندہ خان نے ہری سنگھ سے امداد طلب کی اور بطور ضمانت اپنے بیٹے جہانداد خان کو اس کے پاس بھیج دیا۔ جو سات سال سکھوں کی قید میں رہا۔ ہری سنگھ فوج کے ساتھ حملہ آور (مانسہرہ کی جانب سے) ہوا اور سید احمد علی نے پھلڑہ کے قریب دریائے پر ناکہ بندی کی۔ مجاہدین نے بڑی بہادری اور شجاعت سے مقابلہ کیا۔ مگر سکھوں کی فوج زیادہ اور آتش بار اسلحہ سے مسلح تھی۔ لہٰذا سب غازی میدان میں شہید ہوئے۔ اس کے بعد سید شہید پنجتار چلے گئے۔ سر بلند نے واپس آکر سکھوں سے معافی حاصل کر لی۔ اور جاگیر حاصل کر کے اپنے وطن میں مقیم ہو گیا۔

دلازاک

یہ پٹھان قوم شاندار ماضی کی حامل ہے۔ گکھڑوں اور ترکوں کے بعد یہی قوم ہزارہ میں آئی۔ افغانستان سے ہجرت کے بعد ننگر ہار (جلال آباد) میں آئی۔ وہاں سے یہ قوم موضع پشاور اور مردان میں آئی۔ وہاں سے نکالے جانے کے بعد یہ ہزارہ میں آئی۔ افغانستان، پشاور اور مردان سے ہزارہ آنے تک سب زمانہ اس پر حوادث و آزمائش کا گزرا۔ جس سے اس کی طاقت اور ناموری کو بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔ اپنی جمعیت کے ہر بار منتشر ہونے پر آخر کار صالح محمد خان کو

دوسری مرتبہ دپہلی دفعہ یہ قوم بحکم جہانگیر بادشاہ ۱۶۰۷ء ۱۶۰۸ء میں حسن ابدال کے نواح سے جلاوطن کرکے لاہور کے مضافات میں بھیجی گئی) ہزارہ میں جانے کے بعد اور سرائے صالح آباد کر لینے کے بعد اس قوم کو سکون حاصل ہوا اور تاحال اپنے موجودہ مستقر پر یہ قوم آباد ہے۔

اخون درویزہ کی روایت کے مطابق دلازاک افغان پہلے پہل ننگرہار میں آئے اور پھر یہاں سے مشرق کی طرف چلے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دلازاک ننگرہار میں اس وقت آئے جب چنگیز خاں (گیارھویں صدی عیسوی) نے حملہ کرکے ان ترک قبیلوں کو جو یہاں آباد تھے، تباہ کردیا۔

تواریخ حافظ رحمت خانی (پشتو) کے بیان کے مطابق جب بابر بادشاہ نے ہشت نگر پر حملہ کیا تو اس وقت یہ قوم موضع کلیانی (حال ہوتی مردان) میں دریائے لنڈا (دریائے کابل) کے کنارے سے لے کر ہشت نغرا[1]، شہباز گڑھ، کڑہ مار (موضع کالوخان کا پہاڑ)، شیر درہ، پنج تار تک اور پہاڑ کے سارے دامن دربند تک اور دونوں ہزارہ جات (چھچھ اور میدان ہزارہ)، تربیلہ اور ضلع پشاور میں آباد تھی۔

یوسف زئی اور مندڑ قوم نے ان کو ضلع پشاور اور مردان سے اغلباً ۱۵۲۳ء، ۱۵۲۴ء سے نکال دیا اور وہ چھچھ ہزارہ میں آگئے۔

ہمایوں بادشاہ نے ان کو اس علاقہ میں بوجہ فتنہ فساد اور راہزنی وغیرہ کے جرم پر ۱۶۰۷ء - ۸ یہاں سے نکال کر لاہور بھیج دیا تھا اور ان کے سرکردہ لوگوں کو گرفتار کر لیا۔

مطابق تاریخ ہزارہ "ان جلاوطن دلازاکوں کے سربراہ صالح محمد خان اور اس کا بھائی شیر محمد خان تھے۔ ۱۶۰۲ء میں ان دونوں بھائیوں نے دہلی سے آکر دوبارہ دخل پایا۔ صالح محمد نے سرائے صالح ۱۶۰۲ء آباد کی۔ انگریزی عہد میں اس قوم کا نامور شخص خدابخش خان تھا یہ قوم دلازاک کا جاگیردار تھا۔ اس کا کوئی بیٹا نہ تھا۔ صرف ایک بیٹی تھی جس کی شادی اس کے بڑے بھتیجے الٰہی بخش خان سے ہوئی۔ خدابخش خان کی جاگیر الٰہی بخش خان کو منتقل ہوئی۔ الٰہی بخش خان ۱۹۰۵ء میں فوت ہوا۔ اس کی وفات پر اس کا بڑا بیٹا احمد خان جاگیردار ہوا۔ یہ زبردست اور خرآج خان تھا۔ بڑے رعب و داب کا مالک تھا۔ درمیانہ مضبوط قد، گورا رنگ اور جامہ زیب انسان تھا

---

[1] ہشت نگر۔

اس کی وفات ۸ر دسمبر ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔

سادات

سادات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد اور ان کے انوارِ رحمت کے حامل ہیں۔ مسلمانوں کیلئے علم و فضیلت کے چراغِ ہدایت اور لشکرِ اسلام کے امیرِ لشکر ہیں۔ لہٰذا جہاں جہاں مسلمانوں کی جماعتیں گئیں سادات کا ایک خاندان ضرور ان کے ہمراہ بطور ہادی گئے اور بعض دفعہ سادات کے سرکردہ اشخاص لشکرِ اسلام کے قائد ہو کر گئے۔

ہزارہ میں بھی سادات کی آمد ان دو ہی طریقوں سے ہوئی۔ سید جلال بابا د حضرت سید گلی، پیر بابا کی اولاد سے ہیں، صواتی قوم کے سرِ لشکر ہو کر اس ملک میں آئے۔ ان کی اولاد، سادات ترمزی، کاغان اور صوابی میرا کے سادات ہیں۔

سادات گیلانی بطور ہادی و مرشد اس ضلع میں آئے۔ ان کی اولاد سے موضع داتہ و تحصیل مانسہرہ سلطان پور (نزد حویلیاں) کے سادات ہیں۔

سادات کاغان کاغان کے سادات کی تاریخ نور شاہ (غازی بابا)، پسر سید جلال بابا کے حملہ سے وابستہ ہے۔ جس نے اٹھارھویں صدی میں سواتی، کونشی وغیرہ اقوام کی مدد سے اس کو فتح کیا۔ فتح کرنے کے بعد سید نور شاہ پسر ضامن شاہ[1] اپنے رفقا، شرف دین اور نور محمد کونشی وغیرہ سمیت اس وادی میں مسکن پذیر ہو گئے۔

عہدِ دُرّانی اٹھارھویں صدی کے آخری نصف سے انیسویں صدی کے شروع تک سب ہزارہ درانیوں کے ماتحت رہا۔ کشمیری راستہ (جو اس کے وسط سے گزرتا تھا) کی وجہ سے یہ علاقہ خاص اہمیت رکھتا تھا اور سیدوں کی خاص عزت تھی۔

عہدِ سکھاں ۱۸۱۸ء میں ہزارہ پر سکھوں کی حکومت ہو گئی۔ ۱۸۱۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کشمیر اور شمالی ہزارہ کو بمعہ کاغان اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ سکھوں کا طرزِ حکومت

---

[1] ضامن شاہ جنگ بالاکوٹ میں حضرت سید احمد شہیدؒ کے بمعہ اپنے چالیس پچاس آدمیوں کے موجود۔

ظالمانہ تھا اور سب ہزارہ ان سے بے زار تھا۔ سکھوں کی حکومت سے تنگ آکر تمام علاقہ شمالی ہزارہ کی معیت میں سادات کاغان نے بھی مجاہدین کا ساتھ دیا۔ حضرت سید احمد شہید کی شہادت کے بعد سادات نے سکھوں کی مزاحمت جاری رکھی۔ سادات کاغان اور ان کے سواتی ہمراہیوں نے سکھوں کی فوج کو جو دیوان ابراہیم کے زیر کمان تھی، مقام دیوان بیلہ تباہ کر دیا (اس مقام کا نام ہی دیوان کی شکست کے بعد دیوان بیلہ ہو گیا)

ہزارہ میں سکھوں کے خلاف بغاوت سے سادات کاغان دوسری اقوام ہزارہ کے ہم دوش رہے اور سکھوں کے قلعہ جات تنکیاری، بھیر کنڈ، گڑھی جیب اللہ اور اگرور کو فتح کر لیا۔ گکھڑوں نے خان پور کا قلعہ لے لیا۔ خوانین ہزارہ نے ہری پور کا قلعہ فتح کر لیا۔ سید اکبر ساکن ستھانہ ترندی سید کو حاکم ہزارہ چن لیا۔

جنگ کے خاتمہ پر انگریزوں اور سکھوں کے معاہدہ دفعہ ۱۲ کی رو سے کشمیر بمعہ ہزارہ اور کاغان راجہ گلاب سنگھ کو دیا گیا۔ لیکن اہل ہزارہ کی مخالفت سے راجہ گلاب سنگھ نے گھبرا کر ہزارہ کے بدلے جموں کے نزدیک کا علاقہ لے لیا۔ اس طرح سے ہزارہ و کاغان کا خوشنما علاقہ گلاب سنگھ کے چنگل سے نکل گیا۔

عہدِ انگریزی

۱۸۴۹ء کے آخر میں سکھ راج ختم ہو گیا اور انگریزی دور کے عروج کے آثار شروع ہو گئے۔ میجر ایبٹ ہزارہ کے پہلے ڈپٹی کمشنر کے عہد میں سادات سے گوجروں کی مخالفت کی بناء پر گوجروں نے اس کے کان میں سادات کے خلاف مجاہدین سے ساز باز رکھنے اور علاقہ میں بغاوت پھیلانے کا الزام پھونک دیا۔ جس پر میجر ایبٹ نے ہر سر معتبر سیدوں کے لڑکوں کو بطور حاضر باشی اپنے پاس رکھنے کی شرط لگا دی۔ اس پر سید بہت ناراض ہوئے۔ سید ضامن شاہ (یا زمان شاہ) نے کمشنر پشاور کے سامنے پیش ہونے سے انکار کر دیا تو ایک فوج کاغان بھیجی گئی اور ان کو جبراً مطیع کر کے کاغان سے نکال دیا گیا۔

سادات کاغان سے چپقلش میجر ایبٹ کو مہنگی پڑی اور افسران بالا نے ۱۸۵۲ء سے اس کو ضلع سے ہٹا کر واپس فوج میں بھیج دیا۔ یہ سادات کے اثر و رسوخ کا عملاً اعتراف تھا۔ ۱۸۵۵ء میں سادات کاغان کو واپس جانے کی اجازت مل گئی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہند میں سادات نے

انگریزوں کی مدد کی اور ۱۸۵۵ء ملکی فوج کے سپاہیوں کو جو مردان و پشاور سے بھاگ کر ہزارہ کی طرف آئے۔ ان کو "وادی بکب سر" کے مقام پر گرفتار کروانے میں مدد دی۔ ان کی گرفتاری اور قتل کا واقعہ جس جگہ ہوا اس کا نام پوربی ناڑ آج تک مشہور ہے۔

ساداتِ ترمذی اس قوم کا مورثِ اعلیٰ سلاطینِ اسلام کے وقت اپنی توقیر و عزت دیکھ کر ملک عرب سے اس طرف آئے۔ جابجا پھیل کر ملکیت حاصل کر لی۔ اس خاندان کے لوگ ترمذ میں سکونت پذیر ہوئے، لہٰذا ترمذی کہلائے۔ یہ خاندان اس ضلع میں نہایت بزرگ مشہور ہے۔ کاغان، مانسہرہ کے شمالی حصہ اور صوابی مانیری (ضلع مردان، استھانہ منگل تھانہ، تختہ بند) علاقہ جدون و سوات میں آباد ہیں۔

اس خاندان نے ملکی سیاست کے لئے سربراہ اور مجاہدین پیدا کئے۔ میدان جہاد حریت کے شہسوار رہے ہیں۔

ساداتِ گیلانی مانڑہ (تحصیل مانسہرہ)، سلطان پور نزد حویلیاں منظفر آباد (علاقہ آزاد کشمیر) اور خانیار مقبوضہ کشمیر میں آباد ہیں۔ یہ مبلغین اسلام اور سجادہ نشین طریقت ہیں۔ ساداتِ کاغان (ترمذی)، پیر بابا (بنیر) کی اولاد سے ہیں۔ سید جلال بابا (پیر بابا کی چوتھی پشت میں)، اس ملک میں آئے اور پکلی باغ میں مقیم ہوئے۔ سلطان محمود، ترک، اس علاقہ کا فرمانروا تھا۔ اس نے سید جلال بابا کو اپنی دامادی میں لے لیا۔ درہ بھوگڑمنگ جہیز میں دے کر وہاں آباد کر دیا۔ سید جلال بابا کے روز افزوں عزت و اثر دیکھ کر سلطان کو ناراضی ہوئی۔ خفیہ طور پر ان کو ہلاک کر دینے کا منصوبہ بنایا۔ سلطان کے ایماء پر ان پر بمقام ڈگ علاقہ بھوگڑمنگ حملہ ہوا، جس میں وہ زخمی ہو گئے۔ اس واقعہ کے بعد سید جلال بابا بنیر واپس چلے گئے۔

قوم سوات جو ان کے خاندان کی معتقد تھی، کا ایک لشکر لے کر سلطان محمود پر چڑھائی کر دی۔ اس وقت سلطان بذاتِ خود بادشاہ دہلی کے پاس حاضر تھا۔ قوم صواتی نے بہ راہنمائی سید جلال بابا پکھلی پر قبضہ کر لیا۔ ملک مقبوضہ کا چہارم حصہ لے کر باقی لشکر صوات پر تقسیم کر دیا۔

سید جلال بابا کی اولاد سے بڑے بڑے نامور اور ذی عزت افراد ہوتے رہے۔

بعد میں سید جلال بابا نے تناول پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن تناولی قوم بنیر سے سید جلال بابا

کے برادر زادوں پیر امام بابا اور نجم الدین بابا کو لے آئے اور اپنے آپ کو محفوظ کر لیا اور اپنے دیہات سے چہارم حصہ ان کو دے دیا۔ ان دونوں کی شادی سید جلال بابا کی بیٹیوں سے ہوئی۔ صوبہ خان سردار قوم تنولی کی بیٹی کی شادی سید احمد بابا پسر سعد الدین کے ساتھ کی گئی۔ یہ پہلے کلنجر میں آباد تھے پھر وہاں سے نکل کر صوابی میرا آباد کیا اور یہاں ملکیت بنالی۔

ساداتِ صوابی

زمانہ ماضی قدیم (۱۸۰۰ء) میں اس خاندان سید قاسم اور ان کا بیٹا ہوڈی شاہ ساکن صوابی، ایک نامور اور معزز آدمی تھے۔ زمانہ حال میں اس قوم میں پیر سرور شاہ ایک معروف ہستی تھی۔ وکالت کا امتحان پاس کرنے کے بعد سرکاری پیروکار مقدمات فوجداری مقرر ہوئے۔ ترقی کر کے سپرنٹنڈنٹ پولیس ہوئے اور بعد میں فرنٹیر کنسٹیبلری کے کمانڈنٹ مقرر ہوئے اور ۱۹۶۰، ۱۹۶۱ء میں ریٹائر ہوئے۔ ذاتی معاملات میں معاملہ فہم اور خاندان پرور انسان تھے۔ خاندان کے افراد حکومت کے ہر محکمہ میں بکثرت ملازم کرایا۔ زراعت کے شوقین تھے۔ خاص کر باغات کے۔ اپنی جائداد موضع کندریالہ (صوابی میرا) میں مالٹا کے بہترین باغات لگوائے۔ جو اب تربیلہ ڈیم کی جھیل کی وجہ سے زیر آب ہیں۔

۵ رجون ۱۹۷۱ء بعارضہ حرکت قلب بند ہونے سے وفات پائی۔ اللھم غفرلہٗ

ساداتِ گیلانی

ان کا خاندان موضع داتہ، تحصیل مانسہرہ میں برلب سڑک آباد ہے اور زمانہ قدیم کی شاہراہ عام پر ہے جو کشمیر کا راستہ تھا جو یہاں سے دوگر نالہ سے پار ہو کر گڑھی حبیب اللہ سے ہو کر جاتا تھا۔

عہد قدیم میں جدون اور سواتی قوم کا جھگڑا اس حد پر عموماً رہتا تھا۔ رفع نزاع کے لئے دونوں اقوام نے سادات کو اس جگہ بسا دیا، تاکہ کوئی قوم پھر ادھر ادھر تجاوز نہ کر سکے۔ داتہ کا گاؤں کسی داتا نام شخص نے آباد کیا تھا۔ یہ اس کی وجہ تسمیہ ہے۔

ساداتِ گیلانی حضرت غوث الاعظم گیلانی کی اولاد ہیں۔ ان کے جد سید ابوالبرکات محمود الحموی البغدادی ہیں۔

ان کے ایک صاحبزادے سید عبداللہ شاہ المقلب بہ صحابی ٹھٹھہ (سندھ) تشریف لے گئے اور وہاں ہی فوت ہوئے۔ ان کے دو صاحبزادے تھے، جو دونوں ٹھٹھہ ہی میں پیدا ہوئے۔

۱۔سید حسن پشاوری۔وفات ۲۱؍ذیقعدہ ۱۱۱۵ھ مطابق ۱۰؍اپریل ۱۷۰۲ء۔مدفن پشاور
۲۔سید شاہ محمد فاضل خانیاری۔آپ سادات خانیار (کشمیر) کے جد ہیں۔

سید حسن پشاوری آپ کے دو صاحبزادے تھے۔سید زین العابدین، ان کی والدہ کوٹلہ محسن خان (پشاور) کے خان کی بیٹی تھی۔آپ محدث اور فقیہہ تھے۔آپ کی ولادت پشاور میں ۱۰۹۰ھ، ۱۶۷۹ء میں ہوئی۔انہوں نے بہت سیاحت کی اور بہت سے اولیاء سے کسب فیض کیا اور خاص کر اپنے چچا سید شاہ محمد فاضل قادری سے۔آپ جب سیاحت کشمیر کے لئے روانہ ہوئے اور ضلع ہزارہ میں برلب دریائے دوڑ موضع سلطان پور (نزد حویلیاں) پہنچے تو آزاد خان درانی حاکم کشمیر، خبر پاکر حاضر ہوا۔موضع سلطان پور عطا کیا اور اپنی بیٹی ان کے نکاح میں دے دی۔ان کی دوسری بیوی شاہ محمد فاضل قادری خانیاری کی صاحبزادی تھی۔
سخی صوبہ خان والئی تناول نے موضع مانگل ویبری عنایت کیا
سیاحت کشمیر کے بعد آپ واپس آکر سلطان پور میں مقیم ہوئے۔حسب معمول لنگر جاری فرما کر طریقت وارشاد کے کام میں مشغول ہوئے۔وفات ۱۱۶۹ھ، ۱۷۵۶ء مدفن سلطان پور۔
سید حسن پشاوری کے دوسرے صاحبزادے، سید شاہ محمد غوث ہیں۔ان کی ولادت ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء ہے اور وفات ۱۱۷۸ھ، ۱۷۶۴ء ہے۔مدفن لاہور ہے۔آپ سادات پشاور ومظفرآباد کے جد ہیں۔
سید حسن پشاوری کے تیسرے صاحبزادے سید علی شاہ لاہوری ہیں۔

ساداتِ ستھانہ

تاریخ سادات ستھانہ عزم وشجاعت کی داستان ہے۔تاریخ ہزارہ کا سنہری اور قابل فخر باب ہے۔اس سرزمین سے تحریک آزادی کے مجاہد پیدا ہوئے۔سید احمد شہیدؒ کی سکونت اور اس کے باسیوں ان کا معیت اعزاز حاصل رہا۔اوران کی شہادت کے بعد ان کے خلفا کا مسکن اور جہاد آزادی کے معرکوں کا مرکز بننے کا شرف اس سرزمین کو حاصل رہا۔

ستھانہ کی آبادی

ڈپٹی کمشنر ہزارہ کے ایک خط مورخہ ۱۰ اپریل ۱۸۶۸ء میں تحریر ہے کہ :
" سرکار انگریزی کی حد سے متصل بہت سال ہوئے کہ چند سید گھرانوں نے جن کے گرد پنجاب، سرحد اور پٹنہ کے لوگ جمع ہو گئے تھے، اس کی بنیاد ڈالی - ان کی کل تعداد تقریباً پانچ سو کے قریب تھی - وہ خود تو کمزور تھے - لیکن سرکار انگریزی کے علاقہ میں فتنہ انگیزی کا مرکز تھے اور سرکار انگریزی کے علاقہ کے جرائم پیشہ اشخاص اور دیگر پناہ گزینوں کے لئے جائے پناہ تھی - سید اکبر ان کا سرغنہ تھا جو بعد میں سوات کا بادشاہ بنا اور اوائل ۱۸۵۷ء میں فوت ہو گیا "

مولانا غلام رسول مہر نے اپنی کتاب " سرگزشت مجاہدین" کے صـ ۳۰۹ پر تحریر فرمایا ہے کہ :

" اٹھارھویں صدی عیسوی میں سید ضامن شاہ نے اس گاؤں کو آباد کیا - قدیم ستھانہ برلب دریائے سندھ تھا - لیکن ۱۸۴۱ء میں دریائے سندھ میں ایک خوفناک طغیانی آئی، جس سے ستھانہ برباد ہو گیا - موجودہ ستھانہ دریا سے دور بنایا گیا -
وجہ تسمیہ : اس گاؤں میں سادات کی رہائش تھی، لہٰذا سادات کا آستانہ کے نام سے مشہور ہو گیا - بعد میں ستھانہ کا نام لوگوں کی زبان پر چڑھ گیا "

ستھانہ کے سادات

سرکار انگریزی کے کاغذات بابت مجاہدین کی مسل میں ایک خط قاضی پیر عالم صاحب کا ہے (ساکن سکندر پور، نزد ہری پور) جو شروع عملداری انگریز میں ہزارہ کے اسسٹنٹ کمشنر تھے -

انہوں نے اپنے اس خط مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۸۸۵ء ستھانہ کے متعلق تحریر کیا ہے :

" ستھانہ کے سید، سید خوجہ بابا (ترمذی سید ہیں - اور پیر بابا (بنیر والے) کی اولاد ہیں ان کی قوم آج کل، منگل تھانہ، تختہ بند وغیرہ علاقہ غیر میں آباد ہیں اور ان کی ایک شاخ سادات صوابی - میرا اور گندف علاقہ سرکار میں آباد ہے - زمانہ قدیم میں یہ قوم دلیری اور راہزنی کے لئے مشہور رہی ہے - سادات ستھانہ کی شہرت سید اکبر کے زمانے میں اپنے انتہائے عروج کو پہنچ چکی تھی -

سادات ستھانہ کی مشہور ہستیاں

۱۔ سید اکبر: سر آلف کیرو اپنی کتاب "پٹھان" میں لکھتا ہے کہ:

"وہ جنگ سکھاں میں یوسف زیوں کے لشکر کا قائد تھا اور ۱۸۴۷ء میں یہ زندہ تھا۔ عہد سکھاں میں اپنی قابلیت اور حوصلہ سے طاقت حاصل کر لی۔ ہزارہ کے خوانین اور دوسرے لوگ جو سکھوں سے بھاگ کر ستھانہ پہنچتے، ان کو پناہ دیتا تھا۔ وہ علاقہ کے پٹھان اقوام امازئی، مداخیل، اتمان زئی اور گدون وغیرہ کا پیر تھا۔ وہ اس کی عزت کرتے تھے۔ اس وجہ سے وہ پائندہ خان تنولی (نواب امب) کے مقابلہ کا حریف بن گیا تھا۔ وہ ہندوستانی مجاہدین کی مدد سے، جب کبھی اس کو موقع ملتا تھا، نواب امب کے علاقہ کو نقصان پہنچاتا رہتا تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ایک دفعہ ستھانہ کو جلا دیا تھا۔ لیکن سیدوں نے پھر سے آباد کر لیا۔

سید اکبر ہمیشہ سرکار انگریزی کا مخالف اور دشمن تھا۔ ہندوستانی مجاہدین کا ایک گروہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا تھا اور سرکاری علاقہ کے پناہ گزینوں کو پناہ دیا کرتا تھا۔ میجر ایبٹ کے زمانہ میں ستھانہ کے لوگ ہمیشہ اس سرحد پر واردات کرتے رہتے تھے اور اس سرحد پر حکومت اور مقامی افسر خاص توجہ دیتے تھے۔"

سید اکبر کا بادشاہ سوات بنایا جانا

بقول مہر صاحب، ۱۸۴۹ء میں سید اکبر کو بہ منظوری اخون صاحب سوات، کے سوات کا بادشاہ بنایا گیا اور اپنی وفات (۱۸۵۷ء) تک وہ سوات کا بادشاہ رہا۔

اس سے قبل ۱۸۴۲ء میں ہری سنگھ نلوہ حاکم ہزارہ کی شکست پر سید اکبر کی دستار بندی بطور حاکم ہزارہ ہوئی اور اس کو بادشاہ کا لقب دیا گیا۔ نواب خان تنولی رئیس شنگڑی اور غلام خان ترین ساکن درویش اس کے وزیر مقرر ہوئے اور سیف اللہ خان رسالدار کو میر منشی کے عہدہ پر مامور کیا گیا۔

اس کے بعد اس کا بیٹا مبارک شاہ اور پھر پوتا فیروز شاہ مشہور ہوئے۔ انگریزی سرکار ان سے خائف رہی۔

اس خاندان کی ایک نامور ہستی سید عبدالجبار شاہ صاحب تھے۔ آپ سادات ستھانہ کے آخری چشم و چراغ تھے۔ آپ ایک قابل، اہل علم، صاحب قلم، تجربہ کار سیاست دان اور عربی و فارسی کے فاضل تھے۔ سرحد و ماورائے سرحد کے اقوام کی تاریخ بڑی شرح و لسبط کے ساتھ دو ضخیم جلدوں میں تحریر فرمائی۔

آپ کی پیدائش ۱۸۸۰ء اور وفات ۱۹۵۶ء ہے۔ ۱۸۹۷ء میں سوات کی جنگ آزادی میں بمقام لنڈاکی برخلاف برطانوی افواج شامل تھے۔ اگست ۱۸۹۸ء میں نواب محمد اکرم خان والئی امب کی دعوت پران کے پاس چلے آئے۔ جنوری ۱۸۹۹ء میں ان کے ولی عہد خانیزمان خان کے مصاحب مقرر ہوئے اور ۱۹۰۷ء میں ریاست امب کے وزیر مختار رہے۔

جنوری ۱۹۱۴ء تا آخر ستمبر ۱۹۱۵ء تک ریاست سوات کے بادشاہ رہے۔ وہاں سے آجانے کے بعد ۱۹۵۶ء تک ریاست امب کے وزیر رہے۔

سلمانی (شلمانی)

شلمانی قوم افغانستان سے آئی اور ان کے مورثِ اعلیٰ دراز خان ساکن کابل اور چار باغ (نزد جلال آباد) کا خان تھا۔ قوم پٹھان، سلیمان خیل سے تھا۔ اس کی اولاد ہزارہ میں آئی اور علاقہ تربیلہ، بھکیلہ، بھار و کوٹ وغیرہ میں برکنارہ دریائے دوڑ آباد ہوگئی۔

بموجب بندولبست ہزارہ ۱۸۷۲ء کے یہ قوم مندرجہ بالا دیہات کی مالک ہے اس ملک میں حاجی محمد قاسم خان نے آکر لقب اخون حاصل کیا۔

تاریخ آزاد پٹھان میں اللہ بخش یوسفی صاحب مرحوم لکھتے ہیں کہ قوم شلمانی کو مہمند قوم کا جزو سمجھا جاتا ہے۔

بموجب بندولبست ہزارہ ۱۸۷۲ء تربیلہ کی پرانی آبادی شلمانیوں کی ہے اور اتمان زئی (یوسف زیوں) کی شاخ، ان کے بعد اس علاقہ میں آئے۔

قوم بنبہ

تاریخ ہزارہ (بندوبست ۱۸۷۲ء) کے مطابق یہ قوم قریش حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اولاد ہیں۔ اس قوم کا مورث اعلیٰ سلطان کاشف عہد جہانگیر بادشاہ (سولھویں صدی) ملک بدخشاں سے براہ تبت اس ملک میں آیا اور راج کوٹ متعلق علاقہ کوٹلہ (مہاراجہ کشمیر کی حد) میں آباد ہوئے ان ایام میں یہاں ترکوں کی حکومت تھی۔ لوگ ان سے بے زار تھے۔ سلطان کاشف نے اثر و رسوخ حاصل کر لیا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے قاسم نے علاقہ گھوڑی، درہ بالا کوٹ دوپٹہ وغیرہ اپنی حکومت کے تحت کر لیا۔

ان علاقہ جات میں قوم سراڑہ پہلے سے آباد تھی۔ باقی اقوام بعد میں آکر آباد ہوئیں۔
ہزارہ بندوبست کے مطابق یہ قریش اور حضرت عثمان رضؓ کی اولاد سے ہیں۔ اس قوم کے اکابرین سلطان مظفر خان وفات ۱۷۶۰ء بہت صاحب اقبال ہوا۔ جس نے مظفر آباد کا شہر اپنے نام پر ۱۶۵۲ء میں آباد کیا۔

قوم بمبہ کشمیر کی ایک بڑی قوم ہے۔ اور ہزارہ میں اس قوم کے صرف دو خاندان ہیں۔
۱۔ جاگیردار بوئی ۲۔ خان جبڑی کلش

جاگیردار بوئی سلطان محمد برکات خان (مدفن بوئی، وفات ۲۰ ستمبر ۱۹۲۲ء) بڑے جاگیردار تھے۔ ان کے بیٹے خان بہادر سلطان حسن علیخان خوش صورت اور خوش سیرت انسان تھے۔ آپ سرحد اسمبلی کے ممبر تھے۔ ۲ ستمبر ۱۹۳۶ء میں آپ نے سر صاحبزادہ کی وزارت کے حق میں ووٹ دیا تھا۔
آپ کے ایک صاحبزادے سلطان محمد کاشف خان، سرحد حکومت کے سیکرٹری ہیں۔ خوش اخلاق اور خوش مزاج انسان ہیں۔

چند تاریخی واقعات

۱۔ اقتباس از سیرت احمد شہیدؒ مولانا مہرؒ۔ سلطان زبردست خان (۱۸۲۱ء میں یہ زندہ تھا) سید شہیدؒ سے مدد مانگی تھی۔ کیونکہ اس کے عم زاد بھائی نجف خان نے سکھوں کی مدد سے اس کو مظفر آباد سے نکال دیا تھا۔ سید صاحبؒ نے مولوی خیرالدین صاحب کو مدد کے لئے بھیجا اور یہ ملک لے کر سلطان زبردست خان کے حوالے کر دیا۔
جب زبردست خان غازیوں کی مدد سے مظفر آباد میں بیٹھ گیا تو خفیہ خفیہ سکھوں سے ساز باز شروع کر دی۔ اس کو امید تھی کہ اس کا سکھوں سے سمجھوتہ ہو جائے گا۔ وہ طبعاً بخیل تھا۔ غازیوں

کی امداد باوجود وعدہ، روپیہ سے نہ کی۔ اتنے میں خبر ملی کہ شیر سنگھ اور نجف خان، گڑھی حبیب اللہ پہنچ گئے۔ اس کے بعد بالاکوٹ کی جنگ پیش آگئی۔

۲۔ مظفر آباد شہر کی تاریخ اور نجف خان سے جنگ کی تفصیل جو رسالہ "زندگی" اشاعت ۵ رجنوری ۱۹۷۰ء از قلم محمد اکرم خان ایڈوکیٹ، میں شائع ہوئی درج ذیل ہے۔

(i) تاریخ حسن کے مطابق مظفر خان بمبہ نے مظفر آباد کا شہر ۱۶۵۲ء میں آباد کیا۔ البتہ مظفر آباد کے سامنے گوجرہ اور چیلہ بانڈی کے دیہات مغلیہ حکومت کے قیام سے قبل ہی آباد تھے۔ گوجرہ میں ایک جگہ "کھم درنگ (KHAM DARANG) میں اکبر بادشاہ کے وقت کا ایک قلعہ بنا ہوا ہے۔ اس جگہ ایک سرائے ہے۔ اس جگہ جہانگیر نے اپنی رسم تاجپوشی کی سالگرہ منائی تھی۔ یہ جگہ آزاد کشمیر سکرٹریٹ کے بالکل سامنے بلندی پر واقع ہے۔

(ii) کشمیر میں مسلمانوں کا عہد حکومت ۱۳۳۹ء میں شاہ میر کی تخت نشینی سے شروع ہوتا ہے۔ یہ شاہ مظفر آباد سے گزر کر سری نگر گیا تھا۔ جہاں اس نے ہندو حکمران کی ملازمت اختیار کر لی اور آہستہ آہستہ طاقت پکڑ کر حکومت کا تختہ الٹنے میں کامیاب ہو گیا۔

(iii) مظفر آباد میں ۱۸۳۱ء کے قریب سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان بڑی خوفناک جنگیں ہوئیں۔ مظفر آباد کے راجہ زبردست خان کی دعوت پر، سید احمد شہیدؒ نے اپنے ایک کمانڈر مولانا خیرالدین شیر کوٹی کو چند مجاہدین کے ساتھ مظفر آباد بھیجا۔ مولانا خیرالدین شیر کوٹی، جامع مسجد سلطانی کے قریب (جہاں آج کل ڈپٹی کمشنر مظفر آباد کی رہائش گاہ ہے) ٹھہرے۔ دو معرکے ہوئے، ایک مظفر آباد میں اور پھر دریائے نیلم کے پار چیلہ بانڈھی میں۔ دونوں جگہ پر مجاہدین کو شکست ہوئی۔ ان دونوں جگہوں پر مجاہدین کی قبروں کے نشان موجود ہیں۔

۴۔ سید احمد شہیدؒ نے جو خط راجگاں مظفر آباد کو لکھا تھا اور یہ خط میر اسمٰعیل کے پوتے عثمان (ملازم عدالتِ عالیہ آزاد کشمیر) کے پاس محفوظ تھا اور اب وہ پاکستان نیشنل میوزیم ہال کراچی" میں محفوظ ہے۔

خط فارسی میں ہے۔ اس کے متن کا اردو ترجمہ یہ ہے۔

"امیر المومنین کی طرف سے عالی جاہان، رفیع جائیگان، عظمت دستگاہ،

عمدۃ السلاطین عظام، زبدۃ الاراکین انفہام عالی جاہ سلطان زبردستؔ خان اور سلطان نجف خان گھوڑی والہ اور سلطان احمد خان سلمہم اللہ تعالیٰ کے مطالعہ کے لئے

سلام مسنون اور دعائے اجابت مقرون کے بعد واضح ہو کہ الحمد للہ، خدا تعالیٰ نے محض اپنے کرم سے اپنے بندوں کے لئے فتح کے دروازے کھول دئے اور اپنے کئی طرح کے انعامات سے نوازا۔ یعنی ان دنوں میں کہ ہمیں ملک سمہ دضلع مردان، اور پشاور کے بندوبست کی بنا، پر، انب کے مقام سے لشکر کے ساتھ کوچ کرنا پڑا اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو چند آدمیوں کے ساتھ اس مقام کی حفاظت کے لئے چھوڑا گیا۔ اس وقت کافر ہری سنگھ نے منافق تنولی د پائندہ خان ش ب)، کے ساتھ مل کر اپنی قوت وجمعیت اور توپ وتفنگ کے ساتھ کے ساتھ انب اور چتربائی کے قلعوں پر حملہ کر دیا۔ لیکن فضل الٰہی سے مجاہدین ابرار کو کوئی نقصان یا ضرر نہ پہنچا اور کفار میں سے بہت سے آدمی مردار ہوئے۔ آخر کار ذلت وخواری کے ساتھ اس علاقے سے واپس لوٹے اور انہیں اپنے اس عمل سے سوائے پشیمانی کے کچھ حاصل نہ ہوا اور ہم جو لشکر اسلام کے ساتھ ملک سمہ کے بندوبست کے لئے آئے تھے۔ یہاں ہمیں تمام سرداروں سے جو اپنی مکمل قوت وجمعیت اور توپ وتفنگ کے ساتھ جنگ کے ارادے سے نکل پڑے تھے۔ موضع ڈھوڑو اور ہوتی د مردان کے نزدیک ش ب)، کے میدان میں مقابلہ کرنا پڑا۔ آدھے دن تک گھمسان کا رن پڑا۔ انجام کار تائید ایزدی سے، جو مجاہدین ابرار کے شامل حال ہے مجاہدین کو کامیابی اور منافقین کو قہر الٰہی سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ لوگ عددی کثرت کے باوجود شکست کھا گئے اور راہ فرار اختیار کی۔ بہت سے منافقین اور لاتعداد گھوڑے مارے گئے، بہت سے زخمی ہوئے۔ ان کے اکثر سردار قتل ہو گئے۔ ہماری طرف سے کوئی بیس کے قریب مجاہد شہید ہوئے اور قریباً اتنے ہی

ؔ سلطان زبردست خان والئی مظفر آباد وفات ۱۲۴۰ھ سلطان نجف خان عم زاد زبردست خان والئی گھوڑی تھا۔

زخمی ہوئے۔ ہمارے ساتھی سردار مثلاً مولانا صاحب اور ارباب بہرام خان وغیرہ خیریت سے ہیں اور اخلاص نشان میر اسمٰعیل تو میرے ساتھ ہی ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ جو حالات فضلِ الٰہی سے وقوع پذیر ہوں گے، آپ کو لکھتا رہوں گا۔ باقی باتیں آپ کے قاصد کی زبانی آپ کو معلوم ہو جائیں گی۔

والسلام مع الاکرام ؎ ہفتہ ربیع الاولیٰ ۱۲۴۶ھ

مہر (اسمہ احمد ۱۲۳۹ھ) (مطابق ۲۷ / اگست ۱۸۳۰ء ش ب

نوٹ: میر اسمٰعیل جن کا ذکر اس خط میں کیا گیا ہے، مظفر آباد کے رہنے والے تھے۔ انہیں سید احمد شہیدؒ نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

۴۔ ایک تاریخی واقعہ، مظفر آباد کی تاریخی حیثیت کے متعلق۔

گلاب سنگھ نے ۱۹ / جنوری ۱۸۴۱ء کو آدھی رات کے وقت قلعہ لاہور کو شیر سنگھ کے حوالے کر کے رنجیت سنگھ کے تمام متروکہ خزانے لوٹ لئے۔ روپوں اور چاندی کے دوسرے سکوں سے بھری ہوئی سولہ گاڑیاں اور پانچ سو سپاہیوں میں سے ہر ایک کو سونے کی اشرفیوں کا ایک ایک تھیلہ دے کر اپنے ساتھ لایا۔

یاد رہے نونہال سنگھ کی موت کے بعد جب کھڑک سنگھ کی بیوہ چاند کور تخت نشین ہوئی تو موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گلاب سنگھ نے دینا ناتھ اور وزیر خارجہ عزیز الدین کو پس پشت ڈال کر دربارِ لاہور کی وزارتِ عظمیٰ پر قبضہ کر لیا تھا اور شیر سنگھ نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر کے لاہور کو محاصرے میں لے لیا تھا۔

۲۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کو کشمیر کا قبضہ آسانی سے نہیں ملا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے جموں کا راج عطا کرنے والا رنجیت سنگھ ہی تھا۔ جس نے اکھنور کے مقام پر ۱۸۲۲ء میں بذاتِ خود راجہ گلاب سنگھ کو شاہی سند عطا کی، جس کا خلاصہ یہ ہے۔

"میں مہاراجہ رنجیت سنگھ، راجہ گلاب سنگھ کی وفادارانہ خدمات کے عوض چکلہ جموں کی حکومت جو زمانۂ قدیم میں اس خاندان کے قبضہ میں تھی، اسے عطا کرتا ہوں اور اس کو زعفران کا ایک گلدستہ پیش کرتا ہوں۔ دستخط مہاراجہ رنجیت سنگھ مورخہ ۱۴ / اساڑھ ۱۸۷۹ء بکرمی

۳۔ کشمیر کے ڈوگرہ حکمرانوں نے کشمیریوں کی آزادی ہی سلب نہیں کی۔ برصغیر پاک و ہند کو انگریزوں کا غلام بنانے اور جنگ آزادی ہند ۱۸۵۷ء میں حریت پسندوں کے خلاف فوجی کارروائی کرنے کا بھی اہم کردار ادا کیا۔ چنانچہ ڈوگرہ مہاراجہ نے ریاست سے چھ پلٹن، دیوان ہری چند کی کمان میں بھیجیں، تاکہ وہ انگریزوں کی امداد کر سکیں۔

۴۔ گلاب سنگھ اور قبضہ کشمیر۔ جب کشمیر کے گورنر شیخ امام الدین نے مظفر آباد کے لوگوں سے کہا کہ راجہ گلاب سنگھ کو کشمیر کا قبضہ نہیں ملنا چاہیے تو اہالیان مظفر آباد، سری نگر کی طرف بڑھے اور قلعہ ہری پربت پر حملہ کر کے دیوان کلپ رائے کو واصل جہنم کر دیا۔

گلاب سنگھ نے جب دیکھا کہ وہ آسانی سے کشمیر کا قبضہ نہیں لے سکتا تو اس نے انگریزوں سے امداد کی درخواست کی۔ چنانچہ انگریزوں نے اپنی فوج کشمیر بھیجی تب کہیں راجہ گلاب سنگھ کا قبضہ کشمیر پر ہوا۔ گلاب سنگھ ۲ر کاتک ۱۹۰۳ء بکرمی (مطابق ۱۲۶۲ھ، ۱۸۴۶ء) کشمیر میں داخل ہوا اور مظفر آباد پر ڈوگرہ خاندان کا قبضہ ۱۹۱۱ بکرمی، ۱۸۵۴ء میں ہوا۔

گلاب سنگھ نے کشمیر پر قبضہ کرنے کے بعد راجگانِ مظفر آباد کی طرف رخ کیا اور ان کو جاگیریں دے کر مطیع و فرمانبردار بنا لیا۔

قوم کرڑال

تاریخ ہزارہ مرتبہ ویس (WACE) مہتمم بندوبست ۱۸۷۲ء میں تحریر ہے کہ "یہ اپنے آپ کو مغل کہتے ہیں اور بہ عہدِ سلطنت چغتائی ان کے مورث اعلیٰ گکر شاہ ملک کیان سے اس ملک میں آیا۔ جس کے نام پر کرڑال مشہور ہوئے۔

ابٹسن اپنی "تاریخ اقوام" میں ان کو ڈھونڈ قوم کی ایک شاخ بیان کرتا ہے۔

یہ قوم کوہ مری اور ہزارہ کے میدانوں کے درمیان پہاڑی قطعات میں آباد ہے۔ جس وقت تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا، کرڑال علاقہ بکوٹ میں آباد تھے۔

ہزارہ گزیٹر ۱۹۰۷ء کے مطابق زیادہ تر علاقہ ناڑہ میدان رجوعیہ اور کوہ ڈونگا گلی میں رہتے ہیں۔

نامور افراد کتاب "رؤسائے با اختیار اور نامی خاندان پنجاب" سید محمد خان رئیس کرڑال (ولادت ۱۸۴۵ء)، با اثر شخص تھا۔ ان کا والد علی بہادر خان، سکھوں کی دوسری لڑائی میں میجر ایبٹ کا معاون رہا۔

کرڑالوں میں دو خاندان سربرآوردہ تھے ۱۔ جاگیردار دیوال منال ۲۔ ڈبران۔

سکھوں کے وقت میں دیوال منال کا سردار حسن علی خان تھا جو بہت بارسوخ تھا۔ خاندان ڈبران سے سید محمد خان جاگیردار تھا۔ سکھوں کے ساتھ اس قوم کا مقابلہ رہا۔ ان کے ہاتھوں سکھوں کو بہت نقصان پہنچا۔ اس وقت اس قوم کا سردار حسن علی خان تھا۔ اس کی وفات ۳۱ر دسمبر ۱۸۶۲ء میں ہوئی۔

ڈھونڈ

اس علاقہ کے قدیمی مقامی باشندگان ہیں۔ وہ اپنے آپ کو قریش اور حضرت عباسؓ کی اولاد سے بیان کرتے ہیں۔

ایک روایت کے مطابق ان کا مورثِ اعلیٰ تخت خان امیر تیمور کے ساتھ آیا اور دہلی میں سکونت اختیار کرلی۔ اس کی اولاد سے زہراب خان شاہجہان کے وقت کموٹ چلا گیا، اور جدوال، ڈھونڈ، سراڑہ اور تنولی اس کی اولاد سے بیان کئے جاتے ہیں۔ عربی فاضل مولوی شہید الاسلام ساکن کیالہ نزد حویلیاں کی رائے ہے کہ وہ زہراب خان اصل میں ضراب خان (ضرب سے ہے، یعنی بہت مارنے والا) ہے جو بغداد سے آئے تھے۔ علاقہ ڈھونڈ میں اسلام ان کی وجہ سے پھیلا اور ان ہی کی وجہ سے اس قوم کا انتساب عباسی ہوا۔ سلسلہ موالات سے قومی انتساب عربوں میں معلوم اور مشہور طریقہ ہے۔

مقام آبادی ہزارہ اور راولپنڈی کے حصہ شمالی میں آباد ہیں۔ ہزارہ میں علاقہ بکوٹ مابین سلسلہ کوہ ڈونگا گلی اور دریائے جہلم آباد ہیں اور نالہ ہرو کی مشرقی شاخ (ڈھونڈ شاخ) سے لے کر ہرو کی مغربی شاخ (کرڑال شاخ) سے ملنے کی جگہ تک دونوں طرف آباد ہیں۔ مری کے گرد و نواح میں آباد ہیں۔

کرڑالوں کی طرح وہ بھی مدت تک گکھڑوں کی رعیت رہے۔ عہدِ اسلام میں یہ آزاد ہو گئے۔

عادات بہادر اور حریت پسند قوم ہے۔ مدت تک انگریزوں سے مزاحمت کرتے رہے۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت کے خلاف مری پر حملہ کیا۔ آج بھی ایوبیہ کے گرد و نواح، گورہ فوجیوں کی قبریں اس جنگ آزادی کی یاد دلاتی ہیں۔

سربرآوردہ افراد زمانہ قدیم میں عطا محمد خان ساکن لورہ میر ولی خان ساکن ڈھیری کیاآہ، حسین خان ساکن کالا بن، قطب الدین ساکن مجوہاں اور دوست محمد خان ساکن بکوٹ ہیں۔ دوست محمد خان کے والد حسن خان نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں سرکار انگریزی کی قابل قدر خدمات انجام دیں۔

زمانۂ حال کے نامور افراد ۱۔ خان بہادر راجہ عبدالرحمٰن خان ساکن ٹوٹیال۔ آپ ہزارہ ڈیموکریٹک پارٹی کے ممبر تھے۔ جنہوں نے سر صاحبزادہ عبدالقیوم کی وزارت کا تختہ الٹ دیا تھا۔ مسلم لیگ ایڈہاک کمیٹی کے ممبر تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے بھی ممبر رہے۔

۲۔ خان صاحب اللہ داد خان مرحوم۔ آپ ایک قابل اور دیانت دار افسر مال رہے۔

۳۔ راجہ سردار خان۔ آپ خان بہادر عبدالرحمٰن خان و خانصاحب اللہ داد کے چھوٹے بھائی تھے۔ صوبہ سرحد مسلم لیگ کے ممبر تھے۔ سرحد اسمبلی میں پارلیمنٹری سیکرٹری بھی رہے۔ آپ کی مساعی سے مقصود لورہ سڑک بنی۔

۴۔ سردار عنایت الرحمٰن عباسی: خاں صاحب اللہ داد خان کے بیٹے ہیں مغربی پاکستان کے ممبر رہے اور ۱۹۷۵ء میں مرکزی اسمبلی کے ممبر اور پارلیمنٹری سیکرٹری ہیں۔ سیاست کے ماہر، فصیح مقرر اور بہترین پارلیمنٹرین ہیں۔

۵۔ حاجی محمد سرفراز خان۔ آپ نے اپنی دیانت و قابلیت سے اکاوٹنٹ جنرل پنجاب کے عہدے تک پہنچ کر پنشن حاصل کی۔ شروع میں سوٹ بوٹ اور انگریزی طرز زندگی پر عامل تھے۔ لیکن ملازمت کے آخری سالوں میں سلوک و تصوف کا عملی نمونہ بن گئے۔ موڑہ شریف کے گدی نشین کے خلیفہ مجاز ہیں۔ لاہور ہی میں اقامت اختیار کر لی ہے۔

قوم سراڑہ

ہزارہ گزیٹر ۱۹۰۷ء کے مطابق یہ قوم ڈھونڈ کی شاخ معلوم ہوتی ہے، جن کے ساتھ ان کے شادی کے رشتے ہیں۔ قوم سراڑہ میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ وہ قوم تناولی اور ڈھونڈ سے رشتہ رکھتے ہیں۔

رہائش یہ قوم علاقہ بوئی مابین سلسلہ کوہ ٹھنڈیانی اور دریائے کنہار کے رہتے ہیں۔

عادات غریب اور محنتی لوگ ہیں۔ ان کا اپنی قوم سے کوئی سربراہ نہیں۔ سلطان بوئی اس علاقہ کا حکمران خاندان ہے۔ جب سکھوں کی یلغار مظفر آباد ہوئی، تو سلطان مظفر خان بنبہ بھاگ کر بوئی کے علاقہ میں سراڑہ قبیلہ کے ہاں پناہ گزین ہوا۔ اس کے بعد اس کی اولاد سے سلطان ہوتے رہے۔

قوم جدون

مختلف تواریخ، مثلاً تاریخ ہزارہ، تاریخ مہتاب سنگھ (قلمی) کی متفقہ آراء اور مولوی نواب خان جدون ساکن کوٹ نجیب اللہ کی بیاض کے مطابق اس قوم کی تاریخ یہ ہے۔

یہ افغان ہیں اور کاکڑ وپنی سے ان کا شجرہ ملتا ہے ہزارہ میں تین پتے ہیں ۱۔حسن زئی، ۲۔سالار اور ۳۔منصور۔ جو اپنے اپنے علاقہ پر قابض ہیں۔

۱۔ سالار۔ تمام علاقہ رجوعیہ پر۔

۲۔ حسن زئی۔ تمام علاقہ دھمتوڑ پر۔

۳۔ منصور۔ تمام علاقہ نواں شہر پر۔

علاقہ مانگل پر بہ حصہ مساوی حسن زئی اور منصور قابض ہیں۔

آمد کا حال یہ تینوں پتے مابین علاقہ یوسف زئی پار دریائے سندھ سے اس علاقہ میں آئے اور یہ علاقہ سواتیوں اور تناولیوں سے جنگ کر کے لے لیا۔

حواشی، تواریخ حافظ رحمت خانی ص۶۶۵ پر بحوالہ "فاتح الانساب" تصنیف سید محمود شاہ تحریر ہے :

"ابتداً یہ قبیلہ بھی دوسرے پٹھانوں کے ساتھ قندھار اور بلوچستان کے درمیان علاقہ میں مقیم تھا۔ یوسف زیوں کی کابل سے آمد (۱۴۶۸ - ۱۵۰۲ء) کے کچھ عرصہ بعد یہ بھی یوسف زئی کے علاقہ میں آ گئے تو ان کو گزارہ کے لئے پہلے پہل باڑہ، کھبل، کیا اور موجودہ جدون علاقہ (واقع مہابن)، گابئی، اچنئی، گندف وغیرہ (پار دریائے سندھ)، کا علاقہ دے دیا۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد اتمان زیوں نے باڑہ اور کھبل ان سے واپس لے لیا۔

جب بہاکو خان یوسف زئی (وہ ۱۶۵۰ء میں زندہ تھا) نے ہزارہ پر حملہ کیا تو گدون (جدون)، اس کے ساتھ تھے اور انہوں نے اس وقت دریائے دوڑ کے میدانی علاقہ میں اپنا اقتدار قائم کر لیا۔

یہ قبیلہ ابتدار سے ہی یوسف زیوں کے ساتھ رہا اور یوسف زیوں نے اتمان زیوں کے ساتھ گندف وغیرہ کا علاقہ ابتدا ہی سے ان کو دیا تھا۔

ہزارہ میں موجودہ علاقہ ان کو یوسف زیوں نے دیا۔ علاقہ جوعیہ سالار کو، دھمتوڑ اور نواں شہر منصور کو مانگل، جھنگی اور رنبگ سالار اور منصور کو مشترک کر دیا۔"

جدون قوم کا مرکزی اور خانی کا گاؤں دھمتوڑ ہے۔ صورت دیہی بندو لبست ۱۸۷۲ء کے مطابق جدون قوم نے تقریباً پندرھویں صدی عیسوی کے لگ بھگ یہ ملک لیا۔ ان کے مشہور گاؤں مانگل، دھمتوڑ، بگڑہ، نواں شہر، جوعیہ اور رنگرہ ہیں۔

عمل داری سکھاں اس علاقہ میں تاریخی طور پر اس قوم کی آویزش سکھ حکومت سے رہی اور مشہور واقعہ جس سے اس علاقہ پر سکھوں کا عمل دخل ہو گیا، مانگل کی لڑائی ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ سردار ہری سنگھ، سکھوں کی طرف سے حاکم کشمیر تھا مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کسی کی شکایت کرنے پر اس سے بدظن ہو گیا اور اس کو حکم دیا کہ جلدی واپس آکر کشمیر کی آمدنی کا حساب پیش کرے۔ ہری سنگھ اس وقت مظفر آباد کی سرحد پر تھا، لہذا جلدی

واپس پہنچنے کے لئے اس نے ہزارہ کے راستہ سے واپس آنے کا پروگرام بنایا۔ جدونوں کو پتہ لگ گیا تو قوم جدون مانگل میں جمع ہوئی۔ اس وقت کشمیر کا راستہ مانگل اور واتہ گاؤں کے درمیان نالہ موسوم بہ دوگا سے ہو کر گزرتا تھا اور اسی جگہ سے جدونوں کے علاقہ کی سرحد شروع ہوتی تھی۔ جدون قوم طالب محصول ہوئی۔ آخر نوبت جنگ کی پیش آگئی۔ قوم جدون کو شکست ہوئی۔ ۱۸۲۱ء شہر مانگل ایسا برباد کر دیا گیا، کہ بعد میں وہ پھر آباد نہ ہو سکا اور آج اس کا نام و نشان بھی موجود نہیں۔

فتح کے بعد سردار ہری سنگھ نے جدون قوم، جدون کے ہر گھر سے ۵ روپے بطور جنگ وصول کیا اور نواں شہر میں قلعہ بنا کر سکھ فوج متعین کر دی اور سکھ حکومت اس علاقہ میں قائم ہو گئی۔

نامور افراد قوم جدون

۱۔ جاگیردار مانگل پنیر خان (جس نے بانڈہ پنیر خان نزد مانگل آباد کیا)، ولد قاسم خان۔ وفات۔ ستمبر ۱۸۶۴ء

۲۔ ان کی اولاد سے مانگل کے چیف، خان ولی محمد خان ہوتے۔ آپ پنجاب پولیس میں کپتان رہے۔ کٹھہ مانگل کے کنارے پر رہائش کے لئے ایک بنگلہ بنایا۔ فرشتہ سیرت، صاحب اخلاص انسان تھے۔ اپریل ۱۹۶۹ء میں وفات پائی۔

۳۔ گوہر الرحمٰن خان مرحوم زمانہ حال کی معروف شخصیت تھی۔ آپ اصلاً موضع گھماواں کے رہنے والے تھے لیکن بعد میں سکونت ایبٹ آباد میں اختیار کر لی۔ خاموش طبع و خوش اخلاق انسان تھے۔ باوجود دولت و امارت، امزاج منکسرانہ رکھتے تھے۔ اپنی ذاتی محنت اور ہمت سے نام پیدا کیا۔ ہزارہ کی مشہور ٹرانسپورٹ کمپنی (پنڈی ہزارہ) جو ۱۹۴۰، ۱۹۴۱ء میں شروع کی۔ آپ اس کے پہلے سربراہ تھے۔ اس کمپنی نے پبلک کی خدمت ہمدردانہ اور والہانہ طریقہ سے کی۔ آپ کی وفات ۷ جنوری ۱۹۶۲ء میں ہوئی۔

آپ کے جانشین، ان کے بڑے بیٹے محمد اقبال خان ہیں جنہوں نے ہزارہ کا نام روشن کر رکھا ہے آپ ۱۹۶۵ء کے انتخاب میں مغربی پاکستان اسمبلی کے ممبر چنے گئے اور مارچ ۱۹۶۹ء تک (یعنی مارشل لاء لگنے تک)، پارلیمنٹری سیکرٹری رہے۔

اس کے بعد آپ سرحد اسمبلی کے ممبر چنے گئے اور اب تک (دسمبر ۱۹۷۵ء) وزیر ہیں۔ ۱۹۷۷ء کے اوائل تک سینئر وزیر سرحد رہے۔ دیانتدار، فرض شناس اور ہر دل عزیز وزیر ہیں۔

پسندیدہ اخلاق اور منکسرانہ مزاج رکھتے ہیں۔

آخر میں صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ رہے اور مارشل لاء ۵ جولائی ۱۹۷۷ء تک اس عہدہ پر فائز رہے اور نیک نام رہے۔

خانصاحب محمد اکرم خان جدون مرحوم ساکن نواں شہر خوددار، دیانت دار اور بہت ہی قابل ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر رہے۔ پر رعب شخصیت تھی۔ ان کے بڑے صاحبزادے محمد علی خان ۱۹۷۵ء میں ڈپٹی انسپکٹر جنرل ڈیرہ اسمٰعیل خاں ہیں۔ قابل پولیس افسر ہیں۔ دیانت داری اور حسن کارکردگی میں اپنے والد کے صحیح جانشین ہیں۔ ۱۹۷٦ء میں پنشن لے کر ڈیرہ اسمٰعیل خان میں رہائش اختیار کر لی ہے۔

قوم گکھڑ

ہزارہ میں باہر سے آنے والی اقوام میں سے۔ یہ سب سے قدیم اور شاندار ماضی کی حامل قوم ہے۔ ان کی حکمرانی جہلم سے اٹک تک پندرھویں صدی سے لے کر انیسویں صدی عیسوی تک رہی۔ اس قوم کے ایک سلطان، سلطان مقرب خان جو اٹھارھویں صدی کے آخر میں ہوا ہے۔ کی مہر پر یہ الفاظ کندہ تھے۔ "درمیان اٹک وجہلم اشد مقرب بادشاہ"

اس قوم کی عظمت وجلالت کے لئے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ مغل شہنشاہوں نے ان سے رشتہ داری اور قرابت پیدا کی اور انہوں نے مغل سلطنت کے ساتھ تادم آخر وفاداری استوار رکھی۔ جس کی پاداش میں شیر شاہ سوری جیسے نبرد آزما سلطان سے مقابلہ کرتے رہے۔ ہمایوں بادشاہ کی واپسی پر اس کے قدم اس قوم کی امداد سے ہی ملک میں جم سکے۔ جبکہ کامران مرزا ہمایوں سے شکست کھا کر کابل سے سلیم شاہ کے پاس آیا اور پھر اس سے بے زار ہو کر رات کے وقت برقعہ اوڑھ کر بھاگا اور موضع سلطان پور (قلعہ رہتاس سے تین کوس کے فاصلہ پر) پہنچا۔ تو سلطان آدم گکھڑ نے اس کو گرفتار کر لیا اور ہمایوں بادشاہ کے حوالے کر کے مرزا کی جاں بخشی کی درخواست کی، جو ہمایوں بادشاہ نے منظور کر لی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں نشتر پھروا کر اس کو اندھا کر دیا اور سلطنت ہندوستان کے حصول کی راہ سے یہ بڑا کانٹا اس طرح نکل گیا

یہ واقعہ ۱۵۵۲ء کا ہے۔

قوم گکھڑ کی اصلیت اور ابتدائی حالات

یہ بات مستند تواریخ سے پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ گکھڑ:

۱۔ ایرانی الاصل ہیں۔

۲۔ یہ سلطان محمود غزنوی کے ساتھ وارد پاک وہند ہوئے۔

۳۔ سلطان محمود غزنوی نے ان کے سردار گکھڑ شاہ کو یہ علاقہ، جس میں وہ آج تک آباد ہیں، انتظام کے لئے سپرد کیا۔

۴۔ ہاتھی خان پہلا شخص ہے، جس کو بابر بادشاہ نے خلعت کے ساتھ سلطان کا خطاب دیا۔ اس سے پہلے وہ راجہ کے لقب سے ملقب تھے۔

۵۔ اس قوم میں لشکر خان پہلا شخص ہے، جس کے نام کے ساتھ دیوان کے لفظ کا اضافہ کیا گیا۔ سلطان جلال کے بھائی مرزا عمر خان اور مرزا شریف کو مرزا کہا گیا جو مغلیہ عہد میں عموماً شہزادوں کے لئے مقرر تھا اور غالباً مغلیہ کے آخری عہد میں جب صوبہ داری پر سرفراز کئے گئے تو ان کو نواب کہنے لگے۔

۶۔ سلطان محمود غزنوی کا مقابلہ اس علاقہ میں کھوکھروں سے، جو نہایت بہادر ہندو قوم تھی، ہوا۔ ان کی شکست کے بعد یہ علاقہ گکھڑوں کو ملا۔ اس علاقہ میں سلطان شہاب الدین غوری کو کھوکھروں اور ملاحدہ کی سازش سے قتل کر دیا گیا تھا۔

اس قوم کا قدیم مذہب

سابقہ تاریخ کے مطابق یہ ابتداء میں آتش پرست تھے۔ ایک مؤرخ کے بیان کے مطابق ہنخامشی خاندان کے عظیم خاندان کے عظیم فاتح کورش بزرگ اور اس کے پوتے داریوش اول کے زمانہ میں یہ قبیلہ ایران سے ترک سکونت کر کے اس علاقہ (پوٹھوہار) میں آباد ہوا ہوگا۔ کیونکہ ۵۱۸ ق م میں تمام وادیٔ سندھ کا علاقہ سرہند تک ایرانی سلطنت کا حصہ اور اس کا بیسواں صوبہ تھا۔ (ٹمکسلہ کے آثار قدیمہ میں جنڈیال کا قدیم آتش کدہ بھی اس بات کی شہادت دے رہا ہے)، لہٰذا سلطان محمود غزنوی کے خلاف انندپال کی جنگ کے وقت، اگر فرشتہ (مصنف تاریخ فرشتہ) انہیں انندپال کے لشکر میں

شامل بتاتا ہے تو اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں ہو سکتی۔

انند پال اور اس کے جانشینوں کی شکست کے بعد یقیناً یہ قبیلہ بھی اسلام سے متعارف ہونا شروع ہو گیا ہوگا۔ لیکن اس ضمن میں ہمارے پاس کوئی حتمی شہادت موجود نہیں۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ سلطان شہاب الدین محمد غوری (۱۱۷۲-۱۲۰۶ء) کے عہد میں یہ قبیلہ پوری آب و تاب سے صفحۂ تاریخ پر چمکنا شروع ہو گیا ہے۔

ان کی سلطنت کا مرکز، علاقہ پوٹھوہار تھا

یہ علاقہ ضلع جہلم کے مقامات، سوہاوہ بکڑالہ کی درمیانی پہاڑی سے لے کر مشرق میں دریائے جہلم کے ساتھ ساتھ اور اس سے آگے شمال میں پھیلے ہوئے پہاڑوں کے دامن میں مارگلہ تک چلا گیا۔ مغرب میں اس کی حدود تحصیل راولپنڈی اور گوجرخان تک ہیں۔ مغل بادشاہ نورالدین جہانگیر (۱۶۰۵-۱۶۲۷ء) نے پوٹھوہار کے علاقہ کو ہتھیہ سے مارگلہ تک ہی قرار دیا ہے۔

مارگلہ، وجہ تسمیہ۔ یہ علاقہ گھنا جنگل تھا اور اس جگہ پر، اکا دکا مسافروں پر ڈاکو حملہ کر کے قتل کرتے تھے، یعنی گلہ[1] مارتے تھے) اس واسطے مارگلہ نام پڑا۔ ان فسادات کو ختم کرنے اور امن و امان بحال کرنے کے لئے شہنشاہ اکبر نے یہاں سے کھلی سڑک نکلوا دی تھی، جس کا نشان ابھی سنگ جانی کے قریب موجودہ سڑک کے جنوبی طرف پہاڑ کے دامن میں موجود ہے۔

قوم گکھڑ کی تاریخ مختلف ادوار میں

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ یہ ایرانی الاصل ہیں۔ اس علاقہ میں ان کی آمد ۶۰۰ قبل مسیح کے قریب ہوئی۔ انند پال کی فوج کے ساتھ یہ شامل رہے۔ اس کے بعد یہ محمود غزنوی اور محمد غوری کے طرف دار رہے۔

بابر بادشاہ جب اس ملک میں آیا تو اس کا مقابلہ اس قوم سے ہوا۔ اس وقت اس قوم کا حکمران سلطان ہاتھی تھا۔ بابر بادشاہ نے یہ ملک فتح کر لیا۔ اس کے بعد گکھڑ قوم مغلوں کی حکومت

---

[1] ایک مؤرخ نے گلہ کو قافلہ کے معنی میں استعمال کیا اور گلہ مارنے کو قافلہ مارنے کے مترادف قرار دیا ہے۔

دست و بازو رہے۔ اس کے بعد سلطان سارنگ و سلطان آدم، دونوں بھائی، بابر کے ہمراہ پانی پت کے میدان میں دادِ شجاعت دے کر بابر کے دربار میں مقبول ہو چکے تھے۔ "تاریخ فرشتہ" میں ہے کہ گکھڑ قوم ہمیشہ خاندان تیموریہ کے اطاعت گزار رہے۔

"تاریخ جہلم" میں مرقوم ہے کہ شیر شاہ سے حفاظت کے لئے سلطان سارنگ نے ایک دیوار پتھر و چونہ سے موضع سلطان پور (تحصیل جہلم) میں بنوائی، جس کے آثار اب تک باقی ہیں اس وقت سلطان سارنگ کی بود و باش اس موضع میں تھی۔

جب ہمایوں بادشاہ اور شیر شاہ سوری کا مقابلہ دہلی کے قریب ہوا اور ہمایوں کی قوت میں ضعف آیا تو وہ اسی راستہ سے کابل کی طرف بھاگ نکلنے کے لئے آیا۔ اس موقع پر ہمایوں بادشاہ کا مددگار ہوا اور بخوف شیر شاہ سلطان سارنگ نے یہ دیوار برائے حفاظت بنوائی۔

کہتے ہیں کہ یہ دیوار گوشہ جنوب و شرق دریا سے شروع ہو کر گوشہ شمال و غرب تخمیناً ۵ میل تیار ہوئی۔ اس کے درمیان دروازے رکھے گئے۔ دیوار کی بلندی ۲۰ فٹ اور عرض ۱۲ فٹ کے قریب ہے۔ اب بھی ۴۰۰ کرم کے فاصلہ تک یہ دیوار موجود ہے اور ایک دروازہ بھی۔ باقی سب دیوار مسمار ہو گئی ہے۔

ہمایوں کے تعاقب میں شیر شاہ دریائے جہلم کے پار اترا تو سلطان سارنگ نے اسی جگہ شیر شاہ کا راستہ روکا اور ہمایوں کو سنبھلنے کا موقع پیدا کر دیا۔

سلطان سارنگ سے نزاع نے ایک طویل جنگ کی صورت اختیار کر لی اور شیر شاہ سوری ہمایوں کا تعاقب جاری نہ رکھ سکا اور سلطان سارنگ سے نپٹنے کے لئے وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔

ہمایوں بادشاہ ملک سے فرار ہونے کے بعد ان کا مقابلہ شیر شاہ سوری سے ہوا۔

قوم گکھڑ اور شیر شاہ سوری

گکھڑوں کی ہمایوں سے وفاداری اور شیر شاہ سے چپقلش کے متعلق میجر راورٹی اپنی کتاب "اقوام افغانستان، یادداشتیں" میں لکھتا ہے، کہ جب ہمایوں بادشاہ ہندوستان سے مارچ ۱۵۴۰ء میں براہ پنجند روہڑی بھاگا اور تقریباً دو سال تک صوبہ سندھ میں پھرتا رہا اور شیر شاہ اسی سال اس کے تعاقب میں خوشاب پہنچا، تو سب افغان قومیں مطیعانہ اس کے سامنے پیش ہوئیں۔ لیکن ایک قوم

گکھڑ، جو اس وقت سلطان سارنگ کے زیر قیادت تھی، حاضر نہ ہوئی۔

عباس سروانی نے جو شیر شاہ کا معاصر تھا، تاریخ شاہی لکھی۔ جس کا ترجمہ ایڈورڈ کلایو بیلی نے انگریزی میں کیا۔ جس کو ایلیٹ نے اپنی "تاریخ ہندوستان" میں نقل کیا۔

عباس سروانی لکھتا ہے کہ:

"جب شیر شاہ سوری ۱۵۴۱ء میں خوشاب میں مقیم تھا۔ تو سلطان سارنگ اس کا حکم ملنے پر بھی اس کے پاس حاضر نہ ہوا۔ جواب میں تیروں سے بھری ہوئی ترکش اور دو شیر کے بچے بھیج دیئے۔"

یہ تمثیلی جواب شیر شاہ کے خلاف اعلان جنگ تھا۔ اس پر شیر شاہ نے گکھڑوں کے ملک پر حملہ کر دیا۔ اس کی فوجوں نے زیر کمان جنرل خواص خان بہ مقام روات ۱۵۴۲ء میں ایک خونریز جنگ لڑی۔ سلطان سارنگ بمعہ اپنے دستوں کے میدانِ جنگ میں مارا گیا۔ افغان فوجوں نے گکھڑوں کے ملک کو تہ و بالا کر دیا۔

سلطان آدم خان برادر سلطان سارنگ، اس کے بعد ملک کا حاکم ہوا۔ سلطان آدم نے سلطان سارنگ اور اس کے مقتول ہمراہیوں کو روات میں دفن کر دیا اور اس پر ایک شاندار مقبرہ بنوایا۔ جس کا ذکر کیگوہر نامہ (تاریخ گکھڑ)، جو شاہجہان بادشاہ کے زمانہ میں لکھی گئی، میں یوں تحریر ہے:

"سلطان سارنگ، اس کے بڑے بھائی اور اس کے بھتیجوں کی نعشیں روات، میدان لشکر گاہ کے نزدیک دفن کی گئی تھیں، جو کہ شاہراہ عام پر اور پرگنہ پھڑوالہ (دبروالہ)، کی سرحد پر ہے، قبر پر عالی شان مقبرہ سنگ مرمر اور دوسرے پتھروں سے بنایا گیا۔"

قلعہ رہتاس کی تعمیر

شیر شاہ نے گکھڑوں کو شکست تو دے دی، لیکن گکھڑ اس کے مطیع نہ ہوئے۔ لہٰذا اس نے ایک تو اس قوم کو مطیع رکھنے کے لئے ان کے ملک میں اپنا خنجر شاہی بہ صورت قلعہ رہتاس گاڑ دیا۔ دوسری وجہ ہمایوں کے ہندوستان میں داخلہ کے لئے اس دروازہ، قوم گکھڑ کے ملک کو بند کرنا مقصود تھا۔

چنانچہ اس نے اپنے دار المہام شاہو سلطان کو حکم دیا کہ وہ اس سرزمین میں ایسی جگہ تلاش کر کے ایک قلعہ تعمیر کرے، جس میں تیس ہزار سوار، پچاس ہزار پیدل، پچاس ضرب توپیں اور پانچ سو تیر انداز رہ سکیں۔

شاہو سلطان کی انتخاب کردہ زمین گھان ندی کے کنارے پر ہے۔ جس کو چہ ندی نصف دائرے کی شکل میں شمال اور شمال سے مشرق کی جانب گھیرے ہوئے چلی گئی ہے۔ جنوب کی طرف حریران پہاڑی ہے۔ موجودہ جرنیلی سڑک سے چار میل کے فاصلہ پر اور موضع دینہ سے جنوب مشرق کی طرف قلعہ کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ موجودہ جرنیلی سڑک شیر شاہ کی تعمیر کردہ ہے اور کبھی اسی قلعہ کے خواص خانی دروازہ کے نیچے سے گزرتی تھی۔ اس سڑک پر آج بھی سراؤں اور باولیوں کے نشانات ملتے ہیں۔

اس قلعہ کا ذکر شہنشاہ ہندوستان، جہانگیر بادشاہ نے اپنی توزک (وہ ۱۵۹۸ء میں رہتاس آیا تھا) میں لکھا:

ترجمہ "سوموار کے دن محرم کی پہلی تاریخ کو دریائے جہلم کے کنارے سے کوچ کر کے ایک روز کا سفر کر کے قلعہ رہتاس جو شیر خان افغان کا بنایا ہوا ہے، پہنچا۔ اس قلعہ کی بنیاد ایسی جگہ رکھی گئی ہے کہ اس سے زیادہ استحکام کے لئے کوئی دوسری جگہ ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ جگہ گکھڑوں کی ولایت سے متصل ہے اور گکھڑ قوم سخت متمرد اور سرکش ہے۔ اس قلعہ کو خاص کر ان کی تنبیہ اور سرکوبی کے لئے یہاں بنایا قلعہ کا تھوڑا سا حصہ بنا تھا کہ شیر خان کی وفات ہو گئی۔ اس کے بعد اس کے بیٹے سلیم خان نے اس کی تعمیر کو پورا کیا۔ اس عمارت پر سولہ کروڑ دو لاکھ پچیس ہزار سے قدرے زائد خرچ ہوا۔ جو ہندوستان کے روپیہ کے حساب سے چالیس لاکھ پچیس ہزار روپیہ ہوتا ہے اور ایرانی سکہ کے حساب ایک سو تیس ہزار تومان اور توران کے حساب سے ایک ارب اکیس لاکھ چھتر ہزار خرچ بنتا ہے"۔

شیر شاہ کا حسب و نسب

شیر شاہ بن حسن، بن ابراہیم جو کوہستان روہ (کوہستان روہ سوات، باجوڑ سے قصبہ سیوی کوئٹہ تک ہے)، کے علاقہ

چمله (ضلع سوات) کے گاؤں شوری کا رہنے والا تھا۔ گاؤں کے نام کی معرفت سے سوری کہلایا۔ اسی مقام پر اکبر بادشاہ کا وزیر بیربل، یوسف زیوں کے مقابلہ میں مارا گیا تھا۔ یوسف زئیوں کے قائد بھاگو خان (عہد شاہجہان بادشاہ) کا مزار بھی اس علاقہ، مقام لنگوئے میں ہے۔

سکندر لودھی کے پاس شیر شاہ کا دادا ابراہیم سوری نوکری کے لئے دہلی آیا۔ سکندر لودھی کے عہد میں حسن بن ابراہیم نے ترقی کی۔ حسن کا بیٹا فرید (المعروف شیر شاہ) نے علم و ہنر میں ترقی کی۔ انتظام جاگیر میں بڑی مہارت پیدا کی۔

شیر خان کے اندیشے اور منصوبے

شیر خان شروع ہی سے مغلوں کو ہندوستان کے تخت کا حق دار نہ مانتا تھا (بابر نے ہندوستان کی حکومت افغانوں سے لی تھی)، اور عنانِ اختیار ان کے ہاتھوں سے چھین لینا چاہتا تھا۔

شیر خان بابر کے دربار میں

بابر جب آگرہ میں تخت نشین ہوا تو مشہور جرنیل جنید برلاس کی وساطت سے شیر خان بابر کے دربار میں پہنچا۔ شیر خاں کی پیشانی سے شاہانہ جاہ و جلال عیاں تھا۔ بابر کی فراست نے شیر خان کی پیشانی پر جہانبانی اور حکمرانی کے آثار دیکھتا تو فکرمند ہو جاتا کہ مبادا یہ شخص میری نسل سے حکومت چھین لے۔ اسے ٹھکانے لگانا چاہیے (تاریخ رہتاس قلمی)

بابر کے دربار سے فرار

شیر خان، بابر کے ارادے سے باخبر ہوا تو بھاگ کر بہار کے حاکم سلطان محمد لوہانی کے ہاں چلا گیا اور اس کے بیٹے کا اتالیق بن گیا۔ کچھ عرصہ بعد سلطان ہوا تو یہ وزیر بن گیا اور ایسا اثر و رسوخ پیدا کیا، کہ بہار کے وارث کو بھاگتے ہی بنی اور یہ بادشاہ بن بیٹھا۔ اسی دوران حسن خان (فرید خان کا والد) فوت ہو گیا تھا۔ شیر خان اپنے موروثی ملک پر قابض ہوا۔ اس طرح وہ مستقبل میں اقبال و فتح مندی کے امکانات کے روشن کرنے کے قابل ہوا۔

شیر شاہ کی زندگی

ایک نظر میں:
سال ولادت دسمبر ۱۴۷۲ء جلوس آگرہ کے مقام پر ۱۵۴۱ء، دار الخلافہ دہلی۔ مدت سلطنت ۴ سال، ۴ ماہ، ۱۵ یوم۔ سالِ وفات ۹ مئی ۱۵۴۵ء۔

اس کی حسرت آئینہ دیکھ کر وہ کہا کرتا تھا "افسوس مجھے شام کے وقت بادشاہی ملی"۔
شیر شاہ کی انگوٹھی کے نگینہ پر یہ کندہ تھا:

"شہ اللہ باقی ترا، باد دائم۔ شیر شاہ بن حسن سور قائم"۔

کسی شاعر نے اس کے مرنے کی تاریخ یوں لکھی:

شیر شاہ ہے، کہ از مہابت او ۔ شیر و بز آب را بہم مے خورد
چوں برفت از جہاں، بدارِ بقا ۔ گشت تاریخ او، ز آتش مرد۔ ۹۵۲ھ

واقعہ موت قلعہ کالنجر کے محاصرے میں آگ کا ایک گولا اس پر آکر گرا، جس سے وہ جل گیا۔
لیکن قلعہ کو فتح کرنے کے لئے اس حالت میں بھی حملہ کروایا۔ یہاں تک کہ عصر کی نماز کے وقت قلعہ فتح ہو گیا۔ اس کی فوج قلعہ میں داخل ہوئی اور اذان دی۔ یہ سن کر شیر شاہ نے کہا "الحمد للہ! یہی آرزو تھی۔ اس کے ساتھ جاں، جاں آفرین کے حوالے کر دی۔

(ماہ ربیع الاول ۹۵۲ھ)

سلیم شاہ اور گکھڑ شیر شاہ کے بعد اس کے بیٹے سلیم شاہ نے بھی قوم گکھڑ پر لشکر کشی کی۔ گکھڑوں نے سلیم شاہ کے لشکر کو ایسا تنگ کیا کہ اس کا کوئی لشکری اپنے ڈیرے سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ جو کوئی نکلتا اس کو گکھڑ گرفتار کر کے، کابل قندھار و بدخشاں بھیج دیتے تھے۔ حالانکہ اس سے پہلے اس قوم کو اپنے نزدیک لانے کے لئے کمال خان کی بہن سے اس نے نکاح بھی کر لیا تھا۔ لیکن وہ گکھڑوں کو رام نہ کر سکا۔

سلیم شاہ ان کی تمام ولایت کو خراب و برباد کر کے، خود تو واپس اپنے پایۂ تخت گوالیار چلا گیا۔ مگر امرائے پنجاب کو ان کی بیخ کنی کا حکم دے گیا۔

گوالیار پہنچ کر، قوم گکھڑ کے تمام قیدیوں کو قلعہ کے ایک مکان میں بند کرا کر بارود سے اڑا دینے کا حکم دے دیا۔ ان میں کمال خان پسر سلطان سارنگ بھی۔ لیکن کمال خان ایک کونہ میں صحیح سالم بچ گیا

کمال خان کے بچ جانے کے متعلق ملا عبد القادر بدایونی نے اپنی کتاب "منتخب التواریخ" میں لکھا ہے:

وہ کمال خان کی بہن سلیم شاہ کے نکاح میں تھی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ رات کو قیدیوں کو بارود لگا کر جلا دیا جائے گا تو اس نے اس کی اطلاع اپنے بھائی کمال خان کے پاس بھجوا دی اور ساتھ ہی روئی سے بھرے ہوئے چار لحاف اور کئی مشک پانی بھی اس کے پاس بھیج دیا۔ کمال خان نے غسل کے بہانے سے ان لحافوں کو پانی میں اچھی طرح بھگو دیا اور ان کو اوڑھ کر سب سے الگ ایک کونے میں جا کر پڑا رہا۔ جب آگ لگائی گئی تو سب قیدی جل کر راکھ ہو گئے۔ مگر کمال خان "ان لحافوں میں زندہ بچ گیا۔ جب سلیم شاہ، آتش زدگی کا تماشہ دیکھنے قید خانہ میں آیا تو کمال خان کو سلامت دیکھ کر کہا "وہ چونکہ تو میرے ساتھ سچا خلوص رکھتا تھا اس لئے آگ سے تجھے گزند نہ پہنچا" اور قسم کھا کر کہا کہ میں اب کبھی بھی تجھے گزند نہ پہنچاؤں گا اور رہا کر کے اسے اپنے علاقہ گکھڑ پر حاکم مقرر کر دیا"

ہمایوں بادشاہ کی آمد

شیر شاہ سوری کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا سلیم شاہ تخت نشین ہوا۔ سلیم شاہ اگرچہ باہوش اور ذہین بادشاہ تھا۔ مگر شیر شاہ جیسے اوصاف اس میں موجود نہ تھے۔ سلطان آدم گکھڑ والئی سلطان پور (پوٹھوہار) نے جو ہمایوں کا حلیف تھا، اسے ایران پیغام بھیجا کہ شیر شاہ مر چکا ہے اور سوری اقتدار زوال پذیر ہے۔ چنانچہ ہمایوں ایران سے لشکر جرار لے کر روانہ ہوا۔ کچھ عرصہ کابل و قندھار کی فتح میں صرف ہوا اور آخر کار ۱۵۵۵ء میں ہندوستان کی طرف بڑھا۔ مرزا کامران والئی لاہور، ہمایوں کے ڈر سے بھاگ کر سلطان آدم کے پاس پناہ گزین ہوا۔ جس نے کمال ہوشیاری سے اسے اپنے پاس روک رکھا اور ہمایوں کے پہنچ جانے پر اس کے حوالے کر دیا۔

ہمایوں نے قسم کھا رکھی تھی کہ قلعہ رہتاس کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ مگر جب رہتاس پہنچا تو اکابرین نے مشورہ دیا کہ قسم پوری کرنے کے لئے ایک گولہ قلعہ پر پھینکے۔ چنانچہ ایک گولہ قلعہ پر مارا جس سے شاہ چاندولی دروازہ کی محراب ٹوٹ گئی۔

گکھڑ، درانی و سکھ عہد میں

شاہانِ مغلیہ کے وقت گکھڑ اندرونی طور، آزاد مملکت کے مالک تھے۔ شاہانِ دہلی کو سالانہ بطور خراج ایک گھوڑا

دیتے تھے اور بطور مالیہ کچھ بھی نہیں دیا۔

درانی بھی ایک گھوڑا ہی لیتے رہے۔ درانیوں کے عہد میں ان کو کشمیر میں جاگیرات عطا ہوئیں، جو سلطنت مغلیہ میں ان کو ملی تھیں اور ان دونوں حکومتوں نے ان کو بڑے بڑے منصب بھی عطا کئے۔

درانی سلطنت ۱۷۹۵ء میں ختم ہو گئی تو یہ ۱۸۱۶ء تک مطلق آزاد رہے۔ اس عرصہ میں دو دفعہ ان کا مقابلہ سکھوں سے ہوا۔

۱۔ ۱۷۹۵ء میں گوجر سنگھ نامی، ایک بھنگی سردار نے جہلم کی طرف سے اس قوم پر چڑھائی کی۔ اس وقت شیر محمد خان و جعفر خان راجگان تھے۔ انہوں نے اپنی جمعیت کے ساتھ اس سے مقابلہ کیا اور موضع چھو میں دادا شہید کی خانقاہ کے قریب جنگ ہوئی۔ سردار مذکور مارا گیا اس کی فوج شکست کھا کر بھاگ گئی۔ اکثر مال از قسم ہتھیار، گھوڑے، نقد پارچات سکھوں کا غنیمت میں راجگاں کو ملا۔

۲۔ ۱۸۱۵ء میں سردار صاحب سنگھ نے علاقہ سید پور پر حملہ کیا۔ اس وقت مہند علی خان و شیر محمد خان راجگان تھے۔ انہوں نے مقابلہ کیا لیکن مغلوب ہو گئے اور علاقہ سید پور پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا۔

اس کے بعد ۱۸۲۱ء سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کا زور ہو گیا تو ایک گھوڑا اور پانچ سو روپیہ سالانہ نذرانہ دیتے رہے۔ ۱۸۲۴ء میں سردار ہری سنگھ نے نذرانہ زیادہ کرنا چاہا۔ اس پر سردار ہری سنگھ سے ناچاقی ہو گئی۔ لیکن جنگ و فساد سے پہلے ہی اس بات پر صلح ہو گئی کہ پانچ ہزار سالانہ دیا کریں، جو ایک سال دیا۔

۱۸۲۶ء میں اس کے علاوہ سات مہار شتر، چار راس خچر اور چار قلادہ سگ شکاری اور دو راس اسپ مقرر ہوئے۔

۱۸۳۰ء میں ہری سنگھ نے پورا مالیہ طلب کیا۔ جنگ ہوئی اور راجگان، خان پور[۱] سے نکل گئے۔

۱۸۳۱ء میں صلح اس پر ہوئی کہ نصف علاقہ کی پیداوار کا مالیہ سرکار سکھاں کا اور نصف راجگان

---

[۱] سردار ہری سنگھ نے ۱۸۲۱ء میں خان پور میں ایک قلعہ بنایا، جس میں اب تھانہ ہے۔

کا ہوگا۔

ایک سال بعد ہری سنگھ نے پورا معاملہ طلب کیا۔ لڑائی نہ ہوئی، مگر راجگان، خان پور سے بے دخل ہو گئے۔

جب راجگان خان پور سے معزول ہو کر چلے گئے تو یہ علاقہ خان پور کے قاضیوں کو سردار ہری سنگھ کی طرف سے تفویض ہوا۔ یہ تین بھائی تھے۔ ۱۔ افضل احمد، ۲۔ نور احمد، ۳۔ محمد اشرف ان کی اولاد سے قاضی محمد اعظم رئیس ایبٹ آباد اور مشہور عالم وکیل شیخ محمد عبداللہ صاحب ایڈووکیٹ مانسہرہ ہیں۔ آخر الذکر کے پاس علوم مغربی کے علاوہ علوم مشرقی کی ایک نادر روزگار لائبریری ہے۔

قوم گکھڑ کی چند معروف و مشہور شخصیتیں

۱۔ رانی منگو۔ یہ دیوان اللہ داد خان کی بیوی تھی جو اٹھارھویں صدی کے شروع میں قوم گکھڑ کا حکمران تھا۔ اگر لوگ رضیہ بیگم، چاند بی بی، نور جہاں اور راہلیا بائی پر فخر کر سکتے ہیں تو گکھڑ قوم بھی اپنی ملکہ "رانی منگو" پر فخر کر سکتی ہے۔ وہ مردانہ لباس پہن کر دیوانِ عام میں بیٹھتی اور ملک کا انتظام کرتی۔ وہ شاہانہ طریقہ سے تمام امور انجام دیتی، بلکہ جنگ کے موقعہ پر اسلحہ سے مسلح ہو کر میدانِ جنگ میں نکلتی۔ چند دفعہ جنگ میں کامیاب بھی رہی۔ شاہ عالمگیر اورنگ زیب نے بھی اس کو خلعت فاخرہ سے سرفراز فرمایا تھا۔ اس نے ملک "پوٹھوہار" کو عدل سے بھر دیا۔

۲۔ سلطان مقرب خان (اصل نام مکرم خاں تھا) گکھڑوں کا ایک بڑا سردار تھا، جس کی حکومت گجرات سے اٹک تک تھی۔ وہ گکھڑوں کے قبیلہ ہتھیال سے تھا۔ مہر سلطان مقرب خان پر یہ الفاظ کندہ تھے۔

"درمیان اٹک، جہلم شد مقرب بادشاہ"

۳۔ راجہ نادر خان گکھڑ: اس نامور سردار نے ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف کھلم کھلا علم آزادی بلند کیا۔ انگریزوں نے بغاوت کو کچل دیا۔ نادر خان کو گرفتار کر لیا گیا اور بعد میں اسے پھانسی دی گئی۔

اسی سال ماہ ستمبر میں تین سو حریت پسندوں، قوم ڈھونڈ کے جانبازوں نے مری پر حملہ بول دیا۔ لیکن انگریز فوج نے اس حملہ کو ناکام بنا دیا اور اس کے لیڈروں کو سخت سزائیں دیں۔

۴۔خان بہادر راجہ جہانداد خان رئیس خان پور۔

راجگان خان پور کی بشاخ سولھویں صدی کے آخر میں اپنی قوم (گکھڑ، راولپنڈی) سے الگ ہوئی اور سلطان سعید خان کا بیٹا فتح خان کوہ نور پور، راولپنڈی سے آکر خان پور میں آباد ہوا۔ اور ۱۸۳۱ء تک اپنے علاقہ کے علاوہ کڑال و ڈھونڈ کے علاقہ پر بھی حکمران رہا۔

راجہ جہانداد خان، راجہ نجف خان (وفات ۱۸۶۰ء) بن راجہ سعید (دیا سید) محمد خان (وفات ۱۸۲۵ء) کے پوتے تھے۔ آپ راجہ حیدر بخش خان (وفات ۱۸۶۵ء) کے بیٹے تھے۔ آپ کی ولادت ۱۸۴۸ء میں ہوئی۔ آپ کے پوتوں میں راجہ سکندر زمان خان ۱۹۷۵ء میں سرحد حکومت میں وزیر تعلیم رہے۔ خاندانی شرافت اور نجابت کا مظہر ہیں۔

سوانح راجہ جہانداد خان

آپ ۱۸۷۷ء میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر مقرر ہوئے۔ ۱۸۸۰ء میں سر لیپل گرفن کے ماتحت کابل میں پولیٹیکل افسر رہے۔ ۱۸۸۹ء میں آپ شاہ پور میں تعینات تھے۔ رمضان ۱۳۱۵ھ، ۱۸۹۷ء میں آپ راولپنڈی میں ایڈیشنل جج تھے۔

آپ ۱۸۷۲ء میں اپنی قوم کے سربراہ مقرر ہوئے۔ آپ اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ، عربی اور فارسی کے ماہر تھے۔ بے حد ذہین تھے۔ حافظہ اعلیٰ درجہ کا رکھتے تھے۔ ملک، قوم اور سرکار میں ان کی بڑی عزت تھی۔ ان کا خاندان علمی خاندان تھا، جس کی شہادت ڈاکٹر سید معین الحق کی کتاب "معاشرتی و علمی تاریخ" کے صفحہ ۲۴۰ کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ملتی ہے۔

"سلطان شادمان خان گکھڑ، عہد شاہجہانی میں قوم کے رؤسا میں سے تھا۔ اس کی زبان میں لکنت تھی، لیکن پھر بھی بادشاہ اس کی وقعت کرتا تھا"

تخت طاؤس کے جشن پر قصیدہ شادمان خان نے لکھا تھا، جو بہت پسند کیا گیا تھا۔ اس کا مقطع یہ تھا ؎

شادمان ظلِ شہنشہِ جہان پائندہ باد   تا بود درخشِ فلک در زیرِ زین آفتاب

راجہ جہانداد خان جو ۱۸۸۰ء میں پولیٹیکل افسر تھے، امیر کابل سے ذاتی مراسم رکھتے تھے، انہوں نے شادی بھی کابل کے سردار خیل خاندان سے کی تھی۔

راجہ جہانداد خان کی علمی وجاہت "شاہی مسجد لاہور کے خطیب" کے زیر عنوان ایک مسلسل مضمون "روزنامہ نوائے وقت" میں شائع ہوا۔ ۱۹ / مئی ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں تحریر ہے کہ:

"مسجد کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۸۷ء میں جب سر سید احمد خان مرحوم بانی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ، لاہور تشریف لائے تو محمڈن ایجوکیشنل کانگرس (اسلامی جماعت التعلیم) کا جلسہ بھی بڑی دھوم دھام سے ہوا تھا۔ جس کی روح رواں خان بہادر برکت علی خان (پیدائش ۱۸۲۱ء، وفات ۱۹۰۵ء) تھے۔ جس میں مولوی ذکاء اللہ اور مولوی نذیر احمد دہلوی جیسے لوگ شامل ہوئے تھے۔ ۲۸ / دسمبر ۱۸۸۷ء جمعہ کے دن کانگریس کے اجلاس میں مولوی نذیر احمد دہلوی کی تقریر تھی۔ جب یہ سب اصحاب نماز جمعہ کی ادائیگی کے لئے مسجد میں تشریف لائے تو خان بہادر راجہ جہانداد خان نے خطبہ پڑھا اور نماز بھی پڑھائی۔"

اس سے راجہ جہانداد خان مرحوم کی علمی ودینی وجاہت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

خان بہادر راجہ جہانداد خاں ۱۸۸۳ء میں ہزارہ میں ایکسٹرا اسسٹنٹ تھے۔ کیونکہ ان کی ایک رپورٹ مجاہدین ساکن پلوسہ کے متعلق درج ریکارڈ ہے۔

پلوسہ دربند سے بیس میل کے فاصلہ پر ہے اور حسن زیوں کے علاقہ میں ہے۔

اس وقت چند بد خواہوں نے راجہ صاحب موصوف کے خلاف حکومت انگریزی کو شکایت کی کہ راجہ صاحب مجاہدین کے لئے ہمدردی رکھتے ہیں۔ مگر ان کی وضاحت کے پیش نظر انگریز حکام نے اس شکایت کو کلیتہً نظر انداز کر دیا۔

شکایت کا پس منظر راجہ جہانداد خان چیف آف گکھڑ ساکن خان پور کی چھوٹی بہن کی شادی مولوی حیات گل صاحب ساکن ہری پور کے ساتھ ہوئی تھی۔ مولوی صاحب موصوف ہزارہ میں امیر مرکز مجاہدین تھے اور ہندوستان اور مجاہدین کے درمیان ایک

واسطہ تھے۔ سب مجاہدین کی امداد کے لئے سامان اور روپیہ بھی ان کی وساطت سے مجاہدین سرحد کو پہنچتا تھا۔

مولوی صاحب مرحوم کے کاغذات میں (جو مجھے بی بی امۃ الحفیظ دختر خان مہدی زمان خان مرحوم ساکن کھلابٹ نے دئے تھے)، اس شادی کا پس منظر اپنا شجرہ نسب وغیرہ کے بعد انہوں نے تحریر کیا۔ حمد و ثنا سے شروع کر کے اپنا شجرہ نسب لکھا ہے۔

"فقیر حیات گل ابن محمد بشیر[۱]، ابن شیخ محمد نذیر[۲]، ابن شیخ کلیم[۳]، ابن شیخ محمد سلطان[۴] ابن شیخ سید محمود[۵]، ابن شیخ گل محمد[۶]، ابن مہدی خان خلیفہ محمد غازی ۔ ۔ ۔ مشہور بہ سالار"۔ (اس تمہید کے بعد "اس قبالہ" میں لکھتے ہیں)، ۔ ۔ ۔ اقرار کرتا ہوں کہ مسماۃ بیگم جان دختر راجہ — حیدر بخش خان[۷] ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جاگیر سے دیا، جو اب آٹھ دس لاکھ کے قریب ہوگا، جو میں نے آج تک کچھ نہیں دیا۔ میری یہ بیوی اپنے بھائی کے مال سے کھاتی رہی۔ میں نے چاندی کی ایک انگوٹھی تک اس کو نہیں دی۔ یہ حویلی (ہری پور والی)، میں نے اپنی بیوی کو حق مہر میں دے دی ہے۔ جو دعویٰ کرے تو مسماۃ مذکور کو دس ہزار روپے ادا کرے اور لے لے۔

یہ اشارہ اپنے بیٹے کے دعویٰ کی جانب ہے۔ یہ بیٹا ان کی دوسری بیوی، ساکن موضع ڈھینڈہ سے تھا۔ راجہ صاحب کی ہمشیرہ ان کی پہلی بیوی تھی۔ ان سے ایک صاحبزادی پیدا ہوئی جو خان شیر محمد خان بن خان زمان خان، خان کھلابٹ سے بیاہی گئی۔ جس کا بیٹا خان مہدی زمان مرحوم ہوا۔ جس کی رگوں میں سلاطین گکھڑ اور علمائے مجاہدین کا دو آتشہ خون دوڑتا تھا۔ ان کی زندگی کی تفصیلی کہانی میں نے اپنی تالیف "دیدہ و شنیدہ" میں تحریر کر دی ہے۔

مولوی حیات گل صاحب کے کاغذات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی خط و کتابت مولوی عبداللہ امیر مجاہدین[۸] سے رہی۔ ایک دو خطوط موجود ہیں، جو بہت خوشخط قلم سے تحریر ہیں۔ انہوں نے اس علاقہ میں درس قرآن و حدیث جاری کیا، حالانکہ مقامی خوانین نے اس کی مخالفت کی۔

---

[۸] عہد ۱۸۴۲ء تا ۱۹۰۵ء سے خطوط کی زبان بڑی مؤدبانہ اور خاکسارانہ ہے۔

آپ کتابوں کی تالیف اور جمع کرنے کے شائق تھے۔

اس کے بعد ہری پور کی ایک حویلی کا ذکر ہے، جو راجہ جہانداد خان نے خود، فتح نور تیلی سے چار سو تیس روپے میں خرید کر دی تھی۔ (مولوی حیات گل صاحب، تیلیوں کی مسجد کے امام تھے اور یہ مسجد اب تک اسی نام سے مشہور ہے)، یہی حویلی مولوی حیات گل نے بیگم جان ہمشیرہ راجہ جہانداد خان کو مہر میں لکھ دی۔

اس کے بعد اپنے (دوسری بیوی سے) بیٹے محمد اسحٰق کی تکلیف دہی کا ذکر کیا اور اس کو والد کُش لکھا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس تحریر میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ اس حویلی اور لالو گلی میں زمین کے سوا میری کوئی جائداد نہیں پھر لکھتے ہیں کہ شادی کے وقت بی بی بیگم جان کا مہر دس ہزار روپے مقرر ہوا تھا۔ (انیسویں صدی کے شروع میں۔ مؤلف)

بہ تقدیر الٰہی میرے نکاح .... دریدہ ہے ....

سلطان صاحب جہانداد خان سخت بیمار ہو گئے (جہانداد خان ۱۲ر جون ۱۸۶۵ء میں گدی نشین ہوئے تھے۔ مولف)، تو انہوں نے خداوند تعالیٰ و تقدس کی نذر مانی کہ اگر، خداوند کریم مجھ (راجہ جہانداد خان) کو صحت عطا فرمائے تو میں (راجہ جہانداد خان) جو بہت پیاری چیز ہوگی، اپنے رب کریم کے نذر کروں گا۔ پس اللہ تعالےٰ نے سلطان صاحب کو شفا بخشی تو سلطان صاحب نے وفائے عہد فرمایا کہ مجھ کو بہت پیاری ہمشیرہ کا ...... دریدہ ...... بیگم جان ...... دریدہ ...... ہی آپ فقیر ہیں اور میرے استاد ...... دریدہ ...... نکاح کر دیتا ہوں اور روٹی کپڑا میری ہمشیرہ کا میرے ذمہ ہوا۔ لہٰذا موضع کھوئی ناڑہ پنڈ سے تیسرا حصہ مقرر ہوا۔

خان پور ڈیم

اس منصوبہ پر عمل کا آغاز ۱۹۶۲ء میں شروع ہوا۔ لیکن ۱۹۷۹ء تک صرف ۵ فیصد کام پورا ہو سکا۔

فوائد | مقصد اولیٰ یہ تھا، کہ یہاں سے ۱۳ کروڑ گیلن پانی، روزانہ اسلام آباد کو مہیا کیا جائے۔
دوم - ۱۰،۷۹۰ ایکڑ اراضی صوبہ سرحد میں اور ۱۱،۷۰۰ ایکڑ اراضی صوبہ پنجاب سے سیراب کی جائے۔

نقصان | اس کے بننے سے قوم گھکڑ کے تاریخی قصبے خان پور، باغ پور، ڈھیری و دیگر دیہات کا نام صفحہ ہستی سے مٹ جائے گا۔ زرخیز اراضیات بمعہ باغات کے زیر آب آ جائیں گی۔ جس طرح کہ تربیلہ ڈیم سے، اتمان زئی اور تنولی قوم کا تاریخ ساز علاقہ، جس پر حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے خلفاء کے قدم پڑے تھے، صفحہ ہستی سے مٹ گئے اور ہزارہ میں بہترین زرخیز دیہات زیر آب آ گئے

رہے باقی سدا ذات اللہ کی اور نام اللہ والوں کا۔

تُرک

باہر سے آنے والی اقوام میں سے قدیم ترین قوم ہے۔ ترک قبیلہ قارلق اس ضلع میں آباد ہوا جس سے اس ضلع کا نام ہی ہزارہ قارلق ہوا، اور انگریزی عہد تک یہی نام رہا۔

قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہزارہ کے ترک چنگیز خان کے حملہ کے وقت آئے۔ دگیارھویں، بارھویں صدی عیسوی،

بعد میں جب تیمور ۱۲۹۸ھ میں اس طرف آیا تو ان ترکوں کی حفاظت کے لئے ترک قبیلہ قارلق کی ایک رجمنٹ یہاں تعینات کر دی۔ جس سے ان ترکوں کی بنیاد یہاں پڑی۔

قارلق تُرکوں کا مذہب | ترکی عالم زکی ولیدی طوفان نے اپنے مضمون "قرآن اور ترک" جو انھوں نے بین الاقوامی کانفرنس منعقدہ راولپنڈی میں پڑھا۔ اس سے چند اقتباسات ترکوں، خاص کر قارلوق کے مذہب کے متعلق درج ذیل ہیں۔

"ترکوں نے آٹھویں اور دسویں صدی عیسوی کے درمیان برضا و رغبت اسلام قبول کیا۔"

"قارلوق ترکوں میں ہزاروں سال بدھ مت رہا، مگر یہ اعلیٰ طبقہ کو ہی مؤثر کر سکا۔

عام لوگ، بموجب مشہور چینی سیاح، ہیون سانگ بغیر مذہب شامانی ہی رہے۔"

"وہ چنگیز خان اور اس کی اولاد کے اسلام قبول کرنے سے، باطنیوں اور علویوں کے دینی حکومت کے خواب پراگندہ ہو گئے اور تمام ترک قبائل میں حنفی دینی تعلیم جاری ہو گئی۔"

"ترک قبائل نے نویں، دسویں صدی عیسوی میں حج کا سفر کرنا شروع کر دیا۔"

ہزارہ میں ترک حکومت

تاریخ ہزارہ (مرتبہ مہتمم بندوبست ۱۸۷۲ء) یہ حکومت ۱۳۹۹ء سے ۱۶۶۸ء تک رہی۔ اس کے بعد اس قوم کے چند افراد ہی باقی رہے۔ جن کی آبادی صرف مانکرائے (تحصیل ہری پور) اور بحالی (تحصیل مانسہرہ) میں رہی۔ ممکن ہے کہ ترک اپنے قدیمی مسکن گلی باغ (نزد لبقہ) سے بے دخل ہونے کے بعد مانکرائے میں اقامت گزیں ہو گئے ہوں۔

ترکوں کا نسب

اصل میں یہ قوم مغل ہے۔ ان کا جد جس کے نام پر یہ قوم ترک مشہور ہوئی کا نام تور تھا۔ اس کے نام پر اپنی قوم کا نام مشہور ہونا بیان کرتے ہیں۔

اورنگ زیب بادشاہ کے وقت (سترھویں صدی عیسوی) اس قوم کا مورثِ اعلیٰ ملوک خان اس ملک میں آیا اور مانکرائے میں آباد ہو گیا۔

بموجب شجرہ نسب ملوک خان کی آمد ۱۶۱۹ء کے قریب معلوم ہوتی ہے۔ پہلے پہل اس علاقہ میں قوم غور غشتی کا غلبہ تھا۔ ترک قوم نے ان سے جنگ کر کے ۱۶۶۹ء میں ان کو ملک بدر کر دیا۔ پرانی آبادی ویران ہو گئی جو اب پیر مانکا کی ڈھیری کے نام سے مشہور ہے۔ موجودہ آبادی اس جنگ کے بعد کی ہے۔

تاریخ ہزارہ سے ایک قابل ذکر واقعہ

زمانہ قدیم میں بموجب کلیاتِ اقوامِ ہزارہ (۱۸۷۲ء) میدانِ ہزارہ میں ۸۴ دیہات آباد تھے (میدانِ ہزارہ سے میدان ہری پور مراد ہے)، قوم گوجر اکثر اس پر قابض تھی۔ قوم ترین و دلازاک بھی اس وقت اس ملک میں موجود تھی۔ قوم دلازاک کے آدمی بہت تھے۔

تمام آباد شدہ دیہات میں یہ لوگ پھیل گئے۔ اور گوجروں کو تکلیف دی۔ گوجروں نے بادشاہ کے پاس استغاثہ کیا، جس پر قوم دلازاک کو اس ملک سے نکال کر ہندوستان کی طرف بھیج دیا گیا۔ مگر کچھ لوگ اس قوم کے یہاں رہ گئے، جن کی انگیخت سے ہر سہ اقوام ترک، ترین اور دلازاک نے باہم مصلحت کر کے قوم گوجر کو اس ملک سے نکال دینے کا منصوبہ بنایا اور قوم گوجر کے سرداراں چودھری موسٰی وعیسٰی ساکن کاہل کو قتل کر دیا۔ اس پر قوم گوجر کے نمائندے اس خونِ ناحق کے خلاف استغاثہ کے لئے دہلی گئے تو اتفاق سے صالح محمد خان دلازاک (جو پہلے سے اس وطن سے نکالا گیا تھا) بادشاہ کے دربار میں حاضر تھا۔ اس نے دریافت حال کر کے ان کی فہمائش کر دی کہ بادشاہ سے درخواست کر کے مجھے ہمراہ لے جاؤ میں تمہارا تصفیہ کرا دوں گا۔

گوجر اس کی چال سے ناواقف تھے، انہوں نے بادشاہ کے حضور دادخواہی کیلئے صالح محمد کو ساتھ لانا چاہا۔ حالانکہ بادشاہ اس کو پھر ہزارہ بھیجنے پر تیار نہ تھا۔ لیکن گوجروں کے اصرار پر اس نے صالح محمد خان کو ان کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ جب یہ سب ہزارہ میں آ گئے تو صالح محمد خان نے قوم ترک و ترین سے اتفاق کر کے ملک ہزارہ کو چار برابر حصوں میں تقسیم کر کے ایک ایک حصہ (۱۲ دیہات) ترک، ترین، دلازاک اور گوجر قوم کو دے دیا۔

طریق تقسیمِ وراثت ترکوں میں تقسیم وراثت قوم گکھڑ خان پور کے طریقہ پر ہے۔ یعنی قوم ترک میں جب تک ایک شخص گدی نشین و راجہ ہوتا رہا تب تک وہ اپنے برادران کو جس جس گاؤں سے مناسب سمجھتا رہا بطور گزارہ دیتا رہا۔ کسی شخص کو برادران وغیرہ سے کبھی حصہ تقسیم کر کے نہیں دیا۔ جس کو جس قدر اراضی کسی گاؤں میں ملتی تھی اس کا وہ دفتری شمار ہوتا تھا اور وہی زمین اس کی اولاد میں تقسیم ہوتی تھی۔ جو کوئی ان دفتریاں سے لاولد (بغیر اولاد نرینہ) مر جاتا تھا، اس کا حصہ راجہ گدی نشین اپنے حصہ راجگی میں شامل کر لیتا تھا۔

راجگان ترک میں خانہ جنگی اور اس کے اثرات قوم غور غشتی کے بے دخل ہو جانے کے بعد ۱۶۶۹ء میں ترکوں نے مانکرائے آباد کیا۔ ملوک خان کے دونوں پوتوں میں ملک تقسیم ہو کر[1] کمال خانی اور ہاشم خانی

---

[1] تاریخ ہزارہ ولس۔

اطراف سے معروف ہوگیا۔ سب دیہات علاقہ ترک پر اس قوم کا قبضہ ہوگیا۔

بادشاہان چغتائی (مغلیہ) کو اپنے علاقہ کا تین ہزار روپیہ مالیہ دیتے تھے۔ اس وقت کل ہزارہ کا مالیہ بارہ ہزار روپے تھا۔ اس وقت یہ ملک، اٹک سرکار کے ساتھ شامل تھا۔ جب ۳۸ ۱۷ء میں نادر شاہ اور ۴۸ ۱۷ء میں احمد شاہ درانی کا عمل دخل ہوگیا تو یہ ملک کشمیر سرکار سے متعلق ہوگیا اور مالیہ مقررہ سرکار کشمیر میں ادا کرتے رہے۔

۱۸۰۲ء میں ہر دو اطراف کمال خانی و ہاشم خانی میں سخت دشمنی پیدا ہوگئی۔ عنایت خان ہاشم خانی نے مسمی کلیم بیگ کمال خانی کو قتل کر دیا۔ اس کے بدلے میں سلام خان (کلیچ بیگ کے ماموں)، کمال خوانی نے عنایت خان کو قتل کرا دیا۔ پھر اسی سال ۱۸۰۲ء میں مسماۃ جیونی بیگم، والدہ عنایت خان (ہاشم خانی)، جو برکات خان تنولی کی ہمشیرہ تھی، نے سلام خان کو اس کے دو رشتہ داروں سمیت مقام رتہ بنہ میں قتل کرا دیا۔ عنایت خان کا فرزند ہاشم خان نابالغ رہ گیا۔ حکومت، اس طرف کی جیونی بیگم والدہ عنایت خان کرتی رہی۔ جب ہاشم خان جوان ہوا تو اس نے ۱۸۱۶ء میں کمال خان کو قتل کرا دیا۔ فتح خان پسر کمال خان خورد سال رہ گیا۔

تاریخ مہتاب سنگھ کے مطابق مانگرائے کے ترک محمد خان و ملوک خان کی اولاد ہیں — ہاشم خان و کمال خان ریاست پٹی تور کی پر مشترکہ حکومت کرتے تھے۔ راجہ ہاشم خان بھائیوں پر زور آور تھا۔ ایک دن آدھی رات کے وقت راجہ کمال خان کو بمعہ متعلقان قتل کر کے پٹی تور کی کا واحد مالک بن گیا اور سب بھائیوں کو دبا لیا۔

سکھوں کی ہزارہ میں آمد اور حکومت کی بنیاد

کمال خان کا جنبہ محمد خان ترین کے ساتھ تھا۔ محمد خان ترین نے مدد کی اور ۱۸۱۶ء میں ہاشم خان کو اپنی وراثت سے نکال کر بے دخل کر دیا۔ ہاشم خان مدد کے لئے پنڈی چلا گیا اور وہاں سے سردار مکھن سنگھ کو لے آیا۔ سردار مکھن سنگھ بمعہ فوج آیا اور ۱۸۱۷ء میں محمد خان کے ساتھ جنگ ہوئی۔ محمد خان کو شکست ہوئی۔ مکھن سنگھ اور راجہ ہاشم خان نے گل ڈھیری (مسکن محمد خان)، کو جلا دیا۔

مکھن سنگھ نے اپنی گڑھی موضع شاہ محمد میں بنائی۔ ۱۸۱۹ء میں مکھن سنگھ مہاراجہ رنجیت سنگھ

سے متعلق ہوگیا۔ پہلے یہ خود مختار جاگیردار تھا۔

۱۸۲۰ء میں محمد خان نے بامداد قوم ترک و دلازاک شاہ محمد میں بکھن سنگھ سے لڑائی کی۔ بکھن سنگھ اس جنگ میں مارا گیا۔ اس کے بعد ۱۸۲۰ء میں دیوان رام دیال، مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے آیا۔ وہ ناڑہ (سابق کھلابٹ سے بطرف پہاڑ علاقہ سری کوٹ) میں قوم مشوانی وغیرہ کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ اس کے بعد سردار امر سنگھ مجیٹھیہ حاکم ہوکر آیا۔ وہ سمندر کٹھہ (علاقہ ناڑہ نیلاں) کڑراؤں کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ ۲۲-۱۸۲۱ء سے سردار ہری سنگھ حاکم ہوکر آیا۔ اس نے شہر اور قلعہ ہری پور کی بنا رکھی۔ اقوام کے سرگروہوں کو جاگیریں دینے کی تجویز کی۔ ترکوں میں ہاشم خان کو ایک ہزار کی جاگیر دی، مگر فساد کم نہ ہوا۔ ۱۸۲۳ء میں جب سردار ہری سنگھ لاہور گیا ہوا تھا، ملک میں بڑی شورش پیدا ہوگئی۔ تھانہ شنکیاری، دربند، نواں شہر و اگرور وغیرہ پر اقوام ملکی نے قبضہ کرلیا۔ ۱۸۲۴ء میں سردار ہری سنگھ نے واپس آکر فتح پائی۔

اسی سال ہری سنگھ نے ناڑہ (سید خانی نزد سابق کھلابٹ)، مشوانی و سید خانی سے شکست کھائی۔ لیکن بعد میں اسی سال ۱۸۲۴ء میں فتح پائی۔ اب اس کو یہ ثابت ہوا کہ جب تک ان اقوام ترک، دلازاک و ترین وغیرہ کے سرکردہ توپ سے نہ اڑائے جائیں، ملک میں شورش ختم نہ ہوگی اس لئے بوستان خان ترین، محمد خان پدر پائندہ خان ساکن تلوکر، جلال خان دلازاک، شیر محمد و صالح محمد مشوانی اور شیخا جدون پدر عبداللہ خان چنبہ والے کو توپ سے اڑا دیا گیا۔

اس وقت ہاشم خان و فتح خان سرگروہ قوم ترک فرار ہوگئے۔ سب قوم ترک ۱۸۱۰ء کی شکست کے بعد سلسلہ وراثت میں پریشان رہے۔

ہزارہ گزیٹر ۱۹۰۷ء کے بیان کے مطابق ہزارہ کے ترک ان قارلق ترکوں کی اولاد سے ہیں جن کو امیر تیمور لنگ نے چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں ہندوستان کے حملہ سے واپسی پر ہزارہ میں بسا دیا تھا۔ ایک وقت میں ان کی غالب اکثریت (حکومت) تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ پٹھان اور دیگر اقوام نے ان کو اپنی جائیداد و ملکیت سے بے دخل کردیا۔ اور آخر ۱۷۷۰ء میں ہم ان کو تیمور شاہ درانی کے آگے درخواست کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ ان کی درخواست یہ تھی کہ ان کو اپنے آبائی مرکزی مقام، مانگرائے، میں جس سے ان کو قوم غور غشتی نے بے دخل کردیا ہے، واپس بسایا جائے۔

ان کی درخواست منظور ہوئی اور وہ اب مانگرائے میں جو اس ضلع میں ترکوں کا صدر مقام ہے، موجود ہیں۔ لیکن ان کی گزشتہ شان و شوکت ختم ہو چکی ہے۔ وہ ایک رو بہ تنزل قوم معلوم ہوتے ہیں ان میں کوئی با اثر آدمی نہیں اور نہ ہی ان میں قوت کے آثار پائے جاتے ہیں۔

اتمان زئی

یہ یوسف زئی قوم کی شاخ ہے اور اس شاخ کے دو قبیلے۔ طاہر خیلی و سید خانی جو ہزارہ میں آئے، قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر علاقہ گندگر و کھڑی دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ حسن ابدال تک، پر متصرف ہیں اور سید خانی علاقہ خالصہ و کھلابٹ۔ درگڑی۔ تربیلہ میں آباد ہیں۔

ان دونوں قوموں کے چھوٹے چھوٹے گروہ یا چند افراد وقتاً فوقتاً ہزارہ میں آتے رہے اور آہستہ آہستہ اپنے قدم یہاں جماتے رہے۔ بطور یلغار ان کی آمد اس ضلع میں دوسری اقوام کی طرح نہیں ہوئی۔ طاہر خیلی قوم سید خانیوں سے بہت پہلے وارد ہزارہ ہوئی اور تربیلہ سے لے کر علاقہ گندگر اکھڑی دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ حضرو اور حسن ابدال تک کے علاقہ پر چھا گئے۔ سید خانی اغلباً سکھوں کی سلطنت کے عہد آخر اور انگریزوں کی آمد آمد سے پہلے اس ملک کے علاقہ خالصہ و کھلابٹ، درگڑی داڑی اور تربیلہ، میں وارد ہوئے۔ سکھوں اور انگریزوں کی آویزش میں بھرپور کردار از جانب حکام انگریزی ادا کر کے اپنے سیاسی شعور و کردار شجاعت کی بناء پر اپنا اثر و مقام پیدا کر لیا۔ قارئین کرام تفصیلات آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

اتمان زئی یہ قوم[1] یوسف زئی (ساکن پار دریائے سندھ) کی ایک شاخ ہے۔ اقوام ساکنان تربیلہ (گوجر، شلمانی اترین) نے پہلے پہل اتمان زیوں کو عہد اکبر بادشاہ میں تنولیوں کی دست درازیوں سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے بلایا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ یہ گوجروں شلمانیوں اور ترینوں سے بہت سا علاقہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

لیکن رواج نامہ بندوبست ۱۸۷۲ء کے مطابق اتمان زئی ابدالی خاندان کے زمانہ حکومت میں بطور یلغار پار دریائے سندھ (ٹوپی۔ کھبل، کوٹھہ، وغیرہ) سے آئے اور قوم دلازاک و ترک سے ملکیت

---

[1] ماخوذ تاریخ ہزارہ ۱۸۷۲ء۔

حاصل کی۔ لیکن صحیح یہی ہے کہ پہلے یہ قوم اہل تربیلہ کی درخواست پر برائے امداد مغلوں کے عہد سلطنت میں آئی۔ (اکبر بادشاہ کے عہد میں) اس کی تصدیق مزید موضع جھاڑ، جٹو و لقمانیاں کے صورت دیہی کے حالات سے ہوتی ہے۔ احمد شاہ ابدالی کے وقت ممکن ہے، کہ ان کا زیادہ زور و غلبہ ہو گیا ہو اور خاص کر علاقہ گندگر و کھڑی ہیں۔ لیکن ان کا بطور یلغار آ کر اس علاقہ کا احمد شاہ ابدالی کے عہد میں بزور قبضہ کر لینا قرین قیاس نہیں۔ کیونکہ تربیلہ میں ترین قوم کی بھی ملکیت تھی اور وہ ابدالی درانی، قوم کے ہم جدی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ تیمور شاہ کے زمانہ سلطنت میں نجیب اللہ خان ترین حاکم ہزارہ ہوا، لہٰذا اس وقت ترینوں سے بزور یہ علاقہ لے لینا صحیح معلوم نہیں ہوتا۔

اللہ بخش یوسفی، یوسف زیوں کے حالات میں لکھتا ہے کہ بھاگو خان کو شاہ جہان بادشاہ نے اغلباً ۱۶۰۰ء میں کوہ گندگر کا میدانی علاقہ (مغربی طرف)، تربیلہ اور غازی کی سرحد سے چھچھ تک دے دیا۔ لہٰذا یوسف زئی (اتمان زئی)، اس وقت تک بکثرت اس علاقہ میں آباد دکھائی دیتے تھے بھاگو خان نے ہزارہ کو فتح کرنے کا اقدام اغلباً ۶۰، ۱۶۶۶ء میں کیا۔ لیکن سردار شادمان و دوسرے افسران جو قلعہ اٹک کی حفاظت پر مامور تھے۔ انہوں نے لازماً حکومت کو اس طرف متوجہ کیا ہوگا، تو حکومت سے ٹکر ہوئی۔ اس سے پہلے مصری خان امازئی نے (یہ خان ہمایوں بادشاہ اور شیر شاہ کے وقت تھا۔ تناول ہزارہ پر حملہ کیا۔ ان شاخوں میں علی زئی کی تعداد ہزارہ میں سب سے زیادہ ہے۔

علی زئی کے تین نامور خیل یہ ہیں۔

۱۔ طاہر خیلی دتار خیلی، ۲۔ سید خانی۔ ۳۔ خوشحال خانی۔

۱۔ تار خیلی علاقہ کھڑی و گندگر میں۔ کنا۔ زئی تربیلہ اور خالصہ میں دریائے دوڑ کے پائیں آب میں آباد ہیں۔ اکازئی اس ضلع میں بہت تھوڑے ہیں۔

۲۔ خیل سید خانی۔ ان میں معزز خاندان کھلابٹ کا ہے۔ ان کا جد امجد میر زمان خان بہت بہادر اور میجر ایبٹ کا نہایت وفادار ساتھی تھا۔ اس کی بہادری کے کارنامے بہت ہیں۔ لیکن ایک واقعہ اس جگہ قابل ذکر ہے۔ ایک وقت ایسا آیا کہ سب سکھ لشکر ہزارہ سے چلا گیا اور ان کے ایک ہزار سپاہی قلعہ ہری پور میں مورچہ گزین ہو گئے۔ میر زمان خان نے میجر ایبٹ سے ہری پور کے دیہات سے مالیہ جمع کرنے کی اجازت مانگی۔ اس کام کے لئے ابھی وہ موضع درویش ہی میں تھا

کر سب سکھ لشکر ہری پور سے نکل کر اس پر حملہ آور ہوا۔ لیکن اس نے اپنے تیس سوار ساتھیوں کے ساتھ اس پامردی سے مقابلہ کیا کہ وہ بھاگ کر پھر قلعہ میں داخل ہو گئے۔

میر زمان خان کی وفات کے بعد اس کا بیٹا خانی زمان خان جانشین ہوا۔ وہ بھی اپنے باپ کی طرح حکومت کا وفادار تھا وہ بہت خراج اور سخی انسان تھا۔

میجر ایبٹ کے بیان کے مطابق حکومت انگریزی کے لئے خانانِ کھلابٹ سے زیادہ وفادار اور کوئی اس ضلع میں نہیں تھا۔

میر زمان خان کا والد سعد اللہ خان بھی بہادری میں مشہور تھا۔ میجر ایبٹ نے اس کی وفات پر انگلینڈ سے سنگ مرمر کا ایک کتبہ اس کی قبر پر لگانے کے لئے بھیجا تھا، جس پر مندرجہ ذیل یادداشت کندہ تھی۔

ترجمہ: "یہ یادگار سعد اللہ خان سید خانی، خان کھلابٹ، ناڑہ کا بہادر محافظ جس نے سکھوں کے تین حملوں کا مقابلہ کیا۔ اس نے زندگی مصائب اور تکالیف میں گزاری معزز اور سب سے زیادہ قابل عزت۔ وفات ۱۸۵۲ء، عمر ۹۵ سال۔ یہ پتھر اس کے دوست میجر جیمس ایبٹ نے نصب کرایا۔"

نوٹ: یہ پتھر اس کی قبر پر نہ لگایا گیا، بلکہ بطور خاندانی یادگار خانانِ کھلابٹ کے پاس محفوظ ہے۔

سیّد خانیوں کا قبضہ، خالصہ کے علاقہ پر

۱۸۷۲ء کے بندوبست کے مطابق سید خانیوں کے مورث سید خان نے تین سو سال پہلے (یعنی پندرہ سو عیسوی میں)، خالصہ پر بزور شمشیر دخل وارثانہ پایا۔ اسی وقت رقبہ کھلابٹ پر بھی قبضہ کیا۔ اس کی وفات کے بعد کھلابٹ کا گاؤں اور اس کا رقبہ عظمت خان برادر سید خان کو دیا گیا اور باقی رقبہ اس کے پسران رضا خانؒ، دریا خانؒ، مقرب خانؒ، بہادر خانؒ، قطب خانؒ اور الیپ خانؒ پر مساوی تقسیم کیا گیا۔ یہ علاقہ خالصہ قوم گوجر کا تھا اور وہی یہاں بستے تھے۔ سید خان جب پار دریائے سندھ سے موضع کوٹھہ علاقہ یوسف زئی سے اس علاقہ میں آیا تو اس وقت صرف دو پرانی آبادیاں تھیں۔ کھلابٹ اور کانڈل۔ پہلے پہل اس نے کھلابٹ کی آبادی میں اپنی چند ڈھوک بنا کر اپنا مال مویشی یہاں رکھا اور خود پھر پار چلا گیا۔ چونکہ اس وقت باہم اقوام علاقہ ہذا، اور

علاقہ غیر مثلاً تناول، ولزاک، ترک و ترین، اکثر بدی رہتی تھی - اس واسطے اقوام علاقہ ہٰذا نے سید خان کے پاس فریاد کی - اس وقت اس نے آکر اس علاقہ میں بہ مقام کھلابٹ سکونت اختیار کر لی اور اقوام ساکنانِ علاقہ کو بدی سے بچاتا رہا - آخیر عہدِ اسلام تک یہ آبادی بدستور آباد و بارونق رہی - شروع عملداری سکھاں میں الٰہی بخش توپ خانہ والے (مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج کا افسر) سے سید خانیوں کی بدی ہوگئی - کل قوم نے بمعہ رعایا کے مقام ناڑہ میں جاکر قلعہ بندی کر لی اور الٰہی بخش سے لڑائی شروع ہوگئی - الٰہی بخش نے کھلابٹ اور کانڈل کو جلا دیا - مگر ناڑہ پر بدستور چار برس چھیڑ چھاڑ اور لڑائی جاری رہی - اس کو فتح کرنے کے لئے اول ماتی سدا کور، پھر شیر سنگھ، لبعدہٗ جمیت سنگھ ورام دیال اور ان کے بعد سردار ہری سنگھ، الٰہی بخش کی کمک کے لئے آتے رہے - لیکن ہر بار شکست ہائے شدید کھا کھا کر فرار ہوتے رہے - آخر میں مہاراجہ رنجیت سنگھ بذاتِ خود تشریف لائے - ان کے مقابلے میں سید خانی مغلوب ہو کر پار دریائے سندھ چلے گئے - چند ماہ بعد سردار ہری سنگھ نے بہ اجازت مہاراجہ رنجیت سنگھ سید خانیوں کو بلا کر اس جگہ آباد کیا - کھلابٹ اور کانڈل کی آبادی نے رونق پکڑی - آخر عملداری سکھاں میں دیوان مولراج سے لڑائی ہوئی اور لنڈی مسلمانی (عارضی مسلمان حکومت) ہوگئی - اس وقت پھر کھلابٹ جلا دیا گیا اور لوگ موضع ناڑہ پر چڑھ گئے - دیوان مذکور سے بدی رہے - تا وقتیکہ میجر ایبٹ تشریف لائے - اس وقت قدرے امن ہوگیا اور اس کی اجازت سے پھر کھلابٹ اور کانڈل آباد کر لئے گئے -

اس کے بعد چتر سنگھ کی شورش ہوئی اور اولاد سعد اللہ خان، میر باز خانی مفرور ہو گئے اور میجر ایبٹ کے ساتھ کمر بندی کرتے پھرے - جب میجر ایبٹ نے پورا پورا قبضہ کر لیا تو ملک میں امن و امان ہوگیا - اس کے بعد پھر ان گاؤں کی ویرانی نہیں ہوئی -

وجہ تسمیہ کھلابٹ کھلابٹ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ایک اونچا پتھر سیدھا کھڑا تھا، جس کا نچلا حصہ زمین میں گڑا ہوا تھا - مقامی زبان میں پتھر کو "بٹ" اور کھڑا کو "کھلا" کہتے ہیں - اس لئے اس جگہ کا نام کھلابٹ مشہور ہوگیا -

روسائے با اختیار و نامی خاندان پنجاب مؤلفہ کرنل چارلس فرانسس مطبوعہ ۱۹۰۴ء نے خاندان کھلابٹ کے حالات کے اقتباسات

درج ذیل ہیں۔

خانی زمان خان سید خانی شاخ اتمان زئی کا سرکردہ ہے۔اس شاخ کا مورثِ اعلیٰ بابا سید خان احمد شاہ درانی کے زمانہ میں کوٹھ اور ٹوپی (پار دریائے سندھ) پر قابض تھا۔اس نے اپنے مقبوضات واقع ہزارہ کی حفاظت کے لئے کھلابٹ آباد کیا۔یہ تنولیوں اور ترینیوں سے ہمیشہ لڑتا رہا اور اپنی سرداری ہمیشہ قائم رکھی اور اپنے علاقہ کو رفتہ رفتہ وسعت دی۔

اس کا پوتا سعد اللہ خان سکھوں کے بڑے دلیر مخالفوں میں سے تھا۔اس نے سردار ہری سنگھ کو بہ مقام ناڑہ شکست دی۔میجر ایبٹ نے اس واقعہ کی یاد میں جہاں سعد اللہ خان اور اس کے ساتھیوں نے لڑ کر فتح پائی تھی۔ایک سفید مینار تعمیر کرایا۔

خانی زمانی خان کا باپ میر زمان خان میجر ایبٹ کا ایک بڑا دلیر اور وفادار معاون تھا۔اتمان زیوں اور مشوانیوں ہی کی مدد سے میجر ایبٹ چتر سنگھ اور اس کی فوج کا جبکہ وہ دربار لاہور سے باغی ہو گئی تھی،مقابلہ کر سکا تھا۔

الحاق پنجاب کے وقت سے کھلابٹ کا خاندان سید خانی بڑا وفادار اور نیک چلن رہا اور ہزارہ کے کسی رئیس نے انگریزی حکومت قائم ہونے میں ان تینوں بھائیوں میر زمان خان،قلندر خان اور عبد اللہ خان سے زیادہ مدد نہیں دی۔۱۸۵۲ء کی فوج کشی میں جو کاغانی سیدوں اور کالا ڈھاکہ کی قوموں پر کی گئی،عبد اللہ خان ساتھ تھا۔اس موقع پر اس نے بڑی عقلمندی اور دلیری سے کام کیا۔قلندر خان کئی سال ایبٹ آباد میں تھانہ دار رہا۔۱۸۵۷ء میں ان بھائیوں نے اس فوج کے واسطے جو ہندوستان کے لئے بھرتی کی جا رہی تھی،سوار اور پیادہ دیئے۔

عبد اللہ خاں کچھ سواروں پر کمانڈر ہو کر اٹک کی سرحد پر گیا،تاکہ وہ ستھانہ کے مجاہدین پر جو بغاوت کے لئے وعظ کر رہے تھے،نگرانی رکھے۔

امبیلہ کی پہلی لڑائی میں عبد اللہ خان سر سڈنی کاٹن کے برابر ساتھ رہا۔

جاگیر۔خاندان سید خانی

۱۸۶۸-۶۹ء کے باقاعدہ بندوبست کے سلسلے میں ڈپٹی کمشنر بچر (BECHER) نے اپنے

ہاتھ سے شجرہ نسب سعداللہ خان و پسران درج کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ گندگر جو کہ ضلع ہزارہ کا قلعہ ہے، اس کی چابی میر زمان خان کے پاس ہے۔ جب چتر سنگھ کی بغاوت (۱۸۴۸ء) میں ظاہر ہوئی تو انگریزی افسران نے اپنا کیمپ ناڑہ میں لگایا، کیونکہ ایک تو یہ جگہ محفوظ تھی جہاں پر سکھوں کو فیصلہ کن شکست دی گئی تھی اور دوسرے میر زمان خان کی شجاعت اور اس کے خاندان کی مخلص حمایت کا یقین اور بھروسہ تھا۔ سات ماہ تک اس شجاعت و اخلاص کی آزمائش کی گئی، جبکہ سکھ اور درانی فوجیں عین سامنے فروکش تھیں اور چتر سنگھ اور دوست محمد خان کی جانب سے بہت ہی دل لبھا دینے والی پیش کشیں ہوتی رہیں۔ لیکن میر زمان کی شجاعت اور وفاداری میں بال بھر بھی فرق نہ آیا اور جب اس کو سکھوں کے ایک ہزار سپاہی جو قلعہ ہرکشن گڑھ سے نکل کر حملہ آور ہو رہے تھے، مقابلہ کے لئے حکم دیا گیا تو وہ تلوار بدست ان پر ٹوٹ پڑا اور ان کے بہت سے آدمیوں کو قتل کر کے شکست فاش دی۔ یہ ہزارہ کے ایک اہم مقام پر قابض ہے۔ جہاں پر اس کے مقابلہ پر سکھوں اور درانیوں کی متفقہ فوجیں ٹکرا کر پاش پاش ہوئیں۔ ضلع ہزارہ کا انگریز حاکم (میجر ایبٹ)، گزشتہ جنگ کی تمام مدت میں اس کا مہمان رہا۔ اس کے لئے دو ہزار کی جاگیر حینِ حیات اور بارہ سو روپیہ دوامی کی سفارش کی جاتی ہے۔

میر زمان ۲۰ر نومبر ۱۸۶۹ء کو فوت ہوا اور مندرجہ ذیل اولاد چھوڑی۔

۱۔ پٹھان بیوی جو قائم خان پنی ساکن پنیاں کی بہن تھی۔ اس سے بڑا بیٹا خانی زمان خان عمر ۳۰ سال۔ دوسرا لڑکا علی بہادر خان عمر ۱۸ سال۔

۲۔ غیر قوم بیوی سے۔ تیسرا لڑکا عمر ۱۴ سال۔

مہتمم بندوبست کیپٹن ویس (WACE) کی رپورٹ ۱۳ر اپریل ۱۸۷۰ء

میر زمان خان کی جاگیر علاقہ خالصہ

ہری پور و تربیلہ کے درمیان میں ہے۔ شمال میں نواب امب کی جاگیر علاقہ تناول ہے اور جنوب میں مشوانی علاقہ جو اس قوم کے ملکوں کو انعام دیا گیا۔ تارخیلیوں کا نصف سے زیادہ علاقہ جاگیر میں ہے۔ لیکن میر زمان خان کی ایک ہی ایسی جاگیر ہے جو کہ ہماری موجودہ حکومت برطانیہ نے عطا کی ہے۔ باقی سب جاگیریں گزشتہ حکومتوں کی عطا کردہ اجرا کی گئی ہیں۔

میرزمان خان کی جاگیر میں مواضعات ذیل ہیں۔ بصیرہ، کاگ، کھلابٹ، بادہو، مماہیہ، کوٹ۔
میزان کل مالیہ۔/۲۰۳۶ روپے۔

اس رپورٹ پر ڈپٹی کمشنر ہزارہ نے اپنی سفارش کمشنر پشاور کو ۱۵؍جون ۱۸۷۰ء میں بھیجتے ہوئے لکھا:

"میرزمان خان مرحوم جاگیردار ایک مشہور قابلِ عزت اور وفادار انسان تھا جس نے ہماری حکومت کے ابتدا میں اس ضلع میں میجر ایبٹ کی بے بہا امداد کی۔ اس بات کے کہنے میں کچھ مبالغہ نہیں کہ اگر میرزمان خان اور اس کے خاندان کی بے مثال شجاعت اور وفاداری میجر ایبٹ کے ساتھ نہ ہوتی تو اس کو بے انتہا مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا اور حقیقت یہ ہے کہ اس کی زندگی ان کے ہاتھوں میں امانت تھی۔ اور انہوں نے اس امانت کی عزت و دیانت سے نگہداشت کی۔"

یہ رئیس اور قاضی عبدالغفار ساکن سکندر پور میجر ایبٹ کے خاص صلاح کار اور حمایتی تھے۔ میری رائے میں اس کے خاندان کے ساتھ اگر حکومت فراخدانہ سلوک کرے تو یہ صحیح اور مناسب ہوگا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس کی سابقہ شاندار خدمات حکومت کو یاد ہیں اور دوسرے خوانین کو باور کرایا جا سکے کہ حکومت ایسی خدمات کا صلہ اعلیٰ طور پر عطا کرتی ہے میں اس جذبہ کے تحت سفارش کرتا ہوں کہ بڑے لڑکے خانی زمان خان کو اپنے باپ میرزمان خان کی پوری جاگیر عطا کی جائے۔"

بموجب خط ڈپٹی کمشنر ہزارہ بنام ریونیو کمشنر، خانی زمان خان جاگیردار، آنریری مجسٹریٹ، سول جج اور پراونشل درباری ۲۰؍۲۱؍اگست ۱۹۰۵ء کو فوت ہوا اور اس کی جاگیر اس کے بڑے لڑکے محمد امان خان کو جو رسالہ ۹م میں رسالدار تھا، عطا ہوئی۔ خان بہادر محمد امان خان ساکن کھلابٹ جاگیردار اور پراونشل درباری کی وفات ۲۰؍فروری ۱۹۱۷ء کو ہوئی اور اس کی جانشینی کے لئے اس کے جوان العمر بیٹے محمد زمان خان عمر ۱۷ سال جبکہ وہ ہری پور میونسپل سکول (یہ اب گورنمنٹ ہائی سکول نمبر ۲ ہے) میں زیر تعلیم تھا، کی سفارش ہوئی۔ سفارش میں تحریر کیا گیا کہ وہ تعلیم یافتہ اور ذہین ہے اور پختہ عمر ہونے پر تمان زیوں کے چیف ہونے کے فرائض بوجہ احسن ادا کرے گا۔ داور یہ خیال

حرف بحرف صحیح ثابت ہوا۔ ش ب)

قلندر خان برادر میر زمان خان ساکن کھلابٹ نے ۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۴ء تک پیادہ لیوی (Levy) میں اور اس کے بعد ۱۸۶۹ء تک پولیس میں خدمت کی۔ وہ ۱۰ مئی ۱۸۷۳ء کو فوت ہوا۔

عبداللہ خان برادر میر زمان خان ساکن کھلابٹ ہری پور کا کوتوال رہا۔

فضل خان اتمان زئی (سید خانی) ساکن ٹوپی ضلع مردان کو خدمات کے صلہ میں سکھوں نے موضع مراد آباد و گہر خان بطور جاگیر دئے۔ جس کی مالیت ۱۷۳۳ روپیہ تھی۔ فضل خان نے یہ جاگیر ۱۷ سال کھائی۔ اس کے بعد میر غزن خان پسر ش نے ۱۸ سال کھائی۔ سرکار انگریزی نے اس جاگیر کو جاری رکھا۔

زمانہ حال میں قوم سید خانی کے نامور افراد

۱۔ خان بہادر محمد زمان خان مرحوم بن محمد امان خان بن خانی زمان خان، مدبر صاحب الرائے انسان تھے۔ حکام وقت انگریزی وعہد پاکستان میں صاحب اثر تھے۔ ہزارہ میں چیف آف اتمان زئی تھے مگر مزاج منکسرانہ اور طبیعت سادہ تھی۔ سیاست ملکی پر خوب نظر تھی۔ پابند صوم وصلوٰۃ تھے۔ گفتگو مدلل، پر از حکمت اور موثر ہوتی تھی۔

۲۔ خان فخر الزمان خان بن ناصر خان بن خانی زمان خان۔ آپ خاموش، سنجیدہ، متین اور خوش اخلاق انسان ہیں۔ پاکستان کے C.S.P تھے۔ ۱۹۷۵ء کمشنری سے پنشن پر آئے۔

۲۔ خیل تارخیلی (طاہر خیلی)

یہ قوم اتمان زئی پتہ علی زئی سے ہیں۔ طاہر خان مورث اعلیٰ کے نام سے طاہر خیلی مشہور ہوئے۔ احمد شاہ ابدالی کے دور سے قدرے پیشتر ۱۷۴۰ء میں ان کا دخل علاقہ جات کھڑی و گندگر میں ہوا۔ پہلے ان علاقہ جات قوم سلیمانی[2] (شلمانی) و قوم بلخاوری کا تھا۔ رہن، بیع وغلبہ وغیرہ سے اس قوم نے دخل پا لیا۔ احمد شاہ درانی کے عہد میں بلند خان پسر طاہر خان پانی پت کی لڑائی میں حاضر اور خدمت گزار رہا۔ اس کا لڑکا فتح خان بھی معزز آدمی ہوا ہے۔

یہ قوم علاقہ کھڑی و گندگر ضلع ہزارہ اور ہر دو ضلع راولپنڈی پر از روئے وراثت وحکومت قابض تھے۔ عملداری سکھاں کے چند سال بعد گندگر و کھڑی ان کی سالم ملکیت رہی۔ لیکن ہر دو سے نصف

---

[1] تاریخ ہزارہ "ولیس" ص۸۹ - [2] سلیمانی عربی پٹھان کو کہتے ہیں۔

پیداوار سرکاری ہوگئی۔ شاہانِ سلف سے عہد سکھاں تک وراثت مکمل طور پر ان کی تھی اور کچھ مالیہ وغیرہ نہ دیتے تھے۔ ۱۸۴۸ء میں شورش چتر سنگھ میں خانی زمان خان و غلام محی الدین بمعہ دیگر خوانین کے وراثت سے بے دخل ہو گئے اور کرم خان پسر خانی زمان خان چند سال قید رہ کر بھی اپنی وراثت سے بے دخل پھرتا رہا۔ خان زمانی خان پار دریائے سندھ علاقہ غیر چلا گیا اور وہیں فوت ہوا۔ بندوبست ۱۸۷۲ء میں سرکار انگریزی نے وراثت واپس کی لیکن جاگیر بدستور ضبط رہی۔ ہندوستان وخراسان کی بڑی شاہراہ اس قوم کی سکونت سے گزرتی تھی اور ان کا اس علاقہ کے سفر و تجارت پر قبضہ و استیلاء رہا اور ان کے حملے ضلع ہزارہ و ضلع راولپنڈی پر ہوتے رہے۔

شاہانِ چغتائی کے وقت یہ اس علاقہ میں موجود نہ تھے۔ ان کا مکمل دخل سلطنت درانی کے عہد میں ہوا۔

ہزارہ گزیٹر میں تحریر ہے کہ اگرچہ یہ اتمان زیوں کی شاخ ہے لیکن ان کے ساتھ شادی بیاہ نہیں کرتے۔ ان کے رسوم و عادات اتمان زیوں سے مختلف ہیں۔ ان میں ترکہ کی تقسیم پگ وَنڈ[لہ] کے اصول پر ہے، حالانکہ ہزارہ کے اتمان زیوں کی تقسیم چونڈا ونڈ[ٹہ] پر ہے۔

ان کا خان، خانی زمان خان سکنہ کوٹھرہ تھا۔ لیکن بغاوت کی وجہ سے اس کی خانی جاتی رہی۔ اس قوم میں اچھا خاندان محمد خان سکنہ خرباڑہ کا ہے، لیکن بدقسمتی سے وہ فاتر العقل ہے۔

نوٹ: اس قوم میں افغانی مساوات و برادری کا ایسا نظام ہے جو کسی اور پٹھان قوم میں نہیں۔ اس قوم کا ہر فرد بحصہ مساوی جاگیر میں حصہ دار ہوتا ہے۔ بخلاف دوسرے افغان اقوام جن میں بڑا بھائی ہی سالم جاگیر کا مالک ہوتا ہے۔ (ش ب)

۲- ۱۸۷۲ء میں بموجب تاریخ ہزارہ یہ قوم گھر میں پشتو زبان بولتی تھی۔

۳- غیر قوم کی بیوی کی اولاد کو گزارہ دیتے ہیں اور کمین قوم کی عورت کی اولاد کو محروم الارث رکھتے ہیں۔

لہ- بیٹوں کے لحاظ سے تقسیم

ٹہ- عورتوں کے لحاظ سے تقسیم۔

ماضی قریب کی طاہر خیلی کی نامور شخصیتیں

۱۔خانی زمان خان ،جو اس قوم کا سربراہ تھا۔ جب انگریزی سلطنت کا دور دورہ شروع ہوا تو اس نے انگریزوں کی اطاعت قبول نہ کی اور پار دریائے سندھ کے علاقہ میں چلا گیا اور وہاں ہی فوت ہوا۔

۲۔محمد عمر خان مرحوم نمبردار غازی۔یہ عالم شخص تھے اور زندگی عزت و وقار سے گزاری۔آپ کتابوں کے عاشق تھے اور اپنے علاقہ میں عزت و وقار سے دیکھے جاتے تھے۔چند سال نواب امب کے وزیر رہے۔اپنے علم و تجربہ سے ریاست کی خدمت و تعمیر کی۔

۳۔شیر بہادر خان مرحوم ولد محمد عمر خاں مرحوم ساکن غازی۔آپ علم دوست باپ کے قابل ترین فرزند تھے۔آپ میرے والد مرحوم کے شاگرد تھے۔تعلیم کے بعد ۱۹۰۷ء میں تحصیلدار ہوئے اغلباً ۱۵-۱۹۱۴ء میں وانا جنوبی وزیرستان میں تھے کہ راستہ میں تانگہ میں جاتے ہوئے مسعود قوم کے چند افراد نے آپ کو گولی مار کر قتل کر دیا۔آپ کی ذہانت اور قابلیت کے والد مرحوم اتنے گرویدہ تھے کہ میرا نام بھی ان کے نام پر رکھا۔

۴۔ان کے دوسرے بھائی عبدالقادر خاں مرحوم پولیس کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے عہدے سے پنشن پر آئے۔ایک فرشتہ سیرت انسان تھے اور محکمہ پولیس میں رہ کر اس دیانت اور شرافت سے وقت گزارا کہ آج تک ان کا نام زبانوں پر ہے۔اپنے گاؤں غازی کی سڑک کے کنارے پر کھڑے تھے کہ موٹر لاری کی ٹکر سے زخمی ہو کر فوت ہو گئے۔ ؏

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

ك ۔ ۵، راکتوبر ۱۹۰۷ء میں بطور نائب تحصیلدار لئے گئے۔ان کے کارڈ مورخہ ۱۰ راکتوبر ۱۹۰۷ء سے جو والد مرحوم کے نام تھا، سے واضح ہوتا ہے۔

ك ۔سید عبدالجبار شاہ مرحوم تھانوی اپنی خود نوشت سوانح عمری میں تحریر فرماتے ہیں "محمد عمر خان طاہر خیلی نواب محمد اکرم خان کے عہد میں ان کے وزیر تھے۔بہت علم دوست اور متدین انسان تھے۔سر سید مرحوم کے مداح تھے۔انہوں نے ساٹھ سالہ ریاست امب کی آمد و خرچ کا حساب تین سال سے (غالباً ۱۹۰۰ء سے ش ب) ذمہ داروں سے مکمل طور پر لیتے رہے ہیں

انہوں نے اپنے بھائی شیر بہادر خان صاحب مرحوم کی کتابوں سے الہلال کے مجلدات، میری درخواست پر مجھے عنایت فرمائے، جو میرے پاس ہیں اور اس علم پرور شریف خاندان کی یاد تازہ رکھتی ہے۔ خدا ان سب کو جنت الفردوس عنایت فرمائے۔

۵۔ محمد سرور خان۔ آپ بہت ذہین، قابل اور ہمدرد قوم انسان تھے۔ ۱۹۲۱،۲۲ء میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بنے اور انہی ایام میں ہری پور میں تعینات ہوئے۔ ملازمت میں جی نہیں لگا، چھوڑ کر سیاست میں داخل ہوئے۔ ۱۹۳۶ء کے انتخاب میں سرحد اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ آپ نے اسمبلی میں اپنی ڈیموکریٹک پارٹی بنائی۔ آپ اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر بن گئے۔ چونکہ نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان نے اپنی وزارت میں کوئی ممبر ہزارہ سے نہ لیا۔ لہٰذا آپ کی پارٹی نے حزب اختلاف (کانگرس پارٹی) سے مل کر وزارت کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ پاس کر دیا اور سر صاحبزادہ مرحوم کو استعفا دینا پڑا۔

۶۔ تاج محمد خان۔ حُبِ قومی و وطنی سے سرشار ہیں۔ تیس چالیس سال سے ایک جانباز کی طرح سیاسی حالات پر اپنے ہفتہ وار اخبار "نوجوان سرحد" (جس کے وہ خود مدیر تھے) میں تبصرہ و تنقید کرتے رہتے تھے اور حق کی بات یہ ہے کہ ان کا وجود قوم و وطن کے لئے اس قحط الرجال میں بہت غنیمت تھا۔ آپ کی وفات ۱۹۷۲ء میں ہوئی۔

ان کے ایک صاحبزادہ مسٹر رضا علی، نامور باپ کے نامور بیٹے ہیں اور سائنس کی تعلیم میں بہت اونچی ڈگریاں حاصل کی ہیں اور امید ہے کہ وہ دنیا میں ایک نامور سائنسدان بنیں گے۔ نوجوانی میں پختہ کار انسان ہیں۔ وہ آجکل امریکہ میں ریسرچ (تحقیق) سکالر (عالم) ہیں۔

زمانہ حال کے نامور اشخاص

۱۔ محمد احسن خان: برادر تاج محمد خاں ایک شریف ہمدرد قوم و وطن انسان ہیں۔ پہلے کواپریٹو سوسائٹی میں انسپکٹر تھے۔ بعد میں گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سرحد کے مینجر رہے۔ آجکل پشاور میں مقیم ہیں۔

۲۔ آخر میں تارخیلی قوم کے ہونہار، قابل اور شریف انسان کا نام تحریر کرتا ہوں، جس نے اپنی جوانامرگی میں خاندان، قوم اور ہزارہ کو سوگوار کر دیا۔ یہ کیپٹن اسد خان پسر محمد سرور خان طاہر خیلی ہیں۔ پہلے فوج میں تھے۔ امتحان مقابلہ میں سول سروس کے لئے منتخب کیے گئے۔ اعلیٰ عہدوں پر

رہے۔ آخر کار پولیٹیکل ایجنٹ گلگت تھے کہ ۱۹۶۸ء کے آغاز میں راولپنڈی سے بذریعہ ہوائی جہاز گلگت جا رہے تھے کہ جہاز کاغان کے سربفلک پہاڑوں سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا اور وہ اس حادثہ میں جاں بحق ہو گئے۔ ؎

پھول تو دو دن بہارِ جاں فزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

تربیلہ ڈیم (سدّ تربیلہ)

علاقہ اتمان زئی اور تنول کے علاقہ میں تربیلہ ڈیم کی تعمیر سے ان قوموں کے بیشتر مقامات تاریخی وزرعی زیرِ آب آگئے۔

اس کے متعلق چند حقائق، ماخوذ از تربیلہ ڈیم سپلیمنٹ "پاکستان ٹائمز" لاہور کی اشاعت ۴، نومبر ۱۹۷۰ء درج ذیل ہیں۔

ضرورت تعمیر

۱۔ تقسیم برصغیر پاک و ہند سے ستلج، بیاس، راوی، تینوں دریاؤں کا پانی جس پر پنجاب (حصہ پاکستان) کی زرعی معیشت کا دارومدار ہے، ہندوستان کے حصہ میں آگیا۔ بعد میں دونوں ممالک کے باہمی سمجھوتہ سے منگلا اور تربیلہ ڈیم، پانی کی اس کمی کو پورا کرنے کے لئے بنانے کا فیصلہ ہوا۔ منگلا ڈیم تو بہت پہلے تیار ہو چکا ہے اور تربیلہ ڈیم ۱۹۷۴ء میں تیار ہو گیا۔ لیکن کچھ فنی خرابی کے باعث، اب یہ ڈیم ۱۹۷۷ء کے وسط تک کام کرنا شروع کر دیگا۔

۲۔ یہ کثیر المقاصد بند ہے۔ پانی کی فراوانی اور بجلی کی پیداوار میں ایزادی کا باعث ہوگا۔ اس سے دریائے سندھ کی طغیانی پر بھی قابو پایا جا سکے گا۔ تکمیل کے بعد یہاں ایک قابل قدر سیرگاہ بن جائے گی جو ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کے لئے کشش کا باعث ہوگی۔ اس بند کی جھیل سے مچھلیوں کی افزائش میں ترقی ہو گی۔

۳۔ اس ڈیم کی تعمیر سے زیرِ آب آنے والی اراضی ۸۰ ہزار ایکڑ کے قریب ہو گی جس کا معاوضہ فراخدلانہ طریقہ پر مالکان کو دیا گیا۔ جن مالکان نے نقدی کی صورت میں قبول کیا، ان کو نقد اور جنہوں نے اراضی کا مطالبہ کیا، ان کو جھنگ، لائل پور، سرگودھا، ملتان اور صوبہ سندھ کے نہری حصہ میں

آباد کیا گیا۔ نیز تربیلہ ڈیم کے مواضعات زیر آب کے لوگوں کے لئے مختلف آبادیاں، کھلابٹ تربیلہ کے نام پر آباد کی گئیں۔ ان میں ہر سہولت، ہسپتال، بازار وغیرہ موجود ہیں۔ حکومت ان افراد کے لئے کارخانے بھی لگانے کا انتظام کر رہی ہے۔

اس بند کی تعمیر سے قوم اتمان زئی کے گاؤں تربیلہ، کھلابٹ، داڑھی اور درگڑھی قوم سادات کے صوابی میرا، قوم تنولی کے انب، دربند اور مضافات زیر آب آگئے ہیں۔ ضلع مردان کے چند گاؤں بھی اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ مجاہدین سادات کا گاؤں، ستھانہ بھی زیر آب آگیا ہے۔ اس سے ہزارہ کی تحریک آزادی کی داستانیں وابستہ تھیں۔

بریگیڈیر معین الدین نے اسلام آباد میں اپنی پریس کانفرنس منعقدہ ۳ دسمبر ۱۹۷۵ء میں ایک بیان دیا جو "نوائے وقت" ۴ دسمبر ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔

انہوں نے بتایا کہ تربیلہ جھیل ایک سو مربع میل ہوگی۔ اس سے ۱۲۰ دیہات، رقبہ ۸۵ ہزار ایکڑ متاثر ہوگا اور تقریباً ۹۶ ہزار افراد کو گھر بار چھوڑ کر جانا پڑے گا۔ متاثرین کو ادا کیا جانے والا کل معاوضہ ۶۵ کروڑ ۳۲ لاکھ تک ہوگا۔

چند مزید تفصیلات۔ اقتباس از مضمون مسٹر شجاعت علی روزنامہ "نوائے وقت" راولپنڈی ۶ مارچ ۱۹۷۸ء۔

تربیلہ بند آغاز تعمیر و تکمیل کے مراحل کی داستان۔ یہ منصوبہ ضلع ہزارہ کے تحصیل ہری پور کے مقام تربیلہ پر بنایا گیا ہے اور سندھ طاس معاہدہ بھارت و پاکستان کے درمیان، کا حصہ ہے۔ ۱۴ مئی ۱۹۶۸ء میں تربیلہ ڈیم کے منصوبہ کے سول تعمیراتی کاموں کا ٹھیکہ تربیلہ جائنٹ وینچر کو ملا۔ آخر کار اس میں کل ۱۹ فرموں نے حصہ لیا۔ تین فرانسیسی، تین اطالوی فرموں نے بنیادی طور پر کام شروع کیا اور بعد میں دوسری فرمیں بھی شامل ہوتی گئیں۔

بجلی گھر: بارہ یونٹ کا ہوگا۔ بجلی کی کل پیداوار دو لاکھ، دس ہزار کلو واٹ ہوگی۔

جھیل: اس جھیل میں ۱۱۱ لاکھ ایکڑ فٹ پانی سطح سمندر سے ۱۵۵۰ فٹ بلندی تک پانی ذخیرہ کرنے کی گنجائش ہوگی۔ اس جھیل کا رقبہ ۱۰۰ مربع میل ہے۔

متاثرین: ۹۵ ہزار آدمیوں کو اس علاقہ سے نکال کر متبادل جگہوں پر آباد کیا گیا ہے۔ ان کی

رہائش کے لئے پانچ کالونیاں ہری پور تحصیل میں، نزد تربیلہ جھیل، آباد کی گئی ہیں۔

سواتی

اس قبیلہ[1] نے سلطان محمد غوری کے عہد میں ان کے حکم سے سوات اور باجوڑ کی راہ لی اور وہاں سے قدیم باشندوں کو، جو کافر تھے، نکال کر قابض ہوئے اور قریب چار سو سال تک قابض رہے۔ ان میں سے ایک بزرگ شاہ میر بابا نے بٹ خیلہ سے جا کر کشمیر پر قبضہ کر کے (۱۳۱۵ء) میں اپنی حکومت قائم کر لی اور شاہ میر شمس الدین[2] کے نام سے تخت نشین ہوئے۔ کشمیر میں اسلام ان کی بدولت پھیلا شاہ میر کے والد کا نام شاہ دین تھا۔

کیمبرج ہسٹری کے مطابق انہوں نے برل اصولوں پر حکومت قائم کی۔ بے جا سرکاری لگان اور غیر منصفانہ ٹیکس ہٹا دیئے۔

تاریخ فرشتہ میں درج ہے کہ شاہ میر ۷۱۵ھ (۱۳۱۵ء)، بکشمیر، ۷۴۸ھ (۱۳۴۷ء) تک حکومت کی۔

اس کے بعد اس کے بیٹے نے اپنے باپ کے طریقہ پر عادلانہ نظام حکومت قائم رکھا۔ کتاب "راج ترنگینی" کے مطابق سلاطین شاہ میری نے کشمیر پر تقریباً دو سو سال تک کامیاب حکومت کی۔ اس خاندان کا معروف ترین سلطان زین العابدین مشہور بہ بڈشاہ تھا۔

یہ سلطان بڑا عالم، ادیب اور شاعر تھا۔ عربی، فارسی، کشمیری، سنسکرت اور تبتی زبانوں میں کامل مہارت رکھتا تھا۔

الغرض سواتی پٹھانوں نے الغ بیگ اور بابر سے انکار کرتے ہوئے مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اگرچہ شکست کھائی، تاہم برسوں تک اس علاقہ (سوات)، پر قابض رہے۔ یوسف زیوں کی آمد پر ان سے مقابلہ کی تاب نہ لاتے ہوئے ہزارہ کا رخ کیا اور وہاں سواتی پٹھان پکارے جانے لگے۔ ہزارہ میں جس علاقہ پر انہوں نے قبضہ کیا اسے سلطان پکھل کے نام پر پکھلی کا نام دیا گیا۔ پھر اٹھارھویں صدی

---

[1] بحوالہ حواشی تواریخ حافظ رحمت خانی صفحہ ۲۶۹،۲۶۷ [2] بحوالہ "آب کوثر" مؤلفہ محمد اکرم۔

میں سید جلال بابا کی قیادت میں اس قبیلہ نے ہزارہ کے شمالی علاقوں سے ترکوں کو نکال کر تمام پہاڑی اور میدانی علاقہ پر قبضہ کر لیا۔

یہ قبیلہ کئی شاخوں مثلاً گبری، امامی، عالی، متراوی اور دووان (دوویال) پر منقسم ہے۔

تاریخ حافظ رحمت خانی میں متراوی قبیلہ کو یوسف زئی لکھا ہے۔ گبری، افغانستان کی سرحد ٹوچی کے قریب دریائے گبر کے ساتھ سکونت کی وجہ سے گبری مشہور ہوئے۔ بعد میں وہاں سے چلے آئے۔ سوات میں رہائش کی وجہ سے سواتی مشہور ہوئے۔

یہ قوم ملک سوات سے یہاں آئی، لہٰذا سواتی کہلائی۔ آبادی کے لحاظ سے ہزارہ کی بہت بڑی قوم ہے اور پوری دو تحصیلوں مانسہرہ اور بٹگرام میں آباد ہے۔ ہزارہ میں ان کی آمد غالباً ۱۵۰۵ء ہے۔

زمانہ قدیم میں ان کی وسیع سلطنت مشتمل بر باجوڑ، سوات، بنیر، مالاکنڈ، ہشت نگر تک رہی۔

یہ قوم بہت سے قبیلوں میں منقسم ہے۔ سیاسی شعور کے لحاظ سے ہزارہ میں صفِ اول میں ہے یہ قوم تحریک آزادی کی سرخیل رہی ہے۔ اس قوم میں دینی و دنیوی علم کے لحاظ سے اعلیٰ پایہ کے اصحاب پیدا ہوئے، جنہوں نے دین و سیاست کے میدان میں برتری حاصل کی۔ اس قوم کی اکثریت اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اور اعلیٰ مناصب پر فائز ہے۔ اس قوم کے افراد مشرقِ بعید کے ممالک تک پہنچے اور اپنا مقام پیدا کیا۔

ملک سوات کی وجہ تسمیہ

۱۔ فتوح البلدان کے مطابق عربوں نے جہاں شہروں، نخلستانوں اور درختوں کی کثرت دیکھی تو کہا ہم نے اس سے زیادہ سواد (بہ معنی سرسبز) نہیں دیکھا۔

(ii) ماوردی کے احکام سلطانیہ کے مطابق وادی دجلہ و فرات کی سرزمین کو سواد (سیاہ یا سبز) اس کے باغوں اور کھیتوں کی سرسبزی کی وجہ سے کہتے ہیں۔ چونکہ جزیرۃ العرب خشک علاقہ ہے۔ جس میں زراعت اور باغات کا نام نہیں۔ لہٰذا جب عرب اپنے گھروں سے باہر نکلے تو کھیتوں اور باغوں کی سرسبزی و شادابی نظر آئی تو اس کو سواد کہا (سبزی اور سیاہی کو یہ لوگ ایک ہی نام سے موسوم کرتے تھے)، ملک عراق (دجلہ و فرات کے درمیان کا سرسبز و شاداب علاقہ) جب فتح ہوا تو اس کی سرسبزی کو سواد سے تعبیر کیا۔"

وادی سوات بھی ایک سرسبز اور شاداب وادی ہے۔ لہٰذا یہ بات اغلب ہے کہ مسلمانوں ہی نے اس کا نام سواد رکھا ہوگا، جو کثرت استعمال سے سوات (صوات) ہوگیا۔

یہ دونوں حوالے محمد یوسف الدین کی کتاب "اسلام کے معاشی نظریئے" سے لئے گئے ہیں۔ آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ "مسلمانوں کے عہد میں اس وادی کا یہ نام میری نظر سے نہیں گزرا۔"

(۱۱۱) اللہ بخش یوسفی صاحب مرحوم نے اپنی کتاب "تاریخ یوسف زئی پٹھان" میں سوات کی وجہ تسمیہ میں لکھا ہے کہ قدیم کتب میں سوات کا ذکر "اوڈیانہ" کے نام سے دکھائی دیتا ہے جو سنسکرت کا لفظ ہے۔ معنی ہیں "باغ، گلستان یا پارک نما جگہ"۔

سکندر اعظم کے مؤرخین نے دریائے سوات کے صاف، شفاف پانی کی وجہ سے اس علاقہ کا نام "سویتا" بہ معنی سفید رکھا۔ ہیون سانگ نے بھی سفید پانی کا ذکر کیا ہے اور گیارھویں صدی میں "البیرونی" بھی شفاف پانی کا ذکر کرتا ہے۔ بعد میں جیسے بابر کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے اس علاقے کا نام سواد تھا، جو بعد میں سوات ہوگیا۔

سوات کی قدیم تاریخ

آج جو قدرتی حسن و شادابی سوات کو سیاحوں کے لئے جنت ارضی بنائے ہوئے ہے، وہ زمانہ قدیم میں بھی تھی۔ اس لئے اس خطہ کا نام "اوڈیانہ" یعنی باغ رکھا گیا۔ ۳۲۷ ق م میں سکندر اعظم اپنے لاؤ لشکر سمیت، اس علاقے سے ہو کر گزرا۔ ۳۲۴ ق م سے لے کر ۱۸۵ ق م تک یہ علاقہ موریہ خاندان کے زیر اثر رہا۔ پہلی صدی قبل مسیح کے آخری ربع میں کشن خاندان کے بادشاہوں نے یہاں حکومت قائم کی جو تیسری صدی عیسوی تک رہی۔ ۴۰۰ء میں چینی سیاح فاہین اور ۶۲۷ء میں ہیون سانگ نامی دو مشہور چینی سیاحوں نے جب سوات کی سیاحت کی تو انہوں نے اس علاقہ کو بدھ تہذیب کا گہوارہ قرار دیا۔

بدھ تہذیب کے کمزور پڑ جانے پر یہ علاقہ ہندو شاہیہ کے زیر اثر رہا۔ دسویں صدی عیسوی کے اختتام پر سلطان محمود غزنوی نے اس علاقہ پر حملہ کر کے ہندو شاہیہ کا خاتمہ کر دیا۔ بارھویں صدی عیسوی میں علاؤالدین یہاں حکمران رہا۔ اس کے بعد جہانگیری یہاں آباد ہوئے، جو نسلاً پٹھان تھے۔ مگر پٹھانوں کے ایک دوسرے بااثر قبیلہ یوسف زئی نے جہانگیریوں کو ضلع ہزارہ کی طرف دھکیل کر سوات کی وادی پر قبضہ جما لیا، جو آج تک قائم ہے۔ ۱۵۱۵ء تک یوسف زئی پورے

سوات پر قابض ہو چکے تھے۔ یہ لوگ ایک مضبوط سیاسی وحدت رکھتے تھے، جس کی وجہ سے بیرونی حملہ آوروں کے لئے یہاں قبضہ جمانا آسان کام نہ تھا۔ بابر اور اکبر بھی اس قوم کو مطیع نہ کر سکے۔

سواتی قوم کا حسب ونسب سواتی قبیلہ کی ابتداء اور ان کا نسبی تعلق، مورخین کی نظر میں باعثِ اختلاف رہا ہے۔ لیکن قدیم شجروں سے ان کا تعلق قیس عبدالرشید سے ملتا ہے۔

تاریخ کی رو سے اس قبیلہ نے بہ عہد سلطان محمد غوری سوات اور باجوڑ کی راہ لی۔ جہاں انہوں نے اپنے قوت بازو سے وہاں کے قدیم باشندوں کو، جو ہندو تھے، مطیع کر لیا یا مار بھگایا اور علاقہ پر اپنی حکومت قائم کر لی تھی اور تاریخ میں اس وقت تک مشہور حکمرانوں کے نام مثلاً سلطان اویس، سلطان بہرام، سلطان پکھل اور سلطان جہانگیر (جنہیں جہانگیری سلطان بھی کہتے ہیں)، کے نام ملتے ہیں۔ یہی وہ قبیلہ ہے، جس نے اُلغ بیگ اور بابر کی اطاعت سے انکار کرتے ہوئے مردانہ وار مقابلہ کیا تھا۔ گو شکست کھائی لیکن پھر بھی باجوڑ اور کافرستان کے ایک حصہ پر اس نے برسوں حکومت قائم رکھی۔ سوات سے اس قوم کو یوسف زیوں نے شکست دے کر نکالا تھا۔ لیکن یہ باجوڑ اور کافرستان پر مدت تک قابض رہے۔

آخر میں باجوڑ اور کافرستان سے بھی جب یوسف زیوں نے ان کو شکست دے دی تو انہوں نے اس ملک کو خیرباد کہہ کر، یوسف زیوں اور کشمیر کے درمیانی (علاقہ ہزارہ) میں ڈیرے جما دیئے۔ ہزارہ میں وہ سواتی پکارے گئے اور غالباً اپنی حیثیت قائم رکھنے کے لئے بھی انہوں نے سواتی کے نام سے اپنی جداگانہ ہستی قائم رکھنا ضروری خیال کیا۔ یہ اصلاً پٹھان تھے۔ سواتی نام نسبی نہ تھا، بلکہ وطن سوات کی طرف منسوب تھا، جہاں سے یہ آئے تھے۔

تاریخ حافظ رحمت خانی کے مطابق مورخین انساب مسّراوی (سواتیوں میں اصالت و شجاعت کے لحاظ سے نامور قبیلہ) دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ لوگ نسلاً یوسف زئی ہیں اور سوات میں ان کا نشگی اور گاڑھانز (قندھار سے آنا زمانہ قدیم میں ہوا ہے۔ جو کسی خاص حادثے کے سبب اپنے قبیلہ یوسف زئی سے جدا ہو کر سوات میں آباد ہو گئے اور سوات میں ان کا علیحدہ علاقہ

تھا۔ان کا حکمران ملک حسن تھا اور مرکزی مقام بلوگرام کی پہاڑی پر واقع تھا اور اب جو کھنڈرات دکھائی دے رہے ہیں، وہ اسی مرکزی عمارت کے نشانات ہیں۔

علاقہ سوات سے نکل کر ان لوگوں نے ہزارہ میں جس علاقہ پر قبضہ کیا، اسے اپنے ایک سابق حکمران سلطان پکھل کے نام پر پکھلی کا نام دیا۔ پھر اٹھارھویں صدی میں سید جلال بابا کی قیادت میں اس قبیلہ نے ہزارہ کے شمالی علاقہ سے ترکوں کو نکال کر تمام پہاڑی علاقہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ قبیلہ دو بڑی ذیلی شاخوں میں منقسم ہے۔

۱۔ گبری۔ جن کی آبادیاں کاغان، بالاکوٹ، گڑھی حبیب اللہ، مانسہرہ، شنکیاری، بھوگڑمنگ سندھیاڑ اور تھاکوٹ میں آباد ہیں۔

۲۔ مامی عالی متراوی۔ بھیر کنڈ۔ اگرور، ٹکری اور دیشی میں آباد ہیں۔

ہزارہ میں آمد

تاریخ ہزارہ مرتبہ ویس (بندوبست ۲۷-۱۸۷۰ء) کے مطابق سواتیوں کی آمد ترکوں کے عہد میں ہوئی۔ اس وقت اس ملک میں حکومت ترکوں کی تھی۔ ان ترکوں کا ایک حاکم دھمتوڑ میں اور اس کا بھائی شاہ محمود گلی باغ میں حاکم تھا۔ شاہ محمود کے دو لڑکے مرید خان اور عامل خان تھے۔ اس شاہ محمود کا داماد سید جلال بابا ترمذی تھا، جو کہ ساداتِ کاغان کا مورثِ اعلیٰ ہے۔ شاہ محمود نے اس کو دامادی کے جہیز میں علاقہ بھوگڑمنگ (وجہ تسمیہ بھی جہیز کے لئے ملکی لفظ بھوچھنڑ ہے) دیا تھا۔ سید جلال بابا کے پاس گڑھی والے خان خیل خاندان کا ایک بزرگ مسمی بھائی خان مختار و معتبر تھا۔ کسی نارضامندی کی بناء پر سید جلال بابا سوات واپس چلا گیا اور مطابق بیان سادات کاغان چار ہزار روپیہ خرچ کر کے مختلف قبائل سوات کا ایک بہت بڑا لشکر ساتھ لایا اور ترکوں کا ملک ۱۷۰۳ء میں فتح کر کے اپنے قبضہ میں کر لیا۔

دوست محمد خان کامل مصنف اور خوشحال خان خٹک نے اس واقعہ کے ذکر میں لکھا ہے کہ یوسف زیوں کے خان بہاگو خان جس کے عہد میں ۱۶۶۶-۶۷ء میں مغلوں سے بغاوت ہوئی تھی، اس کی مدد سے ہی سید جلال بابا نے ۵ ہزار کا لشکر لے کر دریائے سندھ کو عبور کیا اور قلعہ چھاچھل (چنجل)، واقعہ پکھلی (ہزارہ)، کے مرزبان بنام شادمان (یا شادم خان)، سے ملک بزور شمشیر لے لیا۔

تاریخ ہزارہ سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ فتح کے بعد سید جلال بابا کے اکثر ہمراہی واپس چلے گئے، مگر جن کا کوئی ورثہ سوات میں نہ تھا اور متفرق قبیلوں کے آدمی تھے، وہ پکھلی میں رہ گئے۔ چند سال سید جلال نے ملک کو اپنے قبضہ میں رکھا اور شاہ زمان فرزند سید جلال اس ملک کو اپنے نانا محمود شاہ کا ملک تصور کرتا تھا۔ گو کہ سید جلال لوگوں کو اس وعدہ پر لایا تھا کہ ان کے درمیان ملک تقسیم کر دے گا۔

جب شاہ زمان پسر سید جلال مر گیا تو سید جلال نے درہ بھوگڑمنگ (جو پہلے سے اس کے قبضہ میں بطور جہیز دامادی تھا) کے علاوہ باقی ملک سے چہارم خود لے لیا اور بقیہ تین حصہ لشکر پر تقسیم کر دیا۔ پکھلی میں سرداری اور خانی، بھائی خان گڑھی حبیب اللہ کے گھر اور سید جلال کی اولاد میں رہی اور اگرور میں عنایت اللہ خان (عطا محمد خان کا دادا) خان رہا۔

قوم سواتی میں مشہور اور موٹی تقسیم کو نمکئی کہتے ہیں۔ ہر گروہ میں بحصہ رسدی تقسیم کر دی گئی۔ سواتی کی بڑی شاخیں یہ ہیں۔

۱۔خان خیل۔ ۲۔بھر خیل۔ ۳۔دودال۔ ۴۔پیچخول۔ ۵۔پنج میرال۔ ۶۔جہانگیری۔ ۷۔ ارغشال۔ ۸۔ملکال۔ ۹۔ازنالے۔ ۱۰۔ مندراوے۔ ۱۱۔علی شیر۔ ۱۲۔بیگال۔ ۱۳۔شرورہ۔ ۱۴۔رباتی۔ ۱۵۔پنج کوڑہ۔ ۱۶۔شلمانی۔

تاریخ ہزارہ فارسی (قلمی مورخہ ۵۰-۱۸۴۹ء، مولفہ مہتاب سنگھ جو سردار ہری سنگھ کے دفتر کا سربراہ رہا۔) میں لکھا ہے:

> "چونکہ ریاست پکھلی، مشترکہ طور پر سب قوم سواتی کی ملکیت ہے۔ یہ افغان قوم سوات سے آکر ملک پکھلی پر قابض ہو گئے۔ انہوں نے جب ملک پکھلی کی تسخیر کا ارادہ کیا تو قوم سے کہا کہ جو کوئی اس وقت حملہ میں شامل ہو گا، وہ برابر کا حصہ دار ہو گا، لہذا سب قوم سواتی نے متفق ہو کر ملک پکھلی پر قبضہ کر لیا اور حسب وعدہ ہر ایک کو برابر کا حصہ ملا۔ چنانچہ ہر پتہ کو حصہ (نمکئی) ملا۔ اس کی بناء پر ہر ایک کو برابر کا حصہ ملا۔ مگر کچھ مدت کے بعد سعادت خان کے بخت و قسمت نے یاوری کی اور وہ صاحب عزت بن گیا۔ قوم نے اس کو دربار شاہی میں جانے اور امراء، وزراء

سے ملاقات کرنے کے لئے منتخب کیا اور طے پایا کہ اس کا فیصلہ قوم کو منظور ہو گا۔

خان موصوف نے اپنی رہائش کے لئے موضع گڑھی موسوم بہ گڑھی سعادت خان (جو بعد میں اس کے بیٹے حبیب اللہ خان کے نام پر گڑھی حبیب اللہ مشہور ہوئی)، آباد کی اور اس کو نمکئی (حصہ خود) سے زیادہ چری بطور دستار دی گئی ؛؛

جب کبھی درانی حاکم کشمیر کو جاتا تو خان موصوف اس کی ہمرکابی کے لئے ایک دو منزل اس کے استقبال کے لئے حاضر ہوتا اور کشمیر تک پہنچاتا۔ جب کشمیر سے کابل کی طرف جاتا تو مظفر آباد پہنچ کر اس کا استقبال کرتا اور اپنے ملک کی حدود سے بہ سلامت گزار کر واپس آتا۔ اس خدمت کے صلے میں اس کو کشمیر سے بھی کچھ جاگیر ملتی۔ حاکم کشمیر کی آمد و رفت پر ملک پکھلی کا مقرر شدہ مالیہ بھی اس حاکم کی خدمت میں پیش کرتا۔

جب کبھی تنول کا رئیس یا افغانانِ جدون جھگڑا فساد برپا کرتے تو سب قوم خانِ موصوف کی سرکردگی میں مقابلہ کرتے۔

خانِ موصوف کی وفات کے بعد اس کے دو بیٹے نجیب اللہ خان اور حبیب اللہ خان قائم مقام رہ گئے۔ حبیب اللہ خان، چھوٹے بھائی نے دستارِ خانی نجیب اللہ خان کے سر پر باندھی۔ نجیب اللہ خان نے بھی اپنے باپ کے دستور کے مطابق بھائیوں سے اتفاق و مراعات رکھ کر وقت گزارا۔ نجیب اللہ خان ۱۸۲۱ء میں سکھوں کے ساتھ جنگ مانگل میں مارا گیا۔ تب اس کا بیٹا ہیبت خان صاحبِ دستار ہوا اور خانی کا انتظام حبیب اللہ خان کے سپرد تھا۔ ہیبت خان کی وفات کے بعد اس کا چچا حبیب اللہ خان اگڑھی کا خان مقرر ہوا۔ حبیب اللہ خان مظفر آباد کی جنگ جو برائے امداد قوم بمبہ بوجہ رشتہ داری کے گیا تھا، میں مارا گیا[۱]۔ اس کے بعد امین خان والدِ سمندر خان صاحبِ دستار اور خان ہوا۔ امین خان نے ۱۸۶۸ء میں وفات پائی اور سمندر خان، خان ہوا۔

تاریخ خاندان خان خیل (خانانِ گڑھی)

یہاں پر ایک قلمی فارسی تاریخ "تاریخ القریش"، جس کی نقل مجھے محمد خواص خان صاحب

نمبر۱ حبیب اللہ خان ۱۸۴۴ء میں زندہ تھا، لہٰذا یہ جنگ بعد میں ہوئی۔

ہیڈراں نے ارسال کی تھی، سے اقتباس درج کئے جاتے ہیں، جس سے خان خیل خاندان اور ترک سلاطین پکھلی کے آخری دور کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ قلمی فارسی تاریخ خان محمد ایوب خاں ساکن ماڑہی کے پاس ہے۔

اجداد

یہ محمد بن ابوبکر صدیق رضؓ کی اولاد سے ہیں، جو مدینہ، شام، بغداد، دمشق، کوفہ، گیلاں کے حکمران تھے۔

ہزارہ میں آمد

گردشِ ایام سے جلاوطنی اختیار کر کے آخر کار پکھلی میں آ کر اس ملک کے مالک ہو گئے۔

ہجرت کی تفصیل

مراد بن عبدالرحمان خان المعروف بہ بھائی خان جو عبدالنبی خان کا داماد تھا اپنے سسرال کے خاندان کے ساتھ، پکھلی میں وارد ہوا۔ ان ایام میں ملک پکھلی پر شاہ سلطان محمود (خورد) ترک کی حکومت تھی، جو ترک سلاطین پکھلی کا آخری فرمانروا تھا اور جس نے سید جلال بابا کو اپنی دامادی میں لیا تھا۔

عبدالنبی خان گلی باغ میں

عبدالنبی خان، اپنی خاندانی وجاہت کی وجہ سے شاہ محمود کا منظورِ نظر ہو گیا۔ ان ایام میں عبدالرحمٰن خان (والد مراد خان عرف بھائی خان)، وطن سے ہجرت کر کے اور مختلف منزلیں طے کرنے کے بعد ملک بنیر (سوات بنیر)، پہنچ گیا۔ وہاں پر عبدالرحمٰن خان کی سید جلال بابا (جو پیر بابا سید علی ترمذی کی چوتھی پشت میں تھا)، سے شناسائی ہو گئی۔ دونوں پارسا طبیعت کے تھے اور یکجائی سے ان میں سلسلہ محبت زیادہ مضبوط ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد دونوں کشمیر کے لئے روانہ ہوئے۔ راستہ میں ریاست پکھلی (جس پر ترکوں کی حکومت تھی)، کے دار الخلافہ گلی باغ پہنچے۔ اس زمانہ میں گلی باغ کا شہر ہندوستان کے شہروں کی طرح بہت آباد تھا۔ جگہ جگہ پختہ عمارتیں تھیں۔ بازار سجے سجائے، باغ واشجار رنگا رنگ کے موجود تھے۔ گلی باغ واقعی اسم بامسمٰی تھا۔ لہٰذا وہ دونوں یہاں ٹھہر گئے۔

عبدالنبی خان کا لڑکا، مراد خان المعروف بھائی خان پہلے سے وہاں موجود تھا۔ اس کی وساطت سے عبدالنبی کی ملاقات شاہ محمود سے ہو گئی۔ شاہ محمود کے لطف و کرم سے عبدالنبی خان یہاں ہی ٹھہر گیا۔

سید جلال بابا کی شادی اور بھوگڑمنگ میں رہائش

اس کے بعد عبدالنبی خان کی وساطت سے سلطان محمود نے سید جلال بابا کو، اس کی خاندانی فضیلت کے باعث اپنی دامادی میں لے لیا۔ بہت سے ساز و سامان اور بھوگڑمنگ کا علاقہ جہیز کے طور پر سید جلال بابا کو دے دیا کہ وہ اس علاقہ کو آباد کر کے وہاں سکونت اختیار کرلے۔

شاہ محمود کی سید جلال بابا کو قتل کرانے کی کوشش

جب سید جلال بابا بھوگڑمنگ میں اقامت گزیں ہوگیا تو ریاست پکھلی کے تمام لوگ ان کے مرید اور عقیدت مند ہوگئے۔ تو ان کے رسوخ کی زیادتی شاہ محمود کو ناگوار گزری، لہٰذا سلطان محمود نے سید جلال بابا کو قتل کرنے کے لئے چند آدمی بھیجے۔ چنانچہ ایک شخص نے علاقہ بھوگڑمنگ میں بہ مقام ٹوک ان پر گولی کا فائر کردیا۔ چونکہ جلال بابا کی زندگی باقی تھی، چہرہ زخمی ہوگیا، لیکن ہلاک ہونے سے بچ گیا۔ اس واقعہ کے بعد اپنی زندگی خطرہ میں جان کر وہ اپنے رفیق عبدالرحمٰن خان کی معیت میں بنیر کو واپس چلاگیا۔

اس پر اہالیانِ سوات اور بنیر جو جلال بابا کے جد پیر بابا کی عظمت و بزرگی کا اعتقاد رکھتے تھے، وہ سب ان کی حمایت میں سلطان محمود کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

چنانچہ ایک لشکر کثیر، بڑے اہتمام اور خرچ کے ساتھ بہ سرداری مراد خان بن عبدالرحمٰن خان (المعروف بھائی خان)، بارہ ہزار مسلمان اور جنگجو پٹھانوں کے لشکر نے پکھلی پر چڑھائی کردی۔ یہی لشکر تھا، جو اب پکھلی میں صواتی قوم کے نام سے موسوم ہے۔

یہ لشکر سب سے پہلے قلعہ چھاچھل نزد تھاکوٹ جہاں ترک حکومت کے سرحدی سردار و جرنیل موجود تھے، حملہ کردیا۔ بہت سخت جنگ ہوئی لیکن قلعہ فتح نہ ہوسکا۔ بہت لمبے محاصرے کے بعد جب قلعہ فتح ہوگیا تو یہ صواتی فوج پکھلی کی جانب بڑھی۔ دریائے سرن کے اوپر کوہ ٹنگلائی پر پہنچی تو اس جنگل میں صنوبر کے درختوں سے بہت سے بڑے بڑے عصا اور ایک ایک گز لمبے چپل گھاس سے بنا کر دریائے سرن میں بہانے شروع کردیئے۔ جب یہ اشیاء بہہ کر نیچے آنا شروع ہوئیں تو ترک ان بڑے عصاؤں اور چپلوں کو دیکھ کر ڈر گئے کہ اس قد و قامت کے لوگوں کے ساتھ مقابلہ بہت مشکل ہے۔

ان ایام میں شاہ محمود[1]، دہلی میں شہنشاہ جہانگیر کے حضور حاضر تھا۔ ملک خالی تھا اور بغیر کسی جنگ کے حملہ آوروں کے قبضہ میں آگیا۔

مرادخان کا عہدِ حکومت پکھلی کے فتح ہو جانے کے بعد مراد خان حاکم ہوا۔ جس نے بڑی قابلیت سے حکومت کی۔ ان کے بعد ان کا بڑا بیٹا محمد سعید خان حاکم ہوا۔ یہ نادر شاہ (۱۷۳۶-۴۷ء) کے ہمعصر تھا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سعادت خان صاحب اقبال ہوا۔

سواتیوں کے مشہور خاندان

۱۔ خاندانِ اگرور یہ اخون رحیم بابا کی اولاد سے ہیں۔ اخون سعدالدین خان اس علاقہ کے پہلے خان ہوئے۔ جن کی وفات ۱۷۸۳ء میں ہوئی۔ اس علاقہ میں سواتی قوم کا پتہ بیگال آباد ہے۔ اخون سعدالدین خان کی پہلی بیوی صوبہ خان، خان تنول کی ہمشیرہ تھی۔ اس کے بطن سے عنایت اللہ خان پیدا ہوا، جو ۱۷۸۳ء سے ۱۸۱۸ء تک خان رہا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا غفور خان ۱۸۳۵ء تک خان رہا۔ غفور خان کا بیٹا عطا محمد خان ۱۸۳۵ء سے ۱۸۶۸ء تک خان رہا۔ اس کے عہد میں یاغستانی اقوام حسن زئی، چغرزئی، آمازئی اور دیشی نے اوگی کے تھانہ انگریزی (یہ تھانہ یکم نومبر ۱۸۶۷ء میں قائم کیا گیا تھا، جس سے خان اگرور پر کنٹرول کرنا مقصود تھا) پر بہ ایماء خان اگرور ڈاکہ ڈالا۔ اس پر عطا محمد خان کی جاگیر سرکار انگریزی نے ضبط کر لی اور اس کو ۱۷ اگست ۱۸۶۸ء میں راولپنڈی اور پھر لاہور بھیج دیا گیا۔

اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا علی گوہر خان (ولادت ۱۸۵۰ء) خان ہوا اور اس کو بھی ملک بدر کیا گیا اور ۱۸۷۲ء میں وہ دھرم سالہ میں تھا۔ اس کے چھوٹے بھائی خان پور میں رہتے تھے۔

اگرور کے چند واقعات بقید سن و سال ۱۔ سواتیوں نے یہ علاقہ ۱۷۰۲ء میں قوم ترک قارلق سے (جو چودھویں صدی میں امیر تیمور لنگ کے ساتھ آئے اور اگرور، دھمتوڑ، تناول میں آباد تھے) لیا۔ یہ علاقہ صوبہ کشمیر کا دور دراز کا ضلع

---

[1] یا سرحدی جنگوں میں مصروف تھا ۱۷۱۳ء میں۔

سمجھا جاتا تھا۔ آخر کار بیگال سواتیوں نے زیر حکم اخوند سعدالدین اس ملک اگرور پر قبضہ کرلیا۔

۲۔ اخوند سعدالدین کے جانشینوں کی حسن زیوں اور تناول کے نواب سے جنگ ہوتی رہتی تھی۔ ۱۸۳۵ء میں پائندہ خان، نواب تناول نے غفور خان، خانِ اگرور کو قتل کرادیا۔ سردار ہری سنگھ کے جانشین نے اگرور کا علاقہ غفور خاں کے بیٹے عطا محمد خان کو دلوادیا۔

جب ۱۸۴۹ء میں سرکار انگریزی نے اس ضلع پر قبضہ کیا تو اس وقت عطا محمد خان، اگرور کا خان تھا۔

۲۔ خانانِ گڑھی حبیب اللہ

موضع گڑھی کی بنیاد تیمور شاہ درانی کے عہد میں سعادت خان نے ڈالی اور اس کے بیٹے حبیب اللہ خان کے نام پر مشہور ہوئی۔ مختصر شجرہ نسب یہ ہے۔

سعادت خان

- نجیب اللہ خان
  - ہیبت خان
- حبیب اللہ خان
  - محمد امین خان وفات ۱۸۶۸ء
    - سمندر خان - ولادت ۱۸۴۴ء
      وفات ۲۰ دسمبر ۱۸۸۹ء

یہ سواتی قوم کے بحیثیت مجموعی خاں تھے۔ سعادت خان اپنے وقت میں ایک مشہور شخصیت رہی۔ آزاد خان، حاکم کشمیر اس کا داماد تھا۔ آزاد خان کا والد کریم داد خان احمد شاہ درانی کے وقت حاکم کشمیر تھا اور اس کے امرا میں سے تھا۔

محمد حسین خان پسر سمندر خان عہد انگریزی میں صاحب عزت و اقتدار رہا۔ یہ صاحب اقتدار خاندان سواتی نہیں، بلکہ قریشی ہیں۔ سواتیوں نے اس خاندان کے مورث اعلیٰ محمد سید خان (محمد سعید خان) کو خان مقرر کیا۔

سواتیوں نے جب یہ ملک ترکوں سے لیا تو مندرجہ ذیل چار دیہات جو سرحدات پر تھے، عام ویش (تقسیم) میں نہیں رکھے گئے تھے۔ ان چاروں دیہات کو چار پایہ بھی کہتے ہیں۔ ان کی

حفاظت کا کام سب قوم کے سپرد زیر سرکردگی خان سید خان، اخان خیل ساکن گڑھی حبیب اللہ تھا۔ دیہات حسب ذیل ہیں ۔

۱۔ ابرار کوٹ، جو زیادہ تر حد کشمیر سے ملتا تھا ۔

۲۔ گڑھی حبیب اللہ۔ اس کی حد کشمیر اور ملک بینبہ سے ملتی تھی ۔

۳۔ مانسہرہ سرحد جدون و تنولی پر واقع تھا ۔

۴۔ تھاکوٹ ۔ یاغستان کی اقوام پٹھان کی سرحد پر تھا ۔

محمد سید خان، خود گڑھی حبیب اللہ میں رہا اور اپنے بیٹے سعادت خان کو ساتھ رکھا ۔ باقی تین جگھوں پر اپنے باقی تین بیٹوں کو مقرر کر دیا ۔

اسی خاندان کی ایک شاخ مانسہرہ میں آباد ہے ۔ اس کے مشہور افراد خان بہادر محمد حسین خان اور ان کے دو بیٹے اخان محمد فیروز خان اور محمد عباس خان تھے ۔

خان بہادر محمد حسین خان کی وفات اغلباً ۱۹۳۰ء ہے ۔ آپ سادہ طبیعت کے خان تھے ۔ سرکار انگریزی میں عزت و وقار کے مالک تھے ۔ خان بہادر تھے اور آنریری مجسٹریٹ درجہ اول تھے ۔ ان کے بڑے بیٹے محمد فیروز خان صاحب، ایک فرشتہ خو، خوش شکل اور معزز انسان تھے ۔ تعلیم مڈل تک تھی ۔ محکمہ مال میں تحصیلدار تھے ۔ ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ پنشن پر آئے اور اپنے والد بزرگوار کی جگہ آنریری مجسٹریٹ مقرر ہوئے ۔ ۱۹۴۲ء میں وفات پائی ۔

ان کے چھوٹے بھائی محمد عباس خان ۔ پیدائش اغلباً ۱۸۸۵ء، تعلیم میٹرک تک تھی ۔ سیاست میں حصہ لیا اور بڑے باوقار طور پر کام کیا ۔ ۳۲ - ۱۹۲۱ء کے انتخابات میں مانسہرہ کے حلقہ کے ممبر چنے گئے ۔ ۱۹۳۶ء میں دوسری دفعہ سرحد اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے ۔ ہزارہ ڈیموکریٹک پارٹی کے ممبر ہوئے ۔ سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان کی وزارت ٹوٹ جانے پر کانگرس کی وزارت میں وزیر جنگلات مقرر ہوئے ۔ ۱۹۴۵ء میں پھر کانگرسی وزارت میں وزیر مقرر ہوئے ۔ ۱۹۴۵ء کے آخر میں قائداعظم پشاور آئے تو یہ کانگرس وزارت سے مستعفی ہو کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے ۔ ۱۹۴۶ء کے انتخاب میں کامیاب ہوئے ۔ پاکستان بن جانے کے بعد مسلم لیگ کی وزارت میں شامل کئے گئے ۔ ۱۹۴۸ء میں ایک عذرداری (سیاسی شطرنج) کی بناء پر ممبری سے الگ کر دئے گئے اور پانچ سال کیلئے

نااہل قرار دیئے گئے۔ پھیپھڑوں کے سرطان کے باعث ۱۹۵۱ء میں وفات پائی۔ آپ نے کوئی اولاد نہ چھوڑی۔

خاندانِ بٹل یہ مندرروی سواتی ہیں۔ علاقہ کونش کے اکثر علاقہ پران کا قبضہ ہے، جس کا مرکزی گاؤں بٹل ہے۔ اس خاندان کا ایک مشہور خان، محمد اشرف خان ہوا ہے، جس کی وفات ۱۸۰۰ء میں ہوئی۔ مجاہدین کی اس علاقہ میں سرگرمیوں میں اس کا ذکر بطور مخالفین آیا ہے۔ مجاہدین کے قافلے علاقہ بٹ گرام براستہ بٹل یا بالاکوٹ یا بھوگڑمنگ جایا کرتے تھے۔

محمد اشرف کی وفات کے بعد بہرام خان، اس خاندان کے سرکردہ فرد تھے اور تازیست سربراہی کرتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد خان صاحب محمد عطائی خان، خاندان اور علاقہ کی قیادت کرتے رہے۔ ۱۹۳۷ء میں خانصاحب محمد عطائی خان سرحد صوبائی اسمبلی کے ممبر تھے۔ ان کے اہتمام اور کوشش سے ہزارہ کے ممبران نے ڈیموکریٹک پارٹی بنائی۔ جس کے دوسرے ممبر محمد سرور خان طاہرخیلی راجہ عبدالرحمٰن خان نگری ٹوٹیال اور محمد عباس خان شم اللہی منگ (مانسہرہ) تھے۔ اس پارٹی کی کوشش سے ہزارہ کے ایک ممبر کو پہلی دفعہ وزارت میں شامل کر لیا گیا۔

خانصاحب محمد عطائی خان کی وفات کے بعد ان کے داماد شاد محمد خان نے ۱۹۵۱ء میں محکمہ تعلیم سے استعفیٰ دے کر اسمبلی کا انتخاب مسلم لیگ کے ٹکٹ پر لڑا اور کامیاب ہوئے۔ اور ۱۹۵۸ء تک اسمبلی کے ممبر رہے۔ خوش اخلاق اور مستعد قومی کارکن ہیں۔ اپنے علاقہ کی ترقی میں کوشاں رہتے ہیں۔

خاندانِ سفیدہ۔ صواتی جہانگیری

اس خاندان کا ذکر اس کا قومی آزادی کی تحریکوں میں حصہ لینے کے لحاظ سے بھی ضروری ہے۔ سیاسی خدمات کے لحاظ سے اس خاندان کے نامور افراد غلام رسول خان اور عبدالقیوم خان ہیں۔

غلام رسول خان تاریخ پیدائش ۱۸۸۲ء ہے۔ پرائمری پاس کرنے کے بعد غالباً ۰۳-۱۹۰۲ء میں گھر سے نکلے۔ ۱۹۰۸ء میں واپس آئے۔ اس اثنا میں افریقہ کے مختلف حصوں میں پھرتے رہے۔ (دارالاسلام ممباسہ، مشرقی افریقہ) میں کچھ مدت گزار کر وسطی افریقہ میں

گھومتے رہے۔ آخر کار جنوبی افریقہ، ٹرانسوال میں تقریباً چار سال مقیم رہے۔ واپسی میں سیاسی خیالات میں کافی تبدیلی لے کر آئے۔ یہاں پر یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ ہزارہ سے عموماً اور مانسہرہ سے خاص کر بہت سے لوگ افریقہ، امریکہ اور جنوب مشرقی ایشیا (برما، انڈونیشیا، ملائشیا، سیام، ہانگ کانگ) تلاش روزگار میں جاتے رہے اور واپسی پر سیاحت کے دوران میں ان ممالک سے سیاسی خیالات کا اثر لے کر آتے رہے۔ چونکہ تحصیل مانسہرہ سے کافی لوگ باہر جاتے رہے، لہٰذا تحصیل مانسہرہ کے لوگ سیاست ہزارہ میں سرکردہ حیثیت کے حامل رہے اور اب بھی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں سیاسی زندگی کی حرارت اس تحصیل میں اول نمبر پر ہے۔

غلام رسول خان ٹرانسوال کے قیام کے دوران گاندھی جی وہاں کی عدالت اعلیٰ (سپریم کورٹ) میں پریکٹس کیا کرتے تھے۔ وہاں پر تمام ہندوستانی، ہندو مسلمان ایک قوم تھے۔ جن کے ساتھ گوروں کا سلوک غیر مہذبانہ بلکہ وحشیانہ تھا۔ گاندھی جی کے خیالات میں تبدیلی وہیں آئی اور وہیں سے غلام رسول خان کے خیالات میں بھی تبدیلی ہوئی۔ واپس آنے کے بعد تادمِ مرگ (سال ۱۹۵۱ء) خفیہ پولیس ان کے پیچھے لگی رہی۔ وہ اپنی دھن کے پکے تھے۔ سال ۱۹۱۹ء میں پہلی دفعہ بسلسلہ خلافت تحریک گرفتار ہوئے۔ دوبارہ ۱۹۲۰ء مع کئی رشتہ داروں کے گرفتار ہوئے اور چند ماہ بعد رہا کر دئیے گئے۔ آخر ۱۹۲۱ء میں گرفتار ہوئے اور زیر دفعہ چالیس سرحدی قانون تین سال بامشقت کی سزا پائی۔ سال ۱۹۲۴ء میں رہا ہوئے۔ سیاسی تحریکات میں ہمیشہ سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔ آخردم تک قومی خدمت کا وطیرہ رہا۔ ۲۰ جولائی ۱۹۵۱ء کو اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے۔

عبدالقیوم خان پیدائش ۱۸۹۲ء ہے۔ یہ ملایا (حال ملیشیا) کچھ مدت کے لئے گئے اور جلدی ہی واپس آگئے اور سوئی پٹ میں اپنے بھائی غلام ربانی خان کے پاس جو وہاں گرداور (قانون گو) تھے، رہے۔ وہاں مڈل پاس کیا اور میٹرک گورنمنٹ ہائی اسکول ایبٹ آباد و ایم۔ اے۔ او ہائی سکول امرتسر سے سال ۱۹۱۲ء میں پاس کیا۔ اس وقت ان کے بھائی غلام ربانی خان امرتسر آگئے تھے۔ ۱۹۱۸ء میں بی۔ اے پاس کیا۔ ان کا نام ای۔ اے۔ سی۔ (ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر) بطور امیدوار درج ہوگیا۔ ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت بہ سرکردگی مولانا محمد اسحاق صاحبؒ مانسہرہ نے زور پکڑا۔ یہ اس تحریک میں شامل ہوگئے۔

ڈپٹی کمشنر ہزارہ (کرنل جیمس، ایک سخت گیر اور جابر انگریز) نے ان کو بلا کر نصیحت وغیرہ کی کہ وہ تحریک میں حصہ نہ لیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ مذہبی معاملہ ہے اور وہ اس سے دست بردار نہ ہوں گے۔ اس پر ڈپٹی کمشنر نے ان کا نام فہرست امیدواراں سے خارج کر دیا۔

۱۹۲۱ء میں خلافت کمیٹی پشاور کے سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے کہ گرفتار ہوئے اور تین سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ ان کو سنٹرل جیل پشاور میں رکھا گیا۔ وہیں ان کے بڑے بھائی غلام رسول خان، ملک خدا بخش مرحوم سابق جوڈیشنل کمشنر سرحد۔ محمد جان خان بیرسٹر ساکن ہنوں و دیگر علمائے خلافت تحریک بھی قید تھے۔ بڑی استقامت سے قید گزاری۔ ۱۹۲۴ء یا شروع ۱۹۲۵ء میں رہا ہوئے۔

اس کے بعد آپ ایل۔ ایل۔ بی کے لئے علیگڑھ کالج گئے۔ ان ہی ایام میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صدر پاکستان بھی وہاں زیر تعلیم تھے۔ ۱۹۲۰ء تا ۱۹۴۳ء ترک موالات کانگرس کے سیکرٹری رہے۔

پہلی دفعہ ۱۹۳۲، ۳۳ء سرحدی لیجسلیٹو کونسل کے لئے تحصیل مانسہرہ سے واحد نشست کے دیہی نمائندہ چنے گئے تھے۔

دوسرے انتخاب ۱۹۳۷ء میں کامیاب نہ ہو سکے۔

تیسرے انتخاب ۱۹۴۵ء میں پھر کامیاب ہوئے۔ قاضی عطاء اللہ (مردان) وزیر مال کے اصرار پر ان کے پارلیمنٹری سیکرٹری کے عہدہ کو قبول کر لیا۔ ایک ہزار روپیہ ماہوار تھی۔ لیکن کام برائے نام تھا۔ کچھ مدت بعد اس لئے استعفاء دے دیا کہ کام کچھ بھی نہیں اور سرکاری خزانہ سے مفت میں ایک ہزار ماہوار لینا حرام ہے۔

پاکستان بننے پر وہ حکومت سرحد مسلم لیگ، کے ہم نوا نہ ہو سکے۔ حالانکہ اکثر کانگرسی ممبر اپنا مقام چھوڑ چکے تھے۔ اس اثناء میں ان پر ایک مقدمہ بنا کر جیل بھیج دیا گیا۔ تین ماہ تک حوالات میں رہے۔ آخر کار ہائیکورٹ نے رہا کر دیا۔

۴۰، ۱۹۳۹ء میں جب کانگریسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں تو کانگرس نے عدم تعاون کا اور فوج میں بھرتی حرام ہے کا نعرہ شروع کیا۔ ہزارہ (مانسہرہ) میں بھی یہ تحریک زور پکڑ گئی۔ سب لیڈر باری باری سے نعرہ لگاتے اور جیل چلے جاتے تھے۔ جب ان کی باری آئی تو ان کو ہائی کمانڈ کا حکم تھا کہ بفہ جا کر

بازار میں یہ نعرہ لگانا ہے۔ تاریخ مقررہ پر ان کی اکلوتی لڑکی سخت بیمار تھی۔ اس کو باویدہ تر آخری بار دیکھ کر دو تین سو قدم گئے ہوں گے کہ وہ فوت ہوگئی۔ لوگ دوڑ کر گئے کہ جنازہ کر کے جائیں لیکن کہنے لگے:

"اپنے وقت پر نہ پہنچ سکوں گا، اس لئے واپس نہیں جا سکتا۔ لڑکی کو دفن کر دو اور میرے لئے دعا کرو۔"

اپنے وقت پر لبِ بپہنچے اور نعرہ لگایا۔ پولیس کھڑی تھی، گرفتار کر لیا اور چھ ماہ کی سزا ہوئی۔ پورے چھ ماہ قید گزار کر واپس آئے۔

سب قوم و آزادیِ وطن کے لئے سب کچھ نثار کر دیا۔ سب اراضیات رہن کر چکے تھے۔ مالی حالت بہت کمزور ہوگئی تھی۔ آخر ۱۲ فروری ۱۹۶۲ء کو ہزارہ کا یہ جلیل القدر فرزند، عزم و استقلال کا پہاڑ اس دارِ فانی سے رخصت ہوا۔

علی اصغر خان اس خاندان میں سب سے چھوٹے بھائی ہیں۔ نامور ایڈووکیٹ ہیں اور مدت سے مردان ہی میں رہائش رکھتے ہیں۔ ہزارہ کے لئے باعثِ فخر ہیں۔ آپ کی پیدائش اگست ۱۸۹۵ء میں ہوئی۔ انٹرنس، ایم۔ اے۔ او۔ سکول امرتسر میں اپنے بڑے بھائی غلام ربانی خان نائب تحصیلدار بندوبست کے زیرِ سایہ رہ کر پاس کیا۔ اسلامیہ کالج پشاور میں ۱۹۱۳ء (جبکہ کالج پورا تیار بھی نہ ہوا تھا) داخلہ کیا۔ ۱۹۱۸ء میں بی۔ اے کیا۔ ایل۔ ایل۔ بی علیگڑھ کالج (الہ آباد یونیورسٹی) سے ۱۹۲۰ء میں کیا۔ جنوری ۱۹۲۱ء میں مردان پریکٹس شروع کی اور تا حال وہیں مقیم ہیں۔ نواب محمد اکبر ہوتی کے مسلمہ وکیل رہے۔ آپ کے چار لڑکے ہیں اور سب ہی لائق اور اعلیٰ مراتب پر فائز ہیں۔

آپ نے ۱۹۳۰ء، ۳۱ء کی تحریکِ آزادی میں حصہ لیا اور چھ ماہ ہری پور جیل میں بھی گزارے۔

دیگر نامور افرادِ قوم تحصیل مانسہرہ ۱۔ مانسہرہ کا خان، زمان خان تھا۔ گیدڑ پور کا خان حاجی اکبر خان تھا۔ بجنہ کا خان، عبدالحمید خان اور ڈبل کا تیرہ خان تھا۔

زمان خان مانسہرہ کا واحد خان ہوا ہے۔ اس کا لڑکا جمعہ خان مشہور و معروف مہمان نواز تھا۔ جمعہ خان کا بیٹا خان بہادر علی گوہر خان تھا جو ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر، کشمیر تھا۔ وہ کچھ مدت سری نگر کا گورنر بھی رہا۔ وہ ۱۹۴۶ء میں قتل ہوئے۔ ان کا بیٹا محمد اکبر خان مانسہرہ ٹاؤن کمیٹی کا چیرمین ہے۔ خان بہادر علی گوہر خان مرحوم کا چچازاد بھائی محمد ایوب خان ہے۔ جو کئی سال مانسہرہ ٹاؤن کمیٹی کا چیرمین رہا۔ ایک

مستقل طبیعت کا انسان ہے۔ فرضِ منصبی پر مضبوطی سے قائم رہتا ہے۔ مجلس آرا اور خوش طبیعت ہیں۔ معمر ہو جانے کی وجہ سے اب گوشہ نشین سے ہو گئے ہیں۔ ان کی وفات جولائی ۸۰ء، ۱۹ء میں ہوئی۔

۲۔ حاجی سربلند خان مرحوم، اچھڑیاں۔ زمانہ شناس، تجربہ کار اور صاحبِ دولت و اخلاق انسان تھے۔

۳۔ خان بہادر غلام ربانی خان مرحوم۔ آپ خان مطیع اللہ خان صاحب تحصیلدار مرحوم کے فرزند تھے۔ مشہور سیاست دان اور ماہر ایڈوکیٹ رہے۔ آپ کے بیٹے قابل اور نامور افراد ہیں۔

(۱) محمد بشیر خان C.S.P (۲) میجر جرنل ممتاز خان ستارۂ پاکستان فوج (۳) کرنل شوکت خان انجینئر ہیں۔

۴۔ مانسہرہ کے خان سرفراز خان ڈپٹی کمشنر رہے۔ وطن دوست، احباب پرور اور قابل ترین پولیٹیکل افسر رہے۔ ۱۹۷۸ء کے آخر میں پنشن پر آ گئے ہیں اور ملکی سیاست میں حصہ لے رہے ہیں۔

۵۔ خان محمد حنیف خان قومی اسمبلی کے وزیرِ اطلاعات رہے ہیں۔ آپ کے دادا مرحوم خان بہادر محمد حسین خان مانسہرہ کی قابلِ عزت ہستی تھے۔ آپ آنریری مجسٹریٹ تھے۔ آپ کے دو فرزند نامور ہوئے۔ محمد فیروز خان جو تحصیلدار تھے، شرافت و حیا کے پتلے تھے اور ان کے بھائی محمد عباس خان نے سیاست میں نام پیدا کیا۔ ان کے حالات کسی دوسری جگہ درج کئے گئے ہیں۔

خاندان اگروہ

ان میں مشہور انسان مولوی محمد علی صاحب ہوئے ہیں، جو سکھوں کے عہد میں صدر الصدور بھی ہوئے۔ وہ ایک بڑے عالم دین اور حکیم بھی تھے۔ حکمت کے ساتھ جراحی کا بھی کام کرتے تھے۔ ان کے پوتے ولی محمد خان، خان ہوئے اور وہ بھی حکمت کا کام کرتے تھے۔

مولوی محمد علی کی ابتدائی زندگی

قلمی فارسی تاریخ خاندان خان خیل کے مطابق مولوی محمد علی صواتی، جہانگیری ساکن نندھیاڑ، ہندوستان سے علم دین و ابدان حاصل کرنے کے بعد، بے شمار دولت کے ساتھ جو اسے اپنے استاد کے ترکہ سے ملی، لاہور آ گیا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ سے پکھلی کی ریاست کا پروانہ لے کر پکھلی کے لئے روانہ ہوا۔ یہاں پہنچ کر سرکاری ملازمان کی امداد سے وادئ کونش پر قابض ہو گیا۔

حبیب اللہ خان کو کسی دوسرے کی پکھلی میں حکومت گوارا نہ تھی۔ پائندہ خان تنولی کی مدد سے مولوی محمد علی کو کونش سے بدر کر دیا۔ اور پائندہ خان اس کو پکڑ کر ساتھ لے گیا، تاکہ اس کو دریائے سندھ میں غرق کر دے۔ مولوی محمد علی چند روز پائندہ خان کے ہاں رہا۔ اس کے علاج سے پائندہ خان کی بیوی کو شفا ہوئی تو اس کی سفارش پر مولوی محمد علی کو رہائی مل گئی۔

وہ پھر اپنی جگہ پر واپس آ گئے۔ اور اپنے سات سو ملازموں کو جو منتشر ہو گئے تھے، پھر جمع کر کے مولراج[ا] حاکم ہزارہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

خان حبیب اللہ خان بھی مولوی کو زندہ پا کر دیوان مولراج کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ تاکہ دیوان مولراج سے نزدیک اور باریابی حاصل کر کے مولوی محمد علی کا تدارک کرے۔ آخر کار خان نے اپنا گھوڑا، جو دیوان مولراج کو بہت پسند تھا، نذر دے کر راضی کر لیا اور رات کو مولوی محمد علی کے قتل کرنے کے لئے اس کے گھر پر گیا، لیکن وہ بیدار ہو گیا۔ اس واقعہ کے بعد مولوی محمد علی دیوان سے رخصت لے کر واپس آگیا اور خان بھی گڑھی چلا گیا۔

ان کے پوتے ولی محمد خان، خان اوگرہ مشہور ہستی گزری ہے۔ ان کی وفات ۱۸۴۲ء میں ہوئی ۱۸۲۱ء کے سیاسی ہنگاموں میں آپ مولانا محمد اسحاق مانسہرہ کے ساتھ تھے۔

خاندان بالاکوٹ۔ سواتی، سیر خیلی، بجوری

بالاکوٹ کو مجاہدین جماعت، سید احمد شہیدؒ کی آخری آرام گاہ کا شرف حاصل ہے اور اسی جگہ ان کی شہادت بھی ہوئی۔

اسی گاؤں کے خان واصل خان نے سید شہیدؒ کو اپنی حویلی میں ٹھہرایا تھا۔ ایام شہادت میں سید شہیدؒ اسی حویلی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ خان واصل خان کی اولاد سے محمد اشرف خان تھے، جو مولانا مہرؒ کی تحریر کے مطابق ۱۹۴۶ء میں زندہ تھے۔

اسی گاؤں میں دوسرا قابل عزت خاندان لہاری عثمانی ہے۔ اس خاندان کا ایک خان سمی

ا۔ مولراج حاکم ہزارہ، پہلی دفعہ ۱۸۴۲ء اور دوسری دفعہ ۱۸۴۴ء تا ۱۸۴۶ء میں حاکم ہزارہ رہا۔

بہادر خان کی وفات ۱۹۰۷ء میں ہوئی۔ ان کا ایک فرزند محمد سرور خان شرافت وقار کا مجسمہ (۱۹۰۷ء سے ایبٹ آباد میں تحصیلدار رہے) ہے۔ جوانی میں حج کی سعادت سے سرفراز ہوئے۔

خاندان سچہ و بھوگڑ منگ

بھوگڑمنگ کے خان نواب خان، بالاکوٹ کی جنگ میں شاہ اسمٰعیل شہید کے ہمراہ تھے اور جنگ میں شامل رہے۔ ان کی اولاد سے خداداد خان ۱۹۵۵ء میں مغربی پاکستان کے وزیر صحت رہے۔

(i) مولانا مہرؒ نے اپنی کتاب سیرت شہیدؒ ص۱۵ پر تحریر کیا ہے کہ سچہ کے خان حسن علی خان پر شبہ کیا جاتا تھا کہ وہ سکھوں کا طرفدار تھا۔ لیکن ذوق اختر خان بن محمد اکرم ساکن سچہ کی تحریر کے مطابق اس کا نام "سچوں کا گاؤں" حضرت سید احمد شہیدؒ نے خود ۱۸۳۱ء میں رکھا جب وہ تشریف لائے تھے اور مزید یہ لکھا ہے کہ حسن علی خان کا چچازاد بھائی عنایت اللہ قبیلہ کا سربراہ تھا۔

تاریخی طور پر یہ گاؤں مجاہدین کا مرکز رہا۔

(ii) سر جارج اوس کیپل مشہور چیف کمشنر سرحد وادی کونش کے دورہ پر بمعہ اپنے تمام عملے کے خان عظیم اللہ خان کا مہمان ہوا کرتا تھا اور تمام مہمانوں اور ان کے گھوڑوں تک کا راشن خان موصوف دیا کرتا تھا۔

قوم آوان

تاریخ ہزارہ طباعت اول میں اس قوم کی تاریخ واضح طور پر مجھے معلوم نہ ہو سکی تھی۔ اس کے بعد قاضی محمد عثمان صاحب (جو خود آوان ہیں اور صاحب علم ہیں) نے اس قوم کی تاریخ لکھ کر مجھے عنایت کی جو واقعی تاریخ ہے اور معتبر حوالوں سے مزین ہے۔ میں نے یہ سب حوالے پرانی تاریخوں میں قاضی صاحب کے پاس دیکھے ہیں۔

سب سے پہلے میں تاریخ ہزارہ (طبع اول) سے مختصر اقتباس درج کرتا ہوں، جس کے پس منظر میں قاضی صاحب کے بیان کی اہمیت واضح ہو جائے گی۔

تاریخ ہزارہ، مرتبہ مہتمم بندوبست ہزارہ ۱۸۷۳ء اور تاریخ جہلم (تصنیف ۱۸۷۰ء) اس قوم کے متعلق جو حالات معلوم ہوتے ہیں، وہ یہ ہیں

"ضلع جہلم کا کل مغربی حصہ قوم آوان کے قبضہ میں ہے، جو اغلباً ڈھائی سو برس سے ہرات سے آکر یہاں آباد ہوئے۔ شاید بیکٹرین (باختری)، یونانیوں کی اولاد سے ہیں۔ تاتاری قوم نے ان کو بلخ سے جنوب کی طرف نکال دیا۔ ہرات سے پھرتے ہوئے ہندوستان پہنچے۔ یہ لوگ اپنے افسران کے زیر نگرانی فتح کرتے ہوئے جلد ہی علاقہ جات تلہ گنگ، پکھڑ، میال، جی۔ بھون، کیسلے، نورپور، کلر کہار اور تھل کے بڑے حصے پر قابض ہو گئے اور قدیم مالکان قوم جنجوعہ کے راجگان کو نکال دیا۔ یہ لوگ اپنے سرداروں کو "ملک" کہتے ہیں۔

اس قوم کی آبادی ضلع ہزارہ میں مختلف مقامات پر پھیلی ہوئی ہے اور کافی تعداد میں ہے۔ راورٹی کے بیان کے مطابق یہ "بدلی یا بدنی" قبائل کا مجموعہ تھا۔ جو ننگرہار (جلال آباد افغانستان) سے تا دریائے سندھ کے درمیانی علاقہ پر قابض تھے۔ جب افغان قوم بنگش، کرم و کوہاٹ کے علاقہ میں داخل ہوئیں تو ان کو وہاں سے نکلنا پڑا۔ راورٹی خود ان کو بدھ قرار دینے کے حق میں نہیں تاہم وہ بموجب رائے اخون درویزہ یہ زمانہ قدیم (۱۵۲۳ء تا ۱۶۲۸ء) میں کافر تھے۔

راورٹی نے یہ بھی لکھا ہے کہ حاکم ہرنچ دلخان نے ان کو وہاں سے نکالا تھا اور یہ مشرق کی طرف چلے گئے اور بقول اخون درویزہ وہ مشرق میں اپنے ہم قوموں سے جا ملے۔ راورٹی کے خیال میں آوان کھٹڑ اور گکھڑ وہی بدلی یا بدنی اقوام ہیں جو دریائے سندھ کو عبور کر کے سندھ ساگر دو آب میں آکر آباد ہو گئے۔

"اِبٹسن" اپنی کتاب تاریخ اقوام میں لکھتا ہے: "آوان زیادہ تر سلسلہ کوہ نمک میں پائے جاتے ہیں اور ساتھ ہی اس سے مشرق، مغرب اور جنوب کے علاقہ میں آباد ہیں۔ جہلم سے دریائے سندھ تک ان کی آبادی کی کثرت ہے۔ یہ کوہ سلیمان اور کوہ سفید کے دامن تک بھی آباد ہیں۔ زمانہ قدیم میں سلسلہ کوہ نمک کے مغربی طرف کے میدان پر یہ قوم قابض تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ پٹھانوں نے اٹک پار سے آکر اور جہلم کی طرف سے ٹوانوں نے آکر ان کو بے دخل کر دیا۔

تحقیق الاعوان کے مصنف خواص خان اعوان ساکن ہیڑاں تحصیل مانسہرہ نے مولانا مہرؒ کے

متعلق لکھا کہ وہ بھی آوان ہیں۔ میں نے ان سے دریافت کیا تو انہوں نے تحریر فرمایا کہ وہ بھی اعوان (آوان) ہیں۔ انہوں نے اس قوم کی تاریخ کے متعلق بہت سی کتابیں بہم پہنچائیں۔ لیکن کوئی بھی علمی اور تاریخی نقطۂ نگاہ سے مستند معلوم نہ ہوئی۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ "میرا خیال ہے کہ قطب شاہ یا عون قطب شاہ کے باب میں یہ کہنا کہ وہ محمود غزنوی کے ساتھ آئے تھے، صحیح نہیں۔ غوری کے ساتھ ممکن ہے درست ہو۔ اب مدت سے میری یہ رائے ہوگئی ہے کہ قطب شاہ بھی داتا گنج بخش کی طرح داعیٔ اسلام تھے۔ باہر سے آکر شمالی و مغربی پنجاب میں تبلیغ شروع کی اور ایک اچھا گروہ معاونین کا پیدا کر لیا۔ چونکہ بعد کے دور میں یہ لوگ فوجی خدمات دینے میں پیش پیش رہے اس لئے عسکری کا پیوند محمود غزنوی سے ملایا گیا اور ایک ایسی تاریخ مرتب ہوئی جو بجائے خود کتنی اہم ہو لیکن جب تک پس منظر کے اعتبار سے تاریخ کے اوراق کے ساتھ مناسبت و مطابقت پیدا نہ کرے گی قابل قبول کیونکر ہوگی۔

تحقیق الاعوان کے مصنف کے نزدیک اعوان (آوان غلط ہے) محمد بن الحنفیہ بن علی کی اولاد ہیں اور محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان میں آئے اور اعوان کا خطاب پایا۔ میر قطب شاہ ان کے مورث ہیں جن کا سن وفات ۴۲۱ھ، ۱۰۲۹ء ہے اور ان کا مدفن غزنی ہے۔

بندوبست ہزارہ ۱۸۷۳ء کے اندراج کے مطابق تنولیوں کے دیہات کی صورت دیہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آوان ترکوں کے وقت میں بعضے دیہات میں ان کے تحت کاشتکاری کرتے تھے۔ مثلاً دیہات بدہنک وغیرہ۔

تنولیوں کا زمانہ آمد سولھویں سترھویں صدی عیسوی کا ہے۔ لہٰذا گمان غالب یہ ہے کہ آوان ترکوں سے پہلے اس ملک میں آئے۔ اگر راورٹی کی رائے کو مان لیا جائے کہ وہ بُدلی یا بدلی اقوام ہیں تو ان کا زمانہ آمد یا سکونت محمود غزنوی سے بھی پہلے کا ہوگا۔

قاضی محمد عثمان صاحب آوان ساکن باندھی ڈھونڈاں کی تحقیق کے مطابق آوان (نہ کہ اعوان)،

لہ۔ مولانا مہر تحریر فرماتے ہیں کہ عون قطب شاہ کا سلسلہ نسب حضرت علیؓ تک مسلسل نہیں ملتا خواہ بذریعہ محمد ابن حنیفہ ہو یا بذریعہ عباس علمدار۔

سامی النسل ہیں، جن کی اولاد ۵۰۰ ۲ قبل مسیح میں عراق میں آباد ہوئی۔ حضرت ابراہیم کا قبیلہ بھی آوان تھا۔ ضحاک نمرود بھی آوان قبیلہ سے تھا۔ یہی قبیلہ غوری ہوا جس کو کھوکھروں نے ۱۲۰۶ء میں جہلم کے نزدیک قتل کر دیا۔

قاضی صاحب کی مزید تحقیق مندرجہ ذیل ہے۔

آوان، ہندوستان میں سلطان محمد غوری نے ہندوستان فتح کر لینے کے بعد کھوکھروں سے علاقے خالی کرائے اور ان کی جگہ بھکر سے اٹک تک کلیدی مقامات پر آوانوں کو آباد کر دیا۔ اس سے پہلے کھوکھر اٹک سے لے کر ملتان تک آباد تھے۔ یہ ان کا آبائی وطن تھا۔ ان واقعات کے بعد کھوکھروں کی جمعیت منتشر ہوگئی۔ مگر کوہ جود (سلسلہ کوہ نمک) میں کھوکھر باقی رہ گئے۔

پنجاب اور ہزارہ میں آوانوں کی آمد جب چنگیزی مغلوں نے براہ کرم، پنجاب پر حملہ کیا اور دریائے سندھ سے لاہور تک قبضہ کر لیا تو اس وقت آوان قوم کی زیادہ تعداد ہزارہ میں آئی۔ یہ معزالدین بہرام شاہ کا دور تھا (۶۳۹ھ، ۱۲۴۲ء) چونکہ آوانوں کے علاقے براہ راست مغلوں کی زد میں آئے اور مغلوں کی رہنمائی کھوکھر (جن کے ایماء پر مغلوں نے حملہ کیا تھا) کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ آوان ان کی دسترس سے محفوظ نہیں رہ سکتے تھے۔ اس لئے محفوظ علاقوں میں (یعنی ہزارہ میں) ان کا پناہ گزین ہونا سمجھ میں آسکتا ہے۔

اسی طرح ناصر الدین محمود کے دور میں جب مغلوں نے براہ پشاور حملہ کیا تو وہ کوہ جود تک کے تمام علاقے پر قابض ہو گئے۔ چنانچہ ناصر الدین محمود نے اپنی تخت نشینی کے پہلے سال ۶۴۴ھ، ۱۲۴۷ء میں اپنے وزیر اور نائب غیاث الدین بلبن کو کوہِ جُود کی مہم پر روانہ کیا۔ قطب الدین حسن غوری اور ملک اعزالدین، حسن غوری بھی اس جہاد میں شریک تھے۔ مغلوں کو شکستِ دینے کے بعد کھوکھروں کو کوہ جود سے بھی بے دخل کر دیا۔

ان کے بعد اس کے مغربی حصہ (خوشاب۔ بھیرہ وغیرہ) میں آکر آباد ہو گئے۔ اور شمالی اضلاع (جہلم کے ملحقہ علاقے، چکوال، کلر کہار وغیرہ) میں بلبن نے گکھڑوں کو آباد کر دیا۔ ورنہ اس سے پہلے گکھڑوں کا دائرہ صرف راولپنڈی اور اس کے ملحقات تک محدود تھا۔

جب تیموری ترک فوجیں ۸۰۰ھ، ۱۳۹۸ء میں یہاں آئیں تو اُدان ہزارہ میں موجود تھے۔ بہرحال ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) کے وسط سے آوانوں (پنجاب اور ہزارہ میں) کی آمد اور آبادی کا دور رہے، خواہ وہ کسی صورت میں آئے خود بسے یا بسائے گئے۔

بابا سجاولؒ اغلباً اورنگ زیبؒ کے دور میں یہاں آئے۔ بانڈھی ڈھونڈاں کے اُدان چار سو سال سے یہاں آباد ہیں۔ مرحوم مانگل کے دو خاندان ایسے بھی ہیں، جو مغلیہ دور سے پہلے یہاں آباد ہیں۔

محمد غوری کے بعد اس کا بھتیجا محمود بن غیاث الدین تخت نشین ہوا (۱۲۰۶-۱۷ء)

جب اس کی حکومت ختم ہو گئی تو بہت سے غوری قتل ہو گئے۔ جو بچ گئے وہ ہندوستان بھاگ آئے اور اپنے غلاموں (قطب الدین ایبک وغیرہ) کے احسان مند ہو کر وقت گزارنے لگے۔ چنانچہ ان ہی غوری اُوانوں کا معتدبہ حصہ اسی دوران میں پنجاب کے مختلف اضلاع میں آکر آباد ہوا۔ جن کی آبادیاں آج تک موجود ہیں۔

اقطاب آوان اس قوم میں بڑے بڑے اولیاء اللہ ہوئے۔

۱۔ ہزارہ میں بابا سجاولؒ نامور بزرگ گزرے ہیں جو سید جلال بابا کے پکھلی فتح کرنے سے پہلے مانسہرہ (نوکوٹ) سے کھر کوٹ چلے گئے تھے جس کو چار سو سال کا عرصہ ہوتا ہے جن کی زیارت کھر کوٹ، ہری پور، دربند روڈ پر تھی۔ تربیلہ ڈیم کی تعمیر سے یہ جگہ زیر آب آنے کی وجہ سے ان کے جسد مبارک کو نکال کر ۲۲ جولائی ۱۹۷۴ء کو مانسہرہ کے نزدیک دفن کر دیا گیا اور جگہ کا نام سجاول شریف رکھا گیا۔

۲۔ مرزا مظہر جانِ جاناںؒ۔ آپ کے جد امجد امیر بابا خان ترکستان سے ہندوستان آئے تھے۔ ان کے اجداد میں سے ایک بزرگ امیر کمال الدین (جن کا سلسلہ نسب ۱۹ واسطوں سے محمد بن حنیفہ کے توسط سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملتا ہے) آٹھویں صدی ہجری میں طائف سے ترکستان گئے اور وہاں کے حاکم سردار الوس تاقشالان (تاقشال ترکی زبان میں لاغر گھوڑے کو کہتے ہیں) کی لڑکی

لہ۔ ماخوذ از مظہر جان جاناںؒ اور ان کا اردو کلام از عبدالرزاق قریشی۔ ناشر ادبی پبلشرز بمبئی ۱۹۶۱ء ص۲۔

سے ان کی شادی ہو گئی۔ چونکہ اس حاکم کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ اس کی حکومت امیر کمال الدین کو مل گئی۔
جب ہمایوں بادشاہ نے شاہ ایران کی مدد سے اپنی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ حاصل کی تو اس خاندان کے دو بھائی امیر بابا خان اور امیر مجنون خان بھی اس کے ساتھ ہندوستان آئے۔
مجنون خان اور بابا خان نے اکبر کے بارھویں سال جلوس میں بغاوت کی جس کی پاداش میں اس خاندان کے لئے مناصب عالیہ کے دروازے بند کر دئے گئے۔
مرزا مظہر جانِ جاناں کی ولادت ۱۱۱۲ھ، ۱۷۰۲ء ہے۔ یہ نام اورنگ زیب نے ان کے باپ مرزا جان کی نسبت سے جانِ جاں رکھا۔ ان کا اصلی نام شمس الدین تھا۔ بیٹا باپ کی جان ہی ہوتا ہے۔ ایک شیعہ کے ہاتھ سے بذریعہ طپنچہ شہید ہوئے (وجہ تعزیت کو بدعت قرار دینا) تاریخ وفات دس محرم ۱۱۹۵ھ، ۱۷۸۰ء ہے۔
آپ کی لوحِ تربت پر ان کا اپنا شعر کندہ تھا ؎

بہ لوحِ تربت من ، یافتند از غیب تحریرے
کہ این مقتول را ، جز بے گناہی ، نیست تقصیرے

کہتے ہیں، جب شاہ عالم نے اس سانحہ کو سنا تو ایک انگریز ڈاکٹر کو معالجہ کے لئے تجویز فرمایا اور حکم دیا کہ ان کے قاتل کو پکڑ کر قصاص کے لئے حضور میں پیش کریں۔
جناب مرزا مظہر جانا جانان نے اس حالت میں بادشاہ کو لکھا۔ بدست شیعہ کے زخم کا علاج، عیسائی سے کرانا، اپنے کی شکایت غیر سے ہے، جس کو میں اچھا نہیں سمجھتا۔ فقیر کا قاتل اگر گرفتار ہو جائے، تو اس کو فقیر ہی کے حوالہ کر دیں، تا کہ بطریق معافی، خود ہی قصاص لے لوں۔
میر قمر الدین منت نے ان کی تاریخ وفات محرم ۱۱۹۵ء (مطابق ۱۷۸۰ء)، عاش حمیداً، مات شہیداً، سے نکالی۔

۲۔ سلطان العارفین سلطان باہو۔ آپ اعوان قوم سے تھے۔ شاہجہان بادشاہ کے عہد میں شورکوٹ ضلع جھنگ ۱۰۳۹ھ، ۱۶۳۰ء میں پیدا ہوئے۔ زندگی کا نصف آخر اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کے عہد میں گزارا۔ آپ کو اپنی والدہ، بی بی راستی، کی نگرانی شروع سے حاصل تھی آپ نے بڑے ہو کر والدہ کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ اپنے ایک شعر میں انہوں

نے اپنی والدہ کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ؎

رحمتِ غفران بود بر راستی
راستی از راستی ، آراستی

ہزارہ میں آوان کی بڑی شاخیں

رواج نامہ بندوبست ۱۸۷۱-۷۲ء کے مطابق اس قوم کی بڑی بڑی شاخیں جو اس ضلع میں آباد ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۱- گولڑہ، ۲- قطب شاہی، ۳- کھوکھر، ۴- چوہان، ۵- کلگال- ان کے علاوہ برشین کٹھوال، ابدان، مرجان، پوٹھواری بھی اس کی شاخیں ہیں۔

قوم کا چیف

اس قوم کا سردار گھر سکندر پور دہری پور میں ہے، جو قوم گولڑہ سے ہے۔ بسبب علم ان کو قاضی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اصلاً یہ راولپنڈی سے آنا بیان ہوئے۔

مطابق تاریخ ہزارہ مرتبہ مہتمم بندوبست ۱۸۷۰-۷۲ء، "مسٹر ویس" ہیں- اس وقت "قاضی عبدالغفار" صاحب ہوشیار آدمی تھے۔ حاکمان سرکار سکھان کے مددگار رہے۔ پھر عہدِ انگریزی دابتدائی میں میجر ایبٹ کو ۱۸۴۸-۴۹ء کی شورش دبغاوت چتر سنگھ، سکھ حاکم ہزارہ، میں ہر قسم کی مدد دی اور جاگیر پائی۔ علم دار گھرانہ کے فرد تھے۔ مدت تک تحصیلدار رہے۔ ۱۸۷۱-۷۲ء میں وفات پائی۔

قاضی عبدالغفار میجر ایبٹ کا دایاں بازو تھے۔ ان کے پوتے قاضی فضل الٰہی بیسویں صدی کے پہلے عشرہ میں ہری پور کے نامور فرد تھے، کمیٹی ہری پور کے سربراہ تھے۔

قاضی عبدالغفار کے بڑے بھائی قاضی غلام احمد، ابتدائی عملداری سکھاں ۱۸۲۱ء تا ۱۸۴۵ء کل عدالتِ ملک ہزارہ کے صدر قاضی تھے اور سوائے گاؤکشی کے مقدمات کے باقی سب مقدمات کا وہی فیصلہ کرتے تھے۔ ان کے بیٹے قاضی میر عالم ابتدائی عہد انگریزی میں ہزارہ کے اسسٹنٹ کمشنر رہے۔ ریٹائر ہونے پر ان کو اعزازی مجسٹریٹ درجہ اول بنایا گیا۔ بڑے صاحب علم تھے۔ اپنی ذاتی لیاقت اور حکام کی پرورش سے محرری کے عہدے سے ترقی کی۔ بہت جائیداد پیدا کی

اس خاندان کے ایک اور نامور اور قابل آدمی قاضی محمد اسلم بن قاضی محمد سعید بن قاضی عبدالغفار

ہوئے، جن کا انتقال ۱۹۷۲ء میں ہوا۔

تحصیل مانسہرہ میں مشہور سیاسی شخصیت امیر عالم خان آوان کی ہے۔ جنہوں نے اپنی ساری عمر سیاسی تحریکوں میں گزار دی۔ پیدائش ۱۹۱۰ء میں بمقام لبڑ کوٹ تحصیل مانسہرہ میں ہوئی۔ ۱۹۲۰ء میں اسلامیہ کالج پشاور کے طالبعلم تھے، کہ تعلیم، زیر تحریک ترک موالات، چھوڑ کر جامعہ ملیہ اسلامیہ (زیر مولانا محمد علی جوہرؒ) میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۷ء تک سیاسی سرگرمی سے عمر گزاری اور بہت دفعہ طویل عرصہ کے لئے پابند سلاسل ہوتے رہے۔

۱۹۵۱ء میں سرحد اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور ۱۹۵۳ء میں اس کے نائب صدر بالاتفاق ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں سیاست سے علیحدگی اختیار کر کے گوشہ نشین ہو گئے۔

ہفتہ وار ترجمان سرحد (اجراء ۱۹۲۶ء) میں کے مدیر ہیں اور ملک وقوم کی خدمت اس کے ذریعہ سے کئے جا رہے ہیں۔

باب ششم

ہزارہ کی سرحدی اقوام پشاور سے چلاس تک ہزارہ کی مغربی سرحد پر مختلف اقوام، چھوٹی چھوٹی وادیوں اور پہاڑوں پر آباد ہیں اور عموماً آزاد رہی ہیں لیکن آج وہ سب پاکستان کے زیر حکومت ہیں۔

اقوامِ سرحد ہزارہ

اتمان زئی موضع کھبل اور کیا، دامن کوہِ مہابن میں آباد ہیں۔ تربیلہ کے اتمان زیوں سے ان کی قرابت داری خاندانی و قومی ہے۔ اب یہ مواضعات بھی ضلع ہزارہ کا حصہ ہیں۔

مجاہدین ان کی آبادی ایک زمانہ میں ستھانہ اور مہابن میں دور دور تک رہی۔ بہت مدت تک ان کی آویزش حکومت ہزارہ، سکھ اور انگریزی سے رہی۔ یہ مجاہدین حضرت سید احمد شہیدؒ کے پیروؤں اور لواحقین سے تھے۔

امازئی اتمان زیوں کے شمالی جانب یہ قوم آباد ہے۔ نواب امب (امب دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر نواب صاحب کا پرانا اور آبائی دارالحکومت ہے۔) کے علاقے کے ساتھ ساتھ اس قوم کا علاقہ ہے۔

مداخیل، حسن زئی اور امازئی مداخیل، کوہ مہابن کی شمالی ترائی میں آباد ہیں۔ حسن زئی، مداخیل سے آگے، دریائے سندھ کے دونوں

کناروں پر آباد ہیں۔ان میں سے جو دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر ہیں وہ کوہ سیاہ (BLACK — MOUNTAIN HAZARA) کی مغربی ترائی کے جنوبی حصہ میں آباد ہیں۔

اکازئی حسن زئی قوم کے شمال میں اور کوہ سیاہ کی دوسری ترائیوں میں اور سندھ کے بائیں کنارے پر آباد ہیں۔

یہ سب اقوام یوسف زئی قوم کی عیسیٰ زئی کی شاخیں ہیں۔شمال میں ان اقوام کی سرحد اگور سے ملتی ہیں اور کوہ سیاہ، ان کی حد بندی کرتا ہے۔

چغرزئی اور پرہری وال اکازئی قوم کے شمال میں چغرزئی قوم جو یوسف زئی کے قبیلہ ملی زئی کی شاخ ہے اس قوم اور شمالی اگور کے درمیان پرہری سید آباد ہیں۔

ٹیکری، دیشی، نندہار یہ سب سے حکومت ہزارہ کے زیر نگین ہو چکے ہیں۔ٹکری ایک زرخیز وادی ہے اور سواتھی اس میں آباد ہیں۔یہ اگور کے شمال میں واقع ہے۔

دیشی پہاڑی اور تنگ دروں کا علاقہ ہے جو پرہری اور ٹیکری کے شمال اور اس کا جنوبی سرا اگور کے شمال میں ہے۔یہ علاقہ بھی سواتھیوں کا ہے۔

نندے ہاڑ دیشی، کونش اور بھوگرمنگ کے درمیان واقع ہے۔یہ بھی سواتھی قوم کا علاقہ ہے۔

الائی نندے ہاڑ سے بعد کا علاقہ ہے اور اس میں بھی قوم سواتھی آباد ہے۔جس کی جنوبی حد اور بھوگرمنگ کے درمیان موسیٰ کا مصلیٰ کا پہاڑ حد فاصل ہے۔

الائی کے لوگوں نے شہید گنج واقع لاہور کی مسجد کے جھگڑے میں کافی حصہ لیا اور سرحد ہزارہ پر بد امنی کا مظاہرہ ہوتا رہا۔اسی سلسلہ میں اس قوم نے ۱۹۔۲۰ر اگست ۱۹۳۵ء موضع ٹبل پر حملہ بھی کیا۔جو رپورٹ ڈپٹی کمشنر ہزارہ نے اس واقعہ کے متعلق لکھی تھی اس سے الائی کی اقوام اور ان سے شجرہ نسب کا بھی ذکر کیا تھا۔

وہ لکھتا ہے کہ الائی میں دو بڑی قومیں ہیں ۱۔ببل یا دبیال، ۲۔تور۔
ببل کا سرگروہ روشن خان ساکن الائی ہے اور تور کا خان شیر محمد خان۔

لہ ماخوذ از رپورٹ سکندر مرزا ڈپٹی کمشنر ہزارہ۔

روشن خان کا نزدیکی رشتہ دار قلندر خان، برکتی خان اور محمود شاہ خان خلافِ سرکار (انگریزی) علانیہ کام کر رہے ہیں اور غیر علاقہ کے لوگوں نے خون سے لکھے ہوئے خطوط کابل، مہمند، آفریدی وزیر اور مسعود اقوام کو لکھے ہیں۔ مسلمانان الائی، ننداہاڑ اور کوہستان آمادہ جہاد ہیں۔ ملا اور طالبعلم اس تحریک کے سربراہ ہیں۔

موضع شار کلی، نزد بٹل میں فرنٹیر کنسٹبلری کا قلعہ اس ڈاکہ کے بعد بنایا گیا۔

کوہستان الائی کے شمال میں علاقہ کوہستان ہے اور وادئی کاغان اور دریائے سندھ کے درمیان کا پہاڑی علاقہ ہے۔ یہ ہندو الاصل معلوم ہوتے ہیں اور اب وہ مسلمان ہیں۔ ان کی زبان گلگت اور لداخ کی زبان سے ملتی ہے۔ ان کے متعلق اقتباسات جو سندھ کوہستان رپورٹ مرتبہ مسٹر ایرسن آئی۔سی۔ایس سے ماخوذ ہیں، ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

سندھ کوہستان

ماخوذ از رپورٹ ۱۹۴۱ء، مسٹر ایرسن ICS

جغرافیائی تقسیم۔ سندھ کے دائیں طرف سوات کوہستان اور بائیں سندھ کوہستان ہے اور دونوں حصے سندھ کوہستان ایک قوم ہیں۔ ان لوگوں کی زبان شینا ہے اور یہ اصلاً درد قوم ہے۔ اور گردونواح کے پٹھانوں سے الگ۔

تقسیم چار بڑے رقبے ہیں۔

۱۔ ہربن۔ ۲۔ جل کوٹ، ۳۔ چلاس، ۴۔ کولائی۔

تاریخ ۱۸۵۷ء میں ان لوگوں نے گوجروں اور سیدوں کے ساتھ مل کر بقیہ باغی ہندوستانی رجمنٹ ۵۵ کو جب وہ کشمیر کو بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے، قتل کر دیا۔

۱۸۸۴ء میں ان کی ناکہ بندی کی گئی۔ کیونکہ انہوں نے ایک کاکا خیل ٹھیکہ دار سے اپنے تنازعہ کا فیصلہ زور سے کرنا چاہا اور کاغان کے علاقہ پر چڑھ آئے۔ ۵ مارچ ۱۸۵۲ء میں انہوں نے چلاس والوں سے مل کر چلاس کے قلعہ پر حملہ کیا۔ بہت سے آدمی ان کے مارے گئے اور وہاں پر انہوں نے ایک مقبرہ شہید بابا کے نام پر بنایا، جس کی وہ بہت عزت کرتے ہیں۔

راجہ بختون ولی نے اپنی حکومت ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۷ء کے درمیان تنگیر اور دریل پر حاصل کرلی۔ والئی سوات نے جب بنیر ۱۹۲۳ء میں لے لیا، تو وہ کوہستانیوں کے قریب آگیا۔ اس نے کانا اور چکیسر بھی اسی سال فتح کرلیا۔ ان علاقوں میں صواتی آباد تھے۔ موسم گرما ۱۹۲۶ء میں اس نے دو کوہستانی گاؤں بشتم اور لاہور پر قبضہ کرلیا۔

۱۹۲۷ء میں والئی سوات نے وادی دبیر پر قبضہ کرلیا اور بنکڑ، رانیلیہ، دُبیر، اور جیجل میں اپنے قلعے بنا لئے۔ فروری ۱۹۲۸ء میں والی نے ڈنڈوره اور جنوری ۱۹۳۹ء میں پٹن پر قبضہ کرلیا۔

جولائی ۱۹۳۹ء میں کانڈیہ، ارزیکہ، وادی میدان پر والی کا قبضہ ہوگیا اور آخر کار دریائے سندھ کے دائیں طرف سب علاقہ تنگیر تک والی کا قبضہ ہوگیا۔

ادویات بہت زیادہ ہے۔ کٹھ تقریباً ختم ہوگئی ہے اور ... اچھی قسم کا نہیں ہے تمباکو سگ اور دوسری بوٹیاں، جن کو میں پہچان نہ سکا، افراط سے بہت پیدا ہوتی ہیں۔

ان لوگوں کی زراعت کاشتکار کرتے ہیں۔ بیج، بیل اور ہل مالک کا ہوتا ہے اور کاشتکار کو چوتھا یا تیسرا حصہ پیداوار کا دیتے ہیں۔ ان کی بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کو چرانے کے لئے عموماً گوجر ہوتے ہیں، جن کو وہ سردیوں میں نورو پے، ایک جوڑا کپڑوں کا اور ساٹھ پیمانہ مکی دیتے ہیں اور گرمیوں میں پھر ایک دوسرا جوڑا کپڑوں کا پچاس پیمانہ مکی کا اور بارہ بکریاں دیتے ہیں۔

یہ سب علاقہ نہری ہے۔ ان کے گاؤں دریائے سندھ کے کنارے یا اس کے معاون ندی نالوں کے کنارے پر ہوتے ہیں۔ ملک زرخیز ہے۔ مکی اور گیہوں پیدا ہوتے ہیں۔ چاول کاشت نہیں کیا جاتا۔ غذا عموماً مکی ہے۔ اخروٹ، انار، انگور، انجیر اور آڑو لگائے جاتے ہیں۔ سبزی، آلو، شلغم، ٹماٹر، کدو، پیاز، تمباکو اور سرخ مرچ کاشت کئے جاتے ہیں۔

عورتیں گھر کے کام کے علاوہ کھیتوں پر بھی کام کرتی ہیں لیکن مرد کبھی کبھی کھاد اور فضلات کی نگرانی کرتے ہیں۔ جن لوگوں کی اپنی چراگاہ نہیں ہے وہ ایک مقررہ رقم دے کر اپنے مویشی چرا سکتے ہیں۔ چراگاہ کے نرخ ایک موسم کے یہ ہیں۔ چالیس بکریوں کے چھ روپیہ یا ایک بکری۔ ایک گائے بیس بکریوں کے مطابق اور ایک بھینس تیس بکریوں کے برابر گنی جاتی ہے۔

ہر ایک جندر لگا سکتا ہے اور پسوائی میں ۱/۲۰ حصہ اٹھا لیتا ہے۔

جنگلات کی آمدنی شریعت کے مطابق گاؤں پر تقسیم کی جاتی ہے۔ ایک مرد، دو عورت۔ بالغ و نابالغ سب یکساں تصور ہوتے ہیں۔

پیشہ ور اس علاقہ میں بہت کم ہیں۔ علاقہ ہربن سمار کے گاؤں میں مَیں نے ایک لوہار دیکھا، جو ایک اخروٹ کے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ جس کے پاس ایک لوہے کی اہرن اور بکرے کی کھال کی ایک پھونکنی تھی، اور ایک جولاہا تھا۔ ان کو ہر گھر سے سالانہ ایک بھیڑ کی اون ایک دن کا گھی اور پانچ پیمانہ مکئی ملتی ہے۔

اس علاقہ میں ایک معمار ستون خان دشین، ہے جو گاؤں میں برج بناتا ہے اور -/۶۰، -/۵۰ اور -/۱۰۰ روپیہ ایک منزل، دو منزل اور تین منزلہ مکان کے حساب سے لیتا ہے۔ ان برجوں کے ساتھ مکان بھی ہوتے ہیں۔

لوہار کو پانچ اوڈی مکی یا چاول خریف میں اور اتنی ہی گندم ربیع میں فی ہل ادا کی جاتی ہے میراثی اور حجام سالانہ ایک سیر گھی، ایک سیر اون، نصف اوڈی غلہ فی آدمی کے حساب سے لیتے ہیں اور ملاح ایک اوڈی غلہ فی گھر سالانہ لیتے ہیں۔ (اوڈی پیمانہ ۲½ سیر کا ہوتا ہے۔)

جل کوٹ کے علاقہ میں ایک بستی ۵۰۰ جولاہوں کی ہے۔

دریائے سندھ کی ریت سے سونا دھو کر نکالا جاتا ہے اور ایک آدمی روزانہ ایک روپیہ کا سونا نکال لیتا ہے اور یہ چلاس کے ہندوؤں پر بیچ دیا جاتا ہے۔

مقدمات شریعت کی رو سے ملا فیصلہ کرتے ہیں اور یہ فیصلے رائے عامہ کے باعث قبول کرنے پڑتے ہیں۔ وراثت بروئے شریعت تقسیم ہوتی ہے اور عورتیں بھی حصہ پاتی ہیں بھائی بہنوں سے درخواست کر کے عموماً ان کا حصہ واپس لے لیتے ہیں۔

فوجداری۔ قتل کا بدلہ لیا جاتا ہے۔ لیکن کمزور پانچ سو روپیہ یا کچھ کم و بیش لے کر صلح کر لیتا ہے۔

چوری معدوم ہے۔

علاقہ گور اور تھور جو پہلے سے گلگت ایجنسی سے ملحق ہیں۔ ان ہی کی شرائط پر کوہستانی بھی سرکار کی رعیت بننے کے لئے تیار ہیں۔

سرحد کاغان و چلاس

تنازعہ مابین جل کوٹی اور تھور فیصلہ ڈپٹی کمشنر ۱۴ر جون ۱۹۰۰ء سے مندرجہ ذیل حقائق معلوم ہوئے۔

سپاٹ کا علاقہ اصلاً شنکئی قوم کا ہے اور چلاسی، تھور اور ہربن اس کے قبائل ہیں۔ سپاٹ کا علاقہ ۲۵ × ۱۲ میل ہے اور بڑی چراگاہ ہے۔ اس علاقہ کا پانی جل کوٹ کے علاقہ سے ہو کر دریائے سندھ میں گرتا ہے۔ چونکہ جل کوٹی قوم کی تعداد اب زیادہ ہو گئی ہے اس لئے انہوں نے اس پر قبضہ کر لیا ہے۔

چلاس لداخ اور گلگت کے مشرق اور کاغان کی وادی شمالی سرحد کے ساتھ ساتھ چلاس کی حد ہے۔ اگرچہ یہ لوگ کوہستانیوں سے ملتے جلتے ہیں۔ لیکن ان کی زبان کوہستانیوں سے مختلف ہے۔ یہ قوم پرامن طور سے سوداگری اور گلہ بانی کا پیشہ کرتے ہیں۔

ہزارہ سرحد کی جنگیں

اقوام سرحد کی ہزارہ کی انگریزی حکومت سے پہلی ٹکر ۱۸۵۱ء میں ہوئی۔ دو انگریز مسٹر کارن (CARNE) اور ٹیپ (TAPP) قتل ہو گئے۔ یہ دونوں محکمہ نمک کے افسر تھے۔ ان دنوں میں کوہاٹ کے نمک کی درآمد اس طرف بغیر اجازت محکمہ نمک کے نہیں ہو سکتی تھی۔ اس غرض کیلئے ایک چوکی موضع غازی میں بھی تھی۔ چونکہ کوہاٹ کا نمک سرحدات ہزارہ کی اقوام میں پہنچ رہا تھا لہٰذا یہ دو افسر موسم خزاں ۱۸۵۱ء میں اس امر کی تحقیق کے لئے از خود خلاف حکم میجر ایبٹ کے نواب جہانداد خان والئی امب کے علاقہ میں آ نکلے۔ ابھی وہ اس کے علاقہ میں تھے کہ سرحد حسن زئی کے قریب ان دونوں کو حسن زئی کے چند مسلح افراد نے قتل کر دیا۔ اس پر قاتلین حسن زئی نواب صاحب کے علاقہ میں ملے ان کو اس نے حکومت ہزارہ کے حوالہ کر دیا۔ حسن زیوں نے انتقام کے لئے نواب امب پر سخت حملے شروع کر دیئے۔ دو سرحدی قلعے چمبیری اور شنگلئی اپنے قبضہ میں کر لئے اور اس کے علاقہ میں لوٹ مار شروع کر دی اور لوگوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنے لگے۔ لہٰذا سرکار انگریزی کو

ان کے خلاف قدم اٹھانا پڑا۔ دسمبر ۱۸۵۲ء میں کالا ڈھاکہ پر ہر دو اطراف سے حملہ کیا گیا حسن زیوں نے کوئی خاص مقابلہ نہ کیا۔ ان کے چند گاؤں جلا دیئے گئے اور جنوری ۱۸۵۳ء میں فوجیں واپس آگئیں۔ اس کو کافی سزا سمجھ کر حسن زیوں کے آدمی رہا کر دیئے گئے۔

ہندوستانی مجاہدین پر حملہ انگریزی افواج کالا ڈھاکہ کی مہم سے واپس آنے کے بعد مجاہدین کی طرف متوجہ ہوئیں۔ کیونکہ انہوں نے حسن زیوں کی امداد کی تھی۔ نواب امب کا قلعہ کوٹلہ (دریائے سندھ کے دائیں طرف) پر قبضہ کر لیا تھا۔ ۱۰ر جنوری کو میجر ایبٹ تھوڑی سی فوج لے کر بلیاں سے دریا پار کر کے ان پر حملہ آور ہوا۔ لیکن وہ پہلے ہی بھاگ گئے اور حملہ آور تنولیوں کے تعاقب سے تیس چالیس آدمی مارے گئے۔ ستھانہ خالی ہو گیا۔ مزید کاروائی کئے بغیر فوج واپس آگئی۔

۴ر اکتوبر ۱۸۵۷ء میں مجاہدین نے پھر چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ اسسٹنٹ کمشنر مردان پر حملہ کیا حکومت نے فیصلہ کیا کہ ان کو ختم کر دیا جائے۔ لہٰذا ایک فوج زیر کمان سر سڈنی کاٹن خدو خیل قوم (ضلع مردان) کو مناسب سزا دیتے ہوئے کھبل کی طرف بڑھی۔ ہزارہ سے میجر بیچر ڈپٹی کمشنر فوج لے کر دریائے سندھ سے پار ہوا۔ دونوں طرف سے ستھانہ پر حملہ کیا گیا۔ مجاہدین شوقِ شہادت میں بہترین کپڑے زیب تن کئے ہوئے مقابلہ میں صف آرا ہوتے اور مطابق ہزارہ گزیٹر کے پینتیس[۳۵] مجاہدین نے جام شہادت نوش کیا۔ ستھانہ کے دونوں حصے جلا دیئے گئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد اتمان زئیوں اور ضلع مردان کے جدون قوم نے ذمہ لیا کہ وہ مجاہدین کو پھر ستھانہ آباد نہ کرنے دیں گے۔ اس کے بعد مجاہدین مہابن کے شمالی حصہ میں ملکا میں جاگزیں ہو گئے۔

۱۸۶۳ء میں مجاہدین پھر ستھانہ آگئے اور اتمان زئی اور جدون قوم نے ان کی کوئی مزاحمت نہ کی۔ اس بناء پر ان ہر دو اقوام کی ناکہ بندی کی گئی۔ مجاہدین اور حسن زئی حملے کرتے رہے۔ اس کے نتیجے میں امبیلہ کی مشہور جنگ ہوئی۔ مجاہدین کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ ستھانہ اور ملکہ جلا دیئے گئے اور آئندہ کے لئے اقوام جدون، اتمان زئی، مداخیل اور امازئی نے مجاہدین کو پھر آباد نہ ہونے کی ضمانت دی۔

کالا ڈھاکہ کی دوسری مہم ۸ جولائی ۱۸۶۸ء میں اکازئی اچخر زئی اور سادات پریری نے

متفق ہو کر پولیس تھانہ اوگی پر حملہ کر دیا۔ اگرچہ ان کا حملہ دست بدست لڑائی سے پسپا کر دیا گیا۔ لیکن کافی لوٹ ہوئی اور وہ چار پولیس کے سپاہی ساتھ لے گئے۔ اس حملہ کے پس منظر میں خان اگرور کا ہاتھ تھا چونکہ ۱۸۶۷ء سے پہلے کے سرسری بندوبست میں اس کا حق ملکیت نہ مانا گیا تھا اور اوگی میں پولیس تھانہ ہونے کی وجہ سے اس کی حکومت کے رعب میں فرق آتا تھا۔ لہٰذا وہ سخت ناراض تھا۔ لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا اور خان کو گرفتار کر کے ایبٹ آباد لایا گیا۔

وادی اگرور میں چند روز بدامنی رہی لیکن انجام کار اس پر قابو پا لیا گیا۔ جبکہ ایک بھاری فوج سے ستمبر کے آخر میں ان اقوام پر حملہ کیا گیا۔ جس پر ان قوموں نے جلدی سے اطاعت قبول کر لی۔ ان اقوام پر معمولی تعزیری جرمانے اور تاوان مقرر کر دیا گیا جو انہوں نے ادا کر دیا۔ منشا صرف ان کے رعب کو زائل کرنا تھا۔ قتل و غارت مطلوب نہیں تھی۔

۹۔ دوسری مہم کالا ڈھاکہ کے بعد کے واقعات۔ گزشتہ مہم میں چونکہ نرمی برتی گئی تھی۔ اس لئے اس کا اثر خاطر خواہ نہ ہوا۔ جولائی ۱۸۶۹ء میں حسن زئیوں، پریری سادات اور اکازیوں نے اگرور کے دو چھوٹے مواضعات پر حملہ کر کے ان کو جلا دیا۔ گاؤں والوں کے چار آدمی مارے گئے اور سترہ زخمی ہوئے۔ اگست میں جبکوٹ پر حملہ ہوا۔ مقابلہ میں اس گاؤں کے چند آدمی اور ایک پولیس کا سپاہی قتل ہوئے۔ اس کے جواب میں ۷ اکتوبر کو ایک فوج زیر کمان کرنل راتھنی اگرور میں داخل ہوئی اور اکازیوں کا گاؤں شاہ توت جلا دیا گیا۔ اس کی سب زمین ضبط کر لی گئی اور حکم دیا گیا کہ اکازئی پھر اس گاؤں میں حکومت کی اجازت کے بغیر آباد نہیں ہو سکتے۔ آئندہ کے استحکام کے لئے اگرور میں فوج متعین کی گئی۔

اکتوبر ۱۸۷۰ء میں پھر کالا ڈھاکہ کی قبائل، اکازئی اور خان خیل حسن زئی نے پہاڑ کے دامن کے تین گاؤں بر چر، سنجل بھوت اور بھولو پر حملے کئے، گاؤں جلا دئے گئے اور کچھ آدمی بھی قتل کر دئے۔ سرکاری فوج ان حملوں کی روک تو نہ کر سکی۔ لیکن شاہ توت کے گرد و نواح کے فصلات کو برباد کر دیا گیا۔

خان اگرور کی واپسی اور بعد کے حالات ۱۸۷۰ء

کیپٹن ویس مہتمم بندوبست کی تفتیش پر خان اگرور بے گناہ ثابت ہوا۔ خان کو لاہور سے رہا کر دیا گیا اور وہ اپنے وطن واپس آ گیا۔ اس کے آنے سے علاقہ میں امن قائم ہو گیا۔ موسم خزاں کے آخر میں

فوج علاقہ اگرور سے واپس بلائی گئی۔ تھوڑی سی فوج اوگی میں باقی رکھی گئی۔

اکازئی کی ناراضی چونکہ موضع شہتوت کے آباد کرنے کی ان کو اجازت نہ دی گئی اور خان اگرور کی جائداد سے بھی ان کو کچھ نہ ملا۔ لہٰذا جون ۱۸۷۱ء میں انہوں نے کانگو، گل ڈھیری اور بھوبو پر حملہ کر کے ان تینوں گاؤں کو جلا دیا۔ اس کا بدلہ لینے کے لئے خان اگرور نے حکومت کی اجازت کے بغیر اپنے تین سو آدمی بھیج کر ان کا ایک گاؤں علی خان جلا دیا۔

۱۸۷۲ء، ۱۸۷۳ء میں اکازئی اور حسن زئی کبھی کبھی معمولی واردات کرتے رہے۔ جولائی ۱۸۷۳ء میں اکازئی اور چغرزئی نے موضع شہتوت کے نہ ملنے پر موضع برچر پر حملہ کیا۔ ۱۸۷۴ء میں اکازئی وارداتیں کرتے رہے۔ اور مئی ۱۸۷۵ء میں حسن زئی اور چغرزئی نے مل کر موضع گھانیاں پر حملہ کیا لیکن غلام حیدر خان پسر خان اگرور اور پولیس نے مل کر ان کو بھگا دیا۔

اکازئی اور حسن زئی کی اطاعت

مندرجہ بالا واقعات کی بناء پر ان اقوام پر فوج سے حملہ کرنا ناگزیر ہو گیا اور تجاویز سوچی جانے لگیں۔ اس اثناء میں ستمبر ۱۸۷۵ء میں اکازئی جرگہ ڈپٹی کمشنر ہزارہ کے پاس آیا اور اپنے گزشتہ کارناموں کی معافی مانگی اور مکمل اطاعت کا عہد کیا اور موضع شہتوت پر بھی اپنا دعویٰ ترک کر دیا۔ دسمبر ۱۸۷۵ء میں حسن زیوں کے جرگہ نے بھی آ کر انہی شرائط پر اطاعت قبول کر لی۔

عطا محمد خان، خانِ اگرور کی وفات ۱۸۷۵ء کے آخر میں عطا محمد خان فوت ہو گیا۔ اس کا نابالغ لڑکا علی گوہر خان، خان ہوا۔

عروج ہاشم علی خان حسن زئی کا خان

۱۸۷۵ء کے تصفیہ کے بعد چند سال تک حسن زئی اور اکازئی امن میں مخل نہ ہوئے۔ لیکن ۱۸۸۰ء میں ہاشم علی خان حسن زئی نے ایک واقعہ سے ناموری حاصل کر لی اور اس کے بعد وہ مصائب پیدا کرتا رہا۔ ۱۸۷۰ء میں حسن زئی کے خان احمد علی خان کو ایک دوسرے خان مسمی فیروز خان نے قتل کر دیا۔ احمد علی خان کے چھوٹے بھائی ہاشم علی خان نے مداخیل فیروز خان کو وطن سے بھاگ

جانے اور نواب امب کے علاقہ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔

مارچ ۱۸۰۲ء میں ہاشم علی خان نے سرکاری علاقہ میں داخل ہو کر اوگی کے نزدیک موضع کلگہ میں فیروز خان کے ماموں زاد بھائیوں منظفر خان اور سمندر خان کو اس بنا پر قتل کر دیا کہ اس کے بھائی کے قتل میں ان کا ہاتھ تھا۔ حکومت نے اس واقعہ پر ہاشم علی خان پر دو ہزار روپیہ جرمانہ کر دیا اور حسن زیوں کو مطلع کر دیا کہ یہ حسن زئی بہ حیثیت قوم اپنے خان کی حرکات کے ذمہ دار ہوں گے۔ جرمانہ ادا نہ کیا گیا لیکن حسن زئی کچھ عرصہ کے لئے خاموش رہے۔

خان اگرور، علی گوہر خان اور اس کے چچازاد عبداللہ خان ولد اللہ داد خان کی چپلقش

اللہ داد خان پنجاب کے الحاق سے پہلے عطا محمد خان اگرور کا بہ عمر صغر سنی سربراہ تھا۔ ان کے درمیان عداوت تھی۔ یہی عداوت ورثہ میں ان کے لڑکے کو ملی۔ ۱۸۰۲ء کے آخر میں علی گوہر خان نے ڈپٹی کمشنر ہزارہ کو درخواست دی کہ اگرور کے چھ گاؤں جو عبداللہ خان کے پاس پٹہ پر ہیں، لے لئے جائیں۔

اپریل ۱۸۰۴ء میں عبداللہ خان نے خلاف وعدہ اگرور سے نکل کر پریری سادات کے علاقہ میں چلا گیا۔ وہاں سادات پریری اکازئی اور چغرزئی کی امداد سے اگرور میں فسادات کرنے لگا اور بہت سے گاؤں پر یکے بعد دیگرے حملے کئے۔ اس بنا پر عبداللہ خان کا الاؤنس ۱۲۹۵ روپیہ جو سرکار نے دے رکھا تھا، ضبط کر لیا گیا۔ اس کو مفرور قرار دیا گیا اور پریری سادات، اکازئی اور چغرزئی کی ناکہ بندی کر دی گئی۔ اس کے بعد ان اقوام سے مختلف اوقات اور جگہوں پر تصادم ہوتا رہا۔ ۱۸۰۵ء کا سال خاموشی سے گزرا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ اقوام اب عبداللہ خان کی طرفداری میں ناکامی محسوس کرنے لگی تھیں۔ اکتوبر ۱۸۰۵ء میں پریری سادات اور چغرزئی نے اطاعت قبول کر لی اور جرگہ برائے معافی بھیجا۔ ان سادات پر چھ سو روپیہ اور چغرزئیوں پر آٹھ سو روپیہ جرمانہ کر دیا گیا اور ان کے جو آدمی بطور یرغمال راولپنڈی میں مارچ ۱۸۰۵ء سے زیر حراست تھے، چھوڑ دیئے گئے۔ آئندہ کے لئے ان دونوں قوموں نے چند آدمی بطور یرغمال دے دیئے جو ایبٹ آباد میں رکھے گئے۔

اکازئی مخالف ہی رہے اور ان کی ناکہ بندی ۱۸۸۶ء اور ۱۸۸۷ء میں بھی جاری رہی۔

اگرچہ سادات پریری، اور چغرزئی نے اطاعت قبول کر لی تھی، لیکن وہ درپردہ عبداللہ خان کی طرفداری کرتے رہے۔ جولائی ۱۸۸۷ء میں عبداللہ خان نے بمعہ اپنے بھائیوں اور چغرزئی افراد موضع باگڑیاں پر حملہ کیا۔ سخت مقابلہ ہوا۔ جانبین سے کچھ آدمی بھی مارے گئے۔ اگست ۱۸۸۷ء میں پریری سادات کے چغرزئی مزارعوں نے موضع گھانیاں کے ایک شخص کو قتل کر دیا۔ اس پر سادات کے یرغمال کو جیل میں ڈال دیا گیا۔

ان واقعات سے حکومت نے یہ اندازہ لگایا کہ نرم سلوک کا ان اقوام پر خاطر خواہ اثر نہیں ہوا اور وہ دلیر ہو گئے اور ان کو سخت سزا دینے کا وقت آگیا ہے۔ اس اثنا میں ہاشم علی خاں کے آدمیوں نے جنوری ۱۸۸۸ء میں اودے گرام اگرور کے ایک گاؤں پر حملہ کیا۔ دو آدمی قتل کر دئے اور دو کو ساتھ لے گئے۔ ان دو آدمیوں کی فوراً واپسی کا حکم دیا گیا۔ لیکن انہوں نے انکار کیا۔ اس پر حسن زیوں کو بحیثیت قوم یہ تنبیہ کی گئی کہ وہ سب اس کارروائی کے ذمہ دار ہیں۔ انہوں نے سختی سے جواب دیا۔ تفتیش سے پتہ چلا کہ اس میں خان اگرور اور اس کے کاردار فضل علی کا ہاتھ تھا۔ لہٰذا فضل علی کو گرفتار کر لیا گیا اور خان اگرور کو لاہور جلاوطن کر دیا گیا اور حکومت نے فیصلہ کیا کہ پریری سادات اور خان خیل حسن زیوں کے خلاف کارروائی کی جائے۔ لہٰذا اپریل میں پریری سادات اور حسن زئی کے خلاف ناکہ بندی کی گئی۔ ۱۸ / جون ۱۸۸۸ء کو دو انگریز افسران کے ماتحت تھوڑی سی فوج سرحد کی دیکھ بھال کے لئے بھیجی گئی۔ اقوام نے پہاڑ پر سے گولیاں چلائیں۔ جانبین سے چند آدمی مارے گئے اور دو افسر بھی مقتول ہوئے۔ تمام اقوام اور عبداللہ خان بھی بمعہ چند مجاہدین از میدان، نزد پلوسی، سے آکر جمع ہو گئے۔ حکومت نے مزید حملہ کرنا اس وقت مناسب نہ سمجھ کر فوج واپس کر لی۔

کالا ڈھاکہ کی تیسری مہم

مندرجہ بالا واقعات کے بدلے میں انگریزی حکومت نے مجاہدین میدان کو بھی ناکہ بندی میں شامل کر لیا اور خان اگرور کو جس کو لاہور سے مری میں تبدیل کر دیا تھا، گرفتار کر لیا اور ان اقوام

پر حملہ کا انتظام کیا جانے لگا۔ یکم اکتوبر ۱۸۶۸ء کو ایک مضبوط فوج اوگی اور دربند میں جمع کی گئی۔ ان اقوام سے مطالبہ کیا گیا کہ دو آدمی جن کو وہ پکڑ کر لے گئے تھے، واپس کریں۔ حسن زئی ترپن ہزار روپیہ جرمانہ دیں اور ہاشم علی خان کو حوالہ کریں۔ اکازئی چار ہزار روپیہ جرمانہ ادا کریں۔ سید اور چغرزئی پندرہ سو روپیہ جرمانہ دیں اور ٹیکری والے ایک ہزار روپیہ جرمانہ دیں اور سب اقوام بطور ضمانت اپنے چند افراد حوالہ کریں۔ یہ شرائط اقوام نے منظور نہ کیں اور ان سے چار طرف سے حملہ کر دیا گیا۔ سب کالا ڈھاکہ میں فوج پھیل گئی۔ بہت سے گاؤں جلا دئے گئے۔ مجاہدین کا گاؤں میدان بھی جلا دیا گیا۔ ان اقوام کا بہت سا گھاس اور غلہ تباہ کر دیا گیا۔ اس علاقہ میں صرف موضع کوٹکئی پر مجاہدین نے بڑی دلیری سے فوج پر حملہ کیا اور ان کے اٹھاسی آدمی شہید ہو گئے۔ ۱۹ر اکتوبر کو اکازیوں نے اطاعت قبول کر لی اور سب شرائط منظور کر لیں۔ ۲۰ر اکتوبر کو حسن زیوں نے بھی اطاعت قبول کر لی اور پچھتر ہزار روپیہ جرمانہ (اب یہ زیادہ کر دیا گیا تھا) ادا کر دیا۔

اس کے بعد فوج ٹیکری اور پریری کی طرف متوجہ ہوئی۔ ٹیکری والوں نے فوراً ایک ہزار روپیہ جرمانہ ادا کر دیا۔ لیکن پریری والے نہ آئے۔ لہٰذا ان کے گاؤں، گڑھی اور کدپرا جلا دئے گئے اس دفعہ فوج تھاکوٹ پر بھی پہنچی۔ ۱۸۶۸ء کی مہم میں یہاں فوج نہ پہنچی تھی۔

الائی اور اہلیان الائی کی دراز دستیاں

اگست ۱۸۶۸ء میں الائی والوں نے مسٹر سکاٹ کی پیمائش کرنے والی پارٹی پر جبکہ وہ بھوگڑ منگ کے درے میں کام کر رہے تھے، حملہ کیا۔ اس جرم کی پاداش میں الائی والوں پر پانچ سو روپیہ جرمانہ کیا گیا تھا، جو انہوں نے ادا نہ کیا۔

۱۸۷۴ء میں انہوں نے علاقہ سرکار میں کوہستانیوں پر حملہ کیا۔ اس کے جواب میں کچھ الائی وال گرفتار کر لئے گئے اور ان کے خلاف ناکہ بندی کی گئی۔ اس کے بعد ان کا ایک جرگہ پہلی دفعہ ڈپٹی کمشنر کے پاس آیا اور اطاعت قبول کی۔

۱۸۷۷ء میں انہوں نے بٹل پر حملہ کیا، لہٰذا پھر ان کی ناکہ بندی کی گئی، جو چند سال تک رہی ۱۸۸۰ء میں جن ہندوؤں کو وہ بٹل کے ڈاکہ میں لے گئے تھے انہیں واپس لائے اور ۱۸۸۱ء میں

انہوں نے ۵۰۰ روپیہ جرمانہ دے کر اپنے آدمی حکومت سے چھڑا لئے۔ لیکن باقی مطالبات انہوں نے پورے نہ کئے، جو یہ تھے۔

۱۔ بٹل پر ڈاکہ ڈالنے پر ۵۰۰۰/۔ روپیہ کا جرمانہ۔

۲۔ مسٹر سکاٹ پر حملہ کا ۵۰۰/۔ روپیہ جرمانہ۔

۳۔ اپنے خان ارسلہ خان کی حوالگی۔

اس کے بعد ایک دفعہ حملہ کر کے ارسلہ خان کے گاؤں پوکل کو جلا دیا گیا۔ ناکہ بندی اٹھا لی گئی۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد پریری سادات ۱۵۰۰/۔ روپیہ جرمانہ ادا کر دیا۔

کالا ڈھاکہ کی چوتھی مہم

اگرچہ گزشتہ مہمیں کامیاب رہیں لیکن اقوام کالا ڈھاکہ سے پھر جلد ہی تصادم ہو گیا۔ ان اقوام کے ساتھ شرط صلح میں یہ بات شامل تھی کہ وہ سرکاری افسران و فوج کے اگرور یا سرحد کالا ڈھاکہ پر جانے پر مداخلت نہ کریں گے۔ اس بناء پر حکومت نے مارچ ۱۸۹۰ء اگرور سے کالا ڈھاکہ تک سڑکیں بنانے کا انتظام کیا اور موسم خزاں میں سرحد کالا ڈھاکہ پر سے ایک دستہ فوج کے مشقی مارچ کا انتظام بھی کیا۔ اس کام کے لئے جب اکتوبر ۱۸۹۰ء میں ایبٹ آباد سے فوج اگرور میں جمع ہوئی تو ہاشم علی خان کے بھائی سکندر خان بمعہ کچھ اکازئی دخان خیل حسن زئی افراد کے ساتھ موضع برچار میں آکر کیمپ پر گولیاں چلائیں۔

دوسرے دن افواج واپس بلالی گئیں اور اقوام کالا ڈھاکہ کو مطلع کر دیا گیا۔ موسم بہار میں ان کو مناسب سزا دی جائے گی۔ مارچ ۱۸۹۱ء میں ایک فوج چھ ہزار کے قریب بمعہ اٹھارہ توپوں کے میجر جنرل الکس کے زیر کمان دربند میں جمع ہوئی۔ جب فوج نے حرکت کی تو ان اقوام نے کوئی مقابلہ نہ کیا۔ ہاشم علی خان بھاگ کر چغرزئی علاقہ نزد سرحد بنیر چلا گیا۔ فوج نے حسن زئی کے علاقہ سے گزر کر علاقہ اکازئی کو بھی پامال کیا۔ مقابلہ صرف سرحد چغرزئی پر بنیر والوں، جدونوں اور ہندوستانی مجاہدین نے کیا۔ مجاہدین نے سر توڑ مقابلہ کیا۔ لیکن آخر کار یہ سب منتشر ہو گئے۔

شرائط صلح حسن زئی اور اکازئی کے جرگہ نے مندرجہ ذیل شرائط مئی ۱۸۹۱ء میں قبول کریں۔

۱۔ اپنے علاقہ سے ہاشم علی خان کی دائمی جلاوطنی بمعہ اس کے رشتہ داران سکندر خان، شیخ عطا محمد اور طرہ باز خان۔

۲۔ ہندوستانی مجاہدین کو اپنے علاقہ میں آباد نہ ہونے دینا۔

۳۔ خان خیل کے چار ممنوعہ قبیلوں سے باہر سیری مقرر کرنا اور اس کی نیک چلنی کی ضمانت۔

سادات پریری اور مداخیل جرگہ نے بھی اسی قسم کی شرائط پر صلح کر لی۔

انتخاب ابراہیم خان، بطور خان سیری اقوام کا مواجب اور اقوام سے سرحدی پولیس کا بھرتی کرنا

معاہدہ کی رو سے ہاشم علی خان کے مخالف ابراہیم خان کو سیری کا خان منتخب کیا گیا۔ اس انتخاب میں نواب امب (اس کی لڑکی ابراہیم خان کو بیاہی ہوئی تھی)، نے امداد کی۔ اس کے انتخاب پر حکومت نے اس کو کافی رقم اور بندوقیں بطور تحفہ دیں اور دو ہزار روپیہ سالانہ مواجب مقرر کیا۔ اس کے علاوہ امن قائم رکھنے کی خاطر مسٹر فریڈرک کننگم ڈپٹی کمشنر کی تجویز پر چند اور خوانین (ملکوں)، کو بھی مواجب دئے گئے اور ان اقوام کے چند سپاہی بارڈر پولیس کیلئے بھرتی کئے گئے۔

مواجب حسب وار قوم۔

۱۔ حسن زیوں کے ملکوں کو : -/۱۷۰۰ روپے

۲۔ اکازئی " " " : -/۸۰۰ "

۳۔ مداخیل " " " : -/۱۰۰۰ "

۴۔ پریری وال " " " : -/۵۰۰ "

۵۔ دیشی، ٹیکری، اندہار " " : -/۱۰۰۰ "

میزان -/۵۰۰۰ روپے

ان انتظامات کے مکمل ہو جانے پر فوج واپس بلائی گئی۔

مہم عیسیٰ زئی ۱۸۹۲ء معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہاشم علی خان اپریل ۱۸۹۲ء دور چغرزئی کے علاقہ سے مداخیل اور حسن زئی کے مواضعات میں

آگیا۔ جون میں ملاخیل کی ناکہ بندی کر دی گئی اور عیسیٰ زئی کے تینوں خیل، حسن زئی، آمازئی اور ملاخیل کو نوٹس دیا گیا کہ وہ ہاشم علی خان کو لے آئیں۔ اگرچہ ہاشم علی خان اور اس کے رشتہ داروں کو تین سو روپیہ ماہوار گزارہ بھی دینا حکومت نے منظور کیا، لیکن وہ نہ آیا۔ اس واسطے ایک فوج چھ ہزار جوان، زیر کمان میجر جنرل لاک ہارٹ دربند میں جمع ہوئیں۔ فوج نے دربند سے اوپر جاکر دریائے سندھ کو عبور کیا اور موضع بائیو، جہاں ہاشم خان سکونت پذیر تھا، پر بڑھی۔ لیکن اس کو اور ملحقہ دیہات کو خالی پایا۔ ان دیہات کو جلاکر فوج واپس آگئی۔

۱۸۹۳ء سے ۱۹۰۵ء تک سرحد کا لاڑ ھاکہ پر امن رہی۔ اس کے بعد ہاشم علی نے آنے کی کوشش کی، لیکن اس دفعہ اس کا الاؤنس کم کر دیا گیا۔ یعنی ۱۵۰/- روپیہ اس کے لئے، ۵۰/- روپیہ اس کے بھائی سکندر خان اور ۵۰/- روپیہ اس کے چچا زاد طرہ باز خان کے لئے، بشرطیکہ راولپنڈی یا پشاور ضلع میں رہائش رکھے۔ یہ اس نے منظور نہ کیا اور اپنے علاقہ سے چغرزئی میں جلاوطن رہا۔

ابراہیم خان کا قتل اور سیری کا جلایا جانا

ابراہیم خان کمزور ثابت ہوا اور قوم پر اس کا کوئی اثر نہ رہا۔ ۰۷-۱۹۰۶ء میں سیری کے حالات خراب ہونے لگے۔ ۱۹۰۵ء میں ابراہیم خان نے اپنے چچا زاد عیسیٰ خان کو جو مدت سے اس کا مخالف تھا، مروا دیا تھا۔ اس پر عیسیٰ زئی قبائل اس سے منحرف ہو گئے۔ عرصہ تک اس قتل پر قوموں کے جرگے ہوتے رہے، لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ آخر کار قبائل نے اپریل ۱۹۰۶ء میں سیری پر حملہ کر کے، اس کو جلا دیا اور حکومت کو مطلع کر دیا کہ وہ ابراہیم خان کو اپنا خان نہیں مانتی ہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد اکازئیوں کی مدد سے، ابراہیم خان نے سیری پر پھر قبضہ کر لیا اور اس کو از سرِ نو تعمیر کرنے لگا۔

ستمبر ۱۹۰۶ء میں حسن زیوں نے سیری پر حملہ کر دیا اور وہ برج، جو ابراہیم خان نے بنایا تھا، پھر گرا دیا۔

۲۔ نومبر ۱۹۰۶ء کو سکندر خان اور طرہ باز خان، دونوں نے مسجد کے گرد، جس میں ابراہیم خان ٹھہرا ہوا تھا، گھیرا ڈال کر آگ لگا دی۔ ابراہیم خان نکل کر بھاگنے لگا کہ اس کو گولی مار دی گئی۔

اس کے بعد کافی عرصہ تک خان کا انتخاب بھی باعث گفتگو رہا۔ آخر کار حکومت نے مئی ۱۹۰۷ء میں ہاشم علی خان کے بڑے لڑکے شیر علی خان کو اس شرط پر خان مقرر کر لیا کہ وہ امن وامان کی ضمانت دے۔ خان اگور جلاوطن رہا اور اس کی سرحدات پر امن رہا۔

باب ہفتم

جاگیرداران و کُرسی نشینانِ ہزارہ

ضلع ہزارہ میں جاگیرداروں (خواہ قلیل جاگیر ہی کیوں نہ ہو) کی تعداد صوبہ سرحد کے دوسرے اضلاع سے بہت زیادہ ہے، جس کی وجوہات یہ ہیں۔

۱۔ مسلمانوں کی قدیم سلطنتوں از محمود غزنوی تا احمد شاہ درانی یہ ضلع افغانستان، پشاور، لاہور سے کشمیر جانے والی شاہراہ اور بہت دشوار گزار علاقہ ہے۔ اس ضلع کو مطیع کرنے اور امن و امان بحال کرنے کے لئے اس ضلع کے خوانین کو جاگیریں دے کر رام کرنا، فوج کشی کرنے سے آسان تر ہے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اس ضلع کو بحیثیت مجموعی کبھی بھی فوجی یلغار سے مغلوب نہیں کیا جا سکا۔ اس ضلع کے خوانین کو جاگیریں دے کر کے ہی، ان کو رام کیا جاتا رہا۔ اس راز کو پہلے انگریزی ڈپٹی کمشنر میجر ایبٹ نے ان جاگیروں کی عطائیگی کے سلسلہ میں اپنی مرکزی حکومت کو باخبر کیا۔

سلاطین ماضی نے کشمیر کے راستہ کو پر امن رکھنے کے لئے فراخ دلی سے جاگیریں دیں۔ یہ سلسلہ مغلیہ سلطنت سے تا عہد درانی مکمل طور پر جاری رہا۔ سکھوں نے بھی (اگرچہ وہ اصولِ جہانبانی سے نابلد تھے) اس پر عمل کیا۔

انگریزوں نے عہدِ ماضی کے سلاطین کی سب جاگیروں کو من و عن جاری کیا۔ میجر ایبٹ نے (پہلا ڈپٹی کمشنر ہزارہ انگریزی حکومت)، اس عطائیگی کی ضرورت پر خاص زور دیا اور جاگیروں کی منظوری لی۔ جس کی وضاحت اس کے خط مورخہ ۲۰ نومبر ۱۸۵۰ء (درج ذیل)، جو اس نے سیکرٹری بورڈ آف ایڈمنسٹریشن لاہور کو لکھا، سے ظاہر ہے۔ لہٰذا اس ضلع کے جاگیردارانِ عموماً سلاطین

مغلیہ کے وقت سے ہیں، سوائے ایک دو خاندانوں کے، جن کو انگریزوں نے خاص خدمات کے صلہ میں جاگیریں عطا کیں۔

یہ جاگیریں عطا کرتے ہوئے جو خط و کتابت ڈپٹی کمشنر ہزارہ میجر ایبٹ، چیف کمشنر کے سیکرٹری اور گورنمنٹ ہندوستان کے مابین ہوئی، اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے، جس سے اِن جاگیروں کے پس منظر پر روشنی پڑتی ہے۔

پہلا خط از طرف مسٹر پی مِلوِل (P. MELVIL) چیف کمشنر کے سکرٹری کا نمبر ۳۱۱ مورخہ ۱۲ مئی ۱۸۵۰ء لاہور ہے، جو اس نے مسٹر سی آلن (C. ALLEN) سکرٹری گورنمنٹ آف انڈیا فورٹ ولیم[۱] کو لکھا۔ چیف کمشنر جاگیروں کے جلدی فیصلہ کی درخواست کرتا ہے:

"ہزارہ پر قبضہ ہوئے بہت عرصہ ہو گیا ہے اور منظوری میں زیادہ دیر ہو جانے سے خطرہ ہے، کہ جو فائدہ ان جاگیروں کے عطا کرنے سے مدنظر تھا، وہ ضائع نہ ہو جائے وہ لوگ جنھوں نے گزشتہ جنگ ۴۹-۱۸۴۸ء میں وفاداری دکھلائی، وہ اپنے حقوق کی منظوری میں اتنی دیر لگ جانے سے حیران ہوں گے۔"

۲۔ چیف کمشنر ہزارہ کی گزشتہ تاریخ، اس کے پہاڑی اور جنگ جو ماحول، خوانین کی خصوصی خدمات اور ان کے رسوخ کے پس منظر میں جاگیریں دینے کی پالیسی کی تائید کرتا ہے۔ وہ خاص کر اس تجویز کی تائید کرتا ہے کہ ضروری نہیں کہ بڑا لڑکا ہی جاگیر کا وارث ہو۔ اس شرط سے قبیلہ یا قوم کا بہترین اور قابل شخص ہی نمائندہ چنا جا سکے گا۔

۳۔ چیف کمشنر کی رائے میں جو شرائط تبادلہ ۱۸۴۷ء سابق سکھ دربار اور مہاراجہ گلاب سنگھ کے درمیان ریزیڈنٹ کے ایماء پر طے ہوئی تھیں۔ ان سے کوئی ضمانت برائے پابندی شرائط اخذ نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ اس کے خیال میں ایسی ضمانت بطورِ اصول مان لینے سے مشکلات پیدا ہوں گی۔ تبادلہ کی شرط ہزارہ کے دو روپیہ کے اصل مالیہ کے عوض ایک روپیہ مالیہ میدانی علاقہ نزد سرحد مہاراجہ کے قرار پایا تھا۔ اصل مالیہ سے مراد وہ مالیہ ہے، جو تمام جاگیروں کے منہا کر دینے کے بعد ہوتا تھا لیکن مہاراجہ گلاب سنگھ نے اس شرط کا یہ مطلب نہیں لیا تھا کہ وہ ان سب جاگیروں کو، جو اس علاقہ میں تھیں، جو جموں سے

---

[۱] انگریزی سلطنتِ ہند کا پہلا دار الخلافہ کلکتہ ہی تھا، جہاں فورٹ ولیم ہے۔

ملحق کیا گیا تھا۔ضروری طور پر برقرار رکھے گا اور نہ ہی اس نے ایسا عمل کیا کہ جس سے یہ ثابت ہو کہ وہ بھی ان کی بحالی ضروری سمجھتا تھا۔

۴۔جہانداد خان کے متعلق خود مختار (INDEPENDENT) کے لفظ سے چیف کمشنر مطلب سمجھتا ہے کہ وہ دریائے سندھ کے اس طرف کے آبائی علاقہ پر اختیار رکھے گا اور وہ علاقہ جو اس کو مہاراجہ گلاب سنگھ نے بعوض ۵،۵۵۰/ روپیہ، جن کی تفصیل نقشہ نمبر ۲ میں دکھائی گئی ہے اور جو سرن دریا کے کنارے ہماری سابقہ چھاؤنی بھاروکوٹ کے نزدیک ہی ہے، بطور جاگیر محض ہے۔

۵۔اس سوال کا جواب بھی درکار ہے کہ یہ نئی جاگیریں، جن کی تفصیل نقشہ نمبر ۱ میں دکھائی گئی ہے، خواہ زمین کی شکل یا نقدی میں ہوں گی۔کس تاریخ سے شروع سمجھی جاویں۔چیف کمشنر کی رائے ہے کہ جن لوگوں کو یہ جاگیریں عملاً دی جا چکی ہیں، وہ تاریخ عمل سے نافذ سمجھی جاویں اور دوسری صورت، جس میں ابھی حکم نہیں ہوا۔ان کو اس فصل سے دی جاویں اور نقد پنشن یکم جنوری ۵۱ء سے ہزارہ کے خزانہ سے ادا کی جائے۔

میجر ایبٹ ڈپٹی کمشنر و سپرنٹنڈنٹ ہزارہ کا خط بنام پی۔ملول سیکرٹری بورڈ آف ایڈمنسٹریشن لاہور۔مورخہ ۳۰ نومبر ۱۸۵۰ء

"مجھے آپ کے خط معہ منسلکہ کاغذات کے ملا۔میری ان سفارشات کے بارے میں ہے جو میں نے بعض ہزارہ کے سرداروں (CHIEFS) اور ملکوں (MULLICKS) کی جاگیر کے متعلق کی تھی، کہ وہ غداروں کی ضبط شدہ جائدادوں سے دی جائیں اور ساتھ ہی مجھے معلے القاب گورنر جنرل صاحب کی ناراضی سے مطلع کیا گیا ہے، کہ میں نے ان غداروں کے نام، جو وقت کی ضرورت کی وجہ سے دشمنوں سے مل گئے تھے، بتانے سے کیوں ہچکچاہٹ کی۔"

جواب میں عرض ہے کہ میری ہچکچاہٹ کے یہ وجوہات تھے۔

اول: میں اپنی تفتیش کے نتیجہ سے خود ہی اتنا پر یقین نہ تھا کہ میں حتمی طور پر ان گروہوں کے نام لکھ سکتا، جنہوں نے واقعی غداری کی تھی۔دوم: مجھے یہ ڈر تھا کہ میں کہیں ایسے لوگوں کا

نام لکھ کر غلط اقدام نہ کروں اور ایسے اشخاص کی وفاداری پر شبہ کروں، جن کا سخت قصور یہی تھا کہ انہوں نے اس وقت ہتھیار ڈالے، جب مخالفت ناممکن تھی۔ ان امور کی وضاحت میرے پہلے خط سے ہوتی ہے۔ میری زندگی اور آزادی کے محافظ یہی ہزارہ کے لوگ ہیں۔ اور مجھے ان کی غداری کی رپورٹ کرتے ہوئے دکھ ہوا۔ میں نے اس خیال سے یہ رپورٹ کی کہ اس کی ضرورت اس واسطے تھی کہ میرے پہلے خطوط میں سے ایک میں مَیں نے غیر محتاط طور پر اس امر کا اظہار کر دیا تھا کہ حکومت کو لوگوں کی اصلی دماغی کیفیت کے متعلق مطلع کرنا، ایک اعزاز اور استحقاق ہے، جو کبھی بھی اظہار رنج کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔

۳۔ میری ناچیز خدمات جو میں نے گزشتہ جنگ کے اختتام کے نزدیک انجام دیں، ان پر جس کمال شفقت و مہربانی کے ساتھ معلی القاب جناب گورنر جنرل نے اعتراف فرمایا ہے وہ میرے لئے بہت ہی اعلیٰ اور مقدس انعام ہے، جس سے مجھے بہت سی امیدیں رکھنے کی ترغیب ہوگئی ہے کہ میری خدمات اور ہزارہ کے وفادار اور بہادر افراد کی قربانیاں آں عالی جناب کی نظر کے سامنے ہیں اور قبولیت سے سرفراز ہوئی ہیں حالانکہ میرے جیسے گمنام اور دور افتادہ نائب کی یہ خدمات اس عام ملکی ہنگامہ میں گم ہو جاتیں۔ اگر ان لوگوں کی جانبازی اور وفاداری حکومت کے ساتھ نہ ہوتی، یہ سب کارنامے اس واسطے ظہور پذیر ہوئے کہ حکومت نے مجھے حکومت کی ان جملہ عنایات کے لئے سربراہ بنایا، جو کہ ان لوگوں سے ہوئیں۔

۴۔ گورنمنٹ کی ان بے مثال عنایات و قدر افزائی نے ان لوگوں کو دیدہ و دانستہ اپنے عزیز ترین واسطوں کو بھی قربان کرنے پر آمادہ کیا اور ان کو اپنے محسنوں کے مستقبل سے ناامید ہونا ناممکن بنا دیا۔ (یعنی انگریزوں کی فتح پر حتمی یقین رکھتے تھے۔ ش ب) حالانکہ جنگ کے میدان (محاذ ملتان) سے بہت سی حوصلہ شکن خبریں آ رہی تھیں۔

۵۔ یہ فراخدلانہ جاگیریں، جن کے مفصل وجوہات اوپر دئیے گئے ہیں، میری ایماندارانہ رائے کے مطابق سرکاری آمدنی میں کمی کا باعث نہیں ہوں گے۔ آخرکار ان سے جو طمانیت اور قوت وفادار لوگوں کو حاصل ہوگی۔ اس سے پولیس اور فوج کی تعداد کم کرنے اور آمدنی میں زیادتی کا باعث ہوگی۔ گزشتہ ساڑھے تین سال میں ہزارہ کے اخراجات میرے

آنے کے وقت سے ¼ کم ہو گئے ہیں اور یہ جاگیروں کے ضبط کرنے سے نہیں ہوئے، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں نے جو فراخدلی سب دعویداروں سے روا رکھی ہے، اس کی وجہ سے جو اعتماد اور محبت کے جذبات ان لوگوں میں پیدا ہوئے وہی اس خرچ میں کمی کا باعث ہوں گے۔

۶۔ دوسرے اضلاع آمدنی کا باعث ہوں گے۔ لیکن ضلع ہزارہ کا سب سے بڑا مسئلہ ہمیشہ سے فوجی اخراجات کے کم کرنے کا رہا ہے۔ ان اخراجات کی کمی بتدریج اور مستقل طور پر جاری ہے کہ ہزارہ چند سالوں کے بعد اپنے سارے اخراجات کو برداشت کرے گا۔ جس رقم کی منظوری کی اب درخواست کی گئی ہے اور جو ۲۸ وفادار، بہادر اور بارسوخ افراد کو بطور انعام دی جائے گی، اس کے منظور ہو جانے کی صورت میں ایک سو ساٹھ پولیس کے سپاہی کم کر کے اس رقم کو پورا کیا جائے گا۔ ان افراد کی فہرست جن کے لئے جاگیروں کی سفارش کی گئی ہے حسب ہدایت درست کر کے بھیجی جا رہی ہے۔"

میجر جے۔ ایبٹ ڈپٹی کمشنر و سپرنٹنڈنٹ ہزارہ

بنام۔ پی میلول سکرٹری بورڈ آف ایڈمنسٹریشن۔ لاہور۔

مؤرخہ۔ یکم نومبر ۱۸۵۰ء

نظامت بورڈ کے ملاحظہ کے لئے پرانے جاگیرداروں کی فہرست پیش کرتے ہوئے ان حالات کا اعادہ کرتا ہوں، جن کے ماتحت یہ سب جاگیریں ۱۸۴۷ء میں ریذیڈنٹ لاہور کے حکم کے ماتحت مستقل کی گئی تھیں۔

۲۔ ہز ہائی نس مہاراجہ جموں ۱۸۴۶ء کے معاہدہ کے مطابق پنجاب کے پہاڑی علاقوں معہ ہزارہ کے مالک ہو گیا۔ لیکن جب یہ ظاہر ہو گیا کہ بغیر زیادہ خرچ اور سخت فوجی کارروائی کے لوگ مہاراجہ جموں کی اطاعت نہیں کریں گے تو سکھ دربار اور جموں کی حکومت کے درمیان تبادلہ کی تجویز ہوئی اور مجھے حکم ملا کہ اس تبادلہ سے پہلے میں ہزارہ کا بندوبست کروں اور ایک رپورٹ مرتب کروں۔

۳۔ ہزارہ کے لوگوں نے سکھ دربار کی اطاعت اس واسطے قبول کی کہ ان کو سرکار انگریزی

کی حمایت کا یقین تھا۔ دوسرے الفاظ میں ان کی اطاعت حکومت انگریزی کے اعتبار و عزت کی وجہ سے تھی۔ میرے آنے کے بعد انہوں نے حکومت کے ہر حکم کو انگریزی حکومت کا حکم سمجھا۔ ہمارا ان سے یہ کہنا کہ پنجاب میں ہماری موجودگی یا اثر عارضی ہے، بے معنی تھا۔ ان کا جذبہ و شوق جو ہمارے متعلق تھا وہ آئندہ واقعات کی صحیح پیشین گوئی تھی۔ ان کو یہ کہنا کہ حکومت و اختیار مہاراجہ دلیپ سنگھ کا ہے عبث تھا۔ ہماری موجودگی سے جو فوری فوائد اور آرام ان کو ملا، اس کی وجہ سے وہ اس بات کو باور کرنے پر تیار نہ تھے کہ یہ اسی حکومت کی طرف سے ہے، جن کے ہاتھ ان کی اجداد کے خون سے رنگین اور آلودہ ہیں اور جو ہمیشہ اور لگاتار تمام مخلص معاہدے توڑتی رہی ہے۔ اس مخلصانہ اور پرجوش اعتماد کا اظہار بعد میں اس آٹھ ماہ کے ابتلاء و آزمائش میں ہوا جبکہ ایسی افواہیں ہزارہ میں پھیلائی گئیں، جن سے تمام برطانوی طرفدار مایوس ہو جائیں اور جبکہ سکھوں اور درانیوں کی فوجیں نظر کے سامنے پڑاؤ ڈالے پڑی تھیں۔

۴۔ مجھے اس تنازعہ مابین سکھ دربار لاہور اور جموں حکومت میں بطور ثالث (ARBITER) اختیار دیا گیا تھا کہ میں پرانی جاگیروں اور انعام والی زمینوں کو بحال کر دوں اور ایک معقول ذریعہ معاش ان سرداروں (CHIEFS) اور ان کے لڑکوں کے لئے تجویز کروں، جن کو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے محروم کر دیا تھا۔

۵۔ قریباً تیس سال ہوتے ہیں کہ ہزارہ میں کوئی باقاعدہ حکومت نہ تھی۔ شاہان دہلی یا کابل جب اپنی فوجوں کے ساتھ میدان ہزارہ سے گزر کر کشمیر کو جاتے تو راستہ پر واقع دیہات سے معمولی سا خراج وصول کر کے ان خانان ہزارہ کو دے دیتے، جن کے علاقوں سے وہ گزرتے۔ یہ ایک قسم کی رشوت تھی جو وہ اپنی زرخیز جاگیر کشمیر کو جاتے ہوئے پر امن طور پر گزرنے کے لئے ادا کرتے تھے۔ لیکن پہاڑی علاقے آزاد تھے۔ ہر ایک چھوٹا سا خان (CHIEF) بھی اپنے علاقہ کا مختار کل اور زندگی اور موت کا مالک تھا اور جن علاقوں میں کوئی خان نہ تھا، وہاں پر قومی جرگہ کی حکومت تھی۔

۶۔ بہت سے علاقوں کے مالک پٹھان تھے۔ جن کی زمینوں کی کاشتکاری وہ خود نہیں

کرتے تھے - بلکہ اجارہ ½ حصہ پیداوار پر کاشت کراتے تھے اور اب زمینوں پر سرکار نے قبضہ کر لیا ہے - ہزاروں ایسے مالک اور قابض جنہوں نے یہ زمینیں بطور غلبہ یا خرید حاصل کیں، موجود ہیں - جن کو حکومت نے بے دخل کر دیا ہے - ان میں بعض بڑے جاگیردار تھے اور عموماً چھوٹے چھوٹے زمیندار تھے، جن کے پاس چند ایکڑ ہی آبائی زمین تھی -

۷ - اب مستقل حکومت کے انعقاد سے وہ سب لوگ جو طبقہ خوانین سے تعلق رکھتے تھے، مفلس اور گمنام ہو گئے ہیں - ان لوگوں نے کئی سال تک حملہ آوروں کا مقابلہ مردانگی سے کیا - لیکن سکھوں نے چالاکی سے ان میں تفرقہ ڈال رکھا تھا جس کی وجہ سے ان میں اختلاف تھا - سکھ چند لوگوں کو جاگیریں دے کر قوم کے خلاف ان کو استعمال کرتے تھے - اس سے سکھوں نے اپنے قدم مضبوط کر لئے تو بہت سے لوگوں کو دی ہوئی جاگیریں ضبط کر لیں اور بہتوں کو لوٹ لیا اور بعضوں کو قتل کر دیا - اگر لوگوں میں بغاوت کے آثار شروع ہوئے تو سکھوں نے پھر پرانے طریقے استعمال کئے اور پھر سے جاگیریں دیں - لیکن ان کا منشا بصرف موقع کی نزاکت کو ٹالنا ہی ہوتا تھا حالانکہ ان کی عطائیگی مضبوط عہد و پیمان کے ساتھ ہوتی تھی -

۸ - برطانیہ حکومت کا بندوبست اسی طرح کی ایک عام ملکی شورش کے وقت ہوا جبکہ جموں حکومت مثل سابق پالیسی کے جاگیروں کے معاملہ میں فراخ دل تھی - افسر بندوبست ان حالات سے جن کے ماتحت امن کو ان جاگیروں سے خریدا جا چکا تھا - باخبر تھا اور وہ ان کو حکومت کی تصدیق کے لئے ضروری خیال کرتا تھا، لہٰذا اس نے اپنے حاصل شدہ اختیارات استعمال کئے اور ان کو مستقل کر دیا - یہ جاگیریں چونکہ اس معاہدہ کا حصہ نہ تھیں اور اس تبادلہ سے ہزارہ پہلے ہی مستقل کر دی گئی تھیں - اس واسطے لاہور حکومت پر اس سے کوئی بار نہ پڑا -

۹ - بہت سی ایسی جاگیریں ملک کے رؤسا کو خاص امداد کے طور پر ہیں مثلاً جہانداد خان (نواب امب) کی جاگیر - اس جاگیر کی آمدنی ۱۰ ، ۵۰ روپیہ تھی اور سکھ حکومت کی فوج کا جو اس علاقہ کی حفاظت کے لئے رکھی جاتی تھی، بیس ہزار روپیہ سالانہ خرچ تھا - اب اس جاگیر کی منظوری سے وہ سب خرچ غیر ضروری ہو گیا ہے - اب لوگ برطانوی حکومت کے زیر سایہ محفوظ ہیں اور شمال کی جانب اس جاگیر کے بن جانے سے وہ نواب امب

کی لوٹ مار سے بھی محفوظ ہو گئے ہیں۔

اسی طرح سادات کاغان کی اٹھارہ سو روپیہ کی جاگیر کی وصولی پر بھی اتنا ہی خرچ آتا تھا اور اگر اس کی وصولی اسی طرح تھانہ کے ذمہ رہتی تو اس کے دور ہونے کی وجہ سے ہمیشہ فکر ہی لگا رہتا۔ یہی بات محمد امین خان گڑھی اور عطا محمد خان اگرور والے کی جاگیروں پر صادق آتی ہے۔ یہ جاگیریں خطرناک سرحدوں پر ہیں اور ان علاقوں کی حفاظت کے لئے بہت بڑے ذمہ دار جاگیروں کی ضرورت ہے، جن کا اثر و رسوخ ان علاقوں میں ہو یا تھانہ دار مع بہت سے سپاہیوں کے جن پر کافی خرچ ہو رکھے جائیں۔ پہلی صورت بہت کم خرچ والی اور میری رائے میں امن کے لئے زیادہ پسندیدہ ہے۔"

۲۰۱۔ کیمپ نواں شہر۔ مورخہ ۹ مئی ۱۸۵۰ء

میجر ایچ۔ بی۔ ایڈورڈ۔ سی۔ بی۔ ڈپٹی کمشنر ہزارہ، بنام پی میلول سیکرٹری چیف کمشنر لاہور

"میں آپ کے خط ۲۹۶ مورخہ ۹ اپریل ۱۸۵۰ء کی ہدایت کے مطابق نقشہ ۳، جس میں میجر ایبٹ نے ان بارسوخ لوگوں کی فہرست پیش کی تھی جو ۴۹-۱۸۴۸ء کی بغاوت میں بے دلی اور بے اختیارانہ شامل ہو گئے تھے، پھر سے تیار کر کے اور درست کر کے بھیج رہا ہوں۔

۲-۲، ۳-۱، ۴، ۵-۱، ۶-۱، ۷-۱، ۸-۱، ۹-۱، ۱۰-۱ (یہ سب پیراگراف انعام اور بنجوترہ کے حساب کے متعلق ہیں۔ ش ب)

۱۱۔ ان واقعات کے پیش نظر جو میجر ایبٹ نے تحریر کئے اور ان سب لوگوں کی مکمل معذوری (سوائے دھمتوڑیوں کے)، اور کافی عرصہ اس واقعہ پر گزرنے کی وجہ سے ان لوگوں کے حال پر جو اس فہرست میں درج ہیں۔ واقعاتی رو سے بھی رحم ہی کی نظر کی جاوے۔"

(فہرست میں عموماً تربیلہ کے لوگوں کے نام ہیں۔ ش ب)

اس خط کا مسودہ جو سابق بورڈ آف ایڈمنسٹریشن (مجلس نظامت) کے صدر نے۔ جولائی ۱۸۵۲ء میں بنام سیکرٹری گورنمنٹ آف انڈیا فورٹ ولیم لکھا تھا، حسب ذیل ہے۔

"دو جولائی ۱۸۵۰ء نے نقشہ جاگیرداران ہزارہ بورڈ کو واپس کرتے ہوئے لکھا تھا کہ معلی القاب گورنر جنرل، ان سفارشات کو منظور نہیں کرتے۔ ان سفارشات پر مزید روشنی چاہتے ہیں۔

یہ نقشہ جات حسب ہدایات پھر سے مزید غور اور نظر ثانی کر کے تیار کیے گئے ہیں۔ لیکن پھر بھی کافی روشنی بعض امورات پر نہیں پڑ سکی۔ حالانکہ یہ نقشے کئی دفعہ میجر ایبٹ اور دوسرے متعلقہ حلقوں کو واپس کیے گئے لیکن وہ بھی اس پر خاطر خواہ مزید روشنی نہ ڈال سکے۔ لہٰذا یہ پھر پیش کیے جاتے ہیں۔

۲۔ ہزارہ کے حالات مخصوص قسم کے ہیں۔ بلحاظ محل وقوع بھی اور بلحاظ ملکیت کے بھی۔ اس میں ہزاروں (جیسے کہ ضلع ہزارہ کے نام سے واضح ہے) رؤسا و خوانین ہیں۔ ضلع کا رقبہ تین ہزار مربع میل ہے، جس میں ۹/۱۰ حصہ پہاڑی ہے اور باقی تنگ وادیاں ہیں۔ جو خاص میدان ہزارہ سے چاروں طرف پہاڑوں کے اندر چلی گئی ہیں اور ہزارہ کا میدان بمشکل پچاس مربع میل ہوگا۔ پہاڑ سخت چٹانوں کے اور بہت خطرناک ہیں، جن میں تنگ اور بہت تھوڑے پیدل راستے ہیں۔ ان پہاڑوں میں جنگجو اور سخت طبع قبائل بستے ہیں۔ یہ قبائلی میدانی علاقوں کے لئے معمولی سپاہی ہیں۔ لیکن اپنے پہاڑی پناہ گاہوں میں زبردست مدمقابل ہیں۔

۳۔ یہ علاقہ کبھی بھی پورے طور سے فتح نہیں ہو سکا۔ یہاں تک کہ انہوں نے کبھی شاہانِ دہلی یا کابل کو کوئی خراج دیا اور نہ ہی حاکمانِ پنجاب ان کو کسی طرح سے تنگ کر سکے۔ بلکہ ان لوگوں نے ہمیشہ اپنی ہی شرائط منوائیں اور شاہراہ عام از لاہور تا پشاور کے دونوں طرف آباد ہونے کی وجہ سے ہمیشہ مالیہ کی بجائے بطور رشوت ہی کچھ وصول کرتے رہے۔

۴۔ سکھ ان کو تنگ کرتے رہے لیکن ان کو مطیع نہ کر سکے۔ بہت دفعہ قابل سکھ سرداروں کے ماتحت فوجوں کو ان مسلح زمینداروں نے شکست دی۔ اگرچہ ظلم و جور اور فریب سے سکھ اپنا قدم یہاں جمانے میں کچھ عرصہ کے لئے کامیاب ہو گئے اور اپنے چھوٹے بڑے قلعوں سے جو سو سے کم نہ تھے، انہوں نے دریائے سندھ کے کناروں اور ہر پہاڑ کی چوٹی کو آماجگاہ بنا لیا۔ اور اس طرح گو یہ ملک عارضی طور پر مطیع کر لیا گیا لیکن اس فوجی خرچ نے سب آمدنی کو ہضم کر لیا اور اس پر بھی ہزارہ کا مسلمان باشندہ بغاوت کے لئے ہر موقع کی تاک میں رہتا تھا اور یہ موقع ان کو ستلج کی جنگ نے مہیا کر دیا اور سب قلعے ان مسلح زمینداروں نے

اپنے خوانین کے زیرِ علم سکھوں سے چھین لئے اور یہاں تک کہ اس ضلع کے دار الخلافہ ہری پور کا قلعہ بھی انہوں نے مار لیا اور مہاراج حکومت سکھ کے گورنر کو ملک سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔

۵۔ میدانی اور پہاڑی علاقہ کی تقسیم بموجب معاہدہ قصور، ہزارہ کا علاقہ مہاراجہ گلاب سنگھ کو دیا گیا۔ لیکن یہ جلدی ہی معلوم ہو گیا کہ وہ اس پر قابض رہ کر امن قائم نہیں رکھ سکتا اور وہ سکھوں کی طرز پر فتح و شکست میں، کبھی کسی قبیلہ یا اس کے لیڈر کو قتل کرے گا۔ جس کے بدلے میں اس کی فوج قتل کی جائے گی اور اس طرح سے سب سرحد پر شورش پیدا ہو جائے گی اور اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے ۴۷، ۱۸۴۶ء میں ریذیڈنٹ نے گورنمنٹ کی منظوری سے سکھ دربار اور مہاراجہ گلاب سنگھ کے سامنے علاقہ تبدیل کرنے کی تجویز پیش کی۔ دونوں طرف کی بہت حیص بیص کے بعد یہ تجویز اس شرط پر منظور کر لی گئی کہ پہلے ہزارہ کا منصفانہ بندوبست کر لیا جائے اور ہزارہ میں تمام جاگیریں اور انعام مہیا کرنے کے بعد جو آمدنی ہو اس کے نصف کے حساب سے مہاراجہ گلاب سنگھ کو دوسری طرف علاقہ دیا جائے۔

۶۔ یہ حالات تھے، جن کی بناء پر انگریزی حکام نے جاگیرداروں کے حقوق کی ضمانت اس فیصلہ کی بناء پر تھی، جو میجر ایبٹ نے مقرر کیا تھا۔ میجر ایبٹ کو اس وقت سرحد کی حد بندی کے بعد اس مشکل کام پر لگایا گیا تھا، تاکہ وہ ہزارہ کا بوجھ ہلکا کرے اور ظلم اور لوٹ کی جگہ عدل و صلح سے امن قائم کرے۔

۷۔ یہ سکیم فوراً کامیاب ہوئی اور اس وقت سے آج تک کامیاب ہے۔ بہت سے سردار و خوانین نے جو اگرچہ چھوٹے درجہ کے ہیں، لیکن مغرور ہیں۔ پہلی دفعہ یہ محسوس کیا کہ ان کی اطاعت کے بعد لوٹ مار نہیں ہوئی اور میجر ایبٹ کے زیرِ سایہ ان کے حقوق اور جذبات محفوظ ہیں۔ اسی واسطے وہ متحدہ طور پر سکھ فوج کی بغاوت کے دوران میجر ایبٹ کے ساتھ رہے اور نہ صرف اسی وقت جبکہ لاہور سے نامہ و پیام کٹ چکا تھا، بلکہ اس وقت بھی جبکہ دوست محمد خان بھی جنگ میں شامل ہو گیا تھا، ان میں سے بہتوں نے میجر ایبٹ کا ساتھ صدق دلانہ طور پر دیا حالانکہ ان کی زمینوں پر دشمن نے قبضہ کر لیا تھا اور ان کی عزیز ترین متاع تک بھی خطرہ میں تھی۔

۸۔ اگر اس پر بھی بورڈ کی سفارشیں بہت فراخدلانہ معلوم ہوں تو ان کی درخواست ہے کہ معلی القاب جناب گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل ان پر یہ باور کرنے کی مہربانی کریں گے کہ یہ تمام سفارشات ملک کے حالات ماضی وحال پر مکمل غور کرنے کے بعد اور مکمل یقین کے ساتھ اس واسطے کی گئی ہیں کہ یہ طریقہ نظم ونسق بہت ارزاں اور بہت مفید ہے۔ گورنر جنرل کو معلوم ہے کہ بورڈ کی سفارشات کسی طرح بھی میجر ایبٹ کی سب سفارشات سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ لیکن وہ اس حقیقت سے اغماض نہیں کر سکتے کہ ہزارہ جس کے اندر اور باہر ارد گرد سامان بدامنی موجود ہیں، مدت سے امن سے محروم رہا ہے۔

۹۔ بورڈ نے نہ صرف سابق سکھ افسران اور سابق سکھ حاکمان ہزارہ مثلاً راجہ تیج سنگھ، رائے مول سنگھ، دیوان مولراج وغیرہ جنہوں نے ہزارہ میں حکومت کی، بلکہ مسٹر کارٹ لینڈ اور میجر چیمبرلین سے جو اس ملک سے خاص طور سے واقف ہیں، مشورہ کیا ہے۔ ان سب کی متفقہ رائے ہے کہ دس بارہ ہزار روپیہ سالانہ جاگیریں (جب پہلی جاگیریں خالی ہوتی جائیں) ان لوگوں کو دینا، جو صاحب رسوخ ہوں، ملک کے امن کے لئے فوجوں کے رکھنے سے بہت بہتر ہیں۔ میجر ایبٹ نے لکھا ہے کہ وہ سب رقم جتنی کہ اس نے نئی جاگیروں کی ایزادی میں خوانین اور ان کے پیروؤں کو عطا کی ہیں، جنہوں نے دوران جنگ میں کمال وفاداری سے اس کی خدمت کی ہے، صرف ۱۰۰ سپاہیوں کی تنخواہ کے برابر ہے۔ بورڈ کی رائے میں یہ سب رقم ایک پیدل فوج کی کمپنی کی تنخواہ ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک شخص کی ناراضی یا بے اطمینانی خواہ وہ کتنے ہی چھوٹے گاؤں کا نمبردار ہی کیوں نہ ہو بغاوت کی آگ کا ایک ایسا شعلہ بھڑکا سکتا ہے، جس کو فرو کرنے کے لئے رجمنٹوں کی ضرورت ہوگی اور جو خرچ اس طرح سے ہوگا وہ کئی گنا اس تجویز شدہ خرچ سے زیادہ ہوگا۔

۱۰۔ جناب معلی القاب گورنر جنرل با جلاس کو شرائط طے شدہ کے ملاحظہ سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ دوامی جاگیریں خاص طور پر حکومت کی خدمت بوقت ضرورت کرنے کے لئے ہیں۔ اور نیز یہ کہ ہر جاگیردار کی وفات کے بعد حکومت کو اس کے جانشین کا اختیار ہوگا اور اس طرح سے کوئی نااہل، فاتر العقل یا ناپسندیدہ شخص جاگیردار نہیں بن سکے گا۔ اس طرح کی

غیر یقینی مشرق کے رہنے والوں کے مزاج کے عموماً موافق ہے۔ اس طرح کی شرط سے ان کو یقین ہو جاتا ہے کہ ان کے خاندان کا نام باقی رہے گا اور اگر ان کے اولاد نے کوئی خاص نافرمانی نہ کی تو ان کے ذریعہ معاش ملتا رہے گا اور اگر قابل انسان بھی خاندان میں ہوا، تو اس کو یہ اعزاز ملتا رہے گا۔ بورڈ یہ سمجھتا ہے کہ اس شرط کی وجہ سے خاندان کے افراد کو خانی حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کے خلاف ریشہ دوانی کرنے کا موقع ملے گا۔ تاہم ان کی آپس میں ریشہ دوانی اس سے بہتر ہے کہ حکومت کے خلاف ریشہ دوانی کریں۔ جیسا کہ حال میں ان کی سفارش برائے خانی علاقہ یوسف زئی میں واقعہ ہوا۔ بہرحال بورڈ بڑے لڑکے کے حقوق جانشینی ہی کی حمایت کرے گا۔ بشرطیکہ وہ اور لحاظ سے اس کے قابل ہوگا۔ بورڈ اس جانشینی کے لئے خان کے لڑکوں یا بھتیجوں میں سے قابل ترین شخص کی تلاش نہیں کریگا۔ بلکہ بڑے لڑکے کو وراثت سے صرف اس حال میں محروم کرے گا جبکہ وہ یقینی طور پر نااہل یا گورنمنٹ کا غدار ہو گا۔

۱۱۔ میجر ایبٹ نے جہانداد خان (نواب امب) کی جدی جائداد کو آزاد علاقہ سمجھتے ہوئے شامل نہیں کیا۔ بورڈ اس کی اس رائے کو صحیح نہیں سمجھتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ بورڈ جہانداد خان کے متعلق موجودہ طریقہ کو فوراً بدلنا چاہتا ہے یا اس کو سکھوں کے وقت کے رتبہ اعزاز سے کم کرنا چاہتا ہے۔ لیکن بورڈ اس بات کو نہیں سمجھ سکتا کہ اس کو کیوں خود مختار سمجھا جائے۔ اس واسطے بورڈ جہانداد خان کے علاقہ کے متعلق میجر ایبٹ کی رپورٹ مورخہ ۱۵ جون ۱۸۵۷ء کو ساتھ شامل کر کے بھیج رہا ہے اور اس رپورٹ سے اختلاف کرتا ہے۔ بورڈ کی رائے ہے کہ جہانداد خان کو یہ بات ذہن نشین کرا دی جائے کہ وہ اپنی اس جائداد کے عوض جو دریائے سندھ کے بائیں طرف ہے وہ سرکار انگریزی کا مکمل طور پر مطیع ہے اور سرکاری فوجی خدمت کے لئے پابند ہے۔"

نوٹ: خدمت سے مطلب فوجی خدمت ہے جو جاگیردار اور اس کے لواحقین و پیروؤں کو بوقتِ ضرورت کرنی ہوگی۔

دوامی جاگیر مکمل طور پر جاگیردار کی اولاد میں سے کسی کو یا جو کوئی بھی اس قوم کا خان ہوگا اس کو

ے گی۔ لیکن یہ صاف طور پر ذہن نشین کرایا جاوے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ خان کا وارث ضرور ہی اس کا لڑکا ہوگا۔ اگر اس کا بڑا لڑکا یا نزدیکی جانشین ناقابل اور نااہل بلحاظ اخلاق، رسوخ اور انتظامی قابلیت یا حکومت انگریزی کا جس کی طرف سے اس کو جاگیر عطا ہوئی ہے، تو غدار ہوگا تو یہ صورت برقرار نہ رکھی جائے گی۔

جاگیریں۔ اضافہ ایزادی ۱۸۵۳ء

۱۔ میر زمان خان۔ چیف آف ناڑہ وکھلابٹ ولد سعداللہ خان۔ پرانی جاگیر مانکرائے۔ نئی جاگیر کاگ اور لصبیرہ۔

موجودہ جاگیر بہ حساب روپیہ کمپنی ۔/۴۴۶ روپیہ

سفارش ایزادی از میجر ایبٹ ۔/۱۵۵۴ روپیہ

میزان کل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔/۲۰۰۰ روپیہ

اولین تاریخ عطائیگی ۱۸۲۵ء۔ جب اس نے طویل اور باہمت مقابلہ کے بعد سکھوں کی اطاعت قبول کی۔ یہ جاگیر ۱۸۲۵ء میں سردار ہری سنگھ نے دی اور اس کی تجدید مہاراجہ گلاب سنگھ نے کی خلاصہ سندات قدیم۔ پرانی سندات گزشتہ جنگ کے دوران میں دریائے سندھ میں ضائع ہوگئیں۔ یہ سندات بہت سے دیہات میں انعام کے متعلق تھیں اور یہ میں میجر ایبٹ، نے بحیثیت انگریزی ثالث کے یکجا بندو لبست ہزارہ ۱۸۴۷ء میں جمع کی تھیں۔

یہ ایزادیِ جاگیر میر زمان خان کے کیریکٹر، مقامی رسوخ اور گزشتہ جنگ کی خدمات وغیرہ کے سلسلہ میں کی گئی۔

میر زمان خان ہزارہ کے رؤسا میں سے پہلا رئیس تھا، جس نے سرکار انگریزی کی جنگ ستلج کی فتح کے بعد جبکہ ہزارہ نے سکھوں سے آزادی حاصل کر لی تھی، سرکار انگریزی کی اطاعت قبول کی۔ اس وقت اس نے ناڑہ کے مقام پر سکھ فوجوں کو دو دفعہ شکست دی تھی۔ اس کی اطاعت نے ہزارہ کے بڑے قلعہ یعنی گندگر کی چابی انگریزی حکومت کے ہاتھ میں دے دی۔ جب چتر سنگھ کی بغاوت نے زور پکڑا تو ہزارہ میں موجود انگریز افسران نے ناڑہ کے مقام پر اپنا کیمپ بنایا۔ کیونکہ اس مقام پر ہی سکھوں کو

بڑی شکست ہوئی تھی اور دوسری زیادہ وجہ یہ تھی کہ میر زمان خان اور اس کے خاندان کی وفاداری اور شجاعت پر مکمل اعتماد تھا۔ مکمل سات ماہ تک، جبکہ بہت مایوس کن اطلاعیں آ رہی تھیں۔ اس کی وفاداری و شجاعت کی آزمائش پوری طرح ہوئی جبکہ سکھوں اور درانیوں کی فوجیں نظر کے سامنے کیمپ لگائے پڑی تھیں۔ مزید یہ کہ چیتر سنگھ اور دوست محمد خان کی طرف سے بہت فراخدلانہ انعام و جاگیر کی پیشکش دی جاتی رہی۔ بایں ہمہ میر زمان خان کی شجاعت و وفاداری اسی طرح اپنی جگہ پر قائم رہی اور جب اس کو حملہ کرنے کا حکم دیا گیا تو وہ برہنہ شمشیر بدست کشن گڑھ کے قلعہ (ہری پور) پر حملہ آور ہوا اور ایک ہزار سکھ فوج کے سپاہیوں کو جو قلعہ سے باہر آ ہی گئی تھی، بہت کشت و خون کے بعد پسپا کر دیا۔

ہزارہ میں اس کا مقام رہائش ہزارہ کے سب مقامات سے بہت اہم ہے، جس سے سکھوں اور درانیوں کی فوجیں ٹکرا کر پاش پاش ہو گئیں۔ گزشتہ جنگ کے تمام عرصہ میں انگریز افسر اس کے مہمان رہے۔

۲۔ قلندر خان ولد عبداللہ خان پسران سعداللہ خان برادران میر زمان خان، وفاداری اور شجاعت میں میر زمان کے ساتھ پیوستہ رہے اور بہترین خدمات ادا کیں۔ دونوں کو ۱۰۸۵ روپیہ و ۱۰۰۱ روپیہ ذاتی و دوامی جاگیر کے طور پر دی گئی۔

پرانے جاگیرداروں کی فہرست

۱۔ فتح خان ٹوانہ۔ جاگیردار ہزارہ۔ سکھوں کے عہد میں

تاریخ ہزارہ میں جاگیرداروں کی فہرست میں ملک فتح خان ٹوانہ کا ذکر نہیں۔ یہ فہرست ۱۸۷۲ء کے جاگیرداروں کی جو بندوبست ۱۸۷۲ء میں تیار ہوئی اور میجر ایبٹ کی رپورٹ ۱۸۵۰ء پر مبنی ہے اور فتح خان ستمبر ۱۸۴۸ء میں قتل ہو چکا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ضلع ہزارہ کی تحصیل ہری پور اور چھچھ کا جاگیردار ۱۸۳۶-۳۷ء تا ستمبر ۱۸۴۸ء رہا۔ جیسا کہ اس کی سوانح زندگی سے ظاہر ہے۔ جو صفحات مابعد میں درج کئے جا رہے ہیں۔ چونکہ وہ ایک نامور تاریخی شخصیت گزری اور اس کا ہزارہ کے ساتھ تعلق بھی رہا ہے، لہٰذا اس کے حالات زندگی درج کئے جا رہے ہیں۔

سوانح فتح خان ٹوانہ

جب رنجیت سنگھ نے منکیرہ کا قلعہ ۱۸۲۱ء میں نواب سے لے لیا اور مٹھا ٹوانہ کا علاقہ بھی فتح کر لیا تو اس نے دونوں بھائیوں فتح خان و خدا بخش اور ان کے والد کو مع ۵۰، ۶۰ سوار از قبیلہ خود، لاہور آنے کی دعوت دی۔ کیونکہ انہوں نے منکیرہ اور مٹھا ٹوانہ کی فتح کے سلسلہ میں اس کی مدد کی تھی۔

ان کے لاہور پہنچنے پر دھیان سنگھ وزیر اعظم ان کو ہمیشہ مہاراجہ کے سامنے، ان کو گھوڑوں اور ہتھیاروں کے کرتب دکھانے کے لئے پیش کرتا رہتا تھا، جو ان کے نیزہ بازی کے کرتب سے خاص طور پر بہت خوش ہوتا تھا۔ اس لئے مہاراجہ نے ان کو اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ ان کو اپنے علاقہ میں چھ ہزار روپیہ کی جاگیر عطا کر دی اور ان کے ۵۰، ۶۰ سواروں کو تین سو روپیہ سالانہ پر نوکر رکھ لیا۔

خدا بخش کو سواروں کے رسالہ کا کمان افسر اور ان کے باپ کو اپنے ساتھ چابک سوار رکھ لیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ، ان کے کمال ہنر و چابکدستی سے بہت خوش تھا۔

فتح خان تو راجہ دھیان سنگھ کے وزیر کا معتمد اور دست راست بن گیا۔ اس خاندان کا اثر و رسوخ لاہور میں بہت بڑھ گیا۔ ان کا باپ ۱۸۳۲ء میں مر گیا۔ اس کی وفات پر راجہ دھیان سنگھ کی سفارش سے فتح خان اور اس کے بھائی کی جاگیر میں اضافہ کر دیا گیا اور یہ ۱۲ سے ۱۵ ہزار تک ہو گئی۔ ضلع ہزارہ میں ایک علاقہ جس کی آمدنی ۲۰ سے ۳۰ ہزار تھی، ان کو اجارہ پر دیا گیا۔

سردار ہری سنگھ، اس خاندان کا سخت دشمن تھا اور اب تک وہی ان کی ترقی میں ایک سخت رکاوٹ بنا ہوا تھا، کیونکہ ہزارہ کا علاقہ اس کی جاگیر میں تھا اور یہ ٹوانے اس کی موجودگی میں ترقی نہ کر سکتے تھے۔ سردار ہری سنگھ کے قتل (۱۸۳۷ء) کے بعد جلد ہی ان کو دھیان سنگھ کی سفارش پر مزید بہت سا علاقہ ضلع ہزارہ میں مل گیا۔ اس ضلع کی آمدنی ایک لاکھ روپیہ سالانہ تھی۔

دربار لاہور میں بھی، دھیان سنگھ کی وجہ سے ان کے مرتبہ و رسوخ میں کافی اضافہ ہو گیا۔ دھیان سنگھ کی موت تک فتح خان اور اس کا لڑکا ۱۴-۱۵ سال کی عمر تک اس کے پاس رہے۔

بحوالہ۔ سکھوں کا حکمران خاندان لاہور۔ صفحہ ۲۲۷ - ۲۲۹

فتح خان بھی دھیان سنگھ کے قتل کے دن تک اس کے ساتھ تھا لیکن یہ جان کر کہ دھیان سنگھ کا وقت ختم ہو رہا ہے، اس کی ہمراہی سے ذرا پیچھے ہٹ کر رہ گیا اور جب یہ قلعہ کے نزدیک پہنچا تو دروازہ بند ہو چکا تھا۔

دھیان سنگھ اندر ہو گیا اور یہ باہر رہ گیا۔ وہاں سے آکر یہ شہر میں چھپ گیا۔ یہ اس وقت ظاہر ہوا جب سندھیانوالے ختم کئے جا چکے تھے (یہ سندھیانوالوں سے ڈرتا تھا)۔ اس کا لڑکا بھی دھیان سنگھ کے ساتھ تھا، جس کو قلعہ میں داخل ہوتے وقت دھیان سنگھ نے واپس بھیجا کہ اس کی حویلی سے تین، چار سو مسلح سپاہی امداد کے لئے لے آئے۔ لیکن جب وہ سپاہیوں کے ساتھ آیا، تو قلعہ کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔

جب شور ختم ہو گیا اور ہیرا سنگھ اور پنڈت جھلّا کا دور شروع ہو گیا، تو فتح خان ظاہر ہوا اس نے محسوس کیا کہ نیا وزیر (ہیرا سنگھ)، اور اس کا صلاح کار (پنڈت جلا)، اس کے خلاف ہیں۔ انہوں نے اس پر دھیان سنگھ کے قتل کے سلسلے میں، بیوفائی اور غداری کا الزام لگایا۔ اس کو اپنے برے انجام کا احساس ہونے لگا۔ ساتھ ہی ہیرا سنگھ اور پنڈت جھلا نے ہزارہ کے اس علاقہ کا جو اس کے خاندان کے پاس اجارہ تھا، اجارہ میں ایک لاکھ روپیہ کا مطالبہ کیا اور ان تیس ہزار اونٹوں کا جو دھیان سنگھ نے اس کے زیر کمان دے رکھے تھے، کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ ان مطالبات کی ادائیگی ہو نہ سکتی تھی، للذا فتح خان رات کے وقت بھیس بدل کر لاہور سے بھاگ کر اپنے گاؤں (مٹھاٹوانہ) چلا گیا۔ اس کی گرفتاری کے لئے جلدی سے فوج بھیجی گئی۔ لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ بہت سی منقولہ اشیاء لیکر دریا کے پار چلا گیا۔ فوج نامراد واپس آگئی۔

فوج کی واپسی کے بعد راجہ ہیرا سنگھ وزیر اعظم لاہور دربار سے ساون خان (یا سوہنا خان) وزیر کو کہلا بھیجا کہ اگر وہ فتح خان ٹوانہ کو، جو اس کے ملک میں پناہ گزین ہے۔ گرفتار کر کے بھیج دے، تو اس کو تین سو پونڈ انعام دیا جائے گا۔ مگر ملک ساون خان نے اس پیغام کو غصہ سے رد کر دیا۔

(بحوالہ کتاب "سرحد پنجاب پر ایک سال۔ ایڈورڈ)

نوٹ: فتح خان ٹوانہ نے بحکم مہاراجہ شیر سنگھ ۱۸۴۲ء میں لکی مروت کا قلعہ بنوایا تھا۔ یہ بہت بہادر اور ہمت والا آدمی تھا۔

فتح خان پھر اپنے علاقہ میں آگیا۔ اور ملکیہ فوج کے ساتھ ادھر ادھر کے علاقہ میں لوٹ مار شروع کر دی۔ سکھوں کی جو فوج اس کے خلاف بھیجی جاتی، اس سے مقابلہ کرنے سے گریز کرتا رہا۔ اس نے یہ رویہ ہیرا سنگھ اور پنڈت جھلا کے زمانہ میں جاری رکھا۔

ان کی موت (۲۱ دسمبر ۱۸۴۴ء) کے بعد وہ فوراً لاہور آگیا، کیونکہ اس کو جواہر سنگھ (جو اب برسر اقتدار آگیا تھا) سے اچھے سلوک کی توقع تھی۔ فتح خان کے پیش ہوتے ہی جواہر سنگھ نے اس کو ایک بیش قیمت خلعت اور زائد جاگیر بقدر دس، گیارہ لاکھ، ہزارہ میں بمعہ ڈیرہ اسمعیل خان، کلاچی، بنوں، ٹانک اور مٹھا ٹوانہ بمعہ اس کے ملحقات کے عطا کر دی اور اس کے بیٹے کو جو ابھی نوجوان العمر تھا، توپ خانہ کا بہ عہدہ جنرل، بارہ ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پر مقرر کر دیا۔

انہی دنوں پنجاب میں ہیضہ کی بیماری کا زور تھا، جس میں فتح خان کا بھائی خدا بخش مٹھا ٹوانہ میں ہیضہ سے مر گیا۔ اس کی وفات کے بعد جلد ہی جواہر سنگھ نے فتح خان اور چتر سنگھ اٹاری والا (ناظم ہزارہ) سے اٹک کے قلعہ میں کنور پشاورا سنگھ کو قتل کرا دیا۔ قتل کرنے کے بعد فتح خان، خالصہ فوج (جو کہ پشاورا سنگھ کی طرفدار، بوجہ اس کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کا بیٹا ہونے سے، کے غصہ و انتقام سے بچنے کے لئے ڈیرہ اسمعیل خان اور بنوں ٹانک کی طرف چلا گیا اور (جواہر سنگھ دیوا اور رانی جنداں) کو خالصہ فوج نے اس جرم کے بدلہ میں قتل کر دیا۔

اس کے بعد فتح خان نے ڈیرہ اسمعیل خان بنوں، ٹانک کے ان چیدہ لوگوں کو جو اس کے خلاف تھے، دعوت میں بلا کر دھوکہ سے قتل کرا دیا۔ جب مقتولین کے ورثا نے انتقام لینے کے لئے اس پر حملہ کر دیا، تو جان بچا کر مٹھا ٹوانہ چلا گیا۔

یہاں آکر اس کو معلوم ہوا، کہ اس کا یہ فعل دربارِ لاہور میں باغی اور غدار کا سمجھا گیا۔

اسی کتاب کے ص ۱۵۴ پر تحریر ہے

"سردار چتر سنگھ ناظم ہزارہ اور فتح خان ٹوانہ نے دھوکا سے پشاورا سنگھ کو حسن ابدال میں گرفتار کر کے بیڑیاں ڈال کر اٹک کے قلعہ میں لے گئے اور رات کے وقت ان دونوں نے اس کو گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا۔"

اس کو دربار کی کمزوری کا علم تھا کہ وہاں چالاکی اور روپیہ سب کام کر سکتا ہے۔ اس نے

دربار کی اطاعت کا اعلان اپنی ماں کے ذریعہ رانی دائی جنداں والدہ دلیپ سنگھ، کی خدمت میں بھیج کر کیا اور ساتھ ہی بہت سا روپیہ رانی اور اس کی کنیز منگلا کے لئے بھیجا۔ اس کی ماں کی وہاں عزت و توقیر کی گئی اور محل میں رہنے کے لئے اس کو خاص کمرہ دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک لاکھ روپیہ نے یہ کام کیا۔

اس کے بعد فتح خان کچھ مدت آرام سے گھر بیٹھا رہا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد دریائے سندھ سے پار کا علاقہ اس سے لے کر دیوان لکھی کے بیٹے کو دے دیا گیا۔

فتح خان ٹوانہ کے مندرجہ ذیل حالات میجر ہربرٹ۔ بی۔ ایڈورڈ کی کتاب "ایک سال ۴۹-۱۸۴۸ء، پنجاب سرحد پر" کتاب سے لئے گئے ہیں۔ میجر ایڈورڈ بعد میں مئی ۱۸۵۳ء سے ستمبر ۱۸۵۳ء تک ہزارہ کا ڈپٹی کمشنر رہا۔

اس کتاب کے صفحہ ۵ پر وہ لکھتا ہے:

"مجھے ۱۸۴۶ء میں جموں جانے کا حکم ملا۔ کہ وہاں جا کر راجہ گلاب سنگھ کی مدد کر کے امام الدین گورنر کشمیر کی بغاوت فرو کروں۔ میں نے فتح خان ٹوانہ کی وساطت سے ہی شیخ امام الدین سے بات چیت کر کے وہ خط حاصل کر لیا جو راجہ لال سنگھ وزیر اعظم سکھ دربار نے شیخ امام بخش کو لکھا تھا، کہ وہ بغاوت کرے۔ وزیر اعظم کی اس غداری کے افشار نے سکھ دربار اور خاص کر دیوان دینا ناتھ کو ملک فتح خان کا دائمی دشمن بنا دیا۔

دینا ناتھ نے ملک فتح خان پر بہت سا بقایا بنا کر اس کو ہتھکڑی لگا کر گوند گڑھ کے قلعہ میں بند کر دیا، تا وقتیکہ وہ سب بقایا ادا نہ کرے۔ ملک فتح خان کی والدہ اور خاندان کی دوسری مستورات نے اپنے زیورات بیچ کر کسی قدر روپیہ جمع کر کے مجھے دیا اور میں نے سر فریڈرک کری کو ملک فتح خان کی رہائی کے لئے سفارش پر آمادہ کر لیا۔ سر فریڈرک نے ملک کو رہا کر کے میرے پاس بھیج دیا، تا کہ اس کی جرأت اور قابلیت سے بغاوت کے دوران فائدہ اٹھایا جا سکے۔ چونکہ میرے کیمپ میں اس کے بہت سے مخالفین موجود تھے، میں نے اس کو واپس کر دیا۔ وہ ایک بہادر

انسان تھا اور خطرناک موقعوں کے لئے موزوں۔ لہٰذا میں نے اس کو بنوں کا گورنر بنا کر بھیجا اور اس کو کہا "ملک! میں تم کو اس غرض کے لئے بھیج رہا ہوں کہ تم لفٹیننٹ بٹلر کی جان بچاؤ۔ کیوں کہ بنوں میں سکھ فوج ضرور بغاوت کرے گی اور کوئی انگریز ان کے ہاتھوں زندہ نہ بچ سکے گا۔ تم سکھوں کی بغاوت کو روک سکو تو روکو۔ اگر وہ بغاوت پر اٹھ کھڑے ہوں تو وزیریوں کو بلا کر ان کو ٹھیک کر دو۔ جنگ ختم ہونے پر مناسب معاوضہ تم کو دیا جائے گا۔"

ملک قید کی وجہ سے بہت کمزور اور غصیلہ ہو گیا تھا۔ میری باتوں کے جواب میں اس کی ڈراؤنی ہنسی میں نہیں بھول سکتا۔

اس نے میرے گھٹنوں کو پکڑ کر کہا "میں تمہارے ساتھ ملتان جانے کی خواہش رکھتا تھا۔ لیکن اب جب آپ نے مجھے بنوں بھیجنے کو کہا ہے، تو میں وہاں جاؤں گا میری زندگی اور عزت آپ نے بچائی۔ میں یہ قرض چکا دوں گا۔ انشاء اللہ"

وہ بنوں گیا اور سکھ سپاہیوں نے جب یہ خبر سنی کہ راجہ شیر سنگھ، مولراج کے ساتھ مل گیا ہے تو ان سب نے اکٹھے ہو کر ملک فتح خان کو قلعہ کے اندر محاصرہ میں لے لیا، قلعہ میں پانی نہ تھا۔ نہ کنواں اور نہ ہی تالاب۔ تنگ آ کر ملک کے وفادار لوگوں نے ہتھیار ڈالنے کی خواہش ظاہر کی۔ فتح خان نے اپنی تلوار اور ڈھال سنبھال لی اور حکم دیا کہ دلیپ گڑھ (قلعہ بنوں کا نام)، کا دروازہ کھول دیا جائے۔ وہ باہر آیا اور باغیوں کو للکارا:

"میں فتح خان ٹوانہ ہوں۔ کتے کی طرح مجھ پر فائر نہ کرنا۔ اگر تم میں دو شخص بھی بہادر ہیں تو سامنے آئیں اور میرے ساتھ مقابلہ کریں۔"

سکھ سپاہیوں نے نعرہ مارا "ملک فتح خان ٹوانہ! تم وہ ہو جس نے کنور پشاورا سنگھ کو قتل کیا۔ ہم تم کو قتل کریں گے۔" اور یک دم سو گولی کی باڑ اس پر چلی اور وہ ڈھیر ہو گیا۔ اس نے اپنا وعدہ عزت مندانہ طور پر وفا کیا۔

اگرچہ میری نظر میں اور بھی بہت سے مقامی لوگوں کی عزت اس جنگ ۴۹-۱۸۴۸ء

میں پیدا ہوگئی تھی، لیکن فتح خان سے زیادہ صدمہ مجھے کسی کی موت پر نہ ہوا۔ اس نے جس قلعہ کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا، اسی کے دروازے پر جان دے دی۔"

نوٹ : راجہ شیر سنگھ ۱۴ ستمبر ۱۸۴۸ء میں ملتان میں مول راج سے مل گیا۔ لہٰذا ملک فتح خان ٹوانہ کی موت ۱۴ ستمبر ۱۸۴۸ء سے بعد ہی واقع ہوئی ہو گی۔

میجر ایبٹ (بعد میں ڈپٹی کمشنر ہزارہ ۱۸۴۹ء تا ۱۸۵۲ء)، نے اپنی ڈائری مورخہ ۱۶ اکتوبر ۱۸۴۸ء از سری کوٹ تحصیل ہری پور سے بنام ریذیڈنٹ لاہور کو لکھا کہ "ملک فتح خان ٹوانہ قتل ہو چکا ہے، حالانکہ میں نے ہزارہ میں بغاوت کے پھوٹنے (۱۸۴۸ء) سے دو ہفتہ پہلے ملک فتح خان کو لکھا تھا کہ اس کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ شاید میرا ایلچی اس تک نہ پہنچ سکا اور راستہ میں روک لیا گیا۔ اگر میرا خط ملک فتح خان کو پہنچ جاتا تو وہ ضرور اپنی حفاظت کر لیتا۔ یہ قتل کا منصوبہ بنوں کے توپخانہ کے افسر نے، جو جرنل سلطان محمود افواج ہزارہ کا بیٹا ہے، نے بنایا تھا۔

میجر ہربرٹ۔ بی۔ ایڈورڈ نے اپنی کتاب "ایک سال ۱۸۴۸-۴۹ء پنجاب کی سرحد پر" کے صفحہ ۲۸۹ پر فتح خان کے متعلق تحریر کیا ہے :

"لفٹیننٹ ٹیلر[ل] کے بجائے میں ملک فتح خان ٹوانہ کو تعینات کرنے کی تجویز کرتا ہوں اور بنوں، مروت، عیسیٰ خیل اور کچھی تا حدِ خوشاب اور ملتان کی سرحد اس کے حوالے کر دینا چاہتا ہوں۔ اس کے نام سے ہی اس علاقہ میں امن قائم ہو جائے گا۔ اگرچہ وہ خود اس کا خواہش مند نہیں ہے، بلکہ وہ ملتان کے جھگڑے باہر ہی رہنا چاہتا ہے۔ کیونکہ بہت سے ملتانی افسر اور پٹھان اس کے سخت دشمن ہیں۔"

ہزارہ کے جاگیردار

مطابق یادداشت و خط میجر ایبٹ جو اس باب کے آغاز میں درج ہے۔

۲۔ راجہ علی گوہر خان، رئیس قوم گکھڑ ساکن خان پور، پسر شیر محمد خان عمر ۵۶ سال۔ اولاد سلاطین گکھڑ علاقہ دوآبہ جہلم۔ بارہ مواضعات ان کی جاگیر ہیں۔

ذاتی سوانح : راجہ علی گوہر خان، گکھڑ قوم کا سردار ہے، جس نے زمانہ سلف میں خان پور

ل۔ ٹیلر صرف بنوں کے ضلع کا انچارج تھا۔

پر حکومت کی۔ شاہانِ دہلی کی طرف سے ان کو جاگیر عطا ہوئی تھی اور بطور نذرانہ یہ شکار ی کتے اور بازان کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔

راجہ علی گوہر خان اونچے درجہ کا رئیس ہے اور بہت معزز ہے۔ جنگ سکھاں (۴۹-۱۸۴۸ء) میں وفادار رہا۔

۳- جہانداد خان ولد پائندہ خان رئیس مغربی تناول۔ عمر ۳۲ سال۔

جاگیر۔ ۲۸ دیہات جاگیر میں ہیں۔

حالات: یہ رئیس ہزارہ میں بہت بڑی طاقت کا مالک اور صاحب اثر ہے۔ نرم طبیعت والا، لیکن بہت وفادار۔

۴- راجہ نجف خان ولد مہند علی خان۔ عمر تقریباً ۷۰ سال۔

۵- راجہ قربان علی ولد مہند علی خان۔

۶- راجہ فیروز خان ولد راجہ علی گوہر خان (اس فہرست کا ۲)، عمر تخمیناً ۲۲ سال۔

۷- راجہ غلام محمد خان ولد سید محمد خان، عمر ۳۲ سال۔ یہ پرانی حکمران قوم گکھڑ کا فرد ہے۔ جس کی ۸۰ سال پہلے تک خان پور پر حکومت رہی۔

۸- راجہ حیدر بخش ولد راجہ نجف خان (فہرست ہذا ۴)، عمر ۴۵ سال۔ یہ خان پور کے راجاؤں کی شاخ کا ایک سردار ہے۔ اس نے سرکارِ انگریزی کی خدمت ملتان کی جنگ (۱۸۴۸ء) اور گزشتہ جنگ (۱۸۴۹ء) کے دوران میں کی۔

۹- راجہ حسو خان ولد راجہ نجف خان عمر ۲۸ سال و راجہ نیاز علی خاں ولد سید محمد خان۔

۱۰- مولوی محمد علی خان[1] ولد میر احمد خان ساکن اچھڑی۔ پکھلی۔ عمر ۵۶ سال۔ سابق اتالیق سر ڈبلیو میکناٹن۔ گیارہ مواضعات جاگیر۔ ہزارہ کی شمالی سرحد از اگرور تا کونش کا گورنر مقرر کیا گیا تھا اور وہ اس علاقہ کے دروں سے ترنی (پشتو۔ تیر بنی)، یعنی مال مویشی کی آمد و رفت کا محصول لیا کرتا تھا۔ قوت فیصلہ اور عظیم جرأت کا مالک تھا۔ اس نے درہ کونش کی آمدنی کو بہت جلد ہی تین گنا کر دیا۔ جس کی سالانہ آمدنی ۱۰۰۰-۳ روپے تھی۔ جبکہ محمد امین خان، خان گڑھی نے

---

[1] آپ خان ولی محمد خان، خان اوگرہ، تحصیل مانسہرہ کے دادا تھے۔ عالم، طبیب اور ماہر جراح تھے۔

دیوان مولراج کے طمع ولالچ کی بنا پر اس کو بے دخل کرنے کا حکم دیوان مولراج سے لے لیا۔
گزشتہ جنگ (۱۸۴۹ء) میں بہت وفادار، سرگرم اور مفید ثابت ہوا۔

۱۱۔ محمد امین خان پسر حبیب اللہ خان ساکن گڑھی حبیب اللہ عمر۔ ۴۰ سال۔ ۴۱ دیہات واقع پکھلی، درہ کنہار اور پرگنہ کونش۔

ڈپٹی کمشنر کا نوٹ: اس کا پکھلی کا رسوخ حکومت کے کسی کام کا نہیں، بلکہ میری رائے میں مضر ہے۔ یہ پکھلی کا پشتینی رئیس ہے۔ اس کا رسوخ اب کم ہو رہا ہے۔ خود تو بے ضرر سا انسان ہے لیکن اپنے سازش کنندہ کارداروں کے زیر اثر ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر سرحد پر امن ہو گئی تو خان کی اہمیت نہ رہے گی۔

۱۲۔ سردار حسن علی خان رئیس کرڑال ولد مہندا خان عمر۔ ۵۶ سال۔ علاقہ ناڑاں اور نیلاں میں دس گاؤں اس کی جاگیر ہیں۔

ذاتی حالات۔ اس رئیس کے اجداد کرڑال قوم کے پہاڑی علاقہ کے خود مختار رئیس تھے سکھوں کے ساتھ بہت جنگ وجدال کے بعد، جب کرڑال مطیع ہوئے تو سردار ہری سنگھ نے ان کو یہ جاگیر عطا کی، جو بعد میں ضبط کر لی گئی۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے پھر دے دی۔ دریائے ستلج پر سکھوں کی شکست کے بعد یہ علاقہ آزاد ہو گیا اور انگریزوں کی حکومت کے بنانے پر مطیع ہو گیا۔

۱۳۔ عبداللہ خان ولد مہندا خان۔ برادر سردار حسن علی خان۔

۱۴۔ بہادر علی خان ولد احمد علی خان نے کرڑال قوم کی ایک شاخ کا رئیس۔ عمر ۵۰ سال۔ ڈبران کی جاگیر امجد علی خان کو عطا کی گئی تھی۔

۱۵۔ عطا محمد خان ولد غفور خان سواتی عمر ۲۲ سال۔ رئیس اگرور۔

ذاتی حالات۔ یہ اگرور کا آبائی خان اور رئیس ہے۔ اس کا باپ خود مختار تھا۔ یہ سرحد پر رہتا ہے۔ حکومت کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ الٹا ثابت ہوا اور غلط اطلاعیں بھیجتا ہے۔

۱۶۔ محمد خاں ولد قمر علی خاں۔ عمر۔ ۴۰ سال۔ جاگیر موضع جلو (نزد۔ کھٹالہ) عہد سکھاں میں

سرحد پر امن رکھنے کی وجہ سے یہ جاگیر اس کو ملی - یہ شخص اس سرحد پر بہت اثر ورسوخ کا مالک ہے اور اس سرحد پر جہاں ہمیشہ بدامنی رہتی تھی - اس نے امن قائم کیا اور بہت اخلاص و کوشش سے بحال رکھا - اس واسطے اس کو یہ جاگیر دی گئی -

۱۷ - سادات کاغان - ضامن شاہ ولد حسن علی شاہ - عمر - ۵۰ سال -

۱۸ - فتح علی شاہ ولد فیض علی شاہ - عمر ۵۰ سال

۱۹، ۲۰، عمر شاہ و میر گل شاہ پسران فیض علی شاہ - ان کو وادئ کاغان میں کل نو مواضعات جاگیر میں عہدِ سکھاں میں دئے گئے تھے - اس کے بعد گلاب سنگھ اور پھر انگریز ثالث و میجر ایبٹ نے سادات کی ذاتی حاضری پر مستقل کر دی -

سادات کی سندات : شیخ غلام محی الدین ، ناظم کشمیر نے سید ضامن علی شاہ اور سید فتح علی شاہ کی خدمات اور حاضری کے صلہ میں ان کو وادئ کاغان کی جاگیر مندرجہ ذیل شرائط پر دی -

۱ - ان ہر دو کے خاندان سے ایک ایک آدمی ہر وقت حاضر خدمت رہا کرے گا -

۲ - وہ کوئی ظلم و زیادتی اہالیانِ وادئ کاغان پر نہیں کریں گے -

ڈپٹی کمشنر ہزارہ نے کچھ عرصہ پہلے (یعنی ۱۸۷۳ء سے پہلے) سید ضامن شاہ ، فتح علی شاہ اور عمر شاہ کے حکومت سے باغی ہونے کی وجہ سے ان کی ذاتی جاگیر بحقِ سرکار ضبط کرنے کی سفارش کی تھی -

سیرت و رسوخ : دیوان ابراہیم جو مہاراجہ گلاب سنگھ کا کاردار تھا ، کے قتل کے بعد اور پھر ان کے جاگیردار بن جانے سے ان کا اثر و رسوخ انتہائی ہو گیا -

ان جاگیرداروں کے علاوہ ضلع بھر میں چھوٹے چھوٹے جاگیردار تعداد ۱۲ تھے ، جن کو ہر ایک کے اثر و رسوخ کے مطابق تھوڑی تھوڑی نقد جاگیریں دی گئی تھیں -

۲۱ - ان کے علاوہ ۴۱ جاگیریں جو قوم طاہر خیلی کو ضلع راولپنڈی میں ملی ہوئی تھیں ضلع ہزارہ کو منتقل ہوئیں -

یہ سب جاگیریں کئی پشتوں سے باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی رہیں - یہ سب سے پہلے سلطان احمد شاہ ابدالی نے عطا کیں - جبکہ وہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا - ان کی تجدید

شاہانِ دہلی کی طرف سے بھی ہوتی رہی اور یہ سلسلہ سکھوں کی حکومت ہزارہ تک جاری رہا۔ سکھوں کے عہد میں ایک سکھ کاردار نے بغیر کسی وجہ سے ۴۰۰/- روپیہ کی جاگیریں ضبط کریں۔ ہزارہ کے بندوبست کے مکمل ہونے پر میں نے (میجر ایبٹ)، سکھ دربار اور برٹش ریذیڈنٹ کی اجازت سے بحال کر دیں۔ کیونکہ اس قوم کے خان خانیزمان خان نے اطاعت قبول کر لی تھی۔ جو سندات اس قوم کے پاس تھیں وہ سب خانیزمان خان جب پھر وہ ۱۸۴۸ء میں باغی ہو کر سندھ پار چلا گیا تھا، اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ وہ وہاں ہی فوت ہو گیا اور سندات کے انجام کا پتہ نہ چل سکا۔

ڈپٹی کمشنر کی رائے اور سفارش

درانی اور دہلی کے بادشاہوں کی یہ پالیسی بہت دانشمندانہ اور صحیح تھی کہ جس علاقہ کو وہ فتح کرنے کے بعد قبضہ میں نہ رکھ سکتے تھے، وہ جاگیر میں دے دیا کرتے تھے۔ سکھوں نے بھی اس پالیسی پر عمل کیا۔ اگرچہ سکھوں کے ایک کاردار نے بغیر اجازت میدان حسن ابدال کی جاگیر سے کچھ مواضعات واپس لے لئے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تارخیلیوں نے اس علاقہ کے لوگوں سے جبراً اپنا حصہ وصول کرنا شروع کر دیا اور لوگوں میں خوف وہراس پیدا ہو گیا۔

قوم طاہر خیلی کا سیرت و رسوخ

طاہر خیلی قوم زمانہ قدیم سے دوآبہ سندھ ساگر میں سوائے قوم گکھڑ کے، بہت زبردست قوم رہی ہے۔ عرصہ سات سال کا ہوتا ہے۔ (یعنی ۱۸۴۳ء، کیونکہ یہ خط برائے منظوری جاگیرات ۱۸۵۰ء میں لکھا تھا)، کہ وہ اٹک سے مارگلہ تک کے سب میدانی علاقہ سے بہ جبر خراج لیتے رہے۔ جب ان کی پرانی جاگیر جو سکھ کاردار نے ضبط کر لی تھی، واپس کر دی گئی۔ اور ان کے چند سرغنوں کو مناسب سزا دی گئی تو وہ اس کے بعد پُرامن اور روفادار رہے اور پھر کوئی زیادتی نہیں کی۔

گزشتہ جنگ (۴۹-۱۸۴۸ء) میں ان کے بہت سے خوانین، درانیوں سے مل گئے تھے ان کی جاگیریں ضبط کر لی گئیں اور ان دنوں ان کا رئیس خانیزمان خان تھا۔

رؤسائے قوم طاہر خیلی جو اس علاقہ میں صاحب اختیار رہے ۱۔ تاج خانؒ، ۲۔ بلند خان۔

ف۔ شجرہ نسب یہ ہے۔ خانیزمان خان بن شیرزمان خان بن ظفر خان بن فتح خان بن بلند خان بن تاج خان بن طاہر خان

نوٹ۔ طاہر خان، طاہر خیلی قوم کا مورثِ اعلیٰ تھا۔

۳-فتح خان - ۴-نظفر خان - ۵-شیر زمان خان - ۶-خانیزمان خان -

دستخط-میجر جیمز ایبٹ-ڈپٹی کمشنر-

اہل ہزارہ کو جاگیرداروں کے علاوہ ، بہت سے افراد کو نمبرداری دہ پنجوترہ ، کے اعزاز اور مختلف انعامات سے نوازا گیا - اس پالیسی نے ہزارہ کے باسیوں کو انگریزوں کا وفادار بنائے رکھا - مختلف حکومتوں کے اثرورسوخ اوران کے رعب وداب کے متعلق کسی اہل علم کا قول ہے کہ "مغلوں نے خدائی کی ہے اور انگریزوں نے بادشاہی کی ہے" پر اتنا اضافہ ، ہزارہ کی تاریخ کی رو سے ، اگر نا غلط نہ ہوگا کہ سکھوں نے غارت گری کی ہے - لیکن سکھوں کو ان کی اس غارت گری کی حکومت ہزارہ میں بہت مہنگی پڑتی رہی ہے -

---

باب ہشتم

ہزارہ کے اخبارات و مدیران

اہلِ ہزارہ زندگی کے ہر میدان سوائے دولت آفرینی کے صفِ اول میں رہے۔ دولت آفرینی کے لئے قدرت نے ان کو بنیادی وسائل ہی نہ دئے۔ للہٰذا اس میدان میں وہ مقابلہ ہی نہ کر سکے۔ یہ امر بھی حکمتِ خداوندی ہی ہوگا۔ کیونکہ محض دولت ہی اگر بنیادِ زندگی و عزت ہوتی تو خدا اپنے نبیوں کو بدرجہ اولیٰ یہ عطا کرتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

مگر خدا نے ہمیں ایسا دلفریب وطن دیا، جس کے نظارہ سے ایک دنیا، تاریخی زمانہ سے، محظوظ ہونے کے لئے کھنچی چلی آتی ہے اور یہ ضلع کشمیر، خطۂ بے نظیر کا جغرافیائی اور تاریخی طور، سے ایک حصہ ہے۔ اسی لئے وہ "پائیں کشمیر" کے نام سے موسوم ہے۔ ہم اس کو اپنی روایات میں "تختِ ہزارہ" سے موسوم کرتے ہیں۔ اس کی آب و ہوا فرحت انگیز، اس کے موسم دل آویز، اس کی ہوا عطر بیز اور اس کے روز و شب راحت افزا ہیں۔ اس دولت پر ہم نازاں ہیں، جس نے ہمارے قوائے ذہنی و جسمانی کو وہ جلا بخشی، کہ ہم ہر میدانِ کسب و سعی میں گوئے سبقت لے جاتے ہیں دنیاوی تعلیم کا میدان ہو یا مذہبی اور روحانی تعلیم کا۔ ہم ہر میدان میں ممتاز جگہ پاتے ہیں۔ دنیاوی میدان میں ہم نے بہترین افراد علم و ہنر والے پیدا کئے، جو معلوم دنیا کے کونے کونے تک پہنچے اور اپنے زورِ بازو اور دماغی قابلیت کے بل بوتے پر اپنا مقام پیدا کیا۔ دین کے میدان میں ہزارہ کے علمائ دیوبند ایسی عظیم الشان دینی درسگاہ کی مسند نشینی تک پہنچے۔ حریت و آزادی کی شمع کو ایک عالم میں فروزاں کیا۔ ہر باطل قوت سے ٹکرانے کے لئے، اپنے ہاتھ میں سیف و سناں بھی سنبھالا۔

علمار ہزارہ کے یہ کارنامے بہت تفصیل کے طالب ہیں، مگر میں بضحوائے سہ

زبان زنطق فرو ماند و رازِ من باقی است
بضاعت سخن آخر شد، سخن باقی است

اس کے لئے میں نے علمار ہزارہ کے باب میں چند معروف و مشہور ہستیوں کا ذکر کردیا ہے علمائے ہزارہ کے باب میں پروفیسر فیوض الرحمٰن صاحب، صدر شعبہ اسلامیات گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد کی زیرِ تسوید کتاب مفصل ہے۔ زیرِ تسوید باب صرف اہل صحافت ہزارہ کا ذکر مطلوب ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ شمالی علاقہ برِ عظیم پاک و ہند میں اولیت اور فضیلت ضلع ہزارہ ہی کو حاصل ہے۔ اس طبقہ کے افراد جشنِ آزادی کے اولین کارکن تھے اور آزادی کی شمع کو فروزاں کرنے میں ان کا خاص حصہ رہا ہے۔

ہزارہ کے اخبارات

جنگ آزادی میں اخبارات کا خاص حصہ ہے۔ میرے علم کے مطابق پہلا اخبار "ایڈورڈ گزٹ" ایبٹ آباد سے ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ صوبہ سرحد میں سب سے پہلا اخبار "افغان" پشاور سے شائع ہوا تھا۔ مجھے یقین کامل ہے کہ اس کا اجرا بھی ہزارہ کے کسی اہلِ علم کے ہاتھوں ہوا ہوگا، یا وہ شریکِ کار رہا ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۲۲-۱۹۲۱ء اور اس کے بعد کا زمانہ کافی ہنگامہ خیز تھا۔ خلافت اور ہجرت کی تحریک زوروں پر تھی۔ مولانا محمد علیؒ، اس تحریک کے سالارِ اعظم تھے۔ کالجوں اور سکولوں کا بائیکاٹ ہوا مختلف کالجوں کے طلبائ، جامعہ اسلامیہ علی گڑھ چلے گئے، جہاں مولانا محمد علی مرحوم کی مساعی سے ان کی سرکردگی میں علیحدہ یونیورسٹی قائم کی گئی۔ اسلامیہ کالج پشاور میں تعلیم پانے والے، ہزارہ کے چند نوجوان طلبائ بھی علیگڑھ پہنچ گئے۔ وہاں کچھ عرصہ رہ کران کو واپس اپنے صوبوں میں تبلیغی مشن پر بھیج دیا گیا۔ یہاں ان نوجوانوں کو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ ان میں مولانا غلام ربانی لودھی، ملک امیر عالم خان اعوان، ملک محمد عالم خان اعوان، مسٹر حاجی احمد مرحوم اور عبدالرشید طاہر خیلی سرِفہرست ہیں۔ ان سب کو کچھ عرصہ ایبٹ آباد جیل میں پھانسی کی کوٹھڑیوں میں بیڑیوں میں جکڑ رکھنے کے کچھ مدت بعد اس وقت کے حاکم ضلع، کرنل جیمسن نے

ضلع سے خارج کر دیا۔ کچھ عرصہ تحریک خلافت میں کام کرنے کے بعد ملک امیر عالم نے راولپنڈی سے "ترجمان سرحد" کے نام سے ہفتہ وار اخبار نکالا۔ اخبار "شہاب" بھی جاری ہوا۔ ان دونوں اخباروں نے صوبہ و ضلع کے نام کو کافی بلند کیا۔ صوبہ میں اصلاحات کی ترویج اور ہزارہ کی انتظامی خرابیوں کی نشان دہی کرنا، ان کا بنیادی مقصد تھا۔ اس تمہید کے بعد اخبارات اور ان کے مدیروں کے حالات تحریر کئے جاتے ہیں۔

۱۔ "ایڈورڈ گزٹ" ہفتہ وار زیر ادارت منشی محمد قلندر خان تنولی، ایبٹ آباد سے، ۲۶ مئی کو شائع ہونا شروع ہوا۔ یہ اخبار دو سال تک جاری رہا۔ یہ دس بارہ صفحات پر مشتمل، جلی قلم سے نستعلیق خط میں، چھپتا تھا۔ اس میں مقامی خبریں اور ضلع کے حالات پر تبصرے ہوتے تھے۔ پبلک کی تکالیف کا ترجمان تھا۔ سرکاری ملازمین کے معمولی سے معمولی شکایتیں لکھتا تھا۔ لہجہ ذرا تند و تیز تھا۔

منشی محمد قلندر خان تنولی ساکن دربند خان خیل تحصیل ہری پور کے رہنے والے تھے۔ آپ کی پیدائش ۱۸۷۰ء اور وفات ۱۹۱۶ء میں ہوئی۔

۲۔ "ترجمان سرحد" ہفتہ وار زیر ادارت ملک امیر عالم خان اعوان ساکن مانسہرہ، جنوری ۱۹۲۶ء میں راولپنڈی سے شائع ہونا شروع ہوا۔ ۱۹۳۲ء میں پشاور منتقل ہو گیا اور آج تک جاری ہے۔

اس کے اداریے قابل قدر، سیاسی متانت، آزادی رائے اور قومی رنگ سے مزین ہوتے ہیں۔ اس کے خاص عنوان "آئینہ عالم (ہفتہ بھر کی خبروں کا نچوڑ)، سرکاری گزٹ، صوبہ سرحد کی خبریں اور نوٹ ہوتے ہیں۔

چونکہ برطانوی سامراج کے آخری ایام کا تشدد، آزادی پسند طبقے سے دست بدست جنگ پر اتر آیا تھا، لہٰذا ملک امیر عالم خان نے ترجمانِ سرحد، جو کہ راولپنڈی سے شائع ہوتا تھا۔ ٹیکسلا کے مقام سے "ترجمان" کا ڈیکلریشن بھی دے رکھا تھا کہ اگر "ترجمان سرحد" سرحد حکومت کے چنگل میں آ جائے، تو کام رکنے نہ پائے اور خریداروں کے نام "ترجمان" ٹیکسلا پہنچتا رہے۔

ملک امیر عالم خان کی سوانح زندگی

آپ موضع "بٹر کوٹ" نزد مانسہرہ کے رہنے والے ہیں۔ تاریخ پیدائش ۱۹۰۱ء ہے۔ ۱۹۲۰ء میں اسلامیہ کالج پشاور میں زیر تعلیم تھے کہ تعلیمی بائیکاٹ کی اپیل پر ۱۶ نومبر ۱۹۲۰ء کالج چھوڑ دیا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ (بنا کردہ مولانا محمد علی جوہرؒ) میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۱ مئی ۱۹۲۱ء کو تبلیغی کلاس کی معیت میں پشاور پہنچے۔ وہاں سے ہزارہ آئے اور یہاں سے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ گرفتار ہو کر جلاوطن ہوئے۔ وفات ۹۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء میں ہوئی۔

صحافتی سرگرمیاں

۱۹۲۴ء میں روزنامہ "تنظیم" امرتسر میں بطور معاون مدیر شامل ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۲۶ء میں راولپنڈی سے "ترجمان سرحد" نکالا۔

سیاسی سرگرمیاں

۱۹۲۹ء میں "پنجاب نوجوان بھارت سبھا" کے تیسرے سالانہ اجلاس کی صدارت کی۔ ۱۹۳۰ء میں ایک سال قید ہو کر اٹک جیل میں گزاری

۱۹۲۸ء میں پراونشل کانگریس کمیٹی صوبہ سرحد کے جائنٹ سیکرٹری اور ۱۹۳۹ء میں نائب صدر چنے گئے۔ ۱۹۴۲ء میں "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک میں چھ ماہ قید ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں پہلی ڈسٹرکٹ کسان کانفرنس منعقدہ مانسہرہ، ان کی صدارت میں ہوئی۔ ۱۹۴۵ء میں اختلافات کی وجہ سے کانگریس سے الگ ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء میں مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں سرحد اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۳ء میں ڈپٹی سپیکر چنے گئے۔

۱۹۵۵ء میں صوبہ مغربی پاکستان بننے پر سیاست سے علیحدگی حاصل کر لی اور اب تک (۱۹۷۰ء) خانہ نشین ہیں۔ لیکن "ترجمان سرحد" کو باوجود علالت و ضعفِ صحت، فریضۂ منصبی کے طور پر چلاتے رہے۔

۲۔ "شہاب" سہ روزہ۔ ادارہ تحریر مولانا غلام ربانیؒ لودھی مرحوم ساکن سرائے صالح ملک محمد عالم خانؒ ساکن منگلور، تحصیل مانسہرہ، مولانا شہاب الدینؒ جہلمی (ڈاکٹر فضل الرحمٰن سابق صدر، اسلامی مشاورتی کونسل کے والد تھے) اور قاضی عزیز الرحمٰن ساکن سرائے صالح ۱۹۲۷ء میں راولپنڈی سے شائع ہونا شروع ہوا۔ صوبہ سرحد میں اصلاحات کی ترویج، اور ضلع ہزارہ میں انتظامی خرابیوں کی طرف توجہ دلانا اس کا مقصد اعلیٰ تھا، ساتھ اسکی اٹھان،

محکمہ تعلیم کی رشوت ستانی اور ظالم افسروں کے خلاف کچھ ایسی بے جگری کی لڑائی تھی کہ مظلوم مدرس طبقہ کی جان میں جان آگئی - یہ چاروں اصحاب، علم و ادب و صحافت کے آسمان کے تارے بلکہ مہتاب تھے - لہٰذا اس اخبار کا پایہ بہت بلند اور حکومت کی نظر میں قابل توجہ تھا - آخر کار یہ اخبار کلی طور پر ملک محمد عالم خان اعوان کے سپرد کر دیا گیا - اس اخبار کی تحریک برائے ترویج اصلاحات سرحد، جلد ہی کامیابی سے ہم کنار ہوگئی اور صوبہ سرحد کو ۱۹۳۲ء میں اصلاحات مل گئیں اور ملک محمد عالم خان، محکمہ پبلسٹی سرحد میں جرنلسٹ کی آسامی سے منسلک ہو گئے - ان کے ملازمت میں آجانے کے بعد کالا خان صاحب ساکن باندھی ڈھونڈاں "شہاب" کو چلاتے رہے - یہ ایک صاحب علم خاندان کے فرد تھے - ان کے دو بھائی ماسٹر خیراللہ اور ماسٹر امیراللہ مدرس تھے -

مدیران شہاب کی سوانح زندگی

۱ - مولانا غلام ربانی لودھی -

خاندان اور پیدائش - آپ جنوری ۱۸۹۹ء میں جناب مولوی برکت اللہ صاحب ساکن سرائے صالح تحصیل ہری پور کے گھر پیدا ہوئے -

تعلیم: ابتدائی تعلیم پرائمری سکول (اب ہائی سکول ہے) سرائے صالح میں حاصل کی - انہی ایام میں قرأت و ترجمہ قرآن مجید مقامی علماء سے پڑھا - مڈل کا امتحان ۱۹۱۴ء میں ہری پور سے اور ہائی سکول کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول نمبر ۱ ایبٹ آباد سے ۱۹۱۷ء میں پاس کیا - انٹرمیڈیٹ کا امتحان اسلامیہ کالج پشاور سے ۱۹۱۹ء میں پاس کیا - ۱۹۲۱ء میں بی - اے کا امتحان دینے والے تھے، کہ تحریک عدم تعاون کے تحت کالج چھوڑ دیا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ میں داخلہ لے لیا - جہاں مولانا محمد علی جوہرؒ، ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم، ڈاکٹر محمد عالم اور خواجہ عبدالحئی پڑھاتے تھے - چھ ماہ کی تعلیم کے بعد ان کو تبلیغ کے لئے پشاور کمیٹی کے پاس بھیج دیا گیا - ان دنوں میں خان عبدالقیوم خان ساکن سفیدہ (تحصیل مانسہرہ) خلافت کمیٹی پشاور کے صدر تھے - افراد خاندانِ سفیدہ، مذہبی رنگ میں رنگے ہوئے - تحریک حریت کے سرخیل تھے - انہوں نے مولانا غلام ربانی لودھیؒ کو، ملک امیر عالم خان اعوان (ساکن مانسہرہ) اور عبدالرشید طاہر خیلی مرحوم (ساکن سلم کھنڈ، تحصیل ہری پور) حاجی احمد صاحب (ساکن شیخ البانڈھی - ایبٹ آباد کے

ساتھ اپنے ضلع (ہزارہ) میں کام کرنے کے لئے بھیج دیا۔ حکومت نے ان کو یہاں پہنچتے ہی (۱۹۲۱ء) میں رفقاء سمیت گرفتار کر لیا اور جیل میں بند کر دیا۔ بعد میں ان سب کو ضلع بدر کر دیا گیا۔ اسی جلاوطنی کے دور میں ضلع راولپنڈی اور اٹک میں مجلس خلافت کے ماتحت تحریک آزادی کے کام میں مشغول ہو گئے۔

۱۹۲۰ء میں ایک تقریر کے سلسلے میں ایک سال قید ہو گئے۔ یہ قید انہوں نے نبول جیل میں گزاری۔ یہاں ہی قرآن مجید حفظ کر لیا۔

رہائی کے بعد لاہور اور امرتسر کے قیام کے دوران دینی حلقوں سے رابطہ قائم کیا۔ مدرسہ تقویۃ الاسلام (دارالعلوم غزنویہ) امرتسر سے سند تکمیل علوم دینی حاصل کی۔ انہی ایام میں تحریک خلافت امرتسر کی ذمہ داری بھی ان پر عائد ہو گئی۔ جبکہ مولانا مظہر علی اظہر، شیخ حسام الدین، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور چودھری افضل حق گرفتار ہو چکے تھے۔ "شہاب" اور "ترجمان سرحد" راولپنڈی کے ادارہ تحریر میں شامل رہے۔ امرتسر میں روزنامہ "وکیل" اور پھر لاہور میں روزنامہ "زمیندار" کے سب ایڈیٹر رہے۔ اخبار "احسان" لاہور میں بھی کام کیا اور سرائے صالح سے "ترجمان" بھی جاری کیا۔ آخر عمر میں "نوجوان سرحد" کے اداریہ نویس رہے۔

عادات و معمولات

ساری عمر جذبہ حریت و آزادی سے سرشار رہے۔ کلمہ حق کا برملا اعلان، گاؤں کے خوانین اور حکومت وقت دونوں کے خلاف کرتے رہے۔ ان سب سے اکیلے ہی کبھی لڑائی لڑتے رہے۔ تقریر اور زبان، قلم (نثر و شعر) سے یہ جنگ جاری رکھی۔ مٹھی بھر ہڈیوں کا ڈھانچا، مگر دل شیر دل جیسا، زندگی بہت سادہ، لباس و خوراک، کیا طرز بود و ماند، مگر خودداری سے گزاری۔ آزادی کے سرخیل رہنماؤں سے ہمیشہ تعلق رکھا۔ ان کو بھی ان کی رفاقت پر ناز رہا۔ اس نحیف نزار جسم کے ساتھ ۱۵، ۲۰ میل روزانہ پیدل چلنا معمول تھا۔ ٹانگے کا کہہ نہیں سکتا لیکن موٹر پر کبھی سفر نہ کیا۔ دو دفعہ ہی ایسا کیا اور دونوں دفعہ حادثہ سے دوچار ہوئے اور آخری حادثہ جان لیوا ثابت ہوا۔

تبلیغی و اصلاحی خدمات میں اپنی زندگی گزار دی، جس کی تفصیل بہت طویل ہے۔ ہزارہ میں پادریوں کی مہم (ہزارہ کی مجبور عورتوں کو عیسائی بنا کر باہر بھجوانا)، کا مقابلہ ڈٹ کر کیا اور

اس سیلاب کے آگے بند باندھنے کی کوشش کرتے رہے۔ تصنیفی خدمات میں بھی آپ کا پایہ بہت بلند ہے۔ بہت سی عربی کتابوں کے ترجمے کئے۔ چند اصلاحی کتابیں تصنیف کیں۔

وفات موٹر کے حادثہ سے ہوئی، جو ۵ اپریل ۴۷ء کو "کھوتہ قبر" کے پاس پیش آیا۔ ان کو ایبٹ آباد سول ہسپتال میں داخل کرایا گیا تھا، جہاں وہ ایک ہفتہ تک بے ہوش رہے اور آخر ۱۲ اپریل ۴۷ء چھ بجے شام داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون۔

ب۔ ملک محمد عالم خان اعوان خاندان۔ آپ منگلور (تحصیل مانسہرہ) کے مردم خیز گاؤں میں ملک سید عالم کے گھر پیدا ہوئے۔

تعلیم: میٹرک کا امتحان ایبٹ آباد ہائی سکول سے پاس کیا۔ کالج کی تعلیم کے لئے اسلامیہ کالج پشاور گئے۔ ان ایام میں جب وہ سیکنڈ ایر کے طالبعلم تھے، بائیکاٹ کا سلسلہ شروع ہوگیا تو وہ اپنے دوستوں حاجی احمد (ساکن شیخ البانڈھی) اور ملک امیر عالم خان (ساکن مانسہرہ) کی معیت میں جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ پہنچ گئے۔ وہاں سے چندے تعلیم حاصل کر کے طالب علموں کو اپنے اپنے ضلع میں برائے تبلیغ بھیج دیا گیا۔ یہ جب یہاں پہنچے تو گرفتار کر لئے گئے اور ۱۵، ۲۰ دن کے بعد پابجولاں ضلع سے بدر کر کے ٹیکسلا لے جا کر چھوڑ دیا گیا۔ وہاں سے یہ سیدھے سنٹرل خلافت کمیٹی بمبئی پہنچ گئے۔ پھر دوبارہ جامعہ ملیہ چلے گئے اور وہاں بی۔ اے (جامعہ) کا امتحان پاس کیا امتحان پاس کرنے کے بعد ان کو صوبہ سرحد کے صدر خلافت کمیٹی، حاجی جان محمد صاحب مرحوم کے پاس بھیج دیا گیا۔ انہوں نے ملک صاحب کو بطور سیکنڈ ماسٹر نوشہرہ ٹیکنیکل سکول (جو خلافت کمیٹی کے فنڈ سے چلتا تھا) بھیج دیا۔ آپ کچھ عرصہ یہاں رہے۔ اس کے بعد روزنامہ "ہمدرد" جاری کردہ مولانا محمد علی جوہرؔ، کے سٹاف میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد ڈاکٹر سیف الدین کچلو کے ساتھ امرتسر چلے گئے۔ اور ان کے اخبار "تنظیم" کے سب ایڈیٹر بن گئے۔ اس کے بعد چندے سردار سکندر حیات خان ساکن واہ کے پرائیویٹ سیکرٹری ہو گئے۔ ان سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے راولپنڈی سے سہ روزہ "شہاب" نکالا۔

جب ۱۹۳۲ء میں سرحد میں اصلاحات شروع ہوئیں تو نواب مظفر خان ساکن واہ[ا] نے آپ

[ا] ۔ موضع نزد حسن ابدال۔

کو پبلسٹی آفس میں جرنلسٹ کے عہدے پر مقرر کر دیا۔ خان بہادر قلی خان مرحوم افسر محکمہ مقرر ہوئے۔ سرکاری ملازمت میں مختلف عہدوں پر کام اور آخر کار حکومت مغربی پاکستان میں سیکشن افسر کے عہدہ سے پنشن لی۔

پنشن پر آجانے کے بعد ایبٹ آباد سے یکم مئی ۱۹۷۰ء کو ہفت روزہ "معاشرہ" کا اجراء کیا اس کا مشن اصلاحِ معاشرہ بر بنائے تعلیم اسلامی تھا۔ لیکن بے مہری زمانہ اور ناقدر شناسی قوم سے ۱۹۷۲ء کے آخر میں بند ہو گیا۔

اس کے بعد آپ نے اپنا مشن تبلیغی جماعت میں شامل ہو کر انجام دینا شروع کر دیا۔ ۱۹۷۴-۷۵ء سے آپ اس جماعت کے ضلعی امیر رہے۔

وفات: طویل مدت تک صاحبِ فراش رہنے کے بعد ۱۸ اکتوبر ۱۹۸۰ء میں وفات پائی۔

ج۔ مولانا شہاب الدین جہلمی

آپ موضع پوچھال کلاں ضلع جہلم کے رہنے والے تھے۔ "شہاب" نکالنے کے وقت آپ پڑھنہ (دتنول) کے خوانین کے قاضی تھے اور ان کے بچوں کے اتالیق بھی۔ انہوں نے شادی سرائے صالح میں کی۔ ان کے دو بچے تھے۔ ان کا ایک بیٹا ڈاکٹر فضل الرحمٰن، فیلڈ مارشل صدر ایوب خان کے وقت ادارہ تحقیقات اسلامی۔ اسلام آباد کا صدر بنایا گیا۔ آخر میں ان کو اس ادارہ سے بوجوہ الگ کر دیا گیا۔ ان کا دوسرا بیٹا آجکل نارووال کالج کے پرنسپل ہیں۔

مولانا شہاب الدین صاحب خود بڑے "متشدد" توحید پرست تھے۔ اخبار شہاب سے الگ ہونے کے بعد چوبرجی کواٹرز، لاہور میں خطیب مقرر ہوئے۔ درس کا شغل جاری رکھا۔

بقول ملک محمد عالم صاحب وہ بہت زندہ دل انسان اور توحید پرست تھے۔ اللہ کے ساتھ شرک کو بہت ناپسندیدہ سمجھتے تھے اور اسی وجہ سے اکثر لوگوں سے مخالفت رہتی تھی۔

د: قاضی عزیز الرحمٰن صاحب ساکن سرائے صالح

آپ مولانا غلام ربانی لودھی کے بھائی ہیں۔ آپ کا "پیغام سرحد" ہری پور مدت سے ان کی ادارت میں جاری ہے۔ آپ کافی عرصہ سے صاحبِ فراش ہیں۔ تجربہ کار اور اہلِ علم صحافی ہیں۔

آپ کی بیماری فالج اور زبان بندی کی وجہ سے پہلے تو ان کے بیٹے اخبار چلاتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد قاضی صاحب کے پوتے ایڈٹ کرتے رہے۔

وفات قاضی صاحب سترہ سال بیمار رہنے کے بعد ستمبر ۱۹۷۰ء کے پہلے ہفتے میں انتقال کر گئے۔ اور ان کی زندگی کے ختم پر ان کی جلائی ہوئی شمع "پیغام سرحد" بھی بجھ گئی۔ کیونکہ ڈیکلریشن قاضی صاحب مرحوم کے نام پر تھا۔ خدا تعالیٰ ان کی خدمت خلق اور طویل بیماری کی صعوبت کے پیش نظر ان کو آخرت میں بلند درجات عطا فرمائے۔ آمین

۴۔ مظلوم

۱۹۳۰ء کے لگ بھگ ضرغام اللہ خان صاحب ساکن لالوگلی جو ایک وقت میں نواب امب خانیزمان کے وزیر تھے اور ان کے زیر عتاب آکر، راولپنڈی میں مقیم تھے، نے یہ اخبار نکالا جس کا مقصد ریاست امب کے نظم ونسق پر جرح کرنا تھی۔ بعد میں شاید نواب امب نے ان کو واپس بلا لیا اور یہ اخبار بند ہوگیا۔

ضرغام اللہ صاحب اور ان کا خاندان آپ کے والد شیخ عبداللہ صاحب، کیا کھیل سے آئے تھے۔ ان کے پانچ بیٹے تھے، جن میں چار مشہور ہوئے اور ریاست امب میں نواب صاحب کے جمعدار د بمعنی وزیر رہے۔

۱۔ رحمت اللہ صاحب المعروف بہ وزیر صاحب۔ ۲۔ ضرغام اللہ صاحب، مشیر مال۔
۳۔ صفی اللہ صاحب، محکمہ عدالت، ۴۔ عبدالرحمن صاحب، محکمہ جنگلات۔

اول الذکر تینوں بھائی اپنے وقت کے اہل علم تھے۔ سیاسی ذوق و مہارت رکھتے تھے اور نواب محمد اکرم خان کے ملازم تھے۔

زمانہ ولیعہدی نواب خانیزمان خان میں یہ ان کے ساتھ ایک قسم کے لنگوٹیے یار تھے۔ جب نواب محمد اکرم خان نے ۱۹۰۵ء ولیعہد خانیزمان خان کو گرفتار کر کے ریاست کے ایک دور دراز گاؤں میں نظر بند کر دیا، تو ان تینوں بھائیوں کو ملک بدر کر دیا۔

جب نواب محمد اکرم خان جنوری ۱۹۰۷ء میں فوت ہوا اور خانیزمان خان نواب ہوا تو اس

نے ان چاروں بھائیوں کو اپنے پاس بلالیا۔ ان کا اثر ورسوخ خانیزمان خان پر بہت زیادہ تھا۔ یہ اس کے پہلے سے لنگوٹیے تھے ۔اس کی ولیعہدی کے زمانے میں ہی انہوں نے اپنے گاؤں لالوگلی میں ایک بڑی حویلی بنائی اور اس کو باور کرایا تھا کہ یہ اس کے لئے بنائی ہے۔

اس کی نوابی کے زمانہ میں خالصہ میں کاگ سما گاؤں رہن خرید لیا، کیونکہ اس وقت غیر زراعت پیشہ پر بیع بند تھی ۔معلوم ہوتا ہے کہ اس سے نواب کو بدگمانی پیدا ہوئی اور ان سب کو ۱۹۱۸ء میں جلاوطن کر دیا۔ ۱۹۲۰ء میں پھر ان کو بلالیا اور یہ برسر اقتدار آگئے ۔ ۲۵-۱۹۲۴ء میں ان کو پھر ریاست بدر کر دیا۔

اس کے بعد یہ لالوگلی میں متذکرہ حویلی میں رہتے تھے ۔ضرغام اللہ صاحب نے پنڈی کے ایک معزز خاندان میں شادی کی ہوئی تھی، لہٰذا وہ راولپنڈی چلے گئے اور طباعت شروع کر دی۔ ان ایام میں ان کا رسم وراہ ،ملک محمد عالم اعوان، ملک امیر عالم اعوان وغیرہ سیاسی کارکنوں سے پیدا ہوگئی ۔ان کے اثر سے انہوں نے اخبار "مظلوم" جاری کر دیا۔

اخبار کے اجراء کی تھوڑی مدت بعد ضرغام اللہ صاحب کو نواب صاحب نے بلالیا اور وہ مستقل طور پر ۳۱-۱۹۳۰ء، خان پھلڑہ سے وابستہ ہوگئے ۔نواب صاحب امب کے پاس بھی وقتاً فوقتاً جاتے رہتے تھے ۔ان کے بڑے بھائی رحمت اللہ صاحب نواب امب کے پاس ہی رہے اور ۵۴-۱۹۵۳ء میں فوت ہوئے۔

ان کے بھائی صفی اللہ صاحب کی وفات ۲۹-۱۹۲۸ء میں ہوئی اور ضرغام اللہ صاحب ۱۹۴۰ء میں فوت ہوئے۔

۵۔ نوجوان افغان۔ ہفتہ وار

۱۹۳۳ء میں ہری پور سے شائع ہونا شروع ہوا۔ ادارہ تحریر یہ مجاہد وطن لالہ محمد اکبر خان قریشی (ہری پور)، محمد سرور خان طاہر خیلی ماہر سیاست و غیرت ہزارہ اور تاج محمد خان طاہر خیلی مجسمہ جرأت افغانی تھے۔ یہ اخبار ۱۹۳۸ء تک جاری رہا، جب ڈاکٹر خان صاحب کی کانگرسی حکومت نے اس کی ضمانت ضبط کر لی۔

شاید ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ محمد سرور خان طاہر خیلی اور لالہ محمد اکبر خان قریشی نے کلی طور پر زمام ادارت تاج محمد خان کے حوالے کر دی۔ ان کے بعد غلام جان خان طاہر خیلی عملہ ادارت میں شامل ہوئے۔

مدیران "نوجوان افغان" کی سوانح

ا۔ لالہ محمد اکبر قریشی مرحوم آپ ہری پور کے قریشی خاندان معروف بہ خاندانِ رسالداریان کے چشم و چراغ تھے۔ طبعاً خاموش، مگر جہادِ آزادی کی شمع سینہ میں فروزاں رکھتے تھے۔ عالمگیر جنگ اول ختم ہونے کے نزدیک تھی۔ اس کے طفیل قومی آزادی کی تحریک جنبش میں آچکی تھی۔ اسلامیہ کالج پشاور میں، مجاہدین آزادی کے کاروان کے آپ سرخیل تھے۔ خاموشی سے سفر جہاد کی تیاری میں مصروف رہتے اور اس غرض کے لئے روزانہ دس پندرہ میل پیدل سفر بصورت سیر کرتے اور کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ آپ یہ مشق کس ارادہ سے کر رہے ہیں۔ اس کا راز ۱۹۲۰ء میں کھلا، جب انگریزوں نے ترکی کے حصے بخرے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے بعد، آپ پانچ ہمراہیوں سمیت، اسلامیہ کالج سے پیدل افغانستان کے لئے روانہ ہو گئے اور آزاد علاقہ مہمند میں تحریک حریت و آزادی کے سرخیل حاجی صاحب ترنگ زئی کے پاس پہنچ گئے۔ پھر وہاں سے افغانستان اور پھر روس چلے گئے۔ کم و بیش دس سال وہاں گزارنے کے بعد جب وطن واپس آئے تو حکومت انگریزی نے ان کو گرفتار کر لیا۔ تقریباً آٹھ سال جیل میں گزارے۔ رہائی کے بعد متعدد خدمت خلق کے ادارے بنائے۔ جب یہ ادارے کامیاب ہو گئے تو ان کو مختلف اصحاب کے حوالے کر کے خود شغل باغبانی میں مصروف ہو گئے۔ ان کی "ہزارہ نرسری" پاکستان کی مشہور نرسری ہے۔

وفات آخر کار یہ سرگرم صاحبِ عمل مجاہد، زندگی کے گرم و سرد کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے یکم مارچ ۱۹۷۲ء کو ابدی نیند سو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ب: محمد سرور خان طاہر خیلی آپ سلم کھنڈ (تحصیل ہری پور) کے معزز خانوادے کے فرد تھے۔ ان کا خاندان طاہر خیلی قوم کا سربراہ رہا۔ انگریزی تسلط کے وقت ان کا خان، خانزمان خان تھا، جس نے انگریزی اطاعت قبول نہ کی اور پار دریائے سندھ

(علاقہ آزاد) میں زندگی گزار دی۔ اس خاندان کے خون میں ہمیشہ جذبہ حریت رہا۔ سلطان عبدالرشید خان، مجاہد وطن محمد سرور خان کا بھتیجا تھا، جو تحریک آزادی کے دوران ۱۹۲۱ء میں گرفتار ہوا۔

خاندان طاہر خیلی، اتمان زئی قبیلہ کی ایک شاخ ہے۔ ان کا مکمل عمل دخل (کوہ گندگڑھ کے مغربی اور جنوبی دامن)، احمد شاہ ابدالی کے وقت ہوا۔ ان کا مورثِ اعلیٰ بلند خان پسر طاہر خان، پانی پت کی لڑائی میں احمد شاہ ابدالی کے ساتھ رہا۔

تعلیم

میٹرک کا امتحان مشن ہائی سکول راولپنڈی سے لی اور وکالت کی ڈگری علی گڑھ سے حاصل کی۔

ملازمت

۱۹۱۳ء میں جب اسلامیہ کالج پشاور کھلا، تو امیدوار استادوں کی انتخابی ملاقات میں سر نواب صاحبزادہ عبدالقیوم خان، آنریری سیکرٹری اسلامیہ کالج کو اپنی ذہانت اور قابلیت سے اتنا مؤثر کر لیا کہ انہوں نے سب سے پہلے ان کو سٹاف کا رکن منتخب کر لیا۔ اس انتخاب میں سکول اور کالج کے لئے بڑی بڑی ڈگریوں والے اساتذہ مثل عنایت اللہ خان المشرقی جیسے لوگ چنے گئے۔ محمد سرور خان، اسلامیہ کالجیٹ سکول کے تھرڈ ماسٹر چنے گئے اور قیوم ہاسٹل کے سپرنٹنڈنٹ بنائے گئے۔

۱۹۱۵ء میں سکول کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور علی گڑھ جا کر وکالت کی ڈگری حاصل کر لی۔ ۲۰-۱۹۱۹ء میں اسٹنٹ کمشنر ہو گئے۔ ہری پور کی تعیناتی کے دوران، مقامی جنبہ، پرہ سے تنگ آکر ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور وکالت شروع کر دی۔

سرحد اسمبلی

۱۹۳۶ء کے انتخاب میں سرحد اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور ہزارہ کے منتخب ممبروں کو ملا کر ڈیموکریٹک پارٹی بنائی۔ صاحبزادہ عبدالقیوم خان نے اپنی وزارت میں کسی ممبر کو نہ لیا، تو اس پارٹی نے کانگرس سے اتحاد کر کے حزبِ اختلاف میں شامل ہو گئے اور ۳، دسمبر ۱۹۳۷ء کے اجلاس اسمبلی منعقدہ ایبٹ آباد میں سر صاحبزادہ صاحب کی وزارت کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ پاس کرا دیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر خان صاحب نے جب وزارت بنائی تو محمد عباس خان مرحوم ساکن مانسہرہ کو اپنی وزارت میں لے لیا۔ اس کے بعد سے ہر وزارت میں ہزارہ کو حصہ ملتا رہا۔ آپ کی وفات اپریل ۱۹۴۷ء میں ہوئی۔

ج: تاج محمد خان اور غلام جان خان کے سوانح اخبار "نوجوان سرحد" اور "جمہور" کے تحت دئے جارہے ہیں۔

۶۔ نوجوان سرحد

۱۹۳۸ء میں تاج محمد خان طاہر خیلی کی ادارت میں یہ اخبار شائع ہونا شروع ہوا۔ غلام جان خان بھی ادارہ تحریر میں شامل تھے۔ "نوجوان سرحد" کی پیشانی پر یہ شعر درج ہوتا تھا جو اس کے عزائم کا مظہر رہا ؎

تندئ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے

یہ حقیقت ہے کہ اس اخبار کا شہباز، اوجِ آسمان، پر اڑتا ہوا۔ نشیب و فرازِ ارضی پر عقابی نظر رکھتا تھا۔ اس کے بے باک اداریے، آزادی خیالات اور قومی مسائل توجہ کے مظہر ہوتے تھے اس میں وقتی اور وطنی مسائل پر مفید تبصرے ہوتے۔ ظرافت قلمی کی نوک و نشتر خوب بہار دکھاتے۔ غلام جان ۱۹۴۸ء میں نوجوان افغان سے الگ ہو گئے اور اپنا اخبار "جمہور" نکالا۔

"نوجوان سرحد" کے آخری چند سالوں میں عالمانہ اداریے اور مسائل دینی پر بصیرت افروز مقالے، مولانا غلام ربانی لودھی مرحوم کے قلم سے ہوتے تھے۔ افسوس کہ یہ اخبار تاج محمد خان کی وفات ۱۹۷۳ء کے بعد بند ہو گیا۔

سوانح زندگی تاج محمد خان آپ یکم ستمبر ۱۹۰۱ء میں موضع خالور بر لب دریائے سندھ، نزد موضع غازی، تحصیل ہری پور، میں پیدا ہوئے۔ پرائمری تعلیم غازی سکول، مڈل اور میٹرک ہری پور سے کیا۔

سیاسی زندگی آپ شروع ہی سے کانگرس کے سرگرم کارکن تھے۔ ۱۹۳۰ء کی تحریک آزادی میں جیل بھی گئے۔ بعد میں اختلاف رائے کی وجہ سے کانگرس سے الگ ہو گئے اور آخر دم تک اس کے مخالف رہے۔ سرحد کے ان چند اخبار نویسوں میں سے تھے جنہوں نے اپنے پیشے کے وقار کو قائم رکھنے کے لئے اپنی ہستی کی بازی لگا دی۔

وفات: آپ مدت سے خون کے دباؤ کے مریض تھے۔ ایک دو بار فالج کے حملے ہوئے آخری

حملہ ۳ر مارچ ۱۹۷۲ء نے ان کی جان لے لی۔

اولاد آپ کا اکلوتا بیٹا، رضا علی خان اپنے نامور باپ کا خلف الرشید بیٹا ہے۔ ایٹمی توانائی کی اعلیٰ ڈگری کا حامل ہے اور امریکہ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔

۷۔ اسرار سرحد

"اسرار سرحد" کو جان فقیرا خان جدون نے ۲۱۔۱۹۲۰ء میں ایبٹ آباد سے شائع کیا۔ یہ ہفتہ وار اخبار تھا۔ چند سال جاری رہا۔

۸۔ انکشاف

"اسرار سرحد" کے بعد فقیرا خان نے ۱۹۴۱ء میں یہ اخبار جاری کیا۔ اس کی اشاعت بے قاعدہ ہوتی تھی۔ کئی کئی ماہ بعد، جب مطلوبہ مواد اکٹھا کر لیتے تو اس کو شائع کر دیتے۔ مضامین کا ہدف کوئی بڑا آدمی ہی ہوتا۔ عموماً خلاف لکھتے، لیکن کبھی کسی کے حق میں بھی لکھتے۔

مضمون کو ظرافت، طنز کی بھول بھلیوں میں سجا کے مقصد و موضوع اس طرز پر تحریر کرتے کہ قانونی گرفت میں نہ آسکے۔ نشانہ ہدف پر خوب لگتا اور پڑھنے والوں کی محفل کو کشت زار بنا دیتا۔ اس اخبار کی پیشانی پر یہ شعر درج ہوتا تھا ؎

نکالا ہے، فقیرا خان نے اخبار
کرے گا منکشف اسرارِ سرحد

شخصیت خان فقیرا خان جدون صوبہ سرحد کی پر اسرار شخصیت ہے۔ آپ اکتوبر ۱۹۱۰ء میں موضع دھمتوڑ (تحصیل ایبٹ آباد) میں پیدا ہوئے۔ مسلم لیگ ہزارہ کے نائب صدر رہے۔ آخر میں قائداعظمؒ نے ان کو مرکزی مجلس عاملہ لیگ کا ممبر بھی بنا لیا تھا۔ قائداعظمؒ کی معیت میں ایک فوٹو کھنچوایا تھا، جو ان کے کمرے میں آویزاں تھا۔ قائداعظمؒ کے ساتھ اتنے تعلقات تھے، کہ ان کی وفات کے بعد مس فاطمہ جناح سے قائداعظمؒ کی ذاتی موٹر بطور یادگار حاصل کر لی۔ پاکستان بھر میں اپنی مثال آپ تھے۔ ہمیشہ او نچے طبقے کی تجوریاں کھلوا کر غریبوں میں بانٹتے رہتے

ان کا اخبار "انکشاف" سرحد کا اخبار "ریاست" تھا۔

آپ کی تعلیم شاید مڈل تک تھی لیکن طرزِ گفتگو، آدابِ مجلس، طرزِ بودوماند اعلیٰ طبقہ کی طرح تھی آپ بڑے ہی نحراج تھے۔ دماغ بڑا زرخیز پایا تھا۔ ہر محفل میں سب پر چھا جاتے۔ دستر خوان، ہمیشہ افسران، وزیرانِ حکومت اور اکابرینِ قوم کے لئے کھلا رہتا۔ بہترین خانساماں رکھتے۔ دستر خوان پر بہترین الوانِ نعمت چنے جاتے تھے۔ وقت کے بڑے پابند تھے، ٹھیک وقت پر کھانا میز پر چنا جاتا تھا۔ خواہ کیسا ہی معتبر مہمان وقت پر حاضر نہ ہوا ہو، کھانا شروع کرا دیتے۔

کھانا کے بعد گپ شپ کے بعد ٹھیک ٹائم (عموماً ۹ بجے رات)، مؤدبانہ دست بستہ کھڑے ہو کر مہمانوں کو مخاطب کرتے، شکریہ ادا کرتے اور کہتے "اب آپ تشریف لے جا سکتے ہیں"۔

اپنی حاضر دماغی اور ظرافت طبع سے بڑے بڑے کام سرانجام دئے۔ لاکھوں کمائے اور خرچ کر دئے۔ بڑے بڑے نوابوں اور امراء سے رابطہ رہا۔ حتیٰ کہ نظامِ دکن سے بھی راہ و رسم رہی۔ قائد اعظمؒ کے ساتھ خصوصی لگاؤ تھا۔

۹۔ شمشیر سرحد

سردار کرپال سنگھ کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا۔ تاریخ اجراء اور مدت اشاعت معلوم نہ ہو سکی اور نہ ہی کرپال سنگھ کے سوانحی حالات۔

۱۰۔ پیغام سرحد

"پیغام سرحد" ہفتہ وار ۱۹۳۱ء میں ہری پور سے زیرادارت قاضی عزیز الرحمٰن صاحب ساکن سرائے صالح شائع ہونا شروع ہوا۔ چالیس سال سے زائد عرصہ تک جاری رہا۔ اس کی پیشانی پر یہ شعر تھا ؂

الہیٰ چار سو آفاق میں گونجے صدا اس کی
کہ مسلم کا حقیقی ترجمان "پیغام سرحد" ہے

یہ شعر اس کے اسلامی عزم و عمل اور خدمت اسلام کا مظہر ہے۔ اس کا مقصد اسلام کی ترجمانی

تھا۔ اس میں ضلع کے مفصل حالات اور خبریں بھی شائع ہوتی تھیں۔ قاضی عزیز الرحمٰن صاحب کہنہ مشق اور عالم شخصیت ہیں۔ اب کافی مدت سے بیمار اور خانہ نشین ہیں۔ لیکن اخبار جاری ہے۔

۱۱۔ پاکستان

"پاکستان" ہفتہ وار ۱۹۳۹ء میں ایبٹ آباد سے زیر ادارت سید غلام حسین کاظمی شائع ہونا شروع ہوا۔

کاظمی صاحب موضع ٹھنگر، آزاد کشمیر کے رہنے والے ہیں۔ اب بوڑھے ہو چکے ہیں۔ تاریخ کے محقق، ریسرچ سکالر ہیں۔ مولانا غلام ربانی لودھی مرحوم سے خاص تعلق تھا۔ مولانا فرماتے تھے کہ کاظمی صاحب نے ان سے فارسی تصانیف کا درس لیا تھا، جبکہ مولانا اور کاظمی صاحب، دونوں لاہور میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ کاظمی صاحب آغا لعل شاہ صاحب مرحوم سابق ایڈیٹر "زمیندار" کے داماد اور بھتیجے بھی ہیں۔

۱۲۔ جمہور

"جمہور" ہفتہ وار ۱۹۴۸ء میں زیر ادارت غلام جان خان طاہر خیلی، ہری پور سے شائع ہونا شروع ہوا۔ اس وقت تک پابندی سے وقت پر شائع ہوتا ہے۔ طباعت بہت صاف اور خوشخط، اچھے کاغذ پر ہوتی ہے۔ اس میں محکمہ جات سرکاری کی کارکردگی، مقامی خبریں، تاریخی مضامین اور مختلف مسائل پر تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ سیاسی روش معتدل اور حکومتِ وقت سے سازگاری کی ہوتی ہے۔

۱۹۵۱ء میں ایبٹ آباد سے شائع ہونا شروع ہوا۔

سوانح غلام جان خان طاہر خیلی

آپ ۱۹۱۲ء میں موضع میاں ڈھیری برلب دریائے سندھ علاقہ غازی، تحصیل ہری پور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں "نوجوان افغان" ہری پور کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کے طور پر صحافتی زندگی کا آغاز کیا اور گیارہ برس تک اس اخبار میں کام کرتے رہے۔ ۱۹۴۸ء میں اپنا پرچہ "جمہور" نکالا۔ آپ سرگرم سیاسی

کارکن اور کہنہ مشق صحافی ہیں۔

ان کا اخبار اب تک (۱۹۸۰ء) اسی شان سے جاری ہے۔

۱۳۔ مضراب

"مضراب" ہفتہ وار ۱۹۵۰ء میں زیر ادارت حکیم عبدالعزیز چشتی ایبٹ آباد سے شائع ہونا شروع ہوا۔ سیاست ملکی اور مقامی حالات پر مضامین ہوتے تھے۔ ۱۹۵۹ء کے ابتدا میں زمانہ مارشل لاء میں بند کر دیا گیا۔

حکیم عبدالعزیز صاحب چشتی، پرانے سیاسی کارکن ہیں، ہر مقامی تحریک میں بھرپور حصہ لیتے رہے۔ آپ شروع سے ہی مسلم لیگ سے وابستہ رہے اور خان بہادر جلال الدین مشہور سیاسی لیڈر کے دست و بازو رہے ہیں۔ آج کل بھی قیوم لیگ کے مقامی انچارج ہیں۔ باوجود صحت کی کمزوری کے پوری ہمت سے کام کر رہے ہیں۔

۱۴۔ نقیب

"نقیب" ہفتہ وار ایبٹ آباد سے ۱۹۵۳ء میں زیر ادارت ناشاد صاحب طاہر خیلی شائع ہونا شروع ہوا۔ تھوڑی مدت ہی جاری رہا۔

سوانح، دلاور خان۔ ناشاد، طاہر خیلی

آپ ایک کہنہ مشق صحافی تھے۔ ترقی پسند خیالات رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی صحافت کا آغاز دوسری جنگ عظیم میں کیا اور مصر میں ایک اردو فوجی اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت میں تین سال تک فرائض انجام دیتے رہے۔ ہندوستان واپس آنے پر "زمیندار" اخبار لاہور سے منسلک ہو گئے۔

قیام پاکستان کے بعد اپنا ہفتہ وار اخبار "نقیب" ایبٹ آباد سے فروری ۱۹۵۳ء میں جاری کیا۔ مگر یہ اخبار اپنی آزادی کی وجہ سے چل سکا۔ چنانچہ آپ نے روزنامہ "زمیندار" راولپنڈی کے ایڈیٹر انچارج کی حیثیت سے دوبارہ ملازمت اختیار کر لی۔ مگر ڈھائی برس بعد آپ پشاور چلے گئے اور روزنامہ "شہباز" پشاور سے منسلک ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد "بانگ حرم" پشاور سے

وابستہ ہو گئے۔

وفات۔ ۱۳ر جولائی ۱۹۷۰ء میں آپ کی وفات ہوئی۔

۱۵۔ الجہاد

ہفتہ وار "الجہاد" مانسہرہ سے جاری ہوا۔ تاریخ اجراء ۱۹۴۴ء ہے۔ اس کے مدیر مولوی شمس الہدیٰ تھے۔ آپ سیاح تھے۔ الجہاد کے اجراء سے پہلے آپ نے دس سال تک دنیا کے چپہ چپہ کی سیاحت کی۔ تبلیغی قسم کے آدمی تھے۔ گفتگو بڑی شستہ، رواں اور معلومات کا خزانہ ہوتی تھی۔

۱۶۔ ترجمان

مجلہ "ترجمان" ماہانہ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۲ء تک سرائے صالح ڈہری پور سے جاری رہا۔

مدیران | مجلہ پر حضرت مولانا غلام ربانی لودھی کا نام بطور ایڈیٹر درج ہوا کرتا تھا۔ لیکن "زمیندار" لاہور کے آخری دور کے ایڈیٹر مولانا خدا بخش اظہر مرحوم اس مجلہ کے اجراء کی تمام ذمہ داریاں نباہتے رہے۔

یہ مجلہ ادبی حیثیت سے صوبہ سرحد کا غالباً واحد پرچہ تھا، جو ملک امیر عالم خان، اعوان کی تجویز اور سرائے صالح کے لودھی قبیلہ کے نوجوانوں ماسٹر خلیل الرحمٰن، مولوی منظور حسین اور غلام جیلانی کے اصرار پر جاری کیا گیا تھا۔ یہ پرچہ علمی، ادبی، مذہبی اور تاریخی حقائق و معارف کا مبلغ تھا۔ اس مجلہ کا ڈیکلریشن مولانا غلام ربانی لودھی نے مسٹر ہاپکنسن ڈپٹی کمشنر ہزارہ سے حاصل کیا، جو ایک علم دوست انگریز افسر تھا۔

مولانا فرماتے تھے وہ کراس کھلے اور بے تکلف طبیعت کے انگریز سے ڈیکلریشن منظور کرانے میں ذرا دیر نہیں لگی اور منظوری دیتے ہوئے اس کی پیشانی پر مسرت اور بشاشت کھیل رہی تھی۔

۱۷۔ معاشرہ

ہفت روزہ "معاشرہ" ایبٹ آباد ملک محمد عالم خان اعوان بی۔ اے جامعہ کے زیرادارت

یکم مئی ۱۹۷۰ء جاری ہوا۔

مدعا و مقصد معاشرہ کی اصلاح ہے۔ معاشرہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ کسی قوم کے رہن سہن کا طریقہ، آپس کے تعلقات، معاملات کی صفائی، ایک دوسرے کی عزت و تکریم، اپنے دوسرے بھائی کا پورا پورا احترام ہی معاشرہ کہلاتا ہے۔ معاشرہ میں کوتاہیوں کو دور کر کے اس کی اصلاح کرنا ہی ہمارا مقصد و مدعا ہے۔ معاشرہ کا نصب العین، معاشرہ کی بہبود و اصلاح، معاشرہ کی مجلسی برائیوں اور آپس کے لین دین اور معاملات کی اصلاح اور ملک میں اسلامی نظریات کی حمایت کرنا ہے۔ اس میدان میں میانہ روی ہمارا شعار ہوگا۔ سیاست میں الجھاؤ ہمارا مقصد نہیں ہے۔

مدیر ملک محمد عالم خان بی۔اے (جامعہ)، سابق ایڈیٹر شہاب راولپنڈی اور ریٹائرڈ سیکشن آفیسر حکومت مغربی پاکستان ہیں۔ آپ کہنہ مشق اخبار نویس ہیں۔ مولانا محمد اسحٰق صاحب مانسہرویؒ کے بعد صوبہ سرحد اور بالخصوص ضلع ہزارہ میں تحریک آزادی کے علمبرداروں میں سے ایک ہیں جنہوں نے قید و بند اور اپنے صوبہ سے جلاوطنی کے مصائب برداشت کئے۔ راولپنڈی سے "شہاب" جاری کیا جس نے اصلاحات نافذ کرانے اور صوبہ سرحد کو باقی صوبہ جات کے مساوی درجہ دلانے میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم کے شاگرد ہیں۔

۱۹۷۲ء کے آخر میں بے مہری زمانہ سے نذر اجل ہو گئے۔

ہزارہ کا ایک ہندو صحافی

نانک چند ناز یہ موضع غازی، تحصیل ہری پور کا رہنے والا تھا۔ مڈل سکول ہری پور میں میرا ہم جماعت تھا۔ اس وقت ہی اس کو شاعری کا چسکہ تھا۔ مہاسبھائی ذہن رکھتا تھا۔ اس نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز، راولپنڈی سے اخبار "شانتی" کے اجراء سے کیا۔ اس کے بعد "بندے ماترم" اور روزنامہ "پرتاپ" لاہور میں کام کرتا رہا۔ ۱۹۴۲ء میں اپنا روزنامہ "پربھات" جاری کیا، جو تقسیم کے بعد جالندھر منتقل ہو گیا۔ یہ اخبار اتنا کامیاب تھا کہ تقسیم کے وقت آپ نے ایک لاکھ روپے کی مالیت کے دو بنگلے چھوڑے۔

لطیفہ: ایک محفل میں شریف مکہ کا یوں ذکر آگیا کہ اس نے ترکوں سے بڑی غداری کی۔

مولانا مرتضیٰ خان میکش نے کہا ع

چو کفر از کعبہ برخیزد، کجا ماند مسلمانی

نانک چند ناز فوراً بول اٹھے کہ اگر مسلمانی کو کہیں جگہ نہیں ملتی، تو ہمارے گھر کیوں نہیں آجاتی۔

سالک صاحب نے کہا۔ لالہ جی! اگر میں آپ کے جواب میں علامہ اقبالؒ کا یہ مصرعہ پڑھوں ع

عروس لالہ مناسب نہیں، مجھ سے حجاب

یہ سن کر لالہ جی اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

۱۸۔ نشیمن

یہ ہفت روزہ ایبٹ آباد سے جاری ہوا۔ کاغذ کتابت اور طباعت دیدہ زیب ہوتی ہے۔ تاریخِ اجراء سے ہر ہفتہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کے صفحات بنیادی طور پر علمی و تاریخی مضامین سے مزین ہوتے ہیں۔ ملک کے سیاسی حالات پر تجزیہ ہوتا ہے۔ مقامی خبریں اور عوامی مطالبات و ضروریات پر حکومت کی توجہ دلائی جاتی ہے۔ نئے لکھنے والوں اور ہزارہ کے شاعروں کی طبع آزمائی کے لئے، اس کے صفحات کھلے ہوئے ہیں اور ان اصحاب کی خاص حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، جو ایک قومی خدمت ہے۔

مدیر

ملک غلام ربانی صاحب اس کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ آپ موضع کاکوٹ، تناول پائیں علاقہ تھانہ شیروان کے رہنے والے ہیں۔

پیدائش و تعلیم

آپ کی پیدائش ۱۹۲۰ء ہے

ابتدائی تعلیم مڈل تک شیروان سکول میں حاصل کی۔ اس کے بعد اپنے والد صاحب کے ساتھ بمبئی چلے گئے اور وہاں انجمن اسلامیہ ہائی سکول سے میٹرک پاس کیا۔

بمبئی کا شہر رومانی شہر ہے۔ وہاں پر ان کو افسانوں اور ناولوں کے مطالعہ کا شوق ہوا۔ اس ضمن میں وہاں کی مختلف لائبریریوں میں جاتے رہے اور اپنے شوق کی تسکین کا سامان ڈھونڈتے رہے۔ ادبی انجمنوں کے اجلاسوں اور مشاعرہ کی محفلوں میں حاضر ہوتے رہے۔ اس دوران مختلف ملازمتیں بھی کیں۔

وطن واپسی اور مزید تعلیم ۱۹۴۷ء میں وطن واپس آئے اور فارسی کا امتحان فاضل پنجاب یونیورسٹی سے اعلیٰ نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ تمام یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ اس کے بعد اردو فاضل کا امتحان فسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔

ملازمت امتحانات پاس کرنے کے بعد آپ محکمہ تعلیم سرحد میں مشرقی علوم کے مدرس داور ٹیل ٹیچر، لگ گئے۔ ۲۵ سال ملازمت کی اور پنشن حاصل کی۔

"نشیمن" کا اجرار فطری لگاؤ، بچپن ہی سے ادب و فن سے رہا۔ شاعروں کے نکتہ شناس اور اردو ادب سے لگاؤ کی وجہ سے اس کے شیدائی ہیں، بلکہ جان نثار ہیں۔ اسی جذبہ کے تحت ہفت روزہ نشیمن نکالا، جس کی ہمہ جہت ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھا رکھی ہے۔

اردو ادب و کلام سے بے مہری زمانہ کے باوجود اخبار کے اخراجات کا بوجھ حوصلہ و ہمت سے اٹھائے جارہے ہیں، جس کے لئے وہ قوم کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

بابِ نہم

ہزارہ کے عُلمائے کرام و صُوفیائے عُظّام

مسلمانوں کے دینی رہنما ہونے کی حیثیت سے طبقہ علماء سے جو عظمت و تقدس والبستہ ہے وہ کسی بھی دوسرے مذہب کے پیشواؤں کو نصیب نہیں۔ عام مسلمان اپنے علماء دین کو اپنی ایک مخصوص قلمرو کا شہنشاہ سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ اگر ان کے ایک ہاتھ میں مذہبی امور میں مسلمانوں کی قیادت کا عَلَم ہے تو دوسرے میں دنیوی امور کے مسائل حل کرنے کا اختیار و قابلیت کا پروانہ ہے۔ ہمارے دنیوی مسائل دینی اور مذہبی اختیارات کے احاطۂ اثر سے باہر نہیں۔ مذہبی دینِ اسلام، علماء کو عام مسلمانوں کے، دنیوی امور میں قیادت کے اختیار سے محروم کرتا ہے۔ اس لئے ہم انتہائی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے علماء ہی، ہمارے ملی مسائل کے گرہ کشا اور قومی روایات و اقدار کے محافظ ہو سکتے ہیں۔ ملک و ملت کے جملہ مسائل میں انہی کی رائے قولِ فیصل کا درجہ رکھتی ہے۔ قرآن و حدیث، فقہ و اصول، مذہبی روایات و دینیات اور تاریخ اسلام کی فہم و فراست میں سروری کے بجا طور پر وہی حقدار ہیں۔ تاریخ اسلامی کے ہر دور میں ان کا وجود، عوام کے لئے روشنی کا مینار رہا ہے۔ ہندوستان میں شہنشاہ اکبر ایسا آزاد منش، لیکن شاطر سیاستدان بھی ان کے قرب اور اہمیت سے صرفِ نظر نہ کر سکا۔ آج اس پر آشوب زمانہ میں ہم اپنے عظیم المرتبت علماء سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

ملت کی تعمیر اور احیائے دین کی خاطر صرف ہندوستان ہی میں ہمارے پاس علماء کے شاندار اور مجاہدانہ ماضی کی سبق آموز تاریخ کے انبار لگے ہوئے ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے زوال کے آثار نمایاں ہوتے ہی ہمارے ذوی القدر علماء میدانِ جہاد

میں اتر آئے تھے۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں ابھی کل ہی کی بات ہے کہ سید احمد شہید، شاہ اسمٰعیل شہید اور ان کی جماعتِ مجاہدین نے، میدانِ جہاد میں اپنا فرض ادا کیا تھا۔ مولانا عنایت علی اور ان کے بھائی مولانا ولایت علی صادق پوری، مولانا احمد اللہ، مولانا محمد جعفر تھانیسوری وغیرہ بیسیوں علماء کے مجاہدانہ کارناموں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا، جنہوں نے احیاءِ دین و ملت کی خاطر جانیں لڑا دیں۔ اپنی عمریں کالے پانی میں جلاوطنی اور قید میں گزار دیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلسل تحریکِ آزادی، ان علماء کی جانبازیوں کی داستان ہے۔ ریشمی رومال کی تحریک (جس کا مرکزی کردار شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ تھے) اس سلسلہ کی آخری کڑی تھی۔ اس تحریکِ آزادی میں لاتعداد علماء اور ان کے متبعین نے اپنی جانیں قربان کیں۔ شاہی مسجد دہلی میں پانچ سو مسلمانوں کو یکبار پھانسی دی گئی۔ ہندوستان کو آزادی کا چسکہ بھی ان مسلمانوں نے لگایا۔ ان کی یہ قربانیاں ایک ایسے نیک مقصد کے لئے تھیں، جس کی عکاسی یہ شعر کرتا ہے ؎

مقصدے از آسمان بالا ترے

دل ستانے، دلربائے، دلبرے

میں نے ہزارہ کے علماء و مشائخ کے حالات طبع اول میں بہت تلاش کے بعد، جو میسر آسکے، لکھے کیونکہ اس سے پہلے اس طبقہ کا ذکر سرحد یا ہزارہ کے کسی تاریخی تذکرے میں نہ مل سکا۔ لیکن میری کتاب کے چھپ جانے کے بعد بہت سے اہلِ قلم نے اس طرف توجہ کی اور کتابیں لکھیں۔ خاص کر مولانا حضرت سید محمد امیر شاہ صاحب قادری، الپشاوری کی کتابیں علماء و مشائخ سرحد و تذکرہ الحفاظ سرحد شائع ہوئیں جو تفصیل اور خوبیٔ طباعت میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ ہزارہ کے اہلِ قلم پروفیسر فیض الرحمانؒ صاحب صدر شعبہ اسلامیات گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد نے بہت سا مواد جمع کیا اور شائع بھی کیا۔

میں نے اس طباعت میں چند چیدہ اور مجاہد علماء ہزارہ کا ذکر بطور تبرک کرنا ہی مناسب سمجھا کیونکہ مجھ سے بہتر اہلِ علم و قلم نے لکھنا شروع کر دیا ہے۔

لہ۔ اب آپ کاکول ملٹری اکاڈمی میں پروفیسر بہ عہدہ میجر ہیں۔

قاری میر عبداللہ ساکن سرائے صالح

۱۹۱۵ء میں انقلاب پسند طلباء کی ایک جماعت آزاد قبائل سے ہو کر کابل پہنچ گئی تھی۔ ان کے ساتھ مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم بھی تھے۔ کابل میں انہوں نے پروونشل گورنمنٹ آف انڈیا (عارضی حکومت ہندوستان بنائی)۔ پشاور میں مولانا عبدالرحیم پوپلزئی مرحوم اس حکومت موقتۂ ہند کے افسر اعلیٰ تھے۔ ان کے ماتحت سرائے صالح میں قاری میر عبداللہ مرحوم کام کرتے تھے۔ مولوی فضل ربی جو پکھلی کے مشہور انقلاب پسند عالم تھے، اکثر قاری صاحب مرحوم کے پاس آتے جاتے تھے۔ قاری میر عبداللہ کا عہدہ حکومت موقتہ ہند مقیم کابل کی طرف سے میر آلائی تھا جس کا مرادف لفظ انگریزی زبان میں کرنل ہے۔ کابل سے جو خطوط ہندوستان کے لیڈروں پر تقسیم کرنے کے لئے آتے تھے، وہ میر آلائی قاری میر عبداللہ ساکن سرائے صالح کے انتظام سے نشر ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ جب مولانا غلام ربانی لودھی اسلامیہ کالج پشاور سے گرمی کی تعطیلات پر سرائے صالح آئے ہوئے تھے، تو انہوں نے کابل سے آئی ہوئی ایک چٹھی کی ساٹھ قلمی نقول تیار کیں، جنہیں میر آلائی قاری میر عبداللہ صاحب نے سوکڑ ھی ضلع اٹک کے ایک حافظ صاحب کو دے کر اندرونِ ہند بھجوایا۔ ایک نقل قائد اعظم محمد علی جناح کو بھی بھجوائی گئی تھی۔ ایک مرتبہ میر آلائی میر عبداللہ مرحوم نے فرمایا کہ حکومت متوقتہ ہند مقیم کابل کا مسلک یہ ہے کہ ہندوستان کی حکومت خالص اسلامی حکومت ہوگی۔ مولانا غلام ربانی لودھی نے پوچھا کہ جس ملک میں دو قومیں بڑی تعداد میں موجود ہوں وہاں خالص اسلامی یا خالص برہمن حکومت کا قیام خوش فہمی ہے۔ اس پر قاری میر عبداللہ جو مولانا غلام ربانی کے استاد تھے، بہت ناراض ہوئے لیکن قریباً ایک سال کے بعد حکومت موقتہ ہند مقیم کابل کی تازہ ڈاک آئی تو حضرت قاری صاحب نے فرمایا کہ حکومت تمہاری رائے کے مطابق یعنی ملی جلی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ کالج کے وہ مجاہد طلباء جو ۱۹۱۵ء میں روپوش ہوئے تھے، ان میں مسلم بھی تھے اور غیر مسلم بھی۔ اور لیڈروں میں جہاں مولانا عبیداللہ اور برکت اللہ بھوپالی تھے وہاں مہندر پرتاپ بھی تھے۔ اس لئے کسی فرقہ کی حکومت کا تصور بے جوڑ تھا۔ آج جس نقشے میں پاکستان اور بھارت مرقوم ہیں اس کے پس منظر میں دوسرے نقوش کے علاوہ یہ کہانی بھی موجود ہے، جس میں ۱۹۱۵ء کے بھاگے ہوئے مجاہد طلباء سے

لے کر میرالائی میر عبداللہ مرحوم اس ڈراما کے اداکار تھے۔

وہ رسوائے زمانہ رولٹ بل جس رپورٹ پر مبنی تھا اس میں مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم اور ان کی سرگرمیوں کی ساری داستان مرقوم ہے اور حکومت موقتہ ہند مقیم کابل ہی کے شاخسانوں میں ان ریشمی خطوط کا بھی ذکر ہے، جس سے رولٹ رپورٹ کے صفحات کی آرائش ہوئی۔ یہاں یہ ذکر کردینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحریک ریشمی رومال، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رح کی ایجاد کردہ ہے یہ پیلے رنگ کے رومال ہوتے تھے، جن پر ایسی روشنائی سے خط لکھا جاتا، جو نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے لکھنے اور پڑھنے کا طریقہ موجدین کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا۔ آخری خط گوٹھ پیر جھنڈا حافظ محمد صدیق سے غالباً پکڑا گیا۔ حضرت شیخ الہندؒ اس وقت حرم میں معتکف تھے۔ ان کو ۱۹۱۵ء میں شریف مکہ کے ذریعہ سے گرفتار کرکے جزیرہ مالٹا میں قید کردیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں وہ رہا ہوکر وہ دیوبند پہنچے۔ کچھ ماہ زندہ رہے۔ دیوبند ہی میں انتقال فرمایا ع

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

مولوی محمد عثمان صاحب (حال گورنمنٹ کنٹریکٹر ساکن ہری پور) کے بیان کے مطابق حضرت مولانا احمد علی رح لاہور کو ایک شخص (انگریزی سوٹ بوٹ میں ملبوس)، کے ہمراہ سرائے صالح بھیجتے رہتے تھے)، ریلوے اسٹیشن پر وہ شخص اکیلا اتر کر قاری میر عبداللہ سے ملا کرتا اور مولوی عثمان صاحب اسے اسٹیشن سے ہی واپس کردیا کرتا۔ وہ لاہور سے مجاہدین کے لئے روپیہ اور نامہ و پیام لایا کرتا تھا۔ اس طرح سے لاکھوں روپیہ یہاں پہنچا، جو کمال امانت اور دیانت سے آگے پہنچتا رہا۔ سرائے صالح سے قاری میر عبداللہ بمعہ ایک نوجوان پٹواری گوہر سلطان مرحوم کو ساتھ لے کر براہ سرائے نعمت خان وادی (کھلابٹ والا راستہ مخدوش ہوچکا تھا)، چمر قند لےجایا کرتے تھے۔ روپیہ گوہر سلطان کے پاس ہوتا تھا، جس کو برقعہ اوڑھا کر قاری صاحب ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ راستہ میں وہ استفسار پر کہہ دیتے کہ یہ برقعہ پوش ان کی بیوی ہے۔ ان کے ساتھ بقول مولانا غلام ربانی صاحب لودھی، محمد اکبر خان مرحوم عرف اکبرا ساکن شاہ محمد بھی مجاہدین کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ ان کا بیٹا دلاور خان آجکل کاروبار کرتا ہے۔

مولانا قمر علی صاحب

آپ موضع گھنول علاقہ کاغان کے رہنے والے تھے۔ اعوان قوم کے سردار خاندان سے تھے۔ شجرہ نسب مولانا قمر علیؒ بن سردار مہدی خان بن سردار شاہ ولی خان ہے۔ والد کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا تھا۔ لاولد تھے۔ گھر پر ناظرہ قرآن پڑھنے کے بعد دینی علم کی تحصیل کے شوق میں گھر سے نکلے اور دیو بند پہنچے۔ وہاں تعلیم حاصل کی۔ آپ عربی فارسی کے فاضل تھے اور انگریزی میں درک رکھتے تھے۔

آپ نے سیاسی زندگی کا آغاز علی برادران اور مولانا ابوالکلام آزاد کی معیت میں شروع کیا۔ آپ گاندھی کے عدم تشدد کے قائل نہ تھے۔ انگریزوں کو تشدد سے نکالنے والوں کے حامی تھے۔

صوبہ سرحد کی کانگرسی شاخ، خدائی خدمت گار (سرخ پوش)، کے پرجوش ممبر تھے۔ بفہ (ضلع ہزارہ) میں سرخ پوش تحریک کے مرکز کے ستون تھے۔ بفہ کے دفتر کانگرس میں قیام فرما رہے۔ مذہبی عالم اور تحریک آزادی کے مبلغ کی حیثیت سے تقریریں کرتے تھے اور انگریز کے طرفدار علماء اور پیروں کے فتاویٰ اور مواعظ کا توڑ کرنے میں سرگرم رہے۔ انہوں نے تحریکِ آزادی کو جہاد قرار دیا۔ ہزارہ کے کونہ کونہ میں پھر کر تحریک کو کامیاب طریق پر چلایا۔

۱۹۳۱ء میں آپ کو گرفتار کیا گیا۔ ایبٹ آباد جیل میں رکھے گئے اور تازیانہ کی سزا بھی ان کو دی گئی۔ آپ کے اس زمانہ کے رفیق کار میاں عبدالقیوم بفہ بھی سرکار انگریزی کے تشدد کا نشانہ بنے۔ مولانا قمر علی صاحب فصیح اللسان مقرر تھے۔ زندگی بہت سادہ تھی۔ رہائی کے بعد آپ چند دن میاں عبدالقیوم کے ہاں رہے۔ پھر آپ اپنے گھر گھنول تشریف لے گئے۔ وہاں اصلاحِ معاشرہ کا کام شروع کیا۔ اپنی کل جائداد وارثوں کے نام منتقل کر کے پھر بفہ آ گئے اور سرخ پوش و کانگرس تحریک میں کام جاری رکھا۔

ایبٹ آباد جیل کی سختی نے مولانا کو انگریز کا زیادہ مخالف کر دیا۔ آپ نے ہجرت کا ارادہ کر لیا تقاریر میں جوش زیادہ ہو گیا۔ آخری تقریر انہوں نے خاکی علاقہ پکھلی میں کی۔ انگریزی حکومت نے وارنٹ گرفتاری جاری کیا۔ لیکن مولانا قمر علی صاحب انگریزی علاقہ سے نکل کر مجاہدین چمرقند کی

جماعت میں شامل ہو گئے اور ۱۹۳۵ء میں جب مجاہدین چمرقند و حاجی صاحب ترنگ زئی نے آزاد قبائل کے ساتھ انگریزوں پر حملہ کیا تو مولانا بھی ساتھ تھے اور سخت زخمی ہو گئے۔ مجاہدین آپ کو اٹھا کر جلال آباد (افغانستان) لے گئے۔ زخم شدید تھے، جانبر نہ ہو سکے۔ انجام کار اپنی آرزو کے مطابق آزاد ملک میں شہید ہو کر دفن ہوئے۔

مولانا فضلِ ربّی

قوم صواتی سے تھے۔ آباؤ اجداد بٹہ موڑی علاقہ نندھیاڑ کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد مولوی محمود صاحب بفہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ آپ دیوبند کے تعلیم یافتہ تھے۔ ۱۹۱۰ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔ ۱۹۱۴ء کی عالمی جنگ میں علمائے ہند و مولانا محمود حسنؒ شیخ الہند و مولانا عبیداللہ سندھی کے مشن کے مطابق انگریزی حکومت کے خلاف جلسے اور تقریریں کرتے رہے۔ جب ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے تو آپ مجاہدین چمرقند کے پاس چلے گئے اور ان کے اور آزاد قبائل کے لشکروں میں شامل ہو کر انگریزی فوجوں پر یلغار کرتے رہے۔

۱۹۲۹ء میں شاہ امان اللہ خان کی جنگ آزادی میں حملہ ٹل کے وقت نادر خان کی فوج میں شامل تھے۔ امان اللہ خان کو افغانستان کا شاہ باقاعدہ طور پر تسلیم کئے جانے پر آپ وہاں مفتی مقرر ہوئے۔ مولانا فضلِ ربی کے مجاہدین چمرقند کے ساتھ شامل ہونے پر ان کے چھوٹے بھائی فضلِ الٰہی اور ان کے قریبی رشتہ دار اور مولانا گل حسن کو گرفتار کر لیا گیا۔ آخر الذکر تو ایک سال بعد رہا ہو گئے لیکن فضلِ الٰہی صاحب کو کافی مدت جیل میں گزارنی پڑی۔ پاکستان بن جانے کے بعد اگرچہ مولانا فضلِ ربی کے داخلہ سرحد پر سے پابندی ہٹالی گئی تھی لیکن وہ واپس نہ آئے۔ چند سال بعد کابل ہی میں رحلت فرمائی۔ ان کی اولاد شاہ امان اللہ خان کی دی ہوئی جاگیر سے مستفید ہو رہی ہے۔ ان کے چھوٹے بھائی فضل الٰہی، (۱۹۶۷ء) زندہ ہیں اور اپنے گاؤں بٹہ موڑی نندھیاڑ میں ہیں۔

مولانا غلام نبی صاحب

آپ گیدڑپور، مانسہرہ کے مشہور عالم تھے اور حضرت مولانا محمود حسنؒ صاحب کے خواص میں سے

تھے۔ گلاوٹی (صوبجات متحدہ ہند) میں کافی مدت مدرس رہے۔

قصبۂ مانگل (مانگلی) اور اس کے مجاہد عُلماء و مشائخ

یہ حالات مجھے میرے محترم دوست قاضی محمد عثمان صاحب ساکن باندھی ڈھونڈاں (حال قلندر آباد) نے میری درخواست پر مہیا فرمائے۔

وجہ تسمیہ مانگل۔ مانگل سنسکرت کا لفظ ہے۔ جس کے معنی ہیں پرفضا اور خوش منظر (محل وقوع کے لحاظ سے موزوں نام) اور بقول مولوی حکیم محمد عالم صاحب مانسہروی مرحوم راجہ رسالو کے اس لڑکے کے نام (منگل) پر جو رانی کوکلاں کے بطن سے تھا موسوم تھا۔ تاریخی تحقیق کے لحاظ سے راجہ رسالو کا زمانہ دوسری صدی عیسوی کا ہے لہٰذا یہ شہر دوسری صدی عیسوی کا آباد کردہ ہے۔ ہیون سانگ چینی سیاح جو ساتویں صدی میں ہندوستان آیا، اس نے اس مقام کو بھی دیکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ شہر اس علاقہ (ہزارہ و کشمیر) کا دار الخلافہ تھا۔ تو گویا اس شہر کو آباد ہوئے سولہ سترہ سو سال ہو گئے۔ اس نے بھی اور تاریخی شہروں کی طرح زمانہ کے نشیب و فراز دیکھے۔ افغانانِ جدون کے دور میں آخری سنبھالا لیا۔ سکھوں کے دور میں بھی یہ آبادی اجڑ گئی اور انگریزوں کے زمانہ میں بے نام و نشان ہو گئی۔ یہ فصیل بند شہر تھا اور اس کے سات دروازے تھے۔ طول چھ فرلانگ عرض تین فرلانگ تھا۔ دو ہزار گھر تھے اور کل آبادی دس ہزار نفوس کی تھی۔ تین نہایت مضبوط برج تھے۔ جو خطرے کے وقت مورچہ کا کام دیتے تھے۔ اس علاقہ میں یہ واحد شہر تھا، جہاں ہر فن کے لوگ آباد تھے۔ لیکن علم و معرفت حق کے متلاشیوں کے لئے اس میں خاص کشش تھی۔ یہ شہر علماء حق اور صوفیائے بے ریا کا گہوارہ تھا۔ اس چھوٹے سے قصبہ نے عہدِ اسلام میں دو تین صدیوں تک اپنی علمی تقدیس اور روحانی عظمت کی انفرادیت کو قائم رکھا۔ سلاطین وقت کی پیشانیاں اس کی چوکھٹ پر سرنگوں ہوتی رہیں۔ شہنشاہ اکبر اور جہانگیر کا ہفتوں تک یہاں قیام پذیر ہونا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور سلطان محمود (سلطان حسین شاہ رخ اور بہادر جیسے ذی وجاہت اور بلند اقبال ترک امراء کا مسکن بھی یہی علاقہ تھا۔ مگر ان کو بھی کورنش اور قدم بوسی کے لئے اسی "مانگل" میں حاضر ہونا پڑتا تھا۔

اس شہر کی پرانی چوحدی مطابق نشانات موجودہ آبادی حسب ذیل تھی۔ جنوبی دیوار موجودہ

نبگلہ خان ولی محمد خان جدون، خان بانڈہ پیر خان اور سری منارہ کے گاؤں سے شروع ہو کر کٹھ مانگل کے ساتھ ساتھ بہ جانب غرب پرانے قبرستان مانگل (بہ طرف شمال) کے محاذ سے بہت نیچے تک جاتی تھی۔ شہر کی پرانی اور مرکزی آبادی اس نچلے حصہ میں تھی۔ اس کے مرکز میں ملک شہاب اعوان سردار وقت کی حویلی بھی تھی۔ وہاں اب بھی پرانے کھولوں کے آثار نظر آتے ہیں۔ یہ آبادی کٹھ مانگل (جنوب میں) اور گندی کسی (شمال میں) کے درمیان تھی۔ اس آبادی سے ملحق اور گندی کسی اور چھوٹی کسی کے درمیان بعض امرا کے مکان تھے۔

شہر مانگل کے مشرقی حصہ، مابین کٹھ مانگل، سرے پر موسٰی زئی اور ان کے نیچے جدون آباد تھے۔ ان سے متصل جانب شمال جلالہ پورہ نئے قبرستان کے نزدیک آباد تھا۔ جلالہ پورہ سے نیچے جانب شہر کا بازار تھا اور جانب شمال نزد مقبرہ میاں کنگال صاحب قاضی محمود کی حویلی، محلہ جامع مسجد اور دار القضا تھے۔ بازار متذکرہ بالا محلہ جامع مسجد کی پشت پر تھا۔ شہر شرقاً غرباً طول میں تھا۔ درمیان کا حصہ تنگ تھا۔ اسی حصہ کے درمیان سے موجودہ سڑک جرنیلی گزر رہی ہے۔ پرانی شاہراہ مانگل سے جس کے آثار اب بھی مانگل کے پل سے بطرف ایبٹ آباد اونچے ٹیلے کے وسط میں موجود ہیں، تھی۔ یہ راستہ کٹھ مانگل (موجودہ پل سے ذرا اوپر) میں اتر کر ولی محمد خان کے نبگلہ کے ساتھ ساتھ جا کر اور مشرقی سرے سے گھوم کر پرانے شہر مانگل کے شمال سے ہوتا ہوا میاں کنگال صاحب کے مقبرے سے جانب شمال نیچے کسی میں اتر جاتا تھا۔

اس کے سات دروازے حسب ذیل تھے۔

۱۔ موسٰی زئی محلہ کا دروازہ بطرف کٹھ مانگل۔

۲۔ پرانی آبادی اور ملک شہاب کی حویلی کا بڑا دروازہ اور اب کٹھ مانگل سے اوپر جانے کا جو بڑا راستہ (آخری جنوب والا) جو اب لوگوں کے زیر استعمال ہے، اسی جگہ یہ دروازہ تھا۔

۳۔ ۱م، ۲م کے درمیان کا دروازہ، بالمقابل حوض پختہ کٹھ مانگل اور باٹا کے نبگلہ کے محاذ ہیں۔

۴۔ محلہ موسٰی زئی و جدون کا مشرقی دروازہ۔

۵۔ جلالہ پورہ کے محلہ کا دروازہ (مشرقی دیوار میں)

۶۔ قاضی محمود صاحب کے محلہ کا پرانا اور بڑا دروازہ۔ میاں کنگال صاحب کی زیارت کے سامنے

ذرا نیچے کو۔

۷۔ ساتواں دروازہ، پرانے قبرستان سے نیچے اور چھوٹی کستی کے محاذ پر امراء کے محلہ کے لئے تھا۔

اخوند صاحب مانگل

مغلوں کے ابتدائی دور میں یہاں ایک اعوان خاندان آباد ہوا۔ ابتداً اس خاندان کے چند افراد شاہی مناصب پر فائز ہو کر یہاں آئے۔ قبائلی شورشوں کے پیشِ نظر سرحدی ریاستوں کے قریب ایک حفاظتی چوکی کی ضرورت تھی۔ یہ چوکی مانگل تھی اور اس حفاظتی چوکی کے اولین منصب دار یہی اعوان امراء تھے۔ یہ لوگ مناصب و امارت کے ساتھ ساتھ علمِ حق اور عملِ جہاد سے بھی بہرہ وافر رکھتے تھے۔

بارھویں صدی کے آخر میں یہاں ایک بزرگ کا پتہ چلتا ہے، جو ان منصب داروں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ علم ظاہری میں شاہ عبدالرحیم اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے شاگرد تھے۔ سلوک کی منازل شاہ ابوسعید کی خدمت میں رہ کر طے کیں۔ امام ولی اللہ دہلوی نے مرہٹوں کے استیصال کے لئے احمد شاہ[1] ابدالی کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی جن ذرائع سے دعوت دی تھی ان میں ایک یہ بزرگ بھی تھے۔

عام طور پر اخوند صاحب کے نام سے وہ مشہور تھے۔ معلوم نہیں ان کا اصلی نام کیا تھا۔ وہ پانی پت کی لڑائی میں موجود تھے۔ وطن مالوف لوٹنے کے بعد وہ مانگل میں نہیں ٹھہرے خاموشی کے ساتھ چند خدام کو ساتھ لے کر یہاں سے نکل گئے۔ کشمیر کے کسی مقام پر قیام کا ارادہ تھا۔ مگر دریائے کنہار کے کنارے تلہٹہ نامی گاؤں میں کوئی ایسا واقع پیش آیا کہ آگے جانے کا ارادہ ترک کر کے کنہار ندی کے داہنے کنارے کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ گڑھی حبیب اللہ سے

---

[1]۔ احمد شاہ ابدالی نادر شاہ کے قتل کے بعد افغانستان کا بادشاہ بنا اور ۵۹ء۱۷ء میں پہلا حملہ کیا۔ دوسرا حملہ نومبر ۶۲ء۱۷ء میں کیا تھا۔ نادر شاہ نومبر ۳۸ء۱۷ء میں پشاور پر قابض ہوا۔ جنوری ۳۹ء۱۷ء میں لاہور پر اور ۱۱ مارچ ۳۹ء۱۷ء میں دہلی پر۔ اور قتل عام کیا۔ وہ ۵۷ دن دہلی میں رہا۔

تقریباً آٹھ میل جنوب میں دریا کے کنارے ایک مناسب مقام دیکھ کر ڈیرے ڈال دئے اور اپنی آخری عمر وہاں قیام پذیر رہے۔ ان کے اعزہ واقربا کو جب معلوم ہوا تو انہوں نے ان کو واپس لانے کی بڑی کوشش کی۔ لیکن انہوں نے آنے سے صاف انکار کر دیا۔ البتہ میاں کنگال صاحب کے ساتھ ان کی دلی کی اقامت کے دوران صاحب سلامت تھی، اس لئے ان کے ساتھ ان کی مجذوبانہ ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔

اخوند صاحب کے دو بیٹے تھے۔ محمد حنیف اور محمد عبید۔ محمد حنیف اپنے باپ کے مسلک پر ثابت قدم رہے۔ ترک وتجرید، اور با کسے کار نداشتن میں اپنے والد کا پورا نمونہ تھے لیکن محمد عبید ایک تیز طرار اور حوصلہ مند طبیعت کے مالک نکلے، جہاں ایک بھائی کتابوں کی ورق گردانی اور ذکر واشغال میں منہمک رہتا، وہاں دوسرا فرصت کے اوقات، فن سپہ گری، گھوڑے کی سواری اور تیراکی کی مشقوں میں گزارتا۔

جب اخوند صاحب کا انتقال ہو گیا تو ان کے اقارب ان کے کنبے کو واپس لے آئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد (۱۸۲۱ء ش ب) جب ہری سنگھ کی آمد آمد ہوئی تو محمد عبید نے سکھوں سے نبرد آزمائی کا پختہ ارادہ کر لیا۔ چنانچہ ان کے بھائی محمد حنیف نے مانگل کے اطراف کا دورہ کیا اور قاضی محمود کے والد سے جہاد کا فتویٰ لے کر چاروں طرف منادی کرا دی۔ قاضی صاحب ان کے ماموں تھے، اور ابتداءً سکھوں سے مقابلے کے حق میں نہ تھے۔ لیکن جب محمد عبید نے کہا کہ جہاد فرض ہے اور ایک متنفس بھی میرا ساتھ نہ دے گا، تو بھی میں اکیلے ہی یہ فرض ضرور ادا کروں گا۔ اس پر قاضی صاحب بھی تیار ہو گئے اور جہاد کی عام منادی کرا دی۔ (اس جنگ کا حال میں اس کتاب میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ ش ب) ان کا قبیلہ کثرت تعداد کے لحاظ سے اس علاقہ کے دوسرے قبیلوں سے زیادہ تھا۔ تاہم جادون اور تنولی سے بھی کافی زیادہ آدمی جہاد پر آمادہ ہو گئے۔ عربی سوجھ بوجھ میں محمد عبید سب پر فائق تھے۔ لہٰذا ان کی زیر ہدایت سب نے مقابلہ کرنا منظور کر لیا۔

مانگل میں ایک چھوٹا سا ٹیلہ ہے، جسے سری منارہ کہتے ہیں۔ اس سری منارہ کے شمال میں شرقاً غرباً مانگل کا شہر آباد تھا اور اب جہاں باٹا کی کوٹھی ہے۔ یہاں سے میاں صاحب کے مزار تک کا تمام علاقہ میدان کارزار تھا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد لڑائی اس چھوٹے سے ٹکڑے میں

ہی محدود نہ رہی، بلکہ گھاٹی سے اتر کر نیچے کٹھ مانگل میں پہنچ گئی۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ شہر کی جنوبی دیوار پر جدونوں کا حفاظتی دستہ متعین تھا اور یہی اہم دروازہ تھا۔ مغربی اور مشرقی دیواروں پر اعوانوں کے حفاظتی دستے متعین تھے۔ سکھوں کو جب ہزیمت کا خطرہ لاحق ہوا تو شہر کی مشرقی دیوار سے چکر کاٹ کر ان کے محفوظ دستے نے جدونوں کے حفاظتی دستے پر حملہ کر دیا۔ لڑائی کا میدان شہر کے مغربی حصے میں تھا۔ مسلمانوں کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ سکھوں کی کوئی محفوظ نفری بھی ہے۔ جنوبی حصے پر حفاظتی دستہ متعین تھا۔ اس لئے اس طرف سے ان کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ لیکن جس بات سے وہ بے خبر تھے، وہی پیش آئی۔ جدونوں کے حفاظتی دستے کی تعداد بہت کم تھی، وہ مقابلہ نہ کر سکے اور پسپا ہو کر مغربی میدان کارزار کی طرف ہٹنے لگے۔ جب جنگ میں مصروف جدونوں کو پتہ چلا کہ ان کے آدمی مارے جا رہے ہیں تو وہ ان چند آدمیوں کو بچانے کی فکر میں پڑ گئے اور ان کی طرف امداد کے لئے دوڑ پڑے۔ اس طرح سے سکھوں کی مجموعی طاقت کا مقابلہ کرنے والی فوج کی تعداد کم ہو گئی۔ اس سے ایک قسم کی افراتفری پیدا ہو گئی اور اس افراتفری میں مسلمان پیچھے ہٹنے لگے۔ حالت یہ ہو گئی کہ سامنے کی طرف سے سکھوں نے اپنا دباؤ قائم رکھا اور دوسری طرف جدونوں کو اپنے حفاظتی دستہ کی مدد سے الگ گھیرے میں لے لیا۔ جس طرف سکھوں نے دباؤ قائم رکھا اس طرف سے مسلح افواج ہٹتے ہٹتے نالہ مانگل میں اتر گئیں۔ چنانچہ ہولناک جنگ اسی نالہ مانگل میں ہوئی جہاں اب ایک حوض بنا ہوا ہے۔ یہاں ایک بزرگ نے اپنا نیزہ گاڑ کر اس پر پگڑی رکھ دی تھی۔ جب سکھوں نے دیکھا تو کہا کہ جب تک یہ مسلا (مسلمان) زندہ ہے، لڑائی ختم نہیں ہو گی۔ چشم زدن میں ان کا سر تن سے جدا کر دیا گیا۔ لڑائی ختم ہو گئی۔ یہ بزرگ محمد حنیف اور محمد عبید کے نانا تھے۔ اب یہ حوض ان کے نیزے والی جگہ پر بنا ہوا ہے۔ یہ حوض ہر وقت بھرا رہتا ہے۔ پانی زمین سے ابلتا ہے۔

اس لڑائی میں محمد حنیف اور محمد عبید بچ گئے تھے۔ محمد حنیف تو بعض دیگر افراد کو ساتھ لے کر شمال مشرقی پہاڑیوں سے ہوتے ہوئے گڑھی حبیب اللہ کے عقب میں پہاڑی علاقہ میں روپوش ہو گئے اور محمد عبید ان سے الگ ہو کر سلطان بوئی کے پاس چلے گئے۔ اس وقت کے سلطان سے ان کے اچھے مراسم تھے۔ ان کے والد کے روحانی اثر کی وجہ سے ان کی خاطر داری بھی کرتے تھے۔ جب سکھوں کو معلوم ہوا کہ ان کا اصلی دشمن ابھی زندہ پھر رہا ہے تو انھوں نے سلطان بوئی پر دباؤ

ڈالا کر محمد عبید کو ان کے حوالے کر دے۔ لیکن محمد عبید اس سے پیشتر ہی وہاں سے نکل کر اپنے بھائی کے پاس پہنچ گئے۔ مگر وہاں بھی زیادہ دیر خاموشی سے نہ ٹھہر سکے۔ بھائی نے بہت روکا کہ مناسب وقت کا انتظار کئے بغیر آزادانہ آمدورفت مناسب نہیں اور اس طرح خود کو سکھوں کے ہاتھ میں پڑنے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔ لیکن وہ انقلابی ذہن کے مالک تھے۔ بھائی کے پاس زیادہ عرصہ تک نہ ٹھہر سکے۔ آخری بار انہیں سید احمد شہیدؒ کے مجاہدین کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ اس کے بعد ان کا کوئی پتہ نہ لگا۔ وہ مجرد تھے، لہٰذا ان کی اولاد نہ رہی۔

محمد حنیف ایک عرصہ روپوش رہنے کے بعد اپنے والد کے مزار کے پاس فروکش ہوئے۔ ان کا مزار بھی اپنے والد کے پاس ہے۔ ان کی تاریخ وفات کہیں مرقوم نہیں۔ غالباً ۱۸۶۰ء کے قریب فوت ہوئے ہوں گے۔

میاں محمد حنیف کی اولاد

آپ کی ایک صاحبزادی اور چار صاحبزادے طبعی عمر کو پہنچے۔ ان میں حافظ محمد سعد اللہ سب سے بڑے تھے۔ قرآن مجید کے حافظ تھے اور امورِ دین میں آگاہی تام رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اپنے ماموں کے ہاں گڑھی افغاناں (پنج کٹھہ) چلے گئے تھے۔ علوم شریعت میں اپنے ماموں کے شاگرد اور طریقت میں خواجہ شمس الدین سیالوی سے خرقہ خلافت حاصل کیا تھا۔ پیر مہر علی شاہ گولڑوی اور حافظ محمد سعد اللہ ایک ہی دن حضرت خواجہ کی خدمت میں اکٹھے حاضر ہوتے تھے۔ ایک ہی دن دونوں کو خلافت ملی۔ سفر حج بھی اکٹھے ہی طے کیا اور طریق نقشبندیہ میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے حجاز میں اجازت بھی ایک ساتھ ہی لی۔ ان کے دوسرے بھائی میاں محمد عباس نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ ہی میں حاصل کی تکمیل علوم دہلی میں مفتی صدر الدین سے کی۔ اپنی آخری عمر میں وطن واپس آکر موضع سمو، علاقہ پنج کٹھہ میں اپنے بھائی کی خانقاہ میں درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ آخر کار اپنے بھائی کے انتقال سے دو سال بعد ۱۹۰۲ء میں راہئی دارالبقا ہوئے۔ ان کا عظیم کتب خانہ تھا، جو اب تلف ہو چکا ہے۔ ماہنامہ "فکر و نظر" جون ۱۹۷۰ء اس عظیم کتب خانہ کے متعلق مندرجہ ذیل نوٹ شائع ہوا۔

"پچھلے دنوں فقہ حنفی کی مبسوط جامع اور نادر کتاب "المحیط البرہانی فی الفقہ النعمانی"
کا اضافہ کتب خانہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد میں ہوا۔ مجموعی طور پر اس کی
ضخامت ۲۴۴۹ صفحات ہے۔ اس کی ندرت اور کم یابی کا اندازہ اس طرح سے
ہو سکتا ہے کہ ساری دنیا میں اس کے صرف دو یا تین مکمل قلمی نسخے پائے جاتے ہیں۔ یہ
کتاب حضرت مولانا پیر محمد اعظم صاحب کی خانقاہ گڑھی افغاناں ضلع راولپنڈی کے
پاس ہے اور ان کی اجازت سے اس کی فلم تیار کی گئی ہے"۔

اس خاندان کے یہی دو افراد علم و فضل اور عمل میں اپنے حلقہ میں نمایاں حیثیت کے حامل رہے۔ ان کے بعد کوئی قابل ذکر آدمی اس خاندان سے پیدا نہ ہوا۔ جہاں تک حافظ محمد سعد اللہ کا تعلق ہے وہ اپنی ساری زندگی میں خانقاہی تصوف سے گریزاں رہے اور اپنے مسلک کو ہمیشہ شریعت حقہ، کے تابع رکھا۔ ان کے ہم نشینوں میں حضرت فاضل صاحب، جن کا مزار گڑھی افغاناں میں ہے۔ حضرت میاں بلو صاحب[1] مجذوب اور دیگر بہت سے بزرگوں کے علاوہ حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب سے خاص انس تھا۔ حافظ صاحب کے خاندان سے اب بھی بہت سے افراد موجود ہیں۔ مگر نہ اس حال اور نہ اس رنگ میں علماء کی وہ محفلیں نہ رہیں اور نہ صوفیاء کا تصوف۔ سکھوں نے اس خاندان کی سیادت کو ختم کیا تھا اور زمانہ نے حافظ صاحبؒ کے بعد ان کی جلائی ہوئی شمع علم و عرفان بھی گل کر دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

پیر فاضل صاحب کا پورا نام فاضل خان ہے۔ میر پور (علاقہ رش۔ ایبٹ آباد) کے افغانوں سے تھے۔ طالب علمی کے زمانہ میں قاضی محمود صاحب کے درس میں حاضر ہوئے حافظ صاحب سے ہم درسی ہوئی۔ دورانِ تعلیم میں حضرت خواجہ سلیمانؒ کی مجلس میں حاضری کا اتفاق ہوا، تو مرید ہو گئے۔ ایک عرصہ کی مجاہدہ و ریاضت کے بعد خرقۂ خلافت سے بہرہ ور ہو گئے۔ حافظ صاحب سے انتہائی محبت ہوئی۔ ان کا انتقال بھی حافظ صاحب کے زانو پر ہوا۔ دونوں کے مقبرے (پنج کٹھہ میں) آمنے سامنے ہیں۔ ہزارہ کے یہ دونوں بزرگ وادئ پنج کٹھہ میں روحانی قربت کی غیر مرئی شمع اب تک جلائے ہوئے ہیں۔ رحمہما اللہ تعالیٰ۔

---

[1] ان کا مزار آج بھی بھیڑ کنڈ میں مرجع خلائق ہے

میاں کنگال صاحب

میاں کنگال صاحب محمد عبیدؒ کے والد کے دوستوں میں سے تھے۔ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ خاندانِ مغلیہ کے امراء گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ابتدائی زندگی، امیر زادوں اور شاہزادوں کی طرح عیش وطرب میں گزاری۔ حضرت مظہر جان جاناں کے کوچے میں گزر ہوا تو ان کی صحبت اختیار کرلی۔ ان کی صحبت سے جذبۂ حق غالب آیا۔ امیری چھوڑ کر مجددی طریقہ میں فقیری اختیار کرلی۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اولاد سے کسی کے مرید ہیں۔ گھربار چھوڑ کر سیاحت کے لئے نکل پڑے۔ ابتداءً بانڈہ پیر خان[1] میں پیش امامی میں، اپنے آپ کو مستور رکھا۔ زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ پہچان لئے گئے۔ لہٰذا "ملائی" نے "فقیری" کا صحیح رنگ اختیار کرلیا۔ وہاں سے اٹھ کر مانگل کے قصبہ کے قریب ہی تکیہ گاہ قائم کرلی اور بہ رنگ صوفیائے رشد و ہدایت اور تصوف و سلوک کے دریا بہانے لگے۔ مگر یہ رنگ بھی تا دیر قائم نہ رہ سکا۔ معاً جاذبۂ الٰہی رنگ غالب آیا اور میاں صاحب مغلوب ہو کر مجذوب ہو گئے۔ کہتے ہیں صرف نماز کے وقت میاں صاحب ہوش میں آجاتے اور پھر دریائے حقیقت میں غوطہ زن ہو جاتے اور دوسری نماز کے وقت تک کوئی ہوش نہ رہتی۔ ایک دو خادم خورد و نوش کا انتظام کرتے۔

روایت ہے کہ کسی نے میاں صاحب سے بدسلوکی کی۔ وہ شخص مانگل کے سرکردہ لوگوں میں سے تھا، اسے فقراء پر قطعی اعتقاد نہ تھا۔ اسی طرح میاں صاحب کی فقیری کا بھی انکار کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ان کے سامنے جا کر گستاخانہ الفاظ استعمال کئے اور ان لوگوں کو بھی جو میاں صاحب کے ارد گرد بیٹھے ہوئے تھے، برا بھلا کہا۔ میاں صاحب نہایت ملول ہوئے۔ اگر صوفیائے باہوش ہوتے تو شاید پی جاتے۔ مگر میاں صاحب مجذوب تھے۔ سر اٹھایا اور معاً زبان سے نکلا: "مانگل بے نشان خواہد شد" تیر نشانے پر بیٹھا۔ میاں صاحب کے ایک عرصہ بعد یعنی ۲۶ سال بعد ہری سنگھ کے حملہ ۱۸۲۱ء میں ہزارہ کی یہ عروس البلاد بے نام و نشان ہو گئی۔ ہری سنگھ نلوہ آندھی بن کر مانگل پر حملہ آور ہوا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ گستاخ زبانیں کاٹ دی گئیں۔ تکبر سے اونچے ہونے والے سر قلم کر دئے گئے۔ جس قبیلے کے شخص نے بدزبانی کی تھی، اس کے قبیلے کے

---

[1] علاقہ مانگل

سات سو افراد سے مانگل میں ایک کنواں اٹا پڑا ہے اور وہ کنواں سری منارہ کے نام سے مشہور ہے محمد حبیب اللہؒ کے نانا کا سر بھی اسی کنوئیں میں مدفون ہے۔

میاں صاحب کنگال صاحب کے مقبرہ پر ان کی تاریخ وفات ان الفاظ میں تحریر ہے "حضرت میاں گل محمد کنگال وفات جمعہ ۲۴ر محرم الحرام ۱۱۹۰ھ مطابق ۱۹ر دسمبر ۱۷۷۶ء"

مولوی عثمان صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ تفسیر بغوی کے پہلے سادہ صفحہ پر لکھا ہوا یہ فقرہ میاں کنگال صاحب کے متعلق ان کی نظر سے گزرا ہے:

"حضرت ایشاں از اکابرین دہلی بودہ۔ جاذبہ حق دامن گیر شدہ راہ فقر اختیار کردہ از ہمہ بیگانہ شد۔"

انجمن نے اپنی تاریخ اقوام میں لکھا ہے کہ مانگل میں میاں کنگال صاحب کے مقبرہ سے جو زیارت مشہور ہے اس میں خواجہ گل محمد المعروف بہ میاں کنگال صاحب محوِ خواب ہیں۔ یہ شیخ عبد الصبور قادری کشمیر المعروف بہ لبتال صاحب جن کا زمانہ ۱۱۴۵ھ (۱۷۳۲ء) ہے کے مرید تھے۔

حاجی عبد اللہ صاحب

انوند صاحب کے دوسرے بھائی کا نام حاجی عبد اللہ تھا۔ ایک عرصہ تک یہ لوگ افراتفری کے بعد دوبارہ یہیں آکر باڑھی ڈھونڈاں میں آباد ہو گئے جو پہلے معمولی ڈھوک تھی۔ سقوط مانگل کے بعد آہستہ آہستہ ایک گاؤں کی شکل اختیار کر گئی۔ اس وقت آبادی زیادہ تر انہی (اولادِ باشندگان) مانگل کی ہے۔

قاضی محمود

آپ کا خاندان کیلگ تحصیل ہری پور سے آکر مانگل میں آباد ہوا تھا۔ ذات کے یہ بھی اعوان تھے۔ ان کے اجداد ہمیشہ عہدۂ قضا پر فائز رہے۔ مانگل کے قیام میں انوند صاحب کے خاندان سے قرابت داری کا رشتہ قائم ہو گیا۔ سقوط کے بعد ان کا بچا کھچا خاندان بھی منتشر ہو گیا۔ یہ ایک بہت بڑا علمی خاندان تھا۔ جس میں بہ یک وقت تین تین، چار چار علماء درس و افتاء پیدا ہوئے اس

دار و گیر میں قاضی محمود کے والد گڑھی افغاناں میں آکر آباد ہو گئے۔ قاضی محمودؒ حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی کے استاد بھی ہیں۔ اس علاقہ کے سب سے بڑے قاضی اور سر آمد روزگار شخصیت تھے۔ ان کی اولاد میں سے بہت سے لوگ مختلف مواضعات میں ہیں۔ لیکن انہیں اپنے اسلاف سے ادنیٰ سی نسبت بھی نہیں۔ اپنی آبائی سیری کی اراضیات یا مختلف پیشوں سے بسر اوقات کرتے ہیں۔ اصلاً یہ پورا خاندان ہزارہ سے تعلق رکھتا ہے۔ نواب شہر اور سلہڈ میں اب بھی ان کے افراد آباد ہیں۔

محمد گل مرحوم

حافظ محمد سعد اللہ مجرد تھے۔ ان کے بھائی محمد گل کے بیٹے کا نام احمد دین تھا۔ حافظ احمد دین نے ابتدائی تعلیم گھر ہی میں حاصل کی۔ قرآن مجید کے حافظ تھے۔ ۱۰-۱۹۰۹ء میں زیارت بیت اللہ کے لئے گئے۔ مدینہ منورہ میں چندے قیام کیا۔ وہاں کے اہل علم سے استفادہ کیا۔ واپس آنے کے بعد حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک سے منسلک ہو گئے۔ ریشمی خطوط کی ترسیل اور اندرون ملک کی مراسلت ایک عرصہ تک ان سے متعلق رہی۔ اس تحریک کا راز افشاء ہو گیا تو وہ روپوش ہو کر قبائلی علاقہ میں چندے قیام پذیر رہے۔ اس کے بعد واپس آ گئے اور تمام عمر گمنامی میں بسر کر کے ۱۹۵۰ء میں رحلت فرمائی۔ مولوی محمد عثمان سے فرماتے ہیں کہ ان سے گفتگو کے درمیان انہوں نے ہزیمت و مایوسی کا ایک ایسا تاثر محسوس کیا۔ جس کا سوائے ان کے اور کسی سے اظہار نہیں ہوا۔ مزید لکھتے ہیں کہ ویسے بھی یہ تمام خاندان ایک عام قسم کی مایوسی کا شکار رہے۔ مانگل کے قصے کہانیاں باندھی ڈھونڈاں میں ان کی بڑی بوڑھیاں اب تک بیان کرتی رہتی ہیں۔

بابا احمد علی صاحب

باندھی ڈھونڈاں میں ایک بابا احمد علی تھے۔ میاں محمد حنیف کے خاندان سے نسبی قرابت تھی۔ ۱۹۳۰ء میں زندہ تھے۔ مانگل کی بربادی انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی جب کہ ان کی

عمر پندرہ سال کی تھی۔ مولوی محمد عثمان صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ مانگل کی اس داستان کے خدوخال انہوں نے زیادہ تر بابا احمد علی کی زبانی نوٹ کئے تھے۔ اس وقت بھی وہ ایک آدھ میل چل سکتے تھے۔ صحت کافی اچھی تھی اور ہری سنگھ کی یورش کا ایک ایک نقطہ ان کو یاد تھا۔ یہ بھی جب حج کے لئے گئے تھے تو ایک عرصہ تک حجاز ہی میں مقیم رہے۔ ان کے خاندان کے ایک بزرگ جب ۱۹۰۷ء میں حج کے لئے گئے تو ان کو ساتھ واپس لائے۔

مولوی عبدالکریم رح

آپ کا خاندان "چوہڑ سہام" سے مانگل میں منتقل ہوا تھا۔ یہ قریشی النسل تھے۔ ان کے آباؤاجداد علم و عمل حق کا ایک نشان تھے۔ محمد حنیف کے ساتھ ان (مولوی عبدالکریم) کے دادا صاحب کی ملاقات تھی۔ یہ ملاقات رشتہ داری میں تبدیل ہو گئی۔ ہری سنگھ نلوہ کی یورش کے وقت مولوی عبدالکریم کے دادا بھی اپنے بھائیوں اور مریدوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہوئے تھے۔ ان کا ایک بھائی اس لڑائی میں شہید ہو گیا تھا۔ جس کی بہادری اور دوسری خوبیوں کے حالات مولوی عبدالکریم صاحب نے اپنی بیاض میں قلم بند کر رکھے تھے۔ ان کی شہادت پر ایک فارسی مرثیہ بھی تھا اور تمام حالات جنگ مانگل بہ قید سن و سال درج کر رکھے تھے۔ مولوی محمد عثمان صاحب تحریر کرتے ہیں کہ یہ بیاض انہوں نے ۱۹۲۸ء میں بچشم خود دیکھی لیکن افسوس اس کو نقل کرنے کا موقع ان کو نہ مل سکا اور یہ بیاض مولوی عبدالکریم کی وفات فروری ۱۹۶۲ء کے بعد ضائع ہو گئی اور کافی تلاش سے بھی نہ مل سکی۔

حضرت پیر مہر علی شاہ رح۔ گولڑہ شریف

چونکہ آپ کے فیض اور اثر سے ضلع راولپنڈی اور ہزارہ خاص طور پر فیض یاب ہوئے لہٰذا ان کا ذکر ہزارہ کے علماء میں کر رہا ہوں۔

ان کی مفصل سوانح عمری شائع ہو چکی ہے۔ لہٰذا میں صرف وہی واقعات تحریر کر رہا ہوں جو میرے علم میں براہ راست آئے۔

انیسویں صدی کے آخر میں کوٹ نجیب اللہ میں نواب علی (جدون) المعروف بہ مولوی نواب ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنے حالات زندگی پر ایک قلمی یادداشت چھوڑی۔ اس میں تحریر ہے کہ انہوں نے ۱۳ر اگست ۱۸۸۰ء میں حضرت پیر صاحب کی بیعت کی۔ پھر یہ تعلق زندگی بھر رہا۔ انہوں نے حضرت پیر صاحب کے ضلع ہزارہ میں مختلف اوقات میں دوروں کا ذکر مفصل طور پر لکھا ہے اور اس ضمن میں مرزا غلام احمد بانی فرقہ احمدیہ کے ساتھ مناظرہ کے لئے حضرت کے لاہور جانے کے مفصل حالات تحریر کئے ہیں۔

وہ لکھتے ہیں کہ حضرت پیر صاحب ۲۴ر اگست ۱۹۰۰ء لاہور پہنچے۔ ان کے ہمراہ تین سو کے قریب علماء از اضلاع پشاور، ہزارہ، راولپنڈی، جہلم، سیالکوٹ، ملتان، ڈیرہ جات شاہپور گجرات اور گوجرانوالہ وغیرہ مقامات سے لاہور پہنچ گئے۔

مولوی نواب بھی اس قافلہ کے ساتھ تھے۔ لاہور پہنچنے پر محمڈن ہال موچی دروازہ میں مقیم ہوئے حضرت ۲۴ر اگست سے ۲۸ر اگست تک لاہور رہے۔ مگر بانی فرقہ احمدیہ مناظرہ کے لئے نہ آیا۔ حضرت پیر گولڑوی کے درس و تدریس اور وعظ و ارشاد سے فرقہ احمدیہ کو بہت زک پہنچی۔

مطابق تحقیق الاعوان مصنفہ محمد خواص اعوان، آپ کی پیدائش یکم رمضان ۱۲۷۵ھ (۴-اپریل ۱۸۵۹ء) اور وفات ۲۹ صفر ۱۳۵۶ھ (۱۱ مئی ۱۹۳۷ء) ہے۔

حیات شبلی مؤلفہ سید سلیمان ندوی میں تحریر ہے "مفتی لطف اللہ صاحبؒ نے علیگڑھ کے مدرسہ "فیض عام" جس کو ان کے استاذ الاستاذ مولوی بزرگ علی نے زندہ کیا تھا، مدرس ہوئے۔ علیگڑھ میں ان کے درس کا فیض ۱۲۸۵ھ سے ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۵ء) تک جاری رہا۔

اسی مشہور مدرس سے مولوی پیر مہر علی شاہ صاحب سجادہ نشین گولڑہ شریف ضلع راولپنڈی نے اسی مدرسہ میں فیض حاصل کیا۔

موضع ڈھینڈہ میں ایک صاحب علم موسوم بہ حافظ جی صاحب ہوئے۔ ان کے پڑپوتے مولوی محمد معصوم ہوئے۔ مولوی محمد معصوم پیر صاحب گولڑوی کے ہم درس و ہم استاد تھے۔ ان مولوی محمد معصوم صاحب سے مفتی محمد حسن صاحبؒ نے درس لیا تھا۔

مولانا غلام رسول ساکن بفہ

آپ ایک عالم اجل تھے، جن کی وفات پر شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے عربی میں ایک منظوم مرثیہ لکھا تھا۔ شیخ الہندؒ ایک عالمی حیثیت کے ولی اور بزرگ تھے۔ ان کے دل سے صادر ہونے والے اور قلم سے لکھے جانے والے جذبات، ضلع ہزارہ کے ایک شہری کے حق میں ضلع ہزارہ کی عزت افزائی کی ایک زندہ جاوید سند ہے۔

آپ دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ کے سٹاف کے ممبر تھے اور اسلامی دنیا کے استاذ الاساتذہ ثابت ہوئے۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ بھی آپ کے شاگرد تھے۔ آپ کا مزار مبارک دیوبند میں ہے۔

پیدائش اور وفات: آپ کی پیدائش ۱۲۳۰ھ (۱۸۰۶ء) ہے۔ سن وفات ۱۹۲۱ء ہے۔

مولانا محمد رسول خان

عربی زبان و ادبیات کے یہ فاضل موضع ٹکری زند ھیاڑ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت علاقہ نندھیاڑ میں ہوئی۔ تحریک خلافت (۲۰-۱۹۱۹ء) میں دیوبند پہنچے۔ وہاں سے ہی دستار فضیلت حاصل کی اور وہیں مدرس ہو گئے۔

۲۹ مئی ۱۹۲۵ء میں ان کا تقرر اورینٹیل کالج لاہور میں بحیثیت صدر مدرس عربی ہوا۔ بعد میں لیکچرار بنا دئیے گئے۔ بیس سال بعد ستمبر ۱۹۵۴ء میں اس خدمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد آپ حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ کی استدعا و خواہش پر جامعہ اشرفیہ لاہور تشریف لائے، اور شیخ التفسیر مقرر ہو گئے۔

آپ کا انتقال بعمر ۱۲۰ سال، اپنے آبائی گاؤں اچھڑیاں (نزد بفہ) ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۱ء میں ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔

مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ

آپ کا ابتدائی گاؤں کل پور، ضلع کیمبل پور ہے۔ لیکن موضع مونن اور موضع چھوہر شریف

و دیگر دیہات تحصیل ہری پور کے خانوادوں کے ساتھ ان کے نسبی تعلقات ہیں۔ لہٰذا ان کو ہزاروی علماء کی فہرست میں درج کر دیا۔ کیونکہ اس سے ہزارہ کو فخر بھی حاصل ہوتا ہے۔

آپ نے امرتسر سے لاہور، ہجرت کرنے کے بعد ۱۹۴۸ء کی ابتداء میں جامع مسجد نیلا گنبد میں درس قرآن مجید شروع کر دیا۔

پاؤں کی معذوری کے سبب درس کی مجلس مسجد سے متصل جامعہ کی عمارت میں منتقل ہو گئی۔ علالت کے شدید ہونے پر یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ قبلہ مفتی صاحب کا اندازِ درس گویا اپنے مرشد گرامی حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ہو بہو خاکہ تھا، جو بیک وقت علم و حکمت اور تصوف و معرفت کا مجموعہ ہوتا۔

عوام کے لئے عام فہم اور خواص کے لئے نکات کا حامل ہوتا۔ صاحب بصیرت، ہلکی پھلکی مجلس میں، معلوم نہیں، کتنی منازل طے کر جاتے۔

آپ کے فرزند گرامی مولانا عبدالرحمٰن نے ۱۹۵۲ء میں جامعہ اشرفیہ کی نئی وسیع و عریض و مسجد حسن، مسلم ٹاؤن لاہور میں درس کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔

مفتی صاحب مرحوم جامعہ اشرفیہ کے بانی اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری ایسے واعظ شعلہ بیان کے استاذ اور خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کے وہ خلیفہ تھے، جو ہمیشہ سید اشرف علی تھانویؒ کی آنکھوں کا تارا رہے۔

لاہور، فیروز پور روڈ پر جامعہ اشرفیہ کی شاہانہ نئی بستی، مواضعات کل پور اور بدھو ابتدائی سکونت کے گاؤں، کے لئے، بلکہ ہری پور تحصیل کے لئے باعث فخر ہے۔

وفات۔ حضرت مفتی صاحب کی وفات یکم جون ۱۹۶۱ء بروز جمعرات بارہ بجے دوپہر کراچی بر مکان جناب نور محمد بٹ، اسولجرز بازار میں ہوئی۔

مولوی عبدالرحمٰن صاحبؒ، چھوہر شریف، ہری پور

پیدائش ۱۲۶۲ھ، ۱۸۴۶ء میں چھوہر شریف میں ہوئی۔ آپ کی وفات بعمر اسی سال بتاریخ یکم ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ (۱۹۲۴ء) بمقام چھوہر شریف ہوئی۔

آپ نے ۱۳۲۱ھ (۱۹۰۳ء) میں، دارالعلوم اسلامیہ ہری پور میں جاری کیا، جو اب تک چل رہا ہے۔ طلبائ کے لئے کھانا باجی صاحبؒ اپنے گھر چھوہر شریف سے بھیجا کرتے تھے۔

اسی مدرسہ کی ۶۱ ویں برسی پر، ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۸۲ھ (۲۶ فروری ۱۹۶۳ء) سابق صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان بمعہ وزیر تعلیم پاکستان چودھری فضل القادر (مشرقی پاکستان) شامل ہوئے اور پچاس ہزار روپیہ بطور عطیہ مرکزی گورنمنٹ کی جانب سے دارالعلوم کو مرحمت فرمایا۔

حضرت باجی صاحب چھوہروی نے اسلامیہ کالج پشاور کی مسجد کا سنگ بنیاد ۱۹۱۳ء میں رکھا۔

مولوی احمد سکندر پوریؒ

آپ دیوبند کے ابتدائی تلامیذ سے تھے۔ آپ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب صدر مدرس دیوبند کے شاگرد تھے۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کچھ عرصہ وہاں آپ نے درس بھی دیا۔

آپ کے والد مولوی عبداللہ صاحب سکندر پور بھی ایک عالم اجل تھے۔ دونوں باپ بیٹا الگ الگ مساجد میں درس دیا کرتے تھے۔ مولوی احمد کے والد اپنے بیٹے کی قابلیت پر ہمیشہ الحمدللہ کہا کرتے تھے۔

قاضی میر عالم صاحب سکندر پوری، مولوی احمد کے ہم عصر تھے۔ جو بعد میں ہزارہ میں انگریزی حکومت کے ابتدائی عہد میں مجسٹریٹ ہوئے۔ قاضی صاحب بھی علوم عربی کے فاضل تھے۔

سید محمود شاہ

آپ موضع ڈھینڈہ، ہری پور شہر سے دو تین میل مغرب کے رہنے والے تھے۔ آپ نے تکمیل تعلیم پنجاب کے (فیروز پور) مشہور مفسر و محدث حافظ محمد صاحب سے حاصل کی۔ آپ کی شادی ملتان کے ایک خدا رسیدہ بزرگ مولانا عبدالمالک کی دختر سے ہوئی، جس سے ایک لڑکی اور ایک لڑکا سید احمد شاہ صاحب تھے۔

آپ کا وعظ وارشاد بہت مؤثر تھا۔ اور قاطع بدعات تھا۔ پنجاب کے اضلاع جھنگ، لائلپور چنیوٹ اور ملتان میں آپ کے مواعظ کی بدولت تعلیم اسلامی کا چمن شگفتہ ہوا۔ ضلع پشاور میں ان کے وعظ کے اثر نے مسلمانوں کی زندگی اسلامی رنگ میں ڈھال دی اور رسومات بد کی بیخ کنی کر دی۔

اس زمانہ میں لوگ لڑکیوں کو وراثت میں حصہ نہیں دیا کرتے تھے۔ انہوں نے اس خلافِ اسلام قانون کی اصلاح گھر سے شروع کی اور اپنے صاحبزادہ کی رضامندی سے نصف جائیداد صاحبزادی کے نام منتقل کر دی۔

آپ کی پیدائش ۱۸۷۰ء اور وفات ۱۹۱۹ء ہے۔ آپ کا مزار ڈھینڈہ کے قبرستان میں چار دیواری کے اندر ہے۔

آپ پنجابی زبان کے بے بدل شاعر تھے اور اپنے اشعار سے اپنے وعظ کو مؤثر بنایا کرتے تھے۔ ان کا ایک شعر یاد ہے ؎

عاماں، نامعقولاں اگے گل خاصاں دی کرنی
مٹھی کھیر پکا محمودا، کتیاں اگے دھرنی

مولانا محمد اسحاق صاحب رح مانسہروی

آپ کی مجاہدانہ سرگرمیوں نے، خلافت اور ہجرت کی تحریک (۲۰-۱۹۱۹ء) میں تمام ضلع ہزارہ کو ہلا دیا۔ آپ کی پر اثر گفتگو اور تقریر، ذاتی وجاہت اور اثر و رسوخ سے لوگ جوق در جوق آپ کے ساتھ شامل ہو گئے۔ آپ کے ارشاد پر بہت سے لوگوں نے ہجرت کی

خاندان آپ حویلیاں کے گل اخوند زادہ کے بڑے صاحبزادہ تھے۔ جو ایک صاحب لفظ زاہد تھے۔

خطابت مانسہرہ مولانا محمد اسحاق صاحب مانسہرہ کی سب سے بڑی جامع مسجد کے خطیب تھے۔ عوام ان کے وعظ و بیان پر دیوانہ ہو جاتے تھے۔

سیاست میں حصہ ۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ کے خلاف انگریزی حکومت کے خلاف جو شورش پیدا ہوئی اس میں انہوں نے بھرپور حصہ لیا اور ضلع ہزارہ بول

کھولنے لگا، جیسے دیگدان میں پانی کھولتا ہے۔ آخر کار ضلع ہزارہ کے جابر انگریز ڈپٹی کمشنر کرنل جیمز نے ان کے خلاف قدم اٹھایا اور موضع سفیدہ کے مایۂ ناز رئیسوں غلام رسول خان، عبدالقیوم خان اور مانسہرہ کے مولوی غلام ربانی ولازاک کے ہمراہ قید کر لئے گئے۔ ہندوستان کے دور دراز مقامات میں نظر بند کر دیا گیا۔

جب شورش فرو ہوئی اور وہ آزاد ہوئے تو ان کا ضلع ہزارہ میں داخلہ بند کر دیا گیا، تو انہوں نے راولپنڈی کو اپنی دینی و سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ محلہ امام باڑہ میں ایک شاندار مسجد بنوائی جس کا نام مسجد انگور رکھا۔ امامت و درس و تدریس کی چالیس سالہ زندگی، اسی مسجد انگور کے ایک حجرے میں بسر کر دی۔ اس عرصہ میں آپ مختلف تحریکات کے سلسلہ میں بارہا گرفتار ہو کر رہا ہوئے اور رہائی کے بعد اسی مسجد میں جاگزیں ہوئے۔

۱۹۱۹ء سے ۱۹۶۲ء تک، مسلمانوں کی بے لوث خدمت کرنے کے بعد یہ مردِ مجاہد ۲ دسمبر ۱۹۶۱ء صبح چھ بجکر دس منٹ پر اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔

مدفن آپ کو اپنے آبائی گاؤں حویلیاں میں آبائی قبرستان میں اپنے بڑے بھائی حکیم خلیل احمد کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔

ترکہ اپنی یادگار میں ۴۹۵ کتابیں، ایک خوبصورت گھوڑی اور ایک ضعیف خادم، جمعہ، چھوڑا۔ گھوڑی اس خادم، جمعہ، کے حوالے کر دی گئی جبکہ یہ کتابیں مسجد میں نئے امام اور خطیب کے حوالہ کر دی گئیں۔

حلیہ مبارک آپ کا قد درمیانہ، وجیہہ و پر رعب شکل و صورت، متین شخصیت، بدن فربہ۔

زندگی و انجام تا دمِ آخر ایک آزادی پسند اور محبِ اسلام لیڈر کی حیثیت سے آزادانہ زندگی بسر کی۔ ان کی آخری بیماری میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، صدرِ پاکستان نے ان کے علاج کے لئے سہولتیں مہیا کیں۔ لیکن موت نے انہیں مہلت نہ دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولوی محمد عرفان صاحب

آپ کا پورا نام ابوالمعارف محمد عرفان تھا۔ ذات کے تنولی اور موضع پکھوال، تحصیل

مانسہرہ کے رہنے والے تھے۔ درس گاہِ مینڈھو سے فارغ التحصیل ہوئے تھے۔

تحریک خلافت میں مولانا محمد اسحٰق مانسہروی کے ساتھ شامل رہے۔ ان کے ساتھ ہی گرفتار ہوتے۔ رہائی کے بعد بمبئی چلے گئے اور مولانا محمد علی جوہرؒ اور مولانا شوکت علی کے رفیق کار رہے اور آخر دم تک ان کا ساتھ دیا۔ کئی دفعہ جیل گئے۔ بہت بڑے عالم اور فلسفی تھے۔ بہترین معلم تھے۔ تقریر اردو، ٹکسالی زبان، فصیح و بلیغ اور لچھے دار ہوتی تھی۔ آپ کل ہند لیڈر تھے۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۵ء میں، جو وفد سلطان عبدالعزیز کی دعوت پر مؤتمر اسلامی کے انعقاد کے انتظام کے لئے، بھیجا گیا، اس میں مولانا ظفر علی خان مرحوم اور شعیب قریشی کی معیت میں مولانا محمد عرفان صاحب کو مرکزی جماعت خلافت نے بھیجا تھا۔

وفات، ۱۲ مارچ ۱۹۳۹ء میں صبح دس بجے کے قریب حرکتِ قلب بند ہو جانے سے واقع ہوئی تھی۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

مولانا غلام ربانی لودھی مرحوم۔ ساکن سرائے صالح، ہری پور تحصیل

آپ ہری پور مڈل سکول وحال گورنمنٹ ہائی سکول نمبر ۱ میں میرے ہم سبق تھے، لیکن بعد میں علم کے آسمان پر چمکے اور تحریک آزادی کے صف اول کے لیڈر رہے۔ ؎

ما و مجنون ہم سبق بودیم ، در دیوانِ عشق
او بصحرا رفت ، ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

مولانا غلام ربانی لودھی نے میٹریکولیشن کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول، ایبٹ آباد سے پاس کیا۔ ۱۹۱۷ء تا ۱۹۲۰ء، اسلامیہ کالج پشاور میں زیر تعلیم رہے۔ فارغ اوقات میں قرآن و حدیث کا مطالعہ جاری رہتا اور ان کی رہنمائی اس وقت کے ناظمِ اسلامیات مولانا قطب شاہ عباسی کی۔ بی۔ اے کا نصاب مکمل کرنے کے بعد لودھی صاحب، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے اولین طالب علم تھے۔ وہاں آپ کے اساتذہ، مولانا محمد علی جوہرؒ بانی اور پرنسپل شیکسپیر پر لیکچر دیتے خواجہ عبدالحئی، تفسیر قرآن پر، مولانا محمد یوسف سواتی، حدیث و ادب عربی پر، ڈاکٹر ذاکر حسین

سابق صدر بھارت، اقتصادیات پر اور ڈاکٹر محمد عالم قانون کا درس دیتے تھے۔

لیکن سیاسی حالات وقت کے تحت آپ کو تبلیغی وفد کے ساتھ اپنے ضلع میں بھیجا گیا، جہاں وہ پہنچتے ہی ضلع سے جبراً بدر کر دیئے گئے۔ اس کے بعد راولپنڈی اور ضلع اٹک میں مجلس خلافت کے ماتحت تحریکِ آزادی کے کام میں مشغول ہو گئے۔

لاہور اور امرتسر کے قیام کے دوران آپ نے دینی تعلیم کے حلقوں میں رابطہ قائم کیا، مفتی محمد حسن مرحوم صدر مدرسہ نعمانیہ امرتسر اور مدرسہ تعلیم الاسلام میں مولانا داؤد غزنویؒ اور مولانا نیک محمد کی شاگردی کا موقعہ ملا۔ اس کے ساتھ تحریک خلافت میں مولانا مظہر علی، شیخ حسام الدین، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور چودھری افضل حق کی گرفتاری کے بعد آپ کو ضلع امرتسر کی مجلسِ خلافت کا جنرل سیکرٹری بنایا گیا۔ اس کے ساتھ آپ روزنامہ "وکیل" امرتسر کے سب ایڈیٹر بھی تھے۔ یہ سب فرائض ایک وقت میں انجام دینا غیر معمولی قوت عمل کی علامت ہے۔

امرتسر اور لاہور میں جتنا عرصہ آپ کا قیام رہا، انہوں نے ترجمہ و تالیف اور صحافت سے خوب دل بہلایا۔ روزنامہ "وکیل" کے بعد "زمیندار" میں کام کیا۔

راولپنڈی میں "شہاب" اور "ترجمان" کے سب ایڈیٹر رہے۔

نوٹ۔ ان کی مفصل سوانح عمری، میں نے اپنی کتاب "دیدہ و شنیدہ" میں تحریر کی ہے۔ تفصیل کے طالب، ان کے مزید حالات اس کتاب میں دیکھ سکتے ہیں۔

مولوی عبد العزیز عثمانیؒ

شجرہ نسب دو بھائی۔ مولوی عبد السلام اور مولوی محمد محمود اغلباً انیسویں صدی کے آخر میں ہزارہ میں آئے۔ ابو محمد عبد العزیز نے اپنے نسب نامہ کے بعد، جو درج ذیل ہے اپنے خاندان کی تاریخ کے متعلق، کتاب فقہ مخدومی، جس کے وہ مترجم تھے، کے آخر میں لکھتے ہیں "شاہ محمد مسعود خطائی اور ان کے بھائی شاہ محمد مقصود خطائی، یہ دونوں شاہزادے اپنے والد خطا و ختن کے بادشاہ سے ناراض ہو کر کشمیر میں آئے۔ ان کے والد نے ان کو واپس لانے کیلئے آدمی بھیجے۔ شاہ محمد مقصود تو ان آدمیوں کے ساتھ واپس چلے گئے، لیکن شاہ محمد مسعود نے انکار

کیا اور گدائی اختیار کر لی۔ ۲۶ سال تک ریاضت و چلہ کشی کی۔ ان کی اولاد سے بہت سے اہل علم و زہد شہر شیو پور و لولاب علاقہ کشمیر میں موجود ہیں۔ پیر تاج الدین صاحب لولابی ان کی اولاد سے ہیں اور کبھی کبھی پنجاب میں آتے رہتے ہیں۔"

پھر لکھتے ہیں کہ وہ انہوں نے تحصیل علم اپنے چچا مولوی محمود سے کی۔ صرف و نحو کی تکمیل علماء پکھلی و ہزارہ سے، ترجمہ قرآن و حدیث مولوی محمد صاحب و مولوی عبدالاحد صاحب بنی و قاضی محمد حسن صاحب خانپوری سے کی۔ اس کے بعد ۱۳۰۹ھ (۱۸۹۲ء) میں برائے حصول اعلیٰ اسناد دہلی میں حضرت شیخ الکل مولوی سید نذیر حسین دہلوی سے سند صحاح ستہ و قرآن وغیرہ کتب حدیث حاصل کی۔" اپنی ولادت کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

"ولادت ابو محمد عبدالعزیز ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ء) ہے۔"

مولوی عبدالعزیز عثمانی نے جو مولوی محمد محمود کے بھتیجے تھے اپنی کتاب میں یوں تحریر کیا ہے:

"ابو محمد عبدالعزیز[۱] (ولادت ۱۲۸۰ھ) بن عبدالسلام[۲] (مرقد گڑھی حبیب اللہ میں ہے)، بن ابوالسلام[۳] (مدفن موضع بھورج، نزد ایبٹ آباد، زیتون کی ڈھیری کے نیچے ہے)، بن شاہ عبداللطیف[۴] بن شاہ مقیم الدین[۵] بن شاہ عبداللطیف[۶] بن شاہ حبیب اللہ[۷] بن شاہ فتح اللہ[۸] بن شاہ حبیب اللہ[۹] بن شاہ فتح اللہ[۱۰] بن شاہ مہدی[۱۱] علی بن شاہ یوسف[۱۲] بن شاہ محمد مسعود[۱۳] خطائی۔"

اس حساب سے یہ تیرہ پشت ہوتی ہیں۔ ابن خلدون کے نظریہ کے حساب سے (ایک صدی میں چار پشت)، تو گویا تین سو سال کے قریب ہوتے ہیں کہ شاہ محمد مسعود خطائی سولھویں، سترھویں عیسوی میں وطن سے نکلے۔ یہ زمانہ بہت سی اقوام افاغنہ و سادات کا کشمیر و ہزارہ کی طرف آنے کا ہے۔

آگے چل کر مولوی عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں: "یہ سلسلہ نسب حضرت عثمانؓ خلیفہ ثالث تک پہنچتا ہے۔"

مولوی عبدالعزیز اپنے چچا مولوی محمد محمود کے، جو بہت بڑے عالم عربی و فارسی کے تھے، کے شاگرد تھے۔ مولوی محمد محمود بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی ایک طبع شدہ منظوم کتاب "قواعد فارسی منظوم" معروف بہ نیر لامع جو مطبع نولکشور لکھنؤ میں نومبر ۱۸۹۱ء مطابق ربیع الثانی ۱۳۰۹ھ چھپی۔ یہ نسخہ ان کے خاندان عثمانی، ساکن ایبٹ آباد موجود ہے اور یہ طبع اول کا نسخہ ہے۔

مولوی محمد محمود کے ہاتھ سے نقل شدہ حسب ذیل عربی کتب، بہت خوش خط، خاندان میں موجود ہیں۔

۱۔ سراجی - درعلمِ میراث، جو ماہ ذوالحجہ ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۳ء) مسجد شریف موضع بھیڑی نزد سرائے صالح مکمل ہوئی۔

۲۔ تعریف الاشیاء: در اصطلاحات، علم منطق - بین السطور اور حاشیہ پر عربی تشریح بروز پنجشنبہ (جمعرات)، بوقت چاشت، مسجد شریف بھورجاں (بھورج - نزد ایبٹ آباد) ۱۲۷۷ھ اتمام کو پہنچی۔

۳۔ رشیدیہ، فی العلم المناظرہ، جو بسم ماہ صفر ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) در مسجد بھیڑی و بھورج تمام ہوئی۔

تعریف الاشیاء کے پہلے صفحہ پر مولوی محمد محمود کی اپنی ایک غزل بڑی خوشخط تحریر کی ہوئی ہے، جس سے ان کی طبع موزوں اور علم کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الایا من رمیت سہم فی صدری مفاجاتا
سناں حشت عشقت کرد فی قلبی جراحاتا
دلم از خنجرِ ہجراں، درونِ سینہ مجروح است
خدارا اے طبیب، اینک روم از دست ہیہاتا
شہید تشنہ لب ہستم، بہ دستِ کربلا اندر
ولا یبقی من الوصل، یزید الہجر کاساتا
بہ چاہ غبغب جاناں، چوں ہاروت و ماروتم
ایا! ناہید من، بے نما ز برجِ وصل راحاتا
رُخ آں دلفریب، ہردم کشد آئینۂ دل
نعم، جذب الحدید آمد ز مقناطیس خاصاتا
ایا! پیک صبا بخرام، سوئے آں شہ خوباں
کہ در خاطر نمے گنجد، دگر درد و شکایاتا

گزر کن بر درِ سلطاں، بزانوئے ادب بنشیں
پس از عجز و نیاز از من، برساں آہ و ندا ماتا

بہر تارِ زِ زلفش، زِ بندہ بندگی برساں
بیار از سنبلستانش، بمن بوئے ملاقاتا

بہارِ گلشن و گل را بچشم خود تماشا کن
زِ گل آور سوئے بلبل، نسیمِ خوش بشاراتا

منال، اے بلبلِ بے دل، کہ غنچہ بشگفد گاہے
زِ لعلِ جاں فزا، یابی کامِ دل، ملاقاتا

بیا، تا ایں ہمہ طامات بگذاریم اے محمود
کہ صدقِ عشقِ تو، خواہد برآورد، ایں مہماتا

مولوی عبدالعزیز ایک جہاں گرد عالم تھے۔ وفات ۲۸، ۱۹۲۷ء بمقام سپاٹو، نزد شملہ ہوئی
ان کا ایک نوٹ فقہ مخدومی پر یوں تحریر ہے:

"ابو محمد عبدالعزیز بن عبدالسلام العثمانی متوطن شہر گڑھی حبیب اللہ خان، ضلع ہزارہ
از اضلاع پنجاب اتفاق زمانہ سے بندر معمورہ بمبئی میں آیا"

انہوں نے فقہ مخدومی (فقہ شافعی کی عربی کتاب) کا ترجمہ اردو میں ۳۰ محرم الحرام ۱۳۱۴ھ میں کیا۔

مولوی عبدالعزیز کا ایک ہی بیٹا بنام عبدالحمید تھا، جس کی وفات ۲۵، ۱۹۳۴ء میں ہوئی۔

مولوی عبدالعزیز کے والد مولوی عبدالسلام گڑھی حبیب اللہ میں۔ مولوی عبدالسلام کے بھائی
مولوی محمد محمود گاندھیاں میں اقامت پذیر رہے۔

مولوی محمود کے چار بیٹے تھے۔ محمد داؤد[۱]، مولوی محمد حسین[۲] (وفات جنوری ۱۹۶۳ء) مولوی عبدالرحمٰن[۳]
المعروف بہ اجی جی (وفات ۲ ستمبر ۱۹۶۹)، عبدالرؤف[۴] (وفات ۹ اپریل ۱۹۶۵ء) اب اس خاندان
کا نام اجی جی کی اولاد سے اب اس وقت خاندان کے سربراہ مولوی عبدالغفور ہیں۔

فقیہ العصر مولانا عبد العزیز رح

عبد العزیز بن شرف الدین بن نصر اللہ بن رحمت اللہ۔
۳۰ رصفر ۱۳۰۰ھ مطابق جنوری ۱۸۸۳ء کو بمقام کاکول ضلع ایبٹ آباد میں پیدا ہوئے۔ نسبًا فاروقی تھے۔

۱۸۵۷ء سے قبل آپ کے دادا کے بھائی حاجی عبد السلام یہاں آکر مقیم ہوئے۔ وہ سلسلہ چشتیہ کے بہت بڑے بزرگ تھے۔ نہایت عابد، زاہد اور ان کا تعلق بھی تحریک مجاہدین سے تھا۔ "مخزن عرفانی" ملفوظات ملا کوٹھ کے دیباچہ نگار سلطان محمد اجنالوی لکھتے ہیں کہ مفتی محمد حبیب (ریاست گھوڑی، کشمیر) خلیفہ حضرت سید امیر المعروف بہ ملا کوٹھ سلسلہ چشتیہ میں ان سے بیعت و ماذون تھے اور انہوں نے ان سے کثیر فیض پایا۔

کاکول آبادی کی ابتداء سے بیسویں صدی کے نصف اول تک علومِ دینیہ کا مرکز رہا، جہاں اطراف و اکناف سے تشنگانِ علوم دینیہ آکر فیض یاب ہوتے رہے۔ حضرت علامہ انور شاہ کاشمیری رح بھی اسی سرچشمۂ علم کے فیض یافتگان میں سے تھے۔

قرآن مجید اور فارسی کی کتابیں گھر پر ہی اپنے بڑے بھائی مولانا میر عبد اللہ (۱۸۷۱-۱۹۰۳ء) سے پڑھیں۔ فقہ کی تعلیم کے لئے ۱۹۰۲ء میں رجوعیہ گئے اور وہاں کے ایک نامور عالم سے تحصیل کی۔ صرف و نحو مولانا محمد اسمٰعیل کوکلوی (م۔ ۱۹۴۰ء) سے اصولِ فقہ کی تعلیم مولانا فضل حق (بانڈی ڈھونڈاں) سے حاصل کی۔ ۱۹۰۴ء میں تحصیل علمِ حدیث کے لئے امرتسر گئے۔ اس وقت مدرسہ تقویۃ الاسلام میں مولانا عبد اللہ غزنوی کے فرزند مولانا عبد الجبار غزنوی مسندِ درس پہ متمکن تھے۔ ایک سال ان کی خدمت میں رہ کر سندِ حدیث حاصل کی۔ اس طرح چار واسطوں سے آپ کا سلسلہ حدیث حضرت شاہ ولی اللہ تک جا پہنچتا ہے۔

سند کی نقل تبرکًا درج ذیل ہے۔

بسم الله الرحمن الرحیم

الحمد لله الذی من علینا با نزال القرآن۔ وانعم ببعثة محمد رسول الله صلّی الله علیه وآله وسلّم صاحب النور والبرهان۔ وجعلنا بمنه وکرمه من اهل الحدیث والفرقان بعد فقدان اهلهما فی الدهور والازمان والهمنا اتباع الصحابة والسلف الصالحین ائمته الهدیٰ والدین علیهم الرحمة والرضوان روقنا من مزخرفات اهل الجدل من المتکلمین و الیونان۔ والقی جذر قلوبنا حب الوحیین مستغنین بهما عن آراء الافاضل والاغیان۔ مجنی ثمار همانا بذی علوم الغیر من کان و این ما کان۔ فاصمدک یا مولای ابلغ صمد وازکه ما تحرک منی اللسان و الاجفان واشکرک اکمل شکر الی ان افوض الیک روحی یا رحمٰن۔ فاللهم وفقنی لما قصدت الی ان اذوق الموت بعد الحیوان۔ والصلوٰة والسلام الاتمان الاکملان علیٰ سیدنا محمّد خاتم انبیاءک و رسلک سید الانس و الجان۔ وعلیٰ آله واصحابه و التابعین لهم باحسان۔ بعثنا الله فی زمرتهم یوم الشهود والحسان۔ فاللهم اجب دعوتی فانی اسالک بان لک الحمد لا الٰه الّا انت الحنان المنان۔ اما بعد

فیقول المفتقر الیٰ ربه الغنی عبد الجبار بن عبد الله الغزنوی تغمدهما الله بفضله الجلی والخفی ان المولوی عبد العزیز قد قراء علیّ اکثر صحیح البخاری وسمع منی الاکثر تفسیر کتاب الله علیٰ وجه التحقیق و قراء باقی الامهات الستة علی اخی الشیخ عبد الرحیم و ابن اخی الشیخ عبد الاوّل وسمع منی الاحادیث الکثیرة فعلیه ان یشتغل بتدریس الکتب المذکورة وغیرها من الکتب الدینیة من التفاسیر وکتب الاحادیث من السنن و المسانید والمعاجم و الاجزاء وشروحها وما یتعلق بها فانی قد اجزته حسب ما اجازنی به مشائخی الکرام واساتذتی الاعلام

الشیخ السید نذیر حسین و الشیخ احمد الشرقی الحنبلی و الشیخ حسین بن محسن الانصاری الشافعی و الشیخ نعمان الحنفی البغدادی مفتی بغداد و الشیخ علی الشامی الحدیدی الیمانی رضی اللہ عنھم و ارضھم وجعل الجنّۃ منقلبھم و مثوٰلھم قال ذلک بفمہ وکتبہ بقلمہ عبدالجبار بن عبد اللہ الغزنوی غفر اللہ ذنوبھما و ستر فی الدارین عیوبھما۔

۱۶ر شعبان ۱۳۲۳ھ

آپ کا شمار حضرت مولانا کے ارشد تلامذہ میں سے ہے۔ مولانا عبدالجبار آپ کے زہد اور قابلیت سے بے حد متاثر تھے۔ انہوں نے انہیں اپنی فرزندی میں لینا چاہا۔ لیکن چونکہ ان کی نسبت مقرر ہو چکی تھی۔ اس لئے یہ بات نہ ہو سکی۔

امرتسر سے تحصیل علم کے بعد گھر لوٹے، تو سادات بڑکپرہ علاقہ کشمیر باصرار آپ کو وہاں لے گئے۔ کچھ عرصہ وہاں رہ کر گھر آ گئے اور سلسلہ درس و تدریس شروع کیا۔ آپ کے درس میں ہمہ وقت پینتیس اچالیس طالب علم رہتے تھے۔ تقریباً ربع صدی تک آپ کا درس کاکول میں علم و فضل کا گہوارہ اور ارشاد و تلقین کا مرکز رہا۔ ہزاروں تشنگانِ علم نے وہاں آکر اپنی پیاس بجھائی اور سینکڑوں گم گشتگان علم نے وہاں آکر روشنی حاصل کی۔

درس و تدریس کے علاوہ آپ نے سیاسی، سماجی کاموں میں بھی بھرپور حصہ لیا۔

۱۹۲۹ء میں جب جمعیۃ العلماء علاقہ رش کا قیام عمل میں لایا گیا تو انہیں جمعیت کا مفتی اور محاسب مقرر کیا گیا۔ جمعیۃ العلماء کا بنیادی مقصد بدعات اور دیگر سماجی برائیوں کا استیصال تھا۔ مگر سیاسی معاملات میں بھی اکابرین جمعیۃ اپنے کردار سے کبھی غافل نہیں رہے معاملہ مسلمانانِ ہند کا ہو یا مسلمانانِ عالمِ اسلام کا، جمعیۃ نے واضح طور پر اور سخت لہجے میں اپنے مؤقف کا اظہار کیا۔

۲۹ر اگست ۱۹۳۵ء کو آپ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ مندرجہ ذیل مادہ ہائے تاریخ سے سن وفات نکلتی ہے۔

آہ بدرِ اسلام شد مستور

۴ ۵ ۳ ۱ ھ

زیب فضیلت فقیہ العصر
۱۹۳۵

فلسفۂ تاریخ کے ماہر کہتے ہیں کہ علم اور عمل کم یک جا ہوتے ہیں انہی کمیاب مثالوں میں مولانا عبدالعزیز کی ذات تھی۔ خصوصیت کے ساتھ اصولِ فقہ اور فقہ پر ان کی نظر بہت وسیع تھی۔ جزئیات فقہ اور خصوصاً ان کا وہ حصہ جو معاملات سے متعلق ہے، ان کی نظر میں تھا۔ افتا جمعیت کے تعلق سے اقتصادی، مالی، سیاسی مسائل پر ان کو عبور حاصل تھا۔

ان کا علم محض کتابی نہ تھا، بلکہ آفاقی بھی تھا۔ معاملات کو خوب سمجھتے تھے۔ ان کو بارہا بڑے بڑے معاملات اور مقدمات میں ثالث بننا پڑتا تھا اور فریقین کو وہ اپنے فیصلہ پر راضی کر لیتے تھے۔ کیونکہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا عطیہ فکر رسا اور رائے صائب تھے۔ وہ بے حد خاکسار اور متواضع تھے۔ ان کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ تقویٰ آپ کا خاص شعار تھا ——— پیر مہر علی صاحب گولڑوی سے بیعت تھے۔ شعر بھی کہتے اور عزیز تخلص کرتے تھے۔ اردو، فارسی اور ہندکو میں آپ کا کلام ملتا ہے۔

تصانیف میں تصوف پہ ایک رسالہ، فقہ کی کئی کتابوں پہ حواشی تحریر کئے، جو سب غیر مطبوعہ ہیں۔

آپ کا ذاتی کتب خانہ، فقہ، تفسیر اور حدیث کا ایک نادر ذخیرہ تھا۔ اس کا ایک حصہ آپ کے فرزند مولانا محمد اسحاق اختر نے دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کو عطیہ دے دیا۔ آپ کے چار فرزند ہیں۔ مولانا عبد الغفور دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ ۹ اپریل ۱۹۳۲ء کو وفات پا گئے۔ مولانا فضل حق حیات ہیں اور اب گوشہ نشین۔ مولانا محمد اسحاق اختر جمعیۃ العلماء صوبہ سرحد کے جائنٹ سیکرٹری، جمعیت کے ترجمان، "صداقت" پشاور کے مدیر اور صوبائی مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے ناظم نشر و اشاعت تھے۔ آج کل چترال میں مقیم ہیں اور تدریس کا پیشہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ محمد ایوب بھی تدریس سے متعلق ہیں۔

باب دہم

چند تاریخی خطوط، جو تاریخ ہزارہ پر روشنی ڈالتے ہیں

چند تاریخی خصوط اور حالات کے اقتباس جو ہزارہ کی تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ناظرین کی دلچسپی کے لئے درج کئے جاتے ہیں

پنجاب ریکارڈ آفس پبلی کیشن، مانوگراف ۱۷

رنجیت سنگھ کے دربار کے واقعات

۱۸۱۰ء سے ۱۸۱۷ء

یہ ریکارڈ ان فارسی خطوط کا انگریزی ترجمہ ہے، جو باجی راؤ پیشوا کا ایک اہل کار فارسی زبان میں لاہور دربار رنجیت سنگھ سے پیشوا کی اطلاع کے لئے لکھتا رہا۔ یہ خطوط ۱۸۱۷ء پر ختم ہو جاتے ہیں کیونکہ اسی سال باجی راؤ نے انگریزوں کی اطاعت قبول کر لی تھی اور پیشوا کا عہدہ ختم کر دیا گیا تھا۔

۱۔ ۱۸۱۰ء خط ۲ از ڈیوڑھی سردار رنجیت سنگھ بہادر بروز ہفتہ ۲۲ ردسمبر ۱۸۱۰ء مطابق ۲۵ ر ذلیقعدہ ۱۲۲۵ھ۔ یہ اطلاع دی گئی ہے کہ مرزا محمود شاہ اور سردار فتح خان وزیر ابھی تک پشاور میں ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ عطا محمد خان صوبیدار کشمیر اور محمد عظیم خان کے ساتھ دونوں طرف کے نمائندگاں کی معرفت صلح کی بات چیت ہو رہی ہے اور محمد عظیم خان اور عطا محمد خان امداد کرنے

کے لئے تیار ہو گئے ہیں اور اس بات پر بھی رضامند ہو گئے ہیں کہ صوبیدار کشمیر کے کچھ سوار اور پیادہ سپاہی مرزا محمود شاہ کی نوکری میں حاضر رہیں گے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ حاکم سندھ کے کاردار نے اپنے حاکم کی جانب سے تیس ہزار روپیہ مرزا محمود شاہ اور سردار فتح خان وزیر کو مالیہ سے ادا کر دیا ہے۔ زمان شاہ ابھی راولپنڈی ہی میں ہے، اگرچہ اس کا عملہ وغیرہ اب پنڈ دادن خان کو منتقل ہو گیا ہے۔

۱۵ مارچ ۱۸۱۲ء۔ جالندھر کے مسلمانوں پر ایک گائے کو ذبح کرنے پر تین ہزار روپیہ جرمانہ کیا گیا۔

۱۷ ستمبر ۱۸۱۲ء، قلعہ بھنگیاں۔ امرتسر

منشی دیوی داس نے ایک خط لاہور میں سردار رنجیت سنگھ کی خدمت میں۔ از جانب بیگم حضرت شجاع الملک پیش کیا۔ جس میں لکھا تھا کہ میری حالت کمزور ہونے کی وجہ سے اخراجات کی تنگی ہو رہی ہے اور آپ کو خدا نے بڑا سردار بنایا ہے، لہٰذا میری مدد کریں۔ اعلیٰ سردار نے اس پر غور کرنے کے بعد حکم سنگھ تھانہ دار لاہور کو حکم دیا کہ وہ ہر ماہ چار ہزار روپیہ بیگم موصوف کو خرچ کے لئے دیا کرے۔ اگر بیگم شجاع الملک یہ خط نہ بھیجتیں اور قلیل پر قناعت کرتیں تو بہتر تھا۔ اب تو اپنی آبرو بھی کم ہوئی اور شجاع الملک کی عظمتِ رفتہ کو بھی بٹہ لگا ۔

"مالم" افزود و آبرویم کاست
بے نوائی بہ از مذلت خواست

۴۔ مورخہ ۲۱ جنوری ۱۸۱۳ء۔ از قلعہ بھنگیاں۔ امرتسر

اس خط میں اطلاع دی گئی ہے کہ سردار فتح خان وزیر کشمیر کی سرحد پر پہنچ گیا ہے اور وہاں اپنا کیمپ لگا لیا ہے۔ عطا محمد خان دو تین دفعہ سردار فتح خان وزیر کو آکر ملا۔ لیکن بات چیت سے معاملہ نہ طے ہو سکا۔

۵۔ مورخہ ۵ مارچ ۱۸۱۳ء

یہ افواہ مشہور ہے کہ سردار فتح خان وزیر اور عطا محمد خان غسل کرنے کے لئے حمام میں گئے۔ جب عطا محمد خان حمام میں داخل ہوا، تو سردار فتح خان وزیر نے حمام کو بہت زیادہ گرم کروا دیا اور عطا محمد خان سے زبرداً زمین میں دفن کئے

ہوئے خزانہ کا حال پوچھا۔ اس پران میں گالی گلوچ بھی بیان کی جاتی ہے اور عطا محمد خان نے چالیس لاکھ روپیہ اور کچھ جواہرات جو زمین میں دبائے گئے تھے، سردار فتح خان وزیر کو دے کر رہائی حاصل کی۔

۶۔ مورخہ ۱۱ مارچ ۱۸۱۳ء۔ شاہی قلعہ۔ لاہور

قاصدوں کی ایک اور جوڑی آئی (ڈاک رسانی کے لئے دو آدمی۔ یعنی ایک جوڑی اس زمانے میں چلا کرتے تھے) اور وہ منشی دیوی داس، سردار مت سنگھ بھرانیہ اور حکیم عزیز الدین خان کے خطوط لائے۔ اس میں انہوں نے تحریر کیا تھا کہ وہ اٹک کی جانب روانہ ہو گئے ہیں اور وہاں پہنچنے پر انہوں نے دریا کے کنارے اور قلعہ کے نیچے اپنا کیمپ لگایا ہے۔ عبدالرحیم خان نے جو نواب عطا محمد خان کی طرف سے اس قلعہ کا قلعہ دار تھا، قلعہ ہمارے حوالہ کر دیا ہے اور ان کی فوج کے ساتھ شامل ہو کر ان کے کیمپ میں آگیا ہے اور اس نے اعلیٰ سرکار کے قلعہ دار کو قلعہ پر پوری طرح قابض کرا دیا ہے۔

۷۔ مورخہ ۸ جون ۱۸۱۳ء، ۸ رجمادی الثانی ۱۲۲۸ھ

کل اعلیٰ سرکار تمام دن کوہ نور ہیرا جو کمال مہربانی سے حضرت شجاع الملک نے ان کو دیا، جوہریوں کو دکھلاتے رہے اور اس کی قیمت لگوائی۔ وزن میں یہ تین سورتی سے زیادہ تھا قیمت کے لحاظ سے اس کو بہت ہی بے بہا قرار دیا گیا۔ کیونکہ اس کی مثل کوئی ہیرا اس کے پاس نہیں۔

نوٹ: مندرجہ بالا ایک قیمتی عصری شہادت کوہ نور ہیرا کو شجاع الملک سے رنجیت سنگھ کے زبردستی لینے کی ہے۔ اس بیان کی تصدیق اس عصر کی تاریخوں سے کی جا سکتی ہے۔

جب رنجیت سنگھ کی عمر کا جام لبریز ہونے لگا تو اس نے ظلم و زیادتی سے جمع کی ہوئی دولت سے بیالیس لاکھ دان کیا اور یہی "کوہ نور ہیرا" ایک مندر کو دے دیا۔ (فاعتبروا یا اولی الابصار)

۸۔ لاہور۔ مورخہ ۹ جون ۱۸۱۳ء

کنور کھڑک سنگھ معہ فوج حسن ابدال سرائے میں وزیر اعظم (سردار فتح خان وزیر) کی فوجوں سے جنگ کے لئے ٹھہرا ہوا ہے۔ وزیر اعظم کے دو ہزار درانی سواروں نے کنور کھڑک سنگھ کو اٹک کے نزدیک شکست دی۔

۹۔ لاہور ۱۵ جون ۱۸۱۳ء

فوج سے ایک قاصد آیا اور بیان کیا کہ اعلیٰ سرکار کی فوجیں سرائے کالا سے روانہ ہو گئی ہیں اور حسن ابدال کے نزدیک اور سردار فتح خان کی فوجوں سے ۵ یا ۶ کوس کے فاصلہ پر کیمپ لگایا۔

۱۰- لاہور- یکم جولائی- ۱۸۱۳ء

ایک خط جو سکھ دیال ایجنٹ راما راما نند ساہوکار ساکن پنڈ دادنخان نے لکھا ہے۔ بیان کرتا ہے- اس ماہ کی گیارھویں تاریخ کو صبح سویرے دیوان محکم چند اور دوسرے فوجی افسران اکٹھے اٹک کے قلعہ میں راشن پہنچانے کے لئے روانہ ہو گئے- دوسری طرف سے دوست محمد خان برادر سردار فتح خان وزیر بمعہ اور سرداروں کے باؤلی سے تقریباً ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر موجود تھے- آمادہ جنگ ہوئے- اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ درانیوں نے اچانک حملہ کر دیا- اس طرف سے توپوں اور بندوقوں کے فائر کئے گئے- کافی جنگ اور کشت و خون کے بعد دشمنوں نے مقابلہ کی تاب نہ لا کر راہِ فرار اختیار کی اور دشمن کے بہت سے آدمی دریائے اٹک میں غرق ہو گئے- سردار فتح خان نے جو اپنے لشکر کے عقب میں چھپا بیٹھا تھا، دل ہار کر کشمیر کا راستہ لیا- اب خدا ہی جانتا ہے کہ اس کے بعد وہ کہاں بھاگ کر جائے گا- دیوان محکم چند، سردار دل سنگھ بھرانیہ بمعہ دوسرے سرداروں کے اس کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔

(نوٹ- اس کے بعد دوسرے خط محررہ ۸ر جولائی ۱۸۱۳ء میں معمولی معمولی جھڑپوں کا ذکر ہے اور جن کے نتیجہ میں آخری جنگ حضرو کے مقام پر ۱۳ر جولائی ۱۸۱۳ء میں لڑی گئی- ش ب)

۱۱- لاہور- مورخہ ۹ر جولائی- ۱۸۱۳ء

رام سنگھ مدار المہام نے اعلیٰ سرکار سے اظہار کیا کہ حضرت شجاع الملک سے کہا جائے کہ وہ عہدنامہ میں کشمیر، ملتان اور ڈیرہ غازی خان کو شامل کریں- اس پر اعلیٰ سرکار نے بھائی گوربخش سنگھ کو عہدنامہ کے کاغذات دے کر بھیجا کہ وہ ان علاقوں کے نام اس میں درج کرا دے ...

(یہ دلچسپ واقعہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۱۳ء ہی سے رنجیت سنگھ اور شجاع الملک کے درمیان سیاسی بات چیت شروع ہو گئی تھی، حالانکہ اس بات کا تذکرہ سکھ تاریخ کے لکھنے والوں نے نہیں کیا) ..... ایک قاصد آیا اور دیوان محکم چند کا ایک خط لایا، جس میں تحریر تھا کہ اس نے حرامیوں کے مواضعات کو جلا دیا اور جو غلہ اور سامان ان گاؤں سے حاصل ہوا وہ قلعہ میں بھیج دیا ہے-

۱۲- لاہور- مورخہ ۲۱ر جولائی ۱۸۱۳ء

مطابق ۲۲ر رجب ۱۲۲۸ھ دفتح کے بعد، سردار فتح خان وزیر جہانگیرہ نوشہرہ سے پشاور کی جانب روانہ ہوا-

وہ کابل جانے کا ارادہ کر رہا تھا ... قاصدوں نے آکر بیان کیا کہ دیوان محکم چند نے سابقہ فوجیوں کو قلعہ سے نکال نئے افسر اور فوج قلعہ میں مقرر کی اور خود وہاں سے ضلع حسن ابدال کو روانہ ہو گیا اور وہاں کیمپ لگایا۔ وہاں پر اس نے اس علاقہ کے زمینداروں کو جو باغی ہو گئے تھے، سزا دینی شروع کی۔ علاقہ کے سب لوگ اطاعت کے لئے حاضر ہوئے۔

۱۳۔ لاہور۔ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۸۱۳ء | دل سنگھ بھرانیہ اپنے ساتھیوں اور قطب الدین خاں (قصوری۔ ش ب) قلعہ میں داخل ہوا۔

۱۴۔ لاہور۔ ۴۔ اگست ۱۸۱۳ء | ایک قاصد کشمیر سے آیا اور بیان کیا کہ محمد عظیم خان وہاں ہے اور اپنی بد قسمتی پر غمگین ہے اور کشمیر کے راجاؤں کے ساتھ ساز باز کر رہا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ سردار فتح خان وزیر اٹک پر یقیناً حملہ کرے گا۔ اس واسطے اعلیٰ سرکار کی فوج کبھی بھی کشمیر نہیں پہنچ سکتی۔ سردار فتح خان کے متعلق اطلاع آئی ہے کہ وہ پشاور میں ہے اور لوگوں سے روپیہ جمع کر رہا ہے۔

۱۵۔ لاہور۔ مورخہ ۱۲۔ اگست ۱۸۱۳ء | سردار فتح خان وزیر نے اعلیٰ سرکار کو لکھا کہ وہ اٹک کا قلعہ چھوڑ دے اور ہمارے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھے، نہیں تو وہ قلعہ پر حملہ کرے گا۔ اعلیٰ سرکار خط سن کر مسکرائے اور کہا کہ وہ رنجیت سنگھ اس ماہِ اسوج میں وہیں اس کو ملے گا۔

۱۶۔ لاہور۔ ۱۰۔ ستمبر ۱۸۱۳ء، ۱۴ رمضان ۱۲۲۸ھ | اعلیٰ سرکار محل کے ایک کونہ میں چلے گئے اور نہال سنگھ سے تخلیہ میں کہا کہ شجاع الملک کے پاس ایک گھوڑے کی زین ہے جو جواہرات سے مرصع قیمتی ۲۰۔ لاکھ روپیہ کی ہے اور ایک بڑا فیروزہ کا پلنگ ہے اور اس کے چاروں پایوں پر ایک ایک بڑا ہیرا لگا ہوا ہے اور وہ یہ اشیاء اس سے اپنے لئے مانگنی چاہتا ہے۔ انہوں نے کہا، اعلیٰ سرکار کو کلی اختیار ہے، جو مناسب سمجھے کر سکتا ہے، لیکن پہلے ہی اس سے کوہِ نور ہیرا چھیننے پر کافی بدنامی ہو چکی ہے اور اب یہ دونوں چیزیں بغیر مزید سختی، بدمزگی اور بے عزتی کے حاصل نہیں کی جا سکتیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ فی الحال اعلیٰ سرکار کو اس پر خاص توجہ، عنایت، مہربانی

اور حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ اعلیٰ سرکار نے کہا کہ اس کی بھی یہی رائے ہے۔ اعلیٰ سرکار نے سردار کھڑک سنگھ کے مدار المہام کو بلایا اور شجاع الملک کو اپنی طرف سے پیغام پہنچایا کہ اعلیٰ سرکار عنقریب اس کو کافی فوج کے ساتھ پشاور بھجوا دے گا۔ ایک خط حکم سنگھ تھانہ دار لاہور کو لکھا گیا کہ وہ خاص طور پر بیگمات حضرت شجاع الملک کی خاطر مدارت کرے۔

(اطلاع ملی ہے کہ محمود شاہ کابل ہی میں ہے اور ایک ماہ کے اندر اس طرف روانہ ہوگا۔)

۱۷۔ لاہور۔ ۲۲ جنوری ۱۸۱۴ء سردار فتح خاں نے دوتر کی نسل کے گھوڑے اور پھل بطور تحفہ بھیجا اور وعدہ کیا کہ وہ حسب معاہدہ ملتان کا قلعہ خالی کر دے گا۔ سردار فتح خاں کے خط پر غور کرنے کے بعد اعلیٰ سرکار نے فرمایا کہ اگر سردار فتح خاں اپنی فوج کے ذریعہ سے ملتان کا قلعہ خالی کرا دے اور کشمیر کا سالانہ خراج گیارہ ہزار روپیہ ادا کرے تو وہ اٹک کا قلعہ اس کے حوالہ کر دے گا۔ اس کے بعد اعلیٰ سرکار نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ درانیوں پر اعتبار نہیں کرتا۔

۱۸۔ جمعہ۔ ۴ مارچ ۱۸۱۴ء، ۱۱ ربیع الاول رام سنگھ کاردار کنور کھڑک سنگھ (سب سے بڑا شاہزادہ) آیا اور کہا کہ وہ حضرت شجاع الملک کے پاس گیا تھا اور اس کو بموجب حکم اعلیٰ سرکار پیغام پہنچا دیا تھا، کو وہ خود سب جواہرات، ہیرے اور زمرد وغیرہ جو اس کی بیگمات کے پاس ہیں، اعلیٰ سرکار کو دے دے، نہیں تو دوسرے طریقہ سے لے لئے جائیں گے۔ جس پر شاہ نے کہا کہ فی الحال اس کے پاس کچھ بھی نہیں، جو کچھ اس کے پاس تھا وہ پہلے سے ہی انہوں نے چھین لیا ہے۔ اب اس کی زندگی ہی باقی رہ گئی ہے۔ اگر وہ چاہتے ہیں تو اس کو لے سکتے ہیں۔ اس نے یہ بھی بیان کیا کہ آخر کار وہ کچھ نہ کر سکا اور واپس آ گیا اور اعلیٰ سرکار کو خبر دے دی ہے۔

اعلیٰ سرکار نے یہ سنا اور کچھ اس کے کان میں کہا اور اس سے کہا کہ چند خدمت گار عورتیں بعد از دوپہر اپنے ساتھ لے جائے اور ان کو اندر حرم میں بھیجے اور ان سے کہے کہ جو چیز از قسم جواہرات موتی اور جو بکس وہاں ملیں، ان سب کو چھین کر لے آویں۔ رام سنگھ نے سن کر حکم کی تعمیل کا اقرار کیا ...... رام سنگھ واپس آیا اور کہا کہ وہ شجاع الملک کے ڈیرے پر گیا اور جواہرات وغیرہ مانگے پھر پانچ خدمت گار عورتوں کو محل کے اندر بیگمات کے پاس بھیجا اور جو کچھ ان کے محل کے اندر از قسم

جواہرات، زمرد، موتی، چھوٹے بکس، قالین وغیرہ ملے وہ ساتھ لے آئیں۔ حضرت شاہ شجاع الملک یہ دیکھ کر رو دیا اور اونچی آواز سے فریاد کی، کہ وہ خدا کی مرضی کی مخالفت نہیں کر سکتا اور جو کچھ وہ لے جانا چاہتے ہیں لے جائیں۔ اعلیٰ سرکار نے اس کو کہا یہ سب اشیاء دوسرے دن اس کے ملاحظہ کے لئے پیش کرے۔

۱۹۔ مورخہ ۵ مارچ ۱۸۱۴ء (ایام ہولی)، یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت شجاع الملک نے جواہرات اور سامان چھن جانے کے غم سے دو دن سے کھانا نہیں کھایا۔ اعلیٰ سرکار یہ سننے کے بعد اپنے دوستوں کے ساتھ ہولی کھیلنے میں مصروف ہو گئے۔

۲۰۔ لاہور۔ ۲۹، ۳۰ جولائی ۱۸۱۴ء عام افواہ ہے کہ اعلیٰ سرکار نے کشمیر فتح کر لیا ہے اور محمد عظیم ناظمِ کشمیر بھاگ گیا ہے۔

۲۱۔ مورخہ ۵ دسمبر ۱۸۱۴ء موضع نادین وال واقعہ تعلقہ قلعہ اٹک اور قلعہ سے بجانب شمال یہ بیان کیا گیا ہے کہ اعلیٰ سرکار کے سپاہیوں نے اس سے اجازت لے کر گندگر میں ایک قلعہ بنا لیا ہے اور اس کے ہر برج پر قلعہ اٹک کے رخ توپیں چڑھا دی ہیں۔ ..... یہ اطلاع ملی ہے کہ محمد عظیم خان کشمیر میں لوگوں کو تنگ کر رہا ہے۔ ..... ایک جوڑی (قاصد) پشاور سے آئی اور بیان کیا کہ شاہ محمود پشاور ہی میں مقیم ہے اور پشاور کے حاکم نے شہر کے بنیوں سے دو لاکھ روپیہ لے کر محمود شاہ کو دیا ہے۔

۲۲۔ لاہور۔ ۳ مارچ ۱۸۱۵ء حکیم عزیز الدین خان نے بیان کیا کہ وہ حسب الحکم حضرت شاہ شجاع الملک کے پاس گیا اور اس کو بہت بڑی رقم والی ہنڈی دینے کو کہا۔ اس نے جواب دیا کہ وہ ہنڈی اس کے پاس نہیں ہے، بلکہ وہ حرم میں بیگمات کے پاس ہے اور اگر اعلیٰ سرکار اس کی جان لینا چاہتے ہیں، تو وہ لے سکتے ہیں لیکن اسے اب اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور اس کا سب مال و متاع لے لیں۔ اعلیٰ سرکار نے یہ جواب سنا اور خاموش رہے۔

۲۳۔ وزیر آباد۔ ۹ جون ۱۸۱۵ء نوشہرہ میں افواہ گرم ہے کہ سردار فتح خان وزیر پشاور ہی میں ہے اور اس نے یوسف زیوں کے پچیس ہزار آدمی جمع

گئے ہیں اور قلعہ اٹک کی طرف ان کو روانہ کر دیا ہے اور اپنی کچھ فوج محمد عظیم ناظم کشمیر کی درخواست پر براہ تبت دچترال۔ ش ب، کشمیر کی طرف روانہ کی ہے۔

۲۴۔ موزخہ۔ ۱۴ر جولائی ۱۸۱۵ء | ان دنوں میں ایک عجیب بیماری قلعہ اٹک میں شروع ہے اور بہت سے سپاہی اور سکھ مر گئے ہیں۔ افغان فوج دریائے پار سے قلعۂ اٹک پر گولے برسا رہی ہے اور ادھر سے گولیاں چلائی گئیں.... تین سو مزدور، ترکھان اور راج قلعہ اٹک کے سامنے دریا سے پار برج نادر شاہ دخیر آباد۔ ش ب) کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ اس برج سے گولہ قلعہ اٹک پر لگ سکتا ہے۔

شاہزادہ کامران اور عثمان پسران زمان شاہ جواہرات چھوڑ کر حاجی فیروز الدین کے پاس چلے گئے تھے۔ وہ وہاں سے حج کے بہانہ پر رخصت ہو کر ملتان پہنچ گئے ہیں۔ جہاں پر مقامی خوانین نے ان کا بہت اچھی طرح استقبال کیا۔ وہ وہاں شاہ شجاع الملک کے پاس جانے کے خواہاں ہیں۔

۲۵۔ لاہور۔ ۲۷ر جولائی ۱۸۱۵ء۔ اطلاع ملی ہے کہ شاہ شجاع الملک فرار ہو گیا ہے۔

۲۶۔ لاہور۔ ۴ر ستمبر ۱۸۱۵ء | اطلاع ملی ہے کہ شاہ شجاع الملک پہاڑوں سے ہوتا ہوا منی ماجرا چلا گیا ہے اور وہاں سے غالباً وہ لدھیانہ آج شام یا کل صبح پہنچ جائے گا۔

۲۷۔ ۱۵ر ستمبر ۱۸۱۵ء | خبر آئی ہے کہ شاہ شجاع الملک ابھی تک کشتواڑ دکشمیر) میں اقامت گزیں ہے اور اس کے ساتھ ایک ہزار سوار اور پیادہ ملازم ہیں۔

نوٹ :۔ ۱۔ سردار فتح خان وزیر کو محمود شاہ کے حکم پر کامران نے ہرات میں ۱۸۱۸ء میں اندھا کر دیا۔ اس پر بارک زئی برادران نے قندھار اور کشمیر میں علم بغاوت بلند کر دیا۔ محمود شاہ اور کامران نے غزنی میں مقابلہ کیا۔ فتح خان کو ساتھ لائے اور وہاں زندہ کی کھال کھنچوا دی۔ محمود شاہ اور کامران نے ہرات میں پناہ لی اور سلطنت افغانستان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس طرح سدوزئی خاندان کی بادشاہ احمد شاہ ابدالی سے ۱۷۴۷ء میں شروع ہو کر ۱۸۱۸ء میں ختم ہو گئی۔

۲- ۱۸۱۸ء کے حالات۔ سدوزئی بادشاہی شمال میں بلخ سے جنوب، سندھ اور بلوچستان تک آزاد ہوگئی۔ مشرق میں پنجاب اور کشمیر پر رنجیت سنگھ نے قبضہ کرلیا اور پشاور پر بھی اپنا غلبہ کرلیا اور وہاں کے حاکم سلطان محمد خان بارک زئی نے خراج دینا منظور کرلیا اور آخر کار پشاور کو اپنی ریاست میں شامل کرلیا۔ ۱۸۱۹ء میں کشمیر پر سکھوں نے حملے شروع کر دیئے اور آخر کار فتح کرلیا اور اسی سال ڈیرہ غازی خان اور ۱۸۲۱ء میں ڈیرہ اسمٰعیل خان پر قبضہ کرلیا۔ ۱۸۲۳ء میں محمد عظیم خان پشاور پر حملہ کے لئے آیا۔ لیکن سکھوں سے شکست کھائی۔ ۱۸۳۷ء میں بہ مقام جمرود افغان فوجوں نے زیر کمان اکبر خان پسر دوست محمد خان سکھوں کو شکست دی اور ہری سنگھ مارا گیا۔

شجاع الملک اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کا معاہدہ

صلح نامہ ما بین شجاع الملک ا رنجیت سنگھ اور سلطنت انگلشیہ ۲۵ رجون ۱۸۳۸ء میں ہوا۔ اس معاہدہ کا آرٹیکل ۱ یہ تھا

شاہ شجاع الملک نے اپنی اور اپنے ورثا کی ملکیت مندرجہ ذیل علاقوں میں سکھوں کو منتقل کردی ہے۔ کشمیر، اٹک، چھچھ، ہزارہ، کھبل، امب بمعہ ملحقات، پشاور بمعہ علاقہ یوسف زئی، خٹک، ہشت نگر، کوہاٹ، ہنگو اور پشاور کے سب ماتحت علاقے تا خیبر، بنوں، وزیرستان داوڑ، ٹانک، گرنگ، کالاباغ، خوشحال گڑھ اور اس کے ماتحت اضلاع ڈیرہ اسمٰعیل خان، ڈیرہ غازی خان، شمالی سندھ کے تین کچھ اور صوبہ ملتان۔

نوٹ: رنجیت سنگھ ۱۸۳۹ء میں مر گیا۔

دسمبر ۱۸۴۸ء میں دوست محمد خان نے پشاور تا دریائے سندھ فتح کرلیا اور اپنے پوتے (اکبر خان کے لڑکے)، کو پشاور کا گورنر بنا دیا۔ یوسف زیوں نے کچھ تعرض نہ کیا اور خود چتر سنگھ (جو سکھوں سے باغی تھا)، سے ملنے کے لئے روانہ ہوا اور زنجیر آباد پر قبضہ کرلیا۔ سکھ اٹک کے اس طرف رہے، دوست محمد خان، چتر سنگھ سے انگریزوں کے خلاف لڑنے کا عہد و پیمان کرتا رہا۔

سب واقعات کے اقتباسات سر آلف کیرو کی کتاب پٹھان سے لئے گئے

ایک خط اس نے ایبٹ کو جو اس وقت مشوانیوں کے پاس گندگر میں تھا، لکھا، کہ وہ پشاور ڈیرہ جات اور ہزارہ کو لینے کے لئے آیا ہے اور جب وہ ان پر قبضہ کر لے گا، تو وہ بڑی خوشی سے انگریزوں اور سکھوں میں صلح کرانے کی بات چیت کرے گا۔

ہزارہ میں نکلستانی (نکل سینی) گروہ، جان نکلسن کو اپنا گرو سمجھتے تھے اور اس کی پرستش کرتے تھے اور اس کی موت کے بعد اس کا ماتم کیا کرتے تھے۔

جان نکلسن نے چتر سنگھ کا مقابلہ مارگلہ میں ۱۸۴۸ء میں کیا تھا۔ اس کی یادگار میں ۱۸۶۸ء میں اس مقام پر ایک مینار بنایا گیا۔ ۱۸۴۸ء میں ایبٹ نے سری کوٹ میں پناہ لی۔ جب چتر سنگھ نے زیریں ہزارہ اور دوست محمد خان نے پشاور پر قبضہ کر لیا تھا۔

دوسری جنگ سکھاں کے عرصہ میں سری کوٹ سے ایبٹ نے نکلسن کی امداد کی۔ مارگلہ کی طرف سے یہ کوشش کی کہ پکھلی (مانسہرہ) کی سکھ فوجیں چتر سنگھ سے نہ مل سکیں۔ لیکن دھمتوڑ کے جدونوں کی بے وفائی اور میدان سے بھاگ جانے پر ایبٹ کو پھر سری کوٹ میں پناہ لینی پڑی اور وہاں دوستوں کی امداد پر مقیم رہا۔ یہاں تک کہ گجرات کی جنگ نے انگریزوں کو فتح دلائی اور سکھوں کی بقایا فوج نے ۱۴ مارچ ۱۸۴۹ء میں راولپنڈی میں ہتھیار ڈال دیئے۔ اس وقت ایبٹ مشوانی سپاہیوں کے ساتھ مارگلہ کے مورچہ پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کی وجہ سے سکھوں کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

ایبٹ میانہ قد کا مضبوط آدمی تھا۔ ۱۸۴۹ء کے بعد وہی ہزارہ کا پہلا ڈپٹی کمشنر ہوا اور چار سال کے بعد اس کو ایشا پور نزد کلکتہ میگزین اور توپ کے کارخانہ میں تبدیل کر دیا گیا۔

قاسم خان (جو پنی قوم میں قاسم بابا کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے خاندان کی قرابت میر خانی پنی خاندان سے تھی)، ساکن کھیل ۱۹۲۷ء میں زندہ تھا۔ جبکہ وہ سو سال کی عمر کا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ جب ایبٹ صاحب ۱۸۴۷ء میں ہزارہ آیا تو وہ (قاسم خان) ۱۴ سال کا نوجوان تھا۔ قاسم خان کا اپنا قد ۵ فٹ کے قریب تھا اور وہ کہتا تھا کہ ایبٹ صاحب کا قد اس کے برابر تھا۔ قاسم خان ۱۹۲۹ء میں فوت ہوا۔

۱۸۴۷ء میں جارج لارنس جو پہلی سکھ دار کے بعد پشاور آیا۔ اس نے سلطان محمد کو اچھی طرح دیکھا۔ پہلی وار (اول جنگ سکھاں) کے بعد اگرچہ سکھوں کی حکومت تھی۔ لیکن عملاً وہ انگریزوں

کے ماتحت تھے اور لاہور میں مہاراجہ کے ساتھ انگریز ریذیڈنٹ بھی رہتا تھا۔ کشمیر گلاب سنگھ کو دیا گیا تھا اور سرحدی اضلاع جو پہلی جنگ کا باعث تھے، لاہور کے انگریز ریذیڈنٹ کے ماتحت ان اضلاع میں انگریز اسسٹنٹ مقرر کئے گئے تاکہ لوگ صلح اور امن سے آرام کریں یہی وقت تھا جب جارج لارنس، ایبٹ، ایڈورڈ، نکلسن اور دیگر انگریز، پٹھانوں کے علاقے میں آئے۔ جارج لارنس کے کہنے پر سلطان محمد کو راجہ نے لاہور سے پشاور آنے دیا۔ وہ پشاور میں آکر وزیر باغ میں رہائش پذیر ہوا، جو اس کے بڑے بھائی فتح خان وزیر نے ۱۸۱۰ء سے پہلے بنایا تھا۔

جب دوسری جنگ سکھاں ۱۸۴۸ء میں ملتان میں اینڈرسن اور اگینو کے قتل سے شروع ہوئی۔ اس وقت سلطان محمد خان ریذیڈنٹ کے پاس ملاقات کے لئے گیا اور لمبی ملاقات میں ہر قسم کی امداد کا وعدہ کیا۔ لیکن جنگ کے دوران میں سلطان محمد نے ریذیڈنٹ اور اس کی بیوی کو سکھوں کے حوالے کر دیا اور اس طرح سے ذاتی فائدہ کے لئے بے ایمانی اور بدعہدی کا مرتکب ہوا۔ اس پر ایبٹ نے اپنی ڈائری ۱۸۴۸ء ۱۸۴۹ء میں لکھا کہ پٹھانوں کے نزدیک درانی سکھوں سے بھی قابل نفرت تھے۔ دوست محمد خان اگرچہ خود بھی دوسری جنگ سکھاں میں سکھوں کا معاون تھا لیکن سلطان محمد نے اس کے کرتوت پر کہا:

"کیا تم نے نہیں سنا کہ خوگیانی پٹھانوں نے ایک سؤر کی حمایت میں جس نے کتوں سے بھاگ کر ان کے خیموں میں پناہ لی تھی، احمد شاہ کے خلاف اپنی تلواریں نکال لی تھیں"

چند سندات جو متعلقہ قوم ترک وارثان پٹی تورکی جو بندوبست ۱۸۷۰ء میں پیش ہوئے۔

۱۔ ۹ ر پھاگن ۱۸۸۳، ۱۸۲۶ء بمہر گورمکھی ہری سنگھ فصل ربیع ۱۸۸۳ بکرمی سے موضع تیر وٹر توپہ و پھراڑی نگری و پنڈ بوجہ جاگیر راجہ ہاشم خان عطا کیا گیا۔

۲۔ ۴ ر ہاڑ سمت ۱۸۸۴، ۱۸۲۷ء ہری سنگھ موضع دو بندی عوض ایک ہزار روپیہ کے فصل خریف ۱۸۸۴ بکرمی سے راجہ ہاشم خان کو جاگیر میں دیا گیا۔ بطور استمراری کے اور ماخذ ۱۵۰ روپیہ اضافہ سال تمام داخلہ سرکار کیا کرے اور بکری شادی و کار بیگار معاف ہوتے۔ سوائے کھگل اور مرمت قلعہ ہرکشن گڑھ کے کہ قدیم سے اس کے ذمہ دار تھے۔

۳۔ ۹ ر پھاگن سمت ۱۸۸۳، ۱۸۲۶ء فصل ربیع سمت ۱۸۸۴ سے مواضعات پنڈ، پھرہال، نڑ توپہ

پھرہاڑی، ونگری، راجہ ہاشم خان کو جاگیر عطا ہوتے مع ہشتاد سپاہیوں داشتی سپاہیوں، کے خدمت سرکار میں حاضر رہے جبکہ ضرورت ہو اور تنخواہ ان کی اپنے پاس سے دیوے اور کار بیگار قلعہ کی بھی کیا کرے۔

۴ - ۲۱ ماگھ سمت ۱۹۰۱ مطابق ۱۸۴۴ء از دیوان مولراج - حیات خان مانکرائے والا کو حکم ہوا ہے کہ جو معاملہ مقرر ہوا ہے، بہر صورت وصول کر کے داخل توشہ خانہ سرکار کرو اور لالہ آسانند و جمعدار لیکھراج کو لکھا گیا ہے، وہ تمہارے پرداخت میں فرق نہیں کریں گے۔

۵ - ۱۶ پھاگن سمت ۱۹۰۱، ۱۸۴۴ء از دیوان مولراج - حیات خان کو لکھا گیا کہ ہم کو آبادی رعایا سب چیز سے مقدم ہے۔ ہر کسی کو دلاسا دے کر رکھو اور بیباقی معاملہ کی اور بابت مقدر کھتریوں کے لالہ آسانند کے پاس رجوع کرو کہ وہ اپنے روبرو تصفیہ کرے گا۔

۶ - ۲۲ اسوج سمت ۱۹۰۵، ۵ اکتوبر ۱۸۴۸ء از میجر ایبٹ صاحب، حیات خان مانک رائے والے کو حکم ہوا کہ تم مانکرائے میں پہنچ کر اور معاملہ اپنے علاقہ اپنے کا تحصیل کر کے روانہ حضور کرو اور جس گاؤں میں فصل سوختہ ہو کر خراب ہو گیا ہے وہاں سوم تخفیف کرو۔

۷ - ۳ ماگھ سمت ۱۹۰۵، ۱۴ جنوری ۱۸۴۹ء از سردار چتر سنگھ، لالہ کنہیا لال کے نام لکھا گیا ہے کہ جو نصف حصہ معاملہ خریف سمت ۱۹۰۵ حیات خان ترک کا ہے، وہ حیات خان سے لے لو اور بعد ادا کرنے معاملہ کے حیات خان مانکرائے میں سکونت رکھے اور جو سکھان نے چریدہ گاؤں سے لیا ہے وہ مجرا دیا گیا اور جو فتح خان کا نقصان ہوا ہے وہ تم مجرا دے دو۔

۸ - ۱۵ پوہ سمت ۱۸۹۵، ۱۸۳۸ء سردار لہنا سنگھ، موازی اسی کنال زمین اور ایک جندر موضع مانک رائے سے راجہ فتح خان کو دیا گیا۔ حاصل وہاں کا معاف کیا جاتے اور سرکار کے حق میں دعا کرے۔

۹ - ۲۳ بیساکھ سمت ۱۹۰۴، ۱۸۴۷ء بخشی ہری سنگھ بموال بنام راجہ جنگ باز و سید حسین شاہ کے لکھا گیا کہ نصف حصہ مانک رائے خاص میں فتح خان ترک کو مقرر کیا گیا۔ تم کارِ سرکار اس سے لیتے رہو اور نصف حصہ انعام مقدم کا اس کو دے کر مقدمان سے دلاتے رہو۔

نوٹ - پنڈتورکی میں عملداری بادشاہی چغتائی سے پیمائش کا پیمانہ ایک رسی تھا۔ جس کے طول عرض سے بارہ کنال زمین ہوتی تھی - آدھ رسی چھ کنال اور پاؤ کے تین کنال سمجھے جاتے تھے۔

باب یازدہم (۱۱)

ضلع ہزارہ کے مقبرے زیارتیں اور درگاہیں

یوں تو ہر گاؤں میں زیارت، مزار عام ہیں۔ لیکن چند مشہور اور تاریخی مزارات وغیرہ یہ ہیں۔

تحصیل ہری پور

۱۔ **بوہر ٹے والی زیارت**: برلب نالہ جوہی، موضع موہڑی ملیا۔ یہ شاہ مقبول کی عبادت گاہ مشہور ہے، جہاں پر انہوں نے ۴۲ سال عبادت کی۔ ان کا روضہ محلہ ڈبگری شہر پشاور میں ہے۔ لوگوں کا عام عقیدہ ہے کہ اس زیارت پر جانے سے بہت سے امراض سے شفا ہو جاتی ہے۔ ان کی اولاد موضع بھیڈیاں اٹک اور موضع کوکلیہ ہزارہ میں آباد ہوئے۔

۲۔ **زیارت شاہ مقصود**: برلبِ دریائے دوڑ، نزد موضع مقصود واقع ہے۔ یہاں پر شاہ محمد غازی جو سکھر سے آئے تھے، مدفون ہیں۔ زیارت کے ساتھ ایک شفاف پانی کا چشمہ ہے۔ یہ زیارت مرجع خلائق ہے۔

۳۔ **زیارت بی بی پرانی ولی** (بی پرانی)، یہ زیارت ایک کنواری فقیرنی کی موضع ویدڑ بر کنارہ سڑک جرنیلی (حسن ابدال تا ہری پور) پر واقع ہے اور زمانہ شاہانِ اسلام کے وقت کی ہے۔ اس زیارت پر ہر اتوار کو بیمار عورتیں (جو مرض پرچھاؤں (چھاواں) سایہ دیو بھوت سے آسیب زدہ ہوتی ہیں) جمع ہوتی ہیں اور تالاب میں نہاتی ہیں۔ اس زیارت کے مجاور

لہ معنی غار۔ ہندی کا لفظ ہے۔

کے پاس لوگوں کی دی ہوئی آٹھ کنال زمین بطورِ سیری برائے خرچ زیارت ہے۔

۴۔ موضع واڑی کی زیارت[1] ہری پور سے ۶ میل نزد موضع کھلابٹ۔ شاہ شیر محمد غازی جو سید کسراں ضلع راولپنڈی سے آئے تھے، یہاں مدفون ہیں۔ ہر جمعرات کو آنکھ کے مریض یہاں جاتے ہیں اور زیارت کی پھلاہیوں کے پتوں کی رس آنکھ میں ڈالتے ہیں۔ ہر عید پر میلہ بھی لگتا ہے اور تیتی کھیلی جاتی ہے۔

۵۔ زیارت چھچکہ موضع صوابی میرا کے پاس ہے اور درد قولنج کے مریض ہر جمعرات اس پر حاضری دیتے ہیں۔

۶۔ زیارت سخی حبیب۔ موضع مانک رائے میں ہے۔

۷۔ زیارت موضع جٹو پنڈ ایک فقیر عہدِ اسلامی میں یہاں آکر اقامت پذیر ہوا۔ ہر جمعرات کو سر درد والے یہاں جمع ہوتے ہیں۔

۸۔ زیارت قاضیاں (نزد ہری پور) یہاں پر میاں عبدالوہاب غازی جو آوان کاری سے یہاں آئے تھے، کا روضہ ہے۔ کھانسی کے مریض ہر جمعرات کو یہاں آتے ہیں ان کی اولاد قاضیاں۔ ملک یار اور پڈھانہ کے مواضعات میں موجود ہے۔

۹۔ زیارت میاں مردان صاحب موضع درویش میں ہے۔ لوگوں کا اعتقاد ہے کہ اس زیارت کے تالاب میں نہانے سے خارش دور ہو جاتی ہے۔

۱۰۔ حضرت حقانی صاحب کی زیارت موضع پہاڑ (نزد موضع پنیاں۔ ان کا اصلی گھر سید کسراں ضلع راولپنڈی میں تھا۔ یہاں پر معتقد ہر جمعرات کو اپنی مرادیں حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں۔

۱۱۔ کھرکوٹ زیارت یہاں پر بابا سجاول المعروف بہ سجالف قوم قطب شاہی آوان کا روضہ ہے۔ جو آوان کاری سے پہلے پکھلی گئے اور پھر یہاں آکر مقیم ہو گئے۔ اولادِ نرینہ حاصل کرنے کے لیے ہر جمعرات کو یہاں میلا ہوتا ہے۔ "تحقیق الاعوان" (مولفہ خواص خان) کے مطابق بابا سجاول مزمل علی کلگاں پسر قطب شاہ کی اولاد سے ہیں۔ ہزارہ کی اعوان برادری زیادہ تر ان کی ہی

---

[1] تربیلہ ڈیم کی وجہ سے اب زیرِ آب ہے۔

اولاد ہے۔ مثلاً کھیال، شدوال وغیرہ۔

کھرکوٹ (پہلے باباصاحب کی وجہ سے کھرے کوٹ ہوگا)، دربند روڈ پر ہری پور سے ۱۵-۱۴ میل برلبِ سڑک ہے۔ ان کی والدہ ماجدہ بی بی چنن جان کی قبر چندور تناول میں ہے۔ یہ موضع ان ہی کے نام پر مشہور ہوا ہے۔ کھرکوٹ سے پہلے آپ تحصیل مانسہرہ میں موجود نوکوٹ سے متصل شاہ داکنڈ یا شادوکنڈ میں مقیم تھے۔

گلی باغ (ترک سلاطین پکھلی کا دارالحکومت۔ نزد لبفہ)، نوکوٹ، بھیڑ کنڈ اور شنکیاری شاہانِ مغلیہ کے عہد سے لے کر ترکوں (سلاطین پکھلی) اور سکھوں کے عہد تک کافی اہمیت اور شہرت کے مقام رہے ہیں۔ گلی باغ، پکھلی کا صدر مقام رہا ہے۔ نوکوٹ اور بھیڑ کنڈ وغیرہ میں ان کے فوجی کیمپ رہا کرتے تھے۔

بابا سجاول، شاہ داکنڈ سے، چار سو سال قبل اور سید جلال بابا کے پکھلی فتح کرنے سے بہت پہلے کھرکوٹ چلے گئے تھے۔ یہ مقام، تربیلہ ڈیم کے بن جانے سے زیرِ آب آگیا ہے۔ ان کے جسد مبارک کو پانی کے آنے سے قبل وہاں سے نکال کر موجودہ مقام سجاول شریف (جو ان کے نام پر بنایا گیا ہے)، تحصیل مانسہرہ میں دفن کر دیا گیا۔

تحصیل مانسہرہ

۱۔ دیوان راجہ بابا کا مزار گلی باغ نزد لبفہ ہے۔ عام روایت ہے کہ ترکوں کی جابر حکومت کا خاتمہ ان کی بددعا سے ہوا۔ انہوں نے ترک راجہ کی اصلاح کیلئے نصیحت کی اور اس کے انکار پر انہوں نے بددعا کی اور تھوڑے عرصہ بعد سواتیوں نے آکر اس کو شکست دے کر ملک سے بدر کر دیا۔ اس زیارت کے ساتھ ایک چشمہ ہے، جس میں بیمار نہاتے ہیں۔

۲۔ میاں خاکی صاحب کا مزار اگرور میں کافی مشہور ہے۔ ان کے متعلق یہ مشہور ہے کہ بیدادی کے ترک بادشاہ نے ان کو ایک شال اور گھوڑا تحفہ میں بھیجا۔ آپ اس بادشاہ سے ناراض تھے۔ شال کو آگ میں ڈال دیا اور گھوڑے کو ذبح کر دیا۔ ایک ٹانگ بادشاہ کو بھیجی اور باقی پکا کر فقیروں کو بھنڈارہ کے طور پر کھلا دیا۔ بادشاہ اس حرکت پر ناراض

ہوا تو اپنا گھوڑا اور شال واپس مانگا۔ آپ نے آگ ہاتھ میں ڈال کر شال صحیح سلامت نکال کر اور گھوڑے کے پنجر کو اٹھا کر زندہ سلامت گھوڑا واپس کر دیا۔

۳۔ زیارت سلطان مغل صاحب واقعہ موضع میاں خاکی دا باغ۔ علاقہ تناول کی ایک مشہور زیارت ہے اور کہا جاتا ہے کہ ان کو خرقہ حضرت میاں صاحب مانگل نے دیا تھا۔

۴۔ ایک زیارت موضع لیونگ میں ہے۔

۵۔ باقی زیارت گاہیں وادیٔ اگرور میں ہیں۔ مثلاً پیمال شریف یا علاقہ مظفر آباد (علاقہ کشمیر) میں ہیں۔

۶۔ زیارت حیات المیر صاحب بالا کوٹ برلب دریائے کنہار۔ ان کی حیات جاودانی کا عقیدہ لوگوں میں ہے۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اس جگہ وہ بیٹھتے تھے۔ ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ یہاں بھائی بالا (گرونانک کا چیلا) کی بیٹھک ہے اس اس زیارت کے ساتھ ایک چشمہ ہے جس کو لوگ شربت کہتے ہیں اور ان کے عقیدہ کے مطابق کوڑھ کا مرض دور ہو جاتا ہے۔ بدیں سبب یہاں کوڑھی رہتے ہیں۔ اس بناء پر حکومت نے ایک بڑا ہسپتال اس مرض کے لئے قائم کر دیا ہے۔

۷۔ زیارت ننکوٹ (پکھلی) یہاں پر سید علی ہمدان بابا کا روضہ ہے۔ یہاں ہر اتوار خاص کر چاند کی پہلی چودہ دنوں عورتیں یہاں جمع ہوتی ہیں اور اپنے پچھاواں (آسیب زدہ) والے بچوں کو برائے شفاء لاتی ہیں اور بیماروں کو ایک خاص درخت کے نیچے سے گزارتی ہیں۔

۸۔ زیارت سید جلال بابا موضع بھوگرمنگ ان ہی کے زیر حکم سواتیوں نے ترکوں سے حکومت چھینی تھی۔

۹۔ ایک بہت پرانی زیارت سیف اللہ بابا کی واقع خطائی علاقہ اگرور ہے۔ یہ فقیر ناگا اور سید تھا۔

ؔ۔ پائیمال شریف۔ بٹگرام سے چند میل کے فاصلہ پر باباجی کا مزار ہے۔ ان کی اولاد سے حضرت علامہ فیضی صاحب، حضرت کوٹھہ شریف (صوابی مردان) کے خلیفہ اعظم تھے۔ حضرت علامہ فیضی صاحب کے صاحبزادے حبیب اللہ صاحب گوڑہ شریف اور چھوہر شریف کے مشائخ عظام کے ہم عصر تھے۔

۱۰- زیارت دوگائی | (مقام اتصال نالہ سروری اور ناں علاقہ اگرور۔ لوگ ہر جمعرات اور اتوار کو یہاں جمع ہوتے ہیں۔

۱۱- زیارت تکیا نوالی | موضع تراوڑہ - علاقہ اگرور۔ یہاں پر اخوند سعدالدین کا روضہ ہے۔ اس نے صوبہ خان تناولی خان کی مدد سے اگرور فتح کیا تھا۔

۱۲- تو تنی کی زیارت | (غازی کوٹ کی زیارت)، ایبٹ آباد کو جانے والی سڑک کے کنارے پر واقع ہے۔ یہاں ہر جمعرات و جمعہ کو پیٹ کے درد والے مریض آتے ہیں۔

۱۳- زیارت شاہ شریف قلندر | واقع موضع سفیدہ۔ یہ سید تھے۔ زیارت کے ساتھ تالاب ہے جس کا پانی عقیدت مند اپنی بیماریوں کو دفع کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

زیارت تکیہ مہانڈری | کاغان۔ یہاں پر پیر غازی کا مقبرہ ہے۔ اس کے ساتھ چشمہ ہے۔ جو ان کی کرامت پتھر پر عصا مارنے سے پیدا ہوا تھا۔

۱۵- زیارت سیری پنجول والی | یہاں پر خطاب شاہ کا مزار ہے، جو یاغستان سے یہاں آئے تھے۔ دونوں عیدوں پر یہاں میلہ لگتا ہے۔

۱۶- زیارت باباجی والی نزد اچھڑیاں | دونوں عیدوں پر لوگ یہاں سلام کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔

تحصیل ایبٹ آباد

۱- زیارت باواجی صاحب | موضع مائی گوجری۔ علاقہ تناول۔ باواجی موضع چنڈ اور تحصیل ہری پور سے یہاں آکر رہے۔ ان کی اولاد اب بھی چھتی موہری میں آباد ہے۔ ہر مرض کے بیمار ان کی زیارت پر جاتے ہیں۔

۲- زیارت میاں سلطان غازی | علاقہ تناول میں کھنیاں ستھانہ میں ہے اور شیروان اور جوہری پور کے درمیان واقع ہے۔ یہاں پر ٹھنڈے پانی کا چشمہ ہے اور بر سر راہ ہونے کے لحاظ سے مسافر یہاں پر آرام کرتے ہیں۔ بہت سی امراض کی شفا کے لئے یہ زیارت

مشہور ہے۔

۳۔چلہ شاہ بری لطیف | یہ بری شاہ لطیف کی عبادت گاہ ہے، جن کا مزار نور پور شاہان نزد راولپنڈی میں ہے۔یہ علاقہ ناڑہ بر لب ہرو ڈھونڈاں واقع ہے۔

۴۔مزار کھنڈ والا پیر صاحب | موضع سجکوٹ، علاقہ ناڑہ۔کہا جاتا ہے کہ ان کی وفات پر کھانڈ کی بارش ہوئی تھی۔اسی واسطے ان کے مزار پر کھانڈ کی نیاز دی جاتی ہے۔ہر خواہش کے لئے لوگ وہاں حاضری دیتے ہیں۔

۵۔زیارت نمانا | (نمانڑا) شاہ ولی موضع چنالی نزد نگری ٹوٹیال۔یہ ایک فقیر جو کشمیر سے آئے تھے اور یہاں رہتے تھے، کی قبر ہے۔بخار کے مریض زیارت کے لئے آتے ہیں۔

۶۔مانگل کی زیارت | میاں کنگال صاحب کا مقبرہ۔یہ مقبرہ خواجہ گل محمد کا ہے اور یہ شیخ عبدالصبور قادری ساکن کشمیر المعروف لبتال زمانہ ۱۱۴۵ھ، ۱۷۳۲ء کا مرید تھا۔ہر جمعرات کو مردوں اور عورتوں کا میلہ لگتا ہے۔اس زیارت کے نزدیک مرغی والا نانگا بھی مدفون ہے۔

۷۔تکیہ ترچھ نزد موضع مجوہاں | ر لب دریائے جہلم۔یہ بہت پرانا مزار ہے۔اس میں پیر ستار شاہ غازی مدفون ہیں۔

دیگر زیارت گاہیں

۱۔مزار جمال غازی دھمتوڑ۔۲۔سائیں پلیت تحصیل ایبٹ آباد۔۳۔شیخ بالا اور مہر علی بابا۔موضع بجنہ نزد شنکیاری۔۴۔قلندر سید بالاکوٹ۔۵۔نوبت شاہ سید لاچی منگ علاقہ کوغش۔۶۔نورتم بابا سید موضع شمدھڑہ علاقہ اگرور۔۷۔حیدر بابا موضع گھنیاں اگرور۔میاں حیدر بابا سادات آتر کے جد ہیں۔

مزار حضرت سید احمد شہیدؒ | آپ کا مزار بالاکوٹ بر لب دریائے کنہار واقع ہے۔آپ سب سے پہلے جنگِ آزادی کے شہید ہیں اور ۱۸۳۱ء میں بمقام بالاکوٹ سکھوں کے ساتھ جنگ میں شہید ہوئے۔اگرچہ مزار آج تک شایانِ شان تعمیر نہیں ہوا۔لیکن آپ کا نامِ نامی روشن اور نمایاں ہے۔[۱]

حاشیہ اگلے صفحہ پر۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد زعشق
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

حضرت شاہ اسمٰعیل کا مزار آپ کا مزار شہر بالاکوٹ سے ہٹ کر جنوب مغربی کونے میں ہے۔ اس کے گرد چار دیواری بھی ہے اور بہتر حالت میں ہے۔ مرجع خلائق ہے۔ اس میں ایک عالم باعمل محو خواب ہے۔ اپنے قائد سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ۱۸۳۱ء میں شہید ہوئے۔ؔ

مقبرہ نور شاہ (غازی بابا) آپ کا مقبرہ بھوگڑمنگ تحصیل مانسہرہ میں ہے اور غازی بابا کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ سید جلال بابا کے پوتے ہیں۔ ایک بہادر غازی اور سرگرم مبلغ تھے۔ کاغان سے کوہستانی علاقہ جہاں پر کافر لوگ آباد تھے۔ انہی کی تبلیغ سے مسلمان ہوئے۔ اب صرف چترال کے قریب تھوڑا سا علاقہ رہ گیا ہے۔ جہاں کے لوگ اب بھی کافر ہیں۔ یہ علاقہ اب کافرستان کہلاتا ہے۔ ان کے دادا سید جلال بابا بھی بھوگڑمنگ میں مدفون ہیں اور ان کی جائے رہائش (نزد مکانات خان خداداد خان سابق وزیر صحت) کے آثار آج تک موجود ہیں۔

زیارت شیخ بابا۔ میر علی بابا واقعہ بجنہ علاقہ شنکیاری۔ ہر دو عید پر فاتحہ خوانی ہوتی ہے۔

اہلِ ہنود کی زیارت گاہیں

۱۔ ڈھیری بھائی کرپارام واقعہ کوٹ نجیب اللہ۔ ماہ ساون میں ہندو سلام کے واسطے حاضر ہوتے تھے۔

۲۔ ہندوؤں کی مشہور زیارت گاہ۔ بریڑی ماتا مانسہرہ کے مغربی جانب۔ یہاں پر ہندوؤں کا میلہ سال میں دو دفعہ لگا کرتا تھا۔ ایک بیساکھی پر (مارچ۔ اپریل) اور دوسرا اکتوبر کے آخر میں۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان بن جانے کے بعد یہ زیارت اب سنسان ہے۔

ؔ تاریخی شہادت ہے حضرت سید احمد شہید کی نعش سکھوں نے قبر سے نکال کر دی تھی۔ لیکن پہلا مدفن یہی تھا۔

۲۔ شوالہ یپچی گٹی سنگ مرمر کی ایک سالم سفید چٹان سے کاٹا ہوا صاف لنگم دشو مہاراج کا آلۂ تناسل)، جو بہترین صنعت کاری کا نمونہ ہے اور ہندو مت کے بنیادی عقیدہ پیٹ اور فرج کا مظہر ہے۔ اس کی لمبائی اتنی ہے کہ اس کا نچلا حصہ، نچلے کمرہ میں اور سر والا حصہ اوپر والے مکان میں ہے۔ جہاں پر ہندو عورتیں اس کی پوجا کرتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ مناسب وقفہ کے بعد پجاری جو نچلے کمرہ میں ہوتا تھا۔ ایسی پچکاری سفید رنگ کے پانی (مسل منی) کے مارتا تھا۔ جس کی بوند اس آلۂ تناسل کے سرے کے سوراخ سے باہر آتی تھی۔

یہ پتھر کب اور کہاں سے لایا گیا یا کس نے بنایا، یہ معلوم نہیں۔

پاکستان بن جانے کے بعد یہ جگہ غیر آباد ہو گئی ہے۔

عہد ماضی کے سکّے اور شاہانِ و خوانین ہزارہ کی مُہریں

سکّہ کی ابتداء تمدّن کے ابتدائی دور میں چیزیں، چیزوں سے بدلی جاتی تھیں اور جب زندگی کی ابتدائی منزلیں طے ہو جاتی گئیں تو کسی نہ کسی آلۂ مبادلہ کے استعمال کی ابتداء ہوتی ہے اسلام اور اسلام سے پہلے بطور زر چیزوں کے بدلے یہ چیزیں استعمال کی جاتی تھیں۔ انڈے، روٹی کے ٹکڑے، چاندی، درختوں کی چھال، سمندر سے نکلی ہوئی کوڑیاں، ان کے علاوہ اور چیزیں بھی۔

سکہ کی قدامت قرآن مجید میں بتایا گیا ہے کہ آج سے کئی ہزار برس پہلے دنیا میں سکہ کا رواج ہو چکا تھا۔ چنانچہ اصحاب کہف کے قصے میں اس کا ذکر ہے۔

یوسف علیہ السلام کے قصے میں بھی چاندی کے کھوٹے سکوں کا کچھ ذکر ہے۔

اسی طرح شعیب علیہ السلام کی قوم کے تذکرے میں ہے کہ وہ سکوں کو کاٹتے تھے۔

سکہ کی اہمیّت اسلام میں سکہ کی اہمیت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل سے معلوم ہوتی ہے کہ بارٹر (تبادلہ اشیاء) کے طریقہ کو رائج کرتے جاتے تھے۔ اس طرح زر (اشیاء) کی قدر کے لئے معیار ٹھہرا۔ جس کے ذریعے لین دین کے معاملے طے کیا کرتے تھے۔

لہ۔ اسلام کا معاشی نظریہ۔ محمد یوسف الدین۔

ہندو پاک کے سکے

اسلامی سکوں پر تصاویر کی بجائے اعلیٰ خوش خطی کے نمونے ہوتے تھے۔

ماضی میں دھات پر نقش کندہ کرنا مشکل کام تھا۔ لیکن مسلمانوں نے ہر دھات کے سکے پر ایسے کمال سے ہر قسم کے خط، کوفی، ثلث، نسخ اور نستعلیق کی نقش کاری کی، جس کا جواب نہیں۔ اس کے علاوہ مسلمانوں نے ان سکوں پر کلمہ اور بادشاہ کے نام کے علاوہ سال اور دار الضرب کے نقش سے تاریخ کے واقعات کے لئے ناقابلِ تردید شہادت بھی مہیا کر دی۔

مسلمان ہر دھات کا سکہ بناتے تھے۔ سونے، چاندی اور تانبے کے سکے عام ملتے ہیں۔ مسلمان آٹھویں صدی عیسوی میں برصغیر پاک و ہند میں آئے۔ اس عہد کے سکوں پر خط کوفی میں خلیفہ کا نام، بمعہ لقب، سال و نام دار الضرب لکھا ہوا ہوتا تھا۔ چونکہ اس دور میں یہاں مضبوط حکومت قائم نہ ہوئی تھی، لہٰذا اس کاریگری (نفیس سکہ کاری) کا اثر دیسی کاریگری پر نہ پڑا۔

صحیح اسلامی کاریگری کا عہد سلاطین دہلی کے عہد، گیارھویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے۔ ان کے زمانے میں سونے، چاندی، تانبے یا ملاوٹی دھاتوں کے سکے بنائے گئے۔ ان کے سیدھے رخ پر کلمہ، خلیفہ و سلطان کا نام، یا قرآن کی کوئی آیت نقش کی جاتی تھی۔ دوسری طرف تاریخ اور دار الضرب کا نام نقش ہوتا تھا۔ کسی کسی سکہ پر ہر دو زبانوں عربی یا فارسی یا ہندی میں نقش ہوتا تھا۔ جس سے ان سلاطین کے دل میں اپنی رضا جوئی کی طلب ظاہر ہوتی تھی۔ ایسے سکے سب سے پہلے محمود غزنوی نے بنوائے۔ ایک سکہ پر محمود آباد (موجودہ لاہور) ۴۱۸ھ (۱۰۲۷ء) میں ڈھالا گیا، کا نام ہندی میں ٹنکا ئین (یعنی تنکائیں بمعنی چاندی کا وزن) رکھا گیا۔ اسی سے سلاطین دہلی نے اپنے ایک سکہ کا نام تنکا (ٹنکہ) رکھا۔

زمانہ ماضی میں ہند و پاک میں ٹنکہ چار ماشہ چاندی کا ہوتا تھا۔ لیکن سلطان مسعود اور بعد میں سلطان شمس الدین التمش (۶۰۷ھ (۱۲۱۰ء) چاندی کے ٹنکہ کا وزن ۹۶ رتی تھا۔ سلطان محمد غوری ($\frac{۵۸۹ھ}{۱۱۹۳ء}$) کے عہد میں صرف سونے کا ٹنکہ ۹۶ رتی کے وزن کا تھا۔

---

۱ مسٹر W.K. BHATTI پاکستان ٹائمز مورخہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء۔

سلطان محمد تغلق (۷۲۵ھ، ۱۳۲۵ء) نے سکہ میں کفایت شعاری کے مد نظر ٹنکہ کی قیمت کم کردی اور چاندی کے سکہ میں ملاوٹ کرادی۔

سلطان سکندر لودھی (۸۹۴ھ، ۱۴۸۹ء) کے سکہ میں چاندی برائے نام رہ گئی۔

سلطان شیر شاہ سوری (۹۴۵ھ، ۱۵۳۸ء) نے خالص چاندی کا روپیہ جاری کیا۔ روپیہ چوتھی صدی ہجری سے جاری تھا، جو بعد میں روپیہ ہوگیا۔

تیرھویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے سلاطین کے روپیہ "دہلی وال" کی بجائے "جیتل"، جو چاندی کے تنکہ کی قیمت کا نصف تھا اور جس میں کانسی ملی ہوئی تھی، کا رواج ہو گیا۔ لیکن تنکہ کی قیمت میں کمی کی وجہ سے آخر کار "جیتل" کو اکبر بادشاہ کے عہد میں ختم کردینا پڑا۔

سکوں کے متعلق محمد تغلق کا عہد بہت بدنام رہا ہے۔ اس نے خالص دھات میں دوسری کم قیمت دھاتوں کی ملاوٹ سے سکے تیار کروانے شروع کردیئے، جو اس کو وسائل دولت کی کمی کی وجہ سے کرنا پڑا۔ اس نے اپنے سارے ملک میں جگہ جگہ ٹکسال بنوائے۔ اس کے عہد کے پہلے تین سالوں میں سکوں پر غیاث الدین تغلق کا نام رہا۔ بعد میں جو سکے اس نے بنوائے، ان پر اس کا نام اور کلمہ لکھا ہوا ہوتا تھا۔ اس کے سونے کے سکوں کا نام تنکہ تھا، جو ۹۶ رتی کا تھا۔ اس نے دو اور سکے "دینار" ۱۱۲ رتی کا اور "عدلی" ۸۰ رتی چاندی کا بنایا۔ ملاوٹی دھاتوں کے سکے (۷۲۷ھ، ۱۳۲۷ء) میں بنوانے شروع کئے۔ لیکن (۷۳۲ھ، ۱۳۳۲ء) میں پھر خالص دھات کے سکے بنوائے۔ ان پانچ سالوں میں اجراء شدہ سکوں کے نام تھے۔

۱۔ تنکہ، پنج گاہی۔

۲۔ درہم۔ دوازدہ گنی، ہشت گنی، دو گنی اور شش گنی۔

اس کے آخری عہد کے سکوں پر عباسی خلفاء کے نام "المستکفی باللہ" اور "الحاکم ثانی" تھے۔

شیر شاہ کے عہد کے سکے اہم ہیں۔ یہ خالص دھات کے ہیں۔ اس کے سونے کے سکے، ناپید ہیں، لیکن اس کا چاندی کا سکہ "روپیہ" جو عام سکہ تھا، دستیاب ہوا ہے۔ اس نے تانبے کے سکے بھی معمولی کاروباری ضرورت کے لئے جاری کئے۔ جو عہد اکبر بادشاہ میں "دام" کہلاتے تھے۔ چالیس دام، چاندی کے روپیہ کے برابر ہوتے تھے۔ روپیہ کا وزن ۹۶ رتی یا ۱۲ ماشہ یا

۱۸۰ اگرین تھا۔

اکبر بادشاہ نے شیر شاہ سوری کے نظام مالی ہی پر نظام رکھا۔ لیکن اس کے سکوں پر خطاطی بہتر نمونہ کی تھی۔ اس کے سکے، امربع، گول اور معین (LOZENGE SHAPED) شکل کے تھے۔ اس کے سونے کے سکے کا نام "مہر" تھا۔ چاندی کا روپیہ اور تانبے کا دام ہوتا تھا۔ اس کے ٹکسال شہروں میں ہوتے، علاوہ جنگی کیمپ میں بھی ہوتے تھے اور جو سکے وہاں ڈھالے جاتے تھے، ان کی پشت پر "ضرب اردو" لکھا جاتا تھا۔

اس کے عہد حکومت کے پہلے میں سالوں کے سکوں پر سامنے کی طرف کلمہ اور خلفاء راشدین کے نام ہوتے تھے اور پشت پر اس کا نام اور سن ہجری اور دار الضرب کا نام ہوتا تھا۔

جب اس نے دینِ الٰہی شروع کیا تو سکوں پر "الٰہی سنہ" اور اللہ اکبر جل جلالہٗ، اور بعض دفعہ جانوروں کی تصویریں ہوتی تھیں۔

عہدِ جہانگیری میں سکوں پر جہانگیری تصویر ہوا کرتی تھی اور بروج سماوی کی شکلیں ہوتی تھیں۔ عہدِ مغلیہ کے بہترین سکے عہد جہانگیری میں مضروب ہوئے، جو عموماً سونے اور چاندی کے ہوتے تھے۔ تانبے کے سکے بہت کم تھے۔ یہ سکے اپنی ساخت، بے نظیر خطاطی، خوبصورتی اور خالص ہونے میں ممتاز تھے۔

جہانگیر نے ایک نئی اختراع اپنے سکوں پر فارسی ابیات کا نقش کرنا تھا۔ تقریباً پچاس شعر تھے، جو مختلف سکوں پر منقوش تھے۔ بعض شعروں میں نور جہاں بیگم کے اوصاف درج تھے۔ بعض پر دار الضرب کا نام بھی ہوتا تھا اور بعض دفعہ اس مہینہ کا نام، جس میں سکہ ڈھالا گیا ہوتا، بھی درج ہوتا۔

اس کے بھاری قیمت کے سکے پانچ، دس، سو اور دو سو مہر کے ہوتے تھے۔ اس کے چھوٹے سکوں کے نام بھی ہنرمندانہ ہوتے تھے، یعنی "نثار"۔ "نور افشاں"۔ "خیر بتول"۔ یہ روپیہ کی تقسیم کے حصے تھے۔

جہانگیر کے بعد شاہ جہاں بادشاہ کے عہد میں کوئی تصویر سکوں پر نہ ہوتی تھی لیکن نستعلیق عبارت بہترین خطاطی کا نمونہ تھی۔

سکے کے سامنے کی طرف کلمہ اور خلفار راشدین کے نام ہوتے تھے اور پشت پر بادشاہ سال ضرب اور دار الضرب کا نام ہوتا تھا۔

شاہ عالمگیر کے وقت سکہ پر فارسی شعر ہوتے تھے (کلمہ اغلباً بے حرمتی کے خیال سے نہ لکھا جاتا تھا اور نہ ہی خلفار راشدین کے نام ہوتے تھے۔)

پرانی دستاویزیں، سکے اور مواہیر مؤرخ کے لئے سامان تحقیق ہیں۔ ان کا مطالعہ ایک دلآویز اور دلچسپ مضمون ہے۔ جس خطے کی تاریخ کا مطالعہ کا کسی کو شوق ہو تو اس خطے کی پرانی دستاویزیں اور سکے، اس شوق کو فریفتگی میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ تاریخی تحقیقات کے سلسلے میں مہروں کو دیکھنے سے مؤرخ کی نگاہ غائر بین، وہاں کے باشندوں کی آئینی فراست ملکی انتظام و معاشرت کے سلسلے میں ان کے اکابر و زعماء کے احساس ذمہ داری کا سراغ پاتی ہے پھر بھی مواہیر اور سکوں سے آئے دن کی تبدیلیاں، جو ان میں رونما ہوتی ہیں۔ قوم کی مجموعی ذہانت، فراست کی مشق و ورزش اور ان کے رہبروں کی زندہ دلی اور منچلے پن کا مظہر ہوتی ہیں۔ یہ منچلا پن اور زندہ دلی، رہتی دنیا تک، قوم کی روشن فکری کی یادگار ثابت ہوتی ہیں۔ فرماں روا خواہ کتنا ہی جابر اور استبداد پسند ہو، اس کے سکہ شاہی کی ڈیل ڈول، قوم کی مجموعی طرز بود و ماند مذہب اور ثقافت کے نشان سے خالی نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ تاریخ عالم کے جو گوشے اور کرۂ ارض کے جن کناروں کے بارے میں تاریخی صحائف ذکر سے خالی ہیں۔ ان کے متعلق بھی عہدِ جدید میں علم تواریخ کے ضخیم دفاتر منصۂ شہود پر آگئے ہیں۔ وجہ صرف یہ ہوئی کہ کسی مقام سے ملکی سکہ برآمد ہوا اور اہلِ فراست نے اس سے ایک بڑے خطۂ زمین کے تاریخی حالات کا کھوج عقلی شواہد کی بناء پر لگا لیا اور رفتہ رفتہ پرانی تاریخی کتابوں نے بھی اس انکشاف اور استدلال کی توثیق کر دی۔ شاہی سکہ حکمران کے اس احساس کی علامت ہے کہ خرید و فروخت اشیائے ضرورت میں شہریوں کو جو مشکل پیش آتی ہے وہ سکہ شاہی کی مداخلت سے رفع ہو جاتی ہے۔ مثلاً جنس کی جنس کے عوض میں فروخت تجارت کی روانی و رفتار کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اس لئے حکمرانوں نے جہالت عہدِ قدیم کے باوجود رعایا کی اس مشکل کو دور کرنے کے لئے سکہ شاہی ایجاد کیا۔ بعد میں جب معاشی مصلحتوں نے دھات کی بجائے کاغذ کے نوٹوں کو سکہ شاہی قرار دیا۔ تو اس کے ضمن میں بھی

ایک نفسیاتی مسئلہ سامنے آتا ہے، جس کی تفصیل پولیٹیکل اکانومی کی سرحدوں تک جا پہنچتی ہے یہاں صرف اتنا ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ جب فطرتِ انسانی نے دھات کے سکوں کو بخل اور تنگ نظری کی وجہ سے دفنِ زمین کرنا شروع کر دیا اور تجارت کی رفتار مدھم ہونے لگی، تو حکومتوں نے کاغذوں کے نوٹ جاری کئے، جو محض معاشی پابندیوں کے ساتھ چلتے ہیں اور مدفون دولت کے شر کا اثر قدرے کم ہو جاتا ہے۔ الغرض سکوں سے اور تاریخی دستاویزوں اور مہروں سے ملک کی سرحدات کا سراغ ملتا ہے اور اہلِ ملک کی جہالت یا دانش، مذہب یا لامذہبی اور ثقافت کا حال ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً محمود غزنوی کا ایک سکہ لاہور میں مضروب ہوا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں سے پہلے بھی اس شہر میں سکے ڈھالے جاتے تھے اور یہ شہر محمود غزنوی کی سلطنت میں شامل تھا۔

محمد بن قاسم کا ایک سکہ مشرقی پاکستان میں پایا گیا، جس سے یہ معلوم ہوا کہ سوداگر لوگ سندھ سے مشرقی پاکستان تک کا لمبا سفر ان دنوں میں بھی کرتے تھے۔ اسی طرح مغربی پاکستان اور مشرقِ وسطیٰ میں تیسری، چوتھی صدی کے یونانی سکے برآمد ہونے سے تجار کی آمد و رفت کا ان دور دراز مقامات تک پتہ چلتا ہے اور ساتھ ہی یونانی سلطنت کے اثر و رسوخ کا۔

ہزارہ میں جن شاہان و خوانین سلف کی دستاویزات و مواہیر مجھے معلوم ہو سکیں، ان کو ان صفحات میں درج کر دیا گیا ہے۔ تاکہ ان کے مطالعہ سے ہزارہ کی تاریخ کے مختلف گوشے روشنی میں آسکیں اور ایک دو مشہور شخصیتوں کے دستخطوں کی نقل بھی شامل کی گئی ہے۔ کیونکہ دستخط کا طرزِ املا اور مواہیر کی ساخت، مالک کی عادات، اطوار اور مزاج کی مظہر ہوتی ہیں۔ اگر غور و تعمق سے ان کا مطالعہ کیا جائے تو مالک کے انفرادی اور نفسیاتی عزائم کا پرتو بھی ان سے ظاہر ہوتا ہے۔

سکھوں کے فرامین اور طریق حساب کتاب

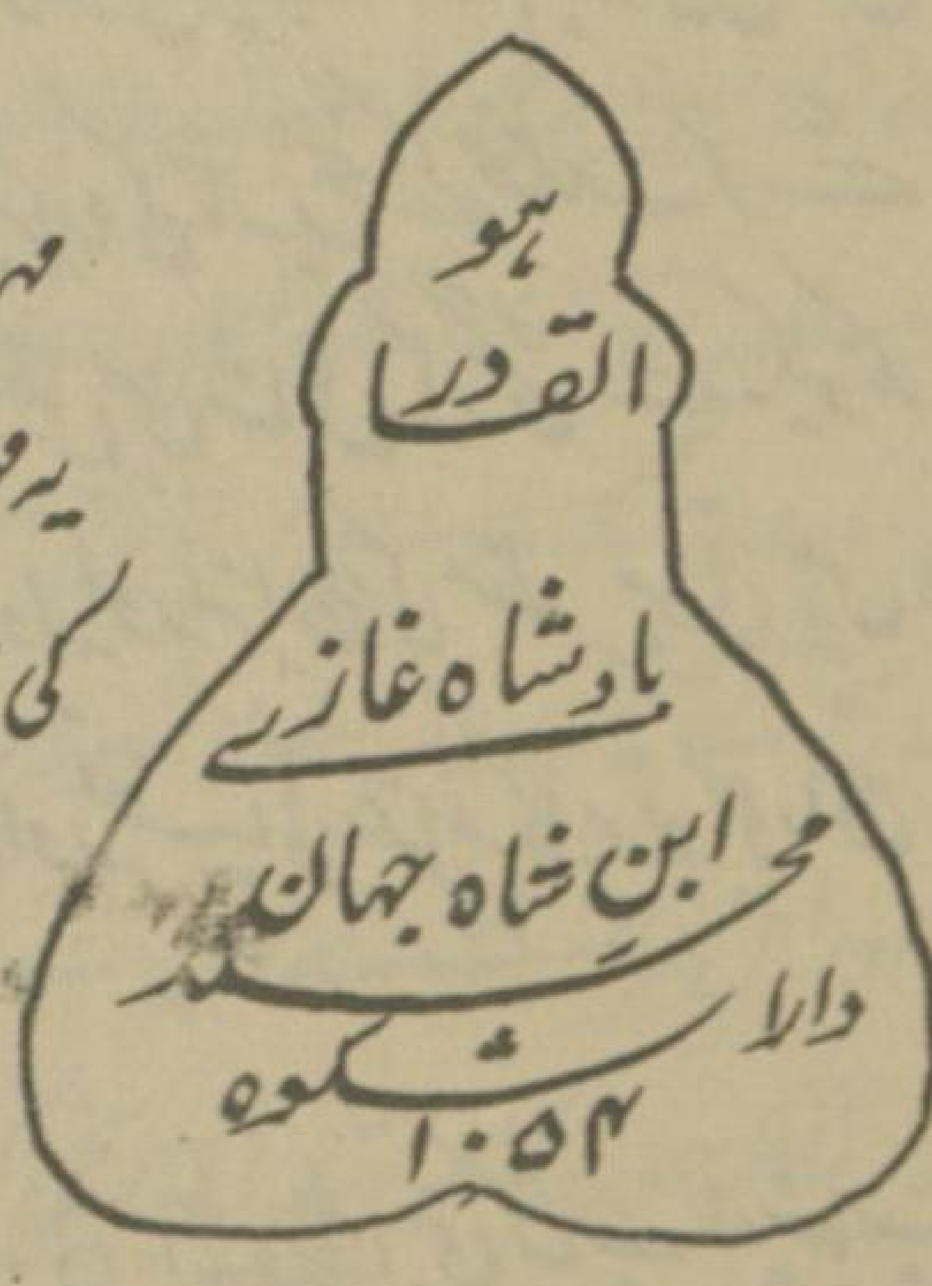
ہربرٹ۔ بی۔ ایڈورڈ اپنی کتاب "پنجاب کی سرحد پر ایک سال" میں صفحہ ۳۰۶ پر لکھتا ہے کہ "اس کو ایک پیر مسمی حیدر چراغ ساکن بلوٹ (ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان واقع بر لب دریائے سندھ) ۲۳ مارچ ۱۸۴۸ء کو اپنی سندات دکھائیں جن کی رو سے سلاطین مغلیہ نے ان کو مختلف جاگیریں عطا کی تھیں"۔

وہ لکھتا ہے کہ "کیا امتیازی شان ان طویل وعریض کاغذاتِ سندات کی ہے۔ کیا خوبصورت و دل آویز خوش خطی اور پرشکوہ شاہی مواہیر ہیں۔"

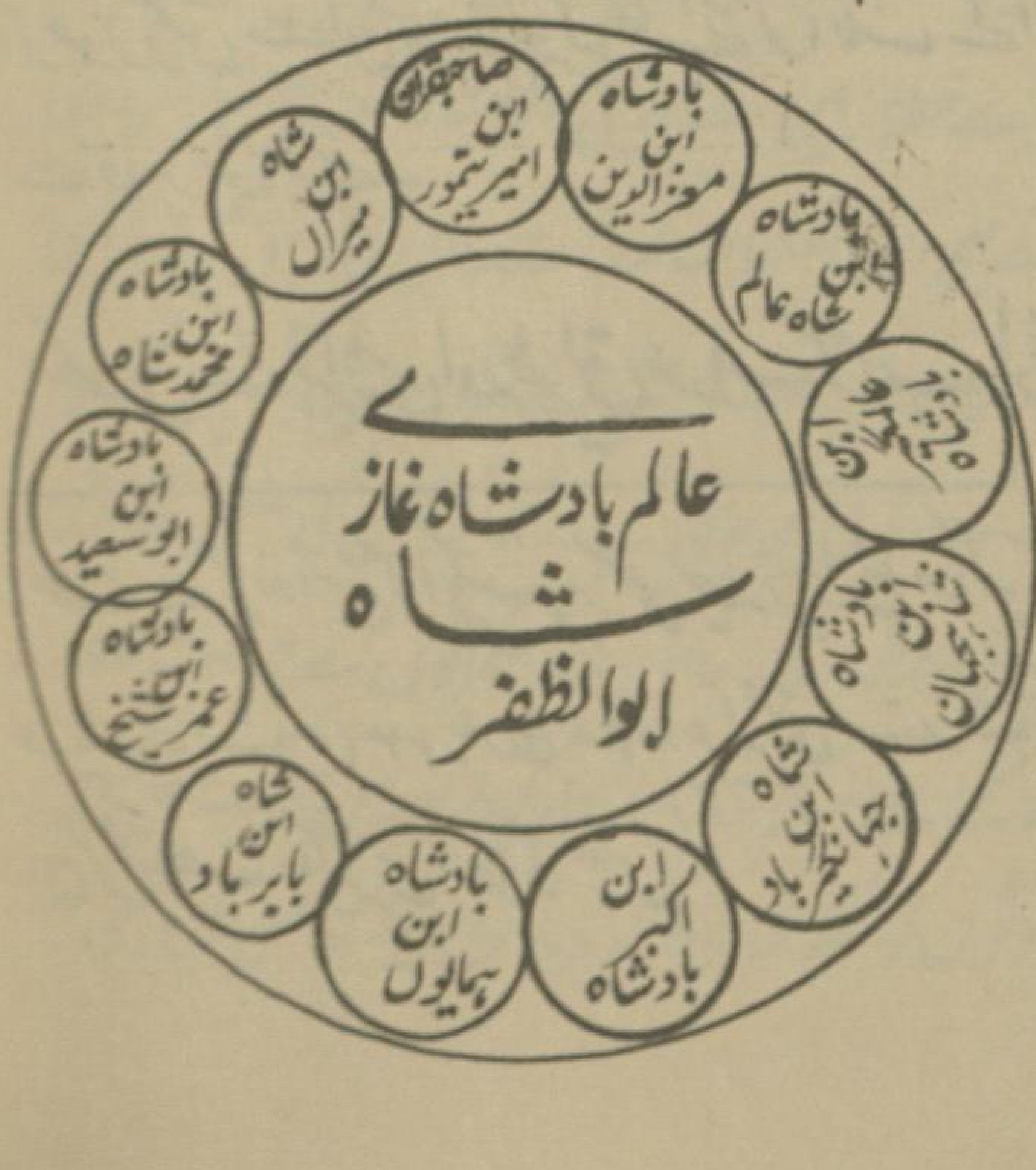
سکھوں کے فرامین فرسودہ اور حقیر چھوٹے سے بوسیدہ کاغذ کے پرزے پر ا جس پر ناخن کے برابر، بانیٔ سکھ سلطنت، مہاراجہ رنجیت سنگھ کی مہر ہوتی تھی۔"

پھر لکھتا ہے کہ "رنجیت سنگھ نے اپنے عہد کے آخر ہی میں دفاتر و دبیر مقرر کئے اور تحریری حسابات رکھے۔ اس سے پہلے سب سرکاری حساب کتاب زبانی ہوتا تھا۔ معمول یہ تھا کہ جب کبھی باہر سے خراج آتا تو جو شخص بھی اس وقت مہاراجہ کے پاس ہوتا، تو وہ سب روپیہ اس کو دیا جاتا کہ وہ خود اس سے بوقت ضرورت خرچ کرتا رہے اور حساب رکھے۔ اس خرچ کا حساب ایک چھڑی پر نشانات لگانے سے رکھا جاتا۔ جب سب روپیہ خرچ ہو جاتا تو حساب کی وہ چھڑی مہاراجہ کے سامنے پیش کی جاتی اور حساب سنایا جاتا۔ مہاراجہ اپنی قوی یادداشت کی بنا پر سن کر جب تصدیق کر دیتا، تو اس چھڑی کو توڑ دینے کا حکم دے دیتا۔"

شاہانِ سلف وخوانین کی مواہیر جو ضلع ہزارہ کے بندوبست ۱۸۷۲ء میں پیش کی گئیں

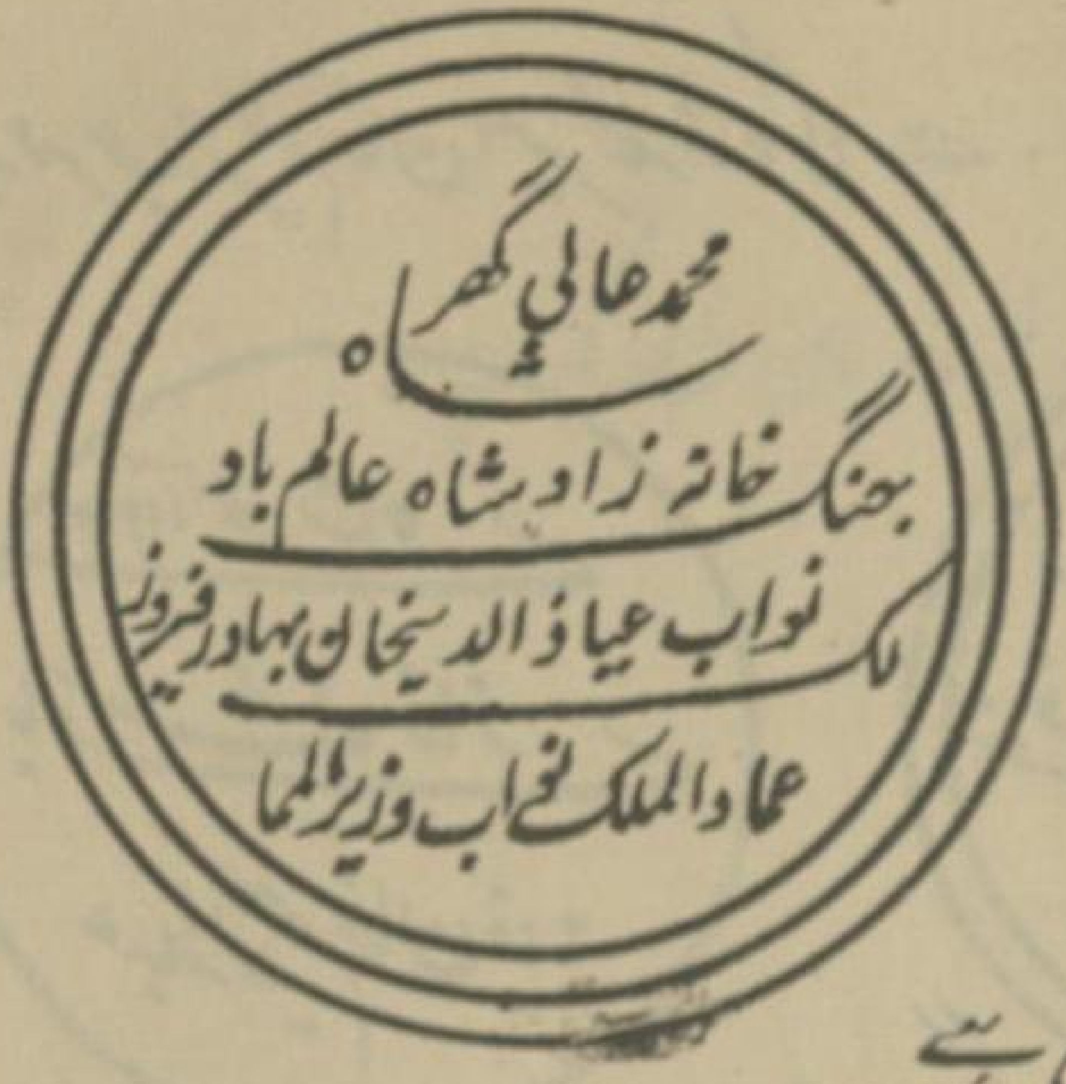


مہر داراشکوہ پسر کلاں شاہ جہان بادشاہ
یہ مہر داراشکوہ کی ہے اس کے فرمان صرف شاہ جہان بادشاہ
کی زندگی میں ہنگامِ مقابلہ عالمگیر بحالت شاہزادگی جاری ہوئے۔

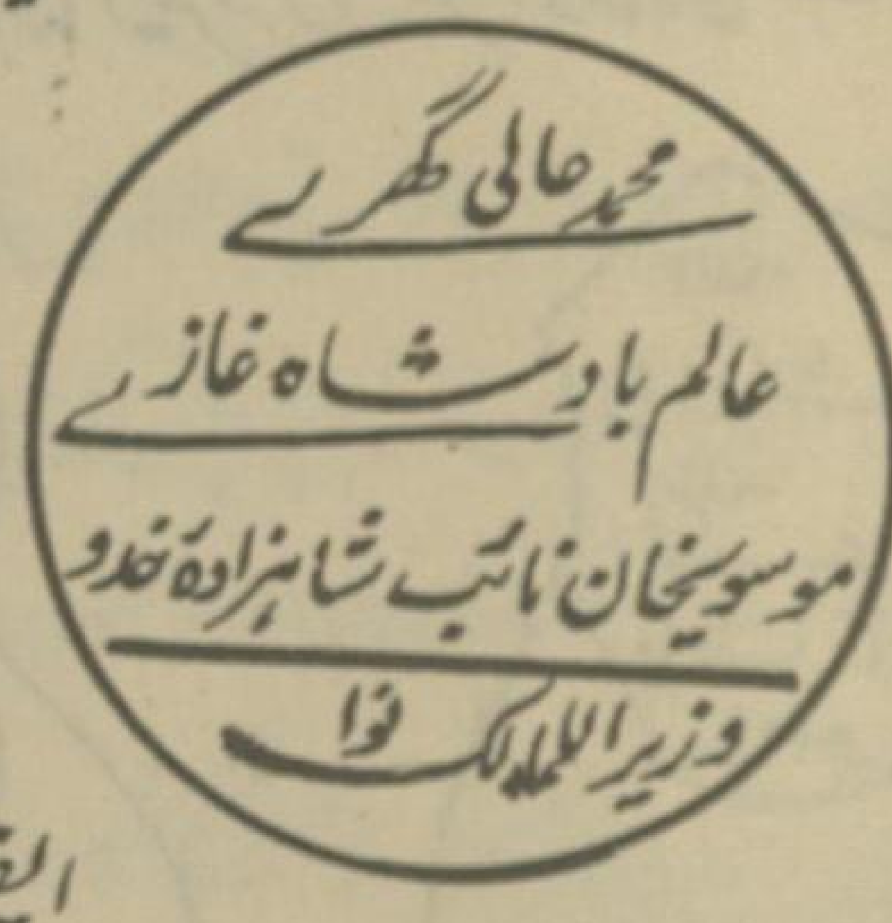


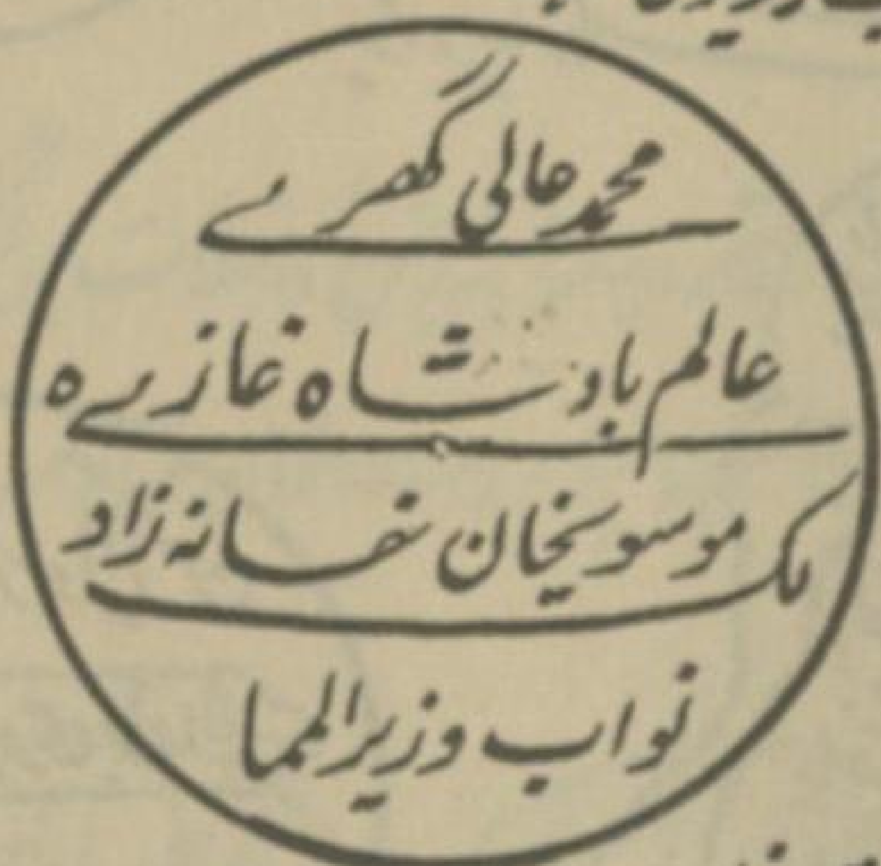
یہ مہر دراصل فرخ سیر بادشاہ
ابن معزالدین ابن شاہ عالم کی ہے۔

یہ مہر شاہ عالم بادشاہ کے وزیر الممالک نواب غازی الدین خان کی ہے۔



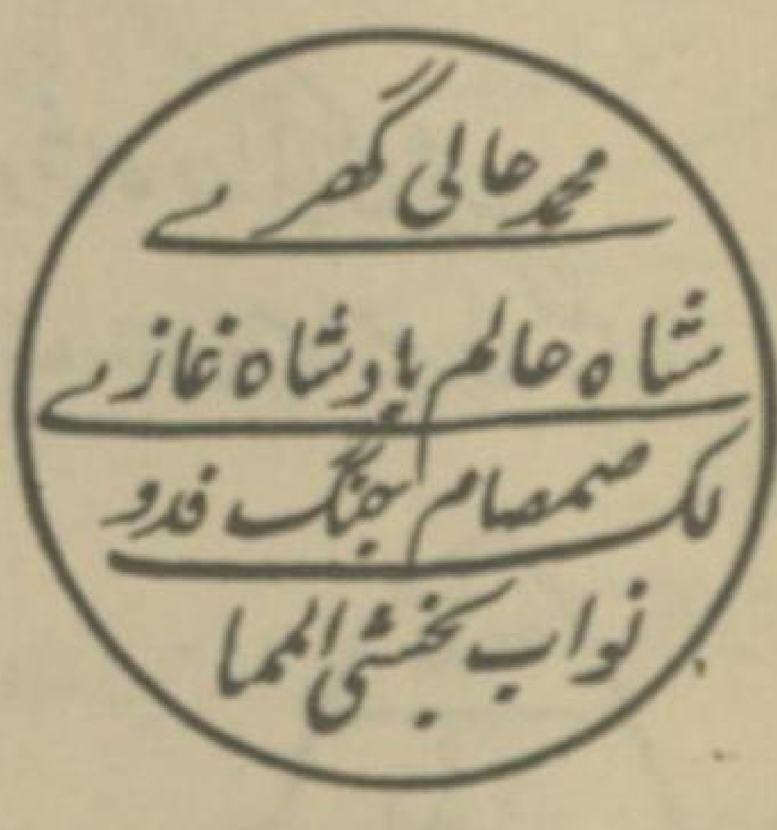
یہ مہر موسویخان نائب وزیر کی ہے



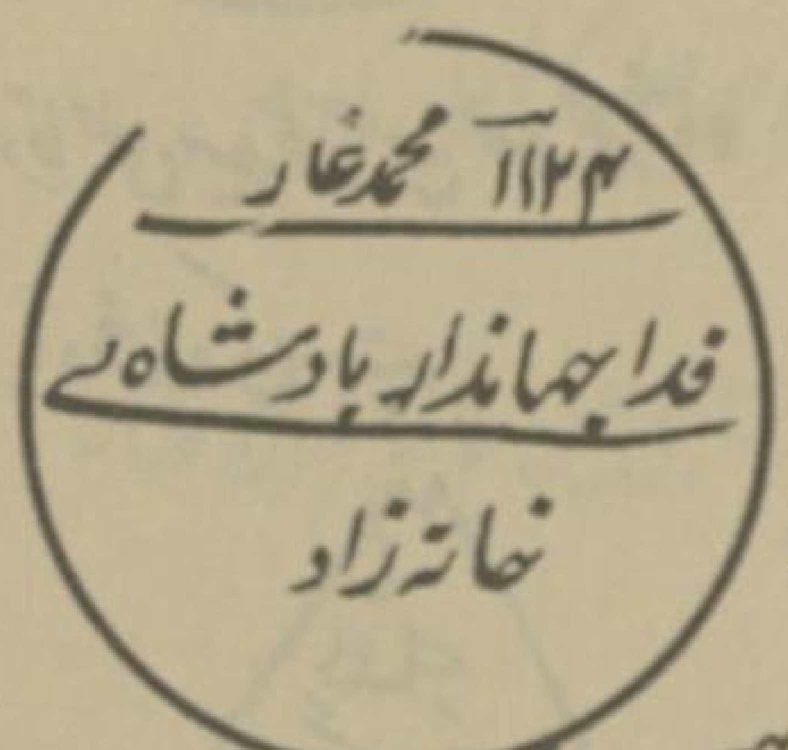


ایضاً بحالت وزارت

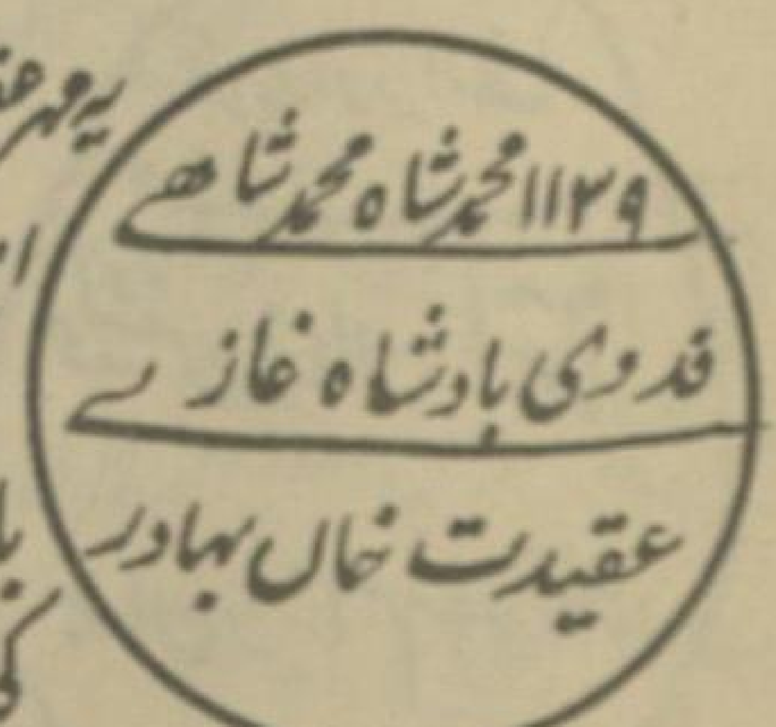
صمصام جنگ بخشی شاہ عالم بادشاہ کی مہر ہے۔ →



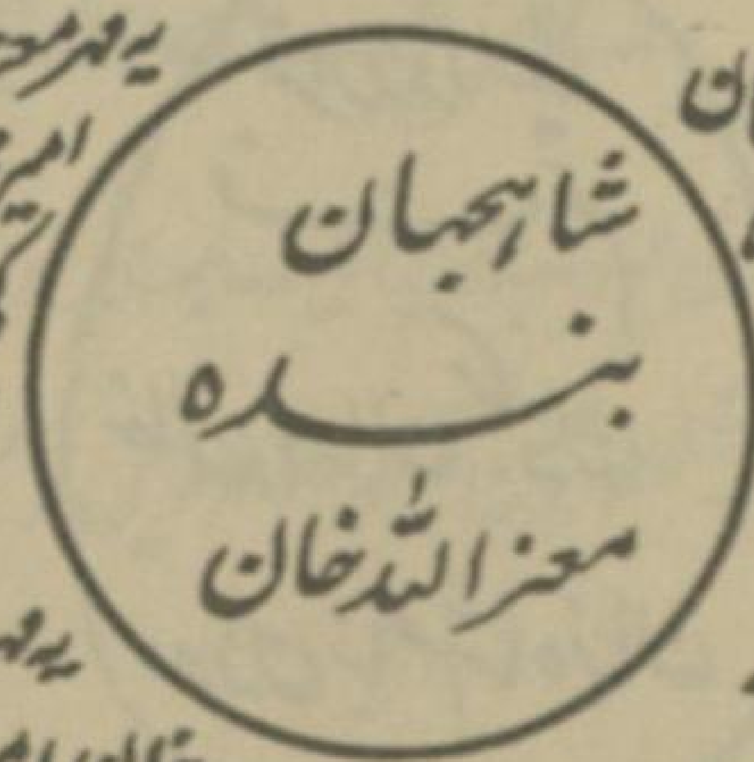
یہ مہر فدائی خان ۔ امیر جہاندار خان یعنی معز الدین بادشاہ کی ہے ←

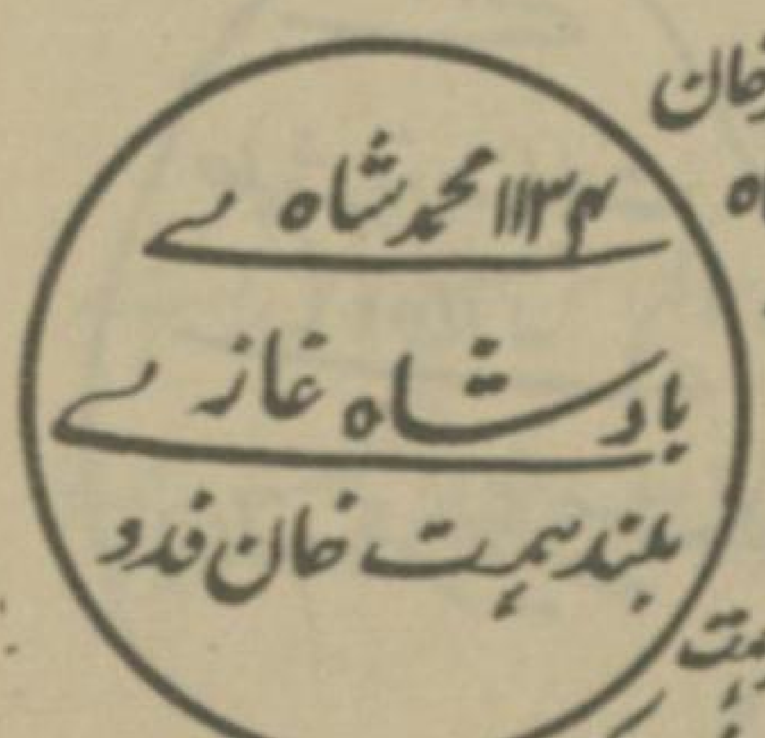


یہ مہر عقیدت خان امیر محمد شاہ بادشاہ کی ہے

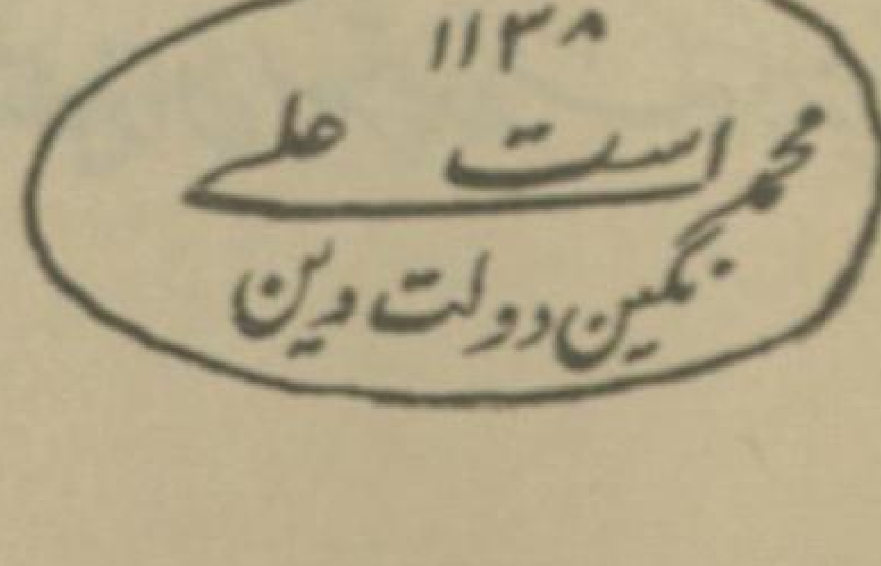


یہ مہر معز اللہ خان امیر محمد شاہ کی ہے →



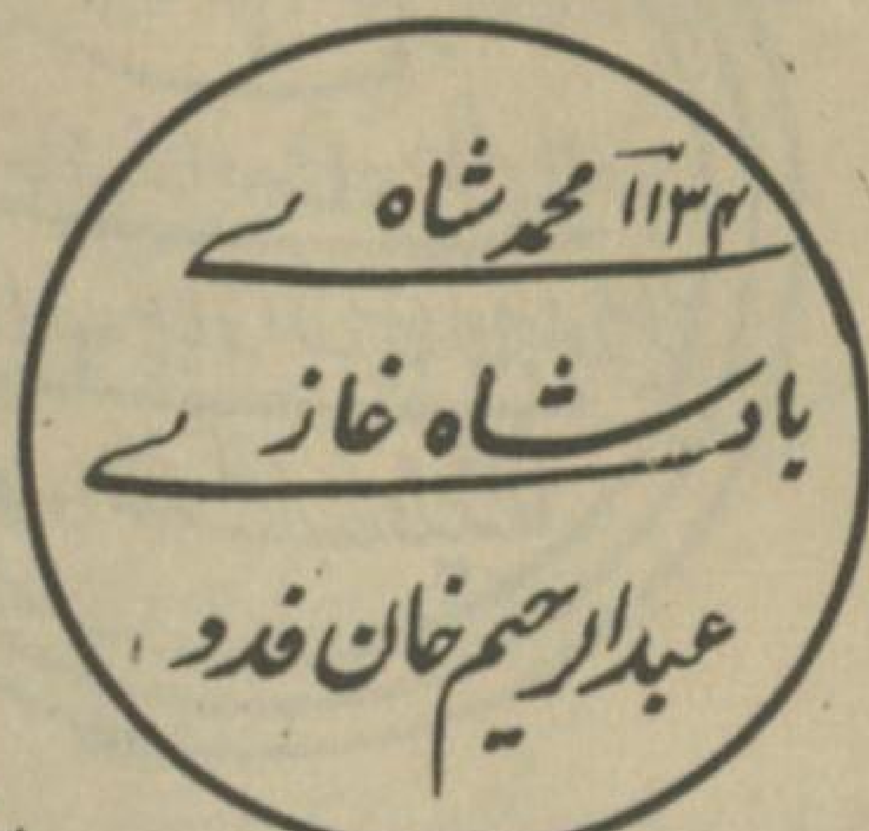


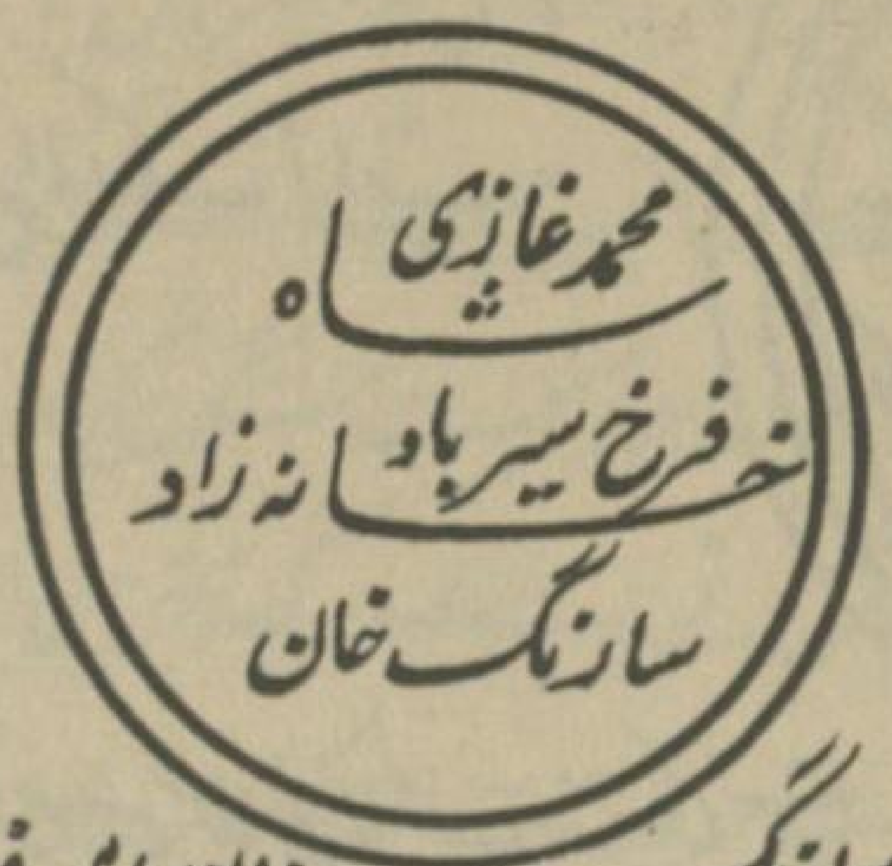
یہ مہر بلند ہمت خان امیر محمد شاہ کی ہے

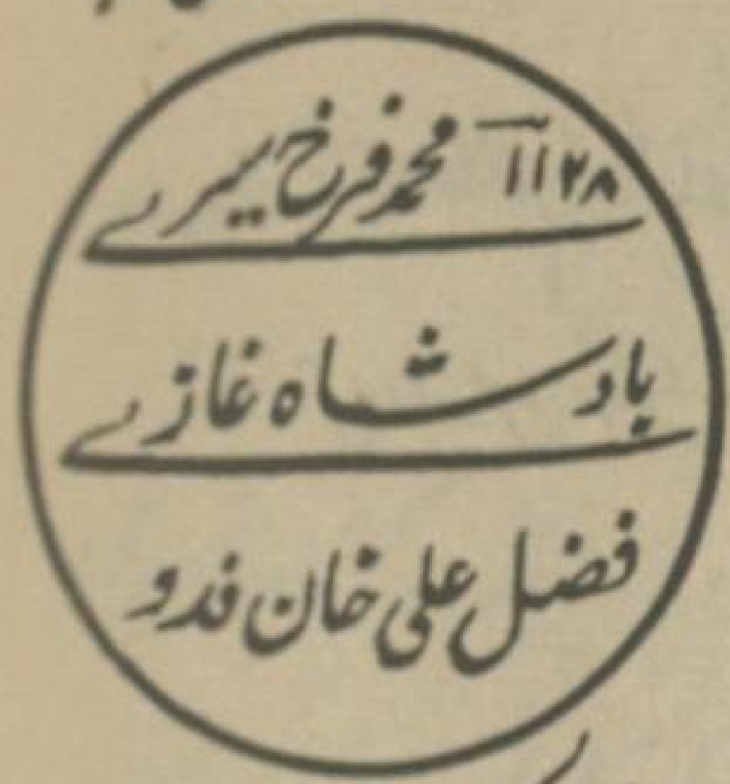


یہ مہر بہادر شاہ بادشاہ کے کسی عامل محمد علی کی ہے۔

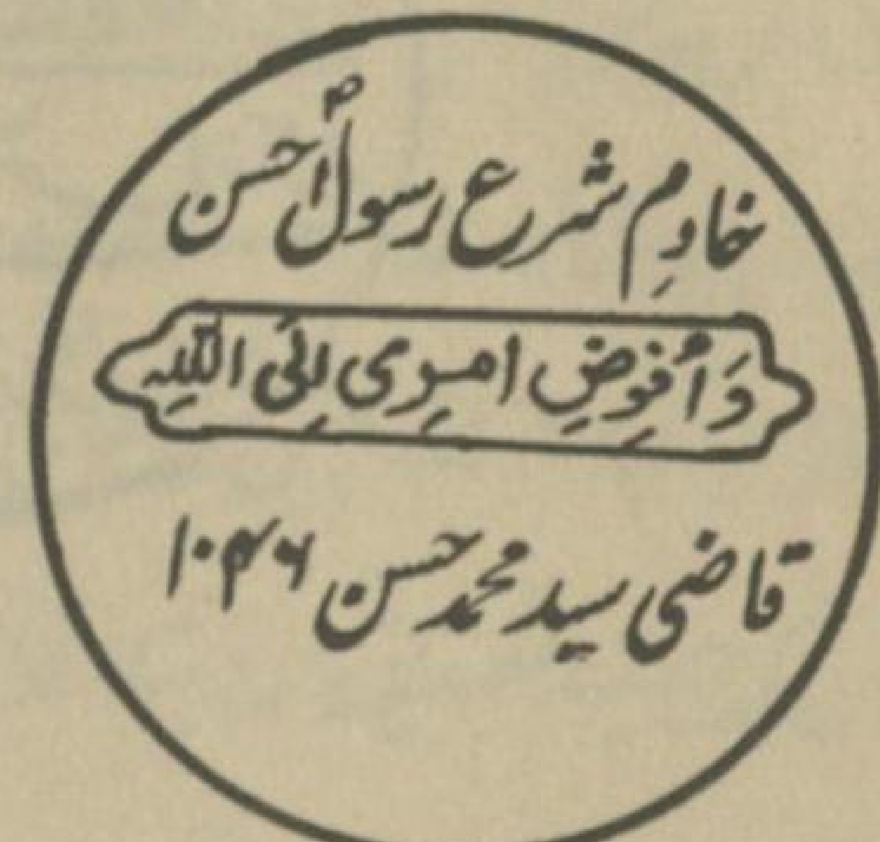
یہ مہر عبدالرحیم خان امیر محمد شاہ کی ہے۔ — یہ مہر فضل علی خان امیر فرخ سیر بادشاہ پوتا عالمگیر بادشاہ کی ہے۔



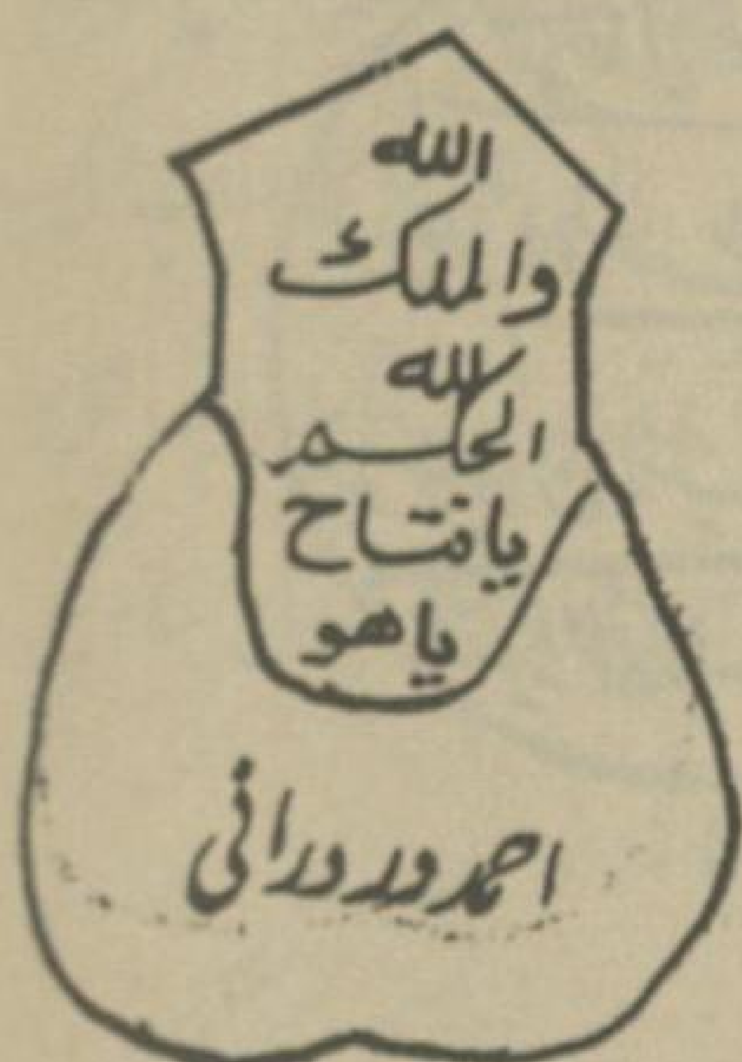




یہ مہر سارنگ خان امیر فرخ سیر بادشاہ کی ہے۔

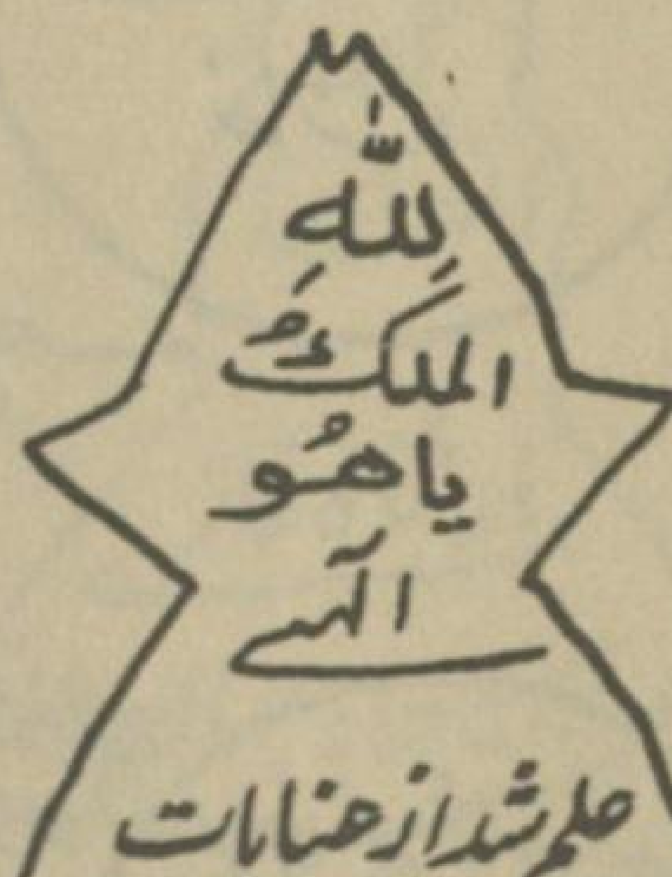






یہ مہر قاضی سید محمد حسن عہد محمد شاہ
بادشاہ کی ہے

یہ ہر دو مہریں احمد شاہ بادشاہ درانی کی ہیں
راجگان گکھڑ کی سندات سے یہ مواہیر لی گئیں

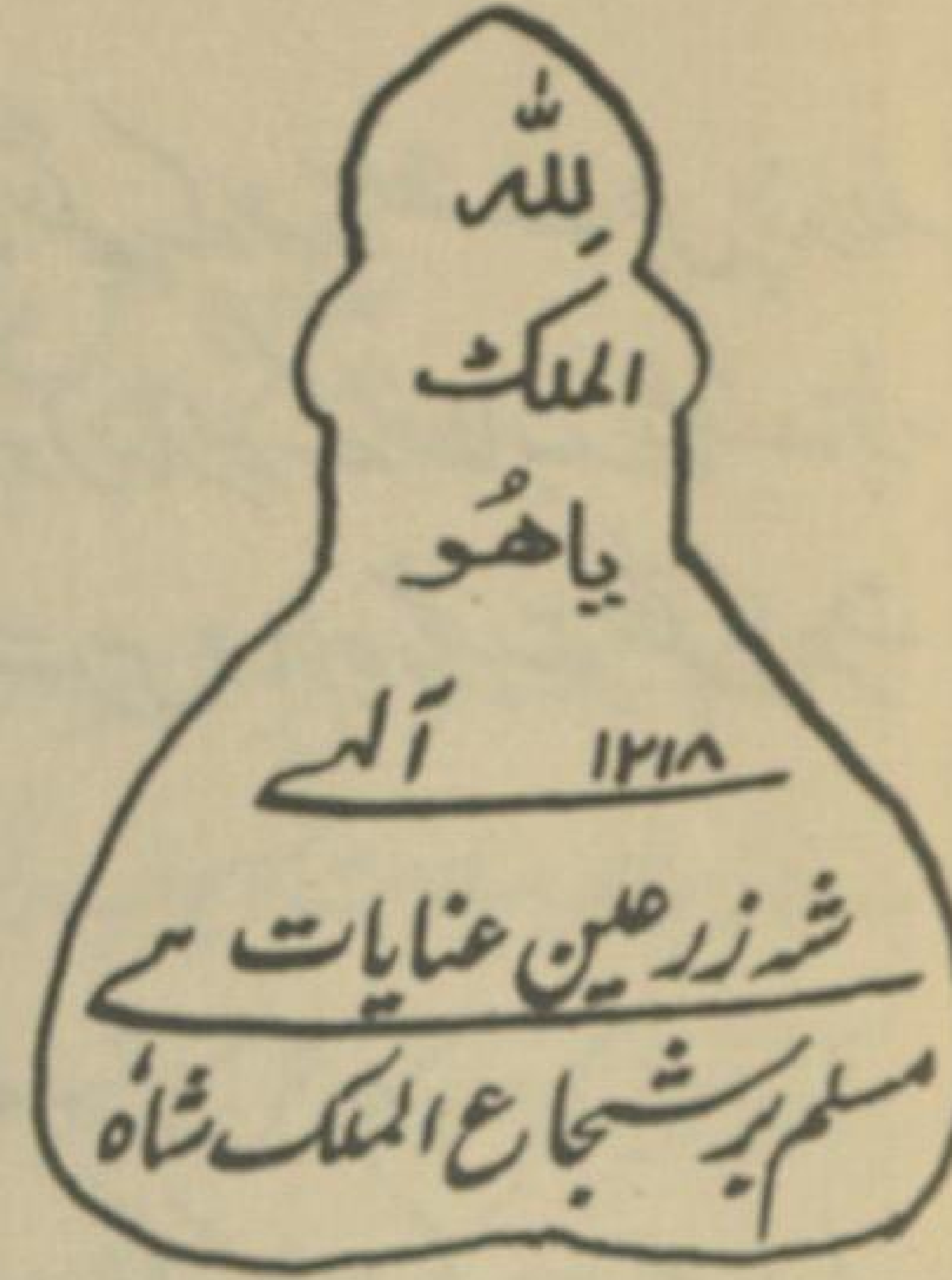






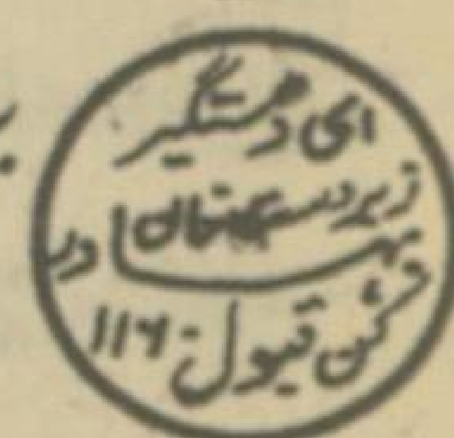
یہ مہر تیمور شاہ پسر احمد شاہ
کی ہے

یہ دونوں مواہیر شاہ زمان پسر تیمور شاہ کی ہیں

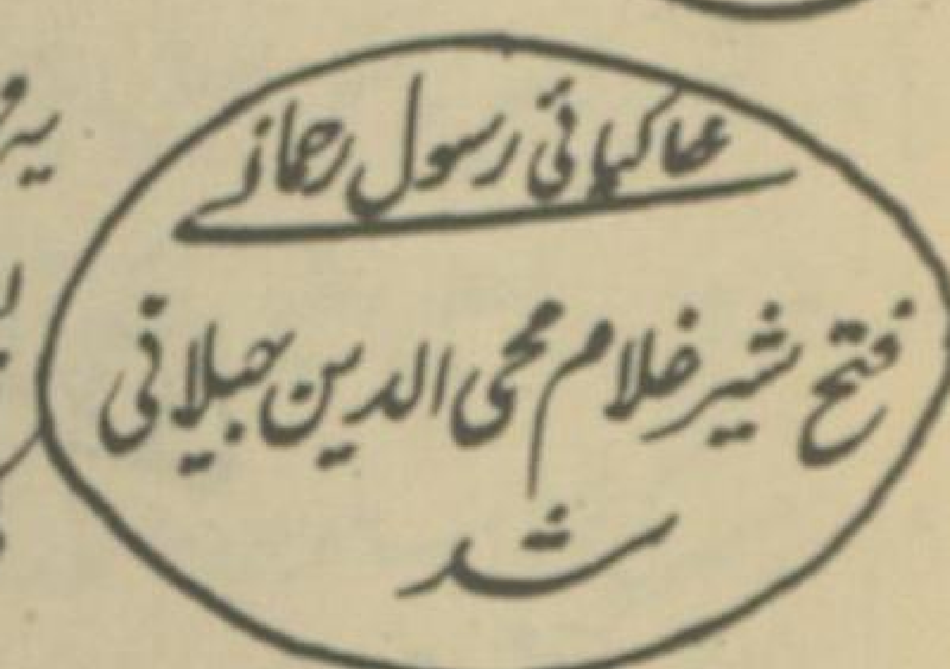


یہ مہر شجاع الملک پسر شاہ زمان شاہ کی ہے

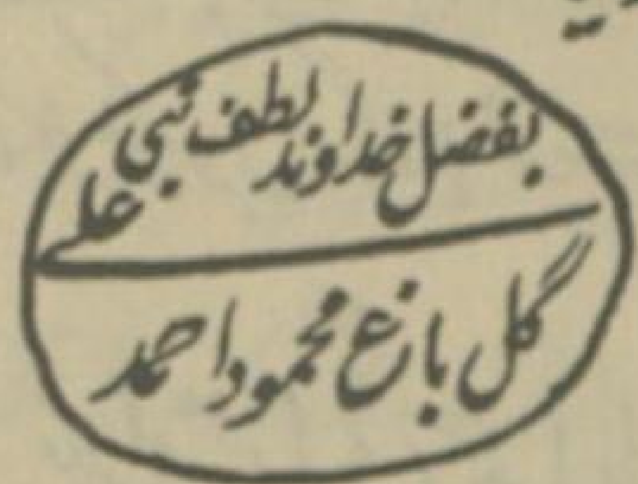
مواہیر۔ بعض حاملانِ ہزارہ جو اپنے عہد میں ذی عزت تھے یہ مواہیر بعض کاغذات پر لگی ہوئی پائی گئیں۔

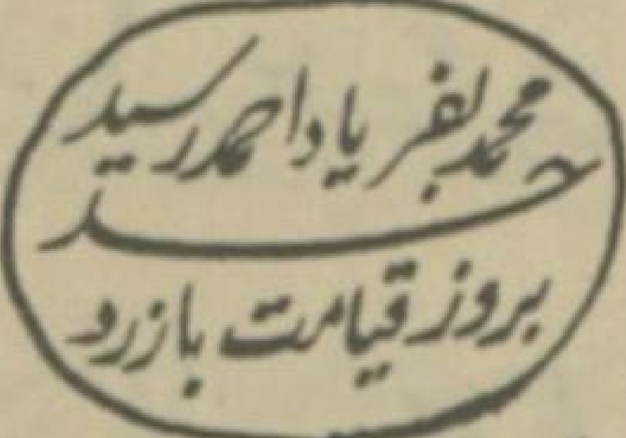


یہ مہر صوبہ خان تنولی پتہ پلال کی ہیں۔ اس کا اصلی نام زبردست خان تھا۔ صوبہ خان بادشاہی ملازمت کی وجہ سے مشہور ہوگیا۔

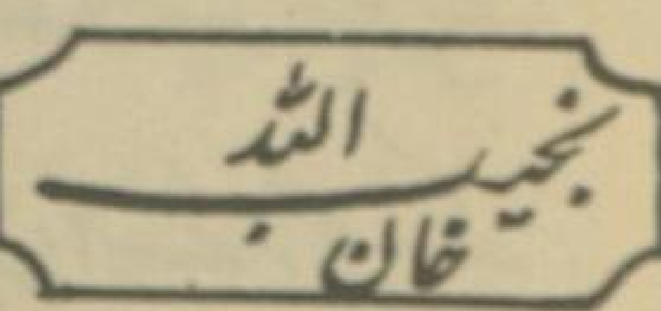


یہ مہر فتح شیر پسر صوبہ خان کی ہے

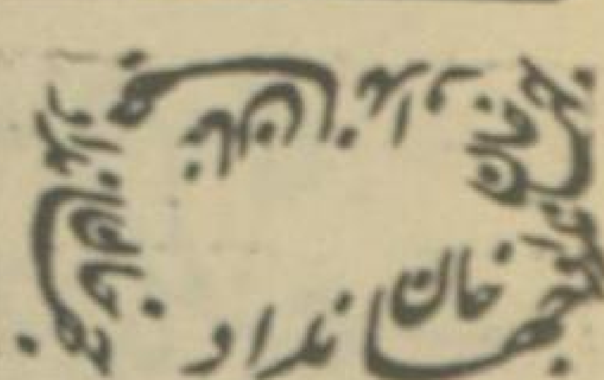




بہ ہر دو مواہیر احمد علی کرڑال کی ہیں



یہ مہر نجیب اللہ خان ترین کی ہے جو عہد احمد شاہی میں حاکم ہزارہ تھا۔

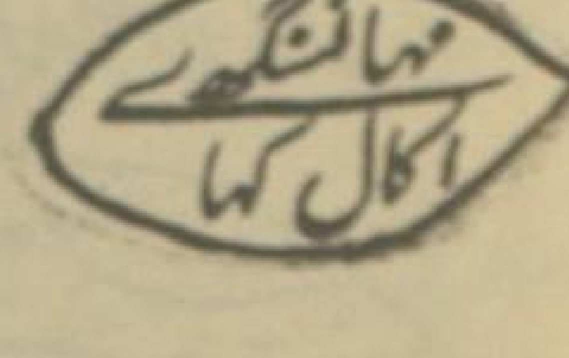


یہ مہر جہانداد خان نواب انب کی ہے۔

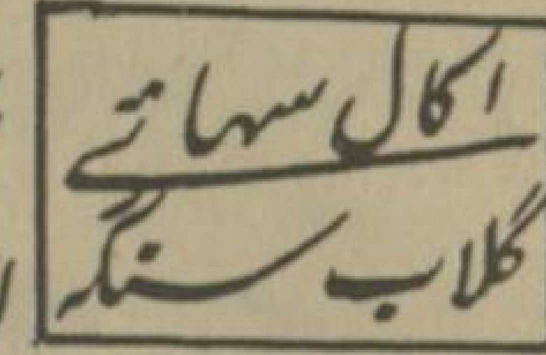
عہد سکھاں۔ مہر ہائے حاملان



یہ ہری سنگھ نلوہ حاکم ہزارہ کی مہر ہے یہ ایک بہادر اور نامی حاکم اس ضلع کا گزرا ہے اس نے شہر ہری پور اور قلعہ ہرکشن گڑھ ۱۸۲۲ء میں (جس میں اب تھانہ و تحصیل ہری پور واقع ہے) بنوایا۔



یہ مہر سردار مہاں سنگھ کی ہے جو ابتدا میں زیر حکم سردار ہری سنگھ اور بعد میں خود اس ضلع کا حاکم رہا۔



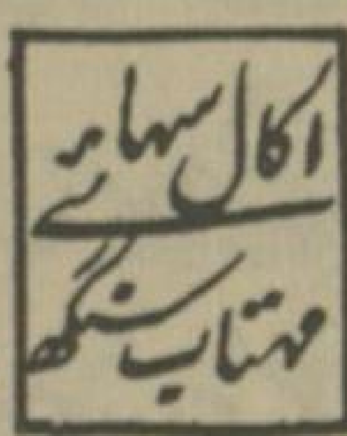
یہ مہر مہاراجہ گلاب سنگھ کی ہے جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد سلطنت میں چند روز اس ضلع کا حاکم رہا اور بعد میں والی ملک جموں وکشمیر ہو کر مہاراجہ کے خطاب سے ملقب ہوا۔



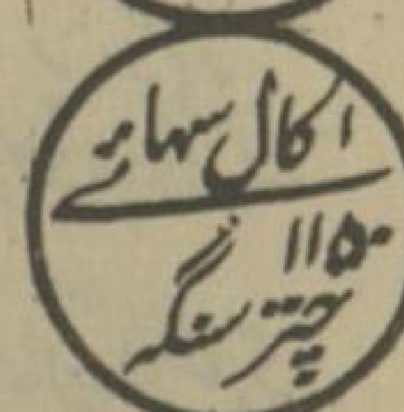
یہ مہر سردار لہنا سنگھ سندھیانوالہ کی ہے جو ایک وقت میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے اس ضلع کا حاکم رہا۔



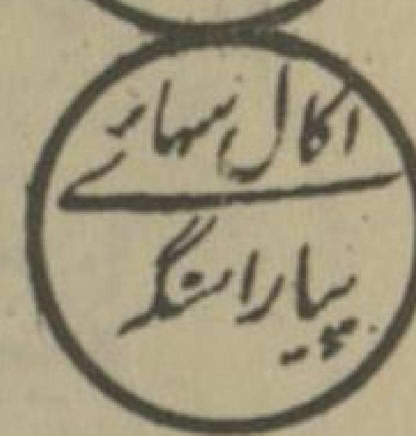
یہ مہر دیوان ہری چند عامل مہاراجہ گلاب سنگھ کی ہے۔



یہ مہر مہتاب سنگھ کاردار کی ہے جس نے میدانِ ہزارہ میں اچھا کام کیا اور اس کا فرزند مانسہرہ میں تحصیلدار (۷۲-۱۸۷۰ء) میں تھا۔

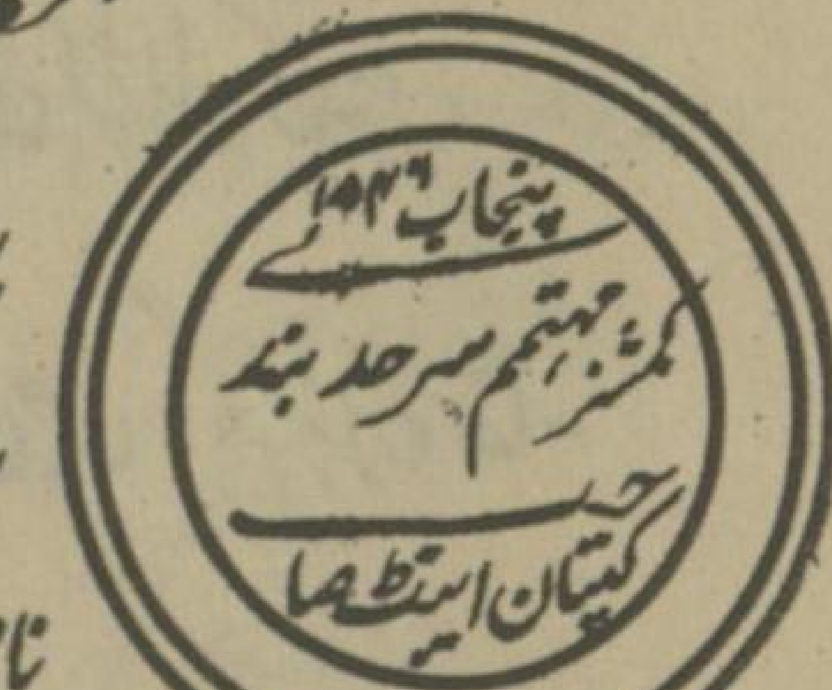


یہ مہر سردار چتر سنگھ کی ہے



یہ مہر پیارا سنگھ کاردار برہان (نزد حسن ابدال) کی ہے جو اپنے وقت میں سخت ظالم اور سخت گیر تھا۔ آخر ملکیوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔

مہرہائے ابتدائی عملداری سرکار انگریزی

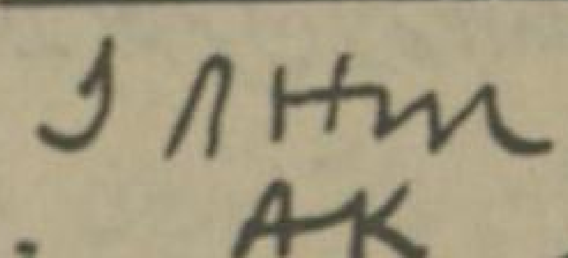


یہ مہر ایبٹ صاحب کی ہے جو دربار سکھاں لاہور کے وقت مہتمم سرحد بندی سرکار۔ لاہور۔ مہاراجہ جموں وکشمیر اس ضلع میں آئے۔ اسی کے نام پر ایبٹ آباد آباد ہوا۔ اس ملک میں وہ بہت نیک نام رہا۔



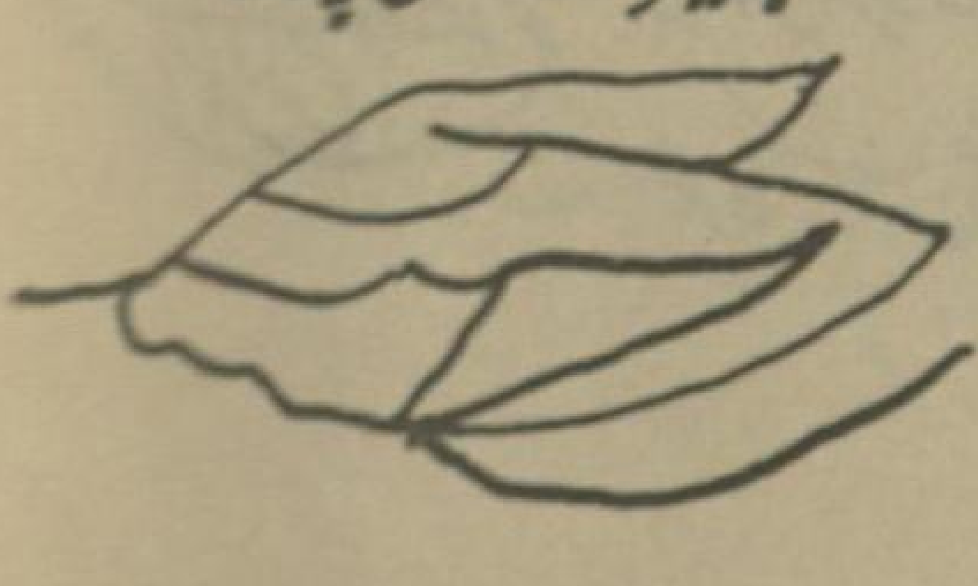
یہ نیول چیمبرلین کی مہر ہے جو ابتدا میں اس ضلع کے ڈپٹی کمشنر ہوئے تھے۔ لیکن میری رائے میں وہ مہتمم بندوبست تھا، جیسا کہ مہتاب سنگھ کی تاریخ سے واضح ہوتا ہے۔

دستخط میجر ایبٹ۔ ہزارہ کا پہلا ڈپٹی کمشنر

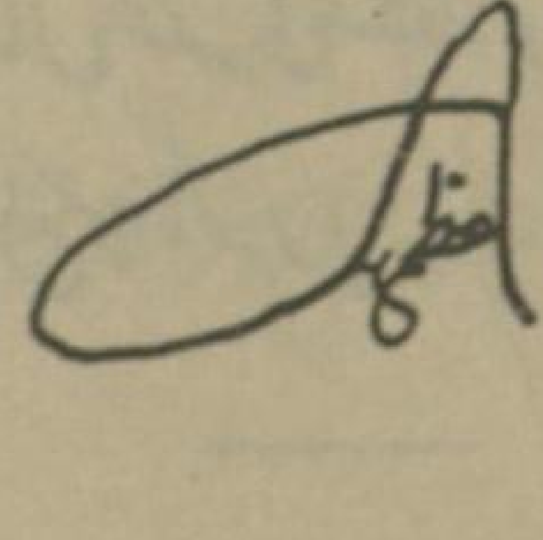


J. ABBOT
AK

دستخط راجہ حیدر بخش خان
جاگیردار۔ خان پور



دستخط مرزا اعظم بیگ نائب مہتمم بندوبست



۷۲-۱۸۷۰ء

ہزارہ میں مروّج سکے تاریخ کی روشنی میں

کائنات ارضی پر تہذیب وتمدن کی کرنیں کب پڑیں۔ صنعت وحرفت اور زراعت وغیرہ کا کب آغاز ہوا ان سوالات کا جواب وثوق سے نہیں دیا جا سکتا اور نہ ہی اس سوال کا کہ موجودہ نظام زر کس قدیم تہذیب کی فکر وکاوش کا نتیجہ ہے۔ بس اتنا کہا جاتا ہے کہ ابتداء میں ابنائے آدم ایک دوسرے کے ساتھ ضرورت کی اشیاء کا تبادلہ کرتے ہوں گے۔ آہستہ آہستہ دھاتوں کے ٹکڑوں کے بدلے مختلف اشیاء حاصل کرنے کا رواج ہوا ہوگا اور پھر دھات کے یہی ٹکڑے کرنسی یا سکوں کی صورت اختیار کر گئے ہوں گے۔ وادئ سندھ کی پراتی تہذیب کے آثارِ قدیمہ (موہنجوڈارو اور ہڑپہ) سے برآمد ہونے والی بعض اشیاء مٹی اور پتھر کی چوکور اور مستطیل ٹکڑیاں ہیں۔ جن پر عجیب وغریب عبارت کندہ ہے جو آج تک نہیں پڑھی جا سکی۔ بعض ماہرین انہیں "مہریں" سمجھتے ہیں۔ بعض انہیں قدیم ابجد کے حروف گردانتے ہیں اور بعض انہیں سکے قرار دیتے ہیں۔ وادئ سندھ کی پرانی تہذیب ہے اور بابل، نینوا، روم اور مصر کی تہذیب موجودہ علماء کی تفتیش کے مطابق سندھ تہذیب سے ہرگز قدیم نہیں۔ پاکستان میں آثارِ قدیمہ کی کھدائی سے جو قدیم ترین سکے ملے ہیں وہ دھات کے مربع اور بیضوی ٹکڑے ہیں، جو تانبے اور پتلی چادر کو کاٹ کر بنائے گئے ہیں۔ ان سکوں کے مطالعہ وتحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سکے ولادت مسیح سے پانچ سو سال پہلے معرضِ وجود میں آگئے تھے اور دوسری عیسوی تک ٹیکسلا (ضلع ہزارہ میں) کے علاقہ میں رائج رہے۔ سکندر اعظم کے حملہ سے مغرب پر قدیم پاکستان کے ساتھ تجارت کے دروازے کھل گئے۔ پہلی اور دوسری صدی ق م کے قدیم سکے یونانی انداز اور فنی حسن سے غیر معمولی طور پر متاثر نظر آتے ہیں۔ پہلی صدی عیسوی تک عظیم روم اور قدیم کشن تاجروں کے مابین گہرے روابط تھے۔ چنانچہ اس زمانے کی معیاری طلائی کرنسی اس عہد میں شمال مغربی پاکستان کی معیشت اور ثقافت کے بارے میں گراں قدر معلومات مہیا کرتی ہے۔ کنشک اور اس کے جانشینوں کے عہد کے سکوں پر نہ صرف کشنوں کے دیوتاؤں بلکہ ایران اور یونان کے دیوی دیوتاؤں کی تصاویر منقش ہیں۔ گپت خاندان کے عہد (چوتھی سے چھٹی عیسوی تک) کے طلائی سکے وزن اور سائز کے اعتبار سے کشن عہد کے سکوں سے بہت ملتے ہیں۔ لیکن ان کی ساخت بہتر ہے اور ان پر مابعد کے بعض دیوی دیوتاؤں کے نقش

موجود ہیں۔

۷۱۲ء میں عربوں کی آمد نے سندھ کو سماجی و معیشتی مساوات کے ایک انقلابی نظریہ سے ہمکنار کر دیا۔ جس کا اظہار اس عہد کے طلائی و نقرئی سکوں سے ہوتا ہے۔ ان سکوں پر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے الفاظ کندہ ہیں۔ ابتدائی دور کے سکے ساسانی اور بازنطینی اثرات کے حامل نظر آتے ہیں۔ وسطی ایشیا کے نئے دور کا آغاز سلطان محمد بن سام (۱۱۹۳-۱۲۰۶ء) میں ہوا۔ روز افزوں تجارت معیاری طلائی کرنسی کی متقاضی تھی۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں ''دھلی وال'' سکہ کا رواج تھا۔ مسلمانوں نے ''جیتل'' اس زمانہ کا پیسہ رائج کیا۔ نقرئی بڑا سکہ ''ٹنکہ'' یعنی روپیہ تھا۔ جو قریب ایک تولہ کا تھا۔ اس کے ۴۸ جیتل ہوتے تھے۔ یہ ٹنکہ سب سے پہلے سلطان التمش کے عہد (۱۲۱۰-۱۲۳۵ء) میں نقرئی ٹنکہ جاری ہوا۔ مغلوں کے زمانہ میں یہی ٹنکہ روپیہ ہو گیا۔ سلطان غیاث الدین تغلق کے زمانے میں نظام زر اور فروغ حاصل ہوا۔ سلطان محمد تغلق (۱۳۲۵-۱۳۵۱ء) نے کرنسی کے ضمن میں کئی تجربات کیے۔ اس نے پیتل اور تانبے کے سکوں کی جگہ چاندی اور سونے کے سکے جاری کیے۔

بابر (۱۵۲۵-۱۵۳۰ء) اور ہمایوں (۱۵۳۰-۱۵۵۵ء) کے سکے زیادہ تر نقرئی درہم تک محدود رہے، جو مغربی ایشیا میں رائج تیموری سکوں سے بہت مماثلت رکھتے تھے۔ شیر شاہ سوری (۱۵۴۰-۱۵۴۵ء) جس نے ہمایوں کی جلاوطنی کے زمانہ میں برصغیر میں بہت سی اصلاحات نافذ کیں۔ ''روپے'' کا موجد تھا۔ اکبر اعظم (۱۵۵۶-۱۶۰۵ء) اپنی سیاسی و فوجی کامرانیوں کی طرح نظام زر کی تاریخ میں بھی ممتاز نظر آتا ہے۔ اس نے ایسے سکے جاری کیے، جو تاریخ کے عظیم سکوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اکبر کے زمانہ میں روپے کے چالیس دام تھے۔ ہر دام کے ۲۵ حصے۔ ہر حصہ کو جیتل کہتے تھے۔ اکبر کے زمانہ میں من ۲۸ سیر کا تھا اور شاہجہانی سیر ۵۰ روپیہ کا ہوتا تھا، جہانگیر (۱۶۰۵-۱۶۲۷ء) کے عہد کے سکے اپنی خوبصورتی اور حسن کے اعتبار سے بڑے ممتاز ہیں۔ ان پر کندہ عبارت دلکشی اور حسن کی حامل ہے۔ جہانگیر نے اشرفیاں بھی ایجاد کیں۔ دو اقسام کی اشرفیوں پر جہانگیر کی اپنی تصویر بھی ہے۔ یہ رواج اورنگ زیب تک رہا۔ فرخ سیر (۱۷۱۳-۱۷۱۹ء) نے ٹکسال کا طریقہ جاری کیا اور اس طرح ٹھپے اور ڈھلائی کے مغل سکے ختم ہو گئے۔

رنجیت سنگھ (۱۷۹۹ - ۱۸۳۹ء) کے عہد میں ایرانی بیت نما" سکے جاری ہوئے - بعد میں ایسے سکے بھی جاری ہوئے، جن پر گورمکھی عبارت ہوتی تھی - لیکن یہ سکے تانبے کے تھے - عموماً ان کا نام نانک شاہی ہوتا تھا -

ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۸۳۵ء میں روپے تک کے تمام نئے سکے جاری کئے - ان سکوں پر شہنشاہ انگلستان یا ملکہ کی تصویر اور کمپنی کا نام درج ہوتا تھا - ۱۸۵۷ء میں پہلی جنگ آزادی کے بعد کمپنی کی حکومت کا خاتمہ ہوا، تو سکوں پر کمپنی کا نام بھی ختم ہو گیا - اکنی اور دونی کے نکل کے سکے اس عہد میں جاری کئے گئے - (اٹھنی اور چونی چاندی کی تھی)

حصولِ آزادی (۱۹۴۷ء) کے بعد پاکستان اپنے نظریات کے مطابق سکے جاری کرنے میں آزاد تھا - تمام سکوں پر اردو - انگریزی میں حکومت پاکستان کے الفاظ لکھے گئے اور ہر سکے کی ایک جانب محبوب نشان چاند تارا ڈالا گیا -

یہ تمام سکے اس خطۂ ملک یعنی ہزارہ میں جاری رہے - سوائے عرب سکوں کے جن کا رواج سندھ ملتان تک ہی محدود رہا -

زمانۂ قریب یعنی کمپنی کے عہدِ حکومت میں کمپنی کے روپیہ اور گنڈہ روپیہ کا عام رواج تھا - ان دونوں کی باہمی قیمتوں کا اندازہ ڈپٹی کمشنر ہزارہ کے ایک خط محررہ ۱۴ اپریل ۱۸۶۰ء سے ہوتا ہے جس میں اس نے جاگیروں کی مالیت کے ذکر میں ایک سو روپیہ گنڈہ کو کمپنی کے ۹۷ روپیہ کے مساوی قرار دیا - یعنی کمپنی کا ایک روپیہ ۱⅕ گنڈہ کے برابر تھا -

میجر ایبٹ نے اپنی ڈائری مورخہ ۱۹ دسمبر ۱۸۴۸ء میں تیس ہزار ہری سنگھی روپیہ کو کمپنی کے پندرہ ہزار روپیہ کے برابر لکھا ہے - میجر ایبٹ کے زمانہ کے تاریخی حوالہ جات سے معلوم ہوتا ہے کہ ضلع ہزارہ کے بندوبست میں مالیہ کا تعین - سکہ گنڈہ زمان شاہی روپیہ کی بناء پر ہوتی تھی - جو انگریزی روپیہ سے قیمت میں زیادہ تھا (بحوالہ خط ڈپٹی کمشنر ہزارہ یکم مئی ۱۸۵۰ء) اس خط میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ نانک شاہی اور گنڈہ روپیہ تجار و دیگر اشخاص سے حسب مقرر کردہ[ا] (دھات کے جانچ و پرکھ کا افسر) راولپنڈی خزانہ سے کمپنی کے روپیہ سے تبدیل کئے جائیں - اس سے معلوم ہوتا

ا - ASSAY MASTER

ہے کہ کمپنی کے روپیہ کے ساتھ مئی ۱۸۵۰ء تک دوسرے سکے بھی رائج الوقت رہے۔

ڈپٹی کمشنر ہزارہ کے ایک دوسرے خط جون ۱۸۴۹ء سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس سال (۱۸۴۹ء) میں گنڈہ رمان شاہی ہری سنگھ کا روپیہ اور سری نگری روپیہ بھی چل رہے تھے۔

اس ضمن میں یہ امر بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ ضلع ہزارہ میں عدالت کے ٹکٹ کا استعمال ۱۸۴۹ء بموجب خط ۱۸ر جولائی ۱۸۴۹ء) میں شروع کیا گیا۔ میجر ایبٹ نے اس امر کی مخالفت کی کہ ہزارہ کے لوگ غریب ہیں اور یہ خرچ ان پر بوجھ ہوگا۔

ایک انگریزی دستاویز مورخہ ۱۲ر جون ۱۸۵۰ء سے معلوم ہوا کہ اس وقت نمک کا بھاؤ تین روپے لاہوری من تھا۔ لاہوری من ۴۰۲۰ تولہ کا اور کانِ نمک پر جو من استعمال ہوتا تھا وہ ۵۰۱۶ تولہ کا تھا۔ شاہ جہانی سیر ۱۰۵ روپیہ کا ہوتا تھا۔ سکہ ہائے و اوزان مروجہ ہزارہ (۱۸۷۲ء تاریخ ہزارہ دیس) عموماً ضلع ہزارہ میں عہدِ اسلام میں سکہ محمد شاہی اور گنڈہ رائج تھے۔ عہدِ سکھاں میں گنڈہ اور نانک شاہی اور عہدِ انگریزی میں ڈبل روپیہ (انگریزی روپیہ کو ڈبل روپیہ کہا جاتا تھا)

اوزان

عہدِ اسلام ۷۰ تولہ کا سیر (قوم تارخیلی) ۸۴ تولہ کا سیر (قوم اتمان زئی)۔ ۷۷ تولہ کا سیر (قوم ترک) قوم دلازاک میں ۸۴ تولہ کا سیر۔ قوم گوجر میں ۹۰ تولہ کا۔ قوم تناولی میں ۹۰ تولہ، قوم سواتی میں ۸۴ تولہ کا، قوم جدون میں ۱۰۰ تولہ کا سیر رائج تھا۔

سکھوں کا عہد۔ یہی اوزان جاری رہے۔

انگریزوں کے عہد میں قوم تناولی، دلازاک، اور سواتی میں ۸۴ تولہ کا سیر رہا اور باقی میں ۸۰ تولہ کا رائج رہا

باب دوازدہم (۱۲)

پٹھانوں کا حسب و نسب

چونکہ ضلع ہزارہ میں بہت سی پٹھان قومیں آباد ہیں، لہٰذا ان کے حسب و نسب کی تحقیق ضروری سمجھی گئی۔ اس باب کے لئے میں نے بہت سے ماخذوں سے استفادہ کیا۔ سر آلف کیرو ایک سابق گورنر سرحد (عہدِ انگریزی کے آخر میں) کی کتاب اس باب میں بہت مفصل ہے اور تاریخی شہادتوں پر مبنی ہے۔

میری تحقیق کے مطابق پٹھان (ماضی پر مستند تاریخوں کے مطابق) اصلاً بنی اسرائیل ہیں۔ جو کوہ سلیمان کے گرد و نواح میں آباد ہو گئے۔ یہاں پر ان کا اختلاط یہاں کے باشندوں۔ اہلِ گندھارا سے ہوا اور اس قوم میں آریائی عنصر داخل ہو گیا۔ یہ اختلاط تاریخ کے مختلف ادوار میں بہت سی صاحبِ اقبال و سیادت اقوام میں ہوتا رہا ہے۔ پٹھانوں اور سادات میں خاص کر زیادہ ہوا۔ پٹھانوں میں ان کے اوصافِ بہادری اور مالکِ تخت و تاج ہونے کی وجہ سے اور سادات کی نسبی شرف و عزت اور صاحبِ ارشاد و ہدایت ہونے کی وجہ سے۔

پٹھانوں کے بنی اسرائیل ہونے کا ناقابلِ تردید ثبوت

یہ بات قابلِ غور ہے کہ افغان ۲۶۰۰ سال ہوئے کہ افغانستان میں اقامت پذیر ہوئے۔ لیکن جن مقامات کے نام انہوں نے اس وقت رکھے اور جہاں سے ہندوستان پر حملہ آور قومیں وقتاً فوقتاً گزرتی رہیں وہ آج تک اسی طرح قائم ہیں اور ان میں

میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ افغان اپنے قومی طور طریق پر متعصبانہ طور پر مستقل رہے، جو بنی اسرائیل کی بنیادی خصلت ہے۔

لیکن حالیہ تحقیق، بحوالہ "دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۵، شائع کردہ پنجاب یونیورسٹی" کے یہ قوم آریاؤں اور بنی اسرائیل سے بہت پہلے اپنے ملک "باختر" میں تہذیب و تمدن سے آراستہ قوم تھی۔

پرانی تاریخوں کے ماخذ کے مطابق، ان کا بنی اسرائیل ہونے پر میں نے تاریخ ہزارہ طبع اول میں مفصل اقتباسات درج کر دئیے تھے۔ اب موجودہ تحقیق کے متعلق اقتباس درج ذیل ہے

بحوالہ دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۵ پنجاب یونیورسٹی

پشتونوں کا وطن، باختر (بلخ)، قدیم ہے۔ جس کا حدود اربعہ، شمال میں دریائے آمو، مشرق میں بدخشاں، جنوب میں سلسلہ کوہ ہندوکش اور مغرب میں صحرائے۔

اس علاقہ کا عرض ۱۲۰ میل اور طول ۲۵۰ میل اور رقبہ تیس ہزار مربع میل ہے۔

یونانی اور عربوں نے اس ملک کو جھنڈوں والا ملک (اس قوم کا ہر قبیلہ شناخت کے لئے اپنا امتیازی جھنڈا لگاتا تھا) لکھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ ایک متمدن اور زراعت پیشہ قوم ہے اور ان کے شہر "بلخ" کو ام البلاد (مادرِ شہرہا) لکھا ہے۔ مشرق و مغرب کے تمام مورخین و محققین اس پر متفق ہیں کہ انسانی تمدن کی نشوونما وارتقاء کا گہوارہ وسطِ ایشیاء کا خطہ ہے۔ جہاں کم از کم ۲۵ ہزار سال ق م انسان نے تمدن کی بنیاد رکھی، نشوونما پائی اور اطرافِ عالم میں پھیل گیا۔ اس خطہ کی سرسبزی و شادابی اور زرخیزی بڑی ہی پرکشش تھی۔ وہاں کے پھل خصوصاً انگور اور سیب خاصے بڑے اور رسیلے ہوتے۔ حیوانات میں دو کوہانوں والے اونٹ (بختی موسوم بہ بخت باختر) آج تک مشہور چلے آتے ہیں۔

آریاؤں کو جب اپنا قدیم وطن سائبیریا ۶۰۰۵ ہزار سال پہلے چھوڑنا پڑا، تو ان کی پہلی منزل یہی علاقہ باختر (بلخ) تھا۔ آریاؤں نے رگ وید (جو شمال مغربی ہندوستان میں لکھا گیا)، میں باختر قدیم کا نام، بکھت یا بکھتہ، بکبا اور بلبکا کے ناموں سے یاد کیا۔ ژند اوستا میں رسے بخدسے اور بخت وغیرہ ناموں سے یاد کیا۔ ہیرو ڈوٹس نے اپنی تاریخ بکھت کے

بر کے باشندوں کے لئے، پکتو، پکتویس اور پکتوان نام لکھے ہیں اور پکتوان کو بہت جری، قدآور، تنومند، جنگجو، پوستین پہننے والے اور خاص قسم کے خنجر اور جنگی اسلحہ رکھنے والا بتایا ہے۔ یساتھ ہی رگ وید اور ہیروڈوٹس کی تاریخ میں اسی شمال مغربی علاقے میں چار قبائل کے نام ملتے ہیں۔ رگ وید میں۔ گندھرو، گندھارا اور گندھاری۔

ہیروڈوٹس: گنداریوسے، ستاگودائے، آپاریتوسے اور داویکائے۔ ان قبائل کے لئے پر کسی نے نہیں لکھا کہ یہ آریا تھے۔ بلکہ ہیروڈوٹس نے ان چاروں قبیلوں کے علاقے کو اکٹھی ایک اقلیم شمار کیا ہے اور انہیں ہندی باشندوں اور تمام دیگر آریا قبائل سے ممیز اور مختلف گردانا ہے اور پکتوان وغیرہ نام سے پکارا ہے جو پکتی ایکا (پختونخوا) میں رہتے تھے۔

مؤرخین نے رگ وید لکھے جانے کا زمانہ زیادہ سے زیادہ ۱۵۰۰ ق م، ژند اوستا کا ۱۰۰۰ ق م اور ہیروڈوٹس کا ۵۰۰ ق م تک مقرر کیا ہے۔ ان تینوں حوالوں سے، پہلے دو تو خود، آریوں کی مذہبی کتابیں، جن کی تاریخی حیثیت مانی جاچکی ہے۔ رگ وید شمال مغربی سرزمین پاک وہند میں لکھے گئے ہیں۔ ژند زرتشت کی مذہبی کتاب، خاص باختر، بلخ میں لکھی گئی تیسرا حوالہ ایرانی بادشاہ دارایوش کبیر (۵۲۱-۴۸۵ ق م)، کے یونانی مؤرخ وسوانح نگار اور جغرافیہ دان ہیروڈوٹس (۴۸۴-۴۲۴ ق م) کی تاریخ کا ہے۔ جس میں اس نے دارایوش کی مملکت میں باجگزار اقالیم کی فہرست بھی دی ہے اور اس کی سلطنت کی وسعت، فوجی طاقت وسلطنت کی تفصیل بیان کی ہے۔ چنانچہ پکھت، پکھتہ، پکھتیس، بخدی، بختی، بخت، پکتو اور پکتوان وغیرہ کا ذکر کرنے والے خود ہی قدیم ہندی اور پھر ایرانی آریا ہیں۔

آریا جہاں جہاں گئے۔ انہوں نے ان جگہوں کا نام اپنے نام پر رکھا۔ سائبیریا اپنی جگہ کا نام "آریانیم وائجو، ایرین ویجہ یا آریانہ ویجا" رکھا۔ ایران میں مقیم ہو کر اس کا نام "ایران ویج" رکھا اور آخری پڑاؤ میں جب وہ شمالی ہند کے کوہ دامانوں میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گئے تو وہاں کا نام آریاورش رکھا اور زندگی گزارنے کے طور طریقوں اور ضابطوں کو "آریاوات" کا نام دیا۔ لیکن باختر قدیم کا نام انہوں نے نہیں بدلا۔ نہ اپنے نام سے کسی شکل میں منسوب و موسوم کیا۔ بلکہ وید میں پکھت، پکھتہ، بلبہ، بلھکا اور باشندوں کو پکھتین اور ژند اوستا میں

بخدی، بختی، بخت اور ہیروڈوٹس نے پکتویس، پکتوا اور پکتوان اور جگہ کا نام پکتی ایکا صاف صاف بیان کیا۔

جناب عبدالحبیب حبیبی نے بحوالہ "ایران قدیم" اور "تمدن ایرانیاں خاوری" میں آریوں کی ترک سکونت کر کے باختر آنے کا زمانہ چار ہزار سال ق م لکھا ہے۔ اس بیان سے باختر کے متمدن اور زراعت پیشہ باشندوں کی قدامت اور بھی زیادہ ثابت ہوتی ہے۔

پشتون، پشتونخوا میں رہتے تھے اور ان کی بولی (پشتو) یقیناً بہت پرانی ہوگی۔ اور تمام دنیاوی زبانوں کی ام الالسنہ۔ یہی پشتو ہوگی جو ۵ ہزار قبل مسیح سے بولی جاتی تھی اور سب زبانوں میں پشتو کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ ژند آوستا، پہلوی، فارسی، سنسکرت، ہندی اور دیگر ملحقہ علاقوں کی پراکرتوں میں، پشتو کے سینکڑوں الفاظ آج بھی پائے جاتے ہیں۔

دنیا کی کسی بھی پرانی قوم اور زبان کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ خالص ہیں۔ اسی طرح پشتونوں میں بھی آریا، میدی، ھخامنشی، منگول، ھن، تاتاری، عرب اور نہ جانے کون کون سی قومیں آکر ملتی اور مدغم ہوتی رہی ہیں اور آہستہ آہستہ سب پر پشتونوں اور پشتو کا رنگ چڑھتا گیا اور ایک وقت میں ان کے ساتھ سب مل کر پشتون ہو گئے۔

پشتو رسم الخط، تحریری ثبوت قدیم طرز کا تو ملتا ہے لیکن اسی قدر معلوم ہوسکا کہ پہلے خط میخی کا رواج رہا، پھر خروشتی کا، اس کے بعد یونانی، براھمی، دیوناگری اور آوستا وغیرہ کا اور بالآخر عربی رسم الخط نے آکر دیوناگری کے سوا سب کو ختم کردیا۔ پشتو مختلف ادوار میں مختلف رسم الخط میں لکھی جاتی رہی ہوگی۔ بہر حال پشتو ادب صرف عربی رسم الخط ہی میں سامنے آیا، جس کی ابتداء دسویں صدی عیسوی میں سلطان محمود غزنوی کے ایک وزیر احمد بن حسن میمندی نے کی تھی۔

پٹھانوں کا شجرہ نسب سب تاریخی کتابوں نے ان کو قیس عبدالرشید کی اولاد لکھا ہے۔ میں نے اس شجرہ کو اس طباعت میں حذف کر دیا ہے۔ جس کی وجہ میں نے آغاز کتاب میں لکھ دی ہے۔

افغانوں کا عہد عروج ترکی نسل کے محمود غزنوی کی حکومت ۹۹۰ء سے لودھی کی شکست اور بابر کے عہد ۱۵۲۶ء کے آغاز اور پھر شیر شاہ سوری ۱۵۳۹ء-۱۵۵۵ء

تک کا عرصہ افغانوں کے عروج، ملکی اثرات و غلبہ اوران کے مسلمان ہونے اور پٹھانوں کے قیامِ سلطنت ہندوستان دنہ کہ آبائی وطن میں، کا زمانہ ہے۔ اس زمانہ کی پہلی دو صدیوں میں مرکز حکومت غزنی رہا اور آخری تین صدیوں میں دہلی وہندوستان کے دوسرے علاقوں میں۔ ان دونوں زمانوں میں افغان مسلمانوں کے ہراول دستہ میں رہے۔ پہلے بطور تنخواہ دار ملازموں کے اور بعد میں خود صاحب حکومت ہونے کے۔ اس تمام عرصے میں ان کے آبائی وطن پر نہ کسی نے باہر سے حملہ کیا اور نہ ہی خود انہوں نے منظم حکومت قائم کی اور اس عرصہ میں ان کا آبائی وطن مختلف قبیلوں کی پرورش گاہ رہا۔ جہاں سے جنگ آزما سپاہی مہیا ہوتے رہے۔ البیرونی نے ان کا مسکن دسویں صدی کے آخر میں کابل اور دریائے سندھ کا علاقہ بیان کیا ہے اور اسی زمانہ میں وہ مسلمان ہوئے۔ اس تمام زمانہ میں صرف لودھی اور خلجی قوم کا نام تواریخ میں ملتا ہے۔ سبکتگین ہی نے پہلے پہل کابل اور گندھارا کے ہندو خاندان کو نکالنے کا بندوبست کیا۔ افغان اور خلجی بے شمار اپنی فوج میں بھرتی کئے افغان اور خلجیوں نے اس کی خدمت میں جسم وجان قربان کر دیئے۔ ان اقوام کی فوجوں کے ساتھ اس نے جے پال کو دو دفعہ لمغان اور ننگرہار میں شکست دی۔ اور وادی کابل کے بالائی حصہ سے اس کو نکال دیا۔ بہت سا مالِ غنیمت اور دوسو کے قریب ہاتھی اس کو اس جنگ میں حاصل ہوئے۔ اس کے بیٹے محمود نے ہندوؤں کو گندھارا سے نکالنے کا ہی عہد نہیں کیا، بلکہ ہندوستان پر حملہ کرنے کا انتظام کرنے لگا۔ اس کے کارہائے نمایاں میں خاص کارنامہ ہندوؤں کو دریائے سندھ کے مغربی علاقہ سے نکالنے، افغانوں کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کرنے، ان کو مسلمان بنانے اور ان کی طاقت کے بل پر ہندوستان پر حملے کرنے میں تھا۔ محمود ترک تھا اور اس کی بہادری و شجاعت افغانوں میں ضرب المثل ہے اور وہ اس کو قومی لیڈر مانتے ہیں۔ اس نے افغانوں کے علاقہ، کوہ سلیمان کی اقوام پر دخل حاصل کیا اور اپنے بیٹے کو ان جنگ جو قوموں کے زیر نظر رکھنے کی وصیت کی۔ اس کے بعد پٹھان محمد غوری کے ساتھ رہے اور ۱۱۹۰ء میں پرتھوی راج کی فوج نے محمد غوری کی فوج افغانوں اور خلجیوں کو شکست دی۔ مگر دوسرے سال محمد غوری نے پرتھوی راج کو افغانوں اور خلجیوں کی امداد سے شکست دی۔ بعد میں یہ دونوں اقوام شاہان دہلی کی فوجوں میں ہر جگہ موجود رہیں ۱۲۹۰ء میں دہلی کی سلطنت پر خلجیوں نے قبضہ کر لیا۔ غوری ترک قوم تھی اور کلی طور پر ترکی غلاموں اور خلجی

سپاہیوں پر حکومت اور فوج کے نظام کے لئے اعتماد کرتے تھے۔

نکتہ: گویا امورِ سلطنت ترکوں کے ہاتھ اور امورِ فوج خلجیوں اور افغانوں کے ہاتھ میں تھے یہی وجہ ہے کہ محمد غوری کے عہد سے خلجی ہندوستان کی تاریخ میں نمایاں ہونے شروع ہوئے۔ مثلاً محمد غوری کے عہد میں محمد بختیار خلجی غزنی میں فوج کی بھرتی کے محکمہ کا افسرِ اعلیٰ تھا۔ اس سے خلجیوں کا اثر اور پھر ان کا غزنی کے صدر مقام میں دوآب تک خلجیوں کی قوم کی سکونت کا مرکز ہے، فوج کے بھرتی کا محکمہ کا حاکم اعلیٰ ہونے سے ان کے اثر و رسوخ کا پتہ چلتا ہے۔

بختیار خلجی اپنی ترقی کی خاطر دہلی چلا آیا۔ وہاں سے اس کو اودھ میں جاگیر مل گئی اور وہ بہار کے ہندو راجہ سے مقابلہ کرنے کے لئے وہاں تعین کیا گیا۔ اس کی شہرت اور آوازہ سن کر خلجی قوم کے بہت سے لوگ اس کے پاس پہنچے اور وہ تمام بہار اور بنگال کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گیا اور سب بڑے عہدوں پر خلجی قوم کے افراد کو مقرر کر دیا۔ اس نے تین سال ۱۲۰۲ء سے ۱۲۰۵ء تک حکومت کی۔ اس کے بعد دو خلجی امیر ہوئے اور آخری کو سلطان التمش نے ۱۲۲۶ء میں ختم کر دیا۔ اس طرح پہلی آزاد خلجی حکومت ۲۵ سال تک رہی۔ ان کی اس ریاست کی وجہ سے خلجی قوم کا زور وہاں رہا اور یہی وجہ ہے کہ بعد میں شیر شاہ نے بھی اس خطہ سے طاقت حاصل کر کے مغلوں کا مقابلہ کیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مغلوں کے زمانہ سے بہت پہلے خلجی اور افغانوں کا بہار اور بندیل کھنڈ میں ایک خاص تاریخی دور رہا ہے۔ ان کے علاوہ دو اور خلجی سلطنتیں ہندوستان میں تھیں۔ دہلی میں ۱۲۹۰ء سے ۱۳۱۶ء اور مالوہ میں ۱۴۳۵ء سے ۱۵۱۰ء تک جس کا عظیم الشان دار الخلافہ مانڈو اب بھی اپنی شان و شوکت کے ساتھ وادی نربدا کے اوپر کھڑا ہے۔

خاندانِ غلاماں کے عہد میں بھی اصلی اختیار اور حکومت خلجی اور افغان فوجیوں کے ہاتھ میں تھی۔ سلطان کیقباد کی موت کے بعد ترکوں کا چراغ گل ہو گیا اور خلجی کا عروج شروع ہوا۔ جلال الدین خلجی فیروز شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ چھ سال تک حکمران رہا۔ اس کے بعد علاؤالدین خلجی زبردست مطلق العنان بادشاہ ہوا ہے اور اس کے زیرِ نگین ہندوستان کا اتنا حصہ تھا کہ نہ اس سے پہلے اور نہ بعد مغلوں کے وقت میں ہوا۔ جہاں تک کہ انگریزوں کے وقت میں اتنا ہی ملک یکجا ہوا۔ اس نے ایسے نظام ملکی و مالی کی بنیاد رکھی جس کو بعد میں شیر شاہ اور

اکبر نے تکمیل تک پہنچایا۔

خلجی سلطنت کا خاتمہ ۱۳۲۱ء میں مبارک شاہ کے قتل سے جو اس کے اپنے منظورِ نظر نومسلم خسرو خان کے ہاتھوں ہوا، ہوگیا۔ میری تحقیق کے مطابق خلجی اور موجودہ غلجی ایک قوم ہیں۔ خوشحال خاں خٹک (۱۶۵۰ء) میں کہتا ہے۔ ؎

بیا سلطان جلال الدین پہ سر یر کیناست
چہ پہ اصل کبنس غلجی و ولایت وُو

خوشحال خان ۱۶۵۰ء میں ہوا ہے۔ اس کو یقین تھا کہ وہ خلجی اور موجودہ غلجی ایک ہی ہیں لہٰذا خلج اور موجودہ غلجی ایک ہیں اور ترکوں کی نسل خلج سے ہیں۔ یہ خلج سفید ہن کی ایک شاخ ہیں جو افغانستان کے کوہستانوں میں پانچویں صدی عیسوی میں آئے۔ صدیوں تک پختنہ (پشتونوں) کے نزدیک رہتے رہے۔ ان کے اطوار اور زبان کو اپنا لیا۔ اگرچہ کچھ اختلاف اب تک ان میں موجود ہے۔ چنگیز خان کے حملے ۱۲۲۰ء سے تیمور کے حملہ ۱۳۹۶ء تک اور اس کے بعد بھی پٹھانوں کے تاریخی کارنامے زیادہ تر ہندوستان ہی میں تھے بہ نسبت ان کے اپنے ملک کے۔

۱۳۳۲ء میں ابن بطوطہ پر جب کہ وہ غزنی سے کرم ایجنسی کی طرف آ رہا تھا۔ ہر تو ب کے علاقہ میں رہزنوں نے اس پر حملہ کیا۔ ان رہزنوں کو وہ افغان بتلاتا ہے۔ تیمور نے ۱۳۹۸ء میں کوہستان کے افغانوں پر حملہ کیا اور ہندوستان کے حملہ میں لودھی اور شیرانی قبائل کو ساتھ لے کر دہلی فتح کی۔ لودھی غلجی ہیں۔ ان کی حکومت دہلی ۵ سال ۱۴۵۱ء تا ۱۵۲۱ء تک رہی۔ بہلول لودھی نے ایک فرمان افغانوں کو بھیجا، جس میں لکھا کہ دہلی پر سلطنت وہی قوم کرے گی جس کے ساتھ سرحدی اقوام ہوں گی۔ اس واسطے ہر افغان کو اپنے لواحقین کے ساتھ جو اپنے وطن میں عسرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہندوستان آجانا چاہیے اور اپنی حالت کو بہتر بنالینا چاہیے اور قومی حکومت کو دشمنوں کے مقابلہ میں مدد دینی چاہیے۔ اس پر بہت افغان قبیلے وارد ہند ہوئے۔ یہ فرمان شیر شاہ سوری کی تاریخ مؤلفہ عباس سروانی میں درج ہیں۔ جو قومیں اس فرمان پر ہند آئیں وہ سب غلجی قوم کے قبیلے مثلاً لودھی، لوہانی، نیازی، امروت اور بھٹنی تھے لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بہت سے سربنی اور کچھ کرلانڑی بھی تھے۔

بعد کی تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ سربنی، قبیلہ یوسف زئی، مندڑ، کار لانڑی بنگش اور اورک زئی تھے۔ انہی لوگوں میں ابراہیم سوری (لودھی قبیلہ کی شاخ)، شیر شاہ کا دادا بھی تھا۔

پٹھان قوم کی سیرت

سور خاندان کی کہانی سے پٹھان قوم کے کیریکٹر پر صحیح روشنی پڑتی ہے۔ ایک لیڈر اٹھتا ہے جو اپنی عظمت اور بڑائی کی وجہ سے لوگوں کو اپنے گرد جمع کر لیتا ہے اور ان کے قبائلی و ذاتی عناد و مخالفت کو ان کے دلوں سے نکال دیتا ہے اس یگانگت و اتحاد سے فتح کی خوشی کا اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن جونہی وہ لیڈر مر جاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی سب نظام بھی ختم ہو جاتا ہے۔ قبائلی جھگڑے اور عداوتیں پھر سے شروع ہو جاتی ہیں اور حاصل شدہ عظمت پاش پاش ہو جاتی ہے۔

پٹھان قوم اپنی جبلت کے لحاظ سے سخت انفراد پسند، آزاد طبیعت اور خود سر واقع ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آج تک کبھی بھی طویل عرصہ کے لئے اتحاد پر قائم نہ رہے۔ یہاں تک کہ ان کی خالص آبادی کا بڑا شہر آج تک نمودار نہ ہوا۔ ان کے الگ الگ گاؤں و چند گھر، افراد کے نام پر بنتے رہے۔ یعنی فلاں کی کلی (شخصی)، ان کی عصبیت اول خاندانی اور قبیلہ وار رہی۔ قومی عصبیت گاہ گاہ ہی عارضی طور پر ظاہر ہوتی رہی۔ قدرت نے ان چند بہترین صلاحیتوں سے جو حکمرانی کے لئے ضروری ہیں، نوازا ہے۔ لیکن ذاتی اور کمزوریوں نے ہمیشہ ان کی ترقی کا راستہ روکے رکھا۔

الفنسٹن اپنی کتاب سلطنت کابل مطبوعہ لندن ۱۸۴۲ء پہلی جلد کے صفحہ ۲۳۱ پر پٹھانوں کی عادات و اطوار کے متعلق ایک عمر رسیدہ پٹھان کا قول کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

"ہم نااتفاقی پر مطمئن رہ سکتے ہیں۔ ہم خطرے سے بے پرواہ رہ سکتے ہیں۔ ہم خونریزی برداشت کر سکتے ہیں، لیکن ایک شخص کی ماتحتی ہمیں کبھی بھی قبول نہیں ہو سکتی۔"

پھر ۲۶۱ پر لکھتا ہے کہ:

"افغان بادشاہوں کا علم پرور ہونا قابلِ تعریف ہے۔ احمد شاہ ابدالی علم و ادب کا شائق تھا۔ رات کے وقت علماء کی مجلس منعقد کیا کرتا تھا۔ حقانیت، اسلام، توحید اور قانونِ اسلام پر ان مجلسوں میں مباحثے ہوتے۔ آخر میں شعر و شاعری اور دیگر فنون اور مسائل سائنس پر بحث ہوتی۔ یہ مناظرے بعض دفعہ صبح تک جاری رہتے۔"

تیمور شاہ نے یہ طریقہ جاری رکھا اور اس کے بعد کے حکمرانوں نے بھی۔ تیمور شاہ ان مجلسوں میں اپنے اشعار بھی سنایا کرتا تھا۔ پھر صفحہ ۳۳۰ پر لکھتا ہے :

"اور مختصر اً پٹھانوں کے عادات، ان کی برائیاں، انتقام، حسد، حرص، بچرستانی اور ضد ہیں۔ ان کی خوبیاں، آزادی کا عشق، دوستوں سے وفاداری، ماتحتوں پر مہربانی، مہمان نوازی، شجاعت، بلند ہمتی، فیاضی، محنت اور ہوشیاری ہیں۔ وہ اپنے قرب و جوار کی اقوام کے مقابلہ میں جھوٹ، ساز باز اور فریب سے کم آشنا ہیں"

یعنی ان کی خوبیوں کا پلہ بھاری ہے۔

بابر نے ۱۵۰۵ء میں پشاور فتح کیا۔ واپس کوہاٹ، بنگش و بنوں براہ برمل واپس آیا۔ ہنگو کے نزدیک رئیسان اور استرزئی کے درمیانی درہ میں بنگش پر حملہ کیا۔ وہاں وہ پٹھانوں کے اس رواج کا ذکر کرتا ہے کہ جب قبائل مفتوح ہو کر رحم کی درخواست کرنے کیلئے آتے ہیں تو دانتوں میں گھاس پکڑ کر آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "میں تمہارا بیل ہوں"

ہزارہ میں ایسے موقعوں کے لئے جو مثل مشہور ہے "منہ میں گھاس اور گلے میں رسی" تو اس کا ماخذ بھی یہی رسم معلوم ہوتی ہے (ش پ)

بابر نے افغان قوم کے قبیلوں کا کم ہی ذکر کیا۔ وہ ان کو افغان ہی کے نام سے یاد کرتا ہے۔ ان گیارہ زبانوں کا جو کابل میں بولی جاتی تھیں۔ ان میں سے ایک کا نام وہ افغانی لیتا ہے یہ اغلباً اس وجہ سے کہ وہ صرف یوسف زئی قوم سے ہی زیادہ واقف تھا اور یہ قوم اپنے لئے ہمیشہ افغان نام ہی استعمال کرتی رہی اور کبھی بھی اپنے آپ کو پٹھان نہیں کہا۔

بابر کی فوج میں یوسف زئی اور دیگر پٹھان اقوام شامل تھیں۔ قصور یہ پٹھان خویشگی پٹھان ہیں اور محمد زئی کی شاخ میں ان کی روایت کے مطابق وہ بابر کے ساتھ ہندوستان گئیں۔ اس نے ان کو وسطی پنجاب میں زمینیں بطور جاگیر دیں، جو ستلج کے دونوں کناروں پر ہیں۔

پٹھانوں کی حمایت بابر کو حاصل تھی۔ اس کا ثبوت خوشحال خٹک کا یہ شعر ہے۔

ترجمہ : دہلی کا بادشاہ بابر ہو گیا اور یہ کام پٹھانوں کی برکت سے ہوا۔

پٹھانوں کی زبان پشتو

فارسی زبان پہلوی زبان سے نکلی ہے۔ یہ پہلوی دارا بادشاہ کے وقت بولی جاتی تھی۔ زرتشت کی کتاب " زند۔ اوستا" پہلوی زبان میں تھی اور اسی سے پشتو زبان نکلی ہے۔ پشتو زبان ۵۵۰ ق م سے ۳۳۰ ق م، زمانہ سلطنت اخمینی میں پروان چڑھی۔

دائرۃ المعارف جلد ۵ صہ ۶۲۲ کے مطابق پشتو کا سب سے پرانا کلام بصورت نظم امیر پولا دسوری کے بیٹے امیر کروڑ (۷۵۶ء) کی رجزیہ نظم ہے۔ مگر دوسرے مؤرخین کی رائے کے مطابق ۱۵۶۰ء تک پٹھانوں کی تحریر کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ سولھویں صدی کے نصف میں دو مذہبی رہنماؤں اخوند درویزہ اور پیر روشن کا نام تاریخ کے صفحات پر ملتا ہے۔ جنہوں نے ایک دوسرے کا مقابلہ تلوار کی بجائے قلم سے کیا۔ جس کی وجہ پشتو میں کافی تحریری مواد جمع ہوا۔ اخوند درویزہ کی تحریر مقفّیٰ نثر میں ہے اور پیر روشن نے نظم میں بہت کچھ لکھا ہے۔ پیر روشن کا بھتیجا مرزا انصاری، پہلا پشتو کا شاعر ہے جس نے نظم لکھی۔ اس کے بعد پیر محمد کاکڑ، خواجہ محمد بنگش اور دوسرے شعراء پیدا ہوئے۔ سترھویں صدی کے شروع میں خوشحال خان خٹک، رحمان بابا، حمید، علی خان، حفیظ اور دیگر مشہور شعراء پیدا ہوئے۔ جنہوں نے پشتو زبان کی خوب خدمت کی اور اس کو سنوارا۔

افغان قوم مندرجہ ذیل ناموں سے یاد کی جاتی ہے

۱۔ اسرائیلی۔ جو قوم کا اصلی نام ہے۔

۲۔ پشتون یا پختون، یہ نام انہوں نے خود اختیار کیا۔

۳۔ سلیمانی۔ عربوں کا دیا ہوا نام (کوہ سلیمان کی اقامت کی وجہ سے)

۴۔ پٹھان۔ ہندوستانیوں کا دیا ہوا نام۔

۵۔ افغان یا اوغان۔ یہ غیر ملکیوں، خاص طور پر ایرانیوں اور تاتاریوں کا دیا ہوا نام ہے۔

باب سیزدہم (۱۳)

ہزارہ میں نظامِ صحت

زمانۂ قدیم یعنی مغلیہ، درانی اور سکھوں کے عہدِ حکمرانی میں صحت کے انتظام کے لئے کسی سرکاری ادارہ کے وجود کا علم نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری طور پر اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ لوگ انفرادی طور پر گاؤں یا شہر کے حکیم، طبیب یا کسی وید سے علاج معالجہ کراتے تھے۔ جو یونانی یا آیورویدک طریق سے جڑی بوٹیاں یا دھات کے کشتہ جات استعمال کرتے تھے۔ علماء، پیر اور ملا تعویذ، گنڈ (دم شدہ دھاگا گلے میں باندھنا)، یا دم (قرآن کی آیت پڑھ کر مریض پر پھونکنا)، سے علاج کرتے تھے۔ بہت سے لوگ مشہور اولیاء کی قبور پر جاتے۔ مٹی یا سنگریزہ قبر سے اٹھا کر جسم پر مل لیتے۔ جس کو لوگ امان کہتے تھے۔ پیر دم شدہ تعویذ باندھنے کے لئے یا اس کی سیاہی کو پانی سے دھو کر پینے کے لئے دیتے۔ پتیاں کے نزدیک موضع کوکلیہ کے سادات (جن کو پیر کہا جاتا ہے)، پاگل کتے کے کاٹے کا علاج مٹی کے ایک ڈھیلے (جو وہاں سے اٹھا کر دیا جاتا ہے)، سے کرتے تھے اور اس کو تھوڑی تھوڑی مقدار میں کھانے کے لئے ہدایت کرتے۔ ان کا یہ علاج بہت مشہور اور مجرب یقین کیا جاتا ہے۔ دور دراز علاقوں سے لوگ ان کے پاس علاج کے لئے آتے ہیں۔ یہ طریقِ علاج، تعویذ، گنڈ، دم وغیرہ اب کم ہو رہا ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اشیاء و کلمات میں روحانی خاصیت اور تاثیر ہوتی ہے جس سے روح و دل متاثر ہوتے ہیں اور جسمانی عوارض پر صحت مندانہ اثر ڈالتے ہیں۔ جسم کی

صحت و توانائی روح و دل کی توانائی پر منحصر ہے ہی۔ لہٰذا ان کے اثر و بیان پر تاریخ بھی شاہد ہے۔ مختلف اقسام کے بیمار، اولیا، صلحا اور انبیار کے ہاتھ سے شفایاب ہوتے رہے ہیں۔ مگر بنیادی شرط اس طریقِ علاج کے کارگر ہونے کی بیمار کے عقیدہ پر ہے۔ یعنی وہ عقیدت مندانہ ایسے صلحار کے پاس جائے۔ اس قول کی تصدیق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد کے ایک واقعہ سے ہوتی ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیان کیا کہ اس کے بھائی کے پیٹ میں درد ہے۔ آپ نے فرمایا، جاؤ اور اس کو شہد پلاؤ" جب وہ شخص شہد لے کر اپنے بھائی کے پاس پہنچا تو اس کے بھائی نے پوچھا "کیا لائے ہو" اس نے کہا: "حضور نے فرمایا کہ تمہارے درد کے لئے تم کو شہد پلاؤں، لہٰذا شہد لے آیا ہوں" اس کے بھائی نے کہا "کہ حضور نے فرمایا ہے تو جلدی دو، کہ میں اس کو پی لوں" اس نے شہد پیا تو اس کا درد جاتا رہا۔ کچھ دنوں کے بعد کوئی اور شخص اسی طرح کے اپنے ایک بیمار کے لئے، جس کے پیٹ میں درد تھا، حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے فرمایا "اس کو شہد پلاؤ" جب اس کو شہد پلانے لگے تو اس نے شور کیا کہ مجھے کیوں زہر پلا رہے ہو۔ مجھے کیوں مارتے ہو۔ بہرحال شہد اس کو پلایا گیا۔ لیکن وہ مر گیا۔

یہ ماجرا یعنی دونوں شخصوں کا حضورؐ کی خدمت میں بیان کیا گیا کہ شہد سے ایک شخص اچھا ہو گیا اور دوسرے کی موت واقع ہو گئی۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا: "پہلے کا پیٹ سچا تھا۔ اس نے دوائی قبول کر لی اور اچھا ہو گیا۔ دوسرے کا پیٹ جھوٹا تھا اور دوائی قبول نہ کی اس لئے وہ مر گیا"

اب تو یورپ کے ڈاکٹر بھی تحلیل نفسی کی بنار پر اس طریقِ علاج کے قائل ہو رہے ہیں اور اب ان کا نظریہ یہ ہے کہ مریض کا علاج تحلیل نفسی کی بنار پر زیادہ مؤثر اور مفید ہے نہ کہ مرض کا۔ ان کی رائے میں نفسِ انسانی کی صحت پر جسم کی صحت کا دار و مدار ہے۔ اس کے لئے بہت سے تجربات بھی انہوں نے کئے ہیں۔ کسی خاص مرض کے لئے مشہور دوا کا استعمال ایک گروہ پر کیا اور اسی خاص مرض کے دوسرے گروہ پر مجرب دوا کے ہم رنگ اور مشابہ معمولی دوا سے کیا گیا۔ نتیجہ دونوں حالتوں میں قریباً ایک رہا۔ چونکہ ان دونوں گروہوں کا علاج ایک قابل

اعتماد ڈاکٹر نے کیا ۔ لہٰذا اس کے ہاتھ سے دونوں دوائیں کارگر ثابت ہوئیں ۔ اس حقیقت کو شیخ سعدیؒ نے ایک دوسرے رنگ میں پیش کر کے اس نظریہ کی تائید مدتوں پہلے کر دی ۔ ؎

اگر حنظل خوری از دست خوش خو

بہ از شیرینی از دست ترش رو

علم روحانی کے تصرفات ایک بدیہی بات ہے ۔ مولانا امین احسن اصلاحی (تدبر قرآن ص۲۴۲) میں فرماتے ہیں کہ اس علم کا انکار ایک بالکل بدیہی بات کا انکار ہے ۔ تجربہ میں ایسی باتیں آئی ہیں ۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اسی علم کے باقیات ہیں ، جن کو ہمارے صوفیوں اور پیروں کے ایک طبقہ نے اپنایا اور اس سے انہوں نے لوگوں کو فائدہ بھی پہنچایا ۔ بلکہ واقعات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض حالات میں اس کی مدد سے انہوں نے جوگیوں اور جوتشیوں وغیرہ کے مقابل اسلام اور مسلمانوں کی برتری بھی ثابت کی ۔ لیکن اخلاقی زوال کے بعد جس طرح یہود کے ہاں یہ علم ، علمِ سفلیہ کا ایک ضمیمہ اور دکانداری کا ایک ذریعہ بن کے رہ گیا ۔ اسی طرح ہمارے یہاں بھی صرف پیری و مریدی کی دکان چلانے کا ذریعہ بن کر رہ گیا اور حق سے زیادہ اس میں باطل کے اجزاء شامل ہو گئے ۔

یہی حال بیماروں کے تعویذوں وغیرہ کے معاملہ میں بھی پیش آیا ۔ حکومت کی جانب سے نظامِ صحت کے بارے میں صحیح علم مجھے باوجود کوشش کے نہ ہو سکا ۔ مسلمان حکومتوں نے تو ہر جگہ باقاعدہ شفا خانہ کھولے ۔ جہاں پر لوگوں کا باقاعدہ سرکاری خرچ پر علاج ہوتا تھا ۔ ہندوستان میں سب سے پہلے فیروز تغلق نے ایک بہت بڑا شفا خانہ قائم کیا ۔ محمد بن تغلق کے عہد میں صرف صرف دہلی میں ستر شفا خانے تھے ، جو اس زمانے میں مارستان یا بیمارستان کہلاتے تھے ۔ بادشاہ کی ملازمت میں بارہ سو اطباء تھے ۔ فیروز شاہ کو خود علم طب سے بڑا شغف تھا اور ایک رسالہ طب فیروز شاہی کے نام پر تالیف کیا ۔ اس کے بعد علاؤالدین احمد شاہ بہمنی نے ۸۵۰ھ مطابق ۱۴۵۲ء میں اپنے پایہ تخت بیدر (دکن) میں ایک عمدہ شفا خانہ کی بنیاد ڈالی ۔

ضلع ہزارہ میں شفاخانہ جات

سول ہسپتال ایبٹ آباد اس ضلع میں شفاخانہ کی ضرورت تعمیر اور باقاعدہ علاج کا انتظام اغلباً عہدِ انگریزی کے آغاز ہی میں ہوگیا۔ یورپین اقوام کے قدم ہندوستان کی سرزمین پر مضبوطی سے پڑنے کے ذمہ دار یورپی ڈاکٹر ہی ہیں۔ اس ضلع میں سب سے پہلی ہسپتال ایبٹ آباد میں ۱۸۷۲ء میں اسی جگہ قائم ہوئی جہاں اب میونسپل کمیٹی ایبٹ آباد کے دفاتر چونگی اور موٹر لسبوں کا اڈہ ہے۔ یہ مختصر سی عمارت ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس میں صرف بیرونی (OUT DOOR) مریضوں کا علاج ہوتا تھا۔ اس کے بعد میں موجودہ ہسپتال کی جگہ وسیع ہسپتال بنی۔ سخت مریض ہسپتال میں رکھے جاتے تھے۔ اس میں توسیع ۱۹۴۸ء میں ہوئی۔ زنانہ کمرہ زچہ خانہ اور ایکس رے بنا۔ ۱۹۵۶ء میں یہ زنانہ ہسپتال کے لئے مختص ہوگیا اور مردانہ ہسپتال محلہ کیہال کے متصل جانب غرب بر لب سڑک لنک روڈ بنا۔ جس میں ایک سو بیماروں کے رکھنے کے لئے بستروں کا انتظام کیا گیا۔ اس جگہ پر پہلے اڈیشنل پولیس کی بارکیں تھیں۔ یہ جگہ اس وقت کے وزیرِ اعلیٰ سابق صوبہ سرحد خان عبدالقیوم خان نے ہسپتال کے لئے منظور کی۔ ۱۹۵۲-۵۳ء میں تعمیر شروع ہوئی اور ۱۹۵۴-۵۵ء میں مکمل ہوگئی۔

نئی تعمیر شدہ سول ہسپتال ایبٹ آباد کا افتتاح ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۶ء خان خداداد خان دبھوگڑ منگ، وزیر صحت مغربی پاکستان نے کیا۔

اب تو سول ہسپتال ایبٹ آباد کی مزید توسیع ہوگئی ہے۔ نئے کمرے بعض سے کرایہ دار بن گئے ہیں۔ سٹاف میں بہت اضافہ کر دیا گیا ہے۔

ہری پور ہسپتال سب سے پہلے یہ ہسپتال ۱۸۷۰ء میں بنی۔ ۱۹۳۱ء جب میں اس ہسپتال میں اسسٹنٹ سرجن تھا، اس کا بہت سا حصہ کچا تھا۔ صرف آؤٹ ڈور کا بلاک پختہ تھا۔ اس زمانے میں صرف آٹھ بستر کا انتظام تھا۔ ۱۹۳۱ء ہی

میں اس سے ملحق میونسپل کمیٹی، باغ کا نصف حصہ شامل ہسپتال کر دیا گیا تاکہ آئندہ توسیع کے لئے اس میں بڑے بڑے وارڈ اور عملہ کے لئے رہائشی مکانات بنائے جاسکیں۔ ۶۸-۱۹۶۷ء میں اس حصہ میں عمارات بنائی گئی ہیں اور اب یہ ہسپتال کافی بڑا ہو گیا۔

اسی ہسپتال کے شمالی کونہ میں ایک ٹی۔ بی وارڈ ہے، جو خان صاحب عبدالمجید خان ترین رئیس تلوکر نے بنوائی تھی۔ سارے ضلع میں یہی ایک وارڈ ہے جو ایک مخیر مسلمان نے بنوائی۔ حالانکہ ہزارہ میں ہندوؤں اور سکھوں کی بنائی ہوئی بہت سی یادگاریں رفاہِ عامہ کے لئے موجود ہیں۔

مانسہرہ ہسپتال پرانا ہسپتال ایک تنگ کونہ، بہ جانب غرب عدالت ہائے تحصیل میں تھا۔ توسیع کے لئے اس کے ساتھ جگہ نہ تھی۔ اب اس کو زنانہ ہسپتال بنا دیا گیا ہے اور مردانہ ہسپتال شہر سے باہر تعمیر ہو گیا ہے۔

میں ۱۹۲۹ء میں پرانے ہسپتال میں چھ ماہ اسسٹنٹ سرجن رہا۔ پہلے پہل پرانا ہسپتال بہت مختصر تھا۔ بعد میں اس کے احاطہ میں دو وارڈ بنائے گئے۔ اب یہ ہسپتال زنانہ ہسپتال میں تبدیل کر دیا گیا۔ اور مردانہ ہسپتال شہر سے باہر بنایا گیا۔ زمانہ ماضی میں اس ہسپتال کا انچارج ڈاکٹر شیر باز خان تھا جو بہت ہی نیک نفس، ہمدرد خلائق اور شریف انسان تھا۔ تحصیل مانسہرہ کے لوگ اس کے گرویدہ تھے اور حکومت بھی اس کی قدر کرتی تھی۔ ان کے نیک نفس بیٹے فضل خالق خان ایکسائز کے محکمہ میں تھے، جو اب ریٹائر ہو کر ہسپتال کے نزدیک ہی رہائش رکھتے ہیں۔ ان کے والد مرحوم کو تو دیکھا نہیں، لیکن ان کے صاحبزادہ سے بڑی راہ و رسم رہی۔ نامور باپ کے صفات حمیدہ کا نقشِ ثانی ہیں۔

دیہاتی مراکز صحت اصلاحات کے بعد ضلع میں بہت سے چھوٹے چھوٹے ہسپتال موسوم بہ دیہاتی مراکز صحت بن گئے۔ محدود بیماروں کے رکھنے کا انتظام بھی ہے۔

تپ دق کی ہسپتال ڈاڈر بہ پر فضا جگہ، برلب دریائے سرن تحصیل مانسہرہ میں ہے یہاں پر ایک سینٹوریم ۱۹۳۹ء میں بنایا گیا۔ چونکہ ان ایام

تپ دق کے مریضوں کے لئے ایسے اونچے مقام، جہاں چیڑھ کے درخت ہوں، صحت افزا قرار دیتے گئے تھے۔ لیکن اب وہ نظریہ ختم ہو چکا ہے۔ اب عام ہسپتالوں میں ہی تپ دق کے مریض بھی رکھے جاتے ہیں۔

فی الوقت ضلع بھر میں مجموعی طور پر ۱۲ سرکاری ہسپتال ۵۹ چھوٹے شفاخانے (ڈسپنسریاں) حفظانِ صحت کے چار مراکز اور دو گشتی شفا خانے ہیں۔

ہزارہ میں سند یافتہ ڈاکٹر

ہزارہ میں سب سے پہلے ڈاکٹر رحمت اللہ ہوئے ہیں، جو ایبٹ آباد کے باسی تھے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد فوج میں ملازم ہو گئے اور تقریباً ساری عمر انگلینڈ میں ہی بسر کر دی اس اثنار میں کبھی کبھی ایبٹ آباد آتے۔ آخری دفعہ ۱۹۷۴ء میں آئے اور ۱۹۷۵ء میں یہاں ہی فوت ہوئے۔

ماضی قریب میں لاہور کے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور میں سب سے پہلے ڈاکٹر سعید احمد خان نے ۱۹۲۴ء میں سند حاصل کی۔ صوبہ سرحد میں محکمہ صحت میں ملازم رہے۔ وہ تپ دق کے مریض رہے اور اس مرض میں مہارت علاج اور مزید تعلیم بھی حاصل کی۔ اس بنار پر حکومت نے ایک نتھ دو کاج کے تحت ان کو ڈاڈر سینی ٹوریم کا ناظم بنا دیا۔ چوبیس سال کے قریب ناظم رہے۔ ۶۷-۱۹۶۶ء میں ریٹائر ہوئے۔ اپنے مکان دار السعید، لوئر ملک پورہ میں کامیاب پریکٹس کی۔ لیکن ۱۹۷۴ء کے سیلاب تحریک ختم نبوت (مرزائیوں کے خلاف) آپ لاہوری پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں اور ہزارہ کے ضلع جماعت کے صدر تھے، میں اپنی جگہ سے اکھڑ گئے اور یہاں سے چلے گئے۔ لیکن مستقل مزاجی سے اپنے عقیدہ پر قائم ہیں۔

ہزارہ سے دوسرے نمبر پر شیر بہادر نیچی (مولف)، نے ۱۹۲۵ء میں لاہور سے سند لی۔ صوبہ سرحد کے محکمہ صحت میں ملازم ہو گئے۔ سول سرجن ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں ڈائرکٹر محکمہ صحت اور انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات ہوئے۔ وحدت مغربی پاکستان بن جانے پر ڈپٹی انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات حلقہ شمالی مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں پنشن لی اور تاحال اپنے مکان دار الشفار ایبٹ آباد

نزد پولیس لائن میں پریکٹس کر رہے ہیں۔

میرے علم میں ان دو ہزارہ کے ڈاکٹروں کے تقریباً بیس سال بعد تک ہزارہ سے کسی نئے ڈاکٹری کی سند حاصل نہ کی۔

۱۔ کرنل محمد صادق ساکن ملکیار تحصیل ہری پور نے اغلباً ۱۹۴۵ء میں لاہور سے سند ڈاکٹری کی اور فوج میں ملازم ہو گئے۔ آپ کان، ناک اور گلے کے ماہر ہیں۔

۲۔ ۱۹۴۹ء میں قاضی عبدالخالق ساکن کنج ایبٹ آباد نے ایم۔بی۔بی۔ایس کا امتحان پاس کیا اور ۵۴-۱۹۵۳ء میں جراحی کی اعلیٰ ڈگری (F.R.C.S) کے لئے انگلینڈ چلے گئے۔ ڈگری حاصل کرنے کے بعد چندے وہاں ہی رہے۔ ۶۵-۱۹۶۴ء میں وطن آئے۔ کچھ عرصہ مشنری ہسپتال (HOLY FAMILY) راولپنڈی میں سرجن رہے اور ۶۸-۱۹۶۷ء میں پھر انگلینڈ چلے گئے اور اب وہاں ہی رہائش اختیار کر لی ہے۔

۱۹۵۰ء میں ڈاکٹر محمد اورنگ زیب ساکن مانگرائے (تحصیل ہری پور) نے ڈاکٹری پاس کی۔ محکمہ صحت سرحد میں ملازم ہیں۔

۱۹۵۱ء میں قاضی محب الرحمٰن ساکن بیدادی (تحصیل مانسہرہ) نے سند ڈاکٹری حاصل کی۔ ۱۹۵۶ء میں (D.P.H پنجاب) ۱۹۵۹ء میں (T.D.D WALES) اور ۱۹۶۴ء میں ---- (D.T.M & H لورپول سے کیا۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۱ء تک صوبہ سرحد کے مختلف ہسپتالوں میں اسسٹنٹ سرجن رہے۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۷ء تک شمالی نائیجیریا (افریقہ) میں وزارت صحت کے مشیر رہے۔ ۴ دسمبر ۱۹۶۷ء میں ٹماڈر سینیٹوریم کے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ رہے۔ جنوری ۱۹۷۰ء میں پھر نائیجیریا چلے گئے اور ۱۹۷۵ء میں واپس آکر مانسہرہ میں پرائیویٹ پریکٹس شروع کر دی۔

خوش اخلاق، بیماروں کے ہمدرد معالج اور ہزارہ کے قابل فخر ڈاکٹر ہیں۔

ڈاکٹر ناصر الدین اعظم خلف قاضی محمد اعظم مرحوم رئیس نوئر ملک پور نے ۱۹۵۱ء میں ڈاکٹری کی سند حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ چلے گئے۔ وہاں سے (M.R.C.P لندن) اور (M.R.C.P ایڈنبرا) کی ڈگریاں حاصل کیں۔ آج کل (۱۹۷۷ء) میں خیبر میڈیکل کالج میں میڈیسن کے پروفیسر اور مشہور ڈاکٹر ہیں۔

ڈاکٹر مسز ناجرہ جدون نے ۱۹۵۱ء میں سند ڈاکٹری لی۔ اور محکمہ صحت سرحد سے منسلک ہوگئیں۔

۱۹۵۴ء میں ڈاکٹر خالد محمود اور ۱۹۵۴ء ہی میں ڈاکٹر طارق محمود پسران شیخ عبدالحمید مرحوم ساکن ہری پور نے سندات حاصل کیں۔

۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر رب نواز نے ڈاکٹری سند لی اور محکمہ صحت سرحد میں ملازم ہوگئے۔

ڈاکٹر نیر رمضان ساکن لبفہ نے ۱۹۵۵ء میں ایم۔بی۔بی۔ایس کا امتحان پاس کیا۔ صوبہ سرحد کے محکمہ صحت سے منسلک ہوگئے۔ ۱۹۶۸ء میں E.N.T کا ڈپلومہ لاہور سے حاصل کیا۔ بہترین سرجن اور شریف النفس ڈاکٹر ہیں۔ ۱۹۷۲ء سے لیبیا میں تھے۔ اب پشاور میں اپنا کلینک جاری کر رکھا ہے۔

۱۹۵۵ء میں ڈاکٹر محمد بشیر خلف قاضی رحمت اللہ صاحب ساکن ایبٹ آباد نے امتحان ڈاکٹری پاس کیا۔ چند سال ملازمت کی اور اب مانسہرہ میں اپنا کلینک بنا کر پریکٹس کر رہے ہیں۔

۱۹۵۶ء میں ڈاکٹر محمد یوسف ساکن بالاکوٹ نے ڈاکٹری امتحان پاس کیا۔

ڈاکٹر تاج محمد ساکن منگ دنز وکوٹ نجیب اللہ، تحصیل ہری پور، نے ۱۹۵۶ء میں سند ڈاکٹری لی۔ تپ دق کا ڈپلومہ (T.D.D) حاصل کیا اور محکمہ صحت سرحد میں ملازم ہوگئے۔

۱۹۵۵ء میں خیبر میڈیکل کالج پشاور کے بن جانے کے بعد کافی افراد نے ڈاکٹری کی سندات لی ہیں، جن کی فہرست تیار نہ ہو سکی۔

ہزارہ میں نظامِ تعلیم

علم اور اصحابِ علم کی سرپرستی کی روایات اسلامی تہذیب کا ہمیشہ جزو رہی۔ قرآن حکیم میں علم و قلم لازم و ملزوم ہیں۔ قرآن حکیم کو کسی جگہ سے بھی کھولا جائے تو علم، قلم، کتابت سطور، صحف و کتب وغیرہ کا تذکرہ ہر جگہ بکثرت ملے گا۔ اس لئے تعلیم و کتابت مسلمانوں کے آغازِ عہد سے، ہر زمانہ میں خاص شغل بطور فرض رہا۔

اس پر مزید مسلمانوں کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ انہوں نے تعلیم کو نہ کبھی بیچا اور نہ تصنیف کو۔ بلکہ اس کارِ خیر کو بلا مزد و تنخواہ، اپنی زندگی کا مقصد اولین سمجھا۔ کیونکہ ان کو یہ نکتہ خوب معلوم تھا، کہ انسان کو اس زمین کی خلافت علم ہی کی وجہ سے ملی۔

تاریخ ہزارہ کی تدوین کے دوران یہ انکشاف بھی ہوا کہ کامیاب اور فلاح یاب افراد عموماً علماء و مدرسین کی اولاد سے ہوئے۔ وجہ ظاہر ہے کہ ان کے اجداد صاحب علم تھے۔ انہوں نے علم کی تبلیغ و توسیع میں عمریں، مخلصانہ طور پر صرف کر دیں۔ ان کی آمدنی بھی طیب اور شائبہ رشوت سے پاک تھی۔

مسلمان حکمرانوں نے علم کی توسیع میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ خلفائے عباسیہ نے مشرق میں اور خلفائے بنو امیہ نے مغرب میں بیش قیمت یونانی علوم کو جو زوال کی حالت میں تھے، فنا ہونے سے بچایا اور انہیں بنی نوع انسان کے لئے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔

خلافتِ عباسیہ کے زوال پر جو سلطنتیں قائم ہوئیں، انہوں نے ان روایات کو قائم رکھا۔ سلطان محمود غزنوی کا دربار اپنے عہد میں ایشیاء کا سب سے مہذب اور متمدن دربار تھا اور شعراء و فضلاء کے عہد کا بھی مرکز رہا۔

مکتب و خانقاہ

قرونِ وسطیٰ میں اشاعتِ تعلیم اور تربیت اخلاق کے دو بڑے مرکز سمجھے جاتے تھے۔ مدرسہ[١] اور خانقاہ[٢]۔ اگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو اسلامی نظامِ تعلیم میں خانقاہ کو بے حد اہمیت حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بڑے بڑے علماء سندِ فضیلت حاصل کرنے کے لئے خانقاہوں کا رخ کیا کرتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ علم کی بدولت تکبر و رعونت کے جو جراثیم انسانی دل و دماغ میں پیدا ہو جاتے تھے ان کی اصلاح کے تمام سامان انہیں ان ہی خانقاہوں کے حجروں میں میسر آتے تھے۔ چنانچہ جب وہ یہاں سے فارغ ہوتے تو وہ ایثار و خلوص اور للہیت کے پیکر اور اسلامی اخلاق کی زندہ تصویر ہوتے تھے۔ وہ اپنے اعمال و افعال سے اسلام کی اشاعت کا فریضہ سرانجام دیتے تھے۔

زمانۂ سلاطین دہلی

ہندوستان سلاطین دہلی (۱۲۰٦ء تا ۱۵۲٦ء) کے عہد میں علم و فضل کا گہوارہ تھا۔ بلبن کے چالیس سالہ دور (۸۷ - ۱۲٤٦ء) میں علوم و فنون کو نمایاں ترقی ہوئی۔ تاتاری تاخت و تاراج کے بعد سے وسطِ ایشیاء اور ایران کے بے شمار علماء فضلاء پاک و ہند چلے آئے۔ علاؤ الدین خلجی (۱۳۱٦ء تا ۱۲۹٦ء)، اگرچہ خود

ان پڑھ تھا۔ لیکن اس نے ملک میں وہ حالات پیدا کر دئے تھے، جن میں علوم و فنون اور تمدنی ادارے پھلتے پھولتے ہیں۔ محمد بن تغلق سے بڑا عالم دہلی کے تخت پر شاید ہی کوئی بیٹھا ہو۔ اس کے زمانہ میں صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے تھے۔ وہ اہلِ علم کی بے حد قدر کرتا تھا۔ اس کی قدردانی کی خبر سن کر اسلامی ممالک کے بہت سے علماء اور فضلاء دہلی آکر آباد ہو گئے۔ فیروز شاہ کو مذہبیات سے شغف تھا۔ اس نے تیس بڑے مدرسے قائم کئے۔

عہدِ مغلیہ

علم کی سرپرستی کی روایات برابر قائم رہیں اور بہتر ہوتی گئیں۔ ان کے اور ان کے شہزادگان و وزراء کے دربار علم و فضل کا مرکز رہے۔ مغلیہ سلطنت جس طرح جہانبانی میں عروج پر تھی، اسی طرح علم و فضل بھی یہاں عروج پر رہے۔

عہدِ انگریزی میں بساطِ علم الٹ دی گئی۔ انھوں نے اپنی سلطنت کے لئے منشی و کلرک بنانے کے لئے علمی سطح کو پست تر کر دیا۔ اس مقصد کے لئے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد ۱۸۰۰ء میں رکھی گئی۔ انگریزی عملداری سے قبل اس علاقہ میں سرکاری مدارس نہ تھے۔ عہدِ مغلیہ کے آخری دور، درانیوں اور سکھوں کے عہد میں متفرق قصبوں میں مکتب جاری تھے، جن میں بچوں کو دینی تعلیم کے ساتھ نوشت و خواند کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ یہ نوشت و خواند عموماً فارسی میں ہوتی تھی اور ان تینوں حکومتوں کی سرکاری زبان فارسی ہی تھی۔ اردو کا رواج عام نہ تھا۔ شہری علاقوں میں کچھ لوگ اردو میں نوشت و خواند کرتے تھے، جو اس وقت کی مروجہ اردو تھی۔ عام خط و کتابت فارسی میں ہوتی تھی۔ خوانین و رؤسا کے بچے گھر پر ہی اپنے ہاں ملازم استادوں سے پڑھتے تھے۔ انگریزوں کی آمد پر جہاں جہاں نئے قصبات آباد ہوئے یا پہلے سے موجود تھے، وہاں سرکاری مدارس ابتدائی تعلیم کے لئے کھولے گئے۔ مگر دیہات میں وہی پرانا طریقہ بذریعہ مکتب، جو مساجد میں ہوتے تھے، جاری رہے۔ آئمہ مساجد ہی بچوں کو پڑھاتے تھے۔

عہدِ انگریزی

انگریزی تعلیم کی بنیاد ہندوستان میں تعلیمی مقالہ میکالے، جو ۱۸۰۶ء میں شائع ہوا کے بعد

ہی پڑی ۔ اس کے زیرِ اثر ہی سرسید مرحوم نے علی گڑھ میں سکول کی بنیاد رکھی اور ۸ر جنوری ۷۷ ۱۸ء میں علی گڑھ کالج کا افتتاح ہوا ، جو بعد میں یونیورسٹی بن گیا ۔ علمارِ اسلام نے فراستِ مومنانہ سے انگریزی تعلیم کے نتائج کو بھانپ لیا اور اس کے بالمقابل دارالعلوم دیوبند کا آغاز ۱۸۶۷ء سے کر دیا ۔

دیوبند اور علی گڑھ تحریک کا تاریخی پس منظر حضرت سید احمد کی شہادت (۱۸۳۱ء) کے بعد شاہ محمد اسحاق نے حکومتِ ولی اللہی کی ترویج اور اصلاحِ امت کے کام کے لئے مکہ معظمہ کو اپنا مرکز بنایا اور ۱۸۴۲ء میں حجاز چلے گئے ۔ مولانا مملوک علیؒ ، حاجی امداد اللہ اور دوسرے حضرات جو شاہ محمد اسحٰق کے مدرسے کے پرانے طالبعلم تھے ، ان کے افکار کی اشاعت کے لئے جمع ہو گئے اور " دہلوی جماعت " قائم ہو گئی ۔ جو بعد میں دیوبندی جماعت بن گئی ۔ شاہ محمد اسحٰق ۱۸۴۵ء میں اور مولانا مملوک علی ۱۸۵۰ء میں فوت ہو گئے ۔

حاجی امداد اللہ اور ان کے رفقار نے ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں کام کیا ۔ پھر حرمین شریف چلے گئے ۔ محمد قاسم نانوتوی ہندوستان میں حضرت حاجی صاحب کے وکیل بنے اور ان کی کوششوں سے ۳۰ ر مئی ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی گئی ۔ اس سے بارہ سال بعد علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی گئی ۔

نوٹ : واضح رہے کہ مولانا محمد قاسم اور سرسید احمد دونوں مولانا مملوک علی کے شاگرد ہیں ۔

اس تعلیم کی منشار اور روح کو سمجھنے کے لئے اسی میکالے کے مقارا کا قول تھا ۔

" ہم اس تعلیم سے ایک ایسی نسل تیار کریں ، جو بظاہر ہندو یا مسلمان ہو یعنی اس کی ظاہری قبا اپنے ہی مذہب کی ہو ، لیکن اندر خانے وہ یورپی فکر کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہو ۔ اس کے دل و دماغ ، ان کے مذاہب کی روایتوں اور عصبیتوں سے یکسر مختلف ہوں ۔ " اور ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا تھا کہ :

" یہ صحیح ہے کہ ہم ہندوستانیوں کو عیسائی نہیں بنا سکے ۔ لیکن ہم نے انہیں اپنے مذہب پر بھی رہنے نہ دیا ۔ ہندو ہندو رہے نہ مسلمان مسلمان ۔ وہ معاشرتی طور پر ہندو اور مسلمان ضرور ہیں ، لیکن مذہباً ہندو ہیں نہ مسلمان ۔ "

انگریزوں کے اس مقصد کو علمائے نے اپنی مومنانہ بصیرت سے دیکھ لیا تھا اس لئے انگریزی تعلیم کی مخالفت کی تھی۔ اسی پالیسی بربنا بمقالہ میکالے پر ایبٹ آباد، ہری پور اور مانسہرہ میں مڈل سکول کھولے گئے۔ ایبٹ آباد میں انگریزی مڈل ۱۸۷۵ء میں۔ ہری پور میں انگریزی مڈل ۱۸۰۰ء میں کھولے گئے۔ ۱۸۰۰ء میں بی لفہ اور کوٹ نجیب اللہ میں اردو مڈل کھولے گئے۔ ضلع کے ہر تھانہ میں ایک پرائمری سکول کھولا گیا، جن کی تعداد ضلع میں پندرہ تھی۔ ۱۹۰۱ء میں مانسہرہ میں انگریزی مڈل سکول خان بہادر غلام ربانی خان ایڈوکیٹ کی مساعی سے ایک کچے مکان میں مانسہرہ کے شمال مشرقی کونہ میں کھولا گیا۔ خان بہادر خود ہیڈ ماسٹر بنے اور باقی وکلاء مانسہرہ نے استادوں کے فرائض سنبھالے جب چیف کمشنر سرحد سر نارمن بولٹن مانسہرہ کے دورہ پر آیا تو خان بہادر غلام ربانی خان اور ان کے رفقائے اس کا استقبال مانسہرہ شہر کے بھوت کھٹھ کے پل پر کیا۔ پل سے سکول تک سڑک پر ریشمی کپڑوں کا فرش کر دیا گیا تھا۔ چیف کمشنر نے سکول کا معائنہ کیا۔ استقبال اور کارکردگی سکول سے خوش ہو کر اسی وقت حکم دے دیا کہ گورنمنٹ اس سکول کو اپنی تحویل میں لے لے۔ یہ سکول ۱۹۲۶ء میں ہائی ہو گیا۔ ایبٹ آباد میں ۱۹۰۸ء میں ہائی سکول بنا۔

دیہات میں نظام تعلیم عموماً بذریعہ مکتب ہی رہا یا چند پرائمری سرکاری سکول تھے۔ مگر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس وقت کے پرائمری مدارس کے پاس شدہ طلباء آج کل کے میٹرک کے برابر قابلیت رکھتے تھے۔ وجہ زیادہ تر مادری زبان میں تعلیم اور پختہ عمر سے تعلیم کی ابتداء ہوتی تھی۔ اس وقت عموماً سات سال سے اوپر کے بچے پرائمری مدارس میں داخل ہوتے تھے۔ فی زمانہ چار پانچ سال کے بچہ کو داخل مدرسہ کیا جاتا ہے۔ انگریزی مدارس کے خلاف شروع میں علمائے اسلام نے اعتراض کیا۔ علما کا اعتراض اصولاً ٹھیک تھا۔ لیکن حالاتِ زمانہ بدل چکے تھے۔ انگریزوں کی حکومت تھی اور انگریزی زبان کا سکہ جاری تھا اور اسی زبان میں قابلیت، معیار ترقی ٹھہری۔ غیر مسلم یعنی ہندوؤں اور سکھوں نے اس طریقِ تعلیم کو فوراً اختیار کر لیا۔ سرکاری ملازمتوں اور سرکاری کاروبار میں نوکریاں اور روزگار حاصل کرنے میں سبقت لے گئے۔ مسلمان سرکاری ملازمتوں اور دیگر ذرائع روزگار سے محروم ہو رہے تھے اور سکھ، ہندو اقتصادی پہلو سے مسلمانوں پر غالب آ رہے تھے۔ ان حالات کو دیکھ کر سر سید احمد خان مرحوم اور ان کے رفقائے کار نے علماء،

نوٹ۔ اگلے صفحہ پر۔

کے فتووں کی تردید کی اور آخر کار مسلمان بھی انگریزی تعلیم کی طرف راغب ہونے لگے۔ ضلع ہزارہ میں سب سے پہلے ایبٹ آباد ۱۸۶۲ء میں اور پھر ہری پور اور مانسہرہ میں مڈل سکول کھولے گئے۔ یہ ڈسٹرکٹ بورڈ کی تحویل میں تھے۔ سب سے پہلے ایبٹ آباد کا مڈل سکول ۱۲-۱۹۱۱ء میں ہائی سکول بنا دیا گیا۔ اسی سکول سے سر فضل حسین جیسے نامور آدمی نے تعلیم حاصل کی، جو صوبہ پنجاب کا وزیر اور بعد میں مرکزی حکومت کا وزیر ہوا۔ انہی ایام میں ایبٹ آباد کے ہندوؤں نے ایک ہائی سکول بنایا۔ ۱۹۵۰ء تک یہ میٹرک سکول پنجاب یونیورسٹی سے ملحق رہے۔ پہلے طلبأ ہزارہ کو میٹرک کے امتحان کے لئے راولپنڈی جانا پڑتا تھا۔ بعد میں ان امتحانات کے سنٹر یہاں ہی بنائے گئے۔ اس سے کئی سال بعد ہری پور اور مانسہرہ کے مڈل سکول بھی درجہ میٹرک تک بڑھا دئے گئے۔ ادھر دیہات میں بھی چند پرائمری سکول درجہ لوئر مڈل تک بڑھا دئے گئے۔ بتدریج مدارس کے درجات اور تعداد دونوں بڑھنے لگے۔ سال ۱۹۱۲ء تک یہی رفتار قائم رہی۔ اسی سال یعنی ۱۹۱۲ء میں ایبٹ آباد ہری پور اور مانسہرہ کے مدارس سرکاری تحویل میں آگئے۔ اس سے پہلے ڈسٹرکٹ بورڈ کی تحویل میں رہے۔

غیر مسلم اقوام یعنی ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں نے بھی اپنے اپنے الگ مدارس ضلع کے تینوں قصبوں میں کھول دئے۔ ایبٹ آباد میں پہلا غیر مسلم سکول البرٹ وکٹر اینگلو ورنیکلر ویدک مڈل سکول تھا۔ اب یہ ہائی سکول ایبٹ آباد نمبر ۳ ہے۔ جو ۱۹۴۷ء سے پہلے کھولا گیا۔ اسی طرح ہری پور اور مانسہرہ میں بھی ہندوؤں اور سکھوں نے اپنے اپنے ابتدائی مدارس الگ الگ جاری کئے۔ تعداد طلبأ ابتداءً بہت تھوڑی ہوتی تھی، یعنی پرائمری مدارس میں ۲۵، ۳۰ تک مڈل سکول میں ۱۰۰ - ۱۵۰ تک اور ہائی میں ۱۵۰ - ۲۵۰ تک۔

تعلیم نسواں

اس ضلع میں حال ہی میں ہر دلعزیزی حاصل کرنے لگی ہے۔ اس کا رواج ۱۹۴۰ء تا ۱۹۵۰ء سے ترقی پذیر ہوا ہے۔ اب تو ضلع بھر میں زنانہ مدارس، لڑکوں کے پرائمری، مڈل اور سکولوں کے ساتھ ساتھ چل رہے۔ یہاں تک کہ اب مردانہ کالجوں کے ساتھ زنانہ

لے۔ سر سید احمد خان ایک عالی دماغ، عالم، فاضل، مدبر، سیاستدان ایثار و محبت کا سمندر، کوچہ چیلاں دہلی کی خاک سے اٹھا اور ہندوستان پر چھا گیا۔

کالج بھی کھل چکے ہیں۔ ۱۹۲۰ء سے پہلے اس ضلع کے باشندگان کی بی۔اے کی تعداد درجن سے بھی کم تھی۔ سب سے پہلے گریجوایٹ ملک شاہ سوار خان رئیس جاگل تحصیل ہری پور تھے، جو پہلے منصف اور بعد میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں اس ضلع کے صرف دو ایم۔اے تھے، جو محکمہ تعلیم میں بطور معلم ملازم تھے۔

دینی اسلامی تعلیم اس ضلع میں باقی اضلاع سرحد کے مقابلہ میں اچھی ہوتی رہی ہے۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے یہاں چند قدیم علماء خاندان لوگوں کو دینی تعلیم دیا کرتے تھے اور پنجاب و سرحد کے دور افتادہ مقامات سے طلباء یہاں آکر دینی تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ مثلاً موضع ڈھینڈہ میں حافظ جی صاحب (جن کے نام پر آج بھی ڈھینڈہ کا تالاب دین، حافظ جی صاحب کے بن سے موسوم ہے) کا درس۔ جن کی اولاد سے مولینا محمد معصوم صاحب ہوئے، جو شاہ محمد حسنؒ، بانی جامعہ اشرفیہ لاہور، کے استاد تھے اور پیر گولڑہ شریف مولانا محمد معصوم کے ہمدرس تھے۔ ۱۹۰۲ء کے لگ بھگ دینی تعلیم کا مرکز ایبٹ آباد تھا۔ جہاں ایک بلند پایہ عالم و محدث جو درویش صفت انسان تھا، مسجد ایبٹ آباد میں قرآن و حدیث و دیگر علوم کا درس دیا کرتا تھا۔ آپ کا نام نامی الحاج محمد عبدالرحمٰن صاحب گنجوی (موضع گنجہ نزد کوٹ نجیب اللہ تحصیل ہری پور) تھا۔ ان سے پہلے سید انور شاہ صاحب کشمیریؒ، جو بعد میں دیوبند تشریف لے گئے، امام مسجد و خطیب تھے۔ وہ بھی ایک مشہور عالم استاد حدیث، ایک حافظِ حدیث تھے۔ ان کے علاوہ سکندر پور اور درویش د ہر دو مواضعات تحصیل ہری پور) میں علماء دین کے خاندان تھے جو لوگوں کو دین کی تعلیم دیا کرتے تھے۔

فنی تعلیم ۱۹۴۷ء یعنی تقسیم برصغیر سے پہلے اس ضلع میں فنی لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ لیکن اس دور میں چند نامور اشخاص ضلع ہزارہ نے پیدا کئے۔ جنہوں نے یہ تعلیم ضلع سے باہر حاصل کی اور نام پیدا کیا۔ اب تو انشاء اللہ اس میدان میں ضلع ہزارہ کے فرزندان کسی سے پیچھے نہیں۔

اعلیٰ تعلیم پاکستان بننے کے بعد اس ضلع میں بھی اعلیٰ تعلیم کے لئے مردانہ اور زنانہ کالجوں کا افتتاح ہونے لگا۔ چنانچہ اس وقت تین مردانہ کالج (ایک ڈگری کالج ایبٹ آباد ایک ڈگری کالج ہری پور، ایک انٹرمیڈیٹ کالج مانسہرہ، اور ایک زنانہ ڈگری کالج ایبٹ آباد

میں اور ایک زنانہ پائلٹ سکنڈری سکول ہری پور میں چل رہے ہیں۔

ہزارہ کے ممتاز حضرات یا انجمنیں، جنہوں نے میدانِ تعلیم میں یا اشاعت تعلیم میں کوششیں کی تھیں، بہت تھوڑے سے ہیں۔ مثلاً ۱۔ انجمن اسلامیہ ایبٹ آباد۔ ۲۔ ہندو مہاسبھا ایبٹ آباد ۳۔ سنگھ سبھا ایبٹ آباد و ہری پور۔

افراد شیخ نور احمد صاحب مرحوم وکیل لاہوری۔ ۲۔ مرحوم میر ولی اللہ صاحب وکیل ایبٹ آبادی ۳۔ سیٹھ موسیٰ جی مرحوم ایبٹ آبادی۔ ۴۔ رائے صاحب سیٹھ چوہڑ لال۔ ۵۔ رائے بہادر روچارام۔ ۶۔ رائے بہادر رالیشر داس۔ ۷۔ رائے بہادر دیوان چند اوبھرائے۔ ۸۔ خان محمد عباس خان مرحوم ساکن مانسہرہ۔ ان کے علاوہ ضلع کے بعض رؤسا اور خوانین بھی تعلیم میں دلچسپی لیتے رہے۔

دینی مدارس ماہنامہ دار البلاغ، کراچی اپنے ذوالحجہ ۱۳۸۸ھ مطابق مارچ ۱۹۶۹ء میں لکھتا ہے کہ ضلع ہزارہ میں مشہور مدارس عربیہ کی تعداد ۱۳ رمئی ۱۹۵۹ء تک آٹھ تھی۔ یہ مدارس علمائے اسلام نے بے سروسامانی، گوناگوں مصائب اور ناموافق حالات میں بقائے اسلام کے لئے پاکستان کے حصوں میں دین کی مشعلیں روشن کرنے کے لئے بنائے۔ عربی درسگاہوں کے معاشرہ پر مندرجہ ذیل اثرات مرتب ہوئے۔

۱۔ مسلمانوں کو ہندوؤں کی تہذیب میں مدغم ہونے سے بچائے رکھا اور ہندو تہذیب کو اسلامی تہذیب پر غالب نہ ہونے دیا۔

۲۔ مغربی تہذیب سے مسلمانوں کی اکثریت کو محفوظ رکھا۔

۳۔ مسلمانوں پر مسیحی تبلیغ کو جس کی پشت پر انگریزی حکومت تھی کے اثر و رسوخ کو اثر انداز نہ ہونے دیا اور مسلمانوں کو فتنۂ ارتداد سے محفوظ رکھا۔

۴۔ آریہ سماج کی شدھی کی تحریک کے فتنہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

۵۔ انگریزوں نے اسلامی قوت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے جو فتنے بھی اٹھائے ان کو کامیاب نہ ہونے دیا۔

۶۔ یورپی مستشرقین کی تصنیفات کا منہ توڑ جواب دیا۔

۷۔ اسلامی معاشرہ کا اخلاق، اسلامی حیاتِ آثار نمایاں کئے۔

۸۔ عالم اسلامی میں اخوت کے جذبے کو بیدار رکھا اور مضبوط کیا۔

۹۔ پاکستان کے لئے مسلم لیگ تحریک کو کامیاب نظریۂ اسلامی دیا۔

۱۰۔ مسلمانوں کی ہندوستان میں اور پھر خطہ پاکستان میں اکثریت الٰہی کی تبلیغ کا نتیجہ تھی، جس سے غیر مسلم اقوام حلقۂ بگوش اسلام ہو کر مسلمانوں کی اکثریت کا باعث بنیں۔

۱۹۱۱ء میں ضلع ہزارہ کے پرائمری مدارس کے اساتذہ کی فہرست

۱۹۱۱ء میں مندرجہ ذیل پرائمری سکول اور ان کے انچارج استادوں کی فہرست مطابق سرکلر مورخہ ۸ر نومبر ۱۹۱۱ء از دست ڈسٹرکٹ انسپکٹر (عنایت اللہ) درج ہے۔ یہ سرکلر استادان کی موجودہ گریڈ سے دوسرے گریڈ کے لئے ہوا تھا۔ اس سرکلر کے مطابق پرائمری سکولوں کے ان اساتذہ کی تنخواہ دس روپے سے بیس روپیہ ماہوار تک تھی۔

۱۔ عبداللہ خان: مدرس سکول موضع جاگل۔ ۲۔ سید عالم مدرس دھمتوڑ۔ ۳۔ رسول خان مدرس غازی۔ ۴۔ غلام محمد شنکیاری۔ ۵۔ کشن سنگھ سرائے نعمت خان۔ ۶۔ عبداللہ خان تربیلہ ۷۔ کرم چند شیروان۔ ۸۔ نادر علی۔ لالوگلی۔ ۹۔ رام کشن۔ بفہ۔ ۱۰۔ گل محمد۔ گڑھی حبیب اللہ۔ ۱۱۔ ولی احمد۔ مانسہرہ۔ ۱۲۔ شاہ حسین۔ بکوٹ۔ ۱۳۔ فضل احمد۔ بھیرہ (خان پور علاقہ)، ۱۴۔ میر عالم۔ جرید۔ ۱۵۔ محمد اکبر۔ ڈھوڈیال۔ ۱۶۔ محمد حسین۔ اچھڑیاں۔ ۱۷۔ شاہ ولی شمدھڑہ۔ اگرور۔ ۱۸۔ جوالاداس۔ ہری پور۔ ۱۹۔ کرم چند۔ بٹل۔ ۲۰۔ شفیع اللہ۔ شیر پورہ۔ ۲۱۔ محمد شاہ۔ لورہ۔ ۲۲۔ علی مروان۔ رجوعیہ۔ ۲۳۔ ہجرت خان۔ بالاکوٹ۔ ۲۴۔ غلام احمد۔ مانسہرہ۔ ۲۵۔ عبدالرشید۔ دیرہ (لالوگلی)، ۲۶۔ سید گل۔ گیدڑ پور۔ ۲۷۔ فیض عالم۔ ہری پور ۲۸۔ کشن چند۔ سرائے صالح۔ ۲۹۔ متھراداس۔ بفہ۔ ۳۰۔ حبیب اللہ۔ جبوڑی۔ ۳۱۔ ولایت خان۔ بگری ٹوٹیال۔ ۳۲۔ سونارام۔ کھلابٹ۔ ۳۳۔ حمید گل۔ پنیاں۔ ۳۴۔ عبدالرحمٰن داتہ۔ ۳۵۔ شیخ احمد۔ کوٹ نجیب اللہ۔ ۳۶۔ سندرداس۔ نائب، ہری پور۔ ۳۷۔ میر عالم۔ نواں شہر۔ ۳۸۔ علی بہادر۔ سلم کھنڈ۔ ۳۹۔ عطا محمد۔ خان پور۔ ۴۰۔ موہن لال۔ مانسہرہ ۴۱۔ جلال خان۔ باندھی ڈھونڈاں۔ ۴۲۔ میر عالم۔ بگڑہ۔ ۴۳۔ فقیر محمد۔ مانکرائے۔ ۴۴۔ غلام یحیٰی۔ فی الحال متعلم ٹریننگ سکول۔ ۴۵۔ غلام محمد۔ لنگڑیال۔ ۴۶۔ غلام حیدر۔

متعلم ٹریننگ سکول۔ ۴۷۔ حبیب اللہ۔ متعلم ٹریننگ سکول۔ ۴۸۔ عبدالحکیم۔ نواں شہر
۴۹۔ فیروز خان۔ کوٹھیالہ۔ ۵۰۔ ایوب خان۔ نواں شہر۔ ۵۱۔ قاضی احمد۔ اوگی
۵۲۔ محمد جان۔ کوٹ نجیب اللہ۔ ۵۳۔ محمد اسمٰعیل۔ نواں شہر۔

یہ فہرست سینارٹی کے لحاظ سے شروع ہو کر ۵۳ تک چلی گئی ہے۔ مندرجہ بالا اساتذہ سے میں مندرجہ ذیل سے واقف ہوں۔

مولوی عبداللہ خان مدرس جاگل، ضلع ہزارہ میں سب سے سینیر استاد تھے۔ شکل و صورت وجیہہ اور باوقار و مضبوط جسم رکھتے تھے۔

رسول خان میرے والد بزرگوار تھے۔ ان کے مختصر حالات کسی دوسری جگہ تحریر کر دیئے ہیں

مولوی علی بہادر۔ ساکن کوٹ نجیب اللہ۔ بڑے متدین، قابل ترین اور شفیق استاد تھے۔ اپنے شاگردوں کی ہمہ جہت تربیت کرتے تھے اور طالب علموں میں دینی و دنیوی ترقی کی روح پھونک دیتے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں تمام صوبہ سرحد میں سے ان کو بہتر کارکردگی پر پچاس روپیہ انعام ملا۔ آپ کے دو فرزند ہیں۔ محمد اشرف خان چیف اکاؤنٹنٹ پاکستان انڈسٹریل کارپوریشن حال مقیم پشاور، اور محمد اسلم خان ایڈووکیٹ ہری پور میں۔

مولوی حمید گل صاحب۔ ٹاہلی دتر بیلہ مرحوم، کے اخوانزادہ خاندان سے تھے۔ ان کے حالات بھی کسی دوسری جگہ تحریر کر دیئے ہیں۔

کشن چند ساکن کوٹ نجیب اللہ۔ پنیاں میں مولوی حمید گل سے پہلے استاد تھے۔ تجربہ کار قابل اور پرانے استاد تھے۔

مولوی غلام یحییٰ صاحب ساکن بفہ ہیں۔ دینی و دنیوی علوم میں ماہر اور قابل استاد تھے۔ اب فوت ہو چکے ہیں۔ ان کے بیٹے عبدالحکیم خان سابق چیف جسٹس ہائیکورٹ سرحد، ڈاکٹر نیر رمضان اور ایگزیکٹو انجینئر حضرت سلطان خان ہیں۔

ماسٹر فیروز خان مرحوم ساکن بھرہ (نزد پنیاں) کے رہنے والے تھے۔

یہ طبقہ مدرسین ہزارہ کے استادوں کے دوسرے دور سے تعلق رکھتا ہے۔ پہلا دور ۱۸۶۱ء سے شروع ہو کر ۱۹۰۰ء کے قریب ختم ہو گیا۔ تیسرا دور تقریباً ۱۹۴۰ء سے شروع ہو کر اب چل رہا ہے۔

پہلے دور کے استاد عموماً پنجاب و ہندوستان کے تھے۔ ان میں سے ایک مشہور استاد خدا بخش ہندوستانی تھے۔

۱۹۶۸ء میں پرائمری سکولوں کی تعداد

۱۹۶۸ء میں پرائمری سکولوں کی تعداد ۸۱۶ تھی۔ ان میں مندرجہ ذیل دس پرائمری سکول یہ تھے۔

۱۔ ایبٹ آباد ۱۸۷۸ء، ۲۔ بالاکوٹ ۱۸۸۷ء۔ ۳۔ غازی، ۱۸۸۴ء۔ ۴۔ گڑھی حبیب اللہ ۱۸۸۱ء
۵۔ خان پور، ۱۸۷۲ء، ۶۔ لنگڑیاں، ۱۸۷۲ء۔ ۷۔ شیروان ۱۸۹۲ء۔ ۸۔ ہری پور، ۱۸۷۲ء
۹۔ کوٹ نجیب اللہ ۱۸۷۲ء ۱۰۔ سرائے صالح، ۱۸۷۲ء۔

بیسویں صدی کے پہلے تیس برسوں میں کل ۵۴ پرائمری سکول کھولے گئے۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ اربوڑہ، ۱۹۲۰ء۔ ۲۔ بکوٹ، ۱۹۱۳ء۔ ۳۔ بھگنوتر، ۱۹۱۲ء، باندھی میرا، ۱۹۲۰ء
۵۔ ٹبل، ۱۹۰۱ء۔ ۶۔ بائی بالا، ۱۹۲۳ء، ۷۔ چنجاہ ۱۹۲۴ء۔ ۸۔ دھڑیال، ۱۹۱۸ء۔ ۹۔ درگڑی، ۱۹۱۱ء۔ ۱۰۔ ڈھیری نقارچیاں، ۱۹۲۷ء۔ ۱۱۔ گڑھی پھوگراں، ۱۹۱۸ء۔ ۱۲۔ گیدڑ پور، ۱۹۲۷ء۔
۱۳۔ کھی کلاں، ۱۹۳۰ء، ۱۴۔ کواتی، ۱۹۱۴ء، ۱۵۔ نوشالہ، ۱۹۱۴ء، ۱۶۔ لساں، ۱۹۲۶ء۔
۱۷۔ مانکرائے، ۱۹۰۴ء۔ ۱۸۔ منگ، ۱۹۱۲ء۔ ۱۹۔ منگلور، ۱۹۲۶ء۔ ۲۰۔ مرطیقہ کلاں ۱۹۳۰ء
۲۱۔ ملکال، ۱۹۲۲ء۔ ۲۲۔ نجف پور، ۱۹۲۵ء۔ ۲۳۔ نمتال ۱۹۰۸ء۔ ۲۴۔ بھلکوٹ ۱۹۲۸ء
۲۵۔ پھلڑہ ۱۹۱۵ء۔ ۲۶۔ اسرہاں، ۱۹۲۷ء۔ ۲۷۔ سنگر ۱۹۳۰ء۔ ۲۸۔ سچہ کلاں، ۱۹۱۸ء۔
۲۹۔ سگدھر، ۱۹۲۷ء۔ ۳۰۔ صابر شاہ، ۱۹۱۳ء۔ ۳۱۔ شیخ البانڈی ۱۹۱۲ء۔ ۳۲۔ سلہنڈ ۱۹۱۴ء
۳۳۔ سرائے گدائی، ۱۹۲۸ء۔ ۳۴۔ سری کوٹ، ۱۹۱۱ء۔ ۳۵۔ ترنوائی، ۱۹۱۸ء۔ ۳۶۔ تریٹ ۱۹۳۰ء۔ ۳۷۔ مانسہرہ، ۱۹۱۲ء۔ ۳۸۔ تربہ پایاں ۱۹۲۱ء۔ ۳۹۔ ٹانڈہ ۱۹۱۲ء۔ ۴۰۔ اوگرہ ۱۹۱۲ء۔ ۴۱۔ اگی، ۱۹۰۱ء۔ ۴۲۔ بھونجا، ۱۹۲۷ء۔ ۴۳۔ بیدادی ۱۹۳۰ء۔ ۴۴۔ بانڈہ گساج ۱۹۲۷ء۔ ۴۵۔ بھوگڑ منگ، ۱۹۲۷ء، ۴۶۔ بانڈہ پیراں، ۱۹۱۴ء۔ ۴۷۔ باگڑیاں، ۱۹۱۷ء۔
۴۸۔ دیگراں، ۱۹۲۰ء۔ ۴۹۔ حویلیاں اسٹیشن، ۱۹۱۳ء۔ ۵۰۔ جاگل ...... ۵۱۔ جہانگیرہ (ایبٹ آباد تحصیل)، ۱۹۱۲ء۔ ۵۲۔ شنگی (مانسہرہ)، ۱۹۰۸ء۔ ۵۳۔ تھاتھی (مانسہرہ) ۱۹۱۲ء
۵۴۔ پنیاں، ۱۹۰۲ء۔

باقی سب سکول ۱۹۲۰ء سے بعد کے ہیں اور ان سکولوں میں نوے فیصدی کے قریب ۱۹۶۰-۶۸ء کے درمیان کھولے گئے

مڈل اسکول کل تعداد ۶۵ ہے، جن کی تفصیل یہ ہے۔ ۱۔ بجالی۔ مانسہرہ، ۱۸۸۲ء - ۲۔ بریلہ دہری پور) ۱۸۷۲ء - ۳۔ بھیو (علاقہ خان پور) ۱۸۹۶ء - ۴۔ رجوعیہ (ایبٹ آباد) ۱۸۷۳ء - ۵۔ ڈھوڈیال (مانسہرہ) ۱۸۸۵ء - ۶۔ شیر پور (مانسہرہ) ۱۸۸۲ء - ۷۔ دھمتوڑ (ایبٹ آباد) ۱۸۷۲ء - ۸۔ شنکیاری ۱۸۸۵ء سے جاری ہیں۔ اکیس سکول ۱۹۳۰ء تک اور باقی ۳۶ سکول ۱۹۶۸ء تک کے عرصہ میں بنائے گئے۔ ہزارہ کے مڈل سکولوں کے امتحانات ۱۹۰۵ء تک راولپنڈی میں ہوتے رہے۔ ۱۹۰۶-۷ء میں نارمل سکول پشاور میں بن گیا، تو پھر یہ امتحانات یہاں ہی ہوتے رہے۔ انٹرنس کے امتحانات بھی راولپنڈی میں ہوتے رہے۔ اغلباً ۱۹۲۰-۲۱ء تک۔ بعد میں صوبہ سرحد کے مرکزی مقامات پر شروع ہونے شروع ہو گئے۔

ہزارہ کے ہائی سکول

تحصیل ہری پور ۱۔ ہری پور - ۲۔ ہری پور - ۳۔ سرائے صالح - ۴۔ کوٹ نجیب اللہ ۵۔ پنیاں - ۶۔ سری کوٹ - ۷۔ درہند - ۸۔ تربیلہ - ۹۔ غازی۔ ۱۰۔ خان پور - ۱۰۔ ٹیلیفون فیکٹری ہری پور - سرائے نعمت خان - دہری پور میں ایک ٹریننگ سکول برائے جونیر استاداں)

تحصیل ایبٹ آباد ۱۔ ایبٹ آباد، ۲۔ ایبٹ آباد - ۳۔ نواں شہر - ۴۔ خانس پور - ۵۔ بگنوتر ۶۔ حویلیاں - ۷۔ شیروان - ۸۔ لورا - ۹۔ بکوٹ -

تحصیل مانسہرہ ۱۔ مانسہرہ - ۲۔ گڑھی حبیب اللہ - ۳۔ بالاکوٹ - ۴۔ کاغان - ۵۔ لقہ۔ ۶۔ بٹل - ۷۔ اوگی - ۸۔ بگرام - ۹۔ کوزہ بانڈہ - ۱۰۔ منگلور۔

ہزارہ کے کالج

۱۔ ڈگری کالج ایبٹ آباد - ۲۔ زنانہ ڈگری کالج ایبٹ آباد - ۳۔ مردانہ انٹرمیڈیٹ

کالج ہری پور۔ ۴۔ مردانہ انٹرمیڈیٹ کالج مانسہرہ۔

ان سرکاری تعلیم گاہوں کے علاوہ پرائیویٹ اسکول بھی ضلع بھر میں ہیں۔

ضلع ہزارہ کے ڈگری کالج

ضلع بھر میں اس وقت طلباء وطالبات کے ۱۲ سرکاری کالج اور ۱۷۹۱ چھوٹے بڑے سکول ہیں۔ خواندہ افراد کی موجودہ تعداد دو لاکھ سے زائد ہے۔
ان کالجوں اور سکولوں کے علاوہ ضلع کے مختلف حصوں میں ایک ٹیچرز ٹریننگ سکول۔ ایک ڈگری کالج آف کامرس۔ ایک ووکیشنل انسٹی ٹیوٹ اور ایک پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ ہے۔ موجودہ مارشل لاء حکومت نے ۱۹۷۹ء میں ایک میڈیکل کالج (ایوب میڈیکل کالج) ایبٹ آباد میں کھولا۔

بیسویں صدی کے اواخر، ہزارہ کے چند معروف اُستاد وافسران محکمہ تعلیم

۱۔ ملک غلام احمد مرحوم ساکن تلوکر۔ آپ ڈسٹرکٹ انسپکٹر ہزارہ رہے پنشن پر ٹیلیفون فیکٹری کے ہائی سکول میں پرنسپل رہے۔ انہوں نے ہزارہ کے استادوں میں غالباً سب سے پہلے انگلستان سے ڈگری حاصل کی۔ سادگی اور شرافت کا مجسمہ تھے۔ آپ نے ۲۳ جون ۱۹۸۱ء میں وفات پائی۔

۲۔ علامہ ابوالخیر مرحوم، آپ موضع سریہ (نزد کوٹ نجیب اللہ) کے رہنے والے تھے۔ ان کا گھرانہ مذہبی علوم کا سرچشمہ تھا۔ آپ میرے ہم عمر تھے۔ ہم دونوں نے ۱۹۱۲ء میں پرائمری پاس کیا۔ انہوں نے کوٹ نجیب اللہ سے اور میں نے پنیاں سے۔ آپ نے پنشن کے بعد ہری پور میں ایک ماڈرن سکول کھولا۔ جس کے فارغ التحصیل طالب علم سرکاری سکولوں سے بہتر نتائج کے ساتھ پاس ہوتے رہے۔ آپ انتھک اور جرأت آموز استاد تھے۔ ان کے ہمعصر ان کی قابلیت کا لوہا مانتے تھے۔ آپ کی وفات جون ۱۹۷۴ء میں ہوئی۔

بیسویں صدی کے اوائل کے چند پرانے استاد

۳- بخشی امیر چند ہیڈ ماسٹر کورٹ نجیبٹ اللہ۔ مڈل سکول

۴- قاضی عبدالخالق صاحب ساکن ہری پور۔

۵- الحاج ماسٹر غلام یحییٰ صاحب، ساکن بفہ۔

۶- ماسٹر (معروف بہ بابا) حسام الدین صاحب مرحوم۔ ساکن کیہال (ایبٹ آباد) آپ علم ریاضی کے حافظ تھے۔ ۶۷-۱۹۶۶ء سے بوجہ کمزوری نظر سے گوشہ نشین رہے اور ہائی اسکول کی طالب علم لڑکیوں کو گھر پر مفت تعلیم دیتے رہے۔ آپ کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر ضیاالدین صاحب ماہر ریاضی ہیں۔ پشاور یونیورسٹی سے رجسٹرار کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ لیکن افسوس ان کی قابلیت سے قوم و ملک نے فائدہ نہ اٹھایا اور اب تعلیمی شغل سے فارغ وقت گزار رہے ہیں۔ باباجی کی وفات ستمبر ۱۹۷۰ء میں ہوئی۔

۸- قاضی محمد عبداللہ صاحب ساکن خان پور۔ سابق ٹیچر حال وکیل مانسہرہ۔ آپ خان پور کے مشہور قاضی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ دینی و دنیوی علم کے ماہر ہیں۔ ۱۹۷۰ء سے پہلے ہی وکالت بوجہ ضعیف العمری چھوڑ دی۔

افسران محکمہ تعلیم ضلع ہزارہ ڈسٹرکٹ انسپکٹران

حسب خواہش مکمل فہرست نہ مل سکی۔ چند افسران و ہیڈ ماسٹر صاحبان سے تبادلہ خیالات سے جو فہرست بن سکی وہ درج ذیل ہے۔

۱- عبدالغنی صاحب انبالوی غالباً ۱۸۹۷ء۔ ۲- خواجہ احمد حسن صاحب کانگڑوی۔

۳- شیخ فضل الٰہی صاحب ۱۹۰۸ء۔ ۴- مولوی احمد شفیع صاحب وزیر آبادی ۱۹۰۹ء۔

۵- بابو محمد شفیع صاحب سیالکوٹی۔ آپ یہاں آنے سے پہلے دفتر ناظم تعلیم سرحد پشاور میں ہیڈ کلرک تھے۔ فرشتہ سیرت انسان تھے۔ مرض نمونیہ سے اغلباً ۱۹۱۱ء میں فوت ہوئے۔

۶- قاضی عنایت اللہ سیالکوٹی ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۳ء۔ ۷- بابا محمد امین گجراتی ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۰ء حنائی سر اور داڑھی۔ گھوڑوں کے شوقین۔ ۸- مولوی غلام حسین وزیر آبادی۔ ۹- خان صاحب شیخ اللہ دین ۱۹۲۷ء سے ۱۹۲۰ء۔ ۱۰- مفتی عزیز الرحمن صاحب وزیر آبادی ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۲ء

آپ کے وقت سکولوں میں نماز باجماعت پابندی سے شروع ہوگئی۔ وہ نماز باجماعت پر زور دیتے تھے۔ یہاں تک کہ ہندو استاد بھی لڑکوں کو نماز کی تاکید کرنے لگے۔ آپ کسی کی روٹی نہ کھاتے تھے۔ ایک دفعہ باندھی ڈھونڈاں کے خوانین کی روٹی نہ کھائی تو انہوں نے بازار والوں کو بھی روٹی دینے سے منع کر دیا۔ قانون کے سخت پابند تھے۔ کاغذات تحقیق سے پڑھ کر دستخط کیا کرتے تھے۔ ایک اسسٹنٹ نے جب کچھ کاغذات برائے دستخط پیش کئے تو کہنے لگے کہ مسلمانوں کی طرح دستخط کروں یا ہندوؤں کی طرح؟ اور کہا کہ مسلمان دستخط کر کے پھر کاغذ پڑھتا ہے، ہندو پڑھتا پہلے ہے اور دستخط بعد میں کرتا ہے۔ ۱۱۔ مولوی محمد عالم ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۵ء ۱۲۔ شیخ فصیح الدین ۱۹۳۹ تا ۱۹۴۰ء۔ ۱۳۔ حافظ عبدالحمید لاہوری ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۳ء۔ ۱۴۔ بی سی رنڈا بنوچی ۱۹۴۵ء تا ۸ ستمبر ۱۹۴۷ء۔ ۱۵۔ سید نور احمد شاہ ہزارہ ۸ ستمبر ۱۹۴۷ء تا ۲۲ نومبر ۱۹۴۷ء۔ ۱۶۔ مولوی محمد مسعود الرحمٰن صاحب ایم اے۔ ایس اے وی (ہزاروی) ۲۲ نومبر ۱۹۴۷ء تا ۱۲ نومبر ۱۹۵۰ء۔ ۱۷۔ ملک غلام احمد صاحب ہزاروی۔ ایم۔ اے ٹی ٹی (انگلینڈ) ۱۲ نومبر ۱۹۵۰ء تا ۲۰ اپریل ۱۹۵۳ء۔ ۱۸۔ چودہری خیر دین بی اے بی ٹی (پنجابی) ۲۰ اپریل ۱۹۵۳ء تا ۱۵ جولائی ۱۹۵۶ء۔ ۱۹۔ محمد یعقوب خان صاحب بی۔ ایس۔ سی بی ٹی ۱۶ جولائی ۱۹۵۶ء تا ۳۱ دسمبر ۱۹۵۸ء۔ ۲۰۔ عبدالرشید خان صاحب پنجابی۔ بی۔ اے۔ بی ٹی۔ ۲ فروری ۱۹۵۹ء تا ۴ اپریل ۱۹۶۰ء۔ ۲۱۔ غلام حیدر خان۔ بی۔ اے۔ بی ٹی ۴ اپریل ۱۹۶۰ء تا ۱۴ جون ۱۹۶۰ء ۲۲۔ عبدالحمید قریشی۔ بی۔ اے۔ بی ٹی ہنگو کوہاٹ ۱۵ دسمبر ۱۹۶۱ء تا ۱۳ اپریل ۱۹۶۳ء ۲۳۔ سید نور احمد شاہ بی۔ اے۔ بی ٹی ہزاروی ۱۶ اپریل ۱۹۶۳ء تا ۳ مارچ ۱۹۶۷ء تک۔ ۲۴۔ محمد اسحٰق صاحب ایم۔ اے۔ ڈی۔ ۴ مارچ ۱۹۶۷ء تا ۳ مئی ۱۹۶۷ء۔ ۲۵۔ سید نور احمد شاہ بی اے بی ٹی۔ ۴ مئی ۱۹۶۷ء تا حال۔ ۲۶۔ عبدالقادر خان۔ بی۔ اے۔ بی ٹی (ہنگو کوہاٹ) ۱۵ دسمبر ۱۹۶۱ء تا ۱۲ اپریل ۱۹۶۳ء۔ اس کے بعد کی فہرست مکمل نہ ہو سکی۔

ان میں بہت سے حضرات پہلے بطور ہیڈ ماسٹر صاحبان ہائی سکول خدمات سرانجام دیتے رہے اور بعد میں ڈسٹرکٹ انسپکٹر ہوئے۔ ان میں ضلع ہزارہ کے باشندے صرف تین ہی ہیں۔ ۱۔ ملک غلام احمد صاحب (تلوکر)، ۲۔ مولوی مسعود الرحمٰن صاحب گنجی تم ایبٹ آبادی

اور سید نور احمد صاحب دکا خان، باقی سب حضرات پنجاب کے تھے۔

محکمہ تعلیم کے صوبائی اعلیٰ افسران میں سے مفصلہ ذیل اشخاص نے بحیثیت صوبائی انسپکٹر صاحبان اس ضلع کی تعلیمی دجو ضلع راولپنڈی کے انسپکٹر تھے) خدمات ۱۹۱۰ء تک سر انجام دیں اس سے پہلے ہزارہ انسپکٹرہ حلقہ راولپنڈی کے ماتحت تھا۔

۱۔ نیاز علی خان۔ ۲۔ مولوی عمر دین صاحب مرحوم۔ ۳۔ خلیفہ عماد الدین صاحب لاہوری مرحوم۔ آپ بہت عرصہ تک انسپکٹر مدارس رہے۔ ۴۔ خواجہ سجاد حسین صاحب مرحوم (خلف شمس العلماء مولانا الطاف حسین صاحب حالی۔ ۵۔ مولوی فیروز الدین صاحب مرحوم۔ ۶۔ خان صاحب مرزا علی محمد خان صاحب مرحوم۔ آپ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۵ء تک انسپکٹر ورنیکلر صوبہ سرحد رہے۔ آپ کو ذاتی قابلیت و کارکردگی پر انڈین ایجوکیشنل سروس کا ممبر بنایا گیا۔ آپ کی وفات ۱۹۲۵ء میں ہوئی ۷۔ خان صاحب حاجی کریم بخش صاحب مرحوم۔ ان حضرات میں کوئی بھی ضلع ہزارہ کا باشندہ نہ تھا۔

نوٹ۔ ۱۹۰۷ء میں محکمہ آثار قدیمہ کے سربراہ ڈاکٹر سر آرل سٹائن نے عارضی طور پر تمام سرحدی سکولوں کا معائنہ کیا۔ وہ مشرقی زبانوں کا عالم تھا۔ اس نے ایشیا کے اکثر ملکوں کی سیاحت کی تھی اس کی زندگی کا سرمایہ اس کی بیش بہا کتابوں کی لائبریری تھی۔ اس کے زمانہ میں تمام سکولوں کو احکام جاری کئے گئے کہ سال میں ایک دفعہ سب سکولوں کے بچے ارد گرد کے مقامات کا سفر کیا کریں اور ان مقامات کی کیفیت و تاریخی حالات تحریر کیا کریں۔ ان سب حالات کا خلاصہ سکول کا انچارج استاد ڈسٹرکٹ انسپکٹر کو بھیجا کرتا تھا اور پھر سب ضلع کا خلاصہ ڈاکٹر ارل سٹائن کو بھیجا جاتا۔

۱۹۱۰ء میں صوبہ سرحد کے سررشتہ تعلیم کا ڈائرکٹر مسٹر جے۔ اے۔ رچی (RICHEY) مقرر ہوئے اور اس کے ساتھ مرزا علی محمد خان انبالوی انسپکٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۴ء میں انگریزی شعبہ کے امتحانات کے لئے مسٹر گیچ (G.H.GEACH) مقرر ہوئے۔ وہ اساتذہ کے ٹریننگ سکول پشاور کے پرنسپل بھی تھے۔ بہت ہی لائق۔ اس کے آنے سے مرزا علی محمد خان کو ورنیکلر مضامین کا انسپکٹر مقرر کیا گیا اور آپ کو (I.E.S) انڈین ایجوکیشنل سروس کا درجہ دیا گیا۔ ۱۹۲۹ء میں بعارضہ تپ دق انتقال کر گئے۔ صوبہ سرحد تعلیمی شعبہ ان کا مرہون منت

ہے۔ خدا ان کو غریقِ رحمت کرے۔

ضلع ہزارہ، نظامِ عدالت و وکلاء

سلطنت ہائے قدیم مثلاً مغلیہ و درانی کا صحیح حال تو میرے علم میں نہیں کہ ان کے عہد میں اس ضلع میں نظامِ عدالت کیسا رہا۔ آیا قاضی مقرر ہوتے رہے، جیسا کہ شاہانِ اسلام میں دستور تھا یا حکام ضلع خود ہی مقدمات کے فیصلے کرتے رہے۔ آخرالذکر طریقہ ہی قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ تاریخ ہزارہ کے چند واقعات اس نظام پر مندرجہ ذیل روشنی ڈالتے ہیں۔

۱۔ جب چودھری عیسیٰ و موسیٰ سربراہان قوم گوجر میدان ہزارہ، راجپور دیرانا مرکز قوم گوجراں نزد موضع کاہل (نزد کورٹ نجیب اللہ) قوم ترین کے ہاتھوں قتل ہو گئے، تو ان کے ورثاء انصاف حاصل کرنے کے لئے شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں حاضر ہوئے۔

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت کوئی خاص نظامِ عدالت اس ضلع میں نہ تھا یا ممکن ہے کہ یہ تنازعہ چونکہ بین الاقوامی مابین قوم گوجر و قوم ترین تھا، اور مقامی حاکم فیصلہ نہ کر پاتے ہوں۔ یا عدلِ جہانگیری کی شہرت پر ان کو بادشاہ کے دربار سے انصاف کرانے کی زیادہ امید ہو۔ بہرحال قرینِ قیاس یہ ہے کہ اس وقت اس ضلع میں کوئی خاص مقررہ کردہ نظامِ عدالت نہ تھا۔ ہر قوم کا خان یا مقدم اپنے علاقہ کے مقدمات کا خود ہی فیصلہ کرتے رہے ہوں۔

۲۔ عہدِ درانی کا کوئی خاص تاریخی واقعہ میرے علم میں نہیں آیا۔ جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ اس وقت کوئی نظامِ عدالت تھا یا نہ۔ اگر تھا تو کس قسم کا تھا۔

اس ضلع کی جغرافیائی حالت اور سیاسی ماحول ایسا تھا کہ یہ کبھی بھی پوری طرح کسی بادشاہی میں مطیع نہ ہو سکا اور نہ ہی یہ کوئی ایسا زرخیز قطعہ تھا، جس سے کوئی آمدنی ہو سکے۔ لہذا کسی حکومت کو اس کو باقاعدہ طور پر مطیع کرنے اور نظامِ حکومت و عدالت قائم کرنے کا خرچ برداشت کرنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ سب حکومتوں کی توجہ کشمیر کو جانے کے راستہ کو محفوظ رکھنے ہی پر رہی۔ لہٰذا اس سڑک کو پرامن بنانے کے لئے مقامی خوانین کو جاگیریں عطا کر کے یہ مقصد حاصل کیا جاتا رہا۔

۲۔ سکھوں کا عہد تو بدنظمی کے لئے ضرب المثل ہے۔ انصاف کی ضرورت ان کے ہاں کبھی سمجھی ہی نہ گئی۔ ان کے حکام یا سکھ افراد کی آمد کا آوازہ سنتے ہی لوگ اپنے گاؤں جوان کے راستے پر واقع تھے خالی کر کے پہاڑوں پر چلے جاتے تھے۔ تو انصاف کے لئے ان کے ہاں حاضر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان کی سکھ شاہی انصاف کے متعلق موضع ڈھینڈہ تحصیل ہری پور کا ایک مقدمہ جو زبان زدِ عام ہے، شاہد ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ کسی نامی چور کو نمبردار موضع موسم خان نے سکھ حاکم کو رپورٹ کر کے پکڑوا دیا۔ سکھوں کے کارندوں نے چور کو گرفتار کر کے گاؤں میں پھانسی دینے کے لئے انتظام شروع کیا۔ یہ سزا بر سرِ عام دی جاتی تھی اور ڈھولکی بجا کر لوگوں کو جمع کیا جاتا تھا۔ جب ایک سکھ ڈھولکی بجا رہا تھا اور لوگ جمع ہو گئے تھے تو چور جو سکھوں کے انصاف کے کاروبار سے واقف تھا ان کے سامنے کسی پر الزام لگا دینا اس کو مجرم بنا دینا ہے۔ شہادت و صفائی کا وہاں گزر نہ تھا، لہٰذا اس نے موسم خان کو بھی اپنے ساتھ شامل کرنے کے لئے اس پر الزام لگا دیا اور کہا ؎

موت دی ڈھولکی نہ مار سکھا   میں اور موسم خان کدے دے یار سکھا

جب اس نے یہ کہا تو موسم خان نے اپنی جان بچانے کے لئے فی الفور کہا ؎

موت دی ڈھولکی، دب دب کے مار سکھا   نہ چور، نہ چوراں دے یار سکھا

یہ ضلع ۱۸۴۹ء میں جب انگریزوں کے تسلط میں آیا۔ تو امن و امان کا دور دورہ شروع ہوا تو اور محکموں کی طرح عدالت ہائے انصاف کے ادارے بھی قائم کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ سکھوں کے وقت تو انتظام کی یہ حالت تھی کہ دار السلطنت لاہور میں شاہی کاروبار بھی زبانی ہوتا تھا۔ حکم حاکم مرگِ مفاجات۔ مہاراجہ کی زبان سے جو نکلا اس پر عمل درآمد کر دیا گیا۔ نہ شہادت نہ ریکارڈ نہ اپیل، لہٰذا انصاف کہاں۔ مختلف دفاتر حکومت بھی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے آخری دور میں قائم ہوئے۔

عہدِ انگریزی

اہلِ ہزارہ سکھوں کے ظلم و تشدد سے اتنے بیزار تھے کہ ۱۸۴۸ء میں میجر ایبٹ یکے از معمارانِ سلطنت انگریزی ریذیڈنٹ لاہور کا نمائندہ اور ناظم ہزارہ (سکھ حاکم) کا مشیر ہو کر اس ضلع میں آیا، تو لوگوں نے فوراً ہی حق و انصاف کی طلب کے لئے

سکھ حاکم کے ہوتے ہوئے، اس کا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ حکومت سکھوں کی، حاکم سردار چتر سنگھ، فوج سکھوں کی۔ میجر ایبٹ کے اہل کار سکھ اور سکھ حکومت کے ملازم حتیٰ کہ میجر ایبٹ کا محافظ دستہ (PERSONAL BODY GUARD) بھی سکھ سپاہیوں کا تھا مگر صورتِ حال یہ تھی کہ لوگ تمام ضلع ہزارہ اور چھچھ، گھیب، کھاٹڑ اور پوٹھوار سے اپنی عرضیاں اور مقدمات میجر ایبٹ کے سامنے پیش کرتے تھے۔ وہ اپنی ڈائری اپریل ۱۸۴۸ء تا جون ۱۸۴۹ء میں اپنے روزانہ معمول کے تحت لکھتا ہے کہ وہ گیارہ بجے دن سے تا غروبِ آفتاب لوگوں کی عرضیوں کے جواب دینے اور مقدمات کے فیصلہ کرنے میں صرف کرتا تھا۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سکھوں کی حکومت اور اس کا رعب دلوں سے اٹھ چکا تھا اور معلوم ہے کہ جب حکومت کا رعب و وقار دلوں سے اٹھ جائے تو جسموں پر تھوڑی مدت ہی رہ سکتا ہے۔ سکھوں کے معاملہ میں تو یہ بہت ہی عارضی رہا اور مارچ ۱۸۴۹ء میں انگریزوں کی حکومت کا پختہ عمل درآمد شروع ہو گیا۔

اس طرح جب تک انگریزی سلطنت کی عظمت و رعب کا اثر ہندوستانیوں کے دلوں پر رہا تو یہ سلطنت مستحکم رہی۔ جب اس حکومت کا اثر دلوں سے زائل ہوا تو سو سال کی حکومت کا قصر چند سال میں ہی زمین بوس ہو گیا۔

اس نکتہ کو گاندھی جی نے خوب سمجھا اور اس کے عمل آزادیٔ ہندو پاکستان کا سورج طلوع ہوا۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ جب گاندھی جی نے آزادی کا علم بلند کیا تو اہلِ وطن سے اپیل کی کہ اگر اسے ایک لاکھ قومی رضا کار اور ایک کروڑ روپیہ جمع کر دیا جائے تو وہ انگریزوں کو ایک سال کے اندر ہندوستان سے نکال دے۔ اس کی اپیل پر ایک لاکھ رضا کار بھرتی ہو گئے اور ایک کروڑ روپیہ بھی جمع ہو گیا۔ لیکن انگریز اس سال کے اندر ملک سے نہ گئے۔ اگرچہ اس نے ان رضا کاروں اور چندہ سے ہندوستان کے طول و عرض میں آزادی کا بگل اس زور سے بجایا کہ انگریزوں کا تختِ حکومت ہل گیا۔ نام باقی تھا مگر جان نکل چکی تھی۔

اس پر کسی نے گاندھی جی کو خط لکھا کہ ایک سال گزر گیا۔ مطلوبہ روپیہ اور رضا کار بھی آپ کو مل گئے لیکن انگریز کی حکومت ابھی باقی ہے۔

اس نے ہفتہ وار انگریزی اخبار ینگ انڈیا (نوجوان ہند) میں جواب دیا کہ "ہم نے سفید چمڑی کا رعب ہندوستانیوں کے دلوں سے اٹھا دیا۔ اب جسموں پر یہ تھوڑا عرصہ ہی رہ سکے گا"۔ جواب مدلل اور علمی تھا اور انجام کار صحیح بھی ثابت ہوا۔

میں مضمون، نظام عدالت، سے دور نکل گیا۔ میجر ایبٹ ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۳ء تک اس ضلع کا حاکم اور پہلا ڈپٹی کمشنر تھا اور انتظامی و عدالتی نظام کا وہی سربراہ تھا۔ اس مقصد کے لئے وہ ہزارہ کے مختلف مقامات پر کیمپ لگاتا رہا اور عدالت کرتا رہا۔

بعد میں نہ معلوم کب سے۔ اول اول اس ضلع میں ایک انگریز افسر بطور افسر خزانہ مقرر ہوا۔ جس کو چھوٹا صاحب (یعنی ڈپٹی کمشنر سے چھوٹا اور موجودہ نام اسسٹنٹ کمشنر) کہا جاتا تھا، جو ضلع کے مالی معاملات کا سربراہ ہوتا تھا اور فوجداری مقدمات کی عدالت بھی کرتا تھا اور ضلع میں ایک افسر مال ہوتا تھا۔ ایک ڈسٹرکٹ جج ایبٹ آباد میں مقیم تھا۔

تھیکر ز انڈین ڈائرکٹری ۱۹۱۵ء کے مطابق ۱۵-۱۹۱۴ء میں ۱۔ خان بہادر محمد عبدالکریم خان داخلیاً کنڈی، ڈیرہ اسمٰعیل خان، بہ مشاہرہ ۸۰۰/- روپیہ ماہوار ہزارہ کے ڈسٹرکٹ جج تھے۔ ۲۔ خان بہادر حمیداللہ خان (ساکن طورو۔ مردان)، اسسٹنٹ کمشنر ایبٹ آباد۔ کیپٹن یول (R.A. YULEA) اسسٹنٹ کمشنر مانسہرہ تھے۔ مہتمم خزانہ ہزارہ رائے بہادر رسالدار کاشی نند اور مہتمم بندوبست خانصاحب بابو فضل حق بمقام اوگی تھے۔

تحصیلدار

۱۔ آغا سردار علی خان ساکن پشاور۔ ہری پور۔
آپ خان بابا خان قزلباش کے فرزند تھے۔ بہت ہی خوش مزاج اور بذلہ سنج تھے۔ مؤلف کے دوست تھے۔ یکم جنوری ۱۹۴۱ء میں وفات پائی۔

۲۔ غلام حیدر خان۔ ایبٹ آباد۔

۳۔ عبداللہ خان۔ مانسہرہ۔

۴۔ محمد ایوب خان۔ اوگی۔ یہ کوہاٹ کے خوانین سے تھے۔

ضلع ہزارہ کے منصف

۱۔ لالہ گھنی شام داس۔ ایبٹ آباد۔
۲۔ لالہ بہاری لال۔ ہری پور۔

آنریری مجسٹریٹ

۱- خان صاحب سلطان محمد خان - ساکن بیٹر -

۲- خان بہادر رسالدار محمد امان خان - سید خانی - ساکن کھلابٹ -

۳- خان بہادر محمد حسین خان - مانسہرہ - (آپ ۱۹۲۹ء میں مجسٹریٹ درجہ اول کے اختیار رکھتے تھے -) جس کو آجکل سینئر سب جج کہا جاتا ہے - ایبٹ آباد اور مانسہرہ کے لئے ایک ہی منصف ہوتا تھا اور ہری پور کے لئے الگ - مانسہرہ میں ایک اسسٹنٹ کمشنر عرصہ قدیم سے رہا کرتا تھا - لیکن ہری پور میں ۱۹۳۶ء سے ایک ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر (E.A.C) ہوا کرتا تھا - پاکستان بننے کے کچھ عرصہ بعد ہری پور ایک سب ڈویژن بنا اور اسسٹنٹ کمشنر مقرر ہوا - اوگی میں ایک اے - ای - سی بعد میں مقرر ہوا - اور اب ۶۸ - ۱۹۶۷ء میں ایک اسسٹنٹ کمشنر ضم شدہ علاقہ کے لئے مقرر کیا گیا -

۱۹۱۸ء میں اس ضلع میں تین یا چار اعزازی مجسٹریٹ تھے - خان بہادر محمد حسین خان مانسہرہ میں - راجہ جہانداد خان آف خان پور جو کبھی خان پور اور کبھی ہری پور میں عدالت کرتے تھے - خان سلطان محمد خان آف بیٹر - وہ ہری پور اور ایبٹ آباد میں عدالت کرتے تھے - ۱۹۱۸ء سے بعد مجسٹریٹ سرکاری و اعزازی میں کام کی زیادتی کی وجہ سے ایزادی کر دی گئی - اور اب ہزارہ کی کمشنری بن جانے سے مجسٹریٹ بھی زیادہ ہو گئے ہیں -

وکلا ہزارہ

عہدِ ماضی میں ہزارہ کے سب وکلار ایبٹ آباد ہی میں رہتے تھے - ابتدائی وکلار ہزارہ وایبٹ آباد کلب کے حالات چودہری محمد علی صاحب وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی نے حسب ذیل تحریری درخواست پر عنایت فرمائی " انیسویں صدی میں ضلع ہزارہ میں کوئی وکیل نہ تھا - ایک سلمان مختار ہوا کرتا تھا جس کا نام انکو

لہ - مولوی عبدالرحمن صاحب المعروف اجی جی مالک کمپنی عبدالرؤف اینڈ برادرز نے بتایا کہ ان کا نام مرزا علی محمد تھا - وہ پشاور کے رہنے والے تھے - فارسی دان اور شاعر بھی تھے - ان کی ایک رباعی بھی بتائی - مالدار سکر سیم و زر نخورد - سال از مرگ پیشتر نخورد بعد مرگش زنش ز قوت زر - کیر ہا مے خورد کہ خر نخورد - اگرچہ رباعی عریاں ہے - لیکن ہے عبرت آموز -

یاد نہیں رہا)، جو عدالت ہائے ضلع میں مقدمات میں پیش ہوتا تھا۔ اس نے اردو میں قانون کا امتحان پاس کیا تھا۔ بیسویں صدی کے شروع میں رائے بہادر روچا رام مقامی تاجر عمارتی لکڑی کے دو بیٹے، پرمانند اور پربھ دیال، انگلینڈ سے بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے آئے اور ایبٹ آباد میں پریکٹس شروع کی۔ بعد میں لالہ پربھ دیال سرکاری وکیل ہزارہ پشاور کے لئے، بعدالت سیشن جج پشاور مقرر ہو گئے۔ اس وقت ہزارہ اور پشاور کا ایک ہی سیشن جج ہوتا تھا اس لئے وہ پشاور چلے گئے۔

انہی ایام میں دیوان چند اوبرائے، مصنف کتاب قانون پنجاب ہدایت نامہ (THE PUNJAB REFERENCES) چکوال سے آکر یہاں مقیم ہو گئے۔ بعد میں سرکاری وکیل مقرر ہونے پر وہ بھی پشاور منتقل ہو گئے۔ رائے صاحب پرمانند ۱۹۴۷ء (تقسیم برصغیر پاک و ہند) تک ایبٹ آباد میں پریکٹس کرتے رہے۔ ۱۹۰۵ء، ۰۷ کے درمیان شیخ نور احمد ایڈووکیٹ (والد شیخ محمد مرحوم و پروفیسر عزیز احمد) امرتسر سے یہاں تشریف لائے۔ آپ کی وفات ۱۹۴۷ء میں ہوئی۔

ان کے بعد رائے صاحب مہتہ منگل سین آئے اور ۱۹۰۹ء میں یہاں پریکٹس شروع کی۔ چودھری محمد علی صاحب نے جب ۱۹۲۱ء میں بی اے، ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا تو کارآموزی کے لئے انہی کے شاگرد بنے۔ چھ ماہ بعد مہتہ منگل سین بھی سرکاری وکیل بن کر پشاور منتقل ہو گئے۔

یہ امر باعث فخر ہے کہ ایبٹ آباد کی جماعت وکلاء ہی سے بہت سے افراد پشاور ڈویژن کے سرکاری وکیل منتخب ہوتے رہے۔

چودھری محمد علی صاحب نے جنوری ۱۹۲۲ء میں اپنی پریکٹس شروع کی۔ ۱۹۳۰ء میں پبلک پراسیکیوٹر بنے۔ ۱۹۴۹ء میں ایڈووکیٹ جنرل ہو کر پشاور چلے گئے۔ وہاں ان کے پاس قلمدان ایڈووکیٹ جنرل، سیکرٹری قانون اور قانونی مشیر کا تھا۔ آپ ۱۹۶۲ء میں پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے اور ۱۹۶۹ء کے آخر میں ریٹائر ہوئے۔ وفات ۲۴۔ اگست ۱۹۷۱ء میں ہوئی۔ ایبٹ آباد میں آپ کے والد بزرگوار چودھری علی بخش آئے وہ اینگلو ورنیکلر مڈل سکول ڈیرہ غازی خان میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہاں سے ان کی تبدیلی ضلع ہزارہ گزشتہ صدی کے اواخر میں ہو گئی۔ بعد میں وہ یہاں عدالت ڈسٹرکٹ جج کے ہیڈ کلرک ہو گئے۔ ان کے پانچ فرزند تھے اور آجکل صرف چودھری محمد علی ہی بقید حیات ہیں۔ چودھری محمد علی کے بڑے بھائی نے علی گڑھ کالج سے بی اے کیا اور وہ مولانا محمد علی جوہر

کے ہم جماعت تھے۔ انہوں نے ہیڈ ماسٹری سے پنشن لی۔ چودھری صاحب کے دو بھائی انجنیئر تھے اور ایک بھائی جن کی وفات دسمبر ۱۹۶۰ء میں ہوئی انکم ٹیکس افسر تھے۔ ان کے ایک بھائی چودھری محمد رحیم (انجینئر) سے میرے دوستانہ مراسم رہے۔ خوش خلق اور دوست نواز انسان تھے۔ آخر عمر میں مرض گنٹھیا کا شکار ہوئے اور اسی سے جان ہار گئے۔ خدا بخشے خوب انسان تھے۔

میر ولی اللہ صاحب ۱۹۱۲ء میں زمرہ وکلاء میں شامل ہوئے۔ وکلاء ایبٹ آباد کی جماعت اس جلیل القدر شخص کی موجودگی سے مزید شہرت و عزت کی مالک ہوئی آپ ۱۹۲۲ء میں وکلاء کی بزم کے صدر چنے گئے اور ۱۹۵۴ء تک (جب آپ لاء کالج پشاور یونیورسٹی کے پرنسپل ہوئے۔ آپ ہی صدر رہے۔ آپ کی وفات دسمبر ۱۹۶۶ء میں ہوئی۔ آپ کشمیری نژاد تھے۔ آپ کے والد بزرگوار مولوی سلطان میر صاحب جو قانون ہی سے معاش حاصل کرتے تھے۔ عربی اور فارسی کے جید عالم تھے۔ وہ چکوال سے آئے تھے۔ پہلے پہل مڈل سکول ایبٹ آباد (حال ہائی اسکول نمبر ۱) میں۔ بعد میں عرائض نویس ہو گئے۔ شعر و سخن میں خاصہ ملکہ تھا۔ یہ ان ہی کے فیض صحبت کا اثر تھا کہ میر صاحب علم و ادب کے آسمان پر مہتاب بن کر چمکے۔

میر صاحب حافظ و خیام کے شارح تھے۔ لسان الغیب۔ حافظ کے کلام کی شرح چار جلد میں تصنیف فرما کر ارباب ذوق سے خراج تحسین حاصل کیا۔ خود بھی غزل گو شاعر تھے۔ اقبال کی شاعری کی طرح میر صاحب کی شاعری بھی ہمارے قلب و روح کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرتی ہے۔ رباعیات فارسی موسوم بہ "بادۂ ناب" میں توحید باری، فلسفۂ زندگی اور حالاتِ حاضرہ پر دلنشین پیرایہ میں اظہارِ خیالات کیا ہے۔ حکیم عمر خیام کی شرح "کاس الکرام" نے تصوف اور فلسفہ کے اہم مسائل کو خوش اسلوبی سے سلجھا کر رکھ دیا۔ ایک مجموعہ، طنز آمیز مگر خوشگوار مضامین موسوم بہ "ماہ و پروین" شائع کیا۔

اردو میں "گلبانگ" مختلف عنوانات پر قطعات اور بعض فرنگی شعراء کے منظوم ترجموں کے علاوہ بیشتر حصہ غزلوں کا ہے، شائع کیا۔ اس میں بہت سی غزلیات بھی ہیں۔ میر صاحب کے پاس انگریزی کے علاوہ علوم مشرقی کا بے بہا اور نہایت قیمتی کتب خانہ تھا جو اپنی موت سے پہلے ہی پشاور یونیورسٹی کو دے دیا تھا۔ حکایت لذیذ ہے اور دراز ہوتی جا رہی ہے

لیکن میر صاحب مرحوم کی ذات اس تذکرۂ طویل کے لائق بھی ہے۔ میر ولی اللہ صاحب مرحوم کی پیدائش ۱۸۰۳ء اور وفات ۱۴ ردسمبر ۱۹۶۶ء ہے۔ آپ کے والد صاحب مولوی سلطان میر صاحب کریالہ دچکوال، پنجاب سے یہاں آئے۔ اپیل نویسی، وثیقہ نویسی کا شغل اختیار کیا اور اپنے فن میں تلؔ ودلؔ کے صحیح مصداق تھے۔ شاعر بھی تھے اور روایت ہے کہ میر صاحب مرحوم کی دوسری شادی جو ۳۰ ردسمبر ۱۹۱۷ء میں ہوئی کا سہرہ بھی انہوں نے خود لکھا اور خود ہی پڑھا۔

میر صاحب کی ابتدائی تعلیم ایبٹ آباد میں ہوئی۔ اس کے بعد اسلامیہ سکول میں ماسٹر ہو گئے۔ پھر گورنمنٹ سکول کے سیکنڈ ماسٹر۔ بعد میں مشن کالج لاہور سے سندِ فضیلت حاصل کر کے وکالت کا جبخہ بھی اسی دار السلطنت سے زیبِ وستار کیا۔ زندگی کے آخری سالوں میں مجھے ان سے گاہے گاہے ملنے کی سعادت حاصل ہوتی رہی۔ وہ رؤف برادر زمپپ پر شام کے وقت تشریف لاتے اور میں بھی وہاں جایا کرتا۔ ان کی شعر وادب کی نکتہ سنجی سے لطف اندوزی میسر ہوتی رہتی۔ آخری بیماری تک ان کا دماغ اور حافظہ کی گرفت ٹھیک تھی۔ ہزاروں اشعار یاد تھے اور سنا سکتے تھے۔ ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

یہاں پر میر صاحب کی زندگی کا ایک واقعہ قارئین کی ضیافت طبع کے لئے درج کرتا ہوں مولوی عبدالرحمٰن صاحب (المعروف اے جی)، ملک رؤف پمپ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ وہ اور میر صاحب مرحوم ہری پور جا رہے تھے اور دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے کہ سرائے صالح کے نزدیک جب موٹر باغات کے درمیان سے گزری تو بادِ خزاں کے ایک جھونکے نے چند پژمردہ پتے موٹر کے اندر میر صاحب کی گود میں پھینک دیئے تو انہوں نے فوراً یہ شعر پڑھا ؎

برگ ایں ریزد - آں گل بیفشاند
ہم خزاں ہم بہار در گزر است

مسٹر جے دیوا بار ایٹ لار پسر سیٹھ چوہڑ لال ربانی آریہ سکول ایبٹ آباد) ۱۴ ۱۹۱ء میں ڈیرہ اسمٰعیل خان سے ایبٹ آباد آیا اور پریکٹس شروع کی اور آخر کار بینائی سے محروم ہو گیا۔ اس کے بعد ۱۶-۱۹۱۵ء میں مسٹر رام پرکاش صوبجات متحدہ (U.P) ہندوستان سے آیا۔ وہ پاکستان

بننے کے بعد چلاگیا۔ ۱۹۱۹ء میں خان بہادر غلام ربانی خان بی اے ایل ایل بی کر کے مانسہرہ میں کام شروع کیا، جہاں ایک اسسٹنٹ کمشنر کی عدالت تھی اور آنریری مجسٹریٹ خان بہادر محمد حسین خان مرحوم و خان محمد حنیف حال مرکزی وزیر اطلاعات کے جدِ بزرگوار تھے، ان ایام میں گورنمنٹ سرحد نے فیصلہ کیا کہ پشاور ڈویژن کا ایک سیشن جج ہزارہ کے مقدمات ایبٹ آباد میں سنا کرے۔ ان ایام ۱۹۰۱ء سے بعد، جبکہ یہ صوبہ ایک چیف کمشنر کے ماتحت تھا ایک ایڈیشنل کمشنر بمنزلہ ہائیکورٹ تھا۔ ۲۷-۱۹۲۶ء میں ایک ایڈیشنل جوڈیشل کمشنر مقرر ہوا اور اس منصب پر پہلے خان بہادر سعدالدین خان (ساکن ڈیرہ اسمٰعیل خان ثم پشاوری)، مقرر ہوا۔ مقدمات مال کی عدالت اپیل ریونیو کمشنر کی تھی۔ یہ سب افسران چیف کمشنر کے ساتھ گرمیوں میں چار ماہ کے لئے نتھیا گلی میں رہتے تھے جس سے اہل مقدمہ اور اہالیانِ گلیات کو فائدہ پہنچتا تھا۔ بعد میں جوڈیشل کمشنر اپنی عدالت ایبٹ آباد میں تا قیام پاکستان کرتا تھا۔ لالہ رام بھایا دیوان چند اوبرائے کے رشتہ دار تھے ۱۹۲۰ء میں یہاں ——— پریکٹس شروع کی۔ وہ آخرکار سرحد کا ایڈیشنل جوڈیشل کمشنر بنا اور پاکستان کے قیام پر ہندوستان چلاگیا اور آسام ہائیکورٹ کا جج بنادیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں علی اصغر خان ساکن سفیدہ اور مولوی غلام غوث ہاشمی نے ایل ایل بی کیا۔ علی اصغر نے مردان میں پریکٹس شروع کی اور ۵-۱۹۷۴ء وہاں ہی گوشہ نشین ہو کر خود نوشت سوانح تحریر کر رہے ہیں۔ ان ہی ایام میں شیخ محمد عبداللہ صاحب نے بھی ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی اور مولوی غلام غوث نے ان دنوں ہری پور میں پریکٹس شروع کی۔ اب یہ دونوں وفات پا چکے ہیں۔ ہری پور میں منصف کی عدالت کے علاوہ ایک جوڈیشل ای۔اے۔سی کی عدالت بھی ان ایام میں مقرر ہو چکی تھی۔

پیر زمان شاہ اور محمد نعمان خان طاہر خیلی نے ۱۹۲۲ء میں مانسہرہ میں پریکٹس شروع کی ۱۹۲۱ء میں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کی عدالت مستقل طور پر ایبٹ آباد میں مقرر ہوگئی۔ ۱۹۲۱ء میں لالہ گوبند سہائے اور لالہ لچھمن داس نے پریکٹس شروع کی۔ ۱۹۲۲ء میں مہتہ رام جی داس ساکن کوٹ نجیب اللہ۔ اور قاضی رحمت اللہ مرحوم ساکن ایبٹ آباد نے وکالت شروع کی۔ ۱۹۲۲ء میں وکلاء نے اپنا کلب بار کلب (اور ٹینس کلب)، شروع کیا۔ انتخاب میں میر ولی اللہ صاحب صدر، لالہ رام پرکاش نائب

صدر - لالہ رام لبھایا سیکرٹری، چودھری محمد علی جائنٹ سیکرٹری اور کلب سیکرٹری ٹینس، مقرر ہوئے - اس وقت کل گیارہ وکلار تھے - غیر وکلار کو بھی ممبر بنایا جاتا تھا - لیکن کلب کے انتظامی معاملات میں ان کو ووٹ دینے کا حق نہ تھا - یہ عہدہ دار تا قیام پاکستان رہے - صرف لالہ رام لبھایا کی جگہ جو جج ہو کر چلے گئے قاضی رحمت اللہ کو سیکرٹری بنا دیا گیا - اپنے وقت میں اس کلب نے بڑے نامور لوگ قانون اور عدالت کے محکموں کے لئے پیدا کئے - بار کلب کے ممبر عموماً سیاست میں حصہ نہیں لیتے تھے - سیاسی گرمی (بقول چودھری محمد علی صاحب) محمد سرور خان تارخیلی مرحوم کی آمد سے (۲۲ - ۱۹۳۰ء) میں شروع ہوئی - محمد سرور خان طاہر خیلی ہزارہ کے ایک قابل فرزند تھے - (شروع شروع میں ملازمت کی - ۱۹۲۱ء میں ہری پور میں جوڈیشنل ای - اے - سی تھے) انہی کی بدولت ہزارہ کو سیاسی اہمیت حاصل ہوئی اور پہلی بار ان کی مساعی ہی سے سرحد کی مجلس وزارت میں اہل ہزارہ کی جانب سے خان محمد عباس کو وزیر لیا گیا -

۱۹۳۰ء میں سجاد احمد جان صاحب نے ایبٹ آباد میں پریکٹس شروع کی - کامیاب وکیل رہے - ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۶ء پبلک پراسیکیوٹر اور گورنمنٹ پلیڈر رہے - ۱۹۵۹ء میں مغربی پاکستان ہائیکورٹ کے جج مقرر ہو گئے - مارچ ۱۹۶۸ء میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے جج مقرر ہو گئے - وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد چیف الیکشن کمشنر مقرر ہوئے - ۱۹۷۷ء کے انتخابی ہنگامہ کے بعد ریٹائر ہو گئے - سیاسی طور پر مسلم لیگ سے وابستہ رہے - ہزارہ کی ضلع مسلم لیگ کے بانی ممبروں میں سے تھے کافی عرصہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے ممبر رہے - قائداعظم مرحوم نے ان کو صوبہ سرحد کے پارلیمنٹری بورڈ کا ممبر نامزد کیا - ۱۹۳۹ء میں مسلم اکثریت کے صوبجاتی مشن، خیر خواہانہ مشن (GOOD WILL) کے ممبر کی حیثیت سے مسلم اقلیتی صوبوں کا دورہ کیا - بہت اچھا علمی ذوق رکھتے ہیں - بزم علم و فن ایبٹ آباد کے بانی ممبروں سے ہیں - اسی بزم کے پلیٹ فارم سے جسٹس کیانی مرحوم نے اپنے مشہور "افکار پریشان" کے لیکچر دئے تھے - آپ ۱۹۶۰ء سے بہت سے قانونی اور علمی اداروں کے ممبر اور سرپرست ہیں -

رائے بہادر دیوان چند اور سردار نیرو تم سنگھ بار ایٹ لار، جو پبلک پروسیکوٹر بھی تھے - ایبٹ آباد کے مشہور وکلار میں سے تھے - قاضی اسد الحق (۱۹۳۵ء) قاضی محمد صادق (۱۹۳۳ء) نور الٰہی خان ۱۹۳۹ء / خان سردار بہادر خان ۱۹۳۶ء میں ایبٹ آباد کے مشہور اور قابل وکیل ہوئے -

قاضی اسدالحق صاحب سول لا رمیں منفرد تھے۔ قاضی محمد صادق ذہین اور قابل وکیل ہیں نکتہ رس دماغ پایا ہے اور انتخابی قوانین کے ماہر ہیں۔ نور الٰہی خان مرحوم ایک قابل وکیل، دیانت دار افسر اور بہترین دوست تھے۔ وہ ۱۹۴۷ء میں بحیثیت مجسٹریٹ سرکاری ملازمت میں منسلک ہو گئے ہو گئے۔ اپنی قابلیت، محنت اور دیانت کے بل پر نام اور ترقی حاصل کی۔ صوبائی اور مرکزی وزارتِ قانون میں ڈپٹی سیکرٹری رہے۔ بعد میں کل پاکستان انکم ٹیکس عدالتِ اپیل کے صدر ہوئے اور کراچی میں قیام رکھتے تھے۔ ۲۶ر جنوری ۱۹۶۹ء میں دفعتہً عارضہ دل سے کراچی وفات پائی، ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھی مرنے والے میں

خان سردار بہادر خان ایک مشہور و معروف سیاستدان ہیں مسلم لیگ میں بہت کام کیا۔ مرکزی حکومت پاکستان میں کافی عرصہ وزیر مواصلات رہے۔ اپنے عہدِ وزارت میں ہری پور ٹیلیفون فیکٹری، پاکستان کی واحد ٹیلیفون فیکٹری قائم کی۔ بہترین پارلیمنٹرین ہیں۔ ان کی زندگی کے حالات اس کتاب میں دوسری جگہ تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔

مفتی محمد ادریس، مولانا خلیل الرحمٰن المعروف خان مولوی صاحب ساکن بھیر کنڈ کے منجھلے فرزند ہیں۔ قریشی خاندان اور ہاشمی النسل ہیں۔ دورانِ تعلیم ہمیشہ اول آتے رہے۔ عربی، فارسی، اردو اور پشتو میں پنجاب یونیورسٹی سے آنرز (اعزازی ڈگریاں) حاصل کیں۔ ایم اے ایل ایل بی گولڈ میڈلسٹ علی گڑھ ہیں۔ مفتی محمد ادریس صاحب مانسہرہ کے نامور وکیل ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں ایڈووکیٹ ہوئے۔ ابتداءً مانسہرہ میں پریکٹس شروع کی اور جلد ہی صفِ اول میں آ گئے۔ ۱۹۵۳ء میں تقریباً ۹ ماہ پبلک پراسیکیوٹر رہے۔ ۱۹۵۹ء میں ایبٹ آباد میں کام شروع کیا۔ یہاں بھی فوراً ہی اپنا مقام حاصل کر لیا۔ قانون کی تینوں شاخوں فوجداری، مال اور دیوانی کے ماہر ہیں۔ ان تھک کام کرنے والے ہیں۔ وکالت کے ساتھ ساتھ سیاستِ وطن میں بھی بھرپور حصہ لیتے ہیں اور اس میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ زمانہ طالب علمی سے تحریکِ پاکستان سے وابستہ رہے۔ ۱۹۵۰ء میں جب لیاقت علیخان نے سرحد مسلم لیگ کی تنظیمی کمیٹی مشتمل بر اکیس ممبران بنائی تو اس کے ایک رکن مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں پاکستان نیشنل گارڈ میں فوجی تربیت حاصل کی۔ سیاسی جلسوں کے پراثر خوش بیان مقرر اور نڈر بولنے والے ہیں۔ پاکستان کونسل مسلم لیگ کے جائنٹ سیکرٹری ہیں اور مسلم لیگ ہزارہ

کے صدر رہے۔عزم و ہمت سے اپنی کثیر المشاغل زندگی کو خوش اخلاقی اور کامیابی کے ساتھ نباہ رہے ہیں۔اگرچہ ہزارہ کے قابل ترین فرزند ہیں لیکن بوجوہ اب تک اپنا اعلیٰ جوڈیشل مقام جس کے وہ ہر طرح سے حقدار ہیں کے لئے منتخب نہ کئے جا سکے۔

وہی میری کم نصیبی وہی تیری بے نیازی
مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال نے نوازی

شیخ محمد عبداللہ مرحوم۔آپ ہری پور کے پرانے وکیل، خاموش طبیعت اور خوش اخلاق انسان تھے۔اپنے کام سے غرض رکھتے تھے اور بس۔ لالہ رام سرن و لالہ رام جی داس۔ یہ دونوں کوٹ نجیب اللہ کے رہنے والے تھے۔ لالہ رام سرن، دراز قد، خوش شکل اور سادہ مزاج وکیل تھے۔لوگ ان کی خوش اخلاقی کے گرویدہ تھے خان بہادر محمد زمان خان ساکن کھلابٹ تحصیل ہری پور، جو آنریری مجسٹریٹ درجہ اول تھے۔یہ ان کے مشیر قانونی اور صلاح کار رہے۔ان کی وکالت پاس کرنے کی تاریخ معلوم نہ ہو سکی۔لیکن یہ یاد ہے کہ وہ ۱۹۳۱ء میں وہ وکالت میں مشہور ہو چکے تھے۔ ہری پور میں پریکٹس کرتے تھے۔لالہ رام جی داس۔یہ ایبٹ آباد میں پریکٹس کرتے تھے۔ان کے والد ماسٹر امیر چند صاحب پرانے ماہر تعلیم تھے۔انیسویں صدی کے آخری بیس سال میں کوٹ نجیب اللہ اردو مڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔میرے والد مرحوم نے ان کی شاگردی کی اور ۱۸۸۹ء میں پرائمری پاس کی اور یہ ۱۹۲۲ء تک اغلباً وہ ہیڈ ماسٹر رہے۔میں نے ان کو ۱۹۲۱ء میں دیکھا تھا۔اسی نوے سال کی عمر کے معلوم ہوتے تھے۔صحت بہت اچھی تھی اور مضبوط جسم رکھتے تھے۔قد سات فٹ سے کچھ ہی کم ہوگا۔لالہ رام جی داس ان ہی قابل ماہر تعلیم کے بیٹے تھے۔شرافت کے مجسمہ تھے۔ ۱۹۲۲ء میں ایڈووکیٹ ہوئے اور دھیمی ہوتی تھی۔اپنی قانونی مصروفیتوں کے ساتھ ضلع ہزارہ کی ریڈ کراس کے آنریری سیکرٹری بھی رہے۔بڑی قابلیت اور حسن انتظام سے اس ادارہ کو پروان چڑھایا۔موجودہ ہیلتھ سنٹر ایبٹ آباد ان کے زمانہ سیکرٹری شپ کی یادگار ہے۔شعر و شاعری کا چسکہ بھی رکھتے تھے۔ان کا ایک شعر نور الٰہی خان سنایا کرتے تھے، جو انہوں نے ایبٹ آباد میں ایک پردہ شاپ کھولنے کے ضمن

میں کہا تھا ۔

بے پردہ عورتوں نے کھولی ہے، پردہ شاپ
پردے کے پیچھے ہوتا ہے، کیا کاروبار، دیکھ

۱۹۴۷ء میں پاکستان بننے کے بعد ترک وطن کر گئے۔ مولوی غلام غوث مرحوم ایڈوکیٹ ہری پور۔ آپ ایک دینی خاندانِ مماہیہ (نزد کھلابٹ) کے چشم و چراغ تھے۔ طبیعت نیک اور مذہبی پائی تھی۔ پیر اعوان شریف پنجاب کے مرید تھے۔ دوست و احباب کے قدردان تھے میرے مہربان دوست اور مخلص رفیق تھے۔ قرآن و حدیث کے عالم اور متدین انسان تھے۔ چلم زیادہ پینے کی وجہ سے آخر عمر میں ضیق النفس میں مبتلا ہو گئے اور اسی مرض سے جان جاں آفریں کے حوالہ کر دی۔ ۱۹۲۰،۲۱ء میں ایڈوکیٹ ہوئے اور ۱۹۶۴ء میں وفات پائی۔

ایبٹ آباد کے چند اور معروف وکلاء

۱۔ صاحبزادہ محمد الیاس مرحوم ساکن کوٹھہ۔ آپ کوٹھہ ڈٹوپی اتمان زئی، دے کر یہاں ہی پریکٹس شروع کر دی۔ فوجداری مقدمات میں بہت شہرت تھی اور جرح کے ماہر تسلیم کئے جاتے تھے۔ ۱۹۶۷ء میں فوت ہوئے۔

۲۔ سردار بہادر خان آف تلوکر ہری پور۔ آپ ایک ماہر وکیل ہیں۔ مال، آپ کا خاص مضمون ہے۔ عالم باپ کے قابل فرزند ہیں۔ ان کے والد مرحوم مولوی محمد خان صاحب میرے استاد تھے۔ تعلیم میں ماہر اور تنظیم سکول کے بہترین مدبر استاد تھے۔ سردار بہادر خان ان کے سب سے چھوٹے فرزند ہیں۔ قابلیت اور شرافت کے مجسمہ ہیں۔

۳۔ سردار محمد صادق صاحب لورہ۔ ایک شریف النفس، ہنس مکھ اور سادہ طبیعت کے انسان ہیں۔ کافی عرصہ ریڈ کراس سوسائٹی کے آنریری سیکرٹری رہے۔ تین چار سال سے (۱۹۷۰ء سے) کمزوریٔ صحت کی بناء پر اپنے گھر تشریف لے گئے ہیں۔

۴۔ لالہ امجید اس کے بعد وہ ریڈ کراس کے آنریری سیکرٹری ہوئے۔ بڑی دیانت سے اپنا فرض پورا کیا۔ آخر بیماری و کمزوریٔ صحت پر مستعفی ہو گئے۔

۵۔ ایبٹ آباد میں ایک اور کامیاب اور قابل وکیل مسٹر فضل حسین ہیں۔ بہت مصروف

اور اپنے فرض منصبی سے ہی شغف رکھتے ہیں۔ ۱۹۵۰ء میں بی-اے-ایل ایل بی بھی کیا۔ تجربہ و قابلیت کے لحاظ سے صف اول کے وکیل ہیں۔

۶۔ سید عبدالسلام سرور بھی اونچے طبقہ کے ایڈوکیٹ اور مشہور وکیل ہیں۔ آپ تحصیل مانگلور مانسہرہ کے مردم خیز علاقہ کے رہنے والے ہیں۔ آپ کے بڑے بھائی سید عبداللہ شاہ صاحب عالم و ادیب بے بدل ہیں اور لاہور میں مقیم ہیں۔ شاید قاضی رحمت اللہ صاحب مرحوم کا ذکر ادھورا ہی رہ گیا۔ وہ ایک ذہین وکیل، مجلس آراء دوست اور بذلہ سنج انسان تھے۔ اونچے درجہ کے وکیل تھے۔ عدالتیں بھی ان کی رائے کا بہت احترام کرتی تھیں۔ ان کے لطائف تو بے شمار سنے ہیں لیکن مندرجہ ذیل دو لطائف نور الٰہی خان کی زبانی حسب ذیل ہیں۔

ایک دفعہ موسم سرما میں سردار محمد صادق وکیل آف لورا صبح سویرے بار روم میں آگئے۔ انہوں نے ایک کالی قراقلی ٹوپی پہن رکھی تھی، جس پر سے کان سے متعلق حصہ سے بال اڑے ہوئے تھے۔ قاضی صاحب مرحوم کی رگِ ظرافت پھڑکی اور فوراً کہا کہ آج سردار صاحب داڑھی کی حجامت کے ساتھ، ٹوپی کی بھی حجامت کرا آئے ہیں۔

دوسرا لطیفہ: ایک دن ۳۳، ۱۹۳۲ء میں مسٹر کرشن لال وکیل نے تمام وکلاء کو اپنے نئے تعمیر شدہ مکان کی رسمِ افتتاح کے لئے چائے پر مدعو کیا۔ کسی نے پوچھا کہ گھر کا نام کیا رکھا ہے۔ ایبٹ آباد میں مکان کے سامنے کے نظارہ پر عموماً موسوم کیا جاتا تھا۔ مثلاً (PINE VIEW) چیڑھ نظارہ۔ اس مکان کے سامنے سے شہر کا ایک بڑہ گندہ نالہ گزرتا تھا۔ قاضی صاحب نے فوراً کہا (DRAIN VIEW) (منظر نالہ عفونت)، آپ ۱۹۵۲ء میں فوت ہوئے۔

۷۔ حافظ محمد داؤد صاحب مہاجر۔ پرانے اور سلجھے ہوئے ایڈوکیٹ ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے یہاں مقیم ہیں۔ آپ حافظِ قرآن ہیں۔ تجوید اور صحت کے ساتھ قرآن پڑھنا ان کا ہی حصہ ہے۔ ہر رمضان شریف میں بہ حصول ثواب مسجد شہزادہ بخارا لوئر ملک پورہ میں قرآن سناتے ہیں۔ فرشتہ صورت انسان ہیں۔ دین و دنیا دونوں کو خوب نباہ رہے ہیں۔ اوائل ۱۹۷۰ء میں عارضہ قلب سے فوت ہوئے۔

مانسہرہ کے چند وکلاء۔ ۱۹۳۰ء میں غلام ربانی خان ایڈوکیٹ کا ڈنکا مانسہرہ میں بجتا تھا۔ آپ

سیاست میں خوب حصہ لیتے تھے۔ اپنے فن میں خوب ماہر تھے۔ مدت سے صحت کی کمزوری کی بناء پر خانہ نشین ہو گئے ہیں۔

مفتی محمد ادریس صاحب کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ موجودہ وقت میں محمد اکبر خان صاحب مشہور وکیل ہیں۔ مانسہرہ کے ایک پرانے وکیل قاضی محمد عبداللہ صاحب ہیں۔ عالم فاضل انسان ہیں۔ آپ اصلاً خان پور کے رہنے والے ہیں۔ چالیس سال سے زائد مانسہرہ میں اقامت گزین ہیں۔ شروع شروع میں مانسہرہ میں صرف ایک وکیل (مختار) تھے۔ جن کا اسم گرامی عبداللہ شاہ تھا۔ آپ اس وقت کی زبان فارسی ہی میں قانون کے عالم تھے۔

ہری پور کے وکلاء قاضی محمد اکرم خاندان قاضیاں ساکن سکندر پور کے ممتاز فرد تھے۔ زندگی سادہ لیکن حریت ضمیر کے مجسمہ تھے۔ آپ قاضی محمد اسلم مرحوم ایڈووکیٹ کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کی سب اولاد نیک اور صاحب کردار ہے۔ آپ کا انجام بھی بہت ہی اچھا ہوا۔ آپ ۱۹۷۵ء حج کے لئے تشریف لے گئے اور وہاں ہی وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

سلطان محمد خان ترین ساکن ریحانہ۔ تحریک آزادی کے سرگرم مگر خاموش رکن پرانے وکیل تھے۔ مئی ۱۹۷۰ء میں وفات پائی۔

ہزارہ کے وکلاء کی یہ فہرست نامکمل ہے۔ صحت کی کمزوری، ہمت اور وسائل کی کمی کی وجہ سے موجودہ وکلاء کی فہرست مکمل نہ ہو سکی، جن کی تعداد بہت کافی ہے۔ ان میں بہت سے نوجوان وکلاء ہیں۔ جن سے قوم و ملک کی بہتری کے لئے امیدیں وابستہ ہیں۔

نظامِ پولیس

مفصل حالات اس باب کے لئے نہ مل سکے۔ کیونکہ پرانا ریکارڈ تلف کیا جا چکا ہے۔

تاریخی طور پر یہ معلوم ہے کہ میجر ایبٹ (ہزارہ کے پہلے ڈپٹی کمشنر) نے ۱۸۴۷، ۴۸ء میں چتر سنگھ حاکم ہزارہ کے دوران بے قاعدہ فوج بصورت پولیس بھرتی کی تھی۔ خیال ہوتا ہے کہ اسی کو ۱۸۵۲، ۵۳ء میں پولیس کے محکمہ میں بدل دیا گیا۔ اس امر کی تائید ایک

سرٹیفکیٹ مورخہ ۲۳ اپریل ۱۸۵۲ء سے ہوتی ہے۔ جو میجر ایبٹ نے اس ضلع کا چارج دینے کے بعد قائم خان پنی کو دیا۔ انہی دنوں میں سید خانی خوانین کھلابٹ کی تعیناتی بصورت کوتوال ہوتی تھی۔

قائم خان پنی کے سرٹیفکیٹ میں میجر ایبٹ لکھتا ہے۔

"قائم خان پنی نے اپنی خودداری، عزتِ نفس اور حیاداری سے اپنے بیٹوں کو پولیس میں بھرتی کرانے کی خواہش ظاہر نہ کی، حالانکہ اس کے بیٹوں کا حق فائق تھا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس بعد میں ہوا جب میں اس کا مداوا نہ کر سکتا تھا۔ اس کی مخلصانہ خدمات کا صلہ نہ دے سکنے پر مجھے افسوس ہوا۔"

اس ابتدائی پولیس کے قائم ہونے پر قلندر خان برادر میر زمان خان، سید خانی کھلابٹ ۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۴ء تک پیادہ لیوی (بے قاعدہ فوج) اور اس کے بعد ۱۸۶۶ء تک پولیس میں خدمات انجام دیتا رہا۔

عبداللہ خان برادر میر زمان خان ساکن کھلابٹ ان ایام میں ہری پور کا کوتوال تھا۔

تاریخ ہزارہ، مرتبہ ویس مہتمم بندوبست ۱۸۷۲ء کے مطابق مندرجہ ذیل جگہوں پر تھانے تھے۔ جن میں انسپکٹر، ڈپٹی انسپکٹر، سارجنٹ، سوار اور سپاہی مقرر تھے۔

۱۔ غازی ۔ ۲۔ تربیلہ ۔ ۳۔ کربلیاں ۔ ۴۔ ہری پور ۔ ۵۔ خان پور ۔ ۶۔ ایبٹ آباد ۔ ۷۔ ناڑہ ۔ ۸۔ بکوٹ ۔ ۹۔ شنکیاری ۔ ۱۰۔ اوگی ۔

۱۸۷۵ء میں محمد اکبر خان بن آزاد خان بن نجیم خان برادر قائم خان پنی بہ عہدہ کنسٹیبل بھرتی ہوئے اور ذاتی قابلیت اور کارکردگی کی وجہ سے جلد ہی تھانے دار ہو گئے۔

ان کے واقعات کے علاوہ مزید معلومات اس محکمہ کے متعلق نہ مل سکیں اور یہ باب ادھورا ہی رہ گیا۔

صنعتی ترقی

اگرچہ صنعتی ترقی کی رفتار ہزارہ میں خاصی سست ہے تاہم اس وقت تک ضلع کے مختلف حصوں میں ٹیلیفون انڈسٹریز آف پاکستان کے علاوہ کپڑے کے دو کارخانے ہیں۔ ایک سیمنٹ فیکٹری، چار ماچس فیکٹریاں، صابن سازی کے دو کارخانے اور پانچ رولر فلور مل ہیں۔ چند سوپ سٹون کی ذاتی فیکٹریاں بھی ہیں حال ہی میں ایک سرکاری کھاد فیکٹری ہری پور میں بنی ہے۔

باب چہاردہم (۱۴)

ضلع ہزارہ کے چند تاریخ ساز افراد اور تاریخی مقامات کا ذکر

ضلع ہزارہ کی تسمیہ اور اس میں آباد مختلف اقوام کے مفصل حالات، کتاب میں کسی دوسری جگہ تحریر کئے جا چکے ہیں۔ اس باب میں مختلف موضعات کا تاریخی پس منظر، ان میں آباد اقوام، اور ان کے سرآوردہ اشخاص کے حالات کا ذکر کرنا مقصود ہے۔

ہزارہ کا نام ابتداءً میدان ہزارہ (تحصیل ہری پور) کے مواضعات پر حاوی تھا اور ہزارہ قارلق تھا۔ امیر تیمور نے ۱۳۹۸ء میں اس میدان میں اپنی فوج، ایک ہزار کا بٹالین (جو ترک قارلق قبیلہ پر مشتمل تھا، کو آباد کیا۔ جس سے اس علاقہ کا نام "ہزارہ قارلق" پڑ گیا اور امتداد زمانہ سے زبانوں پر صرف "ہزارہ" رہ گیا۔

امیر تیمور نے یہ قارلق رجمنٹ، سلاطین پکھلی، جو ترک تھے اور تیرھویں صدی (چنگیزی ترکوں کے حملوں سے بعد) یہاں آباد ہو گئے اور اس علاقہ پر حکمران تھے۔ ان کی مدد کے لئے ان قارلق ترکوں کو مغربی سرحد پر آباد کیا۔ یہ میدان ہزارہ چھچھ پر بھی مشتمل تھا اور عہدِ مغلیہ میں ہزارہ قارلق کا مالیہ اور سرکاری وجوہات قلعہ اٹک کے سرکاری خزانہ میں داخل ہوا کرتے تھے، لہٰذا قیاس ہے کہ چھچھ کا علاقہ بشمول ہزارہ، ایک ہی ملک تھا۔ اور یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ پرانی تاریخوں میں اس خطہ، ملک ہزارہ کو چھچھ ہزارہ سے موسوم کیا جاتا رہا۔ اس قیاس کو اس امر سے بھی تقویت ملتی ہے کہ عہدِ مغلیہ اور عہد درانی میں ہزارہ کا تعلق حاکم اٹک سے رہا۔

لہٰذا اس ضلع کی حدود زمانہ ماضی میں اٹک تک ہونا ایک تاریخی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ بعد کی حکومتوں نے (سکھوں اور انگریزوں) نے اپنی انتظامی مصلحتوں کی بنا پر اس ضلع کا تعلق اٹک (چھچھ) سے توڑ دیا اور ان کو پنجاب سے ملا دیا۔ باقی ضلع ہزارہ یعنی پکھلی سرکار کا تعلق درانیوں کے عہد میں کشمیر کے حاکم سے رہا۔ سکھوں کے ابتدائی عہد میں، کچھ مدت تک ہزارہ کا تعلق راولپنڈی سے رہا۔ لیکن ۱۸۲۱ء (جب ہری سنگھ نلوہ، حاکم ہزارہ نے ہری پور کا قلعہ اور شہر آباد کر لیا)، تو حاکم قلعہ میں رہنے لگا اور یہی ہزارہ کی حکومت کا مرکز رہا۔ یہاں ہی سکھ حکومت کے خلاف ترینیوں کی جنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ سکھوں سے پہلے ترین ہی میدان ہزارہ میں درانی حکومت کے تحت حکمران تھے۔ ان کی حکومت نجیب اللہ خان کے عہد ۱۷۶۲ء تا ۱۷۹۹ء تک رہی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا محمد خان اور پھر پوتا غلام خان حاکم رہا۔

سکھوں سے آویزش کے بعد جب انگریز آئے تو ان سے بھی یہ برد آزما رہے۔ آخر غلام خان کی گرفتاری (۱۸۴۹ء)، بحکم میجر ایبٹ کے ساتھ ہی ان کا اقتدار ختم ہو گیا۔

تحصیل ایبٹ آباد، تنولیوں اور جدونوں کا اقتدار رہا۔ یہ دونوں اقوام، سلاطین پکھلی کے زوال کے بعد ہی برسر اقتدار آئیں۔ سلاطین پکھلی کا دور ۱۷۱۲ء تک رہا۔ جس کو آخرکار سواتیوں نے زیر قیادت سید جلال بابا درہم برہم کر دیا اور علاقہ پکھلی و ٹگرام پر قبضہ کر لیا۔ ترکوں کے وقت، دارالخلافہ گلی باغ تھا۔

انگریزوں کے عہد میں ہر سہ تحصیل ہری پور، ایبٹ آباد، مانسہرہ کا دارالحکومت ایبٹ آباد مقرر ہوا جو ۱۸۵۳ء کے بعد میجر ایبٹ (ہزارہ کا پہلا ڈپٹی کمشنر)، کے نام پر آباد ہوا اور آج تک ضلع کا ہیڈ کوارٹر ہے۔

۱۹۷۰ء میں حکومت نے اعلان کیا ہے کہ ہزارہ کو ڈویژن بنایا جائے گا اور ضلع کے بجائے اس ڈویژن کا نام ہزارہ ہوگا۔ اس کے تین ضلع ہوں گے۔

۱۔ ضلع ایبٹ آباد جس میں تحصیل ہری پور شامل ہو گی۔

۲۔ ضلع مانسہرہ۔ جس میں ٹگرام شامل ہو گا۔

۳۔ ضلع کوہستان۔

ضلع اٹک کی تاریخ چونکہ مدت مدید تک ہزارہ کا تعلق اٹک سے رہا۔ لہٰذا اس قلعہ کی تاریخ جو عبرت آموز ہے، درج ذیل ہے جو جنرل میاں حیار الدین مرحوم (ساکن سرخ ڈھیری ضلع مردان)، کے ایک مضمون جو "پاکستان ٹائمز" میں مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۵۲ء شائع ہوا کی تلخیص ہے۔

اٹک کا قلعہ، اکبر بادشاہ نے فوجی ضرورت، خاص کر یوسف زیوں کے ملک کی تسخیر کے لئے بنایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک شہر موسوم بہ "اٹک بنارس" بنایا۔ دوسرا بنارس تو ہندوستان میں ہندوؤں کا مرکز ہے، جس کو امتیاز کے لئے کٹک بنارس کہا جاتا ہے۔ اس شہر کی مساجد، مندروں، محلات اور عام آبادی کے کھنڈرات شاہراہ پشاور، اٹک کے مشرق میں اب تک موجود ہیں۔

قلعہ اٹک کی تاریخ اس قلعہ کی بنیاد مغل شہنشاہ اکبر نے ۱۴ ارخورداد ۹۹۱ھ (اگست ۱۵۸۱ء) بوقت ظہر محمد حکیم مرزا حاکم کابل پر فتح پانے کی خوشی میں رکھی۔ اس کی یاد کے لئے سنگ مرمر کی ایک تختی موری دروازہ پر لگائی گئی، جس پر یہ شعر کندہ کرایا گیا تھا۔

پسر شاہانِ عالم، شاہ اکبر ۔۔۔ تعالی اللہ شانہ، اللہ اکبر

ابجد کے حساب سے ۱۵۸۱ بنتے ہیں۔

قلعہ کی جنگی اہمیت اس ست شمال کی جانب سے آنے والے حملہ آور پر نظر رکھی جا سکتی ہے۔ اس کی فوری ضرورت اکبر بادشاہ کے سوتیلے بھائی مرزا حکیم حاکم کابل کے حملہ کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ ان دنوں میں اکبر بادشاہ بہار اور بنگال کی مہموں میں مصروف تھا اور ملک میں دین الٰہی (جاری کردہ اکبر بادشاہ کے خلاف سلطنت میں بحرانی حالت تھی)، اس وقت سے فائدہ اٹھانے کے لئے مرزا حکیم اپنے وزرار کے کہنے پر حملہ کر دیا اور بہت سے علاقہ پر بلا مزاحمت قبضہ کر لیا۔ یہاں تک کہ اس کے ایک شاعر نے اس کے سکے پر اندراج کے لئے یہ شعر بھی تجویز کر دیا ؎

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ وارثِ ملک است محمد حکیم

مرزا محمد حکیم کی افواج لاہور پر بڑھ رہی تھیں، کہ دہلی میں اکبر بادشاہ کو اس کی اطلاع

ملی۔ اس پر اکبر بادشاہ نے اپنے جرنیلوں کو اس حملے کو پسپا کر دینے کا حکم دے دیا۔ محمد حکیم کا خیال تھا کہ اکبر ابھی بہار بنگال میں ہو گا۔ لیکن وہ وہاں سے فتح پا کر دہلی آ چکا تھا۔ بادشاہ کی موجودگی اور اس کے جرنیلوں کے جوابی حملہ کی تاب نہ لا کر، محمد حکیم جلدی سے کابل کی طرف بھاگ گا۔ اس کے تعاقب میں شاہزادہ مراد تھا، جس نے مرزا حکیم کی افواج کو کابل خورد کے مقام پر مکمل شکست دے دی اور کابل میں داخل ہو گیا۔ تین دن بعد شہنشاہِ اکبر بھی کابل پہنچ گیا۔

اس وقت یہ خیال اکبر کے دل میں پیدا ہوا کہ دریائے اٹک پر ایک بڑا قلعہ بنانا چاہیے۔ جو مستقبل میں اس قسم کے حملوں کا سدباب کر سکے۔

اس قلعہ کی تعمیر کا کام خواجہ شمس الدین خافی (جو بعد میں پنجاب کا دیوان ہوا) کے ذمہ کر دیا گیا۔ اس نے بادشاہ کی ہدایات کے مطابق یہ قلعہ دو سال دو ماہ میں تیار کر دیا۔

ملا عبدالقادر بدایونی اپنی کتاب میں تحریر کرتے ہیں:

"ربیع الثانی ۹۹۱ھ (۱۵۸۱ء) میں اکبر بادشاہ نے قلعہ بنانے کا حکم دیا۔ جس کا نام اس نے اٹک بنارس (کٹک بنارس داڑلیسہ سے امتیاز کی خاطر) نام رکھا۔"

اکبر بادشاہ نے دریا عبور کرنے کے لئے کشتیوں کا گھاٹ بنوایا اور دریا جمنا کے کنارے سے بہت سے ملاح لا کر یہاں آباد کر دیئے اور ان کے اخراجات کے لئے نزدیک کے ایک گاؤں کی آمدنی ان کے اخراجات کے لئے مقرر کر دی، جو اب تک ان کی اولاد (جو ملاحی ٹولہ کے گاؤں میں آباد ہے) کو ملتی ہے۔

جب قلعہ تیار ہو گیا تو اکبر بادشاہ نے ۱۵۸۵ء کے شروع میں اس کا معائنہ کیا اور چند ماہ یہاں رہا۔ دوسری دفعہ ۱۵۸۸ء میں یہاں آیا۔ تانبے کے سکے بنانے کے لئے ایک دارالضرب (ٹکسال) یہاں بنوایا۔ جو دُرانیوں کے عہد تک رہا۔

قلعہ کا محل وقوع یہ قلعہ شاہراہ عام پر پشاور سے ۴۴ میل اور راولپنڈی سے ۶۰ میل بر لب دریائے سندھ واقع ہے اور دریائے کابل (لنڈا) اور دریائے

سندھ (اباسین)، کے جائے اتصال سے نیچے اور دریا میں ابھری ہوئی دو چٹانوں دکمالیہ اور جلالیہ۔ وجہ تسمیہ: پیر روشن کے دو بیٹوں کمال الدین اور جمال الدین جن کو باپ کے گمراہ کن عقیدوں کی بناء پر ان چٹانوں، چوٹیوں سے دریا میں پھینکا گیا تھا، ان چٹانوں کا یہ نام اس لئے رکھا گیا تھا کہ یہ بہت خطرناک تھیں اور کشتیاں ان سے ٹکرا کر غرق ہو جاتی تھیں۔ چونکہ جمال الدین اور کمال الدین سلطنتِ مغلیہ کے لئے اتنے ہی خطرناک تھے، الہٰذا ان چٹانوں کے یہ نام تمثیلاً رکھے گئے، کے بھنوروں کے سامنے ہے۔

اٹک کا یہ گھاٹ برائے عبور زمانہ قدیم سے ہے۔ سکندر اعظم نے ہنڈ کے مقام (جو اٹک سے سولہ میل اوپر کی طرف ہے)، پر دریائے سندھ کو عبور کیا تھا۔ اکبر بادشاہ کے بعد نادر شاہ ایرانی نے بھی اسی جگہ سے اسے عبور کیا۔

قلعہ اٹک کی ساخت چونکہ فوجی ضرورت کے لئے تھی اس لئے فتح پور سیکری، دہلی اور لاہور کے قلعوں سے مختلف ہے۔ اس کا گھیرا ایک میل سے قدرے زیادہ ہے۔ اس میں اٹھارہ برج ہیں، جن میں، اگول اور ایک چوکور ہے۔ ہر ایک میں ایک دالان (برآمدہ)، ہے اور نیچے پہرہ داروں کے لئے کمرے ہیں۔

مسٹر ویلر (R.E. WHEELER) نے اس قلعہ کا نقشہ اپنی کتاب "پاکستان کے پانچ ہزار سال" میں یوں بیان کیا ہے۔ "اس قلعہ کی خاص بات یہ ہے کہ قلعہ بندی میں ایک چھوٹا سا برآمدہ دیوار کی بلندی پر بنایا گیا ہے تاکہ پہرہ داروں کے سر اور لپشت کے حفاظت کا کام دے سکے۔ ان برآمدوں کے اکثر حصہ پر چھت ہے۔ شمالی برج کی دیوار کے نصف میں ایک بالاخانہ ہے، جو برج کے بالمقابل اور اس کے آگے ایک چھجا ہے۔ اس سے سب دریا پر نظر رکھی جا سکتی ہے۔ یہی ایک عمارت ایسی ہے جو رہائش کے لئے بنائی گئی تھی۔

دروازے | ا۔ بڑا دروازہ۔ موری دروازہ ہے جو قلعہ کے شمال مشرقی دیوار سے شاہراہ عام پر کھلتا ہے اور یہ ۱۸۲۰ء (زمانہ سکھ حکومت)، سے ہے۔

اس کے علاوہ چار اور دروازے (جو قدیمی ہیں)، یہ ہیں۔

لاہوری دروازہ۔ یہ پرانا دروازہ ہے جو کہ قلعہ بالا اور قلعہ پائیں کے لئے حد فاصل ہے قلعہ بالا

میں فوج ہوتی تھی اور حصہ پائیں میں شہر اور بازار تھا۔

پرانی سڑک (شاہراہ عام عہد مغلیہ) لاہوری دروازہ کے (شمالی طرف) سے اندر جاتی تھی۔ وہاں سے شہر کے بازار (قلعہ پائیں) سے ہوتی ہوئی کابلی دروازہ (جنوبی دروازہ)، ملاحی ٹولا گاؤں سے ہوکر دریا کو جاتی تھی۔

قلعہ بالا اور قلعہ پائیں کے درمیان آمدورفت دہلی دروازہ سے ہوتی تھی۔ جس کے ایک طرف ایک بڑا دیوانِ عام تھا۔

حمام

قلعہ بالا میں بیگم حمام دلچسپی کی چیز ہے۔ مغلیہ بادشاہوں کے ذوق و نفاست کا مظہر ہے۔ اس حمام کے داخل ہونے پر ایک بڑا کمرہ ہے اور چند چھوٹے بغلی کمرے کپڑے اتارنے کے لئے ہیں۔ اس سے آگے گرم اور ٹھنڈے کمرے ہیں، جہاں غسل کرنے والا مختلف درجاتِ حرارت کے پانی سے غسل کرسکتا ہے۔ دوہری دیواروں کے درمیان بے نظیر طریق سے پانی کے گرم کرنے اور بھاپ کے دوران کے انتظام کی جھلک اب بھی دکھائی دیتی ہے۔

اس جگہ سے زیر زمین راستہ اس دیوان حضوری کو جاتا ہے، جہاں بیگمات ٹھہرا کرتی تھیں۔ قلعہ پائیں میں زمین کی سطح ذرا نیچے دھنسی ہوئی سڑک اور لوہے کی نوک دار سلاخوں والے دہلی و کابلی دروازے (جو کہ ہاتھیوں کے بے محابہ اندر داخل ہونے سے روک کا کام دیتے تھے) اس وقت کی آمدورفت کے انتظام کا پتہ دیتی ہے۔ دریا والا راستہ (کشتیوں کے پل پر سے پار جانے کے لئے) اب مدت سے بند ہے۔ قلعہ کے نیچے کشتیوں کے پل والی پتھر کی برجیاں اب تک نظر آتی ہیں۔

سکھوں کا عہد۔ تین سو سال سے یہ قلعہ بیرونی حملہ آوروں کے لئے روک بنا رہا سوائے چند افغانی حملوں کے۔

۱۸۱۲ء میں رنجیت سنگھ نے رشوت دے کر اس پر قبضہ کر لیا اور سندھ سے پار چند چوکیاں بنالیں۔ ۱۸۴۵ء میں چند عجیب واقعات اس قلعہ میں رونما ہوئے۔ ان کا نقشہ کرنل گارڈنیر (GARDINER) (سکھ فوج کا ایک افسر) ان الفاظ میں کھینچتا ہے۔

"۱۰ ستمبر ۱۸۴۵ء۔ کرنل گارڈنر سے پشاورا سنگھ پسر رنجیت سنگھ شکست کھا کر سیالکوٹ

سے کانگڑا کے علاقہ میں چلا گیا۔ جہاں وہ اپنے اہل وعیال اور لشکریوں سمیت کوٹلہ کے قلعدار کے زیر حفاظت چلا گیا۔ اہل وعیال کو وہاں چھوڑ کر وہ چند ہمراہیوں کے ساتھ جولائی ۱۸۴۵ء قلعہ اٹک پہنچ گیا اور قلعہ پائیں کے دروازے سے داخل ہو کر سنتری اور بیس دوسرے آدمیوں کو قتل کر کے قلعہ بالا کی طرف بڑھا۔ جہاں کے فوجیوں نے گھبراہٹ کے عالم میں اس کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور وہ قلعہ سے خارج کر دیئے گئے۔

دوسرے دن گردونواح کے لوگوں کو بھرتی کر کے دو ہزار مسلح آدمی مہیا کر لئے۔ وہ پہلے اس قلعہ میں اپنے بھائی کے ساتھ حاکم رہ چکا تھا۔ قلعہ کے خزانہ سے اس کو ڈھائی لاکھ روپیہ اور کافی غلہ بھی ملا۔ اس نے علاقہ کے خوانین سے سرکاری ٹیکس وصول کرنا شروع کر دیا۔

جواہر سنگھ وزیر درانی جنداں کا بھائی، اس کے خلاف کچھ کارروائی نہ کر سکا، کہ سکھ فوج اس کے رنجیت سنگھ کا بیٹا ہونے کی وجہ سے، اس کی طرفدار تھی۔ آخر کار مجبور ہو کر جواہر سنگھ وزیر نے چتر سنگھ حاکم ہزارہ کو ترغیب دی کہ وہ پشاورا سنگھ کو گرفتار کرے۔ چتر سنگھ نے قلعہ کا محاصرہ کیا اور آخر کار چتر سنگھ نے معافی کا وعدہ دلایا۔ پشاورا سنگھ نے اس وعدہ پر ۳۰ اگست ۱۸۴۵ء کو قلعہ خالی کر دیا اور لاہور کے لئے روانہ ہوا۔ لیکن اس کو ختم کرنے کا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔

چتر سنگھ نے شکار کے بہانے پشاورا سنگھ کو اپنے کیمپ میں بلا کر اچانک حملہ کر کے سخت زخمی کر دیا اور اس کے ساتھی قتل کرا دیئے۔ اور پشاورا سنگھ کو ہاتھی پر سوار کر کے واپس قلعہ میں لے آئے جہاں ایک ہفتہ بعد اس کو ایک بھنگی (جو جواہر سنگھ نے لاہور سے اس کے قتل کے لئے بھیجا تھا)، نے قلعہ کے کمرہ میں اس کو قتل کر کے اس کی نعش کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے دریا میں ڈال دیا۔ واپسی پر اس بھنگی کی ملاقات خالصہ فوج کے ایک بھنگی سے ہوئی اور اس نے یہ راز بیان کر دیا۔ بات سکھ فوج کو معلوم ہو گئی جنہوں نے اس بھنگی کو الٹا سر کے بل لٹکا کر دھیمی آگ سے بھون ڈالا۔

جب یہ بات خالصہ فوج کو معلوم ہوئی تو پنچایت نے فیصلہ کیا کہ جواہر سنگھ کو قتل کیا جائے۔ جواہر سنگھ کو میاں میر (نزد لاہور)، کے میدان میں رانی جنداں کے سامنے کھڑا کیا

گیا اور فوج کے سپاہیوں نے اس پر باری باری سنگینوں سے حملہ کر کے اُس کا کام ختم کر دیا۔

انگریزوں کا عہد یہ قلعہ ستمبر ۱۸۴۸ء تک سکھوں کے پاس رہا۔ سکھوں کی دوسری جنگ میں جان نکلسن ایک چال سے قلعہ کے اندر داخل ہو گیا اور لفٹیننٹ ہربرٹ[1] مسلمانوں کی ایک کمپنی کے ساتھ اس پر قابض ہو گیا۔

جنوری ۱۸۴۹ء میں چتر سنگھ نے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔

بیگم سرائے قلعہ کی شمالی جانب اور دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر یہ سرائے موجود ہے۔ قلعہ کی تعمیر کے دوران یہ فوجی کیمپ تھا۔ بعد میں جہانگیر بادشاہ نے نور جہاں بیگم کی خاطر سترھویں صدی عیسوی کی پہلی چوتھائی میں اس کو درست کر کے سرائے بنا دی۔

اس سرائے کا رقبہ ۱۳۲ مربع فٹ ہے۔ اس میں ایک مسجد بھی ہے۔ سرائے کے اطراف میں ایک مسجد بھی ہے۔ سرائے کے اطراف میں رہائشی کمرے ہیں اور اس کے چاروں کونوں پر برج ہیں۔ یہاں شاہی مغل کی بیگمات ٹھہرا کرتی تھیں۔ یہاں سے آگے وہ واہ جا کر ٹھہرا کرتی تھیں۔

سرائے کے مغربی جانب پر ایک کنواں ہے۔ جس کے اندر سے ایک خفیہ سرنگ دریا کے نیچے سے ہو کر دوسری طرف خیر آباد جا کر نکلتی تھی۔ اب یہ برباد ہو چکی ہے۔

اٹک ریلوے پُل یہ ملکہ وکٹوریہ کی سالگرہ کی یاد میں بنایا گیا تھا۔ اس کی تعمیر ۱۸۸۰ء میں شروع ہوئی اور ۱۸۸۳ء میں تکمیل ہوئی۔

قلعہ اٹک میں انگریزی افواج پاکستان کے قیام تک میں رہیں اور اب پاکستانی افواج رہتی ہیں۔ ۱۹۴۸-۵۰ء میں یہاں ہندوستانی فوجی قیدر رکھے گئے۔ (اور اب بھی فوجی قیدیوں کو کبھی کبھار یہاں رکھا جاتا ہے)۔

---

[1] اسی میجر ہربرٹ کو جب دوسری سکھ جنگ کے دوران سکھوں کے محاصرہ میں آ گیا تو میجر ایبٹ نے ہزارہ سے رسد بھجوائی جو ایک کشتی کے ذریعہ تربیلہ سے روانہ ہوئی۔ اسی میں غزن خان نیٹی بھی سوار تھا کشتی اٹک کے پاس چٹانوں سے ٹکرا گئی۔ غزن خان ڈوب گیا۔ اس کے صلہ میں اس کے بڑے بیٹے میر حسن خان کو ۱۷/۵ روپے سالانہ پنشن تا حیات حاصل کرتا رہا۔

گوجر ہزارہ میں موجودہ اقوام میں سے سب سے زیادہ پرانی آبادی گوجروں کی ہے اور یہی قوم اس خطہ میں مالک اور حکمران رہی۔ میدان ہزارہ میں اس قوم کا صدر مقام دو دوتا ، حال کوٹ نجیب اللہ اور "راجپورہ" نزدیک کوٹ نجیب اللہ رہا۔ عہد مغلیہ میں اس علاقہ کا گوجر سربراہ مقدم دولت بیگ رہا جس کے نام پر دوتا موسوم ہے۔ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شہنشاہ عالمگیر نے یہ خطاب (مقدم) دولت بیگ کو دیا تھا۔

ترین جب سلطنت درانی کا غلبہ ہوگیا تو نجیب اللہ خان ترین (ساکن درویش) اس ملک کا حاکم ہوگیا۔ جس کی حکومت ۱۷۶۲ء سے ۱۷۹۹ء تک رہی۔ اس کی اولاد غلام خان کے زمانہ تک رہی۔ آخرکار اس کو میجر ایبٹ (پہلے انگریز ڈپٹی کمشنر ہزارہ) نے ۱۸۴۹ء میں گرفتار کر کے ملک بدر کر دیا۔

درویش کا گاؤں ترینوں کے جد امجد ملک درویش نے سترھویں صدی کے وسط (۱۶۵۸ء) میں آباد کیا۔ ملک درویش کے بیٹے ملک گدائی خان نے اپنے وقت میں درویش کے قرب و جوار میں کافی دیہات آباد کئے۔

گکھڑ یہ قوم درانیوں کے عہد تک از جہلم تا اٹک حکمران رہی۔ ہزارہ میں ان کی آمد کی صحیح تاریخ تو معلوم نہ ہوسکی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم ہزارہ میں درانی حکومت کے خاتمہ کے نزدیک (یعنی ۱۷۹۵ء کے لگ بھگ) اس طرف آئی۔ سلطان فتح خان، جس نے خان پور آباد کیا ہے اپنے علاقہ پوٹھوہار میں سلطان تھا۔ جس کا عہد حکومت ۱۵۹۷ء تا ۱۶۱۰ء ہے جو مطابق تاریخ ہائے گدی نشینی راجگان گکھڑ خان پور رہے۔ یہ نقشہ گدی نشینی ۱۸۷۰ء میں مرزا اعظم بیگ نائب مہتمم بندوبست نے تیار کرایا تھا۔ لیکن صحیح طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ راجگاں خان پور نے کب ہزارہ میں اپنی حکومت کا آغاز کیا۔ بہر حال یہ سترھویں صدی میں ہوگا جب ۱۸۶۰ء ہزارہ کا بندوبست شروع ہوا تو وہ اس ضلع میں آباد اور صاحب اختیار تھے۔ لیکن خود مختار حاکم نہ تھے۔ سکھوں کے عہد میں ان کی چپقلش سکھ حکومت سے رہی ہے۔ کرڑال اور ڈھونڈ بھی کسی زمانہ میں ان کے ماتحت رہے۔ جس وقت ان کی حکومت پوٹھوہار میں تھی۔ لیکن باقی میدان ہزارہ میں ان کا کوئی اثر نہ تھا۔ اس قوم میں زمانہ ماضی قریب میں ایک نامور

راجہ خان بہادر جہانداد خان ہوئے ہیں۔ وہ بڑے ہی صاحب علم و مرتبہ انسان تھے۔ ان کی وجاہت علمی کا ثبوت یہ ہے کہ امیر کابل امیر عبدالرحمن خان کی وفات پر وائسرائے کی نظر میں سارے ہندوستان سے راجہ جہانداد خان ہی امیر صاحب کی وفات پر فاتحہ کہنے کے لئے موزوں نظر آئے اور ان کو بھیجا گیا۔

خان پور

اب خان پور اور باغپور ڈھیری، یہ سب علاقہ، خان پور ڈیم کی جھیل میں آجائے گا۔

قوم تنولی پلال

علاقہ تناول میں اصلاً حکمرانی ہیتہ پلال کی رہی اور ان کے مشہور خان زبردست خان المعروف بہ صوبہ خان سترھویں صدی کے آخر میں والئی تناول تھا اور عام لوگوں میں سخی خان کے نام سے مشہور تھا اور موضع بھوہار میں رہتا تھا۔ چونکہ درانیوں کی جانب سے علاقہ تناول کی صوبیداری اس کو تفویض ہوئی تھی۔ اس لئے وہ صوبہ خان مشہور ہوا اس نے ملک ہزارہ اجدون اور پکھلی پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ بہت رعیت پرور تھا۔ رعایا خوشحال تھی۔ باہر کے علاقوں سے تجار، کھتریاں اور دیگر اقوام کو اپنے علاقہ موضع بھوہار، برلب سرن اور موضع بیڑ اور بھیر کنڈ (یہ دونوں اس کے آباد کردہ ہیں)، میں آباد کیا۔

روایت ہے، جب اس کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا تو سب لوگ اور خاص کر بیڑ کے نوآباد لوگ، مبارک باد کے لئے جمع ہوئے تو اس نے کہا "مجھے بیٹے کی آمد سے نوآباد رعیت عزیز تر ہے۔" اس کی وفات کے بعد اس کے چودہ بیٹے زندہ تھے۔

تنولیوں کی دوسری شاخ (ہندوال)، نواب امب (دربند) کے سربراہ ۱۷۰۲ء میں ہیبت خان ہوا۔ اس کی پانچویں پشت میں نواب محمد اکرم خان ہوا۔

ان دونوں قبیلوں، (پلال و ہندوال)، میں مدت تک خونریز چپقلش رہی۔ آخر کار پائندہ خان کے وقت ہندوال کا پلہ بھاری ہو گیا۔ اس نے درانیوں اور پھر سکھوں کے ساتھ مقابلہ کیا اور اپنا لوہا منوالیا۔

سر الیگزنڈر برن نے اپنی یادداشت (حالات سفر ۳۸، ۱۸۳۶ء، ۳۷) میں لکھا ہے کہ:

"پائندہ خان تنولی، نواب امب، وہ ہمیشہ دریا پار سے آکر سکھوں کے علاقہ سے لوگ پکڑ کر

لے جاتا ہے۔ اور ان کو پھر روپیہ لے کر چھوڑتا ہے، جس سے اپنا اور اپنے لوگوں کے لئے ذریعہ معاش بناتا ہے۔ اس کے پاس تقریباً ۵۰۰ سوار اور دو ہزار پیادہ سپاہی ہیں۔ ان میں اکثر ہندوستانی ہیں، جو سید احمد شہیدؒ کے ساتھ تھے اور ان کی شہادت ۱۸۳۱ء از دست سکھاں، کے بعد منتشر ہو کر اس کے پاس آ گئے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے علاقے میں طاقتور خان بن گیا۔

یہ ریاست (دریائے سندھ سے اس پار) ۱۹۵۰ء میں پاکستان میں ضم ہو گئی اور صرف مختصر سا علاقہ امب، پار دریائے سندھ خود مختار رہا۔

نواب محمد سعید خان، آخری نواب ۴۰، ۱۹ء میں فوت ہو گیا اور یہ علاقہ بھی حکومت پاکستان نے ضم کر لیا۔

موضع ڈیرہ دریائے سندھ کے مشرقی کنارہ پر لالوگلی کے نزدیک یہ گاؤں آباد ہے۔ اول اول جب تنولی قوم اس ملک میں دریائے سندھ کو پار کر کے آئی تو انہوں نے یہاں ہی اپنا ڈیرہ جمایا۔ یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔ مدت تک یہ اس قوم کے خوانین کا مسکن رہا۔

سواتی اس قوم کی دو شخصیتیں قابل ذکر ہیں۔

۱۔ سید جلال بابا۔ ۲۔ سعادت خان۔

سید جلال بابا۔ سواتی قوم کے سربراہ کے طور پر سترھویں، اٹھارویں صدی عیسوی میں اس ملک میں داخل ہوا۔ ترکوں سے ملک لے کر قابض ہو گیا۔ انہوں نے چہارم حصہ ملک کا خود رکھ لیا اور باقی لشکر سوات پر تقسیم کر دیا۔ بھوگڑمنگ کا علاقہ پہلے سے سید جلال بابا کے پاس تھا جو ترک شاہ محمود نے سید جلال (اپنے داماد) کو بیٹی کے جہیز میں دیا تھا۔ اس علاقہ کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے۔ اصلی نام پوچھڑ منگ تھا جو بعد میں بھوگڑمنگ مشہور ہو گیا۔

قوم کی خانی اور سرداری بھائی خان کے گھر رہی۔ یہ قبیلہ قریش سے تھے اور ان کی اولاد خان خلیل کہلاتی ہے۔ ان کا مشہور خان سعادت خان پسر محمد سعید خان ہوا۔

موضع گڑھی حبیب اللہ خان کی بنیاد سعادت خان نے ڈالی، جو ان کے بیٹے حبیب اللہ خان

کے نام سے موسوم ہوئی۔

زمانہ قدیم کے دیہات علاقہ پکھلی کی وجہ تسمیہ	مانسہرہ تحصیل دیہاتوں کے نام مقامی خصوصیت سے موسوم ہو گئے۔

۱۔ سطح زمین پر سفید پتھروں کی وجہ سے، چٹہ بٹہ، چٹی گٹی، چٹی ڈھیری۔

۲۔ کنڈ۔ زمین کی خاصیت سے۔ موضع شنکیاری سے اوپر تین کنڈ ہیں۔

۳۔ خاص پھل کی وجہ سے۔ مثلاً عام پھل ٹنگ کی وجہ پر تین دیہات ٹنگی کے نام سے موسوم ہیں۔

۴۔ چند مواضعات کسی شخص کے نام سے مشہور رہیں۔ مثلاً مانسہرہ۔ یہ مان سنگھ کی سرائے تھی، جو مانسہرہ کے نام سے مشہور ہو گئی۔

۵۔ چند نام ہندوؤں کے عہد میں مثلاً میدان چتر علاقہ بٹل، تو انھوں نے یہاں ہی اپنا ڈیرہ جمایا میں لاچی منگ، بالی منگ، نیلی منگ، اراج دواری۔

۶۔ ترکوں کے وقت کے نام۔ پوچھڑ منگ دحال بھوگڑمنگ، بیداوی دسابق بیداد نگری)، نزد شنکیاری اورگلی باغ دلبفہ کے نزدیک ترکوں کا دارالحکومت،

۷۔ مغلوں کے وقت کے نام۔ عطر شیشہ کا گاؤں۔ وجہ تسمیہ۔ جہانگیر بادشاہ جب کشمیر جارہا تھا تو ایک منزل اس جگہ پر کی۔ جاتے وقت ملکہ نور جہاں کا عطر شیشہ یہاں رہ گیا۔ لہٰذا یہ نام اس جگہ کا پڑ گیا۔

۸۔ سکھوں کے وقت کے نام؛ مثلاً گاندھیاں، جو گاندھی سنگھ کے نام سے مشہور ہوا۔

۹۔ لبفہ۔ یہ بہت ہی پرانا قصبہ ہے۔ ترکوں کے وقت یہ بہت بڑا شہر تھا۔ ان کا دارالخلافہ گلی باغ اس کے ساتھ آباد تھا۔

۱۰۔ مانسہرہ تحصیل میں بہت سے دیہات جائے محل کے لحاظ سے اتلا دبالا)، وترلہ دپائیں)، کے نام سے مشہور ہیں یا جسامت کے لحاظ سے کلاں اور خورد۔ مثلاً موضع خاکی کے نزدیک ترنگڑی۔ اتلی اور ترلی اور مڑ لبفہ کلاں اور خورد۔

۱۱۔ بعضے مواضعات ان جانوروں کے نام سے موسوم ہیں، جو ان کے نزدیک جنگلات

میں کثرت سے پائے جاتے تھے۔ مثلاً۔ شیر پور، نزد خاکی، شیر گڑھ داوگی سے چار میل، اور گیدڑپور
اسی طرح جہاں دو دریا یا ندیاں، ملتی ہیں وہ جگہ دومیل کہلاتی ہے۔ مانسہرہ میں تین دومیل ہیں۔

پکھلی سرکار۔ ایک تاریخی نکتہ ہندوستان پر حملے عموماً شمال سے جنوب کی طرف سے ہوتے رہے ہے۔ یعنی حملہ آور قومیں افغانستان سے عموماً درہ خیبر اور دوسرے دروں سے گاہے گاہے سرحد میں داخل ہوتی رہیں اور پھر ان کا رخ جنوب کی طرف ہوتا رہا لیکن مانسہرہ کے علاقے پر جنوب اور شمال دونوں طرف سے ہوتے رہے۔ سب سے آخری قابلِ ذکر حملہ (مغرب سے) سوات سے مانسہرہ پر ہوا یعنی عہدِ مغلیہ میں سواتی قوم زیر سلطان پکھل، سترھویں صدی عیسوی میں مانسہرہ پر حملہ آور ہوئی۔ اسی نام سے پکھلی سرکار۔ اس خطہ کو ابوالفضل نے آئین اکبری میں موسوم کیا۔

اٹھارھویں صدی میں سواتیوں کا ایک لشکر زیر سرکردگی سید جلال بابا آیا، جن کا مزار بھوگرمنگ میں ہے۔

وادی کاغان ضلع ہزارہ کا ½ حصہ اس وادی پر مشتمل ہے لیکن اس کا تین فیصد رقبہ قابلِ کاشت ہے (یعنی آٹھ سو مربع میل میں سے)

کسی زمانہ میں یہ وادی، وسط ایشیا کی شاہراہ رہی ہے۔ یہ وادی، بالاکوٹ تا بابوسر ۹۲ میل لمبی ہے۔ وادی میں جگہ جگہ ٹھہرنے کے لئے بنگلے بنے ہوئے ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ بالاکوٹ سے کوائی ۱۵ میل پر بنگلہ ہے۔ ۲۔ کوائی سے مہانڈری ۱۳ میل۔ ۳۔ مہانڈری سے کاغان ۱۲ میل۔ ۴۔ کاغان سے ناران ۱۲ میل۔ (ناران سے جھیل سیف الملوک سر ۵ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس جھیل کا طول نصف میل اور بلندی ۱۰،۰۰ فٹ ہے)، ۵۔ ناران سے بٹہ کنڈی ۱۰ میل
بٹہ گنڈی کے گاؤں سے اوپر ایک وسیع یوتھ ہوسٹل (YOUTH HOSTLE) بہ مقام لالہ زار ۱۰۵۹ فٹ کی بلندی پر ہے۔ (دریائے کنہار، وادی کاغان کی سڑک کے ساتھ ساتھ، بہت گہرائی میں بہتا ہے۔ اکبر صاحب نے کنہار کی وجہ تسمیہ "کوہ نہر" لکھی ہے جو دلچسپ بھی ہے اور صحیح بھی۔)

اس دریا کا پانی برفانی اور بہت ٹھنڈا ہے۔ ملکہ نور جہاں جب گڑھی حبیب اللہ کے پاس دریا پر پہنچی اور اپنا چہرہ اس کے پانی سے دھویا، تو آنکھوں کو ٹھنڈک ملی۔ اس نے دریا کا نام

"نمن سکھ" رکھا۔ بٹہ کنڈی سے آگے بوڑاوئی پھر بیسل۔ جس کے آگے گیٹی داس ہے۔

بیسل کے پاس پوربی ناڑ کا نالہ دریائے کنہار میں آکر ملتا ہے۔ یہ جگہ وہی ہے جہاں پر ۱۸۵۷ء میں ہندوستانی کمپنی ؎ کے چھ سو سپاہی دجو مردان سے بھاگ کر کشمیر جا رہے تھے) گرفتار ہوئے اور توپ سے اڑا دیئے گئے۔ جھیل لولوسر، جو ۱۲۰۰۰ فٹ کی بلندی پر اور ڈیڑھ میل طول میں ہے، یہاں ہی واقع ہے۔ گٹی داس سے آگے بابوسر، ہزارہ ضلع کی حد ہے اس کے سامنے نانگا پربت ۲۶۶۰۰ فٹ بلند پہاڑ ہے۔

ایبٹ آباد

یہ شہر میجر ایبٹ (ہزارہ کے پہلے ڈپٹی کمشنر) کے نام پر جب وہ ۱۸۵۳ء میں یہاں سے تبدیل ہو کر کلکتہ چلا گیا، تو اس کے جانشین، میجر ایڈورڈ نے اس شہر کی بنیاد رکھی۔ اس سے پہلے محکمہ ہائے عدالت نواں شہر میں تھے۔ ایبٹ آباد کی آبادی کی بنیاد رکھنے کے بعد بنگلے اور عدالتیں تعمیر ہوئیں۔ شہری آبادی کے آغاز میں سب سے پہلے نوکری پیشہ اور بیوپاری جو عموماً ہندوستانی تھے آباد ہوئے۔ کچھ پنجابی بھی تھے۔ آبادی میں فوج کے افسران کے خانساماں اور خدام (BEARER) رکاب دار تھے، جو سب ہندوستانی تھے۔ یہ لوگ مستقلاً یہاں آباد ہو گئے۔ ۱۹۰۰ء تک شہر کے کل مکان کچے تھے سب سے پہلے پکا مکان موسیٰ خان (رکاب دار) نے بنایا جو چودھری محمد علی ایڈووکیٹ مرحوم کے سکنی مکان کی پشت پر تھا۔

اس شہر کی آبادی میں جامع مسجد اور اس کی دکانوں اور اسلامیہ سکول کی ابتدائی تعمیرات سے اضافہ ہونا شروع ہوا۔ یہ سب تعمیرات انجمن اسلامیہ کی تعمیر کردہ تھیں۔

انجمن اسلامیہ ایبٹ آباد

یہ قابل قدر ادارہ تھا۔ اس نے علمی، مذہبی اور ابتدائی سیاسی شعور پیدا کرنے میں، قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ اس میں ہزارہ کے نامور افراد، صاحب علم وعمل شامل تھے۔

؎ ۔ ان چھ سو سپاہیوں سے صرف ۱۲۴ ہی کاغان پہنچ سکے۔ باقی راستہ میں سوات اور پکھلی میں مارے گئے یا مر گئے تھے۔

اس انجمن کا سالِ تشکیل صحیح طور پر تعین نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اس کا تمام ریکارڈ جو اسلامیہ سکول میں تھا، ۱۹۳۵ء کی آگ سے، جس نے تمام شہر کو جلا کر خاکستر کر دیا تھا، جل گیا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انجمن کی قیمتی دستاویزات اور شاہزادہ بخارا کا نادر کتب خانہ بھی جل گیا۔ یہ کتب خانہ شاہزادہ بخارا اپنے ساتھ یہاں لائے تھے، جس میں امیر تیمور سے لے کر بابر بادشاہ کے زمانہ تک کی کتابیں تھیں، جو سب کی سب قلمی تھیں۔ ان میں ایک کتاب ایسی تھی جس میں بابر بادشاہ مع خاندان محل میں یکجا بیٹھے ہوئے دکھائے گئے تھے۔

ثقہ حضرات کی روایت کے مطابق انجمن کی بنیاد ۱۸۸۲ء میں رکھی گئی تھی۔ یہ انجمن ایک سماجی ادارہ تھا، جسے موجودہ طرز کی سیاست سے کچھ تعلق نہ تھا۔ اس زمانہ میں سیاسی جماعتوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے انجمن اسلامیہ کے عہدہ داروں کو حکام رسی کا موقع حاصل رہا۔ انجمن کی لائف ممبری کے لئے پچیس روپیہ چندہ ہوتا تھا۔ صاحب اثر اور باوقار لوگ ممبر بنتے رہے۔ شہر میں اس انجمن کا بہت زیادہ اثر و رسوخ تھا۔ انجمن کی عہدہ داری قیادت کی سند بن گئی اور ضلع بھر میں حکام سے تعلق کا رشتہ اور عوام کی لیڈرشپ ان کے ہاتھ میں آ گئی۔

انجمن اسلامیہ کی کارکردگی

ممبران و عہدہ داران کی سعی سے گورنمنٹ نے بہت سی نزول کی جائے سفید برائے نام قیمت پر دے دی۔ جس پر ایک چھوٹی سی مسجد اور مسجد کے متعلق دکانیں متفرق لوگوں نے نقد چندہ و سامان تعمیر لکڑی، اینٹ وغیرہ جمع کر کے تعمیر کا آغاز کیا۔ ان تعمیرات کی نگرانی ٹھیکیدار اللہ بخش مرحوم ساکن لوئر ملک پورہ ساکن لوئر ملک پورہ، بابا غلام محمد والدِ خان بہادر جلال الدین المعروف جلال بابا، بابو کرم الٰہی (والدِ بابو سلطان احمد انجینئر) و مسٹر عبدالکریم خاں مجسٹریٹ، جن کا انتقال مارچ ۱۹۷۰ء میں ہوا، نے کی۔

۱۹۰۷ء میں چھوٹی مسجد گرا کر بڑی مسجد زیر اہتمام احمد میر صاحب عرف کھماں ٹھیکیدار ساکن امیر ملک پورہ تعمیر ہوئی۔ انہی ایام میں انجمن نے پرائمری سکول کی بنیاد رکھی۔

۵۔ جولائی ۱۹۳۵ء صبح کے وقت ایک ہندو حلوائی کی دکان میں آتش زدگی سے آناً فاناً آگ نے سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دن کے دس بجے کے قریب آگ قابو سے باہر

ہو گئی، جو تین دن شعلہ زن رہی۔ سارا مرکزی شہر جس میں عظیم الشان جامعہ مسجد، اسلامیہ ہائی سکول اور مسجد کی ملحقہ جائداد جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گئی۔ اس کے بعد انجمن کے ممبران نے ہمت و سعی کر کے پختہ شاندار مسجد اور پختہ دکانیں تعمیر کر لیں۔ سکول بھی بنایا گیا، جو بعد میں ہائی سکول بن گیا اور جو ضلع میں چوتھا ہائی سکول تھا اور نتیجۂ امتحانات کے لحاظ سے ضلع بھر میں اول آتا رہا۔

انجمن اسلامیہ ایبٹ آباد کے عہدے دار

ابتدائی ممبران، جن کا علم حاصل ہو سکا وہ یہ تھے۔

۱۔ ڈاکٹر جہانگیر بخش ولد کریم بخش جن کا بیٹا میجر رحمت اللہ صاحب، جو انگلینڈ میں مقیم رہے اور غالباً ۷۷-۱۹۷۶ء میں ایبٹ آباد آئے اور یہیں فوت ہو گئے۔

۲۔ خان صاحب عبدالرحمٰن خان۔ ملٹری ڈاکٹر۔

۳۔ ڈاکٹر عبدالرزاق خان صاحب۔

۴۔ محمد امیر خاں غوری۔ ان کا ایک پوتا عبداللطیف[۱] خان جون ۱۹۸۰ء کے آواخر میں مجھے یہاں آکر ملا۔ میری تاریخ ہزارہ طبع اول کے حوالہ سے بتایا کہ محمد امیر خان غوری، ملٹری ہسپتال کے سرجن تھے اور ۱۸۸۰ء میں ایبٹ آباد میں فوجی ہسپتال میں تھے۔ ان کی وفات ۹۱-۱۸۹۰ء میں انبالہ میں ہوئی۔ وہ وہاں فوجی ہسپتال میں تھے۔ ان کی اولاد اب پاکستان میں بکھر گئی ہے۔

۵۔ فتح بہادر۔ ہندوستانی اور فوجی کلرک۔

یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ ان حضرات میں چار تو ڈاکٹر ہیں اور ایک کلرک، جو سب پنجاب یا ہندوستان کے رہنے والے تھے۔

انجمن کے اصل بانی حضرات کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ قاضی میر عالم صاحب ساکن سکندر پور (نزد ہری پور)، جو ۱۸۸۵ء میں ہزارہ کے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے اور راجہ جہانداد خان چیف آف گکھڑ، ساکن خان پور جو ۱۸۸۳ء میں یہاں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے۔

---

[۱] حال مقیم نظام آباد پنجاب ضلع گوجرانوالہ۔ بی۔ڈی عہد میں ممبر رہے۔ لیگ کے پرانے کارکن ہیں۔

دونوں کے نام لئے جاتے ہیں ۔ دونوں بہت بڑے عالم، فاضل اور لائق انسان تھے ۔ ان دو میں سے گمان غالب یہ ہے کہ راجہ جہانداد خان بانی تھے ۔ ایک راوی کے بیان کے مطابق اصل بانی مبانی میاں حسین بخش (والد سر فضل حسین، پنجاب کی مشہور ہستی)، تھے جو یہاں افسر مال تھے ۔ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ یہاں کب افسر مال تھے ۔ لیکن میاں حسین بخش کے نواسے میاں سعید الرحمٰن ولد میاں شریف حسین صاحب ساکن پشاور کے بیان کے مطابق ان کے نانا میاں حسین بخش صاحب ۱۹۰۲ء میں بحیثیت ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ریٹائر ہوئے ۔ وہ اغلباً ۱۸۸۲ء کے لگ بھگ یہاں افسر مال رہے ہوں گے ۔ میاں سعید الرحمٰن کے بیان کے مطابق میاں حسین بخش صاحب کی ملازمت کا دور ۱۸۷۵ء تا ۱۹۰۲ء رہا ۔ میاں حسین بخش نے بٹالہ (جائے سکونت) میں انجمن اسلامیہ قائم کی تھی ۔ پرائمری سکول جاری کرایا تھا، جو بعد میں ہائی سکول بنا ۔ ۱۸۹۰ء میں پشاور میں، انجمن حمایت اسلام کی نگرانی میں مسلم سکول کھلوایا ۔ اسلامیہ کالج کے قائم کرنے میں بہت مدد کی ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مشن ہی یہی تھا، لہٰذا ان کا بانی مبانی ہونا صحیح معلوم ہوتا ہے ۔

قابل تحریر واقعہ : سر فضل حسین مرحوم کے ایبٹ آباد سکول کے ہم جماعت خان بہادر سلطان محمد خان چیف آف بیٹر اور محمد فیروز خان ولد خان بہادر محمد حسین خان آنریری مجسٹریٹ درجہ اول ساکن مانسہرہ تھے ۔ سر فضل حسین ہندوستان کے آسمان پر مہتاب ہو کر چمکے ۔ آپ کی پیدائش ۱۸۷۸ء میں پشاور میں ہوئی ۔ ۱۸۹۹ء میں انگلینڈ گئے ۔ ۱۹۰۲ء میں بیرسٹر بن کر واپس آئے ۔ پہلے سیالکوٹ میں پریکٹس شروع کی ۔ پھر لاہور ہائی کورٹ میں کام کیا ۔ ہائی کورٹ بار کے صدر ہوئے ۔ پھر انجمن حمایت اسلام کے سیکرٹری چنے گئے ۔ بعد میں وزیر تعلیم پنجاب ہوئے پھر وائسرائے کی کونسل کے ممبر چنے گئے ۔ پانچ سال دہلی و شملہ میں رہے ۔ ۱۹۳۶ء میں لاہور میں وفات پائی اور بٹالہ میں دفن ہوئے ۔

خان بہادر سلطان محمد خان، تنولی قوم، بیتہ پلال کے خان تھے ۔ بیتہ کے پرانے دار الخلافہ بیٹر میں سکونت رکھتے تھے ۔ اعلیٰ اخلاق و کردار کے شریف زادے تھے ۔ آنریری مجسٹریٹ درجہ اول رہے ۔ ۱۹۵۰ء میں وفات پائی ۔

خان محمد فیروز خان ولد خان بہادر محمد حسین خان ساکن مانسہرہ، قوم سواتی، خاندان خان خیل

کے مشہور رفرد تھے۔ محکمہ مال میں تحصیلدار تھے۔ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ ریٹائر ہوئے اور اپنے والد بزرگوار کی جگہ آنریری مجسٹریٹ ہوئے۔ فرشتہ خو، خوش شکل اور باوقار انسان تھے۔ ۱۹۴۲ء میں وفات پائی۔

انجمن کی صدارت

شاہزادہ بخارا تا حین حیات (۱۹۰۹ء تک) اس انجمن کے سرپرست رہے اور پہلے دور کے صدر میاں حسین بخش تھے۔ میاں حسین بخش کے بعد صاحبزادہ نور محمد صاحب ساکن پشاور اور پھر خان بہادر عبدالغفور خان ساکن زیدہ (صوابی مردان) کے صدر بننا بیان ہوتا ہے۔ وہ ۱۹۰۹ء میں یہاں اسسٹنٹ کمشنر تھے اور بعد میں سیشن جج ہوکر ریٹائر ہوئے۔ آپ چیف آف زیدہ تھے۔ بڑے ہی شریف النفس انسان اور خوددار متعصب پٹھان تھے۔

شاہزادہ بخارا۔ سید عبدالملک تورہ

اس سے پہلے میں نے طبع اول میں ان کے حالات مختلف اصحاب سے معلوم کرکے لکھے لیکن اس دفعہ مجھے ان کے صحیح حالات ان کے داماد سید عبدالجبار شاہ ستھانوی مرحوم کی خود نوشت سوانح عمری (قلمی) سے معلوم ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں:

یہ شاہزادہ، بادشاہ بخارا کا ولی عہد تھا۔ روس کے ساتھ سمرقند پر جنگ کرنے کے الزام میں والد اور روس کا ملزم ہوکر وہ کابل چلا آیا۔ پھر دوبارہ حصولِ ملک کے لئے بخارا گیا، مگر کامیاب نہ ہوا۔ وہاں کے حکمران یعقوب بیگ نے اسے قید کردیا۔ اس کے گھوڑے، اسلحہ اور سوار سب لے لئے۔ روس پر احسان جتانے کی غرض سے اس کو سات سال تک قید رکھا۔ قید سے رہا ہوکر وہ براہ تبت وکشمیر ہندوستان آیا۔ حکومت ہند کے خرچ پر اس کو مکہ مکرمہ ومدینہ منورہ حج کے لئے بھیج دیا گیا۔ حج کے بعد وہ وہاں سے سلطان عبدالحمید ثانی کے پاس چلا گیا۔ (اس سلطان کا عہد ۱۸۷۶ء سے شروع ہوا) دو سال وہاں قیام کرنے کے بعد ہندوستان آیا اور پھر کابل چلا گیا۔ (عہد شیر علی خان ۱۸۶۳ء تا ۱۸۷۹ء) امیر شیر علی خان نے اپنی برادر زادی اور متوفی ولیعہد عبداللہ خان کی منسوبہ سے شادی کرادی۔ اس کے والد کے ساتھ صلح کرانے کے لئے اس کو اپنے ہمراہ بلخ لے گیا۔ کچھ خط وکتابت کی۔ مگر اس مقصد کی

تکمیل سے پہلے ہی امیر صاحب کا اسی جگہ ۱۸۷۹ء میں انتقال ہوگیا اور کابل میں محمد یعقوب خان امیر ہوگیا۔

یہ شاہزادہ بخارا ترکستان سے اس وقت کابل آیا، جب کابل میں انگریزوں کے خلاف بغاوت ہوکر لارڈ رابرٹ کابل پر قابض ہوگیا تھا۔ وہ اس شاہزادے کو اپنے ہمراہ ہندوستان لے آیا اور برطانوی گورنمنٹ سے اس کے لئے بارہ سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر کرا دی۔ جب امیر عبدالرحمن خان ۱۸۷۹ء میں کابل کا حکمران ہوا، تو اس نے بھی اس کے لئے پانچ سو روپے ماہوار مقرر کر دیا۔ کیونکہ ایام جلاوطنی میں اس شاہزادہ نے امیر عبدالرحمن خان سے بخارا میں کچھ مروت کی تھی۔

شاہزادہ بخارا کی وفات ایبٹ آباد میں نومبر ۱۹۰۹ء میں بعمر ۷۰، ۷۵ سال ہوئی۔ ان کی قبر ان کی بنا کردہ مسجد، مسجد شاہزادہ بخارا کے ایک کونے میں ہے۔ مسجد کی بنا ۱۸۹۵ء کی ہے جس کی تائید مقبرہ پر کندہ تختی کی رباعی سے ہوتی ہے اور وہ یہ ہے۔ ؎

چو شد تعمیر بہرِ دیندارے	کنم در وے بسر سجدہ گزارے
بہ ابجد گفت ہاتف سالِ ہجرت	ز او شد مسجد سید بخارے

۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۵ء

اس مسجد کی ۱۹۶۸ء میں توسیع و ترمیم ہوئی پھر ۱۹۷۱ء میں اس کو پختہ تعمیر کر دیا گیا۔ دکانات اور مدرسہ کا اضافہ ہوا۔

شاہزادہ بخارا کی بزرگانہ اور علمی حیثیت

جس وقت آپ ایبٹ آباد تشریف لائے تو ان کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ صرف شاہزادہ ہی نہ تھے، بلکہ بلند پایہ ادیب، اہلِ قلم اور اہلِ سیف تھے۔ دینی علم میں بھی کافی مہارت رکھتے تھے۔ شکل و صورت میں متشرع، وجیہہ، از بس خوبصورت اور پابند صوم و صلوٰۃ تھے۔ نہایت بارعب اور پروقار شخصیت کے مالک تھے۔ اخلاق و عادات میں بدستور بادشاہ تھے ڈپٹی کمشنر ہزارہ ان کے پاس سلام کے لئے حاضر ہوا کرتا اور سیر کے لئے جب گھوڑے پر سوار ہوکر نکلتے تو ڈپٹی کمشنر بھی ہم رکاب ہوتا تھا۔ ان کا بڑا بیٹا تیمور شاہ بھی ان کے ساتھ

بخارا سے آیا تھا۔ جو بخاری بیوی کے بطن سے تھا۔ شہزادہ تیمور شاہ نہایت خوبصورت اور دل کش جوان تھا۔ پولو، شطرنج اور شعر و سخن میں کافی دل چسپی لیتا تھا۔ عنفوان شباب میں ہی، مختصر سی علالت کے بعد اس کا انتقال ہو گیا اور اپنے والد کی بنائی ہوئی مسجد کے احاطہ میں مدفون ہوا۔

شاہزادہ بخارا نے ہزارہ میں تین چار شادیاں کیں۔ لیکن ان سب میں سے اولادِ نرینہ صرف ایک ہی صاحبزادہ سکندر شاہ پیدا ہوا۔ جو بعمر ساٹھ سال ۱۹۷۱ء میں فوت ہو گیا۔

شاہزادہ بخارا کا محل جب شاہزادہ بخارا، ایبٹ آباد تشریف لائے تو حکومت انگریزی نے ان کے حسبِ منشا، دو بہت بڑے قطعات برائے مکانات عطا کیئے۔ ایک میں انہوں نے مردانہ محل دو منزلہ بنوایا جو ان کی وفات کے بعد میں میاں مشرف شاہ کاکاخیل کے قبضہ میں آیا۔ اس کے ساتھ وسیع قطعہ پر مسجد تعمیر کرائی۔ اس کے بالمقابل ایک اور وسیع قطعہ میں حرم سرائے بنوائی۔ کوٹھی اور حرم سرائے کے گرد وسیع قطعات رکھے گئے اور حکومت نے اس کے نزدیک زمین خرید کر لوگوں کو مکانات بنانے سے حکماً منع کر دیا۔ انہی مکانات کے نزدیک اب سعادت محل اور دیگر مکانات خاناں طورو نے بعد وفات شاہزادہ صاحب بنوائے۔

شاہزادہ صاحب کی اقامت اور ان کے محلات کی مناسبت سے، ایبٹ آباد کا یہ علاقہ ملک پورہ کے نام سے موسوم ہو گیا۔

انجمن اسلامیہ کی جامعہ مسجد کے خطیب سب سے پہلے مولوی فقیر محمد پوٹھوہاری امام مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد وہ انجمن کے اسلامیہ سکول میں معلم دینیات مقرر ہو گئے اور ان کے بعد مولوی شریف اللہ امام ہوئے۔ ان کے بعد سید سرور شاہ ساکن داتہ امام مقرر ہوئے۔ وہ بہت بڑے عالم تھے لیکن احمدی دمرزائی، ہونے کی وجہ سے ان کو معزول کر دیا گیا۔

سید انور شاہ کشمیری کا قیام بھی بطور امام مذکور ہوا ہے۔ اس مسجد کے پانچویں امام مولانا محمد عبدالرحمٰن صاحب گنجوی (ساکن گنجہ نزد کوٹ نجیب اللہ) ۱۹۰۳ء سے ۱۹۲۲ء تک خطیب رہے آپ بڑے عالم، فقیہہ، متدین، صاحب عزت و اثر امام تھے۔ آپ کی وفات ۹ر نومبر ۱۹۲۳ء

میں اپنے آبائی گاؤں بعد از طویل علالت ہوئی۔

۱۹۲۲ء سے ۱۹۷۱ء تک مولانا محمد اسحٰق صاحب خطیب رہے۔ بڑے عالم، فاضل شخصیت تھے۔ آواز میں خاص رس تھا اور ان کی تلاوت قرآن مجید مسحور کن ہوتی تھی۔ آپ نے ۱۹۱۹ء میں دیوبند سے تعلیم حاصل کی۔ دو تین سال بمبئی میں مولانا عبدالقادر قصوری کے فرزند اکبر اور مشہور مجاہد اور مشہور مجاہد ملت مولوی محمد علی ایم۔ اے کنٹب کے توسط سے ایک دینی مدرسہ میں کام کیا۔ آپ کی وفات ۳۱ اگست ۱۹۷۱ء میں ہوئی اور پنج پیر کی زیارت متصل عدالت ہائے ضلع میں مدفون ہیں۔ ان کے بعد مولانا عبداللطیف ساکن مانسہرہ خطیب مقرر ہوئے۔

ایبٹ آباد کے قدیم ہندو خاندان

خاندان روچا رام

اس خاندان کے عروج کا زمانہ ۱۸۹۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ روچا رام خاندان کا بانی، ڈیرہ خالصہ نزد مانکیالہ ضلع راولپنڈی سے یہاں آیا۔ وہ کھیوڑہ کے کوئلے کا ریلوے ٹھیکیدار تھا۔ اس کے ساتھ گورنمنٹ کے دوسرے کاموں کا بھی ٹھیکیدار تھا۔ اس کے دو بیٹے پرمانند اور پربھ دیال بیرسٹر تھے۔ اس خاندان کے لوگ شریف الطبع اور اچھے لوگ تھے۔ خیراتی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے یعنی ملازمین کے ساتھ ان کا سلوک بڑا ہی خیر خواہانہ تھا۔ تعلیمی کاموں میں خوب حصہ لیتے تھے۔ روچا رام نے اپنے بیٹے لکھمی چند کی وفات پر اس کی یادگار میں، ۱۹۱۸ء میں ہری پور میں لکھمی چند خالصہ ہائی سکول بنایا۔ ہری پور تحصیل میں یہ پہلا ہائی سکول تھا، جس کا فیض آج تک جاری ہے۔ اس سکول کے استاد بہترین قابلیت و اخلاق کے مالک تھے۔ یہ سب استاد مشنری طریقہ پر اپنا فرض منصبی ادا کرتے تھے۔ ہر استاد اپنے مضمون میں ایم۔ اے کی سند رکھتا تھا۔

یہ خاندان بعد میں، لکڑی کے کاروبار میں بھی بہت مشہور ہوا۔ ان کی رہائش سابق وڈلاک ہوٹل کے وسیع علاقہ میں تھی۔ اس کے ایک حصہ میں موجودہ زنانہ ہائی سکول ہے۔ پاکستان بن جانے کے بعد اس ہوٹل میں مہاجرین آباد ہو گئے۔ اسی ہوٹل میں ان کے دفاتر بھی تھے۔ یہ زنانہ سکول روچا رام نے اپنے خرچ سے بنوایا تھا۔ یہ خاندان شراب اور افیم کے ٹھیکیدار

بھی تھے۔ بہت بڑی جائداد کے مالک تھے۔ ایبٹ آباد، نتھیا گلی میں بہت سے بنگلے اور کوٹھیاں رکھتے تھے۔ ڈونگا گلی میں موچھ پوری ہوٹل ان کا تھا۔ موجودہ تاج محل سینما کی جگہ ان کی ایک سرائے تھی۔

روچارام ان پڑھ تھا۔ لیکن اس کا طور طریقہ تعلیم یافتہ اشخاص کا سا تھا۔ مذہباً سکھ طریقہ رکھتا تھا۔ اس کے پانچ بیٹے تھے۔ لکھمی سنگھ، لکھمی چند، پرمانند، پربھ دیال اور رچھپال سنگھ۔ ان میں صرف رچھپال سنگھ مونا تھا۔

پاکستان بن جانے کے بعد اس خاندان کا ایک ہی فرد، المعروف شیخ محمد اقبال یہاں رہ گیا۔ بڑا ہی شریف انسان ہے۔

سیٹھ جوہڑلال

یہ دوسرے، مشہور ہندو خاندان کا فرد تھا۔ اور ایبٹ آباد شہر کا پہلا بینکر تھا۔ موجودہ جونیئر برن ہائی سکول کے سامنے اس کی رہائش گاہ اور دفتر تھا اس نے اغلباً ۱۸۷۶ - ۷۵ء میں البرٹ وکٹر اینگلو سنسکرت سکول بنایا۔ یہ سکول اس وقت کے لحاظ سے وسیع عمارت میں تھا۔ پاکستان بن جانے کے بعد چند سال گورنمنٹ کالج رہا۔ نیا کالج بن جانے کے بعد یہ سکول رہا اور اب ہائی سکول ۳ ہے۔

سیٹھ جوہڑلال بڑا نیک نام انسان تھا۔ اس کا بیٹا، جے دیوا بیرسٹر تھا۔

ایبٹ آباد کا بوہرہ سیٹھ خاندان

"بوہرہ" ہندی میں تاجر کو کہتے ہیں۔ چونکہ اس خاندان کے اکثر لوگ تجارت کے ذریعے سے بسر اوقات کرتے ہیں لہٰذا اس نام سے موسوم ہوئے۔

دو خاندان دجو یک جدی ہیں، ایک ساتھ ہی ریاست کچھ علاقہ کاٹھیاوار سے آئے یہ خاموش طبیعت کے کاروباری افراد ہیں اور اپنے کام میں مشغول رہتے ہیں۔ آپس ہی میں قرابت داری رکھتے ہیں۔ ایبٹ آباد کے مرکزی حصہ میں کافی قابل قدر سکنی جائیداد ہے۔ انجمن اسلامیہ اور میونسپل کمیٹی میں قابل قدر حصہ لیتے رہے۔ ایک خاندان کے اجداد میں سے ماموں جی علی بھائی، انجمن اسلامیہ کے ابتداء سے تا ۱۹۲۵ء خزانچی رہے۔ اسی خاندان کے ایک فرد، آدم جی، میونسپل کمیٹی کے ممبر اور نائب صدر رہے۔

دوسرے خاندان سے موسیٰ جی کمیٹی کے ممبر رہے ہے۔ سیٹھ فدا علی مرحوم (وفات ۵ جنوری ۱۹۶۹ء) بھی کمیٹی کے ممبر رہے ہے۔ اعلیٰ سیرت و کردار کے مالک تھے۔ نیک کاموں میں امداد کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔

اس خاندان کے ابتدائی حالات، برما شیل دی پٹرول کمپنی، کے ماہوار رسالہ میں تحریر ہیں:

"سیٹھ ماموں جی کے والد سیٹھ علی بھائی ۱۸۶۰ء میں ریاست کچھ دکا ٹھیاوار سے لاہور آئے۔ بعد میں راولپنڈی میں مقیم ہو کر کاروبار شروع کیا۔ ان کی وفات ۱۸۰۰ء میں ہوئی۔

ان کے دو بیٹوں سیٹھ ماموں جی عمر ۱۲ سال اور سیٹھ آدم جی عمر ۱۰ سال نے کاروبار کو سنبھالا۔ یہ دونوں راولپنڈی سے نقل مکانی کر کے ایبٹ آباد آ گئے اور جنرل مرچنٹ کی دکان بنام ماموں جی علی بھائی کھولی۔ ۱۹۲۰ء میں پٹرول کا کاروبار بھی ان کے حوالے کر دیا گیا۔

نواں شہر کا ساہنی خاندان

رائے بہادر الیشر داس بیسویں صدی عیسوی کے اول میں ایبٹ آباد کی بہت مشہور شخصیت تھی۔ اس میں ہندوانہ تعصب کی شدت نہ تھی۔ مسلمانوں سے بھی گہرا تعلق رکھتا تھا۔ باوجاہت خاندان کے فرد ہونے کی وجہ سے بڑا شائستہ مزاج تھا۔ آنریری مجسٹریٹ درجہ اول رہا۔ ہزارہ میں بہت بڑی جائداد رکھتا تھا۔ بہت سے ہوٹل بنائے۔ اور پاکستان کا پہلا سب سے بڑا چینی کا کارخانہ (تکمیل ۱۹۵۰ء) پریمیر شوگر مل مردان، اسی کا بنایا ہوا ہے۔ پاکستان بن جانے کے بعد بھی یہاں آ نار ہا حکومت پاکستان نے اس کی جائداد کو اسی کے حوالہ میں رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا بیٹا، پاکستان کے پہلے وزیر اعظم کا ہم زلف تھا۔ جب تک زندہ رہا۔ اس کا تعلق پاکستان سے برابر رہا۔ بلکہ دونوں مملکتوں کا شہری شمار ہوتا تھا۔ اگر اس کی زندگی میں کشمیر کا مسئلہ حل ہو جاتا تو وہ پاکستانی شہری بن جاتا۔

رہائش

عادات اور طور طریقے امیرانہ اور شریفانہ تھے۔ رہائش کے لئے نواں شہر میں آبائی شاندار گھر کے علاوہ بعد میں خود ایک عظیم الشان بنگلہ گاؤں کے ساتھ وسیع احاطہ میں بنایا۔ جس میں ذاتی رہائش، دفتر، عدالت کے کمرے تھے۔ پانی اور بجلی کا اپنا انتظام تھا۔ آجکل یہ بنگلہ نوابزادگان ہوتی (مردان) کی ملکیت ہے۔ انہوں نے اس کو از سر نو اپنی خواہش کے

مطابق بنایا اور عالیشان طور پر بنایا۔

پاکستان ملٹری اکاڈمی، کاکول

یہ اکاڈمی، کاکول گاؤں کے نزدیک پہاڑ کے دامن میں ہے۔ یہاں جنوبی افریقہ کے بوئر (ہالینڈ، ڈچ قوم کے افراد) کے قیدیوں کی رہائش کے لئے بارکیں بنائی گئی تھیں، جو ۱۸۹۹ء میں یہاں لائے گئے تھے۔ اس قوم نے انگریزی کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ انگریزی قوم کی عادات کے خلاف عام لوگوں سے بڑے تپاک سے ملتے اور مقامی لوگوں میں گھل مل جاتے۔ یہ لوگ کاریگر اور چھوٹے صنعتکار تھے۔ اپنے ہاتھ سے تیار کردہ اشیاء، مثلاً دوات، قلمدان وغیرہ، بازار میں فروخت کیا کرتے تھے۔ جب جنوبی افریقہ سے صلح ہو گئی، تو ان کو واپس بھیج دیا گیا اور ان کے جانے کے بعد ان بارکوں میں ہندوستانی توپخانہ کی چند کمپنیاں، خاص کر گورکھے رکھے گئے۔

پاکستان بن جانے کے بعد یہاں پاکستان ملٹری اکاڈمی، فوجی افسران کی تربیت گاہ بنائی گئی۔ پرانی بارکوں کی جگہ نئی پختہ اور دو تین منزل عمارتیں بن گئی ہیں۔

بوئر قیدیوں کے لئے جب بارکیں بنائی گئی تھیں، تو ہزارہ میں یہ نئی طرز تعمیر تھی، جس کو بنگلہ کہا گیا اور لوگوں میں اس کے چرچے ہوئے۔ بچپن میں سنا ہوا، ایک عوامی گیت، مجھے آج تک یاد ہے ؎

کاکولاں بنگلہ، نواں پیا - چل ویکھن چلئے کیہا جیہیا

ہزارہ کی قدیم شاہراہ

کشمیر کو جانے کے لئے ہزارہ کی جس شاہراہ سے گزرنا پڑتا ہے، وہ حسن ابدال سے شروع ہو کر کشمیر تک جاتی ہے۔ اس پر مغلوں، درانیوں، سکھوں اور انگریزوں کے لشکر اپنے اپنے وقت میں آتے جاتے رہے۔ ۸، ۱۰ میل کی مسافت پر ایک سرائے ہوتی تھی، جو معمولی قسم کی ہوتی تھی، جہاں رہائش، کھانے پینے اور سواری کا انتظام ہوتا تھا۔

اس شاہراہ پر پیدل چلنے والوں کے علاوہ گھوڑوں، گھوڑا گاڑیوں (تانگوں اور یکوں)

اور بیل گاڑیوں سے سفر کیا جاتا تھا۔

حسن ابدال سے ایبٹ آباد تک مختلف مقامات پر اڈے ہوتے تھے اور تمام مسافر ۱۹۱۱ء سے پہلے اسی راستہ سے سفر کیا کرتے تھے۔ ۱۹۱۱ء میں ٹیکسلہ سے حویلیاں تک ریلوے کا اجرا ہوا اور ذرائع نقل و حرکت میں آسانی پیدا ہو گئی۔ ابتداء عہد انگریزی میں حسن ابدال سے ایبٹ آباد ایک ڈاک ٹانگہ سروس تھی، جس میں ڈاک بھیجی جاتی تھی اور انگریز افسران سفر کیا کرتے تھے۔ اس ڈاک سروس کی ٹھیکیداری اول اول ایوب خان درانی (امیر یعقوب خان کا بھائی)، اور اس کی اولاد کے پاس رہی۔ یہ انقلاب کابل میں بھاگ کر ہندوستان آ گئے تھے۔ ان کے بعد ایک پارسی کمپنی، دھن جی بھائی، ٹانگہ سروس چلایا کرتی تھی۔ یہ ٹانگہ حسن ابدال سے ایبٹ آباد ۱۲-۱۴ گھنٹے میں پہنچ جایا کرتی تھی۔ آٹھ دس میل کے فاصلہ پر سٹیشن ہوتے تھے۔ جہاں تازہ دم دو گھوڑے (اس ٹانگہ کے آگے دو گھوڑے ہوتے تھے)، بدلے جاتے۔ ہر اسٹیشن پر تازہ دم گھوڑے تیار رکھے جاتے تھے۔ حسن ابدال تا ایبٹ آباد حسب ذیل سٹیشن تھے۔

۱۔ حسن ابدال تا گھیڑہ (نزد ڈینیاں)، ۲۔ گھیڑہ سے ہری پور (یہ اسٹیشن موجودہ سنٹرل جیل ہری پور کسی جگہ پر ہوتا تھا۔ اس وقت یہ بڑا میدان تھا۔ اس کے ملحق، نالہ درویش کے کنارے پر پرانا گاؤں درویش آباد تھا۔ درویش اب اس نالہ کے شمال مغربی کنارہ پر بر لب سڑک جرنیلی آباد ہو گیا ہے۔ ۳۔ ہری پور سے کھولیاں کلاواں۔ ۴۔ کھولیاں کلانواں سے سلطانپور ۵۔ سلطان پور سے کھوتہ قبر۔ ۶۔ کھوتہ قبر سے ایبٹ آباد۔

عام ٹانگے، جن کو یکہ کہا جاتا تھا، بھی اسی راستہ پر چلتے تھے۔ جس کے آگے ایک گھوڑا ہوتا تھا۔ ہر چڑھائی اترائی پر سواروں کو اترنا پڑتا تھا۔

تجارت کا مال بیل گاڑیوں کے ذریعہ بھیجا جاتا تھا۔ یہ گاڑیاں دس دس یا بیس بیس کے قافلہ میں یکجا چلتی تھیں اور حسن ابدال تا کشمیر جایا کرتی تھیں۔ ان کی آمد و رفت میں ڈیڑھ دو ماہ لگ جاتے تھے۔

ہری پور شہر

اس شہر اور قلعہ کی بنیاد و تعمیر ہری سنگھ نے ۱۸۲۲ء میں کی تاکہ اس علاقہ پر مکمل کنٹرول

حاصل کیا جا سکے۔ یہ قلعہ میدانِ ہزارہ کی خود مختار اقوام کے قلب میں بطور خنجر کے رکھا گیا اور قلعہ کی فوج اور دیگر اہل کاران حکومت کی سہولت اور ان کی ضروریات زندگی کے مہیا کرنے کے لئے شہر ہری پور بنایا۔ یہ شہر بہترین نقشہ پر بنایا گیا اور قلعہ بند شہر تھا۔ قلعہ ہرکشن گڑھ کے گرد بیس فٹ گہری خندق بنائی گئی، جس کے آثار اب تک موجود ہیں۔ اسی طرح شہر کے بعض حصوں کی مضبوط خام حفاظتی دیوار (قلعہ بندی)، کے آثار اب بھی کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ شہر کے چاروں کونوں پر چار برج تھے، جن میں حفاظتی دستے رہا کرتے تھے۔

اس شہر کے چھ دروازے تھے۔ جن میں شیر نوالہ دروازہ آج بھی مشہور ہے۔ جس کے دونوں طرف شیروں کے مجسمے (مٹی، چونے سے بنے ہوئے) اب بھی موجود ہیں۔ شہر کے وسط میں شمالاً جنوباً چوڑی سڑک ہے، جو تقریباً تین فرلانگ لمبی ہے اور شہر کے بڑے بازار سے گزرتی ہے جس پر بڑے بڑے ساہوکاروں کے دفاتر اور کاروباری دکانیں تھیں۔ دو سڑکیں شرقاً، غرباً مساوی فاصلہ پر بنی ہوئی تھیں اور بڑی سڑک سے آر پار تقریباً ایک ایک فرلانگ لمبی تھیں اور جو شہر کو مستطیل رقبوں میں تقسیم کرتی تھیں۔ ان سڑکوں کے ہر دو جانب مختلف پیشہ وروں مثلاً لوہاروں، ترکھانوں، تیلیوں وغیرہ کی دکانیں تھیں۔ مشرقی حصہ شہر میں برلب سڑک نزد شیرانوالہ دروازہ، بازار لوہاراں اور دوسری سڑک بطرف جامع مسجد کی سڑک پر موچی بازار تھا۔ ہندوؤں کی آبادی کی اکثریت مشرقی کونہ شہر متصل موجودہ پولیس چوکی آباد تھی۔ باقی تین ٹکڑوں میں مسلمانوں کی اکثریت اور ہندوؤں کے چند مکانات تھے۔

ہری سنگھ کے عہد میں یہ شہر اپنے عروج کو پہنچا۔ حقیقت میں ہزارہ کے میدان میں سکھوں کی حکومت کے عروج کا زمانہ ہری سنگھ کی حکومت کا زمانہ تھا۔

اس شہر کو پہلا حادثہ اس وقت پیش آیا جب قلعہ و شہر کو ملکی لوگوں نے بہ عہد مولراج حاکم ہزارہ ۱۸۴۵ء میں جلا دیا۔ لیکن جلد ہی پھر سے آباد ہو گیا۔ سکھوں کے عہد کے بعد انگریزی دور میں اس شہر میں ہندوؤں کا زور اور آبادی زیادہ ہوتی گئی۔ تمام ملازمت، تجارت اور کاروبار ان کے ہاتھ میں آگیا۔

۱۹۴۷ء میں برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کے ہنگامہ میں یہ شہر پھر جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔ پر رونق

بازار جس میں عالی شان دکانیں اور چوبارے تھے، جل کر زمین بوس ہو گئے۔ شہری آبادی کے خوبصورت مکانات اور حویلیاں خاکستر ہو گئے۔ یہ برباد شدہ شہر تقریباً بیس سال تک اپنی حالت پر بزبان حال نوحہ کناں رہا۔ آخر کار اس شہر کی تعمیر و تزئین امین خان ترین ساکن درویش کے زمانہ چیرمین ٹاؤن کمیٹی ہری پور میں ہوئی۔ ترتیب و ترغیب سے شہر کو پھر سے بارونق اور پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت بنا دیا گیا۔ بازاروں کی وسعت زیادہ ہو گئی۔

شہر ہری پور کے قابل ذکر ادارے، خاندان اور افراد

۱۔ انجمن اسلامیہ رحمانیہ ہری پور اس کی بنیاد حضرت خواجہ عبدالرحمٰن صاحب چھوہرویؒ نے ۱۹۰۲ء میں اپنے بابرکت ہاتھوں سے رکھی اس کے مصارف تعمیر و دیگر اخراجات، ان کے مریدان بنگال و برما نے برداشت کئے۔ حضرت چھوہرویؒ اپنی زندگی میں طلباء کا کھانا، اپنے گھر چھوہر شریف، جو ایک میل کے فاصلہ پر ہے، سے بھجوایا کرتے تھے۔ اس دارالعلوم دجوان کی وفات کے بعد بہت وسیع ہو گیا ہے، یہں درس نظامی کا مکمل انتظام ہے۔ دورۂ حدیث بھی ہوتا ہے۔

۲۔ انجمن اسلامیہ ہری پور یہ انجمن چند مخلص اور محب اسلام افراد کی کوشش سے ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں قائم ہوئی۔ اس کے قیام کا محرک، ایک لاوارث لاش کی تدفین میں بے حرمتی کے واقعہ سے ہوا۔ جو میونسپل کمیٹی کے خاکروبوں نے شہر کے گندے نالے کے پانی سے نہلا کر، کپڑوں میں لپیٹ کر ایک گڑھے میں دفن کر دی تھی۔

انجمن کے اغراض و مقاصد ۱۔ مسلمانوں کی مذہبی، اخلاقی، تعلیمی اور اقتصادی حالت کی بہتری ۲۔ درس قرآن، حدیث و فقہ کا انتظام ۔ ۳۔ پابندی شریعت کی ترغیب، مسلمانوں کو دعوت اتحاد و تنظیم ۔ ۵۔ اوقاف اسلامیہ کی نگرانی ۔ ۶۔ لاوارث مردوں کی تجہیز و تکفین۔

بانی ممبران ۱۔ صدر بابو نبی بخش فرزند مولوی امام الدین صاحب پٹواری، جو بابو احمد بخش مرحوم کے بڑے بھائی تھے۔ بابو نبی بخش ۱۹۴۲ء میں فوت ہوئے۔ یہ چار بھائی تھے۔

بابو احمد بخش ڈپٹی کمشنر ہزارہ، اردو دفتر کے سر دبیر تھے۔ ان سے چھوٹے بابو عزیز الرحمن اپنی قابلیت سے پٹواری سے تحصیلدار بنے اور ریونیو کمشنر سرحد کے ذاتی معاون یا محکمہ مال کے بہترین دماغ تھے۔ اہلِ وطن کی امداد فرضِ منصبی سمجھ کر کرتے تھے۔ چوتھے بھائی بابو عبدالرحمن تھے، جو پٹواری تھے۔

بابو احمد دین پٹواری کے چچا حاجی پیر بخش صاحب، قانون گو نے ۱۸۷۲ء کے بندوبست ہزارہ میں کام کیا۔ اس بندوبست کی جامعیت بے مثال تھی۔ آج تک اس سے بہتر بندوبست نہ ہو سکا۔ بلکہ اس کے مقابل میں سب بندوبست نامکمل اور ناقابلِ اعتبار رہے۔ بلکہ ایک سرسری خانہ پری معلوم ہوتی ہے۔

بابو امام الدین ۱۹۲۹ء میں ہری پور آ گئے۔ اور جنرل مرچنٹ کی دکان کھولی۔ وہ اس سے پہلے عرصہ تک لاہور رہے اور انجمن حمایت اسلام لاہور کے امور میں دلچسپی لیتے رہے۔ اپنے لاہور کے تجربہ کی بناء پر ہری پور میں انجمن اسلامیہ ہری پور کی تشکیل کی۔

۲۔ ماسٹر منظفر الدین سیکرٹری بنے۔ آپ درزی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ قومی اور اسلامی کاموں (سیاسی نہیں) کے مخلص کارکن ہیں۔ ان کے والد مرحوم سائیں یا میین ایک فقیر منش آدمی تھے۔ اور آپ اور ان کی اولاد پر سائیں مرحوم کے اطوار و عادات نقش ہیں۔ اگرچہ آپ ان پڑھ ہیں، مگر قابلیت اور اخلاص فی العمل پر سیکرٹری چنے جاتے رہے ہیں۔

۳۔ لالہ محمد اکبر خان قریشی مرحوم۔ معزز خاندان رسالداریان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ تین چار بار صدر منتخب ہوتے رہے۔

۴۔ بابو عبدالعزیز صاحب۔ آپ ماسٹر منظفر الدین کے چھوٹے بھائی ہیں۔ میٹرک پاس ہیں آپ کی زندگی سماجی کاموں میں انہماک اور کارکردگی کی نمایاں مثال ہے۔ آپ محکمہ ڈاک میں پوسٹ ماسٹر کی پوسٹ سے پنشن یاب ہوئے اور ہمہ تن قومی اسماجی کاموں میں مصروف ہو گئے اس زمانہ میں ان جیسا قابل، ہمہ تن مصروف کارکن بہت کم نظر آیا۔ آپ انجمن کے مستقل اور مستعد ممبر ہیں۔ انہوں نے ہری پور میں سول پنشنرز سوشل ویلفیئر ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی اور بڑی خوش اسلوبی اور تن دہی سے چلا رہے ہیں۔

۵۔ حاجی لعل دین صاحب خلف مستری فضل دین۔ ٹھیکہ دار ٹانگہ ہائے انجمن کے سرگرم کارکن رہے۔ خاکسار تحریک سے گہری دلچسپی لیتے رہے۔ بلادِ اسلامیہ کی سیاحت کی۔

۶۔ خٹک خاندان سے سیٹھ عبدالرحمٰن (والدِ سیٹھ عبدالحمید) اور ملک عبدالرحمٰن نے اور لوہاروں کے خاندان سے مستری فقیر محمد اور تیلی خاندان سے منشی بہادر خان اوورسیر نے اس انجمن کی بڑھ چڑھ کر خدمت کی۔ حاجی اللہ دتا صاحب صراف نے بحیثیت خزانچی اور بعد میں کچھ عرصہ بطور صدر انجمن خدمت سرانجام دی۔

انجمن کے کارنامے

تعمیر جامع مسجد چوک بازار

اس جگہ ۱۹۱۲ء سے پہلے ایک چھوٹی سی مسجد تھی، جس میں چند چٹائیاں ہوتی تھیں۔ مسجد کی غور پرداخت کا اہتمام ایک معمر سید صاحب کرتے تھے۔ (ان کا نام یاد نہ رہا) وہی امامت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ اپنی گزراوقات کے لئے، مسجد کے سامنے ایک دکان، قہوہ کی چلاتے تھے۔ آپ پشاور کے رہنے والے تھے۔ ان کی امامت کا زمانہ اور جمعہ کا خطبہ پڑھنا، اب تک میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے۔ (میں ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۸ء تک مڈل اور ہائی سکول میں زیر تعلیم رہا) ان کا معاون علی محمد ساکن موضع درویش تھا۔ مسجد کے ساتھ ہی اس کی سیخ کباب کی دکان تھی۔

کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کی اولاد ہری پور میں موجود ہے۔ شاہ صاحب کے فرزند کا نام آغا میر بادشاہ بتلایا جاتا ہے اور علی محمد صاحب کے فرزند ٹاؤن کونسلر رہے ہیں۔

اس مسجد کی توسیع و تعمیر نو کا اعزاز محمد فرید عل خاں، خاندان رسالداریان ہری پور کے مشہور فرد کو ملا۔ وہ بڑے بہادر اور بارعب انسان تھے۔ غیر مسلموں کی شدید مخالفت کے باوجود ۱۹۱۸ء میں راتوں رات اپنے ذاتی مکان کی تعمیر کے لئے جمع کردہ سامان تعمیر سے مسجد تعمیر کر دی۔

اس مسجد کو انجمن اسلامیہ نے ۳۴-۱۹۳۳ء میں دو منزلہ وسیع عمارت کی شکل میں تعمیر کر دیا۔ مسجد کو خود کفیل کرنے کے لئے اس کے نیچے چند دکانیں بھی تعمیر کر دیں۔ محکمہ اوقاف سرحد نے ۱۵ مارچ ۱۹۵۹ء میں اپنے قبضہ میں لے لیا۔

انجمن اسلامیہ کا دوسرا کارنامہ انجمن اسلامیہ کا دوسرا کارنامہ ریلوے اسٹیشن ہری پور کے نزدیک وسیع اور شاندار عیدگاہ کی تعمیر ہے۔ اس کے لئے زمین غلام خان ترین رئیس پانڈک نے مفت دی تھی اور بنیاد نواب خانزمان خان والئی ریاست امب نے ۵ ار دسمبر ۱۹۳۳ء نے رکھی اور تین ہزار روپیہ کا عطیہ بھی دیا۔

یتیم خانہ کا قیام ہری پور میں یتیم خانہ کا قیام بھی اسی انجمن کا مرہون منت ہے۔ اس میں دینی اور دنیوی تعلیم کے ساتھ دستکاری مثلاً درزی، بڑھئی کا کام، چمڑے کے بکس و سوٹ کیس کی ساخت کی عملی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اس کی عمارت کا سنگِ بنیاد نواب محمد فرید خان والئی ریاست امب نے ۱۴ر مئی ۱۹۴۴ء میں رکھا اور تعمیر کے لئے دس ہزار روپیہ کا عطیہ بھی دیا۔

۴۔ آباد کاری مہاجرین کے کام میں بھی انجمن نے بھرپور حصہ لیا۔

۵۔ تجارت واقتصادیات کے ضمن میں مسلم تجارتی کمپنی لمیٹڈ ۵ رفروری ۱۹۳۵ء میں بنائی گئی، لیکن کامیاب نہ ہوسکی۔

۶۔ مسلم گرلز سکول کا اجراء۔ انجمن کے ممبران کی متفقہ کوشش، زیر سرکردگی صوفی عبدالعزیز صاحب، جائنٹ سیکرٹری انجمن ۱۹۳۸ء میں کیا گیا۔

۷۔ انجمن کے ایک معزز رکن علامہ ابوالخیر صاحب مرحوم دفات ۲۱ر جون ۱۹۷۴ء نے اپنی ذمہ داری پر یکم جولائی ۱۹۶۶ء میں "ماڈرن پبلک سکول" کا اجراء اپنے خرچ سے کیا اور تمام انگریزی سکولوں سے بہتر تعلیم کا کام سرانجام دیا۔

۸۔ مال مویشی کی منڈی کا اجراء۔ لالہ محمد اکبر خان قریشی نے اپنی زمین مفت دے کر منڈی کا اجراء کیا۔ یہ سکیم اتنی کامیاب ہوئی کہ ڈسٹرکٹ بورڈ ہزارہ نے یہ منڈی اپنی تحویل میں لے لی اور اسی کے نمونہ پر خان پور، حویلیاں اور مانسہرہ میں منڈیاں قائم کردیں۔

ہری پور کے مشہور خاندان واکابر

ہری پور کی ابتدائی آبادی میں کسی مشہور خاندان کی آبادی کا ذکر نہیں ملتا۔ عموماً اس شہر میں

پیشہ ور لوگ بھی ہری سنگھ نے آباد کئے۔

عہدِ سکھاں کے بعد چند مسلمانوں میں سے ایک معزز خاندان، خاندان قریشی، بھی یہاں آکر آباد ہوا، یا چند ہندو تجار اس میں آباد ہوئے۔

عہدِ انگریزی کے ابتدا میں ایک قابلِ ذکر مجاہد و عالم مولوی حیات گل صاحب اس شہر میں رونق افروز ہوئے۔ جو مجاہدین سرحد کے مرکزی رہنما کی حیثیت سے یہاں مقیم رہے۔ آپ کی زندگی کے مختصر لیکن مستند حالات یہ ہیں، جو مجھے ایک دستاویز بذریعہ خان مہدی زمان خان مرحوم کی چھوٹی صاحبزادی امتہ الحفیظ سے ملے تھے۔

مولوی حیات گل کا شجرہ[1] (ان کی اپنی تحریر کے مطابق) فقیر حیات گل ابن محمد بشیر ابن شیخ محمد نذیر، ابن شیخ گلیم، ابن شیخ محمد سلطان، ابن شیخ سید محمود، ابن شیخ گل محمد، ابن مہدی خان خلیفہ محمد غازی (دریدہ ہے) مشہور بہ سالار[2]۔

زمانۂ حیات آپ کی ایک تحریر مورخہ ۱۸۰۷ء سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ۱۸۰۷ء میں حین حیات تھے اور آپ کی خط و کتابت مولینا عبداللہ امیر جماعت مجاہدین (دورِ امارت ۱۸۶۲ء تا ۱۹۰۲ء) سے رہی۔

مولینا عبداللہ کی وفات ۲۹ نومبر ۱۹۰۲ء میں ہوئی۔

شادی مولوی حیات گل صاحب کی پہلی شادی راجہ جہانداد خان، سلطان خان پور کی چھوٹی ہمشیرہ سے ہوئی۔ اپنی شادی کے متعلق مولوی صاحب نے اپنی دوسری بیوی کے بیٹے سے مقدمہ کے سلسلہ عدالتی بیان میں تحریر فرماتے ہیں:

"اقرار کرتا ہوں کہ مسماۃ بیگم جان دختر راجہ حیدر بخش خان[3] جاگیردار موضع خان پور بہ تقدیر الٰہی

---

[1] اس شجرہ میں سات پشت کا اندراج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا خاندان اٹھارھویں صدی عیسوی کے شروع میں اس علاقہ میں آباد تھا اور صاحب علم گھرانا تھا۔

[2] گویا مولوی حیات گل صاحب کے اجداد سات پشت سے یہاں آباد تھے۔ سالار غازی کی قبر ہری پور تربیلا روڈ پر موضع تھپلہ کی جانب غرب سڑک کے کنارے، پہاڑ کے دامن میں ہے۔

[3] وفات ۱۸۶۵ء۔

میرے نکاح ...... دریدہ ہے ۔)

سلطان صاحب جہانداد خان[1] سخت بیمار ہو گئے تو انہوں نے خداوند تعالیٰ و تقدس کی نذر مانی کہ اگر خداوند کریم مجھ (جہانداد خان) کو صحت عطا فرمائے تو میں (جہانداد خان) جو بہت پیاری چیز ہوگی، اپنے رب کریم کی نذر کروں گا۔ پس اللہ تعالیٰ نے سلطان صاحب کو شفا بخشی تو سلطان صاحب نے وفائے عہد فرمایا کہ مجھ (مولوی حیات گل) سے بہت پیاری ہمشیرہ کا..... (دریدہ ہے) ..... بیگم جان ..... دریدہ ہے ..... ہی آپ فقیر ہیں اور میرے استاد ..... دریدہ ہے ..... نکاح کر دیتا ہوں اور روٹی کپڑا میری ہمشیرہ کا میرے ذمہ ہوا۔ لہٰذا موضع کھوئی ناڑہ پنڈ سے تیسرا حصہ ہمشیرہ کو جاگیر دے دیا ...... دریدہ ہے ۔

اس کے بعد ہری پور شہر کی ایک حویلی کا ذکر ہے، جو راجہ جہانداد خان نے فتح نور تیلی، (مولوی حیات گل ہری پور میں تیلیوں کی مسجد کے امام تھے) سے چار سو تیس روپے میں خرید کر مولوی صاحب کو دے دی۔ جو مولوی صاحب نے اپنی بیوی بیگم جان ہمشیرہ راجہ جہانداد خان کو مہر میں لکھ دی۔

اس تحریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، ان کی کچھ زمین لالوگلی میں تھی۔ ان کی بیوی کا مہر دس ہزار روپیہ مقرر ہوا تھا، لیکن انہوں نے اس کو کچھ نہ دیا تھا اور اس کو تمام خرچ اس کا بھائی دیتا تھا۔

اولاد راجہ جہانداد خان کی ہمشیرہ سے ان کی ایک صاحبزادی ہی پیدا ہوئی، جس کی شادی انہوں نے شیر محمد خان بن خانیزمان خان، خان کھلابٹ سے خالباً ۱۸۷۰ء میں کر دی۔ جس سے مہدی زمان خان مرحوم جیسا صاحبِ علم و عمل بیٹا پیدا ہوا۔ جن کی وفات نومبر ۴، ۱۹ء میں بعمر

---

[1] راجہ جہانداد خان کی ولادت ۱۸۴۸ء ہے۔ آپ ۱۸۷۲ء بندوبست ہزارہ میں موجود تھے۔ آپ صاحب علم انسان تھے۔ ۱۸۸۰ء میں شاہی مسجد لاہور میں خطبہ اور نماز جمعہ پڑھائی اور مقتدیوں میں سر سید احمد خان مولوی ذکاء اللہ اور مولوی نذیر احمد جیسے لوگ تھے۔

۷۶-۷۵ سال ہوئی۔

مولوی صاحب نے دوسری شادی موضع ڈھینڈہ میں کی جس سے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ اس بیٹے سے وہ ناراض رہے کہ اس نے باپ سے مقدمہ بازی شروع کر دی تھی۔ وہ اپنے اس بیٹے کو اپنی تحریر میں والدکش کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

قریشی خاندان خاندان رسالداریان کے نام سے یہ مشہور ہیں۔ ان کے اجداد بدخشاں سے ستھانہ (تربیلہ کے سامنے برلب دریائے سندھ) پھر وہاں سے اٹھ کر عہدِ انگریزی میں ہری پور آگئے۔

اس خاندان کی ایک مجاہد و نامور ہستی لالہ محمد اکبر خان قریشی مرحوم تھے۔ ۱۹۲۰ء میں انگریزوں کے ترکوں کے ساتھ ظالمانہ صلح نامہ کی بناء پر پانچ ہمراہیوں کے ساتھ اسلامیہ کالج پشاور سے پیدل افغانستان روانہ ہوئے اور حاجی صاحب ترنگ زئی (مقیم علاقہ آزاد مہمند) کے ہاں پہنچے۔ حاجی صاحب موصوف ۱۹۱۶ء میں (دوران جنگ عالمگیر ۱۸-۱۹۱۴ء) اعلان جہاد کر کے ہجرت کر گئے تھے۔ وہاں ان کی ملاقات مجاہد سرحد قاضی عبدالولی صاحب ساکن پشاور سے ہوئی۔ جو ۱۹-۱۹۱۸ء کی سیاسی تحریک کے دوران گرفتاری سے بچ کر علاقہ آزاد میں چلے گئے تھے۔ افغانستان میں وہ حکومت کی مجلس مشاورت کے رکن رہے۔ آپ انگریزی، فارسی، پشتو، اردو اور ترکی میں مادری زبان کی طرح گفتگو کر سکتے تھے۔

لالہ محمد اکبر خان علاقہ آزاد سے افغانستان اور پھر روس چلے گئے۔ کم و بیش دس سال وہاں گذارنے کے بعد جب واپس آئے تو حکومت انگریزی نے ان کو گرفتار کر لیا۔ تقریباً دس سال جیل میں گذارے۔ رہائی پر رفاعی اور قومی کاموں میں حصہ لیتے رہے۔ زمینداری اخاص کر باغبانی میں بطور شغل وقت گزارتے رہے۔

آخری ایام زندگی خاموشی سے گذارتے رہے۔ کسی سیاسی تحریک میں حصہ نہ لیا۔

آپ کے چھوٹے بھائی محمد اصغر خان پیکر حلم اور دیانت ہیں۔ مسلم باعمل صالح ہیں۔ سرکاری ملازمت محکمہ امداد باہمی میں کی اور نیک نام رہے۔ پنشن پر آجانے کے بعد فلاحی، اصلاحی اور تبلیغی کاموں میں بھرپور حصہ لے رہے ہیں۔

ماضی قریب میں ہری پور شہر کے مندرجہ ذیل اصحاب، صاحبِ عزت و اثر تھے حاجی عبدالکریم صاحب اور حاجی عبدالرحمن صاحب

تاریخِ آزادیٔ ہندوستان کا ایک نامور مجاہد

حکیم عبدالسلام ہزاروی آپ سیاسی[1]، علمی و طبی دنیا کے نامور فرد تھے۔ اپنی ستر سالہ زندگی کا ساتواں حصہ، پسِ دیوارِ زنداں گزارا۔ انگریز کے جور و استبداد کے سامنے کبھی نہیں جھکے۔

پیدائش آپ کی پیدائش موضع میرپور (علاقہ کنڈی کاہل)، ہری پور شہر سے ۳ میل دور، میں ہوئی۔ ان کے والد مولانا محمد دین ایک جید عالم اور مجاہد صفت بزرگ تھے۔

تعلیم ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی۔ ابھی چھوٹے ہی تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ تعلیم کے حصول کی خاطر گھر سے نکل پڑے۔ مختلف دینی کتب پڑھنے کے بعد علم طب کی تکمیل کی اور ۱۹۲۰ء میں ہری پور شہر میں طب کا آغاز کیا۔

سیاسی زندگی ۱۹۲۷ء میں ان کے مطب میں کانگریس کمیٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۹۲۸ء میں انہیں ہزارہ کانگریس کمیٹی کا صدر چن لیا گیا۔ اس کے بعد جلد ہی سرحد کانگریس کمیٹی کے صدر اور کل ہند کانگریس کی مجلس عاملہ کے رکن چن لئے گئے۔ اس عرصہ میں کئی بار گرفتار ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں سبھاش چندر بوس کو ملک سے فرار ہونے میں مدد دینے کی وجہ سے قید کر لئے گئے اور ساڑھے تین سال کے لئے دیولی کیمپ (راجپوتانہ) میں نظر بند کر دیا گیا۔ رہائی کے بعد تین سال تک ہری پور میں پابند مسکن رکھا گیا۔

کچھ عرصہ بعد کانگریس کی پالیسی کے خلاف احتجاجاً استعفیٰ دے کر مجلسِ احرارِ اسلام سے منسلک ہو گئے اور عرصہ تک مجلس احرارِ اسلام کے صوبائی صدر رہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۵۱ء کے صوبائی انتخاب میں مسلم لیگ کے امیدوار کی حیثیت سے حصہ لیا۔ لیکن برسرِ اقتدار لیگی قیادت کی دراندازی سے کامیاب

---

[1] ماخذ تلخیص از تحریر عتیق الرحمن صاحب صدیقی "ماہنامہ الحق"

نہ ہو سکے۔ اس کے بعد جمعیت علمائے اسلام سے وابستہ رہ کر دین کی خدمت کا کام کرتے رہے۔ وفات سے قبل وہ جمعیت العلمائے اسلام ہزارہ ڈویژن کے امیر تھے۔

طبی بورڈ آپ ایک تجربہ کار اور نامور حکیم تھے۔ اس شہرت کی بنا پر ۱۹۵۸ء میں گورنمنٹ طبی بورڈ کے ممبر نامزد ہوئے۔ دوسری بار ۱۹۶۵ء میں پھر ممبر نامزد ہوئے۔ تیسری بار انہوں نے اطباّ کی مقبول جماعت پاکستان طبی کانفرنس کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا اور بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔

ذاتی صفات آپ ہمہ صفت موصوف انسان تھے۔ سیاسئین کے حلقہ میں بالغ نظر سیاستدان کی طرح سیاست کے اسرار و رموز بیان فرماتے۔ علماء کی مجلس میں دینی مسائل کی گھتیاں سلجھاتے۔ طبیبوں میں تشخیص و تجویز کے مراحل سے گزرتے۔ زمینداروں سے زمین کے مسائل پر ایک زمیندار کی طرح گفتگو کرتے۔ صوفیاء میں سلوک کی منزلیں طے کرتے ہوئے دکھائی دیتے۔ عام لوگوں سے ان کے مزاج کے مطابق گفتگو کرتے۔

وجیہہ شخصیت، خندہ پیشانی، لطیف گفتگو، جس میں ظرافت کی چاشنی ہوتی، وہ ہر جہت سے ایک خوش خلق انسان تھے۔ وفات ۲۲/۲۳ جنوری ۱۹۷۷ء میں ہوئی۔ ؎

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

سید حسین شاہ فدا نے "نوائے وقت جون ۱۹۷۹ء میں یادِ رفتگاں کے تحت تحریر کیا کہ:

۱۔ آپ نے ۱۹۲۶ء میں ایک ہفت روزہ اخبار "مجاہد" نکالا جس کے سرِ عنوان یہ شعر تھا۔

؎ ہاں نکل، قربان گاہِ اسلام پر قربان ہو
دل میں ہو شوقِ شہادت ہاتھ میں قرآن ہو

۲۔ ۱۹۲۵ء میں جب حکومت برطانیہ نے قبائلی علاقہ پر بمباری کی، تو آپ، حضرت علامہ اقبال کا تعارفی خط لے کر افغانستان کے سفیر متعینہ دہلی سردار صلاح الدین سلجوقی سے ملے اور ان کی وساطت سے حکومت افغانستان کو مطلع کیا، جس سے یہ بمباری فوراً بند کر دی گئی۔

۳۔ تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء اور ۱۹۷۴ء میں مؤثر کردار ادا کیا۔

آپ سے میری ذاتی شناسائی تھی۔ آپ بڑی محبت سے ملتے۔ آخری ملاقات وفات

سے کچھ عرصہ پہلے ان سے ہوئی - انہی دنوں آپ طویل بیماری سے صحت یاب ہوئے تھے۔

انجمن اسلامیہ لبفہ

یہ انجمن خانانِ گیدڑپور نے ۱۹۰۰ء میں بنائی - اس انجمن نے اسلامیہ سکول لبفہ ۱۹۰۷ - ۸ء میں بنایا - خان علی گوہر خان صاحب مرحوم تاتار اس میں خاص دلچسپی لیتے تھے - بچوں کو شوق و ترغیب دلانے کے لئے ان کا امتحان لیا کرتے اور ان کو انعام بھی دیا کرتے -

بابِ پانزدہم (۱۵)

مؤلف کی زندگی کی کہانی

گزشتہ منزلیں، منزل بہ منزل یاد آتی ہیں
مسافر! یہ خلش دل کی، بہ آسانی نہیں جاتی (جگر مرادآبادی)

اسی جذبہ کے تحت، مختصر حالات زندگی تحریر کر رہا ہوں۔ خودستائی یا بہ مقصد داستان سرائی مقصود نہیں۔ غرض زندگی کے تاریخی حالات قلمبند کرنا ہے۔ کیونکہ جس طرح قوموں اور خاندان کی تاریخ سے عبرت و بصیرت حاصل کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح چھوٹے پیمانے پر، لیکن زیادہ واضح انداز میں فرد کی زندگی کے حالات میں بھی یہ سبق ملتے ہیں۔ گو

نہ پوچھ نامۂ اعمال کی دل آویزی
تمام عمر کا قصہ، لکھا ہوا پایا

تفصیل کے ساتھ اعمال نامہ تو لکھا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ اپنے حالات، خود ہی لکھنا بڑا مشکل اور نازک معاملہ ہے۔ اگر انسان اپنی برائی لکھتا ہے تو اپنا دل دکھتا ہے اور صحیح حالات (قابل تعریف)، تو خودستائی معلوم ہوتی ہے اور پڑھنے والوں کو برا لگتا ہے۔ شہرت طلبی، انسان کی جبلّی کمزوری ہے۔ ایک بہت بڑے انگریز شاعر نے کہا ہے:

وہ شہرت طلبی، شریف دل سے بھی بڑی دیر کے بعد، بلکہ تمام کمزوریوں کے نکل

جانے کے بعد لکلتی ہے"!

تاہم لکھنے والوں نے اپنے عمر نامے لکھے ہیں اور اہل الرائے کا اتفاق ہے کہ اس سے اجتماعی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ گو یہ ایک محدود زندگی کی تاریخ ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی شنیدہ یا دیدہ سے زیادہ خود گزشت ہوتی ہے۔ جو واقعات اپنی زندگی میں پیش آئے وہ عین الیقین کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس واسطے قابل اعتبار ہوتے ہیں۔

میں نے اپنی زندگی، اس کا ماحول اور نتائج مختصر طور پر لکھ دئے ہیں، شاید قابل عبرت و موعظت بن سکیں۔

قوم و خاندان میری قوم پنی اور خاندان منیر خانی ہے۔ یہ خاندان عہدِ مغلیہ سے قوم کا سربراہ چلا آرہا ہے۔

شجرہ نسب شیر بہادر خان بن مولوی رسول خان، بن حسن علی خان بن عبدو خان بن منیر خان (جس کے نام سے میرا خاندان موسوم ہے)، منیر خان کو خانی اپنے چچا جلال خان سے ملی۔ جلال خان نے اپنے بیٹے تہور خان کو اس کی نااہلی کی بنا پر خانی نہ دی۔ جلال خان درانی عہد سے پہلے ہوا۔ منیر خان درانی عہد میں فوت ہوا۔ اس کے بعد اس کا بڑا بیٹا قائم خان سربراہِ قوم ہوا۔ اس نے سکھوں کے عہد اور انگریزی عہد کے آغاز میں کارہائے نمایاں انجام دئے۔ پہلے انگریز ڈپٹی کمشنر میجر ایبٹ نے ان کی خدمات میں جاگیر اور سرٹیفکیٹ دئے، جن میں اس نے لکھا ہے کہ قائم خان، اپنے بھائیوں، بیٹوں اور بھتیجوں سمیت ہر موقعہ پر میرے دائیں ہاتھ پر موجود رہا۔ وہ لکھتا ہے، کہ قائم خان چیف آف پنیاں نے گزشتہ جنگ سکھاں (۱۸۴۹ء) کے دوران ہمیشہ جرأت اور مکمل وفاداری کے ساتھ کارہائے نمایاں انجام دئے مزید وہ بڑا ہی راست باز اور دریا دل آدمی ہے اور سارے ضلع میں معزز سمجھا جاتا ہے۔ سوائے ان لوگوں کے نزدیک جو اس کی سرفرازی اور اعزاز سے حسد رکھتے ہیں۔

..... آخر میں وہ لکھتا ہے کہ "میں بڑے دکھ اور افسوس کے ساتھ، اپنے اس وفادار دوست سے جدا ہو رہا ہوں۔ (میجر ایبٹ، سابق ڈپٹی کمشنر ۲۲ اپریل ۱۸۵۳ء)

نوٹ۔ میجر ایبٹ مارچ ۱۸۴۹ء سے اپریل ۱۸۵۳ء تک ہزارہ کا ڈپٹی کمشنر رہا۔

میری وجہ تسمیہ

والد مرحوم نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ (۱۸۹۱ء تا ۱۹۲۱ء) بطور اول مدرس مدرسہ غازی بر لب دریائے سندھ تحصیل ہری پور میں گذارے۔ یہ گاؤں طاہر خیلی قوم کا مرکزی گاؤں ہے۔ ان کے زمانے میں اس قوم کا ایک نامور اہل علم خان محمد عمر خان جاگیردار غازی تھا۔ اس کا بڑا بیٹا بنام شیر بہادر خان، ان کا ایک قابل شاگرد تھا۔ طاہر خیلی بحیثیت قوم بہت ہی ذہین لوگ ہیں۔ شیر بہادر خاں کی قابلیت سے والدِ مرحوم بہت متاثر تھے۔ وہ تعلیم کے بعد تحصیلدار بنا اور جنوبی وزیرستان میں متعین تھا کہ راستہ میں جاتے ہوئے وزیریوں کے ہاتھ سے قتل ہو گیا۔

اپنے اس لائق شاگرد سے متاثر ہو کر والدِ مرحوم نے میرا نام شیر بہادر رکھا۔ اس کے بعد تو میرے خاندان، گاؤں اور علاقے میں اکثر لوگوں نے یہ نام رکھا۔

میری پیدائش

والد مرحوم کی بیاض کے مطابق میری پیدائش بروز ہفتہ بوقت صبح پانچ بجے بتاریخ یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء پنیاں میں ہوئی۔ میری بہن، امیر خانم کی پیدائش بروز اتوار نو بجے بتاریخ ۲۰ دسمبر ۱۹۰۰ء پنیاں میں ہوئی۔ ہم دو ہی اپنے ماں باپ کی اولاد تھے۔ بہن نے عین جوانی میں ۲۸ مارچ ۱۹۲۳ء بعارضہ تپ محرقہ وفات پائی۔

والد مرحوم کے حالات زندگی

میر خانی خاندان (بلکہ قوم پنی میں) میں سب سے پہلے والد مرحوم کے چچا مولوی کرم خان بن عبدو خان نے پرانے زمانہ کے دستور کے مطابق تعلیم حاصل کی اور طبابت کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ اپنے پیشہ میں ماہر تھے اور انیسویں صدی کے آغاز میں انہوں نے اپنا مطب بمبئی میں کھولا

والد مرحوم نے انگریزی عہد کے مروجہ طریقہ تعلیم کے مطابق اردو مڈل کا امتحان جنوری ۱۸۸۸ء مڈل سکول کوٹ نجیب اللہ سے پاس کیا۔ ۱۵ مارچ ۱۸۸۸ء میں اسی سکول میں تھرڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ ۷۔ اکتوبر ۱۸۹۰ء تا ۳۱ جولائی ۱۸۹۱ء نارمل ٹریننگ سکول راولپنڈی میں زیر تعلیم رہے۔ امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۵ مارچ ۱۸۹۱ء موضع غازی (علاقہ طاہر خیلی) میں پرائمری سکول کے اول مدرس مقرر ہوئے اور ۱۹۲۱ء تک (تیس سال) وہاں ہی رہے۔

غازی پرائمری سکول ۱۹۲۱ء میں مڈل سکول بن گیا تو آپ کی تبدیلی بحیثیت تھرڈ ماسٹر

مڈل سکول کوٹ نجیب اللہ ہو گئی۔

بیماری اور وفات آپ نے اپنی عمر کا بہترین حصہ (تیس سال) برلب دریائے سندھ گزارا جہاں ٹھنڈی ہوا اور برفانی پانی ہر وقت میسر تھا۔ آپ کو یہ جگہ بہت محبوب تھی۔ آب و ہوا کی تبدیلی (سرد جگہ سے گرم جگہ) اور اپنی محبوب جگہ سے جدائی کے صدمہ سے آپ کی صحت دن بدن تیزی سے گرنے لگی۔ وفات (۱۲ اکتوبر ۱۹۲۱ء) تک ۵ ماہ کا عرصہ بیماری ہی میں گزارا لیکن ذرا سے افاقہ پر کوٹ نجیب اللہ، فرض کی ادائیگی کے لئے جاتے رہے۔

واپسی پر تکان اور نقاہت سے بے آرام رہتے اور صبح نہ جانے کا پروگرام بناتے۔ لیکن ادائیگی فرض کے اصول پر تادم آخر پابند رہے اور صبح پھر تیار ہو جاتے۔ ان کے تیار ہونے پر اگر ان سے کہا جاتا کہ آپ کمزور ہیں، نہ جائیں۔ لیکن آپ وقت مقررہ پر اٹھ کھڑے ہوتے اور کہتے "سکول کی گھنٹی بجی، طاقت آ گئی" اور روانہ ہو جاتے۔ جب نقاہت بہت بڑھ گئی، تو آخر وہ وقت بھی آن پہنچا کہ آپ حسب عادت سکول جانے کے لئے گھوڑی پر سوار ہوئے۔ میرے ماموں نجف خان نے گھوڑی کی باگ پکڑی ہوئی تھی کہ سوار ہوتے ہی گھوڑی کی پیٹھ سے لڑھک کر ایک طرف کو گرنے لگے، کہ ان کو تھام کر اتار لیا گیا اور چارپائی پر لٹا دیا گیا سوفات سے ایک ہفتہ پہلے آپ نے ایک خط لکھا۔

بیماری کی اطلاع ازنیاں
۱۲ اکتوبر ۱۹۲۱ء

عزیزم!

دعوات . . . میری حالت دن بدن خراب ہوتی جاتی ہے۔ بعد تعطیلات دسہرہ، میں کوٹ نہ جا سکا۔ میری طاقت کام کرنے سے جواب دے چکی ہے۔

اگر برخوردار کو دس پندرہ دن کی رخصت مل سکے، تو آوے۔

آپ کا بیمار باپ رسول خان۔

خط ملتے ہی میں گھر پہنچ گیا۔

مجھے دیکھتے ہی اشارہ کیا، کہ ان کے سینے سے لپٹ جاؤں۔ وہ خود اٹھ نہیں سکتے تھے۔ دل سے لگایا۔ بوسے دئیے اور یہ شعر پڑھا ؎

بر لب رسید جانم تو بیا کہ زندہ مانم

گو میں پہنچ گیا، لیکن وہ زندہ نہ رہ سکے۔ ان کا دس پندرہ دن کا اندازہ تقریباً صحیح نکلا کہ وہ اس عرصہ میں وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وفات ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۱ء

والد مرحوم کے برادران آپ کے دو بھائی تھے، جو آپ سے چھوٹے تھے۔ جعفر خان اور۔۔۔ شجاع الدولہ خان۔ ان دونوں کو یکے بعد دیگرے اپنے پاس غازی میں رکھ کر تعلیم دلائی۔ یہ دونوں بعد میں ملازمت کے لئے پہلے ملایا گئے اور اس کے بعد امریکہ چلے گئے۔ محمد جعفر خان ۱۹۰۵ء اور شجاع الدولہ خان ۱۹۰۹ء میں۔ دونوں ساری عمر امریکہ میں ہی رہے۔ اور وہیں وفات پائی۔ محمد جعفر خان ۱۹۶۱ء میں، شجاع الدولہ خان ۱۹۷۱ء میں فوت ہوئے۔ محمد جعفر خان لاولد رہے، کہ انہوں نے شادی نہ کی۔ شجاع الدولہ خان کا ایک بیٹا محمد انور خان المعروف بہ رابرٹ جعفری، اب تک امریکہ میں ہے اور لکھ پتی ہے۔

والد مرحوم کے عادات واطوار آپ کو صفائی بے حد مرغوب تھی۔ کپڑے اپنے سامنے دھلواتے استری کرواتے۔ پگڑی کلاہ پر باندھتے اور بڑی توجہ سے آئینہ سامنے رکھ کر باندھتے۔

ماں، باپ، بہن، بھائیوں کی خدمت مخلصانہ طور پر کرتے اور تمام لواحقین سے مخلصانہ برتاؤ کرتے گفتگو نرمی سے اور بڑے مؤثر انداز میں کرتے۔ ان کی عادات پر یہ شعر صادق آتا ہے ؎

ماقصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہرو وفا مپرس

والدۂ مرحومہ میر حسن خان بن غزن خان بن منیر خان پنی کی بیٹی تھیں۔ اپنے والد کی طرح پابند صوم تھیں۔ قرآن مجید کی چند سورتیں، جو ان کے والد نے یاد کرائی تھیں کی تلاوت باقاعدہ کرتی رہتی تھیں اور قرآن مجید صبح و شام پڑھتی تھیں۔ ہر تیسرے سال حج کے لئے جاتیں۔ کل ۵ حج کئے بھائی، بہنوں، ان کی اولاد اور دیگر اقرباء اور مساکین کی مدد کرتیں۔ لاوارث یتیموں پر نظر رکھتیں۔ ایسے دس یتیم اپنے گھر پر رکھ کر ان کی پرورش کی۔ طبعاً جفاکش اور سخت مزاج تھیں۔ مجھے اور میری بہن کو سخت ضبط میں رکھ کر تربیت کی اور مذہب کا پابند بنایا۔

وفات - وہ ۱۹۴۴ء میں فوت ہوئیں اور رنیاں میں دفن ہیں۔

میری تعلیم

اپنے گاؤں (رنیاں) کے پرائمری سکول (جو ۱۹۰۲ء میں کھولا گیا تھا) میں ۱۹۰۷ء میں داخل ہوا۔ اس وقت سکول میں ایک ہی استاد ہوتا تھا۔ میرے وقت میں مولوی حمید گل از خاندان اخوانزادگان موضع ٹاہلی (تربیلہ) تھے۔ بہت دیندار اور محنتی استاد تھے۔

میں نے ۱۹۱۲ء میں پرائمری امتحان پاس کیا اور ہری پور تحصیل کے پرائمری سکولوں کے چیدہ طلباء کے امتحان میں اول آیا اور ریاقتی وظیفہ حاصل کیا۔ مڈل کا امتحان گورنمنٹ مڈل سکول (حال گورنمنٹ ہائی سکول ٹ) سے پاس کیا۔ میٹرک کا امتحان خالصہ ہائی سکول ہری پور سے ۱۹۱۸ء میں فسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔

خالصہ سکول ہی اس وقت ہری پور تحصیل میں ہائی سکول تھا، جو رائے بہادر لالہ روچا رام ساکن ایبٹ آباد نے اپنے بیٹے لکھمی چند کی وفات پر اس کی یادگار کے لئے بنایا اور نام لکھمی چند خالصہ ہائی سکول رکھا۔ قابل ترین اور تعلیم یافتہ سکھ استاد، تقریباً سب ایم اے الا، اپنے مضامین کے ماہر مقرر کئے۔ جو سب بڑی محنت اور مشنری تندہی سے کام کرتے تھے۔

ہری پور کی تحصیل کے لوگوں نے اس سکول سے بہت فیض پایا۔ یہ سب بانی سکول کی نیک نیتی اور وسعت قلبی کا فیضان تھا۔

کالج کی تعلیم

اسلامیہ کالج پشاور سے دو سال میں (۱۹۲۰ء میں) فسٹ ڈویژن میں ایف ایس سی کا امتحان پاس کر لیا۔

میڈیکل کالج

میرے والد بزرگوار کی مدت سے خواہش تھی، کہ میں ڈاکٹر بنوں۔ داخلہ کے لئے سخت مشکلات تھیں۔ کیونکہ جنگ عالمگیر اول (۱۹۱۴-۱۸ء) کی وجہ سے ۱۹۲۰ء تک داخلہ صرف ان فوجیوں کے بیٹوں کو ملتا رہا، جن کے والدین یا قریبی رشتہ دار میدان جنگ میں موجود رہے۔ ایسی کوئی سفارش مجھے میسر نہ تھی۔ گو میرا ایک نزدیکی رشتہ دار، ۱۹۲۰ء میں میدان جنگ میں تین چار سال گزارنے کے بعد پنشن پر آگیا۔ لیکن اس نے باوجود وعدہ کے آخر وقت گریز کی راہ اختیار کی اور کوئی سفارش نہ کی۔ میرے والد بزرگوار اور میری انتہائی خواہش، داخلہ میڈیکل کالج کے لئے تھی۔ اس مایوسی کے عالم میں میں نے وقتی طور پر اسلامیہ کالج پشاور میں بی۔ ایس۔ سی میں داخلہ لطور

حفظ ماتقدم لے لیا کہ میڈیکل کالج میں داخلہ کی ناکامی پر تعلیم جاری رکھ سکوں۔

جب میڈیکل کالج کے داخلہ کی تاریخ قریب آئی تو ایک الہامی اشارہ کی بنا پر میں نے والد صاحب کو لکھا کہ گو حالات سازگار نہیں۔ لیکن توکل بر خدا، داخلہ کے لئے قسمت آزمائی کرنا چاہتا ہوں اور ان سے اس اقدام کی اجازت مانگی۔

والد صاحب نے بھی، الہامی اشارہ پر مجھے لکھا کہ داخلہ کے لئے قسمت آزمائی کرنے کے لئے لاہور جاؤں۔ میرا خط ان کو اور ان کا خط مجھے ایک ہی وقت ملے۔ اس توارد نے میری حوصلہ افزائی کی اور میں خدا کے بھروسہ پر لاہور روانہ ہو گیا۔

تاریخ مقررہ پر سب امیدواروں کو ایک ہال میں مسلمان، سکھ اور ہندو امیدواروں کو الگ الگ، نتیجہ امتحان یونیورسٹی کی بنیاد پر بٹھایا گیا۔

داخلہ کے لئے مسلمان ۲۵، سکھ ۲۵ اور ہندو ۵۰ کی تعداد میں لئے جاتے تھے۔ اس وقت ایک ہجوم رشتہ داران امیدواران برآمدہ میں جمع ہو گیا۔ امیدواروں کے فوجی رشتہ دار، سینوں پر جنگی اعزاز کے تمغے لٹکائے ہوئے، برآمدوں میں ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔

وقت مقررہ پر میڈیکل کالج کے پرنسپل کرنل سورلینڈ، ہال میں داخل ہوئے اور آتے ہی اعلان کیا کہ اس سال داخلہ قابلیت کی بنا پر (یعنی یونیورسٹی سے حاصل کردہ نمبروں کے مطابق) ہوگا۔ اس اعلان سے ہال کے اندر اور باہر خاموشی چھا گئی۔ سفارشی امیدواروں اور ان کے رشتہ داروں کے رنگ فق ہو گئے۔ اس یکایک شرط داخلہ میں تبدیلی سے فوجی حلقوں میں گھبراہٹ پیدا کر دی اور مجھے بغیر سفارش کے داخلہ مل گیا۔

ان حلقوں سے سفارشوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن پرنسپل اپنے اعلان پر ڈٹا رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس عرصہ میں کالج کی تعلیم کا معیار بہت گر گیا ہے اور بیرونی دنیا میں کالج کی شہرت کو دھچکا لگ گیا ہے۔

ان ایام میں سر فضل حسین وزیر صحت پنجاب تھے۔ دو چار اصحاب نے ان سے پرنسپل کو سفارش کرائی کہ ان کے بچوں کو داخل کیا جائے۔ سر فضل حسین نے پرنسپل کو ایک ذاتی خط لکھا کہ مہربانی کرکے ان دو دو تین، لڑکوں کو داخل کر لیا جائے۔

کرنل سدرلینڈ نے جواباً تحریر کیا کہ

"افسوس ہے۔ سب نشستیں پر ہو چکی ہیں اور مزید داخلہ کی گنجائش نہیں"۔

سر فضل حسین اس جواب سے ناراض ہوئے اور ایک حکم نامہ بہ حیثیت وزیر صحت بھیج دیا کہ ان لڑکوں کو داخل کر لیا جائے۔

کرنل سدرلینڈ نے اس حکم کی تعمیل تو کر دی کہ یہ افسر مجاز کا حکم تھا، لیکن جواباً تحریر کر دیا:

"حسب الحکم ان لڑکوں کو داخل کر لیا گیا ہے، اور میں پرنسپل کے عہدہ سے استعفیٰ دیتا ہوں"۔

اس کے بعد باوجود ہزار کوشش انہوں نے اپنا استعفیٰ واپس نہ لیا اور بقیہ مدت ملازمت بحیثیت پروفیسر میڈیسن گزار دی۔

میں مسلمان امیدواروں میں اپنے ڈویژن اور نمبروں کی بنا پر تیسرے نمبر پر تھا، مجھے داخلہ مل گیا اور میرے رب نے کسی انسان کا زیر بار احسان نہ رکھا۔ الحمدللہ علیٰ ذالک۔

ملازمت

نومبر ۱۹۲۵ء میں ڈاکٹری کا امتحان (ایم۔بی۔بی۔ایس) پاس کیا۔ ان ایام میں تحریک آزادی زوروں پر تھی اور لیڈران قوم کی جانب سے انگریز کی نوکری حرام ہونے کے فتوے لگ چکے تھے، لہٰذا اس جذبہ آزادی کے تحت پرائیویٹ پریکٹس شروع کرنے کا ارادہ کیا۔ کچھ قرض لیا۔ پشاور میں قصہ خوانی بازار، محلہ ڈھکی نعلبندی میں دکان شروع کی۔ لیکن چند روز ہی میں قدرِ عافیت معلوم ہو گئی۔

اس زمانہ میں بازار تجارت میں ہر منافع بخش کاروبار بشمول ڈاکٹری پریکٹس، پر غیر مسلموں کا مکمل قبضہ تھا۔ وہ صدیوں کے مسلسل تجربہ کی بنا پر فن تجارت کے ماہر تھے۔ ان کا کاروباری جال بہت وسیع اور مضبوط تھا۔ مسلمانوں کے لئے آزاد معیشت کے سب دروازے بند تھے۔ مسلمانوں میں الگ وطن کے حصول کا سب سے بڑی اور بنیادی وجہ یہی معاشرتی و معاشی تنگی تھی، جس سے دو قومی نظریہ کی بنیاد پڑی۔ لہٰذا پرائیویٹ پریکٹس کی بدمزگی سے جلد ہی سرکاری نوکری کی طرف رخ کرنا پڑا اور ۱۹۲۶ء میں محکمہ صحت صوبہ سرحد میں ملازمت اختیار کر لی۔

سب مدارج سے ترقی کرتا ہوا، آخرکار ۱۹۵۴ء میں چند ماہ کے لئے ناظم صحت و جیل خانہ جات سرحد مقرر ہوا۔ ۱۹۵۵ء میں وحدت مغربی پاکستان کی تشکیل پر خطہ شمالی کا ڈپٹی انسپکٹر جیل خانہ جات

بنایا گیا اور نومبر ۱۹۵۶ء میں پنشن پر آ گیا۔ ایبٹ آباد میں مقیم ہو کر، اپنا کلینک (مطب) اپنی اقامت گاہ میں بنام دار الشفاء جاری کر دیا ہے۔ اب ۸۴ سال ہونے کو ہیں۔ اس شغل میں اور تنہائی کی زندگی گزر رہی ہے اور خوب گزر رہی ہے۔ اب انجام بخیر کی آرزو ہے۔ ؎

وقتِ طلوع دیکھا، وقتِ غروب دیکھا
اب فکرِ آخرت ہے، دنیا کو خوب دیکھا (اکبر)

اولاد

مجھے خدا نے تین بیٹے اور تین بیٹیاں عطا کیں۔ بڑا بیٹا محمد اقبال خان ایم۔بی۔بی۔ایس ڈاکٹر ہے۔ تقریباً ۱۲ سال سے انگلینڈ میں مقیم ہے۔ ستمبر ۱۹۷۵ء میں میری خواہش پر بمعہ انگریز بیوی (اس نے شادی انگلینڈ میں ہی کی تھی)، واپس آیا۔ اسلام آباد میں کلنک (مطب) شروع کیا۔ کام چل نکلا۔ لیکن اس کی بیوی کو یہ ماحول اور آب و ہوا راس نہ آئی۔ تبدیلی آب و ہوا کے لیئے اس کو انگلینڈ بھیجا گیا۔ جب واپس آئی، تو پھر سخت بیمار ہو گئی، لہٰذا مجبوراً ان دونوں کو پھر واپس جانا پڑا۔ اب وہ وہاں ہیں۔

منجھلا بیٹا، محمد جمیل خان انجینئر ہے۔ ۱۰ سال محکمہ واپڈا لاہور میں محکمہ منصوبہ بندی تعمیرات کا انچارج رہا۔ ایک سال لندن میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیئے گیا۔ واپس لاہور آنے کے بجائے وہ سیدھا امریکہ چلا گیا، کہ زندگی کے دن عزت و آرام سے گزارے۔ میرا یہ بیٹا بڑا قابل محنتی اور خوددار ہے۔ اور وطن میں تو خودداری عیب ہے۔ افسران کو محنت اور بہترین کارگزاری پسند نہیں۔ ماتحتوں سے زبانی خوشامد کے علاوہ عملی داد و دہش بزنگ نقد یا شراب و کباب درکار ہے۔ اب ۱۹۷۵ء سے امریکہ میں ہے۔ وہاں نوکری کے ساتھ ہی ایم۔ایس۔سی (M.SC. ENGINEERING) کر لی اور اب پی۔ایچ۔ڈی کی تیاری کر رہا ہے۔

سب سے چھوٹا بیٹا محمد رشید خان ہے۔ وہ بھی محمد جمیل خان کے ساتھ امریکہ چلا گیا۔ اس نے یہاں ایم اے کیا ہوا تھا۔ امریکہ میں اس نے مشینی شماریات (COMPUTOR) کا علم سیکھا اور ملک سویڈن میں ۱۹۷۶ء سے ملازمت اختیار کر لی۔ وہاں ہی شادی کر لی۔ اس کے دو بیٹے ہیں۔ اب سویڈن میں اعلیٰ برقیاتی (HIGH ELECTRONIC) تعلیم کے حصول میں مشغول ہیں۔

اب میرے تینوں بیٹے، دیارِ غیر میں زندگی گزار رہے ہیں اور ان کے بوڑھے والدین (میری عمر اب ۸۲ سال ہے)، تنہائی کی زندگی گزار رہے ہیں اور میری طرح اور بھی بہت سے افراد اس المیہ سے دوچار ہیں۔

اس المیہ کی بنیادی وجہ انگریز تو چلا گیا اور حکومت اپنوں نے سنبھال لی۔ المیہ اس میں یہ ہے کہ انگریز، اپنی حاکمانہ بصیرت و تجربہ تو ساتھ لے گیا۔ لیکن اپنی حکومت کا فرعونی جاہ و جلال (بقول شخصے، مغلوں نے بادشاہی کی ہے اور انگریزوں نے شہنشاہی)، اپنے پروردہ عمال حکومت کے حوالے کر گیا۔ جن کی عمریں تو انگریز کی چاکری، خوشامد اور غلامی میں گزریں۔ لیکن یکدم حکومت کی باگ ڈور مل جانے پر مطابق مثل "کوا چلا ہنس کی چال، اپنی بھی بھول گیا"۔ انہوں نے اپنی قوم کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھا کہ زندگی وبال بن گئی۔

ستم ظریفی کی انتہا ہے کہ جو ملک علامہ اقبال کے نظریہ خودی کی بناء پر اور نعرہ لا الٰہ الا اللہ پر حاصل کیا گیا۔ وہاں قوم کی احساس خودی کو اتنا پامال کیا گیا کہ ..... بدستِ بچگان افتاد۔ والا معاملہ بن گیا۔

اہلِ علم و ہنر کے لئے وطن میں عزت و آبرو کی زندگی محال ہو گئی۔ اس کے بچانے کے لئے ان کو دیارِ غیر میں پناہ لینا پڑی۔

انتہا یہ ہے، کہ مزدور طبقہ بھی پاک وطن سے بھاگ رہا ہے اور حاکم اس کارِ خیر میں ان کی امداد کر رہے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ اپنا یہ وطن سونے کی چڑیا تھی۔ جس کے حصول کے لئے یورپی اقوام نے اس کے حصول میں دوڑ لگا رکھی تھی اور اب ؎

وائے ناکامی! متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

میری تین بیٹیاں ہیں۔ بڑی سعیدہ بانو ہے۔ اس کا خاوند ڈاکٹر نیر رمضان، ماہر امراض کان، گلا اور ناک ہے اور آج کل پشاور میں اپنا کلنک چلا رہا ہے۔

منجھلی بیٹی نسیم بانو جس کا خاوند حضرت سلطان خان انجینئر ہے اور اس وقت ایبٹ آباد میں ایگزیکٹو انجینئر ہے۔

سب سے چھوٹی بیٹی ڈاکٹر طاہرہ بانو اپنے خاوند ارشد فاروق خان جائنٹ سیکرٹری حکومت پاکستان اسلام آباد میں مقیم ہے۔

زندگی کے چند واقعاتِ عبرت آموز

توکل علی اللہ اور ربِّ قدیر کی چارہ سازیاں

یہ چند واقعات اس لئے تحریر کر رہا ہوں کہ ان سے موعظت و عبرت حاصل کی جا سکے۔

میں نے گھر کے مذہبی ماحول میں آنکھ کھولی۔ والدین اور نانا، اسلامی عقیدہ و کردار پر پختگی سے حامل تھے۔ ہوش سنبھالا تو اسلامی زندگی کے اطوار کو اپنایا اور توکل علی اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیا۔ یہ میرے رب کا فضل و کرم تھا۔

جب کبھی زندگی کی کسی منزل پر، ماسوائے اللہ کی جانب دیکھنے پر مائل ہوا، تو نقصان اٹھایا جونہی تائب ہوا، رحمتِ خداوندی نے سہارا دیا۔

۱۔ والدِ مرحوم کو اپنے بھائیوں سے جو مدت سے امریکہ میں تھے۔ بہت محبت تھی اور وہ بھی ان کی تابعداری کرتے رہے اور روپے بھی بھیجتے رہے اور ہر ماہ سلسلہ خط و کتابت جاری رہا۔ جب والد مرحوم کا وقتِ آخر ہوا اور زندگی کی آس نہ رہی، تو موت سے دو تین دن پہلے مجھ سے ایک مفصل خط بھائیوں کو لکھوایا جس میں میری تعلیم کے دوران امداد کے لئے سفارش کی ان کی وفات (۱۲؍اکتوبر ۱۹۲۱ء) کے دو تین دن بعد میں نے یہ خط روانہ کردیا۔ شاید میرے رب کو والدِ مرحوم کی یہ استدعا پسند نہ آئی کہ اس میں شرکِ خفی کی آمیزش اور اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (ہم تیری ہی مدد کے طلبگار ہیں)، کی دعا کے خلاف نظر آئی۔ خلافِ امید نہ اس خط کا جواب آیا اور نہ ہی تعزیت کا کوئی خط، حالانکہ اس سے قبل ہر ماہ ان کا خط آتا رہتا تھا۔ مجھے میرے رب نے اپنے فضل و کرم سے نوازا۔ شاید اس میں میرے صبر و توکل کی ادا کا اثر ہو کہ میں نے والدِ مرحوم کا دم نکلتے ہی ان کی چارپائی کے ساتھ جاتے نماز بچھائی۔ دو رکعت نفل پڑھے اور عاجزی کے ساتھ ہاتھ اٹھائے اور کہا "میرے رب تو نے میری زندگی کے ظاہری سہارے کو اٹھا لیا۔ اس پر میں صابر ہوں۔ اب تو بالکل تیرا ہی آسرا ہے اور بس"۔

میرے رب نے میری اس مختصر دعا کو قبولیت بخشی اور ایسا بندوبست فرمایا کہ دورانِ تعلیم کوئی تکلیف یا تنگی پیش نہ آئی۔

میں (۱۹۲۶ء) کامیاب ہو کر ملازم ہو گیا اور روادی کرم کا ایجنسی سرجن تھا، کہ ۱۹۴۵ء میں چچا جان کا خط، یعنی والدِ مرحوم کی وفات سے ۲۴ سال بعد ملا۔ انہوں نے معذرت کی کہ وہ اتنی مدت خط بوجہ معذوری نہ لکھ سکے۔ ان دنوں پر ایک مقدمہ قتل کا بن گیا تھا اور وہ اتنی مدت حوالات میں رہے۔

بہرحال میرے رب نے ان کا محتاج نہ رکھا اور نہ ہی ان کا زیرِ احسان۔

۲۔ میڈیکل کالج کا داخلہ۔ اس کی مشکلات کا ذکر گزشتہ صفحات میں کر چکا ہوں۔ اس وقت بھی جب والدِ مرحوم اور میں نے خدا پر بھروسہ کیا تو اس نے ایسا سامان پیدا کر دیا کہ داخلہ کا مسئلہ بر احسن وجوہ حل ہو گیا۔ ایک عالم اس معجزہ پر حیران و ششدر رہ گیا۔

۳۔ میں بنوں میں ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۸ء تک اسسٹنٹ سرجن و سوِل سرجن رہا۔ جوانی تھی، صحت تھی۔ فرض کی ادائیگی کی لگن تھی۔ بڑی محنت سے کام کیا عام لوگوں اور افسرانِ محکمہ نے تعریف کی۔ آخر کار میرے عمدہ کام پر ناظم صحت کرنل تھاربرن نے میری تعریف میں ایک تعریفی سرکلر (میری رپورٹ۔ بنوں میں ملیریا اور اس کی روک تھام)، پر سرحد کے سب ڈپٹی کمشنروں اور سوِل سرجنوں کو بھیجا۔ اس تعریف نے میرے نفس کو مغرور کر دیا اور خیال گذرا کہ میں جلد ہی مستقل سوِل سرجن بن جاؤں گا۔ خدا کو میرا یہ غرور پسند نہ ہوا۔ ناگہانی کرنل تھاربرن گھوڑے سے گرا، اور وہ فوت ہو گیا۔ میرا خواب پریشان ہو گیا۔ اس جھٹکے نے مجھے رب العالمین کی دہلیز پر سربسجود کر دیا۔ میرے رب نے اپنی مہربانی سے مجھے پھر نوازا اور میں اپنے سے تین چار سینئر ڈاکٹروں سے پہلے سوِل سرجن بن گیا۔

---

(۲)



(۱)



(۳)



(۱) محمد خان تارخیلی
ساکن سلکھنڈ

(۲) منصب خان قوم کنازی اُتمان
ساکن چھاڑ علاقہ تربیلہ

(۳) میر زمان خان قوم پٹھانی
اُتمان زئی تیدخانی ساکن کھلابٹ

(۵)



(۴)



(٦)



(۴) نعمت خان بشوانی
ساکن سریکوٹ
(۵) حاکم خان قوم پٹھان ترین
ساکن تلوکر
(٦) راجہ حیات خان قوم ترک
ساکن مانک رائے

(٧)



(٨)



(٩)



(٧) محمد بخش خان قوم پٹھان دلازاک
ساکن سرائے صالح

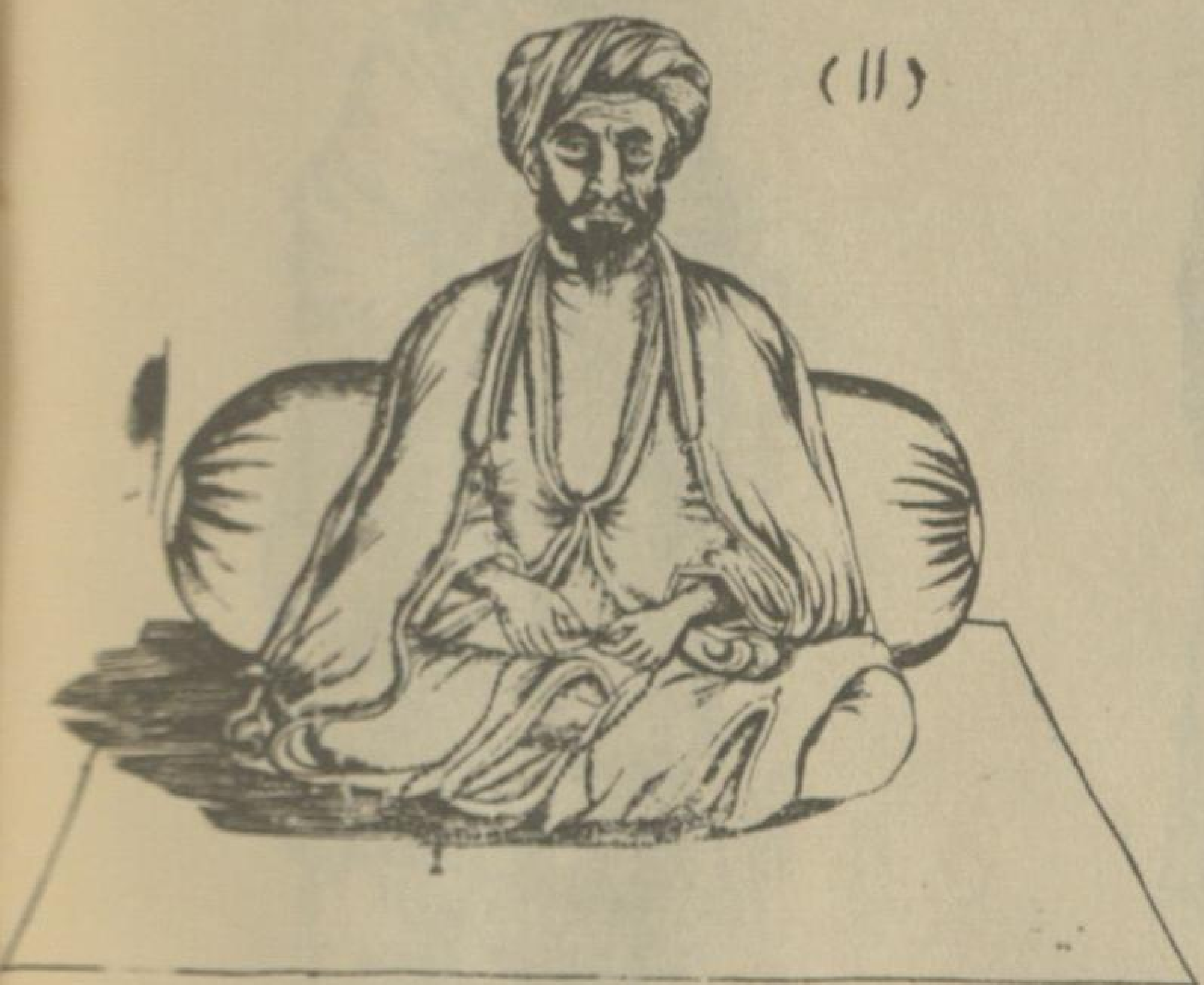
(٨) مقدم غلام محمد نبیرہ مقدم مشرف
ساکن کوٹ نجیب اللہ قوم گجر

(٩) قاضی عبدالغفار قوم آوان گورڑہ
رئیس سکندرپور

(۱۰)



(۱۱)



(۱۲)



(۱۰) قاضی میر عالم
رئیس سکندرپور

(۱۱) نواب خان بن سربلند خان
قوم تنولی پتہ بلال ساکن شنگڑی

(۱۲) عبداللہ خاں بن مدد خاں
قوم تنولی پتہ ہندوال ساکن بھیڑہ

(۱۳)



(۱۴)



(۱۵)



(۱۳) راجہ جہانداد خاں بن راجہ حیدر بخش خاں
سردار قوم گکھڑ ساکن خانپور

(۱۴) راجہ فیروز خاں گکھڑ بھرڑی
بن راجہ علی گوہر خاں

(۱۵) حاکم خان قوم ڈھونڈ
ساکن لورہ

(١٦)



(١٧)



(١٨)



(١٦) سردار آزاد خاں بن سردار حسن علی خاں
قوم کرڑال ساکن منال

(١٧) اکبر علی خان قوم جدون
ساکن کالو میرا

(١٨) سمندر خان بن محمد امین خان بن
حبیب اللہ خاں ساکن گڑھی حبیب اللہ

(۲۰)



(۱۹)





(۲۱)

(۱۹) ہوڈی شاہ بن سید قاسم سید ترمذی
ساکن صوابی میرا

(۲۰) غلام حیدر شاہ بن ضامن شاہ ترمذی
ساکن بلیہ کوائی علاقہ کاغان

(۲۱) سلطان مقرب خاں
والیٔ پوٹھوہار

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No.
★ MAILSI ★



(۲۲) رانی منگو

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

[م جھ ر ل]

2 5 FEB 2021